رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر
۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

افسانہ

۱۱۹

ستمبر ۱۹۷۴ء

مدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغ اردو، لاہور

قیمت: ۱۵ روپے

# ترتیب

## فن اور فنکار



## اِنتظاریہ



## تبصرے



---


محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اُردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا۔

# طلوع

اب کے رائٹرز گلڈ کے الیکشن خوب ہوئے۔ مُردہ جماعت زندہ ہوگئی۔ رچنا زون، یعنی پنجاب کے انتخابات میں جو نتیجہ نکلا۔ وہ حاضر ہے۔

| ہمارا گروپ | ووٹ | مخالف گروپ | ووٹ |
|---|---|---|---|
| **مرکز** | | | |
| (۱) محمد طفیل | ۲۲۹ | (۱) قتیل شفائی | ۱۹۳ |
| (۲) ناصر زیدی | ۱۵۰ | (۲) رؤف شیخ | ۱۱۰ |
| **صوبائی اُردو** | | | |
| (۱) میرزا ادیب | ۲۳۰ | (۲) سلطان رشک | ۲۰۴ |
| (۲) سید وقار عظیم | ۲۲۴ | (۲) ذوالفقار احمد تابش | ۱۵۶ |
| (۳) زاہدہ صدیقی | ۲۰۴ | (۳) اسرار زیدی | ۱۲۸ |
| (۴) محمد منشا یاد | ۱۷۹ | (۴) ارشد حسین ارشد | ۱۰۴ |
| **صوبائی پنجابی** | | | |
| (۱) ڈاکٹر رشید انور | ۲۶۰ | (۱) سلیم کاشر | ۱۷۳ |
| (۲) راجہ رسالو | ۱۹۳ | (۲) شہباز ملک | ۱۲۳ |
| (۳) بشیر منذر | ۱۹۲ | (۳) منظور وزیرآبادی | ۱۱۶ |

جناب قتیل شفائی گروپ کو یکسر مسترد کر دیا گیا۔ اس لیے کہ موصوف ایک مدت سے رائٹرز گلڈ پہ قابض تھے۔ اس کے باوجود، انہوں نے ادیبوں کی فلاح کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

اب جناب قتیل شفائی سیکرٹری جنرل بننا چاہتے ہیں جنہیں اپنے گھر میں مسترد کیا جا چکا ہو۔ وہ کس بوتے پہ دوسرے صوبوں کی قیادت کا حق ادا کریں گے؟ یہ سوال اہلِ قلم سے ہے!

فقط یہ سوال!

(محمد طفیل)

# اِس شمارے میں

پہلی بات تو یہ ہے کہ کاغذ دیر سے ملا۔ اس لئے پرچہ دیر سے شائع ہوا۔ اب حکومت نے اِس امر کا انتظام کر دیا ہے کہ کاغذ کسی رکاوٹ کے بغیر ملا کرے گا۔ لہٰذا پرچہ بھی جلد جلد شائع ہوا کرے گا۔ یوں تو زندہ ہی نقوش کے لئے ہوں۔ اس لئے اس سے غفلت برتنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ ویسے میں اِس عرصے میں برابر کام کرتا رہا ہوں یہ ٹھیک ہے کہ اس عرصے میں چھپ کر کوئی چیز آپ کے سامنے نہیں آئی لیکن کام کئی نمبروں پر ہوا ہے۔ جو قابلِ ذکر ٹھہرے گا۔ بس ذرا توقف۔

ہم نے اس سے پہلے بھی نقوش کے کئی افسانہ نمبر چھاپے۔ جن کی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اتفاق کی بات کہ ان میں سے ہر نمبر میں ایک آدھ افسانہ ایسا بھی سامنے آیا جسے افسانوی ادب میں فراموش کیا ہی نہ جا سکے گا۔ وہ زندۂ جاوید ہو گیا۔ مثلاً:

۱۔ لندن لیٹر — قرۃ العین حیدر — (شمارہ نمبر ۲۵، ۲۶)

۲۔ جل پری — علی عباس حسینی — (شمارہ نمبر ۲۵، ۲۶)

۳۔ ننھی کی نانی — عصمت چغتائی — (شمارہ نمبر ۳۷، ۳۸)

۴۔ گڈریا — اشفاق احمد — (شمارہ نمبر ۳۷، ۳۸)

۵۔ زرد گلاب — اے حمید — (شمارہ نمبر ۳۷، ۳۸)

۶۔ ایک چادر میلی سی — راجندر سنگھ بیدی — (شمارہ نمبر ۸۵، ۸۶)

ویسے ہمارے خاص نمبروں اور عام شماروں میں بھی کئی ایسے افسانے نکلے جنہیں بھولنا مشکل ہی ہوگا۔ مثلاً:۔
موذیل، سعادت حسن منٹو ——— ماں جی، قدرت اللہ شہاب ——— اپنے دکھ مجھے دے دو، راجندر سنگھ بیدی ——— الحمد للہ، احمد ندیم قاسمی ——— سایہ، غلام عباس ——— ماوا، خدیجہ مستور ——— کالی تتری، بلونت سنگھ ——— اُوئی اللہ، ممتاز مفتی ——— ڈیڈ لیٹر، خواجہ احمد عباس ——— صنم تراشں کا خواب، ل احمد ——— بھاگ بھری، ماجو سرور ——— بھیا دیوج۔ ابو الفضل صدیقی ——— شب گزیدہ، قاضی عبد الستار ——— پہچان، آغا بابر ———
ان سے زیادہ افسانے اِس وقت ذہن میں نہیں آ رہے۔ ورق گردانی سے، آپ کو بہت کچھ ملے گا۔ اتنا کچھ کہ جتنا کچھ اُردو کا

کوئی دوسرا رسالہ نہ دے سکا۔

اِس شمارے میں ایک قابلِ ذکر تخلیق تو وہ سوشل ہسٹری ہے۔ جسے قرۃ العین حیدر نے لکھا اور اپنے ہی خاندان کے بارے میں لکھا۔ یوں تو یہ مضمون محیط ہے صدیوں پر مگر انداز ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ جیسے وہ صدیاں سامنے بیت رہی ہوں۔ اِس مضمون میں کمی کیا ہے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ خوبیاں کیا کیا ہیں۔ اس پر کوئی جتنا چاہے لکھ دے۔ میری مراد اُن کی تخلیق "کارِ جہاں دراز ہے" سے ہے۔ اب یہ مضمون نقوش میں مسلسل چھپے گا۔ قرۃ العین نے وعدہ کر لیا ہے کہ یہ سلسلہ ٹوٹے گا نہیں۔

مسعود مفتی کے اِس شمارے میں کئی افسانے ہیں۔ ایک افسانہ وہ بھی ہے جو اس سے پہلے بھی نقوش میں چھپ چکا ہے۔ یعنی "صدیوں پار"! چھاپتے وقت ہم نے افسانے پر سے مصنف کا نام حذف کر دیا تھا۔ محض حفظِ ماتقدم کے طور پر، کیونکہ موصوف بھارت کی قید میں چلے گئے تھے۔ دو افسانے نئے ہیں اور ایک ڈراما، موضوع ان کا مشرقی پاکستان ہے۔ وہ مشرقی پاکستان جو اب بنگلہ دیش ہے۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب ایسے تکلیف دہ موضوعات کو نہیں چھیڑنا چاہیے۔ ایسے حضرات کی خدمت میں میرا جواب یہ ہے کہ کیا ہم اُن واقعات کو تاریخ کا حصہ بننے سے روک سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کیوں سچا ادیب اِس المیے کو اپنی نگارشات کا موضوع نہ بنائے؟ جہاں تک باہم تعلقات کی استواری کا مسئلہ ہے۔ یہاں کے ادیب بنگلہ دیش کے ادیبوں سے آگے ہیں، پیچھے نہیں۔

کچھ خطوط میں نے مسعود مفتی کو لکھے تھے۔ کچھ خطوط مسعود مفتی نے مجھے لکھے تھے۔ وہ بھی پیشِ خدمت ہیں۔ میں تو ان کو چھاپنے پر راضی نہ تھا۔ کیونکہ اپنے رسالے میں اپنے ہی خطوط اچھی بات نہیں لگتی۔ مگر جب مفتی صاحب نے بتایا کہ آپ کے یہ خطوط بھی بھارت کی قید کاٹ کر آئے ہیں تو مجھے اپنے اُن کاغذ کے پُرزوں پر بھی ترس آگیا۔ یہی بات ان کی اشاعت کا باعث بنی۔ بہرحال اِن خطوط سے یہ معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں بیٹھا ہوا ایک سچا پاکستانی کن خطوط پر سوچ رہا تھا۔

اِس شمارے میں دو مضمون میرے بھی ہیں۔ ایک مولانا کوثر نیازی پر، جو مختصر ہے مگر اُسے میں مکمل سمجھتا ہوں۔ دوسرا ممتاز مسعود پر، جو قدرے طویل ہے مگر اُسے میں نامکمل سمجھتا ہوں۔

باقی اِس شمارے میں جو افسانہ بھی ہے۔ اہم ہے۔

محمد نقوش

# قرۃ العین حیدر

# کی تخلیق

عنوانات

(۱) کارِ جہاں دراز ہے

(۲) ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی

# ایک گواہی !

وہ افسانہ نگار بہت اچھا لکھتا ہے آمنا وصدقنا، وہ افسانہ نگار بہت اچھا لکھتی ہیں سرِ تسلیم خم، مگر جس کا دل چاہے وہ حساب کرے کہ اس دور میں، قرۃ العین حیدر سے بہتر کوئی نہیں لکھ رہا۔ تاریخ کی شناور یہ، ناول کی نابغہ یہ، افسانہ نگاری میں کامل یہ، رپورتاژ میں یکتا یہ! ان کی تحریریں کیا ہیں؟ علم و دانش کی اُتبدیں ہیں۔ ایسی اُتبدیں، جو اوراقِ دل پہ آگہی کے پرت کھولتی رہیں گی۔

میں کسی کی تعریف کرنے میں خاصا بخیل ہوں۔ مگر کبھی کبھی ادب میں، سرشاری کا ایک ایسا مقام بھی آتا ہے کہ اس میں احتیاط کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔

میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو کہوں گا سچ کہوں گا۔

محمد طفیل

قرۃ العین حیدر
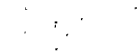
# کارِ جہاں دراز ہے

## قرۃ العین حیدر

## تعارف

تذکرہ سادات نہٹور جو سید عابد حسینی مرحوم نے بزبان فارسی تحریر فرمایا قصبہ نہٹور (ضلع بجنور، یو، پی) میں مصنف کے پوتے سید شمیم حسین زیدی کے پاس محفوظ ہے۔ زیر تصنیف کتاب میری اپنی تحقیق کے علاوہ اس ضخیم تذکرے اور "شجرہ سادات نہٹور" (مطبوعہ کراچی) کے دیباچے پر مبنی ہے جو اس قلمی نسخے اور تاریخ ناصری وغیرہ سے اخذ کیا گیا۔

میں اپنے ماموں میجر سید آل حسین اور پروفیسر سید تہور علی نقوی مرحوم اور پھوپھی زاد بہن اور بھائی بیگم نا ملہ الطاف حسین، سید عثمان حیدر اور مخدوم زادہ سید محمد یٰسین کی بیحد ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کے چند ابواب کے لیے اہم معلومات کراچی سے فراہم کیں۔

قرۃ العین حیدر

بمبئی ۱۲ دسمبر ۷۲ء

---

فصل اوّل

## باب ۱

### فرات و جیحوں

میں دشتِ لُوط کے کنارے کھڑا ہوں۔ کس طرف جاؤں؟ موت کہیں بھی کسی راستے سے آسکتی ہے چمکیلے خنجر کا وار، زہر کا بلوریں پیالہ، زنداں کے دروازے پر جلاد کی دستک۔

ممکن ہے زندہ بھی رہ جائیں۔ فرات سے جیحوں تک کا راستہ کچھ کم دشوار گزار تھا؟ لیکن اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اگر ما سید نبوہ مارا در جہاں جائے تنگ نہ بود۔

جدِّ امجد[1] نے حاکمِ وقت سے بغاوت کی تھی۔ مارے گئے۔ لاش قبر سے نکالی گئی۔ اسے صلیب پر لٹکایا گیا۔ پھر جلا کر اس کی راکھ فرات میں بہا دی گئی۔ اللہ اکبر۔ اولاد غریب الوطن ہوئی۔ ہمارے سترہ سالہ بھائی یحییٰ نے خراسان پہنچ کر پھر کچھ ہنگامہ برپا کیا تھا۔ وہ بھی مارے گئے۔

ابو محمد قاسم کہاں ہیں — ؟ ابو محمد اسمٰعیل؟

در غربت افتاد۔

ابو اسحٰق ابراہیم؟

در غربت افتاد۔

آرمینا اور گرجستان، حبشہ اور بلخ، غزنین اور لاہور، در غربت افتاد۔

آذربائیجان، داغستان، کوہ قاف، یہودی اور نسطوری، خوفناک روسی اور چرکسی اور تاتاری۔ مازندران کے گھنے جنگل اُن دیوزادوں کا مسکن ہیں۔ عجم کا مہم جو رستم جن سے نپٹنے جایا کرتا تھا۔ اللہ کی دنیا بڑی عجیب و غریب ہے۔ کون کون کدھر نکل گیا۔ کیسی کیسی اجنبی اقوام کے درمیان جا بسے آگے کیا ہوگا۔ ڈر لگتا ہے۔

فتح توران کو عرصہ ہو چکا۔ بخارا، سمرقند اور ترمذ میں عرب نو آبادیات قائم ہیں۔ دمشق و بغداد سے بہت دور ماوراء النہر میں شاید امن نصیب ہو۔

ایک وقت تھا کہ ہم آلِ حسنؑ و حسینؑ مدینے میں خاموشی سے رہتے تھے مگر خدا کی قسم منصور کے جاسوسوں نے ہماری زندگیاں تلخ کر دیں۔

کہا جاتا ہے کہ اہلِ ایران اپنی شہزادی شہر بانو کی وجہ سے ہم سے محبت کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ سیاسی معاملات زیادہ پیچیدہ اور نازک ہیں۔ میری سمجھ میں بہرحال کبھی نہ آسکے۔

بلخ کے آتش کدے سرد ہو چکے۔ امیر سامان نے کلمہ پڑھ لیا۔ دیلم کے کریم بن شہریار نے کلمہ پڑھ لیا مگر ساسانیت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے حاکموں نے بادشاہت کے آداب اختیار کر لئے۔ سامان کے لڑکوں کو حکومتیں بخشی گئیں۔ نوح سمرقند، احمد فرغنہ، الیاس ہرات، سب نے اپنا شجرہ بہرام چوبین سے جوڑا۔ سارے حاکم خود کو خسرو اور دارا کہلا کر خوش ہو رہے ہیں۔ بخارا اور سمرقند گھوم کر آؤ تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کیسی بدلی ہے۔ سامانی دربار میں رودکی قصیدے پڑھتا ہے ؎

شاہ ماہ است و بخارا آسماں

شاہ سرو است و بخارا بوستاں

ہائے ابوذر غفاری۔

ملک گیری، کشور کشائی اور ملوکیت کے معاملات عبرتناک ہیں۔ دیکھو طبرستان والوں کا کیا حشر ہوا۔ ہمارے علوی رشتے دار تھے۔ خود کو داعی الحق

---

[1] زید بن امام زین العابدینؑ ۱۲۲ھ میں شہید کئے گئے۔ دوسرے بھائی امام محمد باقرؑ کو زہر دے کر ختم کیا گیا۔ حسین ذوالدمعہ اور عیسیٰ موتم الاشبال کی اولاد فارس اور ماوراء النہر میں جا بسی۔ عمر اشرف کی آل اولاد طبرستان اور گیلان میں آباد ہوئی۔

کھولا۔ شاندار مدرسے قائم کئے۔ صاحبِ خطبہ و سکہ ہوئے۔ جاہ و جلال سے سو برس تک حکومت کی۔ انجام کار وہی اک ضربِ شمشیر۔ خراسان کے صفاریوں اور بخارا کے سامانیوں نے ان کا قصہ کوتاہ کیا۔ یعقوب صفاری بہت عوام کا قائد بن کر اٹھا تھا۔ لوہار ہوں، جو کی روٹی کھاتا ہوں۔ مجھے خلیفۂ بغداد کی پروا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ خود امیر بن بیٹھا۔

خیوا اور خوارزم اور کاشغر کے خاقان مسلمان ہو چکے ہیں۔ سامانی بھی گئے۔ کاشغر کے ایک خان نے بخارا فتح کیا۔

آلِ سامان کی بربادی میں ان کے ترک غلاموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کے یہاں ایک ترک غلام تھا الپتگین نامی —

ہم لوگ بلخ سے پچاس میل دور جیحوں کے کنارے ترمذ میں رہتے ہیں۔ سکندر کے زمانے کا شہر ہے۔ آتش کدے ویران پڑے ہیں۔ پیرِ مغاں اب میکدہ چلاتا ہے۔ جہاں فارسی کے نئے شاعر روز شام کو جمع ہو کر عربوں اور ملاؤں کو برا بھلا کہتے ہیں۔

سرکاری اور علمی زبان عربی ہے درس گاہوں میں عربی پڑھائی جا رہی ہے۔ البیرونی اور بو علی سینا، ابنِ موسیٰ اور ابنِ فارابی کے زمانوں کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ لیکن نئی ایرانی قوم پرستی کی وجہ سے فارسی کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ ابوالقاسم فردوسی نے ہم عربوں کی کم تحقیر کی ہے جانے کیا ہونے والا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ نئی اسلامی برادری ہے۔ فرغنہ اور زرفشاں کی وادیوں میں ترکمان آباد ہیں۔ ترکی بولتے ہیں۔ تاجک قدیم، سغدیوں اور باختریوں کی اولاد میں آلِ سامان نے وسط ایشیا کو تہذیبی لحاظ سے ایران سے ملحق کیا۔ اس خطہ میں تاجک فارسی پھیلی۔ ہم بھی عربی بولنا بھول گئے۔ عبا کو خیرباد کہا۔ ترکی اور تاجک فارسی بولتے ہیں۔ سرخ چوغے اور دھاری دار خلعتیں زیبِ تن کرتے ہیں۔ سخت سرد ملک ہے پورے پورے چرمی جوتے اور سموری ٹوپیاں اور سموری قبائیں پہنتے ہیں۔ ٹوپی یا عمامے پر ہم ایک سبز رومال البتہ باندھ لیتے ہیں کہ نشانِ آلِ رسولؐ ہے۔

یہاں گھوڑوں کی فراوانی ہے۔ میں نے بھی ایک بار سوچا تھا گھوڑوں کی تجارت شروع کروں۔ کچھ بزرگوں نے بلخ اور خوارزم کے مدرسوں میں پڑھا پڑھایا تھا۔ میرا دل بھی تجارت کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

عراق سے یہاں بہت سے صوفیا آن پہنچے ہیں۔ خانقاہیں اور تکیے آباد ہو رہے ہیں۔ ہم سادات نے ترمذ پر حکمرانی بھی کی۔ مگر صاف بات یہ ہے کہ حکومت ہمارے بس کا روگ نہیں۔

سلجوقیوں، خوارزمیوں، غزنویوں، غوریوں میں مسلسل لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ شہر تاراج ہوتے ہیں، پھر تعمیر کر لئے جاتے ہیں۔

کفار نے طلوعِ اسلام سے قبل یہاں صنم خانے تعمیر کئے تھے باختری یونانیوں نے ایک شخص کے مجسمے تراش کر اس کی پرستش شروع کی کہ نام اس شخص کا بُت تھا۔ ہندِ قدیم کا ایک عارف تھا۔ بڑے حسین مجسمے تھے جو الحمدللہ اب ترمذ کی ریت پر بکھرے پڑے ہیں۔ بُت نئی فارسی شاعری کی ایک تلمیح میں تبدیل ہو کر خود صحرائے ترکستان کی خاک میں مل گیا۔

ہمارے ترمذ میں اس وقت ایک سے ایک عالی شان عمارتیں موجود ہیں۔ مدارس، خانقاہیں، شفاخانے، مساجد، کارواں سرائیں، مکانوں پر انگور کی بیلیں پھیلی ہیں۔ بازاروں میں نہریں بہتی ہیں۔ باغوں میں انار اور سرو کے درخت لگے ہیں۔ جیحوں کی ساحلی ریت میں تربوز کے کھیت ہیں۔ شہر سے باہر کپاس لہلہا رہی ہے۔

ترمذ مدینۃ الرجال کہلاتا ہے کہ یہاں علماء اور صوفیا کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

ابھی ابھی جس پر جنگ ہے گا یا غزنوی یا غوری یا سلجوقی شہسوار شب خون ماریں گے اور پل کی پل میں سب غارت ہو جائے گا۔ ہمارے بزرگوں نے کیا کیا دہشت ناک زمانے دیکھے۔

سامانیوں کا جو ترک غلام الپتگین تھا۔ آج کل دستور یہ ہے کہ ان بانکے ترکوں کو فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کلاہ صوبائی حاکمیں اور خود مختار امراء کے حاجب یا مقرب خاص بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد آقا۔ خلافت بغداد کا جو حال ہے سو ہے۔ پھر کیا عجب ہے کہ الپتگین جو غزنی کا سپہ سالار مقرر ہوا تھا ایک شاہی خاندان کا بانی اور اپنے آقاؤں کا حاکم بن گیا۔ والد بزرگوار بتلاتے ہیں۔ وہ سترہ برس کی بات ہے جب الپتگین کے نامور غلام جانشین اور داماد امیر ناصر الدین سبکتگین نے یہاں ترمذ میں انتقال کیا۔

جیحوں سردیوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ دریا کے جنوبی ساحل کے سامنے قبائل کے برفپوش سلسلے ہیں۔ موسم سرما میں اوپر خوارزم سے یہاں تک کشتیوں کی آمد و رفت بند ہو جاتی ہے۔ موسم بہار میں ان کشتیوں پر اکثر دشت قپچاق کے غلام لائے جاتے ہیں۔ قہستان، بلخ اور اکثر افغانوں کا علاقہ ہے۔ امیر ناصر الدین سبکتگین کے حیرت انگیز فرزند محمود نے ان کو لیک کیا تھا۔ یمین الدولہ کی کیا عجیب و غریب شخصیت تھی۔ اس نے ایلک خانیوں اور سامانیوں کے چراغ گل کئے۔ غور فتح کیا۔ آل بویہ سے اصفہان چھینا۔ اس کے دربار اور اس کی علمی مجالس اور اس کی جود و سخا کے قصے الف لیلوی ہیں۔ اس کے مرنے کے بعد دنیا تاریک ہو گئی۔ فرخی نوحہ کناں ہے ؎

خیز شاہا کہ جہاں پر شغب و شور شدہ است

مگر اب وہ کہاں جاگتا ہے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

تاریخ کس طرح اپنے آپ کو اتنی یکسانیت سے دہراتی ہے۔ غزنی کا ایک ترک غلام انوشتگین، سلطان ملک شاہ سلجوقی کا ساقی تھا، اسے خوارزم کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس کے لڑکے نے آزادی کا اعلان کر دیا پوتے علاؤ الدین خوارزم شاہ نے سمرقند و بخارا مسخر کر لئے۔ لیکن جو حشر سامانیوں کا ان کے غلاموں نے کیا تھا وہی سلجوقیوں کا ہو رہا ہے۔ ورنہ طغرل بیگ، چغر بیگ اور سلطان سنجر کا رعب و دبدبہ، شوکت و طاقت، جاہ و جلال کس کو یاد نہیں ہے۔ غزنوی افواج کو شکستِ فاش دے کر خراسان انہوں نے کس آسانی سے تسخیر کر لیا۔ جس روز طغرل بیگ کا خطبہ نیشاپور کی جامع مسجد میں پڑھا گیا ہے میرے ایک دادا وہاں موجود تھے۔ مدرسے میں پڑھایا کرتے تھے۔ انہوں نے پدر بزرگوار کو سلجوقیوں کی شان و شوکت کے قصے سنائے تھے۔

سلاجقہ کو ان کے اتابیگوں نے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ اتابیگ دراصل دشت قپچاق سے لائے ہوئے غلام اور جنوبی روس کی وادی اتل کے ذہین اور شکیل باشندے ہیں۔ فوجی طاقت ان کے ہاتھ میں ہے۔ آذربائیجان، فارس، آرمینیا، شام، موصل، دمشق غرضیکہ ساری سلطنت سلجوقیہ پر ان کا تسلط ہے۔ اس وقت سلطان سنجر محض خراسان کا فرماں روا رہ گیا ہے۔ لیکن درباری شعرا اس کی بھی تعریف کے دریا بہانے میں مصروف ہیں۔

ایک وقت تھا کہ بلخ، جرجان، خوارزم اور طبرستان پر قابض ہونے کے بعد طغرل بیگ آل عباس کے بغداد میں سلطان کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔
قہستان میں فیروز کوہ کے غوریوں نے آل غزنی کا زور توڑا۔ لاہور تک پہنچ کر غزنوی مملکت پر قابض ہو گئے۔ غزنی کے دربار میں بھلے کچھ

---

[illegible] ۔

بھائی ہاتھوں ہاتھ لئے گئے تھے کہ خاقان، خوانین اور ملوک اور سلاطین کے اس دور میں سادات اور فقراء کی قدر بہت کی جاتی ہے۔ بادشاہ وقت آلِ رسولؐ کا ادب کرکے ثواب کمانا چاہتا ہے۔

اس وقت قراچل کے اس پار پنجاب سے عجیب عجیب خبریں آ رہی ہیں۔ ہمارے کچھ بھائی کہ شُوقی تھے۔ لاہور بھی جا بسے ہیں۔ (ہمارے لیے اب تصوف ہی کافی ہے۔)

غزنوی اور غوری افواج کی مستقل آمد و رفت کی وجہ سے ہندکا راستہ کافی آسان ہوگیا ہے۔ اب تو یہی دھن ہے کہ بی بی بچوں کو ساتھ لے کے سفر پر نکلوں اور کفار کو دینِ مبین اختیار کرنے کی ہدایت کروں۔ خداوندِ بزرگ و برتر اس فقیر کے ارادے کو تقویت دے اور کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔

---

# باب ۲

## جیحوں سے جمنا

"سلسلہ نسب پدری سید عالی خاندان سید کمال الدین ترمذی کہ در کیتھل متصل تھانیسر از ولایت آمدہ سکونت کردہ اند بن سید عثمان ترمذی بن سید ابوبکر بن سید عبداللہ بن سید طاہر ابن سید ابوطاہر بن سید عبداللہ، بن سید علی زید بن سید حسین بن ابوعبداللہ، بن سید احمد محدث، بن سید عمر بن سید حسین ذوالدمعہ بن زید شہید بن زین العابدین علیہ السلام۔"[1]

سید کمال الدین ترمذی ان اولین صوفیائے کرام میں سے تھے جو بارھویں صدی میں ہندوستان میں وارد ہوئے۔

قراخطائی سے ریشم و کتان کے چند تاجر بلخ و ہرات جاتے تھے۔ ان کا ساتھ ہوگیا۔ ایک خچر پر خیمہ لادا، ایک مشکیزہ، کتابوں کا بستہ، جانماز، تسبیح اور تلوار جیحوں پار کرکے بلخ پہونچے۔

خراسان مشرقی صوبہ ہے۔ سورج یہاں سب سے پہلے نمودار ہوتا ہے۔ وسیع خشک چٹیل میدان، سُرخ زمین، سرخ مٹی سرخ چٹانیں۔ ایسی بے آب وگیاہ سرزمین نے کیسے کیسے اولیاء، علماء، سپہ سالار اور سیاست دان پیدا کئے۔ تعجب ہوتا ہے۔ جب سورج نکلا تو دھوپ وسعت کی وجہ سے افق تا افق پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ خراسان طلوعِ خورشید کی سرزمین ہے۔

راقم الحروف ناچیز خاکسار نے اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شہنشاہ محمد رضا شاہ اور فرح پہلوی شہبانوئے ایران کے ہمراہ بذریعہ ہیلی کوپٹر و طیارہ خراسان کا دورہ کیا۔

---

[1] ہمایہ - [2] سید احمد توختہ ترمذی وغیرہ -

[3] رسالہ تذکرۃ السادات از شیخ احمد بن محمد عمری، اکبر آبادی - اس کتاب کے بیرونی شجرات نے مآخذ سید احمد اسد علی، شیخ شریف الدین بن عبداللہ نساب، علی بن زید ہراتی، ملا حسین واعظ کاشفی وغیرہ ہیں۔ ہندوستان کے شجرات، سید علی ہمدانی، مخدوم اشرف جہانگیرؒ، سید حسن محمد قطبی وغیرہ - یہ کتاب ابوالمظفر سلطان محمد معظم شاہ عالم اول ملقب بہ بہادر شاہ اوّل (۱۷۰۷-۱۷۱۲ء) کے دور میں لکھی گئی -

اس خطے کے سپاٹ میدانوں اور ٹیلوں سے آج بھی اسی طرح کارواں گزرتے ہیں۔ جدید ترین آسائشوں والے شہر آباد ہو چکے ہیں مگر قصبہ اور طوس اور نیشاپور کی مساجد اور مدارس کے عبا پوش علما و سبز عماموں والے تسبیح پھیرتے بوڑھے اور جوان۔ چادر پوش خانمیں یاد دلاتی ہیں کہ بارہویں اور بیسویں صدی کے درمیان فقط صرف ایک پل اور ایک آن کا ہے۔ پہاڑی راستے اور ندیاں اور سرد کے جھنڈ اور کھیت اس شدید وسعت اور سناٹے میں حیرت خانی سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ جو اس درے میں سے خچروں کی ایک قطار گزر رہی ہے۔ صافوں اور شلواروں والے مسافر ان پہ سوار ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس طرف کا رُخ ہے؟ کون ہیں اور کہاں سے اپنے سفر پر نکلے تھے؟

بلخ سے غزنی پہنچے جسے علاؤالدین جہاں سوز جلا کر خاک کر چکا تھا۔ افغانستان سے نکلے دریائے اٹک، پنجاب، لاہور۔ شہر مختلف سا معلوم ہوا۔ اچانک چند قبریں اور ایک مسجد نظر آئی - جان میں جان آئی - اپنے یک جدی بھائی احمد توختہ ترمذی سے افسوس کہ ملاقات نہ ہو سکی۔ پنجاب سے چلے۔ تو دہلی کے نزدیک پہنچے۔ راستے میں کئی قافلے چھوڑے۔ نئے مسافروں کا ساتھ تھا۔ کبھی تن تنہا۔ پیدل تن بہ تقدیر کبھی اونٹ یا خچر پہ۔ موسم کی تحصیل قریب الختم تھی۔ سوچا اب جو بستی دکھائی پڑے۔ اللہ کا نام لے کر وہاں قیام کیا جائے۔
ایک علاقہ سرسبز و شاداب نظر آیا کہ مویشی کثرت سے چر رہے تھے۔ تالاب تھا۔ اہلِ ہنود کے صنم خانے تھے معلوم ہوا نام اس قصبے کا کیتھل ہے علاقہ ہریانہ ندی کے کنارے اہلِ ہند کی ایک مشہور زیارت گاہ بدریت خانہ ہے۔ نزدیک ہی ایک مقام تھانیسر ہے۔ کیتھل کا خاص میدان کوروکشیتر کہلاتا ہے۔ یہاں عہدِ قدیم میں ایک جنگ لڑی گئی تھی۔
مقامی زبان سے ناواقف، راہ میں کچھ الفاظ پنجابی کے سیکھ لیے تھے۔ ان سے کام چلایا۔ ترک یہاں حد سے زیادہ بدنام ہیں۔ لفظِ ترک سے لوگ سہم جاتے ہیں کہ مستقل حملے کر کے ان اقوام کو ہراساں کر رکھا ہے۔
بیحوں سے جمنا تک کا راستہ کچھ کم خطرناک تھا۔
بہرحال بمقام سیدگڑھ تالاب ایکا نیر کے کنارے جھونپڑی ڈال کر ٹوٹی پھوٹی ہریانوی زبان میں تبلیغ شروع کر دی۔
مجھے ہے حکمِ اذاں . . .

اب قرونِ وسطیٰ کا داستان گو اپنے قصے کا آغاز کرتا ہے :

"ایک روز کمال الدین ترمذی تالاب کے کنارے مشغولِ عبادتِ الٰہی تھے کہ ناگاہ دخترِ راجہ پتھورا اینکاویوی اشنان کے لیے مع داسیوں کے پہنچی۔ دیکھا کہ ایک شخص کالمنیر کنارِ آب قیام پذیر ہے۔ آپ کے اٹھانے کا حکم دینے کی خواہش ہوئی۔ فی الفور گونگی ہو گئی۔ ملازمین نے ماجرا قلمبند کر کے بجنسہ مذکورہ راجہ اہالی دلی التماس کیا۔ وہاں سے فرمانِ استطلاب بجناب میں نافذ ہوئے۔ حضرت کمال الدین علیہ الرحمۃ دربارِ دہلی میں رونق افروز ہوئے مہاراجہ نے انبارِ آتش روشن کر کے حضرت کو اس پر بٹھالا۔ بحکمِ جنابِ باری وسنتِ خلیل اللہ وہ نارگلزار ہو گئی۔ راجہ نادم و منفعل ہوا اور بولا جہاں طبیعتِ مبارک چاہے قیام کیجئے۔ فرمایا اس فقیر کو سایہ درخت اراک کا پسند ہے۔ پس راجہ نے فرمان معافی موضع ہبانہ کہ کیتھل سے جانب دکن بہ فاصلہ دو کوس واقع ہے۔ سربمہر کر کے جانبِ شہر کیتھل روانہ کیا اور اپنی لڑکی کو لکھا کہ یہ بزرگ جنابِ الٰہی سے قربت و نسبت رکھتا ہے۔ چاہیے کہ بہ دل و جان خدمت میں مصروف رہے۔ بہ تعمیلِ حکم پدر دن میں ایک بار وہ دخترِ نیک اختر خدمتِ پُرانوار سید میں حاضر ہو کر برکتوں سے مالا مال ہوتی

تھی۔ باللہ اسلام قبول کیا۔ زنار کفر جسم سے دور کیا۔ مزار اس نیک بی بی کا متصل خانقاہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ دہلی میں موجود ہے۔"

جاننا چاہیے کہ اسی زمانے میں امیر حمزہ بھی کہ آلِ رسول تھے بسلسلۂ تبلیغ اسلام اپنی مہموں پر نکلے تھے۔[1]

الغرض سید کمال الدین ترمذی چند سال کیتھل میں قیام کرنے کے بعد پدر بزرگوار سے ملنے کی خاطر دوبارہ عازم ترکستان ہوئے۔ گویا FURLOUGH پر وطن جاتے ہیں۔ راستے میں سیاسی خلفشار شدید تھا۔ اس طرف ایران میں اسمٰعیلیوں نے آفت جوت رکھی تھی کہ وہ بھی ایک اور امام زادے اسمٰعیل کی امامت کے داعی تھے۔ یہاں امامت اور خلافت کا مسئلہ کب کا ختم ہو چکا۔ اب صرف تصوف ہی تصوف ہے۔

اب فرقہ امیہ کا مورخ گویا ہوتا ہے: "حالات سے گھبرا کر بیشتر سادات نے تقیہ کر لیا۔ ورنہ سب تہ تیغ کر دیے جاتے۔" واللہ اعلم بالصواب۔

الغرض کمال الدین ترمذی نے کچھ عرصہ ترمذ میں گزارا اور بی بی بچوں اور رفقائے ہمراہ دوبارہ قصد ہند کا کیا۔ راہ میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لشکر جرار قرہ خیبر کی طرف رواں ہے کہ سلطان شہاب الدین، علاؤالدین جہاں سوز کے بھتیجے کا لشکر تھا۔ سلطان مع مقربین و سپہ سالار کے آن کر آپ سے ملاقی ہوا اور بولا کہ بے سروسامانی میں برائے تبلیغ دین مبین ہندجانا خالی از ملال نہیں۔ فرمایا کہ فقیر کو تائید ایزدی کافی ہے۔ بعد ازاں اپنے فرزند جرار سید ابراہیم کو سلطان کی فوج کے ہمراہ کیا کہ یہ فقیر زادہ استیصال منکران رسالت مآبؐ میں بہرہ اندوز ثواب ہوگا۔ سلطان نے نشان اسلام مع خطاب ملک کے سید ابراہیم کو تفویض کیا اور سرہند پہنچ کر قلعہ ہانسی کی طرف متوجہ ہوئے فتح حاصل کی۔ اس جہاد میں سید ابراہیم مع رفقاء شہید ہوئے، مزار پُر انوار اس نامدار کا قلعہ کے اندر موجود ہے۔ خانقاہ نشانچی کہلاتی ہے۔

یہ واقعہ ۱۱۹۲ء کا تاریخی ہے اور محتاج تحقیق نہیں۔

فتح دہلی کے بعد بہ طلب سلطان شہاب الدین غوری" سید کمال الدین دہلی تشریف لائے۔ بعد ازاں، قصبہ کیتھل میں دوبارہ قیام کیا۔ آپ کی توجہ سے ایک ہزار آدمی مشرف با سلام ہوئے۔ خود ایک جہاد میں شرکت کر کے شہید ہوئے۔ سید موصوف کے ہمشیرزادے خواجہ سبز خط بھی ترمذ سے کیتھل وارد ہوئے۔ قصبہ صوفیائے کرام کا مسکن بنا۔ علاء الدین خلجی کے باب میں فرشتہ سادات کیتھل کا ذکر کرتا ہے۔

سید کمال الدین کے بیٹوں میں سے دو نصیر الدین اور علیم الدین کے اخلاف نے تاریخ میں نام پیدا کیا۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حسام الدین اولاد ان کی کیتھل، فیض آباد اور احمد آباد (گجرات) میں ہے۔

۲۔ رکن الدین اولاد ان کی احمد آباد میں ہے۔

۳۔ عزیز الدین سنبھل کی ایک جنگ میں کام آئے۔ مزار منور ضلع بجنور میں موجود ہے۔

۴۔ ملک سید ابراہیم۔ جنگ ہانسی میں پرتھوی راج چوہان کی فوج سے لڑتے ہوئے قتل ہوئے اور شہید مرد کہلائے ذکر ان کا اوپر آ چکا ہے۔ (یہ جو ہندوستان میں چپے چپے پر گمنام شہید مردوں کی قبریں ہیں جن پر اندھیری راتوں میں عقیدت مند آ کر چراغ جلاتے ہیں یہ وہی غریب الوطن سپاہی ہیں جو آئی

---

[1] امیر حمزہ حضرت زید شہید کی اولاد تھے۔ شمس الدین التمش کے دور میں سرہند پہنچے۔ جیسے شہدی جنگ سوار امیر حمزہ، سالار مسعود وغیرہ ترکوں وسطی کے مسلم عوام کے کلچر ہیرو تھے۔ امیر حمزہ کے بیٹے، روایت ہے کہ بسلسلہ تبلیغ ہند سے "سنگلدیپ" گئے۔ اولاد نے شہر سلطان پور وغیرہ آباد کیا۔

ان گنت جنگوں میں کام آئے۔)

۵۔ نصیر الدین۔ برائے تبلیغ دور دراز ملک بنگالہ کا سفر کیا۔ اولاد سلہٹ اور پورنیہ میں موجود ہے۔ میر قاسم نواب بنگال، میر نصیر الدین ابن سید کمال الدین ترمذی کی نسل مظفری سے تھے۔

۶۔ علیم الدین اول ۱۱۹۴ء میں شہاب الدین غوری نے قنوج فتح کیا۔ علیم الدین اور دوسرے صوفیا قنوج جا پہنچے۔ سلاطین کی پالیسی شروع سے یہ رہی کہ مفتوحہ علاقوں میں سادات اور ترکوں کو آباد کرو۔ سادات کو عموماً قاضی بنایا جاتا تھا۔

ترمذی اور بخاری گوناگوں سادات اب جوق در جوق ہندوستان آنے شروع ہوئے۔ رفتہ رفتہ وہ گاؤں اور قصبوں میں آباد ہونے لگے۔ ہر طرف صوفیا اور فقراء کی ریل پیل تھی۔ میر علیم الدین اول منجانب سلطان عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ مشہور صوفی سید شہاب الدین قنوجی میر علیم الدین کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے اخلاف زیادہ تر ضلع بارہ بنکی (اودھ) میں آباد ہوئے۔

شمس الدین التمش کو بدایوں کا گورنر بنا کر شہاب الدین غوری واپس گیا۔ راہ میں قرامطیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ خاندان غلامان اور خلجیوں کے ادوار میں مزید علما و مشائخ وسط ایشیا اور ایران سے ہندوستان پہنچے۔ ۱۳۹۹ء میں خواجہ جہاں نے سلطنت جونپور کی بنیاد ڈالی۔ کڑا (الہ آباد) اور قنوج اس نئی سلطنت کے صوبے تھے۔ سید علیم الدین کی پانچویں پشت میں سید العارفین، علیم الدین ثانی سرکار جونپور میں پنج ہزاری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سید جلال الدین بخاری اُچہ تشریف لا چکے تھے۔ شاہان تغلق اُن کے مرید تھے۔ یہ ان کے پوتے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا دور تھا۔ سید علیم الدین مخدوم کے خلیفہ مقرر ہوئے۔

"حضرت سید علیم الدین از بزرگان روزگار، در لباس خاکسب سلوک اہل تصرف را بہ پا میداشت۔ اکمل مرید مخدوم جہانیاں بود۔ حضرت شیخ اخی جمشید راجگیری طریقہ مواخات و مصاحبت و محرمیت داشت چنانچہ برائے اظہار اسلام بہ بلانوں (ضلع بارہ بنکی) آمد۔ مخدوم اخی جمشید از اتحاد پاک نہاد۔ بہ بلانوں آمد و بہ موافقت سید بنائے قلعہ انداخت۔" (بحر ذخار)

مزید تفصیلات مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے تذکروں میں ملتی ہیں۔

دلی کے تخت پہ سے تغلق اور خلجی اترے اور لودھی آئے کہ افغان تھے۔ انہوں نے افغانوں کو سلطنت کی مختلف سرحدی چھاؤنیوں میں آباد کیا۔ پندرھویں صدی میں سکندر لودھی کا عہد احیائے علوم کا دور تھا۔ سید علیم الدین ثانی کے پڑپوتے سید صدر الدین نامور عالم تھے۔ سلطان سکندر کے دربار میں تخت شاہی کے دائیں جانب جگہ پاتے تھے۔ فرشتہ نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اولاد میں سید عبدالمقتدر اکبر اعظم کے صدر الصدور اور صاحب نوبت ہوئے۔

اولاد قصبہ پہانی ضلع ہردوئی (اودھ) میں آباد ہے۔

۷۔ سید جلال الدین غازی سید کمال الدین ترمذی کے نامور صاحبزادے اس تذکرہ نویس فقیر حقیر پر تقصیر باجرہ فدویہ کے مورث اعلیٰ ہیں موصوف اس علاقے میں جا کر بسے جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلایا۔ سید جلال الدین کے اخلاف میں سید اشرف گنج بخش، سید احمد، سید محمد، سید محمود اور سید حسن عسکری کا زمانہ پندرھویں صدی ہے۔ سید حسن عسکری کے صاحبزادے سید ضیاء الدین سرکار سنبھل میں چار ہزاری تھے۔ ٹھاٹھ کرتے ہوں گے۔ موصوف کٹھیر راجپوتوں کو قابو میں رکھنے کے لئے قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں تعینات تھے۔
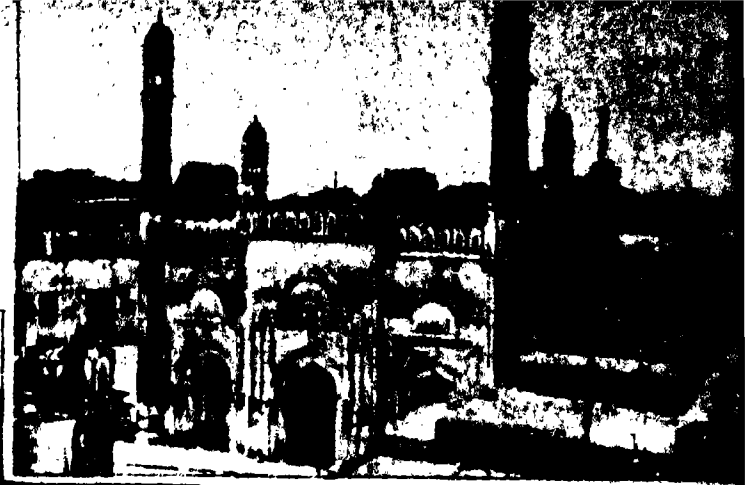
## تصاویر بسلسلہ فصل اوّل

عیدگاہ کا جنگل اور میر حسن ترمذی کا مزار – جو ۱۹۲۱ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

(بحوالہ باب ۹ گاگھی ندی)

مقبرہ مبارز اللہ خاں جہاں امیر خاں کے حملے کے دوران

میر بندے علی ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے۔

(بحوالہ باب ۶ میر خانی گردی)

اخوند امام بخش کی لگائی ہوئی بیکمن – اس کے پس منظر میں جمیل پوڑی اور

میر بندے علی کی مسجد کے مینار نظر آ رہے ہیں۔

(بحوالہ باب ۱۱ خراب کوشک سلطان و خانقاہ فقیر)

حویلی میر بندے علی کے کھنڈر کا ایک حصہ۔ دائیں جانب وہ تہ خانہ

ہے جس کے اندر میر احمد علی روپوش رہے۔

(بحوالہ باب ۱۰ کہاں بیلیتی اور کہاں پائے مور)

سید ضیاءالدین ترمذی کو بغاوت فرو کرنے کے لئے مع لشکر پورب بھیجا گیا جو سلطنت شرقیہ کے المناک خاتمے کے بعد پھر سلطنت دہلی میں شامل ہو چکا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم کے حقیقی ماموں سید کرام حیدر ترمذی اپنے فارسی تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ضیاءالدین فوج لے کر کھیراگڑھ گئے تھے۔ شہید ہوئے اور میر جیا شہید کہلائے۔ خانقاہ مزار جھوسی میں ہے۔ میر جیا شہید کے بعد ان کے بیٹے سید حسن ترمذی کو والد کے منصب پر سرفراز کیا گیا۔ لیکن والد کی موت کے بعد دل اُن کا دنیا سے اچاٹ ہوگیا۔ قصبہ نہٹور میں گاگن ندی کے کنارے حجرہ تعمیر کر کے عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوئے۔

سید جیا شہید کا مزار جھوسی میں ایک پُر فضا ٹیلے پر موجود ہے۔ جھوسی الہ آباد سے چند میل کے فاصلے پر ایک خوش منظر گاؤں ہے۔ پنڈت نہرو کے حلقہ انتخاب تحصیل پھول پور میں شامل تھا۔ کبیرداس کے مرشد شیخ تقی یہاں کے رہنے والے تھے۔ جھوسی کی درگاہ میں متعدد گمنام مزار ہیں۔ عرس ہوتا ہے لیکن اہلِ قریہ اور مجاوروں کو کسی بزرگ کا نام ٹھیک سے معلوم نہیں۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ہم عصر شاہ شعبانؒ کا مزار بھی غالباً یہیں ہے۔ ایک ٹیلے پر قدیم کھنڈر اور قبریں یقیناً عہدِ مغلیہ سے قبل کی ہیں۔ درگاہ کی نشیب میں جمنا بہتی ہے۔ دریا کے کنارے پر بڑی قسم کا درخت بے حد تناور اور انوکھا موجود ہے کہ اس کی مہیب جڑیں ساحل سے لے کر ٹیلے کی درگاہ تک پھیلی ہیں۔ گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ مخدوم جہانیاں اس کا پودا اپنے ساتھ بھکر (سندھ) سے لائے تھے۔ عجیب و غریب درخت ہے نیشنل جیوگرافک میگزین والا دیکھ پاوے تو غش غش کرے۔

جیا شہید کے انتقال کی اطلاع جب سنبھل پہنچی اور میر حسن ان کے بیٹے نے ملازمت سے استعفیٰ دیا اس وقت ان کے لاؤ لشکر میں ایک وفادار تیر گر ایسا تھا جو ان کا ساتھ چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ سابق منصب دار اور غریب تیر گر دونوں سنبھل سے نکلے اور درویشوں کی طرح پا پیادہ نہٹور روانہ ہوئے۔

نہٹور میں اس وقت راجپوت، کائستھ اور بنئے آباد تھے۔ حکومت کی طرف سے پٹھان فوجی قصبے کی حفاظت کے لئے مقرر تھے۔ قاضی امروہے سے بھیجے جاتے تھے۔ (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اضلاع کا انتظام کتنا باقاعدہ تھا۔)

اس وقت قاضی چمن نہٹور میں تعینات تھے۔ سید حسن ترمذی نے قاضی صاحب کی بیٹی سے نکاح پڑھوایا۔ ان کے لڑکے محمد عارف لاولد رہے۔ دوسری شادی زیب النساء بیگم بنت سید احسن کنبھی سے ہوئی۔ ان کی ہزاروں ہزار اولاد سادات نہٹور کہلائی۔

وفادار تیر گر نے بھی شادی کر لی۔ اس کی اولاد نے محلہ تیر گراں بسایا جو آج تک آباد ہے۔

بیشتر سادات نہٹور تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ باقی ماندہ اپنے اجداد کی بنائی ہوئی حویلیوں کے کھنڈروں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد بے سروسامانی کا عموماً وہی عالم ہے جو اُس حجرے کا تھا جو پانچ سو سال قبل سید حسن ترمذی نے دنیائے فانی سے دل برداشتہ ہو کر گاگن کے کنارے عبادتِ الٰہی کی خاطر تعمیر کیا تھا۔

فرات سے جیحوں۔ جیحوں سے جمنا اور گنگا اور گومتی اور گاگن تک کے راستے کچھ کم پُرپیچ اور پُرخطر اور حیرت ناک تھے؟

# باب ۳

## شکنتلا کا دیش

کمایوں اور گڑھوال کے دامن میں جہاں شکارگاہیں تھیں وہاں نیشنل پارک بن گئے۔ ترائی کے شیر جانے کہاں جا چھپے۔ سبزہ زاروں میں ٹریکٹر چل

رہتے ہیں۔ ڈاک بنگلوں میں نامور شکاریوں، مثلاً نے مجو توں، جم کوربٹ، ظفر عمر اور سلطانہ ڈاکو کی داستانوں کی بازگشت ڈوبتی جاتی ہے۔ بجنور میں ڈھاک کے جنگلوں میں چھپے پیر زین العابدین، سید بوڑھا اور دھرم گڑھی کے قصے کھنڈر ہو گئے۔

یہ بجنور ضلع اتر پردیش کے اضلاع میں نسبتاً زیادہ پسماندہ ضلع رہا ہے۔ تذکرہ اس کا ضمناً کبھی اس لئے آیا کہ اُردو بولنے والوں کی تعداد سارے صوبے میں سب سے زیادہ یہاں موجود تھی۔ یا یوں کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن کا وطن تھا۔ مدینہ اخبار یہاں سے نکلتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد یہاں سے جا کر دہلوی کہلائے۔ سر سید نے اس ضلع کی تاریخ لکھی (جو افسوس کہ اس تذکرہ نویس کو دستیاب نہ ہو سکی) اُردو ادب کے چند طلبا کو یہ بھی یاد رہا کہ یہ قائم چاندپوری، شمس العلما تاجور نجیب آبادی اور سید سجاد حیدر یلدرم اور حافظ محمد ابراہیم کا وطن تھا۔

اردو تذکروں میں ایسے علاقوں کو 'مردم خیز' کہا جاتا ہے۔ ہندوستان جنت نشان میں تاریخ کی اس قدر افراط ہے۔ کتنے لاتعداد افسانے اس ایک گمنام اور غیر اہم ضلع کے قصبوں اور گلی کوچوں میں پوشیدہ ہیں۔ اگر چشم بصیرت ہو تو ہر واقعہ سراسر حیرت و تنبیہہ غافلین ہے۔

بوڑھے وکٹورین انگریزوں نے منش مورخین کی جگہ سنبھالی، ایک ایک قریے و شہر کی تاریخ مرتب کی، لوک کتھاؤں اور مستند دستاویزوں کا مطالعہ کیا۔ فارسی کتابیں ترجمہ کیں۔ نئی کتابیں لکھیں جن میں سے بیشتر اب قومی کتب خانوں کے گوداموں میں دیمک کی منتظر ہیں۔

جاننا چاہیے کہ ملاذ بجنور مطابق روایات قدیم کے راجہ بین نے آباد کیا۔ جو ایک چکرورتی فرمانروا تھا۔ اس سے منسوب گڑھیوں کی ٹھیکریاں بجنور، مراد آباد، بدایوں اور دور دراز چمپارن اور شاہ آباد میں پائی گئی ہیں۔ موصوف غالباً راجہ رام چندر والی ایودھیا کا ہمعصر اور نسلاً آدی واسی تھا۔ چنانچہ آریہ تسلط کے بعد برہمنوں نے اس کے خلاف کافی کچھ لکھا۔ وشنو پران میں آیا ہے کہ وہ برہمنوں کا دشمن تھا۔ لہٰذا رشیوں نے اسے ہلاک کیا۔

یہ امر حیرت افزا و عبرت ناک ہے کہ عہد عتیق کے ان آدی واسیوں کی اولاد آج تک نیچی جاتیوں میں شامل ہے۔ اور اتر پردیش کے مغربی اضلاع میں اہیر، بانس پھوڑ اور جنگلی قبائل ہی ملیچھ کہلاتے ہیں،

بجنور کے پچھم میں گنگا بہتی ہے، اُتر میں چنڈی کی پہاڑی ہے جس کے اوپر چنڈی کا بیحد قدیم مندر موجود ہے۔ اس سر سبز علاقے میں جھیلوں اور ندیوں کی فراوانی ہے۔ اتر کی پہاڑیوں میں سے متعدد ندیاں نکلتی ہیں، جن میں سے ایک کا نام گاگن اور ایک کا مالن ہے۔ گاگن کا ذکر پچھلے باب میں آ چکا ہے۔ مالن یا مالنی کو اکثر کتابوں میں مالتی بھی کہا گیا ہے۔ جیسا جو مہابھارت[1] کا قدیم ترین اور اصل نام ہے اس میں لکھا ہے کہ رشی وشوامتر اور کنوار رشی انھوں نے شکنتلا کی پرورش کی اسکے آشرم ہمالیہ کی ترائی میں تھے کہنے والے کہتے ہیں کہ اسی مالن کے کنارے جہاں آج قصبہ منڈاور ہے کنوار رشی کا آشرم تھا۔

مہابھارت میں لکھا ہے کہ مہا پراکرمی راجہ دشینت ایک روز بغرض شکار بن میں گیا۔ پشو پنچھی گنجار رہے تھے۔ سروروں میں کنول کھلے تھے اور رشیوں کی کٹیوں پر بن لتائیں راجہ تپوبن کی شوبھا دیکھتا جاتا تھا کہ آگے جا کر ایک آشرم مالینی ندی کے کنارے دکھلائی پڑا۔ چاروں اور گنجان برکش۔ اگن کنڈ میں اگنی جل رہی، طوطے مینا کبوتر ترمرلی، کوکل چکور کلول کر رہے، ڈالیوں سے پھولوں کی برکھا ہو رہی تھی۔ ایک رشی اگن کنڈ میں آہوتی دے

---

[1] سنسکرت میں دیاس اڈیٹر یا مرتب کو کہتے ہیں۔ متعدد دیاس صدیوں تک مہابھارت کی حکایات جمع کر کے مرتب کرتے رہے۔ ان دیاسوں میں سے ایک کا نام کرشن دوے پائن تھا کہ کسی دریائی جزیرے کے باشندے تھے۔ دیاس کسی ایک مصنف کا نام نہیں۔

رہے تھے اور آگے ایک آشرم رہنگ دیکھا گنگا کے آسن نیچے ایک پرم سندری کنیا تپسوی روپ دھارے ۔

یہ خلوص زدہ بے رنگ و بو منڈ اور اس اسطوری شکنتلا کی جنم بھومی تھی ؟

اسپرائیں اور وہ نورانی شکلوں والے رشی جن کی تصویریں بنگال اسکول کے رومان پرست مصوروں نے کلکتے میں بنائیں، اب بمبئی اور مدراس کے فلمی نگار خانوں میں سیلولائیڈ کے پھولوں کے درمیان ناچتے ہیں۔ اپسرائیں پلاسٹر آف پیرس کی بھدی مورتیوں میں تبدیل ہوئیں اور کیلنڈروں اور فلمی پوسٹروں کی خوبصورتی انہوں نے بڑھائی ۔

گنگشان عہد میں منڈاور نارنجی لباس والے بھکشوؤں کے ادم منی پدمے ہوں سے گونجا ۔ مندر بھی میں ستوپ تعمیر ہوئے ۔ منڈاور بھی آج تحصیل نجیب آباد کا ایک معمولی قصبہ ہے ۔

بسبب نیرنگی زمانہ صدیوں بعد دلی کے اُن دالوں سے کہ اس علاقے کے حاکم تھے، سلطان قطب الدین ایبک نے منڈاور بزور شمشیر حاصل کیا ۔ اور ایک مسجد تعمیر کروائی ۔ بجنور کو صوبہ بدایوں میں شامل کیا گیا ۔

تورانی دستور حکومت کے مطابق ایبک نے اپنے ایک غلام شمس الدین کو کہ داماد بھی تھا ۔ حاکم بدایوں مقرر فرمایا ۔ یہ ترک فرمانروا شب و روز دیکھتے تھے کہ حشران کے بھائی بندوں کا توران و ایران میں ان کے غلامان، موتا بیگان کے ہاتھوں کیا ہو رہا ہے ۔ مگران کی سمجھ میں سہ ہرگز نہ آتا تھا ۔

اہل اسلام کے ورودِ مسعود کے وقت زیادہ تر کٹیہر راجپوت بجنور میں آباد تھے ۔ اس جہت سے یہ خطہ کٹیہر کہلایا ۔ علاوہ ان کے باہمن بنئے ——— اور نیچ نسبی یہاں بستے تھے ۔ کٹیہر کو دلی اور بدایوں کے صوبجات میں تقسیم کیا گیا ۔ راجپوت سردار حکومت دہلی سے ہمیشہ باغی رہے ۔

۱۳۰۰ء میں لشکرِ مغول کے سپہ سالار علی بیگ گورگان نے بجنور پر دھاوا کیا ۔ امروہے کے نزدیک ملک کافور خواجہ سرا مستعد جنگ ہوئے ۔ تاتاریوں نے شکست کھائی ۔ لیکن ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور دلی پر قبضہ کر کے سمت بجنور بڑھے ۔ سطح گنگا پر دہلوی سپاہ کی کشتیاں نمودار ہوئیں ۔ مغول نے سب کو موت کے گھاٹ اتارا ۔

ناظرین! بالکیمیا یہ تاتاری ماسکو پر شب خون مارنے کے ارادے سے نکلے تھے ۔ راہ میں امیر نے سوچا اب روس کون جاتا پھرے بجنور آ پہنچے عجیب لوگ تھے ۔

چنڈی کے جنگلوں پر یلغار کر کے مغول نے ملک شیخا اور دوسرے مقامی سرداروں کو تہ تیغ کیا، ہردوار تک کہ اہل ہنود کی نامی زیارت گاہ ہے ۔ خون کے دریا بہہ گئے ، بالآخر جنگلوں کی اس بے سود جنگ سے اکتا کر امیر تیمور صاحب قران واپس چلا گیا ۔ ہم یقیناً اس کے اس اقدام پر معترض نہیں ۔

ازبسکہ سلاطین دہلی کی سیاست اور جنگیں حد درجہ پیچیدہ تھیں، یہ خطہ خصوصاً سنبھل وقتاً فوقتاً میدان کارزار بنا کیا ۔ کٹیہر سردار راسے ہرسنگھ لودھیوں کے خلاف مستقل شوریدہ سری کرتا تھا ۔ علاقہ کٹھیار، رام گنگا کے اس پار تھا ۔ بجنور مرکزی حکومت دہلی سے وابستہ رہا ۔ صدر مقام اس صوبے کا سنبھل تھا ۔ سلطان حسین شرقی والی جونپور نے مبارک خاں حاکم سنبھل کو شکست دے کر صوبہ اپنی سلطنت میں شامل کیا ۔ شاہ حسین کی المناک تباہی و بربادی کے بعد سنبھل ایک بار پھر دہلی سے وابستہ ہو گیا ۔

۱۴۹۳ء کا واقعہ ہے کہ کٹھیر راجپوتوں کی بغاوت فرو کرنے کے سلسلے میں سکندر لودھی بنفس نفیس سنبھل آیا اور چار سال یہاں مقیم رہ کر محفل مجالس چوگان اور سیر و شکار سے دل بہلاتا رہا۔ تذکرہ اس جلیل القدر حکمران کا سلسلہ مولانا علیم الدین ترمذی پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔

مغلیہ سلطنت میں بادِ مخالف چلی، بابر بادشاہ تخت نشین ہوا کہ آلِ تیمور تھا۔ یہ نئے مغل فرغنہ اور جیحوں کی تازہ ہوائیں ساتھ لائے۔ انھیں دیکھ کر بلخ و بخارا ترمذ و بدخشاں زرفشاں و سیحوں و جوئے مولیاں کی یاد تازہ ہوئی، اونچے چرمی جوتے پہنے، کج کلاہ، اولوالعزم تعلیم یافتہ، بڑی شاندار بانکی قوم تھی۔

جب بابر آگرے پہنچا ہے، ہمارا علاقہ روہیل کھنڈ کہلانے لگا تھا۔ کس واسطے کہ روہیلوں نے یہاں اپنے بھائی بند افاغنہ جا بجا فوجی چھاؤنیوں میں آباد کر دیئے تھے۔ ہر قوم کا دستور ہے کہ اقربا پروری کرتی ہے۔

یہ روہیلے مثل غضبناک شیروں کے تھے۔ نصیر الدین ہمایوں بادشاہ ان کا زور کم نہ کر سکا۔ ۱۵۲۹ء میں ہیبت خان نیازی اور دوسرے افغانوں نے مغل افواج کو مار بھگا اودھ و روہیل کھنڈ سے نکال کر شیر خاں سوری پٹھان کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔

کٹھیر راجپوت اور روہیلے خان دونوں ایک سے ایک لڑاکے۔ ایک دوسرے سے اور مرکزی حکومت کے حاکموں سے جھڑپیں ہوتیں۔ بعد ازاں ترائی کے جنگلوں میں جا چھپتے۔ جب شیر شاہ بادشاہ ہوا اس کے فرمان کے بموجب متعدد جنگل کاٹ ڈالے گئے۔ اس عاقل و دانا حکمران نے انتظام صوبہ کیا۔ بعد اسلام خاں سوری پھر خرابی شروع ہوئی۔

ہمایوں واپس آیا، آلِ چغتائی کا نیرِ اعظم اوجِ شرف پر طالع ہوا۔ ہمایوں نے بجنور مرزا عسکری اور بعد میں خان خاناں بیرم خاں کو عنایت کیا۔

الغ مرزا نے ہمایوں سے بغاوت کی تھی (الغ بزبان ترکی بڑے کو کہتے ہیں) فرخ دل اکبر بادشاہ نے الغ مرزا کے دونوں فرزندان سکندر و محمود کو بجنور میں جاگیریں عطا کیں۔ جس وقت اکبر پنجاب میں اپنے باغی بھائی مرزا حکیم سے برسرِ پیکار تھا۔ محمود سلطان کے لڑکوں ابراہیم حسین و محمد حسین نے بجنور میں علمِ بغاوت بلند کیا۔ مغل صوبیدار حسین خاں ٹکریہ نے دونوں کی بخوبی خبر لی۔ طرفین سے تلوار چلی بمقصد صوبہ پنجاب فرار ہوئے۔

خبر پڑی کہ جونپور کے عرب بہادر نے بجنور پر دھاوا کیا، حاکم سنبھل حکیم عین الملک نے فوج ظفر موج روانہ کر کے حملہ آور کا مقابلہ کیا۔ عرب بہادر کمایوں کی پہاڑیوں میں روپوش ہوا۔ بعد ازاں قصبہ نہٹور کے پڑوس میں شیر کوٹ کے نزدیک قتل کیا گیا۔

خلاصہ ان تمام صدیوں میں کہ یورشِ تاتار و شورشِ افاغنہ و چغتہ سے معمور ہیں، سید حسن ترمذی کی اولاد قصبہ نہٹور میں آباد زمانہ کے مدوجزر دیکھا کی۔ سید حسن پندرھویں صدی میں سنبھل کے منصب سہ ہزاری سے دستبردار ہو کر کنارِ گاگن حجرے میں معتکف ہوئے تھے۔ اولاد ان کی کاشتکاری درس و تدریس میں مشغول ہوئی۔ کچے پکے مکانات تعمیر کئے۔ محلے مسجدیں اور مکتب آباد ہوئے۔ عزیز و اقارب سارے دوآبے میں اور یک جدی سلسلے بہار و بنگال تک پھیلے تھے۔ تمام خانوادہ تاجک فارسی اور ترکی بولنا بھولا۔ اب برج اور پنجابی اور جاٹو اور، اودھی اور پوربی اور جانے کیا کیا نظم ترکی فارسی عربی کے ساتھ ملا جلا کر بولتے ہیں، زبان کیا ہے چوں چوں کا مربہ کہئے۔

سموری ٹوپیاں، اونی فرغل اور قبائیں بغچوں میں رکھے رکھے کیڑوں کی نذر ہوئیں۔ جو رشتے دار صاحب ثروت ہیں سو غلتیں زیب تن کرتے ہیں، نادار موٹا جھوٹا، گزی گاڑھا پہن کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ خاندان بہرحال مثل ایک محفوظ قلعے کے ہے۔ سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ رات کو بھوکا کوئی نہیں سوتا۔

بیبیاں جو ایران و توران میں شہسواری کرتی تھیں اب اس قلعے میں محصور ہوئیں کہ اجنبی ملک میں چہار سو خطرہ ہی خطرہ تھا۔ کلاہ ترک کی، ململ کے دوپٹے اوڑھے۔ ہندو سناروں سے ہندوستانی زیورات گڑھوائے۔ اپنے آذربائیجانی آویزے اِن طباع کاریگروں سے نقل کروائے کہ اب جھمکے کہلاتے ہیں۔ شادیوں میں بجائے دف کے ڈھولک بجتی ہے۔

مرد جو اہلِ سیف ہیں راجپوت وضع کی پگڑی باندھتے ہیں۔

اہلِ قلم عمامے زیبِ فرق کرتے ہیں کہ شملہ ان کا بقدرِ علم رکھا جاتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں امرائے تاتار و خوانین کا شغر و سیاہ مغول کی دیکھا دیکھی شرفائے دلی و نواح پایۂ تخت چینی وضع کی چوٹیاں گوندھنے لگے تھے۔ اب عہدِ مغلیہ میں ترکستان و روم و ایران کے نئے نئے رواج مقبول خواص و عوام ہیں۔

عہدِ علاؤالدین خلجی سے رسومِ عروسی میں اہلِ ہنود کے طور طریقوں کی نقل کی جا رہی ہے۔ مولویوں نے بہتیرا منع کیا کہ بدعت ہے مگر بیبیاں نہیں مانتیں۔ ٹونے ٹوٹکے، نیک و بدشگون، شبِ برات کا حلوہ، فاتحہ، آتش بازی کہ سلطان فیروز شاہ کے دور سے مروج ہوئی، بجری، گھڑیاں، رتال، نذر نیاز، چراغی غرضیکہ شہر تہذیب کا کوئی باقیماندہ رشتے دار اگر نہٹور آنکلے تو ریش پر ہاتھ پھیر کر کہے۔ بابا۔ یہ شیخ سدو کی نیاز کیا شے ہے؟

خاندانی بھاٹ شادیوں پر شجرہ نسب سناتا ہے۔

عہدِ اکبری میں انتظام صوبجات و اضلاع از سرِ نو کیا گیا۔ بجنور پندرہ پرگنوں میں تقسیم ہوا۔ ساداتِ ترمذی کو جاگیر عطا ہوئی۔

ہندو زمیندار چودھری کہلائے۔

جلال الدین محمد اکبر کا دور خوشحالی سے معمور تھا۔ شکر اور گیہوں کی کاشت سہ چند ہوئی۔ اہلِ حرفہ کا کاروبار بڑھا۔ نہٹور خود کفیل قصبہ تھا۔ دارالسلطنت سے فاصلے کی وجہ سے قصبہ جات سیاسی انتشار سے نسبتاً محفوظ رہتے تھے۔ اس جہت سے دوآبہ، بہار، بنگال، پنجاب، سندھ، دکن گجرات وغیرہ کے قصبے اپنے مدارس و خانقاہوں کے لئے مشہور ہوئے۔ مردم خیز کہلائے۔

اہالیانِ نہٹور اپنے قصبہ کو چھوٹا دہلی کہتے تھے۔ آئینِ اکبری میں علامہ ابوالفضل فرماتے ہیں کہ علاقہ کے جاگیر دار جنگ کے مواقع پر سپہ سالار عسکرِ مغلیہ کو پچھتر اسی شہسوار اور پانچ ہزار چار سو پیادے فراہم کرتے ہیں۔ جزاک اللہ۔

ساداتِ ترمذی "دانشمندانِ نہٹور" کہلاتے تھے۔ سید حسن ترمذی کے آبا و اجداد میں سید اشرف "گنج بخش" کے لقب سے مشہور تھے۔ صاحبزادے ان کے سید علی "گھوڑا بخش" کیا وجہ کہ سفر پہ جاتے تھے۔ راہ میں گدڑی پوش مسافر ملا کہ سردی میں ٹھٹھر رہا تھا اور پیدل جاتا تھا۔ اس نے پوشاک طلب کی۔ جامہ دیا۔ مزید فرمائش پر بٹوہ اشرفیوں کا حوالے کیا۔ اسلحہ جات بخشے، اس پر بھی وہ طالب رہا۔ بالآخر اپنا سمندِ شب رنگ عنایت کیا اور پا پیادہ نہٹور واپس آئے۔

ان کے اخلاف سید محمد تقی، عبدالمطلب، بہادر علی، قادر علی، نادر علی، انور علی، منور علی اور حضرت آخوند امام بخش کہ صاحبِ کشف بزرگ بھی تھے۔ چوغوں والے داریشوں ٹوپیوں، گھیردار جاموں و دیگر پارچہ ہائے نفیس در طرحدار میں ملبوس اس نوع کے یک رخی کردار ہیں جو مغل تصاویر میں بادشاہ

---

۱۵ امپیریل گزیٹیر

کے سامنے دورویہ ڈھال تلوار لگائے دوزانوں بیٹھے نظر آتے ہیں، سبحان اللہ تہذیب مغلیہ کی ہمہ گیری کا کیا عالم تھا کہ ایرانی، تورانی، ازبک، ترکمان، خوارزمی، راجپوت، مرہٹے، سکھ، افغان اور سادات عظام سب شکل صورت سج دھج وضع قطع اور ملبوسات سے قطعاً یکساں معلوم ہوتے ہیں۔
صد حیف کہ چرخ کج رفتار کو یہ دورِ پُربہار ہرگز نہ بھایا اور ادبار و خانہ ویرانی نے اہلِ ہند ــــــ

# باب ۴

## وقائع عالمگیری

حضرات دورِ تیموریہ عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔ آیئے عصا ٹیکے کمر خمیدہ عالمگیر شاہی امیر سے ملاقات کرتے چلیں پھر نہ محی الدین علیہ الرحمۃ ہوں گے نہ ان کے ارکین سلطنت محض افسانے باقی رہ جائیں گے۔

شاہان دہلی بیوقوف ہرگز نہ تھے۔ سادات کی قدر کرتے تھے مگر ان کی بستیاں ہمیشہ دار السلطنت سے سو میل سے زیادہ فاصلے پر آباد کرواتے تھے۔ مبادا یہ حضرات جو تیرہ سو برس سے خود کو حکومت کا حقدار سمجھتے آئے ہیں کہیں موقع پاتے ہی تاج و تخت پر قابض ہو جائیں چنانچہ دلی کے قرب و جوار سیدوں کے گاؤں یا قصبے ناپید ہیں۔ (جان سٹھ ضلع مظفر نگر پایۂ تخت کے نزدیک ہے۔ ذرا توقف کیجئے اور دیکھیے کہ دو بھائی بہت جلد اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھ بند ہوتے ہی کیا آفت جوتنے والے ہیں)

البتہ دلی کے قریبی اضلاع خصوصاً سرکار سنبھل کے متعدد سیدوں نے حکومت میں کافی رسوخ حاصل کیا ان صاحبان میں سے سید کمال الدین ترمذی کے اخلاف سید علیم الدین پنج ہزاری، سید ضیاء الدین چہار ہزاری عرف جیا شہید، سید حسن ترمذی سہ ہزاری نواب سید صدر الدین، نواب سید عبدالغفار، نواب سید عبدالمقتدر، مفتی صدر جہاں، سید عبدالنبی (صدر الصدور عہد بعہد اکبر و جہانگیر)، نواب نظام الدین، مرتضےٰ خاں، نواب میر قاسم ناظم بنگال وغیرہ کا تذکرہ سرسری آئندہ کیا جائے گا۔

اٹھارھویں صدی تک نہٹور ایک شالی خود کفیل قصبہ تھا۔ چند ہزار نفوس کی اس صاف ستھری آبادی کے چھوٹے چھوٹے محلے ایک دوسرے سے ملحق مکینوں کے نسبی یا پیشہ ورانہ ناموں سے موسوم تھے، محلہ سادات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے نزدیک محلہ قاضیاں میں میر حسن ترمذی کے ہمعصر قاضی چمن (دیکھیے باب ۲ "بیحوں سے جمنا") کی اولاد رہتی تھی[1] میر حسن ترمذی کے مکان کے سامنے ان کے وفادار تیرگر کی اولاد کے گھر تھے۔ (محلہ تیر گراں کے باسی اب آتشبازی کا سامان بناتے ہیں) آس پاس محلہ حکیماں، شیخاں، خواجگان، میاں صاحبان وغیرہ آباد تھے۔ ان کے بعد محلہ کلالاں، انصاریاں، ماہی گیراں (جو بستی کے دوسرے تالاب کے آس پار جھونپڑوں میں رہتے تھے) ہندو آبادی علیحدہ نہیں تھی مسلمان محلوں سے ملحق محلہ بھوجی کھاتان خانہ و بجبیڑ ین[2] جینیوں کی آبادی تھی۔ پھر محلہ کائستھان محلہ بقالاں، محلہ چودھریاں۔ ہر مسلمان محلے کی اپنی مسجد تھی، ہندو محلوں میں مہادیو جی اور ہنومان جی کے مندر تھے، عہد مغلیہ کی ہندو مسلم مفاہمت

---

[1] آج ۱۹۷۳ء میں قاضی چمن کی اولاد میر حسن ترمذی کے مکان کے نزدیک اپنے آبائی مکانوں میں اسی طرح آباد ہے۔ (ق، ح)
[2] ضلع بجنور جین مت کے پیروؤں کا بڑا مستقر ہے۔

کی ایک روشن مثال ہے[1]۔

فیوڈل نظام اور ہندو کاسٹ سسٹم کے زیر اثر جولاہوں اور کلاوں کو نچلا طبقہ سمجھا جاتا تھا۔ کلاوں کا قول تھا کہ ان کے جدِ اعلیٰ میر کلاں امیر تیمور کے لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ امیر تیمور کے لشکر کے بچے کھچے لوگ یعنی ترم کے خوں کے افراد بھی بجنور خصوصاً قصبہ نہٹور میں موجود تھے، انصاریان شیخان و قریشی صاحبان نورباف اور قصائی تھے۔ خود کو عربی نژاد کہتے تھے۔ اس معاشرے میں حکمران طبقے کا ہر فرد خود کو ولایتی گردانتا تھا۔ اسی طرح انگریزی دور میں وہ ہندوستانی جنہوں نے حاکموں کا مذہب اختیار کر لیا تھا عموماً اپنا رشتہ انگلستان سے جوڑتے تھے ہمارے معاشرے کے انصاری قریشی صاحبان وغیرہ بھی گویا اس وقت کے اینگلو انڈین تھے۔ نالس ولایتی آبادی سادات مغلوں اور افغانوں پر مشتمل تھی[2]۔

وسط سترھویں صدی کا قصہ ہے کہ محلہ سادات کی خوش منظر جھیل جو جوڑی کہلاتی ہے اس کے کنارے میر حسن ترمذی کے پڑپوتے سید محمد تقی کا مکان تھا، اس کے عقب میں بانس کے گھنے جھرمٹ تھے جہاں سید محمد تقی نے مسافروں کے لیے سرائے تعمیر کروائی تھی۔ سرائے کا رُخ بیرونی شاہراہ کی جانب تھا جو سیدھی دلی جاتی تھی۔ جھیل بھی سید محمد تقی کی ملکیت تھی۔

سید محمد تقی کے بیٹے کا نام سید عبدالمطلب تھا۔ سید عبدالمطلب کے دو لڑکے تھے سید بہادر علی اور سید سعد اللہ۔ مؤخر الذکر ایک نہایت ذہین اور مہم جو نوجوان تھے۔ دونوں لڑکے میر حسن ترمذی کے قائم کردہ مدرسے میں پڑھ رہے تھے۔ انہی دنوں قصبے کے چند زورآور کلال سید محمد تقی کی جھیل پر قابض ہو گئے اور اس کے کنارے اینٹوں کا بھٹہ قائم کر لیا۔

"فتنہ کلالاں" کی وجہ سے سید عبدالمطلب کو بہت پریشان ہونا پڑا۔ سرکار سنبھل کے قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش کیا۔ جب وہاں خاطر خواہ فیصلہ نہ ہوا تو فرزند اصغر سید سعد اللہ کو مقدمے کے کاغذات دے کر دارالخلافہ روانہ کیا۔

چند سال بعد مقدمہ کا فیصلہ سید عبدالمطلب کے حق میں ہوا۔

فرمان شاہی[3]

ظل اللہ

.... تالاب و زمین حویلی متصل سرائے سیادت و مغفرت مآب سید محمد تقی .... تالاب عظام واقعہ است۔
دراں تالاب کلالاں پژواہ پامی پژایند۔ بعد از مدت چند ایں تالاب مذکور بقدر یک بیگہ پختہ از خاکستر پر شدہ

---

[1] یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نہٹور میں آج تک ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔

[2] نہٹور کا یہ عمرانی نظام ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ آج ۱۹۷۳ء میں بھی سوائے محلہ سادات کے جس کے بیشتر افراد پاکستان ہجرت کر چکے ہیں۔ نہٹور کے مسلمان محلوں کی آبادی کم و بیش اسی طرح موجود ہے۔ سادات ترمذی کے قدیم مکانات اور حویلیاں جو متروکہ جائداد قرار پائیں اب نئے متمول انصاری صاحبان نے خرید لی ہیں۔ یو۔ پی میں جاگیری دور ختم ہوا گھریلو صنعتوں کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے یہ نئے خوشحال مسلم ورکنگ کلاس اور اہل حرفہ کا زمانہ ہے۔ (ق ح)

[3] اس باب میں شامل دستاویزات مصنفہ نے اوریجنل فرامین اور محضر ناموں وغیرہ سے خود نقل کی ہیں۔ بشکریہ سید شمیم حسین زیدی۔

تودہ ہائے کلاں . . . و در یکیت ہیچ کس نبودہ لہٰذا بتصدق فرق مبارک بندگان حضرت بادشاہ و نواب صاحب قبلہ . . . . . بموجب استدعائے سیادت مآب سید عبدالمطلب ولد سید محمد تقی مذکور بجہت تعمیر حویلی مقرر کردہ چیمرہ داوہ شد کہ بخاطر جمع تودہ ہائے مذکور را از نشیب و فراز برابر ساختہ حویلی تعمیر نمودہ مسکن خود سازند و ہمیشہ در دعاگوئے ابد مدت اشتغال . . . . .

تحریر فی التاریخ محرم الحرام سنہ ۱۰۹۴ھ
بموجب فرمان شاہی برائے آگاہی . . .

مہر بھگوان جیت
مان سنگھ

اس کے بعد ہی اچانک ملاقات سید سعداللہ عامل مالوہ سے ہوتی ہے کہ مع بی بی و فرزند ماندو میں مقیم مالوہ اور بندیل کھنڈ کی بغاوت فرو کرنے کے انتظامات میں مصروف ہیں۔

سید سعداللہ کی بی بی نے مالوے میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایک خورد سال فرزند چھوڑا کہ نام اس کا سید شریف علی تھا۔ بعد کچھ عرصے کے سید موصوف نے فکر دوسری شادی کی۔ گوالیار میں تعینات تھے اسی زمانے میں وہاں ایک بزرگ سید امام علی شاہ باقری بغداد سے تشریف لائے ان کی لڑکی سیدہ زہرا بانو سے باجازت اورنگ زیب عالمگیر عقد کیا۔ جب فرزند تولد ہوا حسب قاعدہ مروجہ ولادت کی اطلاع بادشاہ کے حضور میں بھیجی۔ بادشاہ نے نام اسداللہ تجویز کیا۔ "نامش اسداللہ باید نماد چراکہ پدرش سعداللہ ہست"[1]۔

سنہ ۱۶۸۱ء میں جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر مع خاندان امرائے دربار و افواج دکن کی مہم پر روانہ ہوا سید سعداللہ ہمراہ تھے۔ "سید سعداللہ در عہد سلطنت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی نوراللہ مرقدہ . . . . بملک دکن ہمراہ افواج تشریف بردہ و رفتوحات متواتر حصہ کثیر فراہم آوردہ"۔

سنہ ۱۷۰۷ء ۳ مارچ کی صبح اورنگ زیب نے احمد نگر میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ شاہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ سید سعداللہ نے شہزادہ کام بخش کے تحت کام کیا تھا۔ وفات اورنگ زیب کا صدمہ کم جان لیوا تھا حیدرآباد کے نزدیک کام بخش کی المناک موت نے وفادار نواب کو مزید دل گرفتہ کیا۔ سلطنت میں انتشار شدید پھیل چکا تھا۔ سید سعداللہ دلی واپس آئے۔ بعد کچھ عرصے کے وطن مراجعت کی۔

"سید سعداللہ بیشتر سامان ریاست فراہم آوردہ مثل خرید جائداد و تعمیرات پختہ چاہ . . . ممکن بود مہیا کردند و برکنارہ "تالاب کہ یکیت شاں بود چاہ و مسجد تعمیر برکنانیدند"۔

بعد وفات اورنگ زیب شہزادہ معظم بہادر شاہ اول اور شاہ عالم اول کے القاب کے ساتھ سنہ ۱۷۰۷ء میں تخت نشین ہوا۔ سید سعداللہ کے فرزند اکبر مولینا شریف علی اس کے عہد میں صوبیدار تھے۔ بنارس اور لکھنؤ میں تعینات رہے۔

بہادر شاہ اول نے سنہ ۱۷۱۲ء میں وفات پائی۔ اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی۔ سب مارے گئے۔ بھتیجا فرخ سیر اورنگ نشین ہوا۔ دلی میں اب سادات بارہہ کا تسلط تام تھا۔

---

[1] تذکرہ سادات نہٹور از سید عابد حسین مرحوم

نواب سید سعد اللہ نہٹور کے محل میں مقیم اور الٰہی میں دن گذار رہے۔ اکثر اپنے بھائی سید بہادر علی بھتیجوں اور دوسرے عزیزوں کو دکن کی مہم کے قصے سنایا کرتے جو ہر بیٹا ترہ و نور تن کی پرانی عادت ہے۔ عالمگیر کا تذکرہ کرتے تو طویل ریش آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ آہ سرد بھر کے فرماتے "زندہ پیر جنتی تھا، مرد مومن تھا"۔

کبھی کبھار خاص درباروں اور اہم تقریبات کے مواقع پر توشے سے اپنا درباری لباس و خلعت نکال کر زیب تن کرتے۔ تلوار مرصع سجا کر دلی جاتے۔ وہاں اب آئے دن خون خرابہ ہو رہا تھا۔ سید موصوف پرانے ساتھیوں امرائے عالمگیری ساتھیوں سے مل کر حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے۔ ان سب کی آنکھوں کے سامنے دولت چغتائیہ کے تار و پود بکھر رہے تھے مگر یہ بوڑھے شیر بے بس تھے۔

فرخ سیر نے سید سعد اللہ کو پرانی خدمات کے صلے میں مزید اراضی عطا کیں:

فرمان شاہی

عاملان حال و استقبال پرگنہ نہٹور سرکار سنبھل مضاف صوبہ دار الخلافہ شاہجہان آباد عمال جاگیر بدانند ۔ ۔ ۔ جہت احداث باغیچہ بسیادت و رفعت پناہ سید سعد اللہ متوطن نہٹور، پرگنہ مذکور مرحمت نمودہ شد۔

۵ سنہ جلوس والا[1]

مہر بیرم خاں

بیرم خاں فدوی محمد فرخ سیر بادشاہ غازی

سید سعد اللہ نے مسافروں کے آرام کے لیے نہٹور میں باغات لگوائے جو آج تک ان کی اولاد کی ملکیت ہیں:-

محضر نامہ سید سعد اللہ خاں

۔ ۔ ۔ اراضی در سواد قصبہ پرگنہ نہٹور بالائے گاگن سر راہ از مدنی خارج ۔ ۔ ۔ ۔ افتادہ بود ۔ ۔ ۔ جہت آرام خلق اللہ درآنجا باغیچہ برپا ساختہ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ مسافران راہ و فقرائے باب اللہ میوہ و سایہ آں ۔ ۔ ۔ ۔

مہر سید سعد اللہ

مہر کردہ محمد فاضل ابن قاضی نور محمد خادم شرع محمد

فرخ سیر ۱۷۱۹ء میں قتل کیا گیا۔ اس کی زندگی ہی میں سید سعد اللہ اپنا وصیت نامہ لکھ کر اسے پیش کر چکے تھے۔ سید موصوف کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر حسب ذیل ہے:-

قسمت نامہ بمہر سیادت و رفعت پناہ میر سعد اللہ

اقرار میکند معتبر و صحیح و شرعی سید سعد اللہ ولد سید عبد المطلب بن سید محمد تقی متوطن قصبہ پرگنہ نہٹور سرکار سنبھل بہ ایں وجہ کہ چوں ۔ ۔ ۔ ۔ چہار پسر دارم سید شریف علی پسر کلاں از یک بطن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درمیان خود ہا قسمت کردہ گرفتند ۔ برحیات مستعار دنیا کے ناپائیدار بنائے اعتبار نیست بردر حالہ حیات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضور برادراں و اقرباؤ و جماعۃ مسلمین

---

[1] مطابق ۱۷۱۸ء

بدست خود نوشتہ دادم کہ من بعد در فرزندانِ من خصومت و فتنہ نشود . . . . . بنا برآں این چند کلمہ بطریق قسمت نامہ نوشتہ دادہ ام کہ ثانی الحجت گردد۔ مرقوم صفر . . . . . وفات اورنگ زیب . . . . . سید سعد اللہ از حضور بادشاہ غازی سلطان محمد فرخ سیر نور اللہ . . . . .

بوقت رحلت قسمت نامہ نواب سعد اللہ نے مہر قاضی ابراہیم حسین فرزند اکبر مولوی شریف علی کی تحویل میں دیا۔ اس کے مطابق مولوی شریف علی[1] کو دو حصے اور دوسری بی بی سید زہرا و بانو باقری کے لڑکوں کو ایک ایک حصہ جائداد کا ترکے میں ملا قسمت نامے پر سن ۱۱۳۲ھ صاف پڑھا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید سعد اللہ نے لمبی عمر پائی۔ نواب موصوف نہٹور سے ایک میل کے فاصلے پر اپنی جاگیر سکندر پور میں سپرد خاک کئے گئے۔ مدفن آج تک بڑے سید کا مزار کہلاتا ہے۔

مولینا شریف علی سو برس ابن سید سعد اللہ کا انتقال بھی نہٹور میں ہوا۔ قبر سکندر پور میں موجود ہے۔ مولینا کے چھوٹے سوتیلے بھائی سید اسد اللہ وغیرہ بھی حکومت دہلی سے وابستہ رہے ہیں ان کے متعلق سرکاری دستاویزیں یا بیدکرم خوردہ ہیں یا روشنائی بہت مدھم پڑ چکی ہے۔ لہذا ان کے حالات تاریکی میں ہیں۔ مثلاً :۔

سید اسد اللہ و سید الحسن و محمد باقر پسران سید سعد اللہ بن سید عبد المطلب متوطنین قصبہ نہٹور لکار . . . . . دار الخلافہ شاہجہاں آباد . . . .
. . . ملکات و حویلیات و باغات واقعہ پرگنہ نہٹور و سرایات . . . . .

ربیع الاول ۱۱۴۶ھ ہجری مقدس　　　　مہر خادم شرع رسول الثقلین
　　　　　　　　　　　　　　　　قاضی ابراہیم حسین

". . . . . سید سعید اللہ بن اسد اللہ ساکن قصبہ نہٹور لکار . . . . . مضاف مستقر الخلافت اکبر آباد . . . . . قطعہ زمین . . . . .

۱۲۲۳ھ　　　　مہر خادم شرع جمیل رسول اللہ
وغیرہ وغیرہ　　　　قاضی پرگنہ نہٹور

القصہ عزیزو۔ اب وقت سحر وقت مناجات ہے۔ دنیا آنی جانی ہے۔ یہ کاغذات بستے میں لپیٹ کر واپس طاق میں رکھ دو۔ اب طغرہ شاہی اور مہر قاضی خادم شرع جمیل رسول الثقلین کے بجائے اشٹام پیپر کا زمانہ آیا چاہتا ہے جو دور کلکتے کے چھاپے خانوں میں چھپنے شروع ہو گئے ہیں۔

شمع بڑھا دو۔ وضو کر و۔ تالاب کے کنارے حسین و جمیل مسجد میں غازی جمع ہو رہے ہیں۔ دربار عظام کے پھاٹک سے نکل کر محلہ مدبارا ور حویلی اندر کے بوڑھے بچے جوان شبنم آلود گھاس پر چلتے مسجد کی سمت جا رہے ہیں۔ چند سال قبل نواب سید سعد اللہ جریب ٹیکتے جھکے جھکے، سفید پوشاک میں ملبوس، بگلہ ایسی سفید داڑھی آہستہ آہستہ چلتے مسجد پہنچتے۔ بعد نماز کنول کے پھولوں سے بھری وسیع جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر کبھی کبھی دوسرے ساحل پر نظر ڈالتے جہاں بانس کے کہر آلود جھرمٹ کے ادھر شاہراہ بل کھاتی دتی جاتی تھی۔ مدتیں گذریں اسی سڑک پر سے گھوڑا دوڑاتے، دھول اڑاتے جو شیلے نوجوان سید سعد اللہ اپنے والد کی جائداد اور اس جھیل کا مقدمہ لے کر شاہجہان

---

[1] مولینا شریف علی کی لگڑ پوتی سیدہ شریف النساء سجاد حیدر یلدرم کی دادی تھیں۔

آباد ہو گئے تھے۔

سنو! اس شاہراہ پر پھر غبار اُٹھ رہا ہے دُور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آتی ہے۔ گاگن کے اس پار سرخ لبادے اور پھجے دار ٹوپیاں پہنے فرنگی سپاہی بگل بجا رہے ہیں۔
یہ فرنگی کا فوجی بگل ہے یا صورِ اسرافیل؟

---

# باب ۵

## اٹھارھویں صدی

قیامت کی گھڑی آن پہنچی۔ آفتاب سوا نیزے پر آیا چاہتا ہے۔ اب کہیں امن نہیں۔ فرنگی سپاہی بندوق کے توڑے پہ طرح طرح ہے ہیں۔ بے گناہ رعایا پہ ہر طرح آفت ہے۔ صاحبانِ اولوالعزم مثل بادِ صرصر کے کشورِ ہند پر چھا گئے۔ امرائے ہند یا لہو و لعب میں مبتلا یا ایک دوسرے کے درپئے آزار ہیں۔ فرنگی کے ہاتھوں حافظ رحمت خاںؒ کی شہادت کے بعد روہیل کھنڈ کے چراغ بجھ گئے۔

حافظ صاحب خلد آشیانی کے دادا داؤد خاں کہ علاقہ ان کا اولاً بریلی میں تھا افاغنہ کے پیشوا بنے۔ بیٹے علی محمد خاں نے سید برادران بادشاہ گر اور سادات بارہہ کا قلع قمع کر کے دربارِ مغلیہ سے خطاب نواب کا حاصل کیا۔ بعد ازاں حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ نواب کو دو سال دِلّی میں قید رہنا پڑا۔ بارے احمد شاہ ابدالی کے حملے سے فائدہ اٹھا کر پایۂ تخت سے فرار ہوئے۔ بجنور پہنچ کر نہٹور کے پڑوس میں دھام پور اور شیر کوٹ پر حملہ کیا۔ یہ قصبے اب تک نواب علی محمد کے پرانے دشمن۔ صفدر جنگ نواب وزیرِ اودھ کی ملکیت تھے (تفصیل آئندہ باب میں ملاحظہ ہو) حافظ رحمت خاں نواب علی محمد کے فرزند تھے۔

روہیلوں کو کچلنے کے لئے صفدر جنگ نے مرہٹوں سے ساز باز کی اور پٹھانوں کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ معاہدے کے بعد نواب نجیب خاں نے کہ نواب علی محمد کے جرنیل تھے دربارِ مغلیہ سے ۱۷۵۵ء میں بخشیٔ سلطنت امیر الامرا، نجیب الدولہ کا خطاب حاصل کیا اور نہٹور سے کچھ فاصلے پر نجیب آباد بسایا۔

۱۷۶۷ء میں گنگا پار سے سکھ آن پہنچے۔ نہٹور تک پہنچ کر لوٹ مار کی۔ سات برس قبل روہیل کھنڈ میں شدید قحط پڑا تھا۔ مرہٹہ گردی سے خائف و ترساں عوام اب فاقہ کشی کر رہے تھے۔ ۱۷۷۰ء میں نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد مرہٹوں نے نجیب آباد پر یلغار کی۔ نواب کا مقبرہ گرایا۔ ۱۷۷۴ء میں وارن ہیسٹنگز بہادر کی افواج نے نواب اودھ کی طرف سے روہیلوں پر حملہ کر کے حافظ رحمت خاں کو شہید کیا۔ روہیلے ممالکِ افاغنہ سمیت بجنور سلطنتِ اودھ میں شامل کیا گیا۔

۱۸۰۱ء میں نواب شجاع الدولہ نے سارا روہیل کھنڈ اٹھا کے کمپنی بہادر کو بخش دیا۔ بجنور، مراد آباد، بریلی ایک کمشنری بنائے گئے۔
۱۸۰۲ء میں بجنور پھر خشک سالی کا شکار رہا۔ گیہوں کے فساد بپا ہوئے۔ بے روزگاری عام ہوئی۔
سردار امیر خاں جو سنبھل کے نزدیک پیدا ہوئے تھے، ہولکر کے جرنیل تھے۔ ۱۸۰۵ء میں انہوں نے انگریزی علاقے پر حملہ کیا۔ مراد آباد

میں بعد کرو فرداخل ہوئے اور شیر کوٹ اور دھام پور کی سمت بڑھے۔ لیکن لشکر ان کا بہت جلد بکھر گیا۔ اینگلو انڈین کرنل جیمز سکنر نے جو سکندر صاحب کہلاتا تھا۔ امیر خاں کا تعاقب کیا۔ وہ دلاور میر میاں بجنور سے نکل کر مراد آباد گیا اور مستقل فرنگیوں سے لڑا کیا۔ نوجی سرداروں کی دنیا عجیب تھی۔ پایۂ تخت لیکن آج ہر جگہ فرنگی ان پر غالب آ رہا تھا۔ یہ فتوحات صاحبان عالیشان عروج اقبال کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھیں۔ مرضی مولا یہی ہے کہ ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی بادشاہ غازی ملک فرنگستان کے بادشاہ جارج سوئم کے مطیع ہوں۔

فرنگی اب ایک عرصے سے روہیل کھنڈ میں براج رہا ہے۔ ہمیں تاتاریوں اور مغول اور افغنہ اور ترکوں سے سابقہ پڑا۔ جنگ و جدل رہی مگر اپنے ہم مذہب تھے۔ راجپوتوں سے واسطہ ہے کہ اپنے ہم وطن بھائی اور ہمسائے ہیں۔ امرائے ہنود فخریہ اپنے ناموں کے ساتھ شاہجہانی، عالمگیری، محمد شاہی لکھتے تھے۔ یہ گورا البتہ سمجھ میں نہ آیا۔ کیا جانئے اس کے پاس اسم اعظم ہے۔ چہار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ سنتے ہیں کہ خلیفۃ الاسلام سلطانِ روم اس کی ریشہ دوانیوں سے عاجز ہیں۔ شاہانِ قاچار کو اس نے ناکوں کر رکھا ہے۔ زار روس اس کا نام سن کر تھر تھر کانپتے ہیں۔

اس کے صاحبِ کمال ہونے میں ہمیں اس وقت شک نہ رہا جب اس نے بجنور ایسے دقیانوسی شہر کا نقشہ بدل دیا۔ کوٹھیاں، کیپتی باغ، ہسپتال بنگلے، کہتے ہیں کہ گورا تاجر اول اول بنگال میں وارد ہوا اور بنگالی وضع کے پھونس کی چھتوں والے گھر اپنی رہائش کے لیے تعمیر کروائے جو بنگلہ کہلانے لگے۔ اب بجنور سول لائنز میں کلکٹر، جج، انجینئر، پادری، سول سرجن، کپتان پولیس سب اپنے اپنے شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں۔ کیمپ میں نیٹو سپاہیوں کی بارکیں ہیں، گرجا گھر ہے۔ سینکڑوں حلال خور اور ہین بنسی کرسٹان ہو چکے ہیں۔

صاحبانِ عالیشان کی ہر ادا نرالی ہے۔ مختصر اسلحہ جات مثلاً چاقو اور ایک نوع کے چہار شاخے کے ذریعہ لقمہ اٹھا کر منہ میں رکھتے ہیں۔ ام الخبائث کے از حد شوقین ہیں۔ علاوہ ازیں ایک جھاڑی کہ آسام و بنگال کی پہاڑیوں پر اگتی ہے۔ اس کی پتیاں ابال کر پیتے ہیں۔ نام اس مشروب کا چاء ہے کہ چینی لفظ ہے۔ ایک روز کلکٹر صاحب نے ہمیں بھی پیش کی۔ ہم نے پینے میں ذرا تامل کیا۔ کیونکہ ان مشرکین و نصاریٰ کے ہاں لحمِ خنزیر پکتا ہے۔ لیکن ان کے بیرے نے جو مسلمان ہے چپکے سے ہمارے کان میں کہا کہ پیالیاں پاک و صاف ہیں۔

القصہ دودھ اور شکر ملا کر ہم نے چاء کا گھونٹ بھرا۔ ذائقہ کڑوا معلوم ہوا۔ مگر مجبوراً پیالی ختم کرنی پڑی۔

صاحبانِ عالیشان پہلے سرخ لبادے کہ "کوٹ" کہلاتے ہیں پہنتے تھے۔ تنگ پائجامے، سفید جھالر والی آستینیں، ساٹن کے جوتے اور سر پر سفید بالوں کی ٹوپی جسے وِگ بولتے ہیں۔ اب کوٹ اور پتلون زیب تن کرتے ہیں۔ بے روزگار مسلمانوں میں سے متعدد نے سول لائنز کے درزی، بیرے، خانساماں، خدمت گار وغیرہ کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔

صاحبان پہلے ہندوستانی پوشاک بھی پہنتے تھے۔ اُردو، فارسی بخوبی جانتے ہیں۔ ہندی عورات سے شادیاں کیں۔ اکثر کوٹھیوں میں آج بھی ایک "بی بی خانہ" احاطے میں ہوتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔

میمیں ان کی قابلِ دید ہیں۔ مثلِ حورانِ کوہ قاف۔

خلاصہ عجیب و غریب محیر العقول قوم ہے۔

حصولِ دیوانی کے بعد سے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ کاریگر تباہ ہو رہے ہیں۔ ریاستوں کے خاتمے کے بعد بے کاری عام ہوئی۔ فنِ سپہ گری مسلم شرفا کا پیشہ تھا۔ اب امرا فاقے کر رہے ہیں۔ سپاہی کون رکھے۔

دِلّی والے مرزا سودا کیا صحیح فرما گئے ہیں کہ اس دور میں امیر، دولتمند سپاہی نوکر رکھتے تھے۔ سو آمد ان کی جاگیر سے بند ہو چکی ہے۔ ملک مدّتوں سے سرکشوں نے پسند کیا ہے۔ جو ایک شخص بائیس صوبوں کا خاوند تھا اس کے تصرّف میں اب فوجداری کول بھی باقی نہیں۔ امیر جو دانا ہیں انہوں نے زمانہ کا حال دیکھ کر خانہ نشیں ہوتے۔ سوزنی بچھی ہے۔ خوجہ کھڑا رومال جھلے ہے۔ حضور دو ایک ندیم اہلِ کمال بیٹھے ہیں۔ دھری ہے سامنے ایک چلمچی دان ایک تنبول۔ یہ تو حویلی کے اندر کا منظر ہے۔ باہر یہ حال کہ سپاہی نامتصدی سمجھوں کو بیکاری ہوا۔ خطّی پھاڑ کر پنساری کسی کو انگور کسی کو گٹھل باندھ دیتا ہے۔ سلاطین کی تو یہ دعا مُجاور کی ہے۔ جو شام کو بہر نماز مسجد میں جائیے تو وہاں چراغ نہیں، بجز چراغِ غول۔ ان مکانوں میں الّو بیٹھتے ہیں جہاں بہار میں ہنڈول سلگتا تھا۔

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم

آگرہ بازار میں نظیر دیکھتے ہیں کہ دکان دار قطار اندر قطار قیدیوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ چھتیس پیشے والوں کے کاروبار بند ہیں۔ گرد و پیش میں قزاق لوٹ رہے ہیں۔ گھاٹ دار بار بند ہیں۔ سہاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں۔ میناکار مرتے ہیں، مصور کباب ہو چکے۔ باہمن ہنڈوں کے بیچ سر پٹکتے ہیں۔ علم والے مدرسوں کے بیچ عاجز ہیں۔

کہو یارو اِس مکاں میں کیسی ہوا چلی

# باب ٦

## میر خانی گردی

نہٹور میں نواب سیّد سعید اللہ کے بڑے بھائی سید بہادر علی کے پڑپوتے میر امام بخش ابن میر منور علی ترمذی ایک خستہ حال جاگیردار عزتِ سادات سنبھالے قصبے کے مشہور رہے ہیں کہ سیّد حسن ترمذی کے زمانے سے قائم ہے، لڑکے پڑھاتے ہیں اور چند ٹکے پیدا کرتے ہیں۔ اخوند جی کہلاتے ہیں۔ "ذات ان کی سراپا خیر و برکت ہے۔ پابندِ احکامِ شرعی و صوم و صلوٰۃ بطریقہ حنفی، حالتِ موجودہ میں بھی صابر و شاکر، اللہ پہ توکل کرتے ہیں حرفِ شکایت و ناسپاسی زبان پر نہیں لاتے اور کسی نے ان کے چہرے پر ناشکری و تنگ دستی و قلتِ معاش کے آثار نہ دیکھے[1]"

طوائف الملوکی ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ ایک روز خبر پڑی کہ امیر خاں نے حملہ کر دیا۔ سن ۱۲۱۰ھ کی بات ہے کہ[2] امیر خاں غارت گر برائے غارت گری و کشت و خونِ خلق اللہ کمر بستہ با جماعت کثیر غارت گراں نہٹور پہنچا۔ یک شبانہ روز قصبے میں قیام کیا۔ یہ واقعہ محمد خانی اور میر خانی گردی کہلایا۔ اہلِ قصبہ بخوفِ قتل و خون جا بجا منتشر ہوئے کھیتوں کھلیانوں اور جنگلوں میں جا چھپے۔ بہت سوں نے پُرانے کھنڈروں اور مقبروں میں پناہ لی۔

جس وقت امیر خاں کے پٹھان سپاہی لوٹ مار مچاتے محلّہ سادات کی طرف بڑھ رہے تھے، اخوند امام بخش نے اپنی بی بی سیدہ آمنہ خاتون اور تینوں بچوں، بنی النسا، اللہ بندی اور علی بخش کو ساتھ لیا اور افتاں و خیزاں چھپتے چھپاتے مقبرہ مرزا مبارز اللہ خاں میں جا کر پناہ گزیں ہوئے۔

رات ہوئی جنگل میں سیار بولے۔ مقبرہ میں بہت سے پناہ گزین کنبے جمع تھے کسی سمے بھی امیر خاں یا اس کے سپاہی آ کر دھاوا بول سکتے تھے۔ بہت سی بیبیاں زیوروں کی پوٹلیاں باندھ کر ساتھ لے آئی تھیں۔ صرف ایک مشعل روشن تھی۔ جس کی روشنی میں اندھیرے گنبد کے اندر سے چمگادڑیں نکل کر اڑتیں

---

[1] فارسی عبارت کا ترجمہ۔ [2] پٹھان سردار۔ محمد شاہ خان۔

دور سے بندوقوں کی آواز آئی۔ چند بزرگوں کو ابدالی کا زمانہ خوب یاد تھا۔ سنا تھا امیر خاں انگریز سے لڑتا ہے۔ انگریز سے سب لڑ رہے تھے۔ اس کا فائدہ کیا تھا؟ سارے ہندوستانی ایک دوسرے کا خون بہانے میں مصروف تھے۔ بی بی کی جھاڑو پھرے ان کم بختوں پر۔

انگریزی حساب سے یہ ۱۷۸۶ء تھا۔ اسی سال لارڈ کارنوالس ہندوستان کا گورنر جنرل بنا، ایک برس بعد غلام قادر روہیلہ نے بادشاہ کو اندھا کیا۔

اسی رات نیم تاریک مقبرے میں سیّدہ آمنہ خاتون کے ہاں لڑکا تولد ہوا۔

آخوند امام بخش کے اس لڑکے کا نام بندے علی رکھا گیا۔ مکتب کی تعلیم کے بعد آخوند جی نے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دلی روانہ کیا۔ کپڑوں کا بقچہ، بوسیدہ کتابیں اور چند سکہ چہرۂ شاہی کیسے میں رکھ کر میاں بندے علی سلمہٗ بیل گاڑی پر دارالسلطنت روانہ ہوئے۔ دلی پہنچ کر مدرسۂ فتح پوری میں داخل ہوئے۔ دوسرے غریب طلبا کی مانند مسجد کے ایک حجرے میں مقیم درسِ نظامیہ کی تحصیل میں جٹ گئے۔

۱۸۰۳ء میں دلی پر باضابطہ برطانوی قبضہ ہو گیا۔ نابینا، دکھیارا بادشاہ لال قلعے میں پنشن خوار ہوا۔ تین سال بعد راہیِ ملکِ عدم ہوا اس کے بیٹے اکبر شاہ ثانی کو لارڈ ہیسٹنگز کے حکم سے وہ سارے شاہی قاعدے اور رسومات ترک کرنی پڑیں جن سے کمپنی کے مقابلے میں مغلیہ برتری ظاہر ہوتی۔

میر بندے علی کبھی کبھار جمنا پر جا کر بادشاہ کو دیکھ آتے جو بے چارہ پابندی سے جھروکہ درشن دیتا تھا۔ دلی کی شان و شوکت تھوڑی سی باقی تھی۔ روائتی شاہجہاں آباد ابھی زندہ تھا۔ ایک مفلوک الحال قصباتی زمیندار کے سیدھے سادے لڑکے میر بندے علی پایۂ تخت کی رنگینیوں اور عیش و عشرت سے بالکل ناواقف رہے۔ علاوہ ازیں مدرسے میں پڑھنے والے لڑکے یہ بھی نہ جانتے تھے کہ دلی سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ فرنگستان اور صاحبانِ فرنگ محض ایک طلسم تھا۔ یورپ کے علوم و فنون و ایجادات، عالمی سیاست، جدید فلسفہ و نظریے، شرفائے دلی اور ان کی ہونہار اولاد ان تمام خرافات سے مطلق بے نیاز، ناآشنا اور بے پروا اپنے روایتی مشاغل میں منہمک تھی۔ مدرسوں میں قرونِ وسطیٰ کے علوم پڑھائے جا رہے تھے۔ حویلیوں میں شعر و شاعری اور مرغ بازی ہوتی تھی۔

اب میر بندے علی کو ایک پریشانی لاحق ہے۔ دلی سے واپس جا کر کیا کریں گے۔ وہ زمانہ نہ رہا کہ اپنی فوج جمع کر کے خود بھی ان خانہ جنگیوں میں شامل ہو جائیں۔ اپنا علاقہ جو دوسرے زیادہ طاقت ور سرداروں نے چھین لیا بزورِ شمشیر واپس لیں۔ دوسروں کا علاقہ چھین کر دشمن کا زن بچہ کولہو میں پلوا قلعے پر اپنا پرچم لہرائیں۔ آہ۔ وہ وقت ہی نہ رہا اور یوں بھی یہ لارڈ لیک کا عہد ہے۔ بڑے بڑے جغادری اس کے آگے گھٹنے ٹیک چکے ہیں۔ جسونت راؤ ہولکر کو اس کے سامنے جھکنا پڑا۔ ہولکر کا سردار امیر خاں گورنر جنرل کا مطیع ہوا۔ فرنگی نے اسے ریاستِ ٹونک کا نواب بنا دیا۔ حلیفِ برطانیہ بنا کریم خاں پنڈاری کو ایک ریاست عطا ہوئی ایک کے بعد ایک پرانے دبنگ سرداروں کو فرنگی بازی گر ریاستوں کی گدیوں پر بٹھاتا جا رہا ہے۔

ہماری نہ تو بڑی ریاست تھی، نہ ہم نے کہیں لوٹ مار کی۔ جس کے عوض ہم کو ایک عدد تخت و تاج چھوٹا موٹا ہی مل جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ نوجوان میر بندے علی اور ان کے چھوٹے بھائی احمد علی آج کی دنیا میں کریں کیا؟ کہاں جائیں۔۔۔؟

---

# باب ۷

## رباطِ کہن اور حویلی

" ہونے والی چیزوں کو لکھ کر قلم سوکھ گیا۔ اب یا سعادت ہے یا شقاوت۔"

مِنکہ میر بندے علی ترمذی ابن حضرت آخوند امام بخشؒ ترمذی فی الوقت ایک معمولی ملازم جان کمپنی بہادر کا ملک بندیلکھنڈ میں تعینات ہوں۔ اقوالِ مشائخ صوفیا یاد کرتا ہوں اور دل لرزتا ہے کہ ہمارے اجداد رباطِ کہن سے نکل کر حویلیوں میں آباد ہوئے۔ سو وہ حویلیاں ڈھے گئیں۔ منصب داروں کی کمان گر گئی۔ فی الوقت کالپی میں کنارِ جمنا ایک پھوس کے بنگلے میں مقیم ایک بار پھر عالمِ تحیر میں ہوں۔ یہ تمہارا سورج جسے تم دیکھتے ہو یہ وہی سورج ہے جو قارون و ہامان کے محلوں کے جھروکوں پر طلوع ہوا۔ اور اب ان کی قبروں پر نکلتا ہے۔ بادشاہوں نے دنیا میں مضبوط محل بنائے۔ نہ بادشاہ رہے، نہ محل۔" پس روئے مبارک بریں فقیر آوردند فرمودند فرزند من ایں فوائد کہ گفتم بنویسش[2]۔"

وقت تیغِ قاطع و برہانِ درخشاں ہے۔ ہر سمت قبرستان پھیلے ہیں۔ سینکڑوں برس پرانے مزار اور وہ قبر جو کل بنی ہے۔ اور میری اپنی قبر جو شاید کل ہی بن جائے۔ یا کسی اور دن۔ وہ پرانے مزار اور وہ تعمیر ہونے والی قبر ایک ہیں۔

تبریز اور آذربائیجان اور طبرستان اور کیتھل اور جھوسی اور سلہٹ اور قنوج اور نہٹور میں قبروں پر گھاس اُگ آئی۔ کتبوں کے الفاظ مٹ گئے۔

دو فرنگی بھائی جو ڈینیل[3] صاحب کہلاتے تھے کچھ عرصہ گزرا سارے ہندوستان میں قدیم مساجد و مقابر، درگاہوں اور برگد کے درختوں میں پوشیدہ مندروں اور مزاروں کی تصاویر بناتے پھرتے تھے۔ ان کی سمجھ میں بھلا کیا آئے گا۔

یہ کالپی اور للت پور اور اورئی اور باندہ اور ہمیر پور چندیلوں، بندیلوں، بنگش پٹھانوں اور مرہٹوں کی رزم گاہ رہ چکے ہیں۔ کلاہ پوش فرنگی نے بحکم حضورِ فیض گنجور لارڈ کارنوالس بہادر نقشے بدل دیئے۔ عہدِ شاہ عالم کے عہدیدار برطرف ہوئے۔ حاکمِ ضلع فوجدار کی جگہ کلکٹر نے لی۔ دیوانی میں صدرِ اعلیٰ صدر امین منصف مقرر ہوئے۔ میرے دلی والے دوست سید احمد اس وقت ہمارے وطن بجنور میں صدر امین ہیں۔ کبھی کبھار خط و کتابت ہوتی ہے۔

---

۱۔ تسلسل کے لیے باب ۳ ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ ملفوظاتِ مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاریؒ (الدر المنظوم)

۳۔ طامس اور ولیم ڈینیل (رائل اکیڈیمی لندن)

جس ذات گورنمنٹ روہیل کھنڈ نے ہمیں نائب تحصیلداری پر نامزد کیا۔ ان کو سب پہلے سے معلوم تھا۔ ضلع میں کون کون سے مقتدر خاندان ہیں۔ مالی حالت ان کی کیسی ہے۔ زمینداری سے کتنی آمد ہے۔ سیاسی رجحانات کیا ہیں۔ مجاہدینِ سید احمد بریلوی کا ساتھ کن کن نے دیا تھا یا دے رہا ہے۔

نوجوان شرفا کو کمپنی کی ملازمت پیش کرنے میں فریقین کے گوناگوں فوائد مضمر ہیں۔

القصہ ہم بھی داخلِ زمرۂ خیر خواہانِ سرکار انگلشیہ ہوئے۔ صورتِ معاش بخوبی نکلی۔ فی زمانہ ہزاروں بیکار و معطل، خانہ نشین یا سینکڑوں آوارہ وطن ہوئے۔

برادرِ خورد میر احمد علی کمپنی بہادر کی ایک نیٹو پلاٹین میں شامل ہو چکے ہیں۔

ہمارے اجداد صدیوں تک صاحبِ نوبت و لشکر رہے۔ ایک بزرگ سید نظام کو شاہجہاں بادشاہ نے خطاب امیر الامرا کا عطا کیا تھا۔ ماموں اُن کے سید عبدالغفار باون ہزاری تھے۔

میاں احمد علی سلمہ، میرٹھ چھاؤنی میں بندوق اٹھا کر گورے کمانڈر کے حکم پر قواعد پریڈ کرتے ہیں۔ ہم جوتے اتار کر حاکمِ ضلع کے سامنے جاتے ہیں۔

ہم سب چاروں نے دنیا میں غوطہ مارا تھا۔

"ایک عزیز کہ عالمِ طیر رکھتا ہے۔ شب جمعہ کو دروازے کے آگے پہنچا۔ خانقاہ[2] بادشاہ کی جہت سے اندر نہ آیا۔ ایک آدمی بھیجا۔ اُس نے سلام کیا، زمین چومی اور بولا کہ تم جو ہر لحظہ ملوک کا کھانا کھاتے ہو یہ وظیفہ جو فوت ہوتا ہے اسی سبب سے ہے۔ میں نے اس دن خانِ جہاں کا کھانا کھایا تھا۔"

حیف کہ ہم نے صدیوں ملوک کا نمک کھایا اب ملکہ وکٹوریہ کے نمک خوار ہیں۔

یہ جو بعض اصحاب کا قول ہے مذہبِ اسلام میں قطع علائق ممنوع تھا، اکابر صوفیہ: راہبان مسیحی و اہلِ ہنود سے متاثر ہوئے، ہمارے نزدیک یہ نظریہ چنداں صحیح نہیں۔ کس واسطے جب امتِ رسول کے حاکموں نے طور طریق شاہانِ عجم کے اختیار کئے۔ خود کو بصد فخر و غرور خسرو و دارا کہلوایا وہ اور ان کے حاشیہ بردار مظالم غربا پر کرتے تھے۔ تب ائمہ و اولیاء نے اقتدار پرستی کے خلاف ایک تحریک گویا شروع کی۔

اور ہم جو نسل سے ائمہ و صوفیا کی ہیں۔ ارکانِ دولت میں شامل ہو کر داخلِ طبقہ امرا ہوئے۔ لبادے کار چوبی طلائی منقش زیب تن کرتے تھے۔ ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے۔ شیخین اور اویس قرنی اور ابوذر غفاری کو بھولے تھے اور یہ سراسر فراموش کر چکے تھے کہ ملوکیت و شہنشاہیت کے معاملات عبرت ناک ہیں۔

---

[1] یعنی ہوا میں اڑتا ہے۔

[2] ملفوظات مخدوم جہانیاں جہاں گشت: "اس طرف تاجر لوگ خانقاہ بناتے ہیں اور حلال خرچ کرتے ہیں۔ خانقاہ کے نیچے حجرے وقف کر دیتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ رسم نہیں۔ سلطان محمد بن تغلق نے مجھے شیخ الاسلام کیا اور چالیس خانقاہیں میرے تصرف میں دیں۔"

دیکھو ہمارے یک جدی نواب قاسم علی خاں عالی جاہ ناظم بنگالہ نے کہ سید نصیر الدین ابن سید کمال الدین ترمذی کی نسل دختری سے تھے کس طرح متواتر شکست صاحبانِ عالی شان کی فوج سے کھائی۔

اگرچہ اپنی فوج کو موافق دستورِ انگریزی آراستہ کیا تھا۔ مگر نہ سمجھے کہ لڑوانے والے صاحب کہاں تھے۔ چنانچہ مونگیر میں نواب گورنر جنرل نے جن سے اتحادِ دلی ہو گیا تھا دو نشانہ سمجھایا کہ بہت خوب فوج آراستہ ہے مگر کبھی قصد مقابلہ کا ہم سے نہ کیجئے گا۔ ہم لڑواتے ہیں۔ فوج کیا لڑے گی۔

قبل از جنگ بکسر جناب عالی نواب شجاع الدولہ بہادر بنارس میں شیخ علی حزیںؔ سے ملاقی ہوئے۔ جناب شیخ نے سبب عزیمت پوچھا۔ عرض کیا۔ قاسم علی خاں اپنی کمک اور حمایت کو لئے جاتے ہیں اور انگریز اس پر اصرار کرتے ہیں کہ تم شریکِ عالی جاہ نہ ہو بلکہ ہم سے ملکِ عظیم آباد بھی لے لو۔ کیا ضرور ہے عبث عبث اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنا۔

شیخ نے تبسم فرمایا کہ گو ان کی فوجیں قلیل اور یہاں فوج قاہرہ ہے مگر یہ آتشِ فرنگ ہیں۔ انھیں کم نہ جاننا چاہئے۔ بظاہر ان کی بنیاد نظر نہیں آتی مگر باطن میں طبقہ گاؤ زمیں سے گوندھی ہوئی ہے۔ تم نہیں جانتے ہمارے پیغمبرؐ نے عین حکمت سمجھ کر اس فرقۂ خاص سے صلح کی تھی۔ دوسرے دن جناب شیخ نے اپنے حاضرین سے بافسوس کہا کہ اس جماعت سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ جنگِ حمقا با دانایانِ فرنگ۔

القصہ عالی جاہ اور جنابِ عالی شجاع الدولہ میں بگاڑ ہوا۔ نواب میر قاسم سوچتے تھے اب مرشد آباد واپس جاؤں اور انتظامِ انگریزی میں خلل ڈالوں تو مضائقہ نہیں۔ ایک دن جنابِ عالی نے کہلوا بھیجا کہ بادشاہ بقایائے صوبہ بنگالہ وغیرہ طلب فرماتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا سبحان اللہ میں تو تمہارے بھروسے پر بیٹھا ہوں۔ جو مجھ سے ممکن و مہیا ہوا اس میں قصور نہیں کیا۔ اب مجھے مقدور کہاں رہا۔ مجبور ہوں۔

دوسرے دن جنرل سمرو ملازمِ عالی جاہ میر قاسم وقتِ بد دیکھ کر لشکرِ جنابِ عالی میں چلا آیا۔ تیسرے دن خیمۂ عالی جاہ کا محاصرہ کر لیا۔ انھیں ہاتھی پہ سوار کر کے لشکرِ جنابِ عالی میں پہونچایا۔ مال اسباب نقد و جنس سب ضبطِ سرکارِ جنابِ عالی ہوا۔ تمام رفقائے عالی جاہ نے نواب شجاع الدولہ سے موافقتِ دنیوی کر لی۔ ایک دن پیشتر لڑائی بکسر کے عالی جاہ نواب میر قاسم لنگڑی ہتنی پر سوار روانہ الہ آباد ہوئے اور بہ جان واحد قیدِ شجاع الدولہ سے نجات پائی۔ اس وقت بے کسی میں علی ابراہیم خاں نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اپنی سواری کا بھیجا لیکن عالی جاہ نے از راہِ غیرت قبول نہ کیا۔ بہ ہزار خرابی افتاں و خیزاں الہ آباد پہنچے۔ چھوٹے سے مکان کرایہ میں اترے۔ پھر لکھنؤ ہو کر روہیل کھنڈ آئے اور قیدِ فرنگ سے محفوظ ہوئے۔

کہتے ہیں کہ عالی جاہ جب لکھنؤ میں اترے۔ خیمہ کنارے دریائے گومتی زیرِ قلعہ مچھی بھون برپا ہوا تھا۔ ان کے سامنے ایک طرف قرآن دوسری طرف زنارِ ہنود رکھے تھے کہ اگر فتح نواب شجاع الدولہ ہوئی زنار پہن لوں گا یہاں تک کہ خبر شکستِ بکسر سُنی۔

خلاصہ ملکِ افاغنہ میں بھی صورتِ قیام نہ ٹھہری۔ بعد چند روز کے پریشان و خستہ حال میانے میں سوار ہو شاہجہان آباد پہنچے۔ نواب نجف خاں نے بڑے احترام سے اپنا مہمان کیا اور کہا کہ اب خیالِ ملکِ بنگالہ اور تصورِ عہدہ وزارت کو دل سے دھو کے حاضر حضورِ شاہی رہنا غنیمت سمجھیے۔ بہرصورت آپ کی خدمت گذاری اور کفالت کو حاضر ہوں۔ بعد چند روز کے سبزی منڈی میں انتقال کیا۔ حضرت شاہ مرداں میں دفن ہوئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار[1]۔

---

[1] تاریخ اودھ سید از سید کمال الدین حیدر۔

جب نواب میر قاسم کا حال سنتا ہوں کہ کس قدر صاحبِ مروت و فیاض و عالی مرتبت تھے اور کس بے کسی و نادار ی کے عالم میں مرے، تو دل خون ہوتا ہے۔

اور ایک ان مرحوم مغفور خلد آشیان کا کیا ذکر ہے والد مرحوم میر امام بخش فرماتے تھے اُن کی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ دلّی میں سب عمل دخل مرہٹوں کا تھا۔ بادشاہ کو وظیفہ اُن کے گزارے لائق نہ ملتا تھا۔ ان سے قبل بادشاہوں کو اندھا کیا گیا۔ قتلِ عام ہوئے۔ وزیروں نے جس کو چاہا ہلاک کیا۔ جس کو چاہا تخت پہ بٹھایا۔ عین اس وقت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ کی بے بسی کا کیا عالم ہے۔ اللہ اکبر۔

خدا کی قسم دنیا سے نفرت ہو چلی ہے۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ سید حسن ترمذی اپنے چہار ہزاری والد میر ضیاالدین خانہ ی کی شہادت کی خبر سن کر گاگن کنارے ایک جھونپڑی میں جا بیٹھے تھے۔ ہم ان کے ترکِ علائق پہ متعجب نہیں۔

یہاں اس کوردہ میں وطن سے سینکڑوں میل دور کچہری عدالت کے بعد فرصت ہی فرصت ہے کہ ملفوظاتِ قدیم کا مطالعہ کروں اور سر دھنوں۔ خواجہ معین الدین حسن سجزی رح چشتی کہ ہمارے جدِ امجد سید کمال الدین ترمذی رح کے ہم عصر تھے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح، سید محمد بندہ نواز گیسو دراز رح، سید علی ہجویری رح اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح کی تصانیف پڑھتا ہوں اور بارگاہِ ایزدی سے طالبِ بخشش ہوتا ہوں۔

تعجب ہوتا ہے کہ اولیا ماسلف ہندوستان میں کہاں کہاں پہنچے۔ اس بندیل کھنڈ میں کہ گھنے جنگلوں اور جنگجو گونڈوں اور قزاقوں کی سرزمین ہے۔ ہم صاحبانِ عالی شان کے ہمراہ دورے پہ جدھر جاتے ہیں۔ اولیا کے مزار دکھلائی دیتے ہیں۔ بدیع الدین زندہ شاہ مدار بھی دور عہدِ فیروز شاہ تغلق کالپی میں رہ چکے ہیں۔ (صد افسوس کہ درویش جو ان کے نام لیوا ہیں۔ وہ اب بندر اور ریچھ نچاتے پھرتے ہیں۔ شعبدے دکھاتے ہیں اور مداری کہلاتے ہیں۔)

ہمیر پور میں مبارک شاہ کا مزار ہے۔ راجو قتال برادر و خلیفہ مخدوم جہانیاں کے خلیفہ تھے۔ چھتر سال بندیلہ آپ کا معتقد تھا۔

عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ان دنوں ان اطراف میں تین نوجوان حفاظ کی جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد ہیں۔ بڑی شہرت ہے۔ نواب صاحب باندہ نے ان کا تذکرہ ہم سے کیا۔ ہمیں بھی ان سے ملاقات کا اشتیاق شدید ہوا۔

نواب صاحب کا قصہ بھی غریب ہے۔ گزشتہ صدی کی طوائف الملوکی نے ہزاروں کو بگاڑا اور سینکڑوں کو بنایا۔ سندھیا والئ گوالیار نے نظام الملک آصف جاہ کے لڑکے عماد الملک غازی الدین کو کالپی جاگیر میں دی (مرزا نوشہ دلی والے کے شاگرد نواب انوار الدولہ شفق انہیں عماد الملک کے پڑپوتے ہیں۔)

راجہ چھتر سال بندیلے نے کچھ علاقہ اپنا اپنے حلیف پیشوا باجی راؤ اوّل کو عطا کیا۔ محمد خاں بنگش کے خلاف بندیلے کی ایک جنگ میں اس کے خاندان کی ایک لڑکی کو پٹھان افواج نے اسیر کیا۔ باجی راؤ نے اسے قید سے رہا کر کے داخل رنواس کیا۔ ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نام اس کا شمشیر بہادر رکھا گیا۔ مذہباً مسلمان تھا۔ لیکن باجی راؤ نے باندہ اسے جاگیر میں دیا۔ اس کا بیٹا علی بہادر تھا۔ مرہٹوں نے ۱۸۰۲ء میں یہ سارا علاقہ انگریزی حکومت کے حوالے کیا۔

ادھر جھانسی کے مرہٹہ نیم خود مختار راجہ کی بیوہ لکشمی بائی نے اپنے متبنّیٰ لڑکے کے حق تخت نشینی کی درخواست کلکتہ گورنمنٹ کو دی جو رد ہ

وراثت کے پیچیدہ جھگڑوں کے نامنظور ہوئی۔ جھانسی حال ہی میں برٹش عملداری میں شامل کیا گیا، جس وجہ سے ہم یہاں موجود ہیں۔ رانی صاحبہ کو پنشن دے دی گئی ہے۔ وہ ناراض اور غیر مطمئن شہر کے اندر اپنے محل میں رہتی ہیں۔

نواب علی بہادر کے صاحبزادے ذوالفقار بہادر انگریزوں سے لڑے، شکست کھا کر معاہدہ کیا۔ سرکار انگلیشیہ نے باندے کے باہر زمین اور تھوڑی سی فوج رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ موجودہ نواب علی بہادر کے بھتیجے اور مرزا نوشہ کے دور کے قرابت دار ہیں۔ مرزا نے ان کے لئے فرمایا بھی ہے ؎

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالیؑ گہر کو میں

نواب صاحب ہر سال ایک جلسۂ قرأت منعقد فرماتے ہیں۔ دور دور سے قاری اس میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ کچھ برس قبل کا ذکر ہے کہ اس جلسے میں جب تمام قاریانِ گرامی تلاوتِ کلامِ مجید کر چکے تو ایک اجنبی ولایتی نے کھڑے ہو کر اجازت چاہی اور اس خوش الحانی سے تلاوت کی کہ سامعین اشک بار ہوئے۔

نام اس نوجوان کا حافظ سید محمد موسیٰ اور وطن سوات بُنیر تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بخارا و سمرقند، کابل و سرحد کے قاریوں کا آج تک کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جلسے کے بعد نواب صاحب باندہ نے حافظ صاحب سے ان کا احوال دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ والد بزرگوار ان کے حاجی لادیا حاجی بابا کے نام سے مشہور عارفِ کامل تھے۔ سوات بُنیر کے باشندے تھے اور اصل نام حافظ سید ابراہیم تھا۔ ایک معرکے میں شہید ہوئے۔ مزار سوات بُنیر کی ایک پہاڑی پر مرجعِ خلائق ہے۔ مولانا سید ابراہیم نے کچھ قرضہ واجب الادا چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے کوچ کیا تھا۔ حافظ موسیٰ نے ارادہ کیا کہ تجارت کر کے پیسہ کماویں اور قرضہ باپ کا ادا کریں۔ چنانچہ اپنی والدہ ماجدہ، چھوٹے بھائیوں اور بہن کو گاؤں رائے سین میں چھوڑ کر ہندوستان روانہ ہوئے۔ فی الوقت جامع مسجد باندہ میں مقیم تھے۔

نواب صاحب نے فرمایا کہ اپنے متعلقین کو باندہ لے آئیں۔ مسجد کی امامت پیش کی اور اس کے عوض قرضہ ادا کرنے کی پیشکش فرمائی۔ حافظ صاحب نے درخواست منظور کی۔ روپیہ لے کر سرحد گئے اور مع خاندان واپس تشریف لائے۔

جلسۂ قرأت میں نواب صاحب باندہ کے رشتہ دار نواب کدورہ[1] موجود تھے۔ وہ بھی حافظ موسیٰ کے مدّاح ہوتے۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں کو پہرے پر لگایا کہ جب حافظ صاحب سوات بُنیر سے واپسی پر باندہ جانے کے لئے اس طرف سے گزریں ہمیں مطلع کرو۔

کدورہ کالپی سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ جب حافظ صاحب کی شکرم راستے پر نمودار ہوئی۔ نواب کدورہ گھوڑے پر سوار لپک کر فوراً پہنچے اور چند روز کی مہمانی کے بہانے اپنی گڑھی میں لے آئے۔ نواب صاحب باندہ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد حافظ صاحب نے کدورے میں قیام فرمایا۔

---

[1] نواب انور اللہ دولہ شفق

مجھ بندے علی نے شہرت اُن کی روحانیت کی سُنی اور قصد ملاقات کا کیا۔ بعد مغرب ہم کدرہ پہنچے تو عجب روح پرور نظارہ دیکھا۔ مسجد میں ایک سرحدی مرد مومن تلاوت کلام پاک میں مصروف، دوسرے بھائی مٹی کے کوزے میں آٹا گوندھ رہے تھے۔ مسجد کے طاق میں تیل کی کپی جلتی تھی۔ دُور دُور تک اندھیرا اور سناٹا چھایا تھا۔ ہم گھوڑے سے اُترے اور دل میں کہا بندے علی یہ وہ طرز زندگی ہے جو صدیوں قبل ہمارے بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ اب ان سرحدی پیرزادوں سے راہ و رسم بڑھانا ضرور ہے۔ جرنیلوں اور کمشنروں کی دنیا ہیچ پوچ ہے۔

یہ تینوں بھائی حافظ محمد موسیٰ، مولانا عزیز احمد اور مولوی محمد طاہر فارسی اور پشتو بولتے ہیں۔ ذرا سی کوشش سے اُردو بھی سیکھ گئے ہیں۔ سلسلہ پیری مریدی کا یہاں بھی جاری کر دیا ہے۔ والدین کا شجرہ مخدوم جہانیاں سے ملتا ہے۔ والدۂ ماجدہ سیدہ امینہ بیگم سوات بنیر کے اخوند تاج محمد کاکا کی صاحبزادی اور خود عارفہ بی بی ہیں۔

خانوادۂ مخدوم کی ایک شاخ سے بہ اتفاقیہ ملاقات بہت خوب تھی کہ خود ہمارے ایک بزرگ سید علیم الدین دھم کو مخدوم جہانیاں نے خرقۂ خلافت عطا کر کے جونپور بھیجا تھا اور سلطان ابراہیم حسین شرقی نے اُن کو اپنے امرا میں شامل کیا تھا۔

کتابوں میں آیا ہے کہ سید جلال الدین حسین سرخ بخاری ——————— بخارا میں ۱۱۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ بہ عہد سلطان شمس الدین التمش بخارا سے بھکر سندھ تشریف لائے اور مولانا سید بدر الدین بھکری کی صاحبزادی سے شادی کی۔ ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا سے خرقۂ خلافت حاصل فرمایا۔ اوچھ علاقہ بہاولپور میں سکونت اختیار کی۔ آپ کی پہلی شادی شاہ بخارا کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ فرزند سید احمد کبیر ان کی اولاد تھے۔ سید احمد کبیر بخاری کو ہمارے ہاں کی عورتیں شیخ سدّو کے نام سے جانتی ہیں۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید احمد کبیر کے فرزند اکبر تھے۔ سلاطین دہلی و گجرات مخدوم کے مرید تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے خرقۂ خلافت عطا فرمایا تھا۔ ۱۴۰۳ء میں انتقال فرمایا۔ مزار اوچھ شریف میں ہے۔ آپ کی اولاد تمام اقلیم ہند میں پھیلی ہے کوئی سرکار و صوبہ سادات بخاری سے خالی نہیں۔ یہ لوگ ماشاء اللہ مثل آفتاب کے ہیں۔

حافظ سید موسیٰ اور ان کے بھائیوں سے اکثر ہماری ملاقات رہی۔ پہروں خانۂ مسجد میں بعد نماز مغرب گفتگو جاری رہی۔ یہ چار دہ خانوادے کی ہوتی تھی طریقت علم و ربانی۔ علوم سلوک و تحصیل و اسمائے اعظم و ماہیت جن و بشر و مکاشفہ و ملکوت و جبروت و لاہوت و اسرار و وجد و خوف و قبضیت و محبوبیت و درویت و اذکار، و ابتدا و انتہا — ہر علم کے کمل حصول کے لئے عمر خضر چاہئے۔

ہم عرصے سے پردیس میں مقیم ہیں۔ حرم رکھنے کا رواج ختم ہو چلا ہے کس واسطے کہ شرفا کے پاس اب نہ پہلی سی دولت ہے نہ فراغت۔ یوں بھی ہمارے گھرانے میں عموماً ایک سے زیادہ شادیاں نہیں کی جاتیں۔ ہم نے البتہ بوجوہ تین شادیاں کیں۔ پہلی بی بی کا انتقال ہو چکا ہے دو بیبیاں بفضل خدا حیات ہیں۔ دو خورد سال فرزند سید ابوالحسن اور فرزند سید سلمہٗ اپنی ماں کے ساتھ لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ یہاں بہی خیر خواہوں نے کہا میر صاحب پردیس کی تنہائی دور کرنے کی غرض سے ایک شادی اور کر لیجئے کہ سلف سے ایسا دستور چلا آتا ہے اور شرعی گنجائش ابھی باقی ہے۔

انہی بہی خواہوں نے حافظ سید موسیٰ کے ہاں اُن کی چھوٹی ہمشیرہ سیدہ مریم خاتون کے لئے ہمارا پیغام بھجوایا۔ ہم ترمذی لوگ آٹھ سو سال ہند میں رہ کر بوجہ تمازت آفتاب ایسے ٹھیٹھ ہندوستانی بن گئے کہ فرنگی ہمیں بلیک مین کہتا ہے۔ یہ تازہ ولایت خاندان سرخ و سفید بلند و بالا، صحت مند اور شاندار لوگ ہیں۔

حافظ صاحب نے پیغام منظور نہ کیا۔ نام سے اُن کو شبہ تری ہوا کہ بندہ شیعانِ علی کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔
ہماری اطراف میں شیعہ سنی کی تفریق بہت زیادہ نہیں کہ خود ہماری برادری سادات نہٹور میں چند گھرانے اہلِ تشیع کے ہیں اور شادیاں بھی آپس میں ہوتی ہیں کہ سینکڑوں برس سے شادیاں فقط برادری میں کرنے کا دستور چلا آتا ہے۔ ہمارے نزدیک ضلع مراد آباد تو شیعہ اصحاب کی بہت بڑی اور تاریخی آماجگاہ ہے۔ مگر جاننا چاہئے کہ نواحِ کابل و توران میں اہلِ سنت و الجماعت اور فرقۂ امامیہ کے مابین بدگمانی شدید ہے۔
القصہ ہم نے ایک ڈاک گاڑی سے جو راول پنڈی جاتی تھی شقہ چند بزرگوں کو نہٹور روانہ کیا کہ پنڈی تشریف لا کر ان سرحدی لوگوں کو اصل کوائف سے آگاہ کریں۔
کچھ عرصے بعد (سفر پُر خطر ہے۔ گو انسدادِ ٹھگی ہو چکا ہے۔ پنڈ دادن خان کے علاقے میں ڈاکوؤں کی کثرت ہے) دو بزرگ نہٹور سے تشریف لائے۔ اور کوہاٹ جا کر حافظ سید مولٰی سے ملاقی ہوئے۔ کمال طباعی سے ان کو سمجھایا کہ نام تحصیلدار صاحب کا بندے علی نہیں بلکہ بندے عُلی ہے اور بولنے میں علی ہو گیا اور عُلی اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اسمائے میں سے ایک ہے۔ یہاں پر دانشمندانِ نہٹور کے ہم بھی قائل ہو گئے۔
حافظ صاحب نے اس تاویل پر یقین فرمایا اور ہمارا عقدِ شرعی ان کی بہن سیدہ مریم خاتون سے شربت کے پیالے پر ہوا۔
سیدہ مریم خاتون از بسکہ صاحبِ فہم و فراست، علومِ دین سے واقف اور شریف النفس، نیک طبع بی بی ہیں۔ ان کی علمیت پر البتہ ہم متعجب ہیں۔ کہ ہمارے گھر کی بیگمات تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے جاگیری ماحول اور سرحد کے اس مولوی گھرانے کے طرزِ زندگی میں بُعد المشرقین ہے۔ بہرکیف آج رخصت لے کر ہم بعد چند برسوں کے زوجہ صاحبہ کو وطن نہٹور لئے جاتے ہیں۔ گویا رباط کہن سے نکل کر حویلی کی سمت روانہ ہوتی ہیں۔
اگرچہ انگریزی عملداری میں بظاہر امن و بندوبست ہے لیکن گر بندے چند خفیہ شقے ایسے لے کر آئے ہیں جن سے ———

# باب ۸

## غدر ۱۸۵۷ء

مزاجِ دہر تباہ ہو چکا۔ رات کے آسمان پر سرخ مریخ دہک کے انگارہ ہو گیا۔ روزانہ دونوں وقت ملتے ایک دُمدار تارہ خلقت کو نظر آتا ہے۔ گاؤں گاؤں چپاتی بٹی۔ راتوں کے سناٹے میں ایک پُراسرار فقیر بھیانک آواز میں صدا لگاتا پھرتا تھا۔
منکہ میر احمد علی ترمذی ابن حضرت اخوند آتا محمد بخش ترمذی نہٹوری میرٹھ چھاؤنی میں تعینات تھا۔ جب کمان افسر نے حکم دانتوں سے کارتوس کاٹنے کا دیا۔ سپاہیوں نے انکار کیا۔ بغاوت شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد اتفاقیہ توپخانے کا خلاصی میں میں سے گزرا اور بولا آج پریڈ کے میدان میں نہ ٹھہرنا، ہمیں حکم مل چکا ہے کہ باغیوں کو توپ سے اڑا دیں۔
دوسرے روز ایک صوبیدار نے انگریز افسر سے چغلی کی۔ فلاں فلاں مفسدین ہیں ان کو قید کیجئے۔ کمان افسر نے ستر سواروں کو جیل خانے میں ڈالا۔ بعد ازاں ان کو میدان میں لائے پابجولاں بازار میں سے گزارا۔ بالاخانوں پر سے اربابِ نشاط نے غیرت دلائی کہ چوڑیاں پہن لو۔
دوسرے دن ۱۵ ماہِ رمضان مبارک بعد نمازِ ظہر اس رسالے کے سپاہی مسلح ہو کر چھاؤنی پہنچے بنگلوں میں آگ لگائی، شدید نقصانِ جان و

مالِ اہلِ فرنگ ہوا۔

ہم بھی اس معرکے میں شریک تھے کیونکہ دین خطرے میں تھا۔

آدھی رات کو دلی مارچ کیا۔ ۱۶ تاریخ ماہِ رمضان مطابق ۱۱ مئی ہمارے ایک سوار نے ثمن برج کے جھروکے کے نیچے پہنچ کر میر فتح علی خاں داروغہ تختِ شاہی سے بات کرنا چاہی۔ میر صاحب اس وقت کنارِ جمنا خضری دروازے کے سامنے نماز پڑھتے تھے۔ سلام پھیر کے اونہوں نے استفسار کیا "کیا کام ہے؟" سوار نے کہا "فوج لایا ہوں۔ فوراً جہاں پناہ سے عرض کیجیے کہ ہم نے صاحبان کو میرٹھ میں قتل کیا اب اسی ارادے سے دلی آئے ہیں۔"

بعد اس کے جو کچھ ہوا سارے عالم کو معلوم ہے۔

ہم اس معرکے میں جا بجا لڑے۔ باڑھ بندوق کی، مگر اب توپ کا ہر سو پٹنے لگا۔ ہم نے اپنے مورثِ اعلیٰ کے فرزند ملک ابراہیم نشانچی لشکر شہاب الدین محمد غوری کو یاد کیا اور نعرۂ تکبیر اور نعرۂ حیدری بلند کر کے دشمنوں پہ جا پڑے۔ متعدد فرنگیوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔

بہت جلد غدر سارے دوآبے میں پھیلا۔ خاص ہمارے وطن قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں ایک خفیہ جماعت قائم ہوئی یہ بارہ ٹوپی والے کہلاتے۔ ان میں سید کرامت حسین، سید الطاف حسین، سید عنایت حسین، میراں امتیاز علی اور نواب رحمت خان وغیرہ شامل تھے۔

انہوں نے سرکاری چوکیوں پر شبخون مارے۔ سارے ضلع میں باغیوں نے مورچے کئے اور توپ کو آگ دی تفصیل جنگِ بجنور کی جو ہمارے برادرِ بزرگ بندے علی صاحب تحصیل دار کے دوست سید احمد دہلوی نے کہ اس وقت بجنور میں صدر امین تھے، رقم کی ہے، حالاتِ چشم دید بیان کئے ہیں۔ واقعات صحیح ہیں لیکن اندازِ بیان میں رویّے کا فرق ہے۔ سید موصوف روشن دماغ، عالم فاضل انسان ہیں۔ قوم کا شدید درد دل میں رکھتے ہیں یہ خیال ان کا یہ ہے کہ اس دورِ نکبت و ادبار میں حکومتِ انگلشیہ سے وفاداری مسلم قوم کے حق میں عین مناسب ہے۔

جس وقت ہنگامے کا بجنور میں آغاز ہوا۔ صاحب لوگ حسبِ معمول اپنی میم صاحبان اور بابا لوگ کو نینی تال اور کوہ منصوری بھیجنے والے تھے کہ یہ شہر انہوں نے کوہ ہمالہ کی چوٹیوں پر بطرز قصبہ جاتِ ملک اسکاٹ لینڈ آباد کئے ہیں۔ سول لائینز بجنور میں صرف بیس عدد انگریز موجود تھا۔ مسٹر الگزینڈر شیکسپیئر، کلکٹر ضلع، جارج پامر، جنٹ مجسٹریٹ، ڈاکٹر رینٹ، سول سرجن۔ جانسن صاحب، مرنی صاحب وغیرہ۔ نیٹو افسروں میں بابو کالی چرن انگریزی نویس کلکٹری، ڈاکٹر تارا چند سین اسسٹنٹ سرجن اور ہمارے سید احمد دہلوی صدر امین۔

سید موصوف فرماتے ہیں: "میرٹھ میں فساد اور نمک حرامی دسویں مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی اس کی خبر گیارہویں تاریخ تک بجنور پہنچی۔ بارہویں تاریخ کو یہ خبر مشہور ہوئی اور پے در پے اس کے آثار نمودار ہوتے گئے۔ یعنی کنارِ گنگا جمنا راہ لٹنے لگی اور آمد و رفت مسافروں کی بند ہو گئی۔ ۱۸ مئی کو ایک کمپنی تلنگوں کی جو سہارن پور سے مراد آباد جاتی تھی، بجنور پہنچی۔ ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹا۔

"قیدی جیل سے نکل آئے۔ سب کے منہ دریا کی طرف تھے اور بھاگے جاتے تھے۔ کلکٹر خزانے پر آیا۔ مجھ صدر امین نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ کنوئیں میں ڈال دیا۔

---

۱؎ میر احمد علی "ترک سواران راجہ کرشن رائے" میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ راجہ کون تھا اور اس کی ریاست کا کیا نام تھا۔ ق ح

"ہزارہا گوجر گنگا وار اور گنگا پار کے لوٹ مار مچاتے پھر رہے تھے۔ اسی روز شام کو محمود خاں[1] مع ساٹھ ستر پٹھان بندوقچی کے بجنور پہنچا۔ اس رات بجنور میں بڑا اندیشہ رہا۔ جناب شیکسپیئر صاحب دام اقبالہ اور جناب مسٹر جارج پامر جو اخلاق و عنایت ہمارے حال پر فرماتے تھے ان اخلاق اور عنایتوں نے ہمارے دل میں ایسی محبت ان صاحبوں کی ڈالی تھی کہ محبت کے سبب ان صاحبوں کی نسبت جو وہم دل میں آتا تھا بُرا ہی بُرا دکھائی دیتا تھا۔"

"فلگے اب نگینے سے دھام پور پہنچے۔ وہاں ہر سکھ رائے لوھیا کے ہاں اس دن برات تھی۔ اس نے برات کا کھانا اور بہت اچھی اچھی مٹھائی لشکروں کو دی۔ اس لئے انہوں نے وہاں کچھ فساد نہیں کیا اور مراد آباد چلے گئے۔ گوجر، جاٹوں، میواتیوں اور بنجاروں کی شورش کے سبب ضلع میں زیادہ تر غدر ہوا۔ اور بجنور پر بھی ڈاکہ آنا مشہور تھا۔

"چودھریانِ ضلع حکومت کی کمک کو بلائے گئے تھے۔ ان میں سے چودھری رندھیر سنگھ رئیس ہلدور اور چودھری پرتاب سنگھ رئیس تاجپور مع سپاہیوں کے احاطہ کوٹھی کلکٹر صاحب میں مقیم ہو گئے۔ دیہات لٹتے رہے۔ مختلف پرگنوں پر ڈاکے پڑھے۔ باغیوں نے جگہ جگہ لام باندھے۔ ۲ جون کو کپتان گف صاحب مع سواروں کے میرٹھ سے خزانہ لینے آئے۔ اور پچاس ہزار روپیہ کنوئیں سے نکالا۔ سوار کم تھے اور ڈاکے والوں کے غول کے غول جمع تھے۔ مگر صاحب موصوف بہ کمال بہادری خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر براہ گھاٹ دارانگر میرٹھ چلے گئے۔ ۳۱ مئی تک سب اضلاعِ روہیلکھنڈ بگڑ چکے تھے۔"

اس پُرخطر وقت میں سیّد احمد رات رات بھر کلکٹر ضلع کی کوٹھی پر پہرہ دیتے۔ کرسی پر بیٹھے رہتے یا ٹہلتے۔ ان کے بہلانے پھسلانے سے باغیوں نے انگریزوں کو زندہ چھوڑ دیا۔

"اب اس وقت اور کوئی مصلحت نہ تھی بجز اس کے کہ ضلع کمبخت نا محمود خاں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جاوے۔" ۷ جون کی رات کو سارے صاحب میم لوگ مع سواروں کے ہاتھیوں پر سوار ہو کر میرٹھ روانہ ہو گئے۔ "سمجھو اس بات کو کہ وہ سب نمک حرام پرانے سوار گنگا کے کنارے پر سے نا محمود خاں کے پاس بھاگ آئے۔ نئے سوار رڑکی تک ساتھ رہے۔ وہاں پہنچ کر بگڑ گئے۔"

نواب محمود خاں نے صبح ہوتے ہوتے "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم نواب محمود خاں کا" کی منادی پٹوادی اور ضلع کا بندوبست شروع کیا۔ انہوں نے سیّد احمد اور دوسرے دیسی افسروں سے کہا کہ وہ حسب سابق اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔ سیّد احمد کو آزاد حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی اور جاگیر پیش کی مگر سیّد موصوف نے انکار کر دیا اور نواب سے کہا: "خدا کی قسم نواب میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لئے کہتا ہوں کہ تم اس ارادے کو دل سے نکال دو۔ حکام انگریزی کی عمل داری نہیں جائے گی۔"

اسی وقت منیر خاں جہادی نے نگینے سے بجنور پہنچ کر انگریزوں کو شہر سے زندہ نکل جانے کے جرم میں سیّد احمد خاں کو واجب القتل ٹھہرایا۔ پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر مدارس پر الزام لگایا کہ "عیسائی کتب ہر جگہ بانٹتا پھرتا تھا۔" منیر خاں نے سیّد احمد سے در مسئلہ جہاد بحث مباحثہ کیا، پھر دلی چلا گیا۔

جون کے مہینے میں بریلی کی باغی فوج کی کمان صوبیدار بخت خان نے سنبھالی۔ حافظ رحمت خاں کے پوتے خان بہادر خاں کو بہادر شاہ ظفر کی طرف سے صوبہ کھیٹر کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ بہادر خاں نے راجپوتوں کا تعاون حاصل کیا۔ شوبھا رام بنیا حکومت کا دیوان مقرر ہوا۔

---

[1] نواب نجیب الدولہ کے پڑپوتے نواب محمود خاں

اب انگریزوں نے پٹھانوں اور راجپوتوں کی آزاد مشترکہ حکومت ختم کروانے کے لئے ہندو بغاوت کا انتظام کیا اور پچاس ہزار روپیہ اس مقصد کے لئے کپتان گورداتی کو دیا گیا۔ وہ ناکام رہا۔ مگر بجنور میں انگریز کے وفادار ہندو چودھری نواب محمود خاں کے خلاف صف آرا ہوگئے۔

سید احمد خاں لکھتے ہیں :۔

" غلغلہ ہوا کہ بہادر خاں نے فرمان حکومتِ ملک کٹیہار کا بادشاہ دہلی سے حاصل کیا۔ نا محمود خاں کو بڑا تردد ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ملک کٹیہار میں ضلع بجنور بھی شمار میں آجائے۔ چنانچہ عرضی بادشاہ کو بھیجی "

ادھر شیر کوٹ کے زمیندار نواب ماڑے خاں اور احمد اللہ خاں نے شیر کوٹ کے سب سے مالدار آسامی چودھری امراؤ سنگھ سے مطالبہ ادائیگی مال گزاری کا کیا۔ ۲۷ جولائی کو توپ میگزین شیر کوٹ پہنچ گئے۔

محمود خاں فرمانِ شاہی سے کہ بجنور آئے کہ " فدوی خاص لائق العنایت والاحسان امیر الدولہ ضیا الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ " انگریزوں سے چھینا ہوا مال خزانہ فوراً دلی بھجوا دیں ا

اس طرف احمد اللہ خاں نے امراؤ سنگھ سے روپیہ لے کر اپنا مطالبہ ایک لاکھ کا کر دیا۔ اب باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ احمد اللہ خاں نے حویلی پر توپ لگا دی۔ ماڑے خاں اور دوسروں نے حویلی لوٹی۔ بہت سے ہندو مارے گئے۔ امراؤ سنگھ نکل بھاگے گڑھی فتح ہوئی۔ سارے چودھریوں نے مل کر احمد اللہ سے گڑھی چھیننے کا ارادہ کیا۔ دھام پور میں چودھری صاحبان توپیں لے کر جمع ہوئے۔

" دیہہ بدیہہ گنواری بگل یعنی ڈھول واسطے جمع ہونے اور لام بندی بجنے لگا "

سید احمد خاں صحیح فرماتے ہیں کہ اب تک بجنور میں تنازع عداوت یا مذہبی تکرار نہ تھی۔ چودھریوں کے ہاں مسلمان اور ہم مسلمان زمینداروں کے ہاں ہندو ملازم تھے۔ مگر اب باقاعدہ ہندو اور مسلم ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ شیر کوٹ کا مندر مسمار ہوا۔ کئی مسجدیں شہید ہوئیں۔ افواہ پھیلی کہ احمد اللہ خاں نے محمدی جھنڈا کھڑا کیا ہے۔

شیر کوٹ کی دوسری لڑائی میں احمد اللہ کی سپاہ مغلوب ہوئی۔ اس کے بعد ہلدور کے چودھریوں نے بجنور پر چڑھائی کر دی۔ نواب محمود خاں کو بھاگ کر نجیب آباد جانا پڑا۔ چودھریوں نے کلکٹر کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ جس میں اس وقت تک نواب محمود خاں فروکش تھے گنواروں نے خوب سول لائنز کی کوٹھیاں لوٹیں۔

اب ڈونڈی پٹی " خلق خدا کی ملک بادشاہ کا۔ حکم چودھری نین سنگھ بجنور والے اور ہلدور کے چودھریوں کا " ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے محلے لوٹنے شروع کئے۔

" مذہبی عداوت کا جو بیج شیر کوٹ میں بویا گیا تھا۔ بہت بلند ہو گیا۔ چودھری نین سنگھ اور جودھ سنگھ اس بات کے درپے تھے کہ ہندو مسلمانوں کی تکرار نہ بڑھے۔ مگر وہ گنوار چودھریوں کی حیثیت کیا سمجھتے تھے "

نواب محمود خاں نے پھر بجنور پر فوج کشی کا بندوبست کیا۔

" دو دفعہ غلغلہ پڑا کہ نواب چڑھ آیا۔ چودھری جودھ سنگھ جو کنویں میں سے روپیہ تلاش کرنے کو بیٹھے تھے۔ ایسے بے اوسان گھر پہنچے کہ سب کی جان ہوا ہو گئی "۔ سید احمد خاں، سید تراب علی اور پنڈت رادھا کشن جو اب تک اپنے اپنے مکانوں میں دروازے بند کئے بیٹھے تھے۔ ان کو

یقین ہوگیا کہ نواب ان کی جان نہیں بخشے گا ۔ چنانچہ یہ تینوں چودھری مین سنگھ کے ساتھ ہلدور پہنچے اور وہاں سے انہوں نے اور چودھری صاحبان ہلدور نے میرٹھ عرضیاں بھیجیں کہ فوج انگریزی بجنور بھیجی جائے ۔ وہاں سے مسٹر ولسن جج و اسپیشل کمشنر کا جو خط آیا ، وہ قابل غور ہے ۔

" رفعت وعوالی مرتبت گرامی قدر چودھری امراؤ سنگھ سلمہ الرحمٰن ۔ اس قدر ظلم یعنی غارت گری جان و مال و قتل عزیزان تمہارا پٹھان لوگ نہ کرنے تو تم سب رؤسا ہنود یک دل ہو کر کیوں ان کو نکالتے ۔ اب تم سب ہنود نے اتفاق کرکے اس حاکم نو کو نکال دیا ۔ اب بفضل خدا سب تکلیف تمہاری جلد ۔ رفع ہو جاتی ہیں ۔ شکسپیر صاحب بھی پہاڑ سے بلائے گئے ہیں اور ہم مقدار کی فوج معتبر سے کر عنقریب آویں گے ۔ حال لگانے توپ کے آپ کے مکان پر بہ نسبت بجا نجہ نواب خاص جو آپ نے لکھا ہے ۔ سو اہل ہند جنہوں نے توپ نہیں دیکھی وہ توپ سے بہت ڈرتے ہیں ۔ اگر یہ پٹھان لوگ تم اہل ہنود پہ توپ لگا دیں تو یہ تدبیر کرنی چاہئے کہ ـــــ " وغیرہ وغیرہ

سید احمد خاں اور محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر ہلدور سے بجنور آئے اور ضلع کا انتظام بحکم ولسن صاحب اپنے ہاتھ میں لیا ۔ جب ضلع ہمارے سپرد ہوا میری دلی یہ تھی کہ پہلے الفاظ منادی کے یعنی خلق خدا کی ملک بادشاہ کا حکم کمپنی بہادر کا ۔ بدلے جاویں اور پکارا جاوے کہ ملک ملکہ وکٹوریہ شاہ لندن کا ۔ تاکہ عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھیں کہ درحقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے ۔ لیکن بلا اجازت حکام ، اس باب میں لئے دینی دوسرے وقت پر موقوف رکھی ۔"

محمد رحمت خاں و سید احمد خاں نے ۱۶ اگست کی رپورٹ میں مسٹر جارج پامر کو مطلع کیا کہ " سوا پرگنہ نجیب آباد سب طرف امن ہے ۔ قصبہ نہٹور اور سیوہارہ وغیرہ میں کچھ لوگ بارادہ فساد جمع ہوئے تھے ان کو متفرق کرنے کے لئے تدبیریں کی گئی ہیں " ۔ محمود خاں جنگ کی تیاری میں مصروف تھے کہ محرم آگیا جس میں مزید فساد ہونا لازمی تھا ۔ سکھ رجمنٹ مظفر نگر پہنچنے والی تھی ۔

نگینے میں بشنوئیوں[1] اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی ۔ احمد اللہ خان نے یکم محرم ، ۲۲ اگست توپ نکالی ۔ محمدی جھنڈا کھڑا کیا ۔ نگینہ پہنچ کر بشنوئی سرائے پر توپ لگا دی ۔ بشنوئی مکان جلا دیئے گئے ۔ سید تراب علی تحصیلدار نے قتل کا حکم دیا ۔ مگر چونکہ سب پٹھان سید کا قتل برا سمجھتے تھے اس لئے ان کی جان بخشی ہوگئی ۔ ۲۶ اگست کو احمد اللہ خاں ماڑے خاں وغیرہ نے ہلدور پر چڑھائی کے ارادے سے نہٹور کوچ کیا ۔ ۲۷ کو چودھری رندھیر سنگھ وغیرہ نقارہ بجاتے ، نشان اڑاتے ، توپ اور جزائل کے ساتھ مقابلے کو روانہ ہوئے ۔ نہٹور سے احمد اللہ خاں کا لشکر چلا ۔ بان ندی پر مقابلہ ہوا ۔ چودھری صاحبان پسپا ہوکر ہلدور میں داخل ہوئے جہاں خندق کھدی تھی ۔ دمدمہ بنا تھا ۔ یہ توپیں لارڈ لیک نے نواب محمد بخش والی فیروز پور جھرکہ کو دی تھیں اور چودھریوں نے نیلام شمس الدین خاں کے وقت خرید لی تھیں ۔ اب نواب کی توپ نے گولہ باری شروع کی ۔ ہلدور میں زبردست آگ لگی ۔ اس کے بعد احمد اللہ خاں بجنور آگئے ۔

احمد اللہ اور ماڑے خاں کا ارادہ تھا کہ ہلدور فتح کرکے تاجپور پر چڑھائی ہوگی ۔ نہٹور میں منادی ہوگئی تھی کہ ہلدور اور تاجپور کی لوٹ معاف ہے ۔ دوسرے روز ہلدور میں قتل عام ہوا سارا ہلدور جل گیا " پھونس کا نام ہلدور سے جاتا رہا ۔ یہاں تک کہ اگر کوئی چڑیا ایک پھونس کا تنکا اپنا گھونسلہ بنانے کو قرض مانگتی تو بھی نہ ملتا " ۔

---

[1] مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری کا معتقد فرقہ ۔ مخدوم کی مجسم پیر کے نام سے پرستش کرتا ہے ۔

اس وقت سید احمد دہلوی اور سید تراب علی ہلدور میں چودھریوں کی حویلی کے اندر پناہ گزین تھے۔ ۱۹ کی رات بوقت تمام پیادہ پا وہاں سے نکلے اور باغیوں کی یورش جیسے موت کے منہ سے بچتے میرٹھ پہنچے۔ ۲۰ اگست کو احمد اللہ خاں نے ہلدور پر حملہ کر دیا۔ لیکن جب گڑھی فتح نہ کر سکا تو نہٹور پہنچے۔ یکم ستمبر کو نہٹور سے بجنور کو کوچ کیا۔

ہلدور کے دوسرے معرکے کے بعد تمام ضلع پر نواب محمود خاں کا تسلط قائم ہو گیا۔ کچہری کی نئی مہریں بنیں جن پر "واللہ ملک السموات" بڑھایا گیا۔ سنہ عیسوی کے بجائے سنہ ہجری اور ضلع بجنور کے بجائے حکومت نجیب آباد لکھا گیا۔ نواب کے معتمد سعد اللہ خاں تحصیلدار نگینہ نواب کی طرف سے چودھریوں سے صلح صفائی کرنے کی غرض سے نہٹور گئے۔ مگر چودھریوں نے صلح نہ کی۔ ۱۸ ستمبر کو ہلدور کے چودھری نواب سے پھر لڑے۔ اور پھر ہار گئے۔ اب سعد اللہ خاں نے ان کو لکھا۔ غور فرمایئے کہ قدیم وضعداری اور اخلاق کا کیا عالم ہے:

"چودھری صاحب مشفق و مہربان دوستان سلمہ اللہ تعالیٰ بعد سلام شوق واضح ہو خط تمہارا پہنچا۔ حال دریافت ہوا۔ ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ایام کچھ بُرے آگئے ہیں۔ ورنہ ہرگز تم سے ایسی بات ظہور میں نہ آتی کہ تم مجھ سے اندیشہ کرتے ہو۔ اور میں تم کو اپنے فرزند سے کمتر نہیں جانتا جبکہ تم میرے کہنے سے باہر ہو تو پھر کیا علاج کروں۔ چاہیے کہ بلا اندیشہ تم میرے پاس نگینہ چلے آؤ۔ اور اگر ایسی ہی بیت و لعل میں رہو گے خراب اور برباد ہو جاؤ گے۔ جب تم مجھ کو اپنا مربی جانتے ہو تو پھر کیا خوف ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

صلح صفائی کی اس کوشش کے بعد نواب محمود خاں کا بڑا بیٹا غضنفر علی خاں مع ماڑے خاں و لشکر کے نہٹور روانہ ہوا تاکہ اگر چودھری صاحبان حاضر نہ ہوں تو ہلدور پھر تباہ کر دیا جائے۔ اب نہٹور کے ٹیکہ راج سنگھ وغیرہ کے ذریعے چودھری رندھیر سنگھ کو پیغام بھیجا گیا۔ اور وہ نہٹور آنے پر راضی ہو گئے۔ ۲۵ ستمبر کو انہوں نے نہٹور میں نواب غضنفر علی خاں سے ملاقات کی۔ ایک پیش قبض اور پچاس روپے گزرانے۔ غضنفر علی خاں نے ایک دوشالہ بطورِ خلعت دیا۔ پھر چودھری امراؤ سنگھ بھی نجیب آباد گئے۔ نواب محمود خاں کو اشرفیاں نذر کیں۔ نواب نے دوشالہ عطا کیا۔

چودھری امراؤ سنگھ شیر کوٹ سے نجیب آباد روانہ ہوئے ہیں کہ غضنفر علی خاں اور ماڑے خاں نے دوبارہ ہندوؤں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ہلدور پر حملہ کیا گیا۔ ہلدور کی تیسری لڑائی میں گڑھی فتح ہو گئی۔ ۲ نومبر کو احمد اللہ خاں کا لشکر حویلی میں داخل ہوا۔ چودھری رندھیر سنگھ کو گرفتار کر کے نجیب آباد لے گئے۔ چودھریوں کے مکانات جلا دیئے گئے۔ ہلدور میں لُوٹ پڑنے لگا۔

۲ نومبر کو ہلدور روانگی کے وقت نواب ماڑے خاں نے چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور کو خط لکھا۔

"چودھری صاحب مشفق و مہربان کرم فرمائے۔ بہر حال نیاز منداں چودھری پرتاپ سنگھ سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام شوق ایں کہ ارادہ لشکر ایں جانب بطرف تاجپور است کہ آں صاحب تدبیر رسد وغیرہ سازند چناں نشود کہ بہ کسے نہج ضعیف مردمان لشکر را شود۔ باقی خیریت است

فقط رقیمہ الشوق

ماڑے خاں از مقام چاندپور"

یہ پروانہ ملتے ہی بے چارہ چودھری ڈر کر گڑھ مکتیشر چلا گیا۔

اب احمد اللہ خاں نے تحصیل داران ضلع کے نام پروانہ جاری کیا جو معافیات عہد انگریزی میں ضبط ہو کر بحق مفرور ہو گئی ہیں۔ وارثان کو معاف و بحال رکھی جائیں گی۔

۱۶ فروری ۱۸۵۸ء کو شیکسپیئر و پامر صاحبان رڑکی پہنچے۔ چودھریان ضلع بجنور نے جو گنگا پار پناہ گزین ہو چکے تھے۔ ان سے رڑکی جا کر ملاقات کی۔ رڑکی میں انگریز سرکار روہیل کھنڈ پر حملے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ادھر بجنور میں غضنفر علی خاں اور ماڑے خاں کے مابین نئی مقبوضات کی ملکیت کے بارے میں جھگڑے شروع ہو گئے۔

فتح لکھنؤ کے بعد سر کولن کیمپ بل نے فوج روہیل کھنڈ بھیجی بریگیڈیر جونز کی قیادت میں گورا اور سکھ فوج نے ۱۴ اپریل کو گنگا پار اتر کر نواب محمود خاں کے لشکر کو شکست دی۔ نواب کے سپاہی منتشر ہو کر جنگلوں میں جا چھپے۔ جب انگریزی فوج مالن ندی پر پہنچی تو نواب کی طرف سے تین توپ کی آواز آئی، مگر نجیب آباد خالی ہو چکا تھا۔ شہر میں آگ لگا دی گئی۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں: "نہایت افسوس ہے کہ ہمارے حکام کو اس طرح سے شہر کا جلانا منظور نہ تھا۔ شاید اتفاقیہ آگ لگی۔"

نواب محمود خاں کا محل بارود سے اڑا دیا گیا۔ ۲۴ کو نواب کے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں کو بحکم جنرل جونز گولی مار دی گئی۔ ماڑے خاں، احمد اللہ خاں، دلیل سنگھ گوجر اور دوسرے باغیوں نے آخری مورچہ نگینہ میں لگایا۔ اس میں بھی سرکار کو فتح و نصرت حاصل ہوئی شیکسپیئر و پامر صاحبان مع توپہائے غنیمت نگینۃ الفتح و فیروزی بجنور میں داخل ہوئے۔ پھر انگریزی لشکر نے مراد آباد کو کوچ کیا۔ ۲۶ تاریخ سے سید احمد نے کچہری صدر امینی کھول دی۔ انتظام ضلع حیرت انگیز سرعت سے درست ہو گیا۔ جنگل کی راہیں صاف ہو گئیں، تجارت جاری ہو گئی۔

گیارہ ماہ تک روہیل کھنڈ آزاد رہا۔ جب مئی ۱۸۵۸ء میں انگریزی افواج چاروں طرف سے روہیل کھنڈ میں داخل ہوئیں۔ اس وقت خان بہادر خاں کے غازیوں اور ہائی لینڈرز کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ ادھر سے فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شہزادہ فیروز بخت اور ملکہ حضرت محل کی افواج نے شاہجہاں پور پر حملہ کیا مگر بریگیڈیر جونز ظفر مند رہا۔ مولوی احمد اللہ شہید ہوئے۔ نواب محمود خاں کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ مگر انہوں نے جیل میں انتقال کیا۔ بوڑھے خان بہادر خاں بریلی میں تختہ دار پر چڑھے۔ فرخ سیر کا نواسہ فیروز بخت مراد آباد میں خستہ حال فاقے کرتا فقیروں کے بھیس میں لڑتا پھرا۔ آخر شکست کھا کر ایران چلا گیا اور سنتے ہیں وہاں سے زار روس کی عملداری میں پناہ لی۔ میں میر احمد علی یہ سب واقعات دہراتا ہوں تو دل خون ہوتا ہے۔

ہم اس جنگ میں کیوں ناکام رہے؟ مراد آباد برطانیہ کے وفادار نواب رامپور کے زیر اثر تھا۔ بجنور میں ہندو مسلم خانہ جنگی ہوئی۔ اگر سارے ہندو انگریز کے حمایتی نہ تھے۔ بجنور کے راجپوت باغیوں میں ہمارے رائے بھوپ سنگھ پیش پیش تھے۔ البغاوت کے بیشتر قائدین کے ذاتی مقاصد جداگانہ تھے۔ کچھ اپنا تاج و تخت واپس حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کوئی آپس میں متفق نہ تھا۔ ادبار نے عقلیں سب کی زایل کر دی تھیں۔ جنگ حمقاً باوانایانِ فرنگ۔

آپس کی پھوٹ ہندوستان کا پرانا خاصا ہے۔ اس پھوٹ نے اس سرزمین فردوس نشان کو ہمیشہ تباہ و برباد کیا۔
کجا ست فکر حکیمے و رائے برہمنے؟

# باب ۹

## گاگن ندی

ایک شخص نامعلوم نحیف الجثہ، طویل القامت، سفید فام، سیاہ داڑھی، صورت سے خوش مزاجی اور نیک دلی ہویدا ہے۔ طلعت سازگار ہو تو طبیعت باغ و بہار ہے۔ بذلہ سنج، ظریف طبیعت، ہنس مکھ، مگر قسمت یاور نہیں۔ کیا جانئے کون ہے۔ مسافر ہے یا رہزن ہے کہ مردان غیب سے ہے یا محض ایک خانماں برباد آوارہ دہلوی ہے ؎

برنگِ بوئے گل اہلِ چمن چمن سے چلے     غریب چھوڑ کر اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بے چارے کس چلن سے چلے     قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی[1]

یہ رُوحِ عصر تو نہیں؟

بندوق سنبھالے منہ دلائی میں چھپائے سردی سے کانپتا بانس کے جھنڈ میں پہنچ کر رستہ بھول گیا۔

راستہ بھول کر ان جنگلوں میں جہاں راجہ وشنیت کو شکنتلا ملی تھی۔ یہاں ہُو کا عالم طاری ہے۔ گیدڑ چلا رہے ہیں۔ کہاں کی شکنتلا۔ سب خام خیالی، طلسم، واہمہ، داستان طرازی۔ حقیقت محض وہ ہے جسے لندن اور کلکتے اور بمبئی کے انگریزی اخباروں میں چھاپے کی کلیں کھٹا کھٹ چھاپ رہی ہیں۔

سیسے میں ڈھلے حروف سَرسَر کرتے زنانے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

صریرِ خامہ نوائے سروش و روش کچھ نہیں۔

شوالک پر کہرہ اس طرح رواں ہے جیسے گنگا جی آنسو بہاتی شیو جی کی جٹاؤں میں واپس جاتی ہوں۔ مہرت بیر دھرتی کی کرلی۔ بُری جگہ ہے کچھ فاصلے پر گاگن ندی نظر آئی۔ شخص نامعلوم نے آسمان کو دیکھا۔ ہلکی سی سرخی ابھی باقی تھی۔ کنارے پر جا کر اکڑوں بیٹھا۔ فوجی بوٹ اتارے۔ پٹیوں پر سے گرد جھاڑی۔ وضو کیا۔ نمازِ مغرب ادا کی۔ سلام پھیرا اور کچھ دیر تک وہیں گھاس پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔

اس طرح جب وہ خاموش پانیوں کے کنارے بیٹھا۔ صحبتوں کو یاد کر کے روتا تھا۔ ناگاہ ایک ہیولہ ساحل کے برابر برابر چلتا دھندلکے میں جاتا نظر آیا۔ متأمل میں پکارا۔ یا ابو العباس۔

سوچا۔ جا کر قدم لے۔ رہبری کی التجا کرے۔ پھر خیال آیا۔ خاموشی بہتر ہے۔ اگر خواجہ خضر ہیں ہدایت خود بخود دل جائے گی۔

---

[1] فریاد دہلی از داغ دہلوی

کچھ دور جا کر ہیولہ ٹھٹکا۔ پلٹ کر مسافر کی طرف بغور دیکھا۔ اور یکلخت کہرے میں غائب ہو گیا۔

رات ہوئی۔ مسافر نے زنبیل میں سے تھوڑی سی بھنی مچھلیاں نکال کر کھائیں۔ تھرمس سے فوجی مگ میں پانی بھر کے پیا۔ اونی اوورکوٹ کی آستین پر منہ پونچھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ ندی کنارے سے اٹھا اور ایک سمت چلنا شروع کر دیا۔

چلا چل چلا چل جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اچانک سامنے ایک شکستہ محراب نظر آئی۔ تھکا ہارا اس کے نیچے جا بیٹھا۔ عمارت منہدم ہو چکی تھی۔ فقط محراب باقی تھی۔

شخص مذکور نے ٹانگیں پھیلائیں۔ مدکھول۔ پنڈلیوں کو دبایا۔ چلتے چلتے پاؤں سوج چکے تھے۔

چاند نکلا۔ عجیب بیہودہ سا چاند تھا۔ لاغر۔ فاقہ زدہ۔ یرقان کا مارا۔ آٹھا تی گیا۔ خدائی خوار۔

روشنی تیز ہوئی۔ گویا چراغ میں تیل پڑا۔ آسمان کے طاق میں رکھا کنول منور ہوا۔

ترائی کی سمت سے شیروں کے گرجنے کی آواز آئی۔

شخص مذکور نے اللہ اللہ کا ورد شروع کیا کہ "اللہ" اسم جلال ہے۔

گرمی سی محسوس ہوئی۔ پھر سردی کی لہر آئی۔ دانت سے دانت بجنے لگے۔ آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کر لیں تو چند لمحوں بعد پپوٹوں کے اندر سرخ روشنی سی معلوم ہوئی۔ جیسے شعلیں جلتی ہیں۔

پھر ایسا لگا جیسے سامنے ایک چوک ہے۔ چاروں طرف کاشی اینٹوں کے مکانات۔ دیواریں ان کی سبز اور سمرقندی ٹائلوں سے مزین۔ ان کی سفالی نقاشی تک بہت صاف دکھلائی دے رہی تھی۔ ایک مکان کہ سب سے اونچا تھا اس کے پھاٹک پر ایک حبشی تازیانہ لئے مستعد ہے۔ چبوترے پر نفیری اور نقارہ بجانے والے بندروں کی مانند اکڑوں بیٹھے۔

مکانوں کی آئینہ بندی کی گئی تھی۔ چوک کے وسط میں سفید رنگ کا پرانا چھتنا تھا۔ اندر کافوری شمعیں جھلملا رہی تھیں۔ جاجم اور شطرنجی کے فرش پر مسندیں لگی رکھی تھی۔ پیچھے ان کے مصور کاشانی پردے آویزاں تھے۔ بہت دھوم دھام معلوم ہوتی تھی۔

مگر سناٹا۔ آواز ایک سنائی نہیں دیتی۔ عجیب کرشمہ ہے۔ ایک محافہ لا کر ڈیوڑھی پہ رکھا گیا۔ ایک گل چہرہ حسینہ، سرخ و سفید رنگ، مصنوعی خال ذقن تھوڑی پہ نمایاں، کلاہ ترکی کے نیچے متعدد باریک باریک چوٹیاں گندھی ہوئی شانوں پہ پریشان۔ تافتہ کی سرخ قبا کے اوپر اونی قلچی پہنے، مرصع زیورات کلائیوں پہ گوہر کش، گلے میں ست لڑا، نقاب پوش نہیں تھی۔ لاہوری شال پستئی رنگ کی اوڑھے جس سے غازہ آلود چہرہ ذرا اوٹ میں تھا۔

محافے سے اتر کر پھاٹک کے اندر گئی۔ چوک زنگارنگ سامان سے بھر گیا۔ پٹارے، جامہ دان، بوغ بند، چھتری دار نقرئی چھپر کھٹ جس پر زریں اوقچہ بچھا ہوا۔ ادنیٰ کے اوپر ستون رکھے۔ اندر کی طرف ڈلردوں میں پیچھے پیچھے لائے گئے۔ ہجوم بڑھتا گیا۔ مگر وہی خاموشی۔

آنکھیں اس ڈر سے نہ کھولیں کہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔

یاد آیا بچپن میں سنا تھا کہ ایک نادار بڑی بی سلائی کر کے بسر اوقات کرتی تھیں۔ ایک شام پالکی لے کر دو کہار آئے۔ بولے ہمارے ساتھ چلیے۔ صاحبزادی کی شادی کا جوڑا سینا ہے۔ ضعیفہ، عفیفہ برقع سر پہ ڈال پالکی میں سوار ہوئیں۔ پالکی بستی سے نکلی۔ بہت دیر

ہو گئی۔ ضعیفہ نے گھبرا کر باہر جھانکا تو جنگل بیابان۔ کہاروں کے بجائے بکر گدھوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔ پل کے پل میں بکر گدھوں نے جنگل کے اندر ایک محل کے سامنے جا اتارا کہ شاہ جنات کا قصر تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یا مظہر العجائب۔ کیا ہم نے ابھی ابھی جنوں کی کارفرمائی دیکھی؟

آنکھیں کھولیں تو وہی سنسان ڈھاک کا جنگل۔ بغور دیکھا تو سامنے قدیم عیدگاہ نظر آئی۔ جس کی دیوار چاندنی میں چمک رہی تھی۔ یاد آیا یہ جانی پہچانی جگہ ہے۔ یہیں سے علاقہ صادق پور شروع ہوتا ہے۔ اسی جگہ سید حسن ترمذی کی قبر تھی جو پچھلی کسی مینار میں مسمار ہوئی۔ اب انیٹوں کا ایک تودہ باقی ہے۔[1]

جاڑوں کی ایسی ہی سرد اور طویل راتوں میں دادی اماں قصہ سناتی تھیں "ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ ہمایوں کے زمانے سے بھی پہلے اس جگہ پہ قاضی چمن کا مکان تھا۔" بڑے ہو کر اسی قدیم فارسی صحیفے میں پڑھا: "یہاں مدرسہ اسلامی و عربی فرمان روائے وقت کی طرف سے جاری تھا۔ سید ضیاء الدین جو سرکار سنبھل میں منصب چہار ہزاری افغانان پر فائز تھے اس قصبے میں تعینات تھے۔"

ضیاء الدین صاحب پھر واپس آ گئے ہو وہ کیا سامنے کھڑے ہیں۔ فلاسفہ کی کتابوں میں آیا ہے کہ ہمارے سارے اجداد ہمارے اندر زندہ ہیں۔ جسمانی اور مابعد الطبیعاتی دونوں طرح۔

ہم خود اس وقت میر ضیاء الدین کی آنکھوں سے اس سرد ویرانے کو تک رہے ہیں۔ ضیاء الدین کی آنکھیں اور ہماری آنکھیں ایک ہیں۔ ہمارے ہاتھ کسی اور گزرے ہوا کے ہاتھ ہیں۔ دماغ عقل و فہم یا ناسمجھی کسی اور بڑے کی عقل یا نافہمی ہے۔

خون ہزار ہا برس سے ان شریانوں میں گردش کر رہا ہے۔ تجدید تخلیق سوچ کر جھرجھری سی آتی ہے۔ مولانا روم نے کیا فرمایا تھا۔ کچھ ضرور فرمایا تھا۔ یاد نہیں آ رہا۔ حافظہ کمزور ہو چلا۔

چہار ہزاری افغانان پہ فائز تھے۔ مدرسہ پہلے قاضی ابو محمد بن قاضی قطب الدین عرف قاضی چمن کے زیر انتظام تھا۔ میر ضیاء الدین کے فرزند اکبر میر حسن اسی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ قاضی صاحب کی دوستی میر ضیاء الدین سے بہت استوار تھی جیسے آج کل ضلع کے جج اور کلکٹر میں دوستی ہوتی ہے۔

سید حسن تکمیل تعلیم کے بعد منصب سہ ہزاری پر فائز ہوئے۔ قاضی صاحب نے اپنی دختر سیدہ مہرالنساء سے ان کے عقد کی خواہش ظاہر کی۔

کتاب میں لکھا ہے کہ میر ضیاء الدین نے چندے سکوت اختیار کیا۔

قاضی چمن نے متعدد بار یاد دہانی کرائی۔ بارے میر ضیاء الدین نے منظور کیا۔ سید حسن کی شادی بعد کرو فر مہرالنساء خاتون سے ہوئی۔ بیٹی پیدا ہوئی۔ نام جاوید دولت رکھا گیا کہ اب تک نام ترکستانی رکھے جاتے تھے۔

ایک لڑکا محمد عارف تولد ہوا۔ دونوں بہن بھائی نا کتخدا جوان مرے۔ مہرالنساء اولاد کے غم میں روتے روتے اللہ کو پیاری ہوئیں۔

بعد کچھ عرصے کے میر حسن بسلسلہ کار منصبی مع لشکر کیتھل روانہ ہوئے کہ آبائی جائے ورود و قیام ان کے مورث اعلیٰ شاہ کمال الدین ترمذی کا تھا۔ اس تاریخی قصبے میں متعدد اولیا کے خانوادے آباد تھے۔ ان میں ایک خانوادہ شاہ جمال کا تھا کہ امام باقر علیہ السلام کی اولاد تھے۔ ان کے اخلاف

---

[1] یہ مزار ۱۹۲۱ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

میں سید محمد احسن باقری کے توسل سے سید حسن کی ملاقات ہوئی - ان کی بیٹی سیدہ سعید النسا کو بیاہ کر سید حسن نہٹور واپس تشریف لائے -

"قاضی چمن کے مشورے سے مدرسے کے مکان میں قیام کیا۔"

کتاب میں آیا ہے کہ اس وقت مدرسہ عالیہ کی عمارات شہریار وقت کی طرف سے وقف تھیں۔ بعد ازاں میر ضیاء الدین کے نام منتقل کی گئیں۔ اسی اثنا میں، مشہور واقعہ ہے، کہ میر ضیاء الدین شاہی فوج لے کر اودھ روانہ ہوئے جہاں راجہ کھیرا گڈھ حکومت سے منحرف ہوا تھا۔ معرکے میں شہید ہوئے۔ بعد شہادت پدر میر حسن نے کہ سنبھل میں تعینات تھے - ملازمت شاہی ترک کی - جب میر حسن اپنے پروردگار کی طرف لوٹے - مزار ان کا نہٹور کے باہر جانب غرب اسی عید گاہ کے نزدیک تعمیر ہوا۔

لکھا ہے کہ سید حسن کے فرزند اکبر سید علی گھوڑا بخش کی شادی سیدہ شوکت النسا دختر سید محمد باقر عامل شاہی سے ہوئی - ان کے بیٹے سید محمد تقی نے سید اسد اللہ زیدی کی لڑکی فضیلت النسا سے عقد کیا۔ سید اسد اللہ زیدی بھی سرکار سنبھل میں عہدیدار اور امروہے میں تعینات تھے۔ سادات بارہہ سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ دور مغلیہ تھا۔

فتوئی اور اوور کوٹ کے باوجود ٹھنڈ سے جسم ہے کہ اکڑا جا رہا ہے - ایک ماچس جلائی جائے -

چند خشک پتے اور ٹہنیاں جمع کر کے الاؤ سلگایا۔ ذرا جان میں جان آئی۔ ٹانگوں کو آرام ملا - نیم غنودگی طاری ہوئی۔ شعلوں میں سرخ رنگ کی ایک فلک بوس عمارت سی نمایاں ہوئی ۔غور سے دیکھا تو قلعہ اکبر آباد تھا۔

جیسے ایک کنگھڑا سا ہے - سنگ سرخ کا - اس میں ایک شاندار بزرگ کھڑے ہیں - ہو نہ ہو یہی سید عبدالنبی مفتی صدر جہاں[1] ہیں ایک بے حد خوش قسمت سکڑ دادا - وہی ہوں گے - ورنہ ہمیں کیوں نظر آتے - رومی خلعت چار قبا اور دو شالہ - ملائم اور گرم -

کس قدر سردی ہے - کوئی ہاری شکستہ ہو چکی - ٹوٹ چلتے چلتے بھاگتے بھاگتے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں -

چند پتے تھے سو جل کر خاک ہوئے - ایک دیا سلائی اور جلایا چاہیئے -

---

[1] نواب سید صدر جہاں سلطنت جلال الدین محمد اکبر و جہانگیر میں صاحب نوبت وصدر الصدور یعنی ہم پایہ وزرائے سلطنت تھے۔ (تذکرہ سادات نہٹور)

"میر صدر جہاں از علما است و مدتی مفتی بود۔ حالا صدر الصدور است۔ طبع نظم دارد" طبقات اکبری ص ۴۹۲

بہ ذیل ذکر علما و فضلا کہ در ایام سلطنت خلیفہ الٰہی در سواد اعظم ہند بودہ اند - امیر صدر جہاں صدر الصدور ہندوستان است و بفضائل کمالات موصوفست "

بہ ذیل ذکر اسامی امرائے نامدار ص ۲۸۹ طبقات اکبری مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۲ھ (بشکریہ قاضی عبدالودود و عابد رضا بیدار ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ)

تزک جہانگیری ص ۲۰ مطبع نظامی کانپور (بشکریہ سید شمیم حسن زیدی)

مفتی صدر جہاں کے بیٹے سید نظام کو شاہجہاں نے خطاب مرتضیٰ خاں عنایت کیا جو امرائے مغلیہ کا ایک خطاب تھا۔ محمد فرید احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے سرپرست اسی سبب مشہور "مرتضیٰ خاں" تھے ۔

کیا خوش گوار دل خوش کن منظر ہے ۔ آ ہا ہا ۔ وہی سگڑ دادا مرصع خنجر و شمشیر خلعت خاصہ ڈانٹے کھڑے ہیں ۔ بھئی بہت اچھے ۔ زمرد علیؔ سے ہیں ۔ مگر مالا ابھی پہن رکھی ہے ۔ اس کا لعل بدخشاں کو ہر شب چراغ کی مانند ۔

تیل ختم ہو گیا ۔ تیسری جلائی تو اندھیرا تھا ۔

مگر ہر فرد بشر اپنے حاضرات الخیال اپنا عالم رویا رکھتا ہے ۔ جس میں کوئی دوسرا شامل نہیں ہو سکتا ۔ جس طرح ہم کسی دوسرے کی موت کی تکلیف نہیں چکھ سکتے کسی اور کے خواب ہمیں نظر نہیں آتے ۔ ہر انسان کے دن رات صبح شام لمحات منفرد اور علیحدہ ہیں ۔

عذاب قبر ۔ وہ سزائیں جو تم بھگتو گے اس حس کے ذریعے سہو گے جو صرف تمہاری حس ہو گی اور جو زندگی میں تمہیں حاصل نہیں ۔

اس عالم سے اس صاحبِ خاص ذہان فرشتے اور وحی اور الہام اور رویا بن کر آتے ہیں ۔ سہروردیؒ نے کہا تھا یا ابن العربیؒ نے ؟

ابھی اجنہ کی ایک جماعت ادھر سے گزری ۔ سب کی صورتیں مختلف ۔ رجال الغیب ہوا میں اڑتے پھر رہے ہیں ۔ اخیار اور ابدال اور اوتاد اور اقطاب سے گروہ آسمان پر پل رہے ہیں ۔

سارا عالم قوس قزح میں تبدیل ہو گیا ۔

لاہیج ۔ مازندران ۔ تبریز ۔ گنجہ ۔ باکو[1] ۔ تیز ہواؤں کے راستے ، ہزاروں میل دور ۔ شمس الدین لاہیجی ۔ محمود شبستری[2] ۔ نجم الدین کبریٰ ۔ روزبہان شیرازی ۔ اس وقت تک جانے کہاں پہنچ چکے ہوں گے ۔ دنیا سے بہت دور ۔ ان کا زمانہ ہو گیا اور وہ دنیا سے بہت دور چلے گئے شاید معدوم ہو چکے ہوں کیا پتہ ۔

ہمائے لاہوت کا آشیانہ کہاں ہے ؟

مقام نصیرا ۔ مقام محمود ا ۔ سب کی سیر کر لی ۔ انوار پہلے سبز رنگ کے ظاہر ہوئے پھر سپید پھر عقیق ۔ سب سے آخر میں نور سیاہ کے جبروت کا نور ہے ۔

اپنے برزخ میں معلوم کیا تھا ۔ صورت شیخ ۔ ذات ، وجود مطلق ۔ صفات ، ساتوں امام ۔ حیات اور علم اور قدرت اور ارادہ اور سمع اور بصارت اور کلام سب مبہوت ۔ بے بس ۔ ناکارہ ۔

جل جلالہ

جب یار لوگوں کے پاس فرصت ہی فرصت تھی ۔ کان بند کر کے اور کھلے کانوں سے صوتِ سرمدی بھی سن لیا کرتے تھے ۔ جیسے پانی مسلسل اوپر سے گر رہا ہو ۔ اس شغل سے ربودگی اور بے خودی اور غیبت طاری ہوتی کہ فنا الفنا کا مقدمہ تھی ۔

مگر یہ جہان رنگ و بو ہی بہت دشوار گزار ثابت ہوا ۔ فنا فنا اور بقا البقا تک کون پہنچا ۔

ذرا سنو تو ۔ پانی تو ہیم گر رہا ہے ۔

---

[1] باکو ۔ تیز ہوا کا راستہ ۔ (سوویٹ آذربائیجان)

[2] آذربائیجان کے صوفی ، مصنف گلشن راز

یہ چوک جو سامنے ہے۔ جو صرف مجھے نظر آتا ہے۔ اس میں ہجوم اسی طرح موجود ہے۔ مدرسے کے لڑکے رشیدی، احدی، کلاہ پوش لمچی اور عباؤں میں ملبوس بخاری۔

بی بی مہرالنسا بنت قاضی چمن تافتہ کی سُرخ قبا پہنے، سید حسن کی دلہن۔ پالکی اُن کی پھاٹک کے اندر گئی۔ زمین کے اندر اتر گئی۔

بی بی تا دیدہ دولت۔ مال شکاچہ طوری خانم؟

خاموشی اتل ہے۔

سعید النسا۔ شوکت النسا۔ فضیلت النسا۔ کرن پھول اور جوشن اور نونگے اور گلوبند پہنے چھم چھم کرتی ہوئیں۔ ہزار برس کی نیوبی پالکیوں سے اُتر رہی ہیں۔

بی بی جاذیہ دولت۔

بی بی گل رخ، گل چہرہ خانون۔ ماہ نور بیگم۔

مٹھی مٹی۔

گرگٹ، تکرٹ، کانٹے۔

سلیمانؑ۔ بادشاہ نے قصر بنوایا۔ اس کے شہتیر کو دیمک لگ گئی۔

ایک کیڑا یہ میٹھا کر دن بھر میں رتی رتی کھائے۔ تو پانچ سو برس میں تیرہ سو برس میں تین اور چار ہزار برس میں کتنا کھائے؟

قصیؑ[1] بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی سے لے کر عدنان ثانی تک اور ان سے کئی پیڑھی قبل عدنانؑ[2] اول تک کہ جب بخت نصر کے ہاتھوں خاتون اقوام یروشلم بیوہ ہوئی۔ خدا نے مخالفوں کا سینگ بلند کیا۔ شہر پناہ کے دروازے زمین میں غرق ہوئے۔ فاتح نے حکم دیا۔ مفتوح سترفا رکو، قاصی علوم کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ قصر شاہی کے دربار میں کھڑے ہو سکیں اور ان قیدیوں میں دانیال تھا جس نے دجلہ کے کنارے بیٹھ کر اپنے رویا دیکھے۔

اور عدنان اوّل سے کئی پیڑھی قبل قیدار[3] بن اسمٰعیلؑ جس کا دادا ابراہیمؑ سفید گدھے پر سوار باب عشر سے گزرتے ہوئے اپنے رویا دیکھتا تھا۔

اور ان سب کا خون چار ہزار سال سے ہماری شریانوں میں گردش کر رہا ہے۔ اور ان انبیاء کے رویا میں ہم سب شریک ہیں۔ لیکن آلِ یعقوبؑ کی قسم ان میں سے بہت سے رویا ایسے ہیں کہ ان کے اور ہمارے درمیان آنسوؤں کا مینہ مسلسل برس رہا ہے۔

---

۱۔ رسول اللہ کے اجداد۔

۲۔ عدنان اوّل کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے۔

۳۔ اٹھارھویں صدی قبل مسیح

عابد بھائی - کتنا روئے - ساری عمر روتے گزری -
مولا علیؑ نے کہا تھا - جو کچھ میں جانتا ہوں تم کو بتاؤں تو تمہارا دل دہل جائے گا - باؤلے ہو جاؤ گے -
چاندنی عیدگاہ کی دیوار سے اتر گئی - محراب تنہا کھڑی ہے - اس کی دوسری طرف عالم ملکوت ہے - محراب خالی چوکھٹے کی مانند افق پر اڑ گیا ہے - ایک ایک کر کے اس کی اینٹیں گر تی ہیں - ایک اینٹ عمر یا شتہ جو نشہ سال میں دیوار سے گر کر خاک میں مل جاتی ہے -
ابھی سب موجود تھا - ابھی سب غائب
محراب اور عقاب اور قرب اور بُعد اور حضور اور غیب اور جب اس کا بھی علم نہ رہے تو فنا فنا -
دیاسلائی کی ڈبیا ختم ہو گئی - بریلی کے بازار سے خریدی تھی -
شخص نامعلوم اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑا ہوا - بندوق کندھے سے لٹکائی - چاند ڈوبنے والا ہے - تاریکی خوفناک ہے -
روشنی -

اندھیرے میں دو درخت پھانسی کی مانند نظر آ رہے ہیں - موت کسی بہانے سے آ سکتی ہے - مرصّع خنجر کا وار - زندان کے دروازے پر جلاد کی دستک -
روشنی -

یا مرد منور مقدم الغائب صدیوں کے راستوں پر بندۂ خاکی کے ہمراہ ہے -
پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا -
سامنے یہ خدقرآن پاک کے ایک ایک حرف کی تلاوت کر کے طلوع آفتاب تک سارا کلام مجید ختم کر دیں گے -
صبح کاذب کے دھندلکے میں دو درخت پھر تختۂ دار کی صورت نظر آئے - شخص نامعلوم نے دل مسرت کے ساتھ مسکرا کر ان کی طرف دیکھا -
یا شیخ الغائب گواہ رہنا سب گواہ رہنا - میں مسلمان کی موت مر رہا ہوں -
لوئی سے چہرہ چھپا کر وہ شخص تیز تیز قدم اٹھاتا قصبے کی سمت روانہ ہوا -

## باب ۱۰

### کُجا بیابنت اور کُجا پائے مُور

پانچ سو برس سے محلۂ سادات اس سبز جھیل کے کنارے آباد ہے - پانچ سو برس سے افق پر بکھری شوالک کی پہاڑیاں چاند اور سورج کے سفر کے ساتھ ساتھ صبح سے شام تک طرح طرح کے رنگ بدلتی رہی ہیں - کاسنی، گلابی، سبز، زرد، خاکی، لاجوردی، سیاہ، سطح سمندر سے آٹھ سو فیٹ کی بلندی پر بسا ہوا قصبہ نہٹور، ہمیشہ سے خوشگوار اور خوش منظر رہا ہے - جھیل کے کنارے بانس کے جھنڈ سرسراتے ہیں - سطح آب پر سنگھاڑے اور کنول اور نیلوفر پھیلے ہیں - ایک طرف ڈونگی بندھی ہے - گرمیوں میں بچے یہاں پیراکی اور غوطہ زنی کا مقابلہ کرتے ہیں - ایک سرے پر مغل طرز تعمیر کا اونچا پھاٹک استادہ ہے - مختلف محلے تیر گران (واضح ہو کہ سمرقند و بخارا میں "محلہ تیرگران" آج تک آباد ہے) محلہ

دریا کلاں، دریا خورد، سوزری، وغیرہ سادات ترمذی کے منصب داری دور کی یادگار ہیں۔

جھیل جوڑی کہلاتی ہے۔ اس کے کنارے اخوند امام بخش نے ایک پلکھن بوئی تھی، سو اب وہ چھتنار ہو چکی۔ اس پلکھن کے نیچے باتیں ہو کر اُتریں، بیٹیاں وداع ہوئیں، باراتیں چڑھیں۔ بہوؤں کے ڈولے اُکر اُتارے گئے۔ اوّل منزل کے لئے ابد کے مسافر بھی یہیں سے اٹھائے جاتے ہیں۔

پلکھن کی چھاؤں اہلِ محلہ کے لئے کلب گھر کا کام دیتی ہے۔ ہمارے فری تھنکر اس کے سائے میں مجلس آرائی کرتے ہیں۔ گرمیوں کی دوپہروں میں جب دُور سے پن چکی کی آواز آتی ہے، آم کے باغوں میں رہٹ چلتے ہیں اور کوئل کوکتی ہے، اس وقت یہاں کمتری کھاٹوں پہ چوسر کا دُور کے لوگ بانگ تکیوں کے سہارے نیم دراز دُور کی کوڑی لاتے ہیں۔ غدر کے زمانے میں یہاں کبھی ہجوم رہتا تھا کبھی بالکل سناٹا۔ زخمیوں کے کھاٹ جرّاح اور طبیب کے انتظار میں یہاں لا کر رکھے جاتے۔ اسی چھتنار کے نیچے بہت سے جیالوں نے دم توڑا۔

ابھی طرفین سے بندوقیں بند نہیں ہوئیں۔ باغی جہاں تنہا نہتا فرنگی ملتا ہے مار ڈالتے ہیں۔ گو جانتے ہیں پکڑے گئے تو پھانسی سے مفر نہیں۔ دار پر کھینچے کو یہ بدنصیب سر بلندی کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ تلاوتِ قرآن کرتے کھٹ کھٹ پھانسی کی سیڑھیاں چڑھ جاتے ہیں۔ بعض روتے اور واویلا کرتے ہیں۔ میدانِ حشر کا سماں ہے۔

سنسان گلیوں میں لوگ قضا کے منتظر بیٹھے ہیں۔

جنوری ۱۸۵۸ء کی اس یخ بستہ رات ایک سایہ کچے راستے پر نمودار ہو کر جھیل کی سمت بڑھا۔ نجانے کن دھندلکوں سے نکل کر آ رہا تھا۔ منہ ولائی میں چھپائے تالاب کے کنارے آن پہنچا۔ دُور جولاہوں کی جھونپڑیوں پہ کہرا تیر رہا تھا۔ ایک جنگم بعین مین سادھو ڈنڈا سنبھالے کھڑاؤں پہ کھٹ کھٹ کرتا پگڈنڈی پہ سے گزرا۔ چند لمحوں میں صبح ہو جائے گی۔

بچارا چاند جو رات بھر اونچے پھاٹک کے اوپر منڈلاتا رہا تھا پھیکا پڑ کر اچانک غائب ہو چکا تھا۔ جیسے ہوا کے سرد جھونکے سے شہ نشین پر آویزاں قندیل بجھ جائے۔ سارے میں بڑا دہشت ناک سناٹا طاری تھا۔ سونا سب سنسار، جاگتا پاک پروردگار۔ شخصِ نامعلوم پھاٹک میں داخل ہوا۔ چند قدم آگے بڑھ کر ایک شاندار ڈیوڑھی پہ پہنچا۔ مہیب چوبی دروازے پر دستک دی۔

نزدیک کی تاریک گلی میں کوئی کھانسا۔ شخصِ نامعلوم نے چوکنے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ دوبارہ دستک دی۔

چند منٹ بعد اندر کنڈی کھڑکھڑائی۔ جیسے گھپ اندھیرے میں کوئی بڑی دقت اور خوف کے ساتھ تالا ٹٹولتا ہو۔ بوڑھی نسوانی آواز بڑبڑائی۔

"جل تو جلال تو ـــ"

کواڑ کی درز میں سے لالٹین باہر جھانکا۔

"صاحبِ کمال تو ـــ" آواز حلق میں پھنس گئی۔ ڈیڑھ سال سے بمشکل کوئی رات ایسی جاتی تھی جب مصیبت، تباہی، موت، طرح طرح کے بھیس بدلے سامنے نہ کھڑی ہو۔

"آئی بلا کو ـــ"

"تحصیل دار صاحب ہیں؟" اجنبی نے سرگوشی میں پوچھا۔
"ہاں تو —"
"بڑی بی — اے بڑی بی —" نووارد کی آواز میں ایسی لجاجت تھی کہ بڑھیا کا دل لرز گیا۔
"کون ہو میاں —؟"
"کلکٹر صاحب کا ہرکارہ ہوں گا۔ اور کون — بجنور سے آیا ہوں سیدھا۔"
ماما کو یقین نہ آیا۔
"بڑی بی۔ تم گلشن تو نہ ہو؟"
اصیل خاموش رہی۔ اللہ جانے کس حیاڑ و پیٹے ملکہ فرنگ نے بھیجا ہے۔ کاہے کہ باغیوں کا جاسوس بنے گا۔
"اری نیک بخت۔ باہر پالا پڑ رہا ہے۔ میں تحصیل دار صاحب کے لئے پروانہ لایا ہوں۔ ورنہ تو کھولو ذرا۔ تحصیل دار صاحب ہیں گے اندر؟"
"مجھے معلوم ہی نا ہیے۔ میں تو سوری پار سے کل ہی آئی ہے۔" ماما صاف جھوٹ بول رہی تھی۔ اجنبی کو یک لخت طیش آ گیا۔ بندوق کی نال کواڑ پر ٹکا کر بولا "تالا کھولو سیدھی طرح —"

"یا علی مدد —" ماما نے دہل کر فوراً تالا کھول دیا۔ نووارد نے کواڑ زور سے دھکیلا اور ڈیوڑھی کے اندر داخل۔
بڑھی اصیل گرتی پڑتی سرپٹ صحن کی طرف بھاگی۔ اجنبی نے کنڈی چڑھا دروازہ مقفل کیا اور ڈیوڑھی کے ایک کونے میں دبک کر اکڑوں بیٹھ گیا۔

دیوار کی دوسری جانب مویشی خانہ اور اصطبل تھا۔ بھوسے کی مہک سے اجنبی کو چھینک آ گئی۔ گھبرا کر چہرہ گھٹنوں میں چھپایا اور آیت الکرسی شروع کی۔

کچھ دیر بعد بندوق اُٹھائے کنٹوپ اوڑھے چینے لالٹین ہاتھ میں لیے تحصیل دار صاحب ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے میں آ کر جھلّائے گرجدار آواز میں پوچھا "کون ہے۔ بیٹھ جاؤ" دونالی بندوق اجنبی کے رخ کر دی۔

شخص نامعلوم اپنی بندوق ایک طرف پھینک کر بھوسے کے ڈھیر پر سے اُٹھا۔ آہستہ سے بولا "السلام علیکم۔ بھائی جان۔"

میر بندے علی نے ہکا بکا ہو کر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پریشان حال، پھٹے جوتے پہنے، گرد آلود، قزاقوں کی طرح منہ پر ڈھاٹا بندھا، مفرور قیدی سا حلیہ۔ دُلارا، نازوں میں پلا بھائی احمد علی؟ وفورِ مسرت اور غم سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گلا رندھ گیا۔
یا الٰہی خیر کیجیو۔ جانے غریب پر کیا کیا بپتا پڑی۔ ہمیشہ کا خودسر، ضدی، خودرائے۔ کانوں کے کچے ہیں یہ سرپھرا جا کے باغیوں میں مل گیا تھا۔ خبر آئی تھی کہ دلی میں مارا گیا۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ احسان کہ زندہ ہے۔ اگر وہی ہے۔

"بھائی جان —" اجنبی نے مضبوط آواز میں دھیرے سے کہا۔
"ہم آپ کو ایک خوش خبری سنانے آئے ہیں —؟"
"کیا — ؟ سامنے آ کر بات کرو۔" ڈپٹ کر کہا۔ لالٹین اونچی کر دی۔ باغیوں کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔

"ہم کو سزائے موت مل چکی ہے۔ جامِ شہادت پینے والے ہیں ہم۔" اجنبی نے لوئی منہ سے پرے ہٹا کر روبرو آتے ہوئے کہا۔

میر بندے علی کو چکر سا آ گیا۔ کواڑ کا سہارا لیا۔ اڑسٹھ برس کی عمر ہونے آئی۔ ہمت کہاں تک ساتھ دے گی۔

آنکھیں پھاڑ کر بھائی کو دیکھا۔ وہی ہے، ہمیشہ کی طرح ہنس مکھ، بشاش، پہلے خیال آیا حسبِ عادت لطیفہ سنا رہا ہے۔ پھر جیتے پہ نظر ڈالی پھانسی کا حلقہ آنکھوں کے سامنے کوند گیا۔ نیچے نظر گئی۔ ایک موٹے رستے کا ڈھیر حلقے کی صورت بھوسے کے انبار پر قدموں ہی میں پڑا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اب تک ۲۸ باغیوں کو پھانسی لگ چکی تھی۔ حلق سے آواز نہیں نکلی۔

شخصِ مذکور نے بڑے اطمینان و بشاشت سے سرگوشی میں گفتگو جاری رکھی۔ "بھائی جان۔ قصہ در اصل یہ ہے کہ ہم جیل خانے سے نکل بھاگے۔ پھانسی تو پچھلے ہی مہینے لگنے والی تھی ہمیں۔ مگر ہم نے تہیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح ایک بار گھر آ کر آپ سب کو خدا حافظ کہہ دیں بھابیوں اور بچوں سے رخصت ہو لیں — تو بہتر ہو گا۔"

مارے تہذیب کے بڑے بھائی سے یہ تھوڑا ہی کہہ سکتے تھے کہ اپنے بی بی بچوں سے بھی رخصت ہو لیں۔ بی بی اور بڑا لڑکا سید جلال الدین حیدر[1] عین اس وقت اندر دالان میں روئی کے پردوں کے پیچھے محوِ خواب تھے۔ بے چاروں کو کیا پتہ کہ باہر کس قدر خوفناک ڈرامہ ہو رہا ہے۔ پھانسی کا سزا یافتہ شوہر اور باپ ڈیوڑھی میں موجود ہے۔

"چھوٹی بھابھی جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اس نارمل آواز میں بات جاری رکھی گویا قیدِ فرنگ سے نکل بھاگنا اور واپس کال کوٹھڑی میں جانے کا ارادہ رکھنا روزمرہ کی معمولی باتیں ہیں۔

"یہاں تک کیسے آئے؟" بندے علی نے بجھی ہوئی آواز میں سوال کیا لالٹین زمین پہ رکھ دی۔

"بڑی ترکیب سے فرار ہوئے لمبی داستان ہے۔ پھر کبھی سنائیں گے۔" اچانک خاموشی۔ پھر کبھی کب سنائیں گے؟ اجل تو بریلی جیل میں منتظر ہے۔ "بہرحال یہ بات شروع کی۔" پا پیادہ آئے۔ چھپتے چھپاتے، بڑی مشکلوں سے۔ گاؤں پہ پہنچ کر راستہ ہی بھول گئے نقشہ بدلا بدلا سا نظر آیا۔ ہر طرف کھنڈر اور ملبے اور راکھ کے ڈھیر۔ بڑی غارت گری رہی یہاں۔ رات ہم نے عید گاہ والے جنگل میں چھپتے جاگتے گزاری۔ خیریت رہی۔ اللہ کا شکر ہے۔ اگر راہ میں کہیں پکڑے جاتے سخت کوفت ہوتی۔ آپ کی زیارت نہ کر پاتے۔ بھابھی صاحب اور دلہن بھابھی کیسی ہیں؟" یہ دونوں "بیٹیز" بھابھیاں میر صاحب کی پہلی دو بیبیاں تھیں۔[2] "سر بلندی سے پہلے ہم سوچے کہ —"

اب جا کر میر بندے علی کے حواس ذرا قائم ہوئے۔ یکبارگی طیش آ گیا۔ دبی آواز میں دانت پیس کر بولے۔ "سر بلندی کا بچہ۔ میاں صاحبزادے جامِ شہادت نوش کرنے چلے ہیں۔ احمق الدین۔ سارے سورماؤں، غازیوں کا حشر دیکھ لیا۔ آنکھیں نہیں کھلیں۔ زمانے بھر کا بیوقوف خبطالحواس خبردار جو تخت کا نام لیا۔ ایسی طبیعت صاف کروں گا کہ سارا شوقِ شہادت ہوا ہو جائے —" یہ فرما کر شخصِ مذکور کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے صحنِ چمن کے اندر لے گئے۔ وہاں سے زنانخانے کی ڈیوڑھی میں پہنچے۔ چاروں طرف دیکھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ انار، امرود اور یوکلپٹس کے درخت

---

[1] سید سجاد حیدر یلدرم کے والد۔

[2] سیدہ مریم خاتون۔

صبح کی ہوا میں سرسرائے۔ سفید مرغ، مرغی خانے کی چھت پر پہنچ چکے۔ شاگرد پیشے میں کھٹر پٹر شروع ہو گئی تھی۔ اندر باورچی خانے میں صاحب میم لوگ کے ناشتے کی تیاری کے لئے چولہا ابھی سے سلگ گیا تھا۔

یا للعجائب! یہ صاحب میم لوگ کون ؟

معزز ناظرین، انتظار کیجئے، صبر سے کام لیجئے۔

میر صاحب چھوٹے بھائی کو اسی طرح گھسیٹتے، زنانے صحن میں آ کر ایک چور دروازے کی طرف لپکے جو ایندھن کے گودام کے عقب میں پوشیدہ تھا۔ دروازہ کھولا۔ نیچے ایک دم تاریک غار کی مانند زینہ تھا۔ ٹٹولتے ٹٹولتے اس کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ پیچھے پیچھے دم بخود بھائی۔ ہاتھ ان کا مضبوطی سے اپنی گرفت میں رکھا کہ کہیں صاحبزادے ایک قلانچ بھر کے پھر بھاگ نہ نکلیں۔ انسانی دماغ کا کیا بھروسہ، نہ اس کی کوئی تھاہ۔ کیا کچھ نہیں کر دکھاتا۔ پچھلے ڈیڑھ سال میں جو کچھ ملک میں ہوا وہ لوگوں کی الٹی سمجھ ہی کی وجہ سے تو ہوا۔

زینہ اتر کر تہ خانہ تھا۔ اندھیرا گھپ۔ صرف ایک دریچے کے نیچے روشنی کی رمق نظر پڑی۔ وہیں ٹوٹی کھاٹ نظر آئی۔ اس پر صاحبزادے کو بٹھال دیا۔ فوراً اوپر آئے۔ باہر پہنچ کر دروازہ بند کیا۔ کنڈی چڑھائی۔ تالا ڈالا۔ مرغی کا ایک ٹاپا کھینچ کر دروازے کے آگے لگا دیا۔ ہاتھوں میں مٹی لگ گئی تھی۔ اسے نفاست سے جھاڑتے ہوئے صحن کی طرف بڑھے۔

حوض کے کنارے گل عباس کی جھاڑیاں تھیں۔ پودوں کے پیچھے ایک اندھا نیلے شیشوں والا روشندان نظر آتا تھا۔ اس کے پٹ کو ذرا سی جنبش ہوئی۔ دو نیلی ہراساں اور بے رونق آنکھوں نے باہر جھانکا۔ سنہرے بال ذرا سے جھلملائے۔ میر صاحب نے حمام میں سے لوٹا بھر کے حوض کی منڈیر پر رکھا اور روشندان کی طرف جھکے۔ بشاش آواز میں آہستہ سے کہا ”گڈ مارننگ مسز کارلٹن۔“

”گڈ مارننگ ٹو یو میر صاحب۔“ ننھی نحیف آواز۔

”ڈونٹ وری مسز کارلٹن۔ گاڈ از گریٹ۔ ایوری تھنگ آل رائٹ۔“

پٹ بند ہو گیا۔ میر صاحب نے منڈیر پر بیٹھ کر وضو کیا۔ دالان میں پہنچے۔ نماز کے تخت پر جا کر کھڑے ہوئے۔ نیت باندھی۔

اس وقت تک نمازِ فجر کے لئے گھر بھر جاگ چکا تھا۔ میر صاحب کی چوتھی سب سے کم عمر سرحدی بی بی سیدہ مریم خاتون تخت کے پاس سے گزریں تو حیرت سے دیکھا کہ میاں سجدے میں پڑے زار و قطار رو رہے ہیں۔

مریم خاتون نے دوسرے تخت پر مصلیٰ بچھا کر نماز ادا کی۔ خاموشی سے باورچی خانے کی طرف گئیں۔ مہمانوں کے لئے اپنے سامنے ناشتہ تیار کروایا۔ خاگینہ، پراٹھے، پھل، گاجر کا حلوہ۔ ربڑی، مسٹر کارلٹن تو نہاری تک ذوق و شوق سے کھانے لگے تھے۔

دھوپ نکلی۔ گلشن کی لڑکی گھمن سینی سجا کر اٹھلاتی ہوئی دالان کی سمت چلی۔

چبوترے کی سیڑھیوں کے نیچے بڑے تہ خانے کا دروازہ تھا۔ یہ تہ خانہ موسم گرما میں خس خانے میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ گھمن نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نیچے اتری۔

وہ تینوں اپنی اپنی چارپائیوں پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دونوں میموں کے سر جھاڑ، منہ پہاڑ، حواس باختہ، محمد مرونستاً مطمئن نظر آتا تھا۔

جھانسی سے جب ایامِ غدر میں میر بندے علی اپنی بی بی کو ہمراہ لے کر وطن آئے، رستے میں گنگا پار کے باغیوں نے اس انگریز کنبے کو گھیر لیا تھا۔ مار ڈال رہے تھے۔ عین وقت پر میر صاحب نے جان پر کھیل کر انھیں بچایا۔ اپنی بیل گاڑی میں پردے کے اندر چھپا کر نہٹور لائے۔ تب سے یہ لوگ تہ خانے میں پناہ گزین تھے۔ آفریں ہے میر صاحب کی ذہانت اور ڈپلومیسی پر کہ اتنا بڑا طوفان آ کر گزر گیا۔ نہٹور میں ومدمے بندھے۔ توپیں چلیں۔ چودھریوں اور پٹھانوں کی خانہ جنگی رہی مگر ان تین فرنگیوں کے متعلق کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

زنانے کے تخت پر میر صاحب اب بیٹھے قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ گلبن لونڈی کو تہ خانے کی جانب سینی لے جاتے دیکھا۔ تلاوت ختم کر کے فوراً اٹھے، قرآن کو سر آنکھوں سے لگا کر رحل پر رکھا۔ سلیپر میں پیر ڈالا اور چھوٹی خانے کی طرف لپکے۔ بی بی مریم خاتون بڑے پرہیز دونوں بڑی سوکنوں اور ان کی اولاد کے لیے، شتنے کی سینیاں سجا رہی تھیں۔ جھانسی سے آتے ہی سب کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ سارا کنبہ ان کے حسنِ اخلاق کے گن گاتا تھا۔

میر بندے علی قریب جا کر جھکے۔ کان میں کہا "سنیے۔"

انھوں نے فوراً ادب سے سر اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ نہ صرف یہ کہ شوہر خدائے مجازی ہے۔ عمر میں میر صاحب بی بی مریم کے باپ سے بھی بڑے تھے۔

"سنیے۔ ایک اور پناہ گزیں دوسرے تہ خانے میں بھی موجود ہے۔ اس کا ناشتہ ہمیں دے دیجیے۔ ہم خود دے جائیں گے۔"

"ایک اور فرنگی — ؟"

"جی ہاں! بے چارہ کئی دن کا بھوکا پیاسا معلوم ہوتا ہے۔ لائیے۔ جلدی کیجیے۔

عورت سے ہمیشہ راز چھپانا چاہیے۔ عورت کے پیٹ میں بات نہیں پچتی۔

مریم خاتون نے فرمانبرداری سے ایک اور سینی سجائی۔ گرم گرم یخنی کا پیالہ رکھا۔ میر صاحب نے کشتی اٹھائی اور چور دروازے کی طرف روانہ ہوئے۔

اپریل کے مہینے میں ہنگامہ فرو ہوا۔

امن قائم ہوئے تین چار دن ہی گزرے تھے کہ جلادوں نے زنداں کے دروازے پر دستک دی۔

وہ بھی نورِ ظہور کا وقت تھا جب چابک پہ گھوڑے ہنہناتے۔ گھگرا پلٹن یعنی ہائی لینڈرز کے دو گورے افسر سنگین چڑھائے ڈیوڑھی پر پہنچے۔ ان میں سے ایک نے انتہائی درشتی سے "کوئی ہائے" کی آواز لگائی۔

منشی جی زنانہ ڈیوڑھی پر گئے۔ گلشن کے ذریعے میر صاحب کو اطلاع کی۔

میر صاحب نمازِ فجر سے فارغ ہو چکے تھے۔ فوراً چوغہ پہن دستار باندھ بیرونی ڈیوڑھی کے چبوترے پر نمودار ہوئے صاحب لوگوں کو سلام کیا۔ ایک گورے نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ڈپٹ کر سوال کیا۔

"ویل۔ میر بندے علی آپ ہائے؟"

"جی حضور۔"

"آپ نے اپنا مکان پر کسی کو چھپایا ہے؟"

"جی حضور۔"

گوروں نے ذرا تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا اور گھوڑوں سے اترے۔

"کون ہاؤس؟ گڈ رہائش؟"

"اندر تشریف لائیے۔"

میر صاحب پردہ کروا کے دونوں کو زنانے صحن میں لے گئے۔ نیم تاریک زینہ اتر کر بڑے تہ خانے میں پہنچے۔

"ویل ڈیم ——"
"آئی نیور ——"
"گڈنس گریشس ——"
"واٹ دی بلڈی ہل۔"

گوروں نے کہا

"گوڈ سیو دی کوئن" —— مسٹر کارلٹن نے نعرہ لگایا

مسز فلورا کارلٹن اور ان کی بھانجی مس جولیا تھارن ہل غش کھا کر گر پڑیں۔

میر بندے علی کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے مونچھوں میں مسکراتے رہے۔

گوروں نے چرٹ سلگائے۔ خود کو کچھ بے وقوف سا محسوس کیا۔ خفت مٹانے کے لئے میر صاحب کو ایک چرٹ پیش کیا۔

"نو تھینک یو سر۔ ہم محض حقہ ہی کے عادی ہیں۔ آپ کے لیے منگوایا جائے؟"

"اوہ —— نیور مائنڈ۔" ایک گورے نے جز بز ہو کر کہا۔

دوسرا گورا زیادہ خرانٹ تھا۔ اپنے ساتھی سے بولا۔

"I STILL BELIEVE THAT OUR INFORMATION IS CORRECT. THIS CRAFTY OLDMAN'S MAKING A BLOODY FOOL OF US"

پناہ گزین مسٹر کارلٹن نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ ان کے معزز میزبان انگریزی خوب سمجھتے ہیں۔ وہ ان کا بے حد ممنونِ احسان تھا۔ جان بچائی تھی اور اتنے عرصے کس قدر آرام و آسائش سے مہمان رکھا تھا۔

نئی نئی فتح کی وجہ سے گوروں کا دماغ آسمان پر تھا۔ موٹا، زیادہ بدتمیز گورا میجر مک ڈانلڈ۔ کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ میر صاحب کو غور سے دیکھا۔

"میر صاحب۔ ہم آپ کا بہت گریٹ فل ہے۔" پھر ذرا جھنجھلا کر اسی نخوت سے مسٹر کارلٹن کو مخاطب کیا۔

"PLEASE TELL HIM WE ARE DAMN GREATFUL TO HIM."

"جی ہم سمجھا۔ لیکن یہ ہمارا ڈیوٹی تھا۔"

میر صاحب نے بھی ذرا درشتی سے گورا شاہی اردو میں جواب دیا۔

"فائن - شاباش - اب آپ اپنا دوسرا ڈیوٹی پورا کرنا مانگتا - ایکدم جلدی -" میجر مک ڈانلڈ نے کہا۔
"حکم ——" بتول دھک سے رہ گیا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔
"باغی احمد علی کو پیش کرنا مانگتا - ابھی - ایکدم۔"
"جی صاحب ؟"
"باغی احمد علی - جیل سے بھاگا - ادھر چھپ گیا۔"
"باغی احمد علی ——" میر بندے علی نے دہرایا۔ "میجر صاحب بہادر آپ کو بالکل غلط اطلاع ملی ہے - باغی احمد علی اگر جیل سے بھاگا تو بینڈی کے جنگلوں میں روپوش ہو گیا ہو گا یا نیپال فرار ہو گیا ہو گا - وہ بے حد ذہین آدمی ہے - چھپنے کے لیے خاص منصور نگر کیوں آئے گا جہاں سے اُسے تلاش کر لینا سب سے آسان ہے۔"
میجر ٹس سے مس نہ ہوا۔ کچی گولیاں نہ کھیلا تھا - نہ وہ سرکاری مخبر اناڑی تھا جس نے دسمبر کے اس سرد شام کے دھندلکے میں گومتی کے کنارے احمد علی کو نماز پڑھتے دیکھ لیا تھا، جسے بے چارے میر احمد علی ماسٹے تصوف کے خواجہ خضر سمجھے تھے۔
چھمن مریم خاتون کے شیر خوار بچے عزیز حیدر کو گود میں لئے زینے کے سامنے سے گزریں۔ بچے کو دیکھ کر معاً میر بندے علی کے دل میں ایک خیال کوندا - خداوند کریم دوسری اولاد دے سکتا ہے - دوسرا بھائی البتہ نہ ملے گا۔
فوراً اوپر گئے - عزیز حیدر کو گود میں لیا - واپس تہہ خانے میں آئے - پھر ٹھہرے ٹھہرے رعب سے بولے۔ "صاحبان آپ جانتے ہیں ہم کون ہیں ؟"
"جانتا ہے - آپ ریٹائرڈ تحصیلدار اور زمیندار ہے اور کون ہے۔" میجر مک ڈانلڈ نے ترشی سے جواب دیا۔
دوسرے گورے نے جو میجر کی بدتمیزی سے نادم نظر آتا تھا، اخلاقاً اضافہ کیا۔ "گورنمنٹ جانتا ہے آپ لوگ روہیلہ کنٹری کا BARON بھی رہ چکا ہے۔"
میر صاحب نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے مگر آپ کو ایک اور بات معلوم نہیں ——"
"کیا - ؟"
"ہم لوگ —— " ڈرامائی انداز میں فرمایا۔ "ہم لوگ ایک دم پکا محمڈن لوگ ہے۔"
"اوہ ویل - سو ؟"
"محمڈن لوگ جھوٹی قسم نہیں کھاتا۔"
"اوہ —— ریلی - ؟" میجر مک ڈانلڈ ایک عیار ہے۔
لیکن پناہ گزین مسٹر کارلٹن نے فوراً میز بان کی ہاں میں ہاں ملائی - یہ واقعہ تھا کہ یہ اہلِ ہند خصوصاً نیٹو جنٹری GENTRY آن پر جان دیتے تھے - یہاں کے بڑے اٹھا کر عجیب عجیب قسمیں کھاتے تھے - قسم کی اُن کے ہاں شدید اہمیت تھی - بے تکے لوگ تھے - اب تک سمجھ میں نہ آئے۔
"اور مسلمان جھوٹی قسم ہرگز نہیں کھاتا۔" میر بندے علی نے اب گویا باقاعدہ نفسیاتی جنگ شروع کی - گورے کچھ کچھ قائل اور ذہمل یقین نظر

آئے۔ ایام غدر میں انھیں حریفوں اور وفاداروں دونوں کی عجیب و غریب ذہنیتوں اور ان کی اخلاقی اقدار کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔

میر بندے علی نے بات جاری رکھی: "اور ہم لوگ تو مولی پر دفٹ کی اولاد ہیں۔ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے۔" اب انہوں نے عزیز حیدر کو جلاد کے سامنے پیش کیا۔ پل کی پل کو آنکھیں بند کیں اور کہنا شروع کیا: "صاحب یہ ہمارا بیٹا ہے۔ بڑھاپے کی اولاد۔ ہمیں جان سے زیادہ پیارا ہے۔ آپ اگر صاحب اولاد ہیں ۔ اور ہم اس بچے کی جان کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ باغی احمد علی جو ہمارا حقیقی چھوٹا بھائی ہے۔ اس حویلی میں موجود نہیں۔ ہمیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، کہاں ہے، کس حال میں ہے؟ جب غدر شروع ہوا اس سے بھی دو سال قبل اُسے آخری بار دیکھا تھا۔ اگر آپ اس قسم کا اعتبار کرتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ آپ اس ملک کے، ہم سب کی زندگیوں اور قسمتوں کے مالک اور مختار ہیں ۔ اندر تشریف لے چلئے۔ حویلی کی تلاشی لے لیجیے۔"

میجر بک ڈانلڈ پسپا نظر آیا۔ رومال سے منہ پونچھا۔ مسٹر کارلٹن اور دونوں میمیں ان سے گٹ پٹ کرنے لگیں۔ تینوں میر صاحب کے حسنِ سلوک اور شرافت اور راست بازی کی تعریف کے دریا بہا رہے تھے ۔

چند لمحوں میں پانسہ پلٹنے والا تھا۔ یہ ظالم میجر اندر جا کر تلاشی لے گا۔ یا قائل ہو کر واپس چلا جائے گا

میر بندے علی بچے کو گود میں لئے لئے تھک کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ جس طرح ڈوبتے ہوئے انسان کی نظر دل کے سامنے اس کی ساری زندگی کے واقعات کوند جاتے ہیں، بوڑھے میر صاحب نے اپنی حیاتِ مستعار کا جائزہ لیا۔ پورے پچاس سال تک سرکارِ انگلشیہ کی انتہائی نیک نامی سے ملازمت کی تھی۔ ریکارڈ تھا۔ پنشن کی عمر سے کب کے تجاوز کر چکے تھے۔ پھر بھی گورنمنٹ نے مختلف اہم خدمات پر مامور رکھا۔ انگریز جنٹ مجسٹریٹوں تک کو انھوں نے ٹریننگ دی۔ عزت کا یہ عالم تھا کہ "گرینڈ اولڈ میر صاحب" کے لئے نوجوان انگریز کلکٹر تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ آج یہ تیّا فوجی اس بدتمیزی سے پیش آ رہا تھا۔ کیونکہ گو ہم ان کے وفادار رہے مگر بہرکیف مفتوح غلام قوم ہیں۔

زمانے نے کیا کچھ نہ دکھایا۔ اکبر شاہ ثانی کا عہد جب مدرسہ مسجد فتح پوری میں مولوی بنے۔ ملازمت ملی۔ باپ کے زمانے کی بگڑی ہوئی مالی حالت کو بنایا۔ زمینداری کا انتظام درست کیا، ایک بار پھر فارغ البالی کا منہ دیکھا۔ نئے مکان بنوائے۔ شادیاں کیں اللہ نے صحت ایسی دی کہ بیرانہ سالی میں چوتھی شادی کی۔ صاحبِ اولاد ہوئے۔ آج بھی عمر سے دس پندرہ سال چھوٹے معلوم ہوتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا اور ایسی کڑی آزمائش میں بھی ڈال دیا۔ اس کی قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ بندہ مجبورِ محض ہے۔ دم مارنے کی مجال نہیں ۔

معجزہ ہو گیا۔ میجر بک ڈانلڈ نے کھڑے ہو کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا: "میر صاحب۔ ہم آپ کی قسم پر ٹرسٹ کرتا ہے اور آپ نے اس آنریبل فیملی کی جان بچائی ہے ہم سمجھتا ہے مخبر ہم کو غلط خبر بولا۔ ہم آپ سے معافی مانگتا ہے۔ گڈ بائی! اینڈ تھینک یو" ایک اور پُر جوش مصافحہ۔

فرنگی کنبے کو ساتھ لے کر دونوں گورے حویلی نہٹور سے رخصت ہوئے ۔

ناظرین تمکین۔ یہ امر عجیب ہے کہ سید عزیز حیدر جس کی جان کی جھوٹی قسم بوڑھے باپ نے کھائی تھی چند روز بعد ہی اللہ کو پیارا ہوا۔

ستائیس ہزار مسلمان تختۂ دار پر چڑھا۔ باقی کالے پانی بھیجا گیا۔ میر احمد علی آبائی حویلی کے چھوٹے تہ خانے سے بڑے تہ خانے میں منتقل

کر دیئے گئے۔ میر بندے علی کی راتوں کی نیندیں حرام تھیں۔ میاں احمد علی ایک دفعہ تو بچ گئے لیکن کسی وقت بھی دوبارہ پکڑے جا سکتے تھے۔

وفاداروں کو انعام و اکرام دینے کے لئے صاحب کمشنر بہادر نے دربار منعقد کیا۔ میر صاحب خلعتِ فاخرہ میں ملبوس دربار میں شامیانے کے نیچے اپنی کرسی پر موجود تھے۔ کچھ دیر بعد چوبدار نے ان کا نام پکارا۔ بھاری قدموں سے اٹھ کر کمشنر کے سامنے گئے۔

کمشنر نے نقرئی کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ اٹھا کر میر بندے علی کو پیش کی۔ خطاب خان بہادری۔ باغیوں کی ضبط شدہ اراضی کے کاغذات کہ یہ اراضی ایک مستقل چھوٹی سی ریاست کے برابر تھیں۔ نفیس کاغذات اطلسی رومال میں ملفوف چاندی کی کشتی میں جھلملا رہے تھے۔ خان بہادری سرکار کی طویل خدمت کا صلہ۔ زمین فرنگی کپتان کی جان بچانے کا انعام۔ مسٹر کارلٹن کلکتہ گورنمنٹ کا اعلیٰ افسر تھا۔

میر صاحب نے کشتی دوبارہ میز کی سنہری جھالر دار عنابی مخملیں چادر پر رکھ دی۔ عزیز حیدر کی جان کی قسم کھانے کے بعد سے وہ قسمت سے کھیلنے کے عادی ہو گئے تھے۔

چغے کی جیب سے فوراً وہ اشتہار نکالا جو میر احمد علی کی گرفتاری کے لیے اضلاع روہیل کھنڈ و اودھ میں جاری کیا گیا تھا۔ کمشنر نے اشتہار پر نظر ڈالی۔ معاملہ فوراً بھانپ گیا۔ رنگ اس کا لال بھبوکا ہو گیا۔

میر صاحب جھک کر گویا ہوئے "حضورِ والا۔ ان عنایات کے عوض باغی احمد علی کی جان بخشی۔"

صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور چوبدار کو اشارہ کیا کہ دوسرا وفادار پیش کیا جائے۔ چوبدار نے نقرئی سینی اٹھا کر میر صاحب کو تھمانا چاہی۔ میر صاحب نے اسے وہیں میز پر رکھ دیا اور سر اٹھائے سامنے دیکھتے اپنی کرسی کی طرف چلے گئے۔

چھ سو سال کا پروردہ فیوڈل غرور اور آن جو پچھلے پچاس سال میں تحصیلداری کی ٹالوں تلے دب گئی تھی یکبارگی جاگ اٹھی تھی۔ یہ بدمعاش فرعون و نمرود کی اولاد ہمیں انعام دینے چلے ہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ یہ بنئے، غاصب، مردود ہمیں انعام دیں گے۔

اس نازک وقت میں خطاب اور زمینداری کا انعام واپس کرنا کم مخدوش نہ تھا۔ وہابیوں کی جنگ ابھی جاری تھی۔ مگر میر بندے علی کرسی پہ تنے بیٹھے رہے۔ اسی وقت طے کر لیا چھوٹے بھائی کے لئے پریوی کونسل تک اپیل کریں گے۔ کلکتہ کا سب سے بڑا بیرسٹر کھڑا کریں گے۔ ہمیں سمجھا کیا ہے۔ یہ کمینے گورے بھول گئے کہ ہم کون ہیں۔

مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ سامنے کئے جو غصے سے لرز رہے تھے۔ ان لمحات میں کسی پرانے چہار ہزاری منصب دار سگڑ دادا یا یقیناً مفتی صدر جہاں کی روح حلول کر گئی۔ جلال اور طیش کے مارے کانپ رہے تھے۔ قریب بیٹھے ایک چودھری صاحب نے آہستہ سے پوچھا۔ "میر صاحب خیر تو ہے؟ کیسی طبیعت ہے؟" میر صاحب کو انعام کی کشتی واپس رکھ کر بغیر صاحب سے ہاتھ ملائے واپس آتے دیکھ کر دربار میں سناٹا چھا گیا تھا۔ چودھری صاحب کی آواز سے چونک کر میر بندے علی نے نظریں اٹھائیں۔ کمشنر اب آخری وفادار کو خلعت سے نواز رہا تھا۔ چوبدار نے اعلان کیا دربار برخاست ہوا۔

ایک اور معجزہ۔ الہ آباد میں بڑے لاٹ صاحب نے بڑا دربار منعقد کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عام معافی نامے کا اشتہار جاری ہوا۔ اس شاہی فرمان کے بموجب جن باقیماندہ باغیوں کی جان بخشی کی گئی ان میں میر احمد علی نہٹوری کا نام بھی شامل تھا۔

ضلع بجنور میں باغیوں کی ایک لاکھ ۳۶ ہزار ایکڑ اراضی بحق سرکار ضبط ہوئی۔ اس کا بڑا حصّہ وفادار چودھریوں کو عطا کیا گیا۔ شیرکوٹ اور ہلدور کے چودھری صاحبان کو راجہ کا خطاب ملا۔ تاجپور کے چودھری صاحب کو باغی میں نمبردار امیر خاں کے خلاف سرکار کی اعانت کے صلے میں راجہ بہادر کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اب راجہ صاحب تاجپور کا لڑکا شیام سنگھ بغرض تعلیم انگلستان روانہ ہوا اور وہاں جاکر کرسچان بن گیا۔ واپس آ کر ڈپٹی کلکٹر نامزد کیا گیا (اس نے تاجپور میں ایک شاندار کیتھیڈرل تعمیر کیا جو آج تک موجود ہے) تاجپور کے کنور شیو ناتھ سنگھ بھی کرسٹان ہو گئے۔ لندن جاکر بیرسٹر بنے۔

سادات کی ساڑھے پندرہ ہزار ایکڑ زمین بحق سرکار ضبط ہوئی۔ میر احمد علی کی جان بخشی ہو گئی مگر ان کی موروثی زمینداری بھی اس ضبط شدہ اراضی میں ضبط کر لی گئی۔

دکھیارے بہادر شاہ ظفر، رنگون کے قید خانے میں پلنگ پہ لیٹے حقہ پیتے رہے۔ مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ اپنے "پری خانے" میں مشغول ہوئے۔ رقت خیز مثنویاں اور اشعار قلمبند کرنے میں منہمک ہو گئے ؎

اگر جنگ کرتا تو دس سال تک<br>
مگر آخرش تھی شکست اور تھک<br>
ہوں سیدھا مسلماں کہاں مکر و زور<br>
کجا پیلتن اور کجا پائے مور

سدا رہے نام اللہ کا۔

# باب ۱۱

## خرابِ کوشکِ سلطان و خانقاہِ فقیر

۱۸۸۰ء بھی قریب الختم ہے۔ ہماری روپوشی اور جان بخشی کا واقعہ آج افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ دلّی کی گلیوں میں آلِ تیمور بیس سال سے بھیک مانگ رہی ہے۔ شیروں کے قالین بن گئے۔

حضرت شیخ حاتم بن عنوان اصم بلخی نے فرمایا تھا اگر عبرت چاہتے ہو تو دُنیا کافی ہے۔ اگر وعظ چاہتے ہو تو موت کافی ہے۔

اس برس بھائی جان بھی اپنے پروردگار کی طرف لوٹ گئے۔ بفضلِ خدا ۹۴ سال کی عمر پائی۔ گزر گئے۔ آخر آخر میں ہوش و حواس زائل ہو چکے تھے۔ عالمِ طفلی واپس آگیا تھا۔ اُن کو مسلوب الحواس دیکھ کر اُن کا وہ جاہ و جلال اور گھن گرج کا زمانہ یاد آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ حیاتِ مستعار کے ہر دور میں اپنی قدرت کے کرشمے دکھاتا ہے۔

ایسے بھائی آج کل کہاں۔ اپنے بیٹے کی قربانی دے کر ہماری جان بچائی ساری زندگی کنبہ پروری میں گزاری۔ جب تک قوٰی نے کام کیا نوجوان عزیزوں کی سرکاری ملازمتوں کے لئے انگریز حکام کے نام سفارشی خطوط یا سرٹیفکیٹ لکھا کئے۔ روہیل کھنڈ اور بندیل کھنڈ کے کمشنران بھائی جان کو حکومتِ صوبہ جاتِ شمال و مغربی کا ایک اہم ستون کہتے تھے۔ ایک بار ایک کلکٹر نے ان سے پوچھا۔ "ویل۔ میر صاحب ہمارا

۱؎ آج کا اُتر پردیش

سمجھ میں نہیں آتا آپ جیسا لائق محنتی جنٹلمین کا سگا بھائی اتنا بڑا مفسد اور باغی کیسے بنا؟"

ہم اب کیا بغاوت کریں گے۔ کب کے ہار مان چکے۔ تھک گئے۔

بھائی جان مرحوم مغفور نے جھانسی اپنی سسرال میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ بلکہ ہجرت فرمائی۔ بندیل کھنڈ والوں کا اس وقت یہ حال ہے کہ نواب صاحب باندہ رانی لکشمی بائی کی حمایت میں لڑے۔ سو ریاست ان کی ضبط ہوئی۔ اب چار سو روپے ماہوار پنشن پاتے ہیں۔ علم دوست خاندان تھا۔ مرزا غالب سے قرابت داری تھی۔ منیر شکوہ آبادی اُن کے ہاں ملازم تھے۔ بھائی جان مرحوم کے برادرِ نسبتی حافظ سید محمد موسیٰ یعنی ہماری چھوٹی بھابی مریم خاتون کے برادرِ بزرگ کی آج بھی اُن کے یہاں عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ مگر وہ پہلی سی بات کہاں، حافظ صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا عزیز محمد ولی اللہ ہیں۔ بہت کرامتیں مولانا صاحب کی ان اطراف میں مشہور ہو رہی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مسلمان اب صرف کرامات کی امید پر زندہ ہے۔

محض ہماری بھتیجی اور بہو سعیدہ بانو بی بی کی ننہال میں ستر اولیا گزرے ہیں۔ ہمارے اپنے خانوادے کے اولیا ان کے علاوہ۔ اتنے اولیا بہت ہیں۔ خود ہم نے علم تصوف تھوڑا بہت ایک زمانے میں حاصل کیا تھا۔ نہٹور میں بھائی جان جنت مکانی کی بیٹھک میں جو سہ دری کہلاتی ہے، ہم سالے نئے اخبار منگواتے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ غدر کے قبل ہم لوگ کچھ نہ جانتے تھے۔ مغرب کے علوم ظاہر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

معلوم ہوا کہ ابراہیمؑ اور نوحؑ اور آدمؑ نہ تھے۔ ازل میں صرف بندر تھا۔ ہمارے اندر ہمارا جداد زندہ نہیں۔ محض ایک عدد گوریلا سانس لے رہا ہے۔ نقلِ کفر کفر نباشد۔

علمائے دین فتوے دے چکے انگریزی تعلیم حرام ہے۔ لیکن ہم خود جو پابند شرع مسلمان اور سزا یافتہ باغی ہیں اپنے بچوں کو دیوبند روانہ کرنے کے بجائے انگریزی تعلیم دلوا رہے ہیں۔ کیونکہ اب ہم جانتے ہیں کہ مسلمان اگر جاہل اور پسماندہ نہ ہوتے۔ اس عبرت ناک طور سے شکست کھاتے۔

مگر صد افسوس کہ انحطاط کا وہی عالم ہے۔ بلکہ پہلے سے زیادہ تعویذ گنڈے، جھاڑ پھونک کی گرم بازاری ہے۔ مشائخ عظام کی درگاہیں اور فقرا کی خانقاہیں عیاشی اور نشے بازی کے اڈے بن چکی ہیں۔

غدر سے قبل صرف ہمارے ضلع بجنور میں ۱۷۴ فارسی، ۱۹ عربی مدارس اور ۸۹ پاٹھ شالے تھے۔ ہمارے اپنے قصبے نہٹور کا سنسکرت پاٹھ شالہ دُور دُور تک مشہور تھا۔ ہمارے مورثِ اعلیٰ سید حسن ترمذی کا مدرسہ بند ہو چکا۔ اس کے لیے شہنشاہ ہمایوں نے جاگیر وقف کی تھی۔ جاگیرداروں کے زوال کے بعد مشہور مدارس سارے ہندوستان کے بند ہو گئے۔ ہمارا مدرسہ کب تک چلتا۔

ہمارے دونوں چھوٹے لڑکوں غلام حیدر اور حسین حیدر نے طبابت کی تعلیم حاصل کی ہے گو ہم تو چاہتے تھے کہ دونوں ڈاکٹری پڑھیں دونوں ماشاء اللہ اس وقت للت پور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ ہمارے تیسرے بیٹے کرار حیدر سلمہٗ کے لیے ہم اپنے ارادے میں بفضلِ خدا کامیاب ہوئے۔ ان کو میڈیکل کالج لاہور بھیجا ہے۔ فرزندِ اکبر سید جلال الدین حیدر سلمہٗ جب ہم حویلی نہٹور میں حسبِ حکم برادرِ بزرگوار روپوش ہوئے، اس وقت صرف بارہ برس کے تھے۔ آج ماشاء اللہ جھانسی میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں۔

خاندان کے بے شمار گوناگوں اولیا کا اثر سب سے زیادہ اس بچے نے قبول کیا ہے اور محکمہ اس کے برعکس۔

بہرحال۔ ہم ان دونوں نورِ چشمی کے ہاں جھانسی میں مقیم عہدِ نو کا نظارہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک طرف ایک لق و دق خاموش برآمدے میں آرام کرسی بچھائی ہے۔ اس پر بیٹھے عبرت حاصل کیا کرتے ہیں۔ چپڑاسی اخبار لاکر رکھ جاتا ہے۔ شام ہوتی ہے۔ برقنداز لیمپ روشن کرتے ہیں

باہر تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے۔ ایک دن اور ڈھلا۔ دنیا سے اور دور ہوئے۔ قبر کے اور نزدیک پہنچے۔

لیمپ کی روشنی سنہرے چوکھٹوں میں لگی رنگین سینریوں پر جھلملاتی ہے۔ دیوار پر ایک منظر کاپی کی جھیل کا ہے۔ کسی انگریز نے پینسل سے بنا کر بھائی جان مرحوم کو دیا تھا۔ جھیل کے کنارے ایک خستہ جان درویش کھڑا آسمان کو تک رہا ہے۔ عقب میں پیر روح اللہ شاہ کی شکستہ خانقاہ ہے۔

یہ سارا علاقہ جہانگیر نے ایک باندی کی اولاد کو بخش دیا تھا۔ پیر روح اللہ نے جھٹ سال بدلے سے خوش ہو کر اُسے ایسی دعا دی کہ علاقے میں ہیرے اور پنے کی کانیں نکل آئیں۔

اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالنے کو جی نہیں چاہتا۔ آج ہم نے حافظ جی سے فال کھول۔ فرمانے لگے ۔۔

حافظا در کنج فقر و خلوت شب ہائے تار
تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

ہم بالکل تنہا رہ گئے۔ ہماری بی بی سیدہ شریف النساء بھی سفر آخرت اختیار کر چکیں۔
وہ مرحومہ ہمارے ایک جد اعلیٰ سید سعد اللہ کی نسل سے تھیں۔

جانے اس وقت کیوں سعد اللہ خاں کا خیال آ گیا۔ یہ ہمارے پرکھوں کی عجیب عادت ہے کبھی کبھی پردے سے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔
حاضرات انبیاں۔

سید سعد اللہ عامل شاہی تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ دکن گئے تھے۔ اورنگ زیب کا ایک رقعہ فرمان روائے برہان پور کے نام سید سعد اللہ کے متعلق ہے۔ شادی اُن کی بہ اجازت شہنشاہ، سید امام علی شاہ باقری کے ہاں ہوئی تھی۔ صاحبزادے کا نام اسد اللہ اورنگ زیب علیہ الرحمتہ نے خود رکھا تھا۔

آج ہم نے صوبے کی سول لسٹ میں اپنے بیٹے جلال الدین حیدر کا نام پڑھا کہ انسپکٹر پولیس سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوئے۔ اس سے اونچا عہدہ محکمہ پولیس میں نیٹو کو میسر نہیں۔
اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

انگریز کہتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان یہ کسی طرح فراموش کرنے پر تیار نہیں کہ ایک ہزار سال حکومت کر چکے ہیں۔
اگر صاحب بہادر کے ہاتھ سے سو برس بعد بھی حکومت نکل جائے تو وہ اُسے آسانی سے بھول جائے گا؟
نور چشمی بکار منصبی شب و روز مصروف رہتے ہیں۔

ڈی۔ ایس۔ پی، کوتوال شہر بھی ہوتا ہے۔ انگریز سرکار نے مغل عہدوں کے نام برقرار رکھ کر ان کی اصل حیثیت ادنیٰ درجے کی کر دی ہے۔ وہ آرو غہ جو ہندوستان و تاتار سے لے کر روس و ترکیہ تک حاکم شہر تھا اب تھانیدار ہے۔ قاضی محض نکاح پڑھانے کے لئے رہ گیا۔ صوبیدار گورنر تھا، اب معمولی فوجی ہے۔ صدر الصدور آج معمولی سب جج ہے۔ شہنشاہ کے محل کا خان ساماں۔ اب صاحب کے باورچی خانے میں کھڑا جھاگ فرنیزی پکارہا ہے۔ شاہی آبدار خانہ خشک ہوا۔ اب انگریزی کلب کی پینٹری آبدار خانہ کہلاتی ہے اور اس کا نگراں ہیڈ آبدار کو شراب

کی پوتلوں کا انکاس ہوتا ہے۔

خلعتیں طبوسات چپراسیوں اور ہرکاروں کو پہناتے ہیں۔ وہ جو کہ دیوان تھا۔ تھانے میں دیوان جی بن کر بیٹھا ہے۔ میر بخشی، میر تزکی، میر پیادہ، میر منزل، میر تورک، میر عدل سب خواب و خیال ہوئے۔ آمد ہی جو شاہوں کے اے ڈی سی تھے۔ اب کاہل کہلاتے ہیں۔

بائی راجپوتانہ کی عصمت مآب ستی ساوتری راجکماریوں اور رانیوں کا لقب تھا۔ دورِ تنزل میں دربار مغلیہ کے اندر رقاصاؤں کا اثر بڑھا۔ ان کو بائی کے خطاب ملے۔ آج تمام طوائفیں بائی جی کہلاتی ہیں۔

بمبئی کے پارسیوں نے تھیٹر کمپنیاں کھولی ہیں۔ نوجوان لڑکے زمانہ سوانگ بھر کے شہر شہر مخرب الاخلاق ڈرامے دکھلاتے پھر رہے ہیں۔ مسلمان رؤسا کی عیش پرستی کا وہی حال ہے۔ اب تھیٹر کمپنیوں اور بائیوں کی سرپرستی میں پیش پیش ہیں۔ شعروشاعری، ہزل و ہجو کا دریا حسبِ سابق زوروں پر ہے۔

خان جہاں اور خانخاناں اور راجۂ راجگان کے خطابات مرحمت کرنے والے نہ رہے۔ اب محض خان بہادری اور رائے بہادری کو نمیٹو باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ اور غنیمت جانتا ہے۔

خان بہادروں کا نیا معاشرہ پیدا ہو رہا ہے۔ پل کی پل میں خود ہم لوگ جاگیرداروں کے سماج سے نکل کر ڈپٹی کلکٹروں کی سول لائنز میں آگئے۔

ہندو مسلم فساد کہیں کہیں شروع ہو چکے ہیں جو دورِ مغلیہ میں قطعاً مفقود تھے۔ لیکن نئی پالی ٹکس اور پالیسی (انگریزی کے اچھے جامع الفاظ ہیں) کے باوجود شکر ہے کہ دونوں فرقوں میں حسبِ سابق اتحاد اور دوستی باقی ہے۔ ہندو احباب گہری دوستی کے باوجود چھوت چھات برتتے ہیں۔ مگر اندرونی تعصب ان میں ہرگز نہیں۔ ہم بھی اُن کے چھوت چھات کے دستور کا احترام کرتے ہیں۔ بُرا نہیں مانا جاتا۔ صدیوں سے خود ہمارے گھرانے میں یہ رواج چلا آتا ہے کہ ہندو دوستوں کی دعوت کے لئے برہمن رسویا باہر بیٹھ کر بھوجن تیار کرتا ہے۔ رواداری اور حسنِ اخلاق ہماری پرانی ہندوستانی تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے۔

بہت ممکن ہے آگے چل کر یہ بھی نہ رہے۔

اس وقت تک سیکڑوں مجاہدین تختۂ دار پر پہنچ کر سربلندی حاصل کر چکے ہیں جب یہ مجاہدین انگریز کے خلاف جہاد کے لیے گاؤں گاؤں غلہ جمع کرتے پھرتے تھے گزران کی ایک جماعت کا ریاست رامپور میں ہوا۔ وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ کی میم نے توجہ اپنے خاوند کی اس طرف دلائی کہ یہ مولوی ہماری حکومت کے خلاف اعلانِ جہاد کر چکے اس کا سدِ باب لازم ہے۔ اس کے بعد ان مجاہدین نے سکھوں کے خلاف جنگ شروع کی۔

بھائی جان مرحوم کے پرانے دوست سید احمد دہلوی کے سیاسی نظریات سے ہم آج بھی متفق نہیں۔ مگر اُن کے اصلاحی کارناموں کے دل سے قدردان اور اُن کے بے پایاں خلوص کے قائل ہیں۔ خود ہم جانتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہم باغیوں کی املاک ضبط ہوئیں اور میر صادق علی اور میر رستم علی ہمارے ہمسائے چاندپور کے رؤسا کا علاقہ بجرم بغاوت' سرکار نے اپنے قبضے میں لیا۔ اور سید احمد خان کو پیش کیا گیا تو انہوں نے اُسے قبول نہیں کیا۔ سید موصوف کے مضامین ہم غور سے پڑھتے ہیں۔ بھائی جان مرحوم سے اُن کی خط و کتابت[1] بھی جاری رہی۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اپنے

---

[1] "میر بندے علی تحصیلدار متھرا کے نام سرسید کے خطوط خاندان میں کسی عزیز کے پاس غالباً اب تک محفوظ ہیں (۱۹۲۹ء میں میر احمد علی کی پڑپوتی یعنی سید جلال الدین حیدر
(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

پوتوں کو مل کر دیکھیں۔

سید جلال الدین حیدر سلمہٗ کی شادی بھائی جان میر بندے علی مرحوم اور سیدہ مریم خاتون کی بیٹی سعیدہ بانو سلمہا سے ہم نے کی ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے ان کی اولاد بھی دیکھ لی۔ سید اعجاز حیدر، صغریٰ فاطمہ اور چھوٹا لڑکا اسی سال میں پیدا ہوا ہے۔ نومولود کا نام سجاد حیدر رکھا گیا۔

ان بچوں کو اور بھائی جان مرحوم کی اولاد کو خدا عمر خضر عطا فرمائے بھائی جان کے دو بیٹے سید ولی حیدر اور سید اکرام حیدر[1] فی الوقت شہر بستی پور میں مقیم ہیں۔

ہماری چھوٹی بیٹی ام سعید کی شادی خاندان کے ایک ہونہار نوجوان تحصیلدار صغیر حسین سے ہوئی۔ نواب سید عطا اللہ کی نسل سے ہیں۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے۔

میاں اکرام حیدر کے علاوہ ہماری باقی نئی پود نے اپنے نام کے آگے ترمذی لکھنا ترک کیا۔

اللہ اللہ ترمذ کہاں رہ گیا!

غدر سے پہلے جب ہم میرٹھ چھاؤنی میں متعین تھے ایک بار کیتھل گئے تھے۔ شہر کرنال سے ۲۵ میل دور اشنان کا تالاب دیکھ کر سوچنے لگا: یا الٰہی کمال الدین ترمذی انہی سیڑھیوں پر اتر کر نہائے تھے؟ بہت عجیب سا لگا۔ ان کے بعد سالار مسعود غازی اور تیمور لنگ یہاں پہنچے ایران کے مجوسی کیتھل میں پناہ گزین ہوئے اور انہیں کے فقرا، وہاں آن کے بسے۔ مٹی کہاں سے کہاں انسان کو کھینچ لاتی ہے۔ اگر کمال الدین ترمذی کے جی میں یہ نہ سمائی ہوتی کہ ہندوستان چلیں تو ہم آج یہاں کاہے کو وکٹوریہ کی غلامی کر رہے ہوتے۔ ترمذ میں اگر چنگیز کی تباہ کاری سے بچ گئے ہوتے تو اس وقت بیٹھے زار روس کی غلامی کر رہے ہوتے۔ آج اپنے پوتوں کو لندن بھیج کر بیرسٹری پڑھانے کے خواب نہ دیکھتے۔ ترمذ یا بخارا سے سینٹ پیٹرز برگ روسی پڑھنے کے لئے بھیجنے کے منصوبے بناتے۔ کیوں کہ جب خدا نے مخالفین کا سینگ بلند کیا شہر پناہ کے دروازے زمین میں غرق ہوئے۔ فاتح نے حکم دیا۔ مفتوح شرفا کو فاتحین علوم کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ قصر شاہی کے دربار میں کھڑے ہو سکیں[2]۔

والد مرحوم میر امام بخش کو کیا معلوم تھا کہ ان کی اولاد پر کیا گزرے گی۔ نہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پوتے کس قسم کی دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ والد مرحوم نے ہتھور میں جھیل کے کنارے ایک پلکھن بوئی تھی جو اب چھتنار ہے۔ دوسری پلکھن کا پودا ہم نے لگایا تھا۔ دونوں "چھوٹی بڑی پلکھن"

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی پوتی عائشہ صدیقہ خاتون بنت سید اعجاز حیدر کی شادی سید احمد رشید دہلوی سے ہوئی جن کی دادی سر سید کی کزن اور والد بیرسٹر محمود میر حشمت سید محمود کے رضاعی بھائی تھے۔ تقسیم کے بعد سر سید کے خاندان کے بیشتر افراد پاکستان چلے گئے۔ سید احمد رشید مرحوم کی بڑی بہن ہندوستان میں ہیں ان کی شادی الٰہ آباد کے ڈاکٹر رؤف سے ہوئی جو آنادہ کے حکیم اور کرنل وغیرہ ہندوستان کے سید تھے۔

[1] سید اکرام حیدر ترمذی ابن میر بندے علی راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہیں۔ علی گڑھ میں عمر بیس سال کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر اسی کے لگ بھگ تھی۔ سرخ و سفید رنگ نورانی چہرہ، بگلا جیسی سفید داڑھی۔ وضع قطع اور لباس سے باشندۂ افغانستان معلوم ہوتے تھے۔ ان کی والدہ مریم خاتون مع اپنے بھائیوں کے ۱۸۴۵ء میں سوات بونیر سے بندیل کھنڈ آئی تھیں (دیکھئے باب ۶ "ابا لکھو اور حویلی")۔ دادا اکرام حیدر ہمیشہ بندوق ساتھ رکھتے تھے اور ہم بچوں سے چاند ماری کی مشق کروایا کرتے تھے۔ بصارت اور نشانہ بہت اچھا تھا۔ فارسی کے عالم تھے۔ والدم کی والدہ سعیدہ بانو کے سگے بھائی تھے۔ ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا۔ ق۔ ح

[2] عہد نامہ قدیم، صحیفہ دانیال۔

کھلاتی ہیں۔ جب یہ چھوٹی پلکھن چھتنار ہو گی تب ہم نہ ہوں گے۔
کہ یہی وقت کا اٹل قانون ہے۔[۱]

# باب ۱۲

## نسبت کا گراں پھول

امابعد۔ اس پُر آشوب زمانے میں اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا لازم ہے۔ بیسویں صدی میں صرف انیس برس باقی رہ گئے۔ کانے دجّال کی آمد آمد ہے۔ مشرکین عناصر پر بھی قابض ہو چکے۔ ٹیلی گراف کا تار جھنجھنا جھنجھنا کر قربِ قیامت کی اطلاع دے رہا ہے۔ سمندروں پر دخانی جہاز اور زمین پر اسٹیم انجن ارواحِ خبیثہ کی مانند چنگھاڑتے پھر رہے ہیں۔ ایک ایسا آلہ ایجاد ہوا ہے جو عکسی تصاویر مثلِ اصل کے کھینچ لیتا ہے۔ ان حالات میں ہمارے نئی روشنی کے چند احباب خصوصاً بابو صاحبانِ کلکتہ مافوق الفطرت کا یقین نہیں فرماتے بلکہ ہنسی اڑاتے ہیں۔ اپنے برہم ہنسوں اور ساہوکیوں کو بھوسے میں۔

لیکن الحمد للہ کہ ہمارے میاں احمد علی ترمذی گو انگریزی تعلیم کے حق میں ہیں، مذہب پر اسی راسخ العقیدگی سے قائم ہیں۔ اس وجہ سے ذرا امید بندھتی ہے کہ حالات زیادہ نہیں بگڑے۔ علاوہ ازیں ہنوز بہت سے ایسے بزرگانِ دین ابھی موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے۔

باید دانست کہ ایک حیرتِ مذمومہ ہے اور ایک حیرتِ محمودہ۔ حیرت شک سے برعکس ہے۔ شک جہلا کو ہوتا ہے۔ اور حیرت عارفوں کو۔ حیرت حضور میں ہوتی ہے اور شک غیبت میں اور مقاماتِ توبہ میں اوّل توبہ ہے اور آخر حیرت۔

دیکھو حافظ سید محمد موسیٰ قادری نقشبندی اپنی بھانجی سعیدہ بانو اہلیہ سید جلال الدین حیدر کو جو اپنے پدر بزرگوار میر بندے علی کے انتقال کے غم میں سوگوار ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں کالپی سے کیا تحریر فرماتے ہیں۔

"قرۃ عینی سعیدہ بانو زرتہا اللہ العصمۃ فی دارین داعی بالخیر حافظ محمد موسیٰ غفر اللہ بہ لوالدیہ کی طرف سے سلام دعا کے بعد معلوم کرو کہ اس سے پیشتر ایک پوسٹ کارڈ تمہارا اور نور البصر سید جلال الدین حیدر کا آیا۔ حررنے کل الثلاثہ دریافت ہوا۔ اللہ تعالیٰ تم کو وہم کو و سب کو دونوں جہان میں تنف وجوار و ظل حمایت میں رکھے۔

ہم نے تو اپنے احوال کو مخفی کرنا چاہا تھا کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری ہمتوں کو اب بالکل (؟) ہے اور رغبت فی الدنیا عن لا آخر میں...... (؟) رات دن پیٹ کا دھندا اور ہر وقت اس کا شغل و عمل۔ اللہ تعالیٰ رحم فرما دے۔

مگر اب عندالاستفسار تمہارے نمونہ از خروارے لکھا جاتا ہے۔ ہمارے جدِ امجد تک تفاخر بالنسب حرام سمجھا جاتا تھا اور واقعی ایسا ہی

---

[۱] کچھ عرصہ بعد میر احمد علی ترمذی نے جھانسی میں انتقال فرمایا۔

ہے۔ اللہ جل شانہ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے کہ جس وقت پھونکا جاوے گا صور تو نہ ہوویں گے کچھ نسب ان کے درمیان میں اس دن اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ سارا دار و مدار تقویٰ پر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اِنّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ یعنی بے شک تم میں بڑا بزرگ اللہ کے نزدیک تم میں کا بڑا پرہیزگار ہے۔ کیا اچھا کسی نے کہا ہے ؎

ذات پات پوچھے نہ کوئے
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

اگرچہ ہمارے خاندان میں بہتر بزرگوار اولیائے کاملین سے گزرے ہیں اور باوجودیکہ قرب قیامت کی وجہ سے اب وہ حالت نہیں رہی مگر تاہم اب تک بفضل و کرم الٰہی کچھ کچھ اس کا سلسلہ باقی ہے۔ ہاں پر اب دیکھئے کیا ہوتا ہے رسی تو ہاتھ سے چھوٹ چکی۔ اگر وہی اپنا فضل و کرم کرے تو البتہ صورت نجات ہے۔

تمہارے چھوٹے ماموں میاں محمد طاہر عرف نواب شاہ؟ تو اکمل عصر علامہ دہر عارف زمانہ علوم ظاہر و باطن میں یکتا تھے۔ تمہارے منجھلے ماموں حاجی عزیز احمد کی باطنی حالت اہلِ بصیرت پر خوب روشن ہے۔ تمہاری والدہ سیدہ مریم خاتون تو تمہیں یاد ہوں گی۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ جس خوبی و آداب کے ساتھ خشوع و خضوع سے روزمرہ عبادت و تلاوت کرتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں جو مجھ سے ساری عمر میں کبھی اس طرح پر عبادت و تلاوت کرتے بنی ہو۔ میر صاحب یعنی تمہارے والد (اللہ تعالیٰ بخشے) اکثر اُن کے انتقال کے بعد روتے اور کہتے کہ حافظ جی میں اب تک کسی کا مرید نہیں ہوا ہوں کیونکہ اس وقت تک بجز دو شخصیتوں کے اور کسی پر میرا اعتقاد نہیں۔ ایک تو وطن میں ایک بزرگ پر اعتقاد ہوا تھا مگر میں اُس وقت عالم شباب میں تھا۔ کسی طرح مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہ تھا۔ اس لئے میں نے ان سے بیعت نہ کی اور ایک ان پر۔ مگر میں ان کا اس لئے نہ ہوا کہ لوگ کہیں گے کہ یہ جورو کا مرید ہے۔

غرض یہ کہ ان کی ہر حالت ایسی تھی جیسے کسی بڑے کامل کی ہوتی ہے اور از انجملہ یہ کہ کبھی انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے خاوند کی طرف پشت نہیں کی۔ کہتی تھیں کہ منجملہ حقوقِ شوہر کے ایک یہ بھی عورت پر حق ہے کہ کبھی شوہر کی طرف اپنی پشت نہ کرے۔ تمہاری نانی یعنی ہماری والدہ ماجدہ حضرت سعیدہ بیگم قدس سرہا کی اور کیا تعریف کروں۔ تمہاری والدہ نے انھیں سے ظاہری اور باطنی تعلیم پائی تھی۔ کرامتیں اُن کی بکثرت وقوع میں آئی ہیں۔ اُن کے والد یعنی حضرت نانا بزرگوار ہمارے سید تاج محمد صاحب پشاوری قدس سرہٗ جن کے منجملہ حالات کے ایک یہ حالت تھی کہ جب کبھی پانی نہیں برستا تو لڑکیاں آتیں اور کہتیں کہ کاکا صاحب ہم تمہارے اوپر پانی ڈالتے ہیں

---

ؔ صوفیا کے روحانی تجربات پر لینن گراڈ یونیورسٹی ہارورڈ، پرنسٹن، ڈیوک، اوکسفورڈ، کیمبرج وغیرہ میں ریسرچ کی جا رہی ہے۔ صوفیا اور یوگیوں کے تجربات پر پیراسائیکولوجی کی اصطلاح میں :۔

SECONDARY PERSONALITY, PARTHENGENETIC SYMBIOTIC SELF. PSYCHIC PERCEPTION,
PSYCHIC EMANATION.
ELECTROMAGNETIC POWERS OF THE HUMAN PSYCHE. TELPORTATION, MULTIPLE
PERSONALITY. CLARKEEDIENCE

وغیرہ وغیرہ کہلاتے ہیں (ق۔ح)

دعا کرو کہ پانی برسے۔ جو میں اُن پر وہ پانی ڈالتیں تو وہیں اللہ کے فضل و کرم سے پانی برسنے لگتا[1]

ہمارے ولایت میں دستور ہے کہ جب پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی ولی کے مزار پر اسی مراد سے پانی ڈالتے ہیں کہ جیسی اُن کی قبر میں ٹھنڈک پڑی ویسی ہی اللہ تعالیٰ ہمارے لئے پانی برسا دے۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے پانی برساتا ہے۔ سو یہ کیفیت اُن کی حالت حیات ہی میں دیکھنے میں آتی تھی۔

اور ان کی والدہ یعنی ہماری جناب نانی صاحبہ بی بی راضیہ قدس اللہ سرہا کی یہ کیفیت تھی کہ رات دن سجدہ ہی میں پڑی رہتی تھیں۔ شاید کسی وقت اس حالت سے فراغت پاتی ہوں۔ نانا تمہارے یعنی حضرت والد جناب محمد ابراہیم شہید قدس سرہٗ تو بہت بڑے عابد زاہد متقی آخرت مجتنب عن الدنیا، ولی متقی، شجاع، سخی، باحیا، باوفا، متوکل، حاجی، غازی، شہید تھے۔ کرامات و خرق عادات ان کی نہایت مشہور و معروف۔

ان کے چھوٹے بھائی حضرت عمی میاں محمد صاحب قدس سرہ ولی مادرزاد تھے۔ اہل قبور کو عیاناً دیکھتے اور ان سے ہمکلام ہوتے تھے۔ والد اُن کے حضرت شاہ سید فیض محمد صاحب کہ ہمارے دادا تھے ایسی حالت میں ان کو منع فرماتے کہ ایسے امور کا اظہار نہ کرنا چاہیئے۔ محبوب کے بھید کی ہرگز کسی کو اطلاع نہ ہونے پاوے۔

اُن کے پدر بزرگوار ہمارے پردادا مولانا شاہ سید نور محمد صاحب پشاوری ملک پشاور میں اولیائے کبار میں مشہور رہیں۔ غرض میں کس کس کا حال لکھوں حسب خواہش تمہارے اب اپنے اس سلسلہ کا ذکر کرتا ہوں یعنی حضرت شیخ الشیوخ قطب دوران امام زماں حضرت سید جلال الدین بخاری بزرگ صاحب تو شہر جو صاحبزادے حضرت سید ابوالمؤید بخاری کے ہیں اور وہ حضرت سید محمد بخاری کے اور وہ بچند سلسلہ حضرت امام محمد باقر کے جو صاحبزادے ہیں۔ حضرت سید الساجدین امام زین العابدین کے اور وہ سبط نبی ابن المرتضےٰ اسد اللہ الغالب امام الکونین حضرت ابی عبد اللہ الحسین شہید کربلا کے۔ (طویل عربی عبارت) —— آمین آمین آمین[2]

حضرت حافظ محمد موسیٰ قادری نقشبندی کا تلخیص شدہ شفقت نامہ بھانجی کے نام تمام ہوا۔

سلطان ابراہیم بن ادہمؒ نے کہا تھا دنیا کے بادشاہ کہاں ہیں۔ آکر دیکھیں یہ معاملہ کیا ہے اور یہ کیسا کاروبار ہے تاکہ اپنے ملک و حکومت سے انھیں شرم آئے۔

اور جاننا چاہئے کہ خود سیدہ سید بانو کے زہد و تقوے کا یہ عالم تھا کہ گو ریل چل چکی تھی مگر چونکہ اس کی سواری میں خدشہ بے پردگی کا تھا وہ جھانسی اپنی ننھیال سے شوہر مع بچوں کے بیل گاڑی میں آتی جاتی تھیں۔ موسم کی سختیاں دو ماہ کا طویل سفر، گرمی کی شدت، پردے کی خاطر

---

[1] ہوا اور موسم پر اولیاء کے تصرف کا عقیدہ بہت قدیم ہے۔ پودوں کی نشوونما پر دعا یا منت کے اثرات کے عقیدے کو جا بجا امریکہ یونیورسٹیوں میں جانچا جا رہا ہے۔ میک گل یونیورسٹی کے بیالوجسٹ ڈاکٹر گراڈ نے بیمار چوہوں اور پودوں پر دعا کے اثر کا تجربہ کیا ہے۔ (ق۔ ح)

[2] خط کے مارجن میں: کاتب ایں سطور کہ . . . . (؟) بندہ احمد حسن است حسب الارشاد فیض بنیاد حضرت والد ماجد خود نوشتہ واز اول تا آخر حرف بہ حرف ایشان را شنوانیدہ برائے سند . . . (؟) کہ ایں نوشتہ احقر است مثبت بہ مہر می کند والسلام۔ ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۰۶ھ حسب الارشاد والد حافظ محمد موسیٰ صاحب قادری نقشبندی مہر دی بلدہ عزیز حافظ حاجی قاری مری احمد حسن . . . (؟) دستخط صحیح (طغرہ) (مہر) (مہر)

سب گوارا تھا۔ ان کی آواز ریڈیو ڈرامی سے باہر کسی نے نہ سنی۔

سیدہ سعید بانو نے اپنے بچوں کو ان کی کم سنی ہی میں داغِ مفارقت دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب لکھنؤ میں انتقال ہوا اور نمازِ جنازہ پڑھی گئی تو میدان میں بے شمار آدمی تھے مگر نعرۂ تکبیروں کا میدان سے پرے تک سنائی دے رہا تھا۔ ماموں ان کے حافظ سید محمد موسیٰ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور فرمایا کہ تکبیروں کا غلغلہ فرشتوں کا ہے۔

بعد سیدہ سعید بانو کی وفات کے آپ کے نامور شوہر خان بہادر سید جلال الدین حیدر نے عقدِ ثانی فرخ آباد کی ایک شیعہ خاتون سے کیا۔ ان کے اولاد نہ ہوئی۔

خان بہادر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید کرار حیدر مشہور ماہر امراضِ چشم تھے۔ خطاب خان بہادری کا ان کو لارڈ لینسڈاؤن وائسرائے ہند نے عنایت کیا۔

ان بزرگوں اور ان کی اولاد[1] کے ہمراہ ہم خان بہادروں کے معاشرے میں داخل ہوں گے۔

---

# باب ۱۳

## اجنہ، قدیم و جدید

سبحان اللہ ہمارے جنات بھی کس قدر صاحبِ نظر ہیں۔ کس خوبی سے زمانے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ شاہجہانی محرابوں سے نکل کر جارجین ستونوں اور پرتگالی دروں میں داخل ہو گئے۔ کمپنی باغ کے درختوں پر چڑیلیں فروکش ہیں۔ سڑکوں کے کنارے گیس کے لیمپوں کی مدھم روشنی میں مسافروں کو آج بھی بھتنیاں مل جاتے ہیں۔ اب تک ان بھتنیوں کی مزید کتنی کہانیاں یاد ہو گئی ہوں گی۔

سیکڑوں فرنگی غدر میں ہلاک ہوئے تھے کسی انگریزی قبرستان کے پاس سے آدھی رات کو گزریئے یقیناً کسی صاحب کی روح سامنے آ کر کھسی چینی کی فرمائش کرے گی۔ سر کٹے شہسوار جب جنگ چاندنی سارے میں پھیلی ہو ان سنسان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں جہاں چند سال قبل خونریز جنگیں لڑی گئی تھیں۔

شہید مردوں کے مزاروں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے۔

چھٹ پٹے کے وقت کھیتوں میں دیوتا آواز دیتے ہیں۔ چیچک کی وبا ماتا کا قہر ہے۔

انسانوں کے بھیس میں اجنہ کے بچے علماء سے قرآن شریف پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔

---

[1] خان بہادر ڈاکٹر سید کرار حیدر مرحوم کے ایک ہر دلعزیز پوتے کا ذاتی تعلق سلسلۂ مارکسیہ سے ہے۔ چراغ ہدایت حضرت مینن سے بیعت ہیں۔ خان بہادر سید جلال الدین حیدر مرحوم کی ایک پرنواسی کہ لندن اسکول آف اکنومکس میں زیر تعلیم ہیں اسی سلسلے کے بدعتی فرقے ادیہ لاتیہ سے عقیدت رکھتی ہیں۔ (ق - ح)

اکثر جنات مٹھائی کے شوقین ہیں۔ ورنہ عموماً صرف ہڈیوں پہ گزر کرتے ہیں۔ بے حد دراز قامت ہیں اور ان کی پلکیں کبھی نہیں جھپکتیں۔
چیل پرکی چڑیلیں وہ حلال خور یا چماری وغیرہ عورات ہیں۔ جو زچگی میں مریں یا زندگی میں ناشائستہ حرکات کی مرتکب ہوئیں۔ یہ چھل پائیاں ہوتی ہیں اور ناک میں بولتی ہیں۔ ان سے بچنا چاہیے۔

کالی بلّی بھی ایک نہایت پراسرار شے ہے۔ اوزناگ کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ اپنے بارے میں ایک علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ جو سانپ کا پتلہ آٹے کا بنا کر دفینوں کی ہانڈی پر ڈال دیا جاتا ہے۔ دفینہ کھود کر نکالئے فوراً زندہ ہو جاتا ہے۔ مال کا سانپ کہلاتا ہے۔

ایامِ غدر میں بہت لوگوں نے اپنی جمع پونجی لوٹ سے بچانے کے لئے جگہ جگہ دفن کرکے اُن پر مال کے سانپ بٹھال دیے۔ وہ لوگ مارے گئے یا اُن کے وارث جلا وطن ہوئے۔ اماوس کی راتوں میں یہ ہانڈیاں زمین کے اندر چھن چھن کرتی سرکتی رہتی ہیں۔ یہ اُوت کا مال کھود کر نکالنا پُرخطر ہے کیونکہ ان کے لئے ہمیشہ ایک جان کی قربانی چاہتی ہے۔

قدیم شہروں اور قصبوں، بوسیدہ حویلیوں، فرنگی پلانٹرز کی لق و دق کوٹھیوں میں آسیب کی آبادی زیادہ ہے۔ کلکتہ بمبئی کہ نئے صنعتی شہر ہیں وہاں ابھی ان کا گزر نہیں ہوا۔ فیکٹریوں اور یونیورسٹیوں کے جن ابھی گننے میں نہیں آئے۔

بہت سے فرنگی بھی روحانیات کے قائل ہیں۔ ایک تھیوسوفیکل سوسائٹی انہوں نے ولایت میں قائم کی ہے ہمارے شہروں میں بھی فری مسن لاج کھولے ہیں۔ عوام انھیں جادو گھر یا شیطان خانہ کہتے ہیں۔ خدا جانے وہاں کیا ہوتا ہے۔

ہمارے گھرانے کی جنات سے پرانی یاد اللہ ہے۔ میر نبارے علی ترمذی کے بیٹے سیدولی حیدر سے ایک جن نے مراد آباد میں زبردستی دوستی کرلی۔ تحائف لاتا۔ گفتگو کرتا۔ سید ولی حیدر راجہ کی مشہور آماجگاہ مراد آباد میں تحصیلدار اور عالم باعمل تھے۔ جب انتقال اُن کا ہوا عوام نے کہا کہ آج مراد آباد کا قطب رخصت ہوا۔

ان کے عم زاد بھائی خان بہادر سید جلال الدین حیدر بھی ربط و ضبط اجنہ سے رکھتے تھے جب بنارس میں تعینات تھے مہاراجہ بنارس اُن کا از حد معتقد تھا۔ جنوں کے لڑکے اُن سے قرآن شریف پڑھنے آتے تھے۔

جھانسی میں خان بہادر صاحب کی کوٹھی کے ایک کمرے کے اندر شہید مرد کی ایک قبر دریافت ہوئی۔ ایک روز خان بہادر صاحب کا ایک بچہ گیند کھیلتا تھا وہ اتفاقاً اس کمرے میں جا گری جو عموماً بند رکھا جاتا تھا۔ وہ بچہ بے خیالی میں جوتوں سمیت گیند لینے اندر چلا گیا۔

ناگہانی اس بچے کو تیز بخار چڑھا۔ علاج سے ہرگز نہ اترا۔ خیال ہوا سایہ ہے۔ بچے کے ماموں سید اکرام حیدر نے اس کو بہت کچھ ڈانٹا پھٹکارا۔ مگر جواباً اس بچے کے منہ سے ادق الفاظ عربی کے ادا ہونے لگے۔ سید اکرام حیدر نے کہ اپنے بھائی ولی حیدر کی مانند عالم باعمل تھے، شے کو حکم دیا کہ بچے کو چھوڑ دے۔ دونوں کے مابین بڑی عالمانہ گفتگو رہی۔ بہت سے مسائل حل ہوئے معلوم ہوا موصوف شہید مرد نہیں

---

لے قربان جائیے ان دانش وران فرنگ کے۔ آج ۱۹۴۴ء میں آسیب زدہ مکانات وغیرہ کے بارے میں عجیب و غریب تاویلیں پیش کر رہے ہیں فرماتے ہیں کہ ماضی کے PSYCHIC RESSIONS ہیں کیوں کہ ہر جگہ اپنا حافظہ رکھتی ہے۔ سارا عالم مجموعی یاد داشت کا خزانہ ہے۔ ہر واقعہ محفوظ ہے فنا نہیں ہوتا۔ ہر آواز فضا میں باقی ہے۔ ہر واقعے کا عکس فضا میں موجود ہے۔ اے سبحان اللہ! ہم اہلِ مشرق جاہل، توہم پرست کہلائے۔ فرنگی سائنس دان نے تاویل پیش کی تو اُسے سننے کے لئے فوراً تیار ہو گئے۔ (ق ح)

# فصل دوم

## باب ۱

### امام باڑہ

گاگن جو مُنوّرے گذر کر ڈھاک اور سیمل کے جنگلوں میں سے بستی ضلع مراد آباد میں داخل ہوتی ہے۔ یہاں پر اس ندی کے کنارے ایک اور کہنہ گاؤں آباد ہے کہ لاکھڑی کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ شاہجہاں بادشاہ نے ایک خراسانی سکنجے کو جاگیر (معافی) میں عطا کیا تھا۔ گویا یہ پینتالیس میل لمبی ندی ایک طرف جھکول اور دوسری طرف ہری رود کی نعم البدل ہے۔

حضرات ایسے ہماری لاکھڑی کی اہمیت تاریخ عالم یا تاریخ ہندوستان و ایران تو کیا اس برطانوی صوبے میں بھی صفر تھی۔ لاکھڑی بہنور سنبھل محمود پور اکندرکی جیسی سنگ میں ہیں۔ نواحِ دلی اور مملکتِ ایران میں جا بجا شکستہ مینار اب بھی نظر آتے ہیں کہ ملوک گذشتہ نے مسافروں کی سہولت کے لئے بنوائے تھے جن میں اب کبوتر بستے ہیں۔

ناظرین۔ ان گمنام قریوں کے باشندگان میں سے چند ایک نے تھوڑا بہت پارٹ ڈرامے میں ادا کیا۔ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے ناٹک کا سین بدلتا ہے۔ دوسرے ایکٹر یا وہی تماشاگر پوشاک تبدیل کرکے گیس کے ہنڈوں کی روشنی میں سامنے آتے ہیں۔ ڈراپ سین کے بعد کمپنی کا منشی کمپنی کی مشہوری اور پبلک کی دلبستگی کی خاطر نیا ناٹک لکھتا ہے

دیکھنے والے کی موت ہے۔

سارے زمانے یکساں ہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ ہم جیسے انسان تھے لیکن دورِ حاضر سے ہم مانوس ہیں۔ ماضی حکایت بن جاتا ہے، ہر واقعہ ہر کردار اہم ہے۔

سمجھنے والے کی مرت ہے۔

ہندوستان کے لاکھوں گاؤوں میں سے ایک چھوٹا سا گاؤں جس کے زمیندار شہر مراد آباد مغل پورہ حصہ اوّل محلہ سادات لاکھڑی ایں غدر کے بعد سے اپنی مسندوں پر سرنگوں بیٹھے۔ تہ پچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ اس بے بضاعت لاکھڑی کے تذکرے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بھادوں میں لگنے والا میلہ۔ گاگن کے میٹھے خربوزے، چند پکے مکان، کچے جھونپڑے بنیوں کی دوکانیں، چند مندر، دو مسجدیں۔ ایک امام باڑہ۔

اتنی کم بساط پر کوئی تاریخ لکھی جا سکتی ہے؟

آج چاندرات ہے۔ امام باڑہ روشن ہوا۔ لاکھڑی کے نادار شیعہ منبر کے سامنے بوسیدہ چٹائیوں پر آن بیٹھے۔ گل یار برگد کے نیچے مولوی محمد سمیع اللہ نے لالٹین کی روشنی میں شہادت نامہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ہندوؤں نے اپنے تعزیے سجائے، سبیلیں لگ گئیں۔

فرمایئے، اُداس لاکھڑی کی یہ چاندرات کن اسی ایسی معنویت کی حامل ہے؟ اس قریے کا نام ہی آپ کو صوبے کے نقشے پر نظر آئے گا۔ بقول حضرت اکبرؔ

# تصاویر بسلسلہ فصل دوم

قلعہ محمود کی محلسرا کی شکستہ محرابیں

(بحوالہ باب ۵ رام گنگا)

دیوان خانہ محمود پور کے کھنڈر میں مصنفہ ستمبر ۷۳ء

(بحوالہ باب ۵ رام گنگا)

قلعہ محمود پور کی محلسرا کا صحن، جس میں جنگل اُگ آیا ہے۔

(بحوالہ باب ۶ رام گنگا)

قلعہ محمود پور کی محلسرا کا کھنڈر۔ پیش منظر میں موجودہ نواب سید ہاشم علی خاں کے چھوٹے بھائی نواب سید ابراہیم حسنین خاں مرحوم کی بیٹیاں جن میں بیگم میجر سید آل حسنین بھی شامل ہیں پاکستان میں ہیں۔ کرنل فروغ نبی پاکستانی فوج میں ہیں۔ نواب سید ہاشم علیخاں مع خاندان ان کھنڈروں کے قریب میں رہتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں زمینداری کے خاتمے کے بعد قلعے کی سنگِ سرخ کی عمارت جو سنہری کی تھی قلعہ رفتہ رفتہ منہدم ہو گئیں۔ ——————— (بحوالہ باب [illegible])

...کی مسجد' جو رستم خاں دکھنی گورنر شاہجہاں نے بنوائی تھی۔ میر قاسم کی کوٹھی مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر تھی —————— (بحوالہ باب ۵ رام گنگا)

مرادآباد میں میر قاسم علی کی کوٹھی کا احاطہ اور ایک پھاٹک جو باقی بچا ہے
(بحوالہ باب ۵ رام گنگا)

...ات لانگری کا قدیم امام باڑہ جو سترھویں صدی میں تعمیر ہوا۔ مصنف کے ماموں میجر سید ... حسنین احمد ... نے اس کی مرمت کروائی۔ اب یہ امام باڑہ آل انڈیا شیعہ وقف بورڈ لکھنؤ کی نگرانی ... ہے۔ —————— (بحوالہ باب ۱ امام باڑہ)

چوک سادات لانگری کے اندر میر معصوم علی اور میر قاسم علی وغیرہ کے مکانات جو اب کھنڈر ہو گئے —————— (بحوالہ باب ۵ رام گنگا)

رام گنگا کے کنارے مقبرہ رستم خاں دکھنی کے آثار۔ (بحوالہ باب ۵ رام گنگا)

چوک سادات لانگری۔ دائیں طرف قدیم امام باڑہ ہے۔ (بحوالہ باب ۵ رام گنگا)

تصاویر: قرۃ العین حیدر
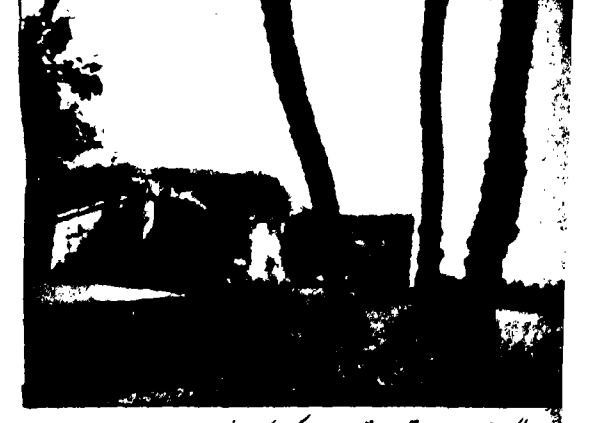
جو گزرو گے ادھر سے میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے
شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے

لیکن میں سید عملدار حسین رضوی المشہدی عرف آغا کربلائی (کہ پانچ مرتبہ زیارتِ کربلائے معلیٰ کا شرف حاصل کر چکا ہوں) غریب اور کثیر الاولاد اور سفید پوش یعنی نادار کو چھپائے رکھنے میں ماہر۔ میں جو اس امام باڑے کا نگران ہوں اور میں جو چھٹی تاریخ سے شہر جا کر قلیل معاوضے پر اپنے متمول عزیزوں کے ہاں مجالس پڑھوں گا۔ افلاس، صبر و قناعت اور عشقِ حسینؑ میری دولت ہے۔ میں جو تیرہ سو (۱۳۰۰) برس کی تاریخ کے بے بہا خزانے کو اپنے نسلی حافظے اور اپنے خون میں محفوظ رکھتا ہوں ـــــ دُنیا جیسی لگتی ہیں نے اسے دیکھا۔

حضرات در سخن من معنی شکل و غریب ہست۔ لیکن جب کڑیوں سے کڑیاں ملتی جاتی ہیں تو پردے اُٹھتے ہیں۔

عشرے کی ویران صبح اس شکستہ امام باڑے کے دالان سے مستورات کی ولولہ وزفریاد بلند ہو گی ـــ وا محمدا کشتہ شد حسینؑ ـــ وا محمدا کشتہ شد حسینؑ ـــ

آنسوؤں کا فرات تیرہ سو برس سے بہہ رہا ہے۔ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے غلامانِ اہلِ بیتِ اطہارؑ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں گویا واقعۂ کربلا آج کی بات ہے۔

مؤمنین آج ۱۸۹۶ء کی لانکھڑی کا ۶۸۰ء کے کوفے سے کون سا ایسا گہرا تعلق ہے؟

وا محمدا ـ کشتہ شد ـــ

---

# باب ۲

## قصۂ اہلِ خراسان

یاد رہے کہ پچھلا وقت آج سے منسلک ہے۔ کوئی سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ ازل سے ابد تک وجود پیہم اور مسلسل اور مستقل ہے، ماضی کا ہر واقعہ ہم سے بہت نزدیک ہے۔ تاریخ کی مجموعیت اور تسلسل اور معنویت کا جس قدر شدید احساس ہم محمڈن لوگوں کو ہے، دنیا کی کسی قوم کو نہیں۔ ہر واقعہ اور حادثہ موجود ہے۔ ہم حال میں زندہ ہیں لیکن ماضی میں اس شدت کے ساتھ شامل ہیں ـ ہر زمانے میں ہم شریک رہے ہیں بات مابعد الطبیعات کی طرف چلی جائے گی۔ لہٰذا اب میں بنامِ ایزدِ بخشایندۂ مہربان موضع لانکھڑی کی داستان کا آغاز کرتا ہوں۔

ابو ہاشم بن محمد بن حنیفیہ[1] کو ہشام بن ملک نے زہر کھلا دیا۔ وقتِ رحلت پیروؤں سے وصیت فرمائی۔ خراساں جاؤ اور وہاں کے لیڈروں سے مل کر آلِ عباس کے حصولِ خلافت کے لئے کوشش کرو۔

آلِ عباس کے حلیف پبلک سے چھپے چھپے کہتے پھر رہے تھے۔ ابو العباس کے ووٹ دو۔ خراسان میں اب تک بنی فاطمہ کے لیے کوشش جاری تھی۔ اب بنی عباس کے لیے کام ہونے لگا۔ امیدوار کا نام اعلانیہ نہ لیا جاتا تھا ورنہ دمشق گورنمنٹ امیدوار اور حامی دونوں کو فوراً جیل میں ڈال دیتی۔

تیرہ سو برس قبل کی سیاست اور آج کی ترقی یافتہ پالیٹکس میں اللہ مجھے بتلاؤ کہ کیا فرق ہے۔ آج کیا زارِ روس، شاہِ قاچار، سلطانِ روم

[1] حضرت علیؑ کی دوسری بی بی حنیفیہ کے صاحبزادے۔

اور یورپ کے متعدد حکمرانوں کے خلاف اسی طرح سازشیں نہیں کی جارہی ہیں؟

اس مخفی دعوت کی وجہ سے بہت افراتفری رہی۔ کہیں بنی فاطمہ کے لیے کام ہو رہا ہے اندر خانہ کبھی اور کینڈیڈیٹ کے لئے۔ واضح ہو کہ میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ جانے والے ہونہاروں کی خاطر نئی اصطلاحات استعمال کر رہا ہوں۔

یہ زبردست تحریک اس کامیابی سے اس لئے میں چلائی گئی جب نہ ریل تھی نہ تار۔ خراسان سے رپورٹیں کوفہ روانہ کی جاتیں وہاں سے ان کا خلاصہ تیار کرکے حمیمہ بھیجا جاتا۔ جو دمشق کے قریب انڈر امیہ ایجی ٹیشن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ تمام شیعیان علیؑ، محمد بن علیؑ بن عبداللہ بن عباس کے حامی بن چکے تھے۔ نشر و نقیب تاجروں کے بھیس میں سارے خلافت میں بھیس کر چپکے چپکے حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے۔

ہشام بن ملک نے چند نقیب پکڑ کر پھانسی گھر بھجوا دیئے بدامنی ہر طرف پھیل رہی تھی۔ خراسان میں ایک خرمی نے اعلان کیا۔ کاشتکاروں کو زمین دو، جاگیرداروں کا خانہ خراب ہو۔

داعی الکبیر ابو مسلم کو تھیٹر کا فن آتا تھا۔ سیاہ پوش فوج، سیاہ علم، "تاریخ عجم کے حوالے۔ مرو کی پہاڑی پر گھپ اندھیری رات میں الاؤ دہکائے گئے۔ ڈرامائی انداز سے فوج کو تیار کا سگنل ملا۔

خراسان کے پہاڑی راستوں پر سے دوڑتا، ہزار ہا کاشتکار مزدور فوج میں آ شامل ہوا متمدن انسان ہمیشہ اس امید پہ زندہ رہا ہے کہ اگر موجودہ نظام بدل دیا جائے نیا نظام اس سے بہتر ہوگا۔

آج ہمارے امرا دورِ مغلیہ کی یاد میں آہیں بھر رہے ہیں۔ ایران میں دولتِ ساسانیہ کی یاد تازہ تھی۔ بیشتر زرتشتی امرا اسلام قبول کر چکے تھے۔ جدید اسلامی علوم سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ گویا انگریزی پڑھ رہے تھے۔ لیکن عرب تسلط سے ناخوش تھے۔

نئے پڑھے لکھے جوشیلے خراسانی نوجوان گویا بنگالی بابو تھے۔ بلخ کا دستور زادہ خالد برمکی نامی مسلمان ہو چکا تھا۔ دولتمند اور معتمد خاندان تھا۔ عوام پر اس کا بہت اثر تھا۔ خالد بنو امیہ کے خلاف منظم بغاوت میں ابو مسلم کا دستِ راست بن گیا۔

۷۵۰ء میں آلِ عباس کی حکومت قائم ہوگئی۔ بعدازاں ابو مسلم کا جو حشر ہوا سو ہوا۔

نظامِ نو قائم ہوگیا۔ تب جا کے علویوں کو احساس ہوا کہ چوٹ ہوگئی۔ لہٰذا از سرِ نو دعوت شروع کی۔ بے مایہ فقیر منش لوگ طاقتور حکومت سے ٹکر لیتے اور ہار جاتے۔ اِدھر ایران میں نئی تحریکیں شروع ہو رہی تھیں۔ سونے نقل چہرہ لگائے حکیم المقنع مع اپنے سپید جامگان خراسان کے سیب کے باغات میں سے نمودار ہوا۔ آذربائیجان کے تاکستانوں میں "سرخپوش" انقلابیوں اور زندیقوں نے خفیہ میٹنگیں شروع کیں۔ نیشاپور میں سن باد مزدکی نے اودھم مچائی۔ مجوسی دانشور تھا۔ شہر کے چوراہوں پر کھڑے ہو کر جوشیلی تقریریں کرنے لگا۔ امیر غریب کا فرق مٹا دو کہنے لگا۔ ——— ——— حاکم اور محکوم، عرب اور غیر عرب کی تفریق ختم کرو۔ عباسی سرکار امپیریلزم ہے ——— دیکھا آپ نے؟ یہ ہمارے انگریز بہادر اپنی برٹش ایمپائر لیے پھرتے ہیں۔

اب ہو یہ رہا تھا کہ علوئین اور بنو فاطمہ پہلے کوفے کا رُخ کرتے جو شیعہ انقلاب کا سنٹر تھا اور وہاں سے سیدھے ایران۔

فرار کے مختلف راستے تھے۔ کبھی بھیس بدل کر دیبا و حریر کے تاجروں کے ساتھ ہو لیتے جن کے کارواں گھنٹیاں بجاتے دور دراز سمرقند اور کاشغر کی طرف رواں تھے۔ یہ قدیم "سلک روڈ" جنوبی عراق سے شروع ہو کر شمالی دشت کریہ کے کنارے سے گزرتی مرو، بلخ

...قرآچپن جاتی تھی۔ اسی شاہراہ کی ایک شاخ سیستان سے نکلتی قندھار اور وادیِ سندھ آپہنچتی تھی۔ قدیم ہخامنشیوں، اسکائیوں اور ساسانیوں کے ادوار میں بھی لوگ باگ شاہی عتاب یا بیرونی حملوں سے بچنے کے لئے خراسان کی پیچدار گھاٹیوں میں جا چھپتے تھے۔ زرتشتی وہاں گیارھویں صدی عیسوی تک چھپا کئے۔

خلیفہ مہدی کا بھائی اور جانشین ہارون الرشید اناطولیہ میں بازنطینیوں کا حلیہ ٹھیک کرنے میں مصروف تھا۔ یورپ کے اس جلیل القدر شاہنشاہ یعنی فرماں روائے بازنطیم کو اپنے مراسلوں میں اطمینان سے "سگِ رومی" کے لقب سے مخاطب کرتا تھا یعنی۔

DOGS AND EUROPEANS NOT ALLOWED.

اس اثنا میں خبر پڑی کہ خراسان میں پھر ہنگامہ شروع ہوگیا۔ خلیفہ نے اپنے فرزند مامون الرشید کو مرو بھیجا۔ خود بھی مشرق کی سمت روانہ ہوا۔ یہ ۸۰۸ء کا واقعہ ہے۔ خلیفہ طوس کے نزدیک سناباد میں بیمار پڑا۔ راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

بغداد خراسان سے بہت دور ہے۔ ہارون الرشید کی موت کی اطلاع پہنچتے ہی اس کا چھوٹا بیٹا امین الرشید تختِ خلافت پر بیٹھا۔ مامون ایران میں تھا۔ دونوں بھائیوں کی افواج رے کے نزدیک ایک دوسرے سے بھڑ گئیں۔ مامون کے لشکر نے آگے بڑھ کر بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ ایرانی سپاہ کے تعاقب سے بچنے کی کوشش میں نوجوان امین نے دجلہ عبور کیا اور موت کے گھاٹ اترا ———

اے رودِ دجلہ — اے رودِ دجلہ —

خلیفہ مامون الرشید مرو میں مقیم تھا۔ ۸۱۵ء میں اس نے فیصلہ کیا۔ خلافت آلِ رسولؐ کو واپس کر دی جائے۔ امام علی الرضاؑ کو مدینے سے خراسان بلوا بھیجا۔

امامِ عالی مقام جس وقت نیشاپور پہنچے ہیں تمازتِ آفتاب کی وجہ سے آپ نے چہرہ مبارک پر چھتری کا سایہ کر رکھا تھا۔ خواص و عوام نے شہر سے باہر آپ کے استقبال کے لئے ہجوم کیا۔ محدثین شیخ ابوذرعہ رازی، محمد بن اسلم طوسی اور دوسرے علمائے نیشاپور نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر التجا کی۔ یا ابنِ رسول اللہ، ہمارے ماں باپ آپ پر قربان۔ چہرے سے پردہ ہٹا دیجئے تاکہ آپ کے غلام آپ کی زیارت کر سکیں۔ امامِ فلک اقتدار نے التجا منظور فرمائی۔ آپ کے رُخِ روشن کو دیکھتے ہی مجمع نے گریہ و زاری شروع کی۔ لوگ خاک پر گر کر لوٹتے تھے اور امامؑ کے خچر کے کھروں کو چومتے تھے۔

مرو میں المامون نے اعلان کیا "میں اولادِ عباس اور اولادِ علیؑ میں کسی کو امام علی الرضا جیسا نہیں پاتا۔" جونہی یہ اطلاع بغداد پہنچی کہ امیرالمومنین نے امام رضا کو جانشین مقرر کیا۔ خاندانِ عباسیہ میں تہلکہ مچ گیا۔

مومنین۔ بلادِ اسلامیہ کی دشت نوردی کرتے ہوئے اس فدوی کا گذر ایک بار مرو سے ہوا کہ یہ شہر جو کبھی "شاہِ جہان" کہلاتا تھا آج کور دہ ہے۔ میں نے بہرام علی اور سلطان سنجر میں مقابر پر فاتحہ پڑھی اور چائے خانوں میں خاموش بیٹھا رہا۔ ایک روز گلیوں میں آوارہ گردی کر رہا تھا کہ ایک بلوان گنبد نظر آیا۔ نجانے کیوں دل نے کہا شاید اسی جگہ وہ سرائے ہی ہو جس میں امامِ والا قدر جلوہ افروز ہوئے تھے۔ لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ ناگاہ کان میں مولینا جامی کی کڑک دار آواز آئی۔ با ادب۔ خبردار سنبھل کے چلو کہ شہِ کاخِ عرفاں اِن گلی

---

۱؎ مولینا عبدالرحمٰن جامی کی منقبت ؎ شہِ کاخِ عرفاں، گُلِ باغِ احساں     دُرِ دُرجِ امکاں، مہِ بُرجِ تمکیں

کوچوں سے گزر چکے ہیں۔ زور سے ٹھرا گئی ہو۔ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں۔ تصور میں دیکھا کہ روزِ عید ہے۔ مامون فرمان جاری کر چکا
ہے کہ دولتِ عباسیہ کے سیاہ نشان اتار کر آلِ رسالت مآب کے سبز پرچم بلند کئے جائیں۔ امامِ معصوم سے خطبۂ عید پڑھنے کی درخواست
کی ہے۔ باشندگانِ مرو جوق در جوق عیدگاہ کی سمت جا رہے ہیں۔ ہر در و بام پر عورتوں اور بچوں کا ہجوم۔ مشتاق و منتظر۔ دولت کدے کے سامنے
جمِ غفیر۔ آقا ابھی باہر تشریف نہیں لائے۔ میں نے سوچا شاید زیارت نصیب میں ہو۔ دبے پاؤں بارگاہِ امامؑ کی سمت بڑھا۔

مداحِ امیر آتا ہے۔ دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے۔

ایک گرجدار آواز کانوں میں گونجی۔ سیتاپور کی مجلس۔ میرزا کی آواز۔ لرزہ سا طاری ہو گیا۔ قدم اچھل۔ یک لخت صحرائے قراقم
سی گرم گرم ریتیلی ہوا کا ایک تھپیڑا ایسا آیا کہ نخلستانِ مرو کی خنک شمع کی طرح بجھ گئی۔ گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔
آنکھیں کھولیں تو سامنے شکستہ مسجد۔ بغل میں گورا بارک۔

چوک میں زارِ روس کے سپاہی قواعد پریڈ میں مصروف تھے۔ ایک خیمے کے سامنے۔ روسی کمسریٹ کا ایک تخر میری طرح چپ چاپ
کھڑا تھا۔ گریٹ کوٹ میں ملبوس سنہری مونچھوں والا ایک۔ روسی کپتان ایک بدحال ترکمان کو چابک مارتا تھا۔ ایک غریب خوبرو یعنی
سیدزادہ عمامے پر سبز رومال باندھے۔ سر جھکائے آہستہ آہستہ شکستہ مسجد کی طرف جا رہا تھا۔
دوبارہ آنکھیں بند کیں۔

اب میں روسیوں کے غلام کرنل علی خانوف گورنر مرو کے عہد سے بہت دور ایک بار پھر ۸۱۸ء کے مرو میں موجود ہوں۔
سامعین۔ جو آج ہو رہا ہے وہی اس وقت ہو رہا تھا۔ فقط کیلنڈر کی تاریخیں بدلتی جاتی ہیں۔
مامون الرشید دار الامارت کے حالات سے روشناس ہوا۔ عراق کا قصد کیا۔ مرو سے کوچ کر کے طوس پہنچا۔ جہاں پر علی الرضا
علیہ السلام نے اچانک انتقال فرمایا۔ شیعہ مؤرخ سید امیر علی کے خیال میں خلیفہ پر الزام بے بنیاد ہے۔
مامون نے امامِ والا تبار کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ روتا دھوتا عراق روانہ ہوا۔ یہ خلیفہ کہ اہلِ عجم کو دوست رکھتا تھا، ۸۳۳ء میں راہی
ملکِ عدم ہوا۔ اس کے بھائی اور جانشین معتصم باللہ نے ایرانیوں کے بجائے کرنل علی خانوف کے اجداد کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔
۸۷۸ء میں امام محمد مہدی آخر الزماں، صاحب العصر، قائم آلِ محمدؐ سامرہ میں مستور ہوئے۔
از محمدؐ تا محمدؑ، صغیر ہو کہ کبیر، داستان طولانی ہے ؎

عجب نہیں کہ نظر بندی مصور نے
پلٹ پلٹ کے دکھائی ہو ایک ہی تصویر

(میر انیس)

---

۱؎ ۱۸۸۴ء میں خوانینِ مرو کو مجبوراً زارِ روس کی اطاعت کرنا پڑی۔ ترکمان شکست کے بعد حکومتِ روس نے ایک داغستانی مسلمان افسر کرنل علی
خانوف کو مرو کا گورنر مقرر کیا۔ آج یہ شہر بالکل غیر آباد اور ویران ہے۔

قصۂ اہلِ خراسان کی طرف واپس آتا ہوں۔

المتوکل کیا مرا۔ دولتِ عباسیہ کا آفتاب غروب ہوگیا۔ خراسان آزاد ہوا۔ امام اسمٰعیل بن امام جعفرؑ صادق کی اولاد نے مصر میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ شمالی ایران کے صوبے خودمختار ہوگئے۔ دیلام کے آلِ بویہ کہ پہلے زرتشتی امیرزادے تھے اور شیعہ مسلمان ہوچکے تھے اب خلفائے بغداد کے حاکم بن گئے۔ خطباتِ جمعہ میں امیرالمومنین کے ساتھ سلطانِ دیلام کا نام پڑھا جانے لگا۔

۹۵۲ء میں معزالدولہ والئ دیلام نے عشرۂ محرم کی یادگار منانے کی رسم کا اجرا کیا۔ آلِ بویہ کی ایرانی قوم پرستی اور تشیع نے ایرانی شیعیت کی روایات کی بنیاد ڈالی۔

گیارہویں صدی عیسوی میں غزنویوں نے فارس اور کرمان کے علاوہ سارے ایران اور ماوراءالنہر پر قبضہ کرلیا۔

ہم آلِ امام رضا نیشاپور میں بستے تھے۔ جیحون پار ترمذ میں زیدی آباد تھے۔ خواجگانِ سہروردیہ نے ترمذ میں ایک عظیم خانقاہ قائم کی جس میں ٹریننگ لے کر نوجوان گدڑی پوش بغرضِ تبلیغ ہندوستان، چین، روس وغیرہ بھیجے جارہے تھے۔ جیسے آج کل فرنگی مشنری یہاں باہر سے آتا ہے۔

خداوند تعالیٰ کی داستان ختم ہوجائے، باختر و خراسان کی طلسم ہوشربا ختم نہ ہوگی۔ آتش کدے، یونانیوں کے مدارس، بودھ وہار، ان روایات کا اثر ابھی باقی تھا کہ دسویں صدی کے آغاز سے خرقہ پوش اور معتزلہ علما کی چہل پہل شروع ہوگئی۔ پھر بخارا اور مرو میں ایک نئی زبان و ادب کا چرچا شروع ہوا۔ روز ایک نئے شاعر کا نام سننے میں آتا تھا۔

طلوعِ اسلام سے قبل خراسان مقتدر دہقانوں یعنی جاگیرداروں کا ملک تھا۔ ان کے درباروں میں گرجدار آوازوں والے داستان گو قدیم سیستانی پہلوانوں کے قصے سناتے تھے۔ طوس کی گلیوں میں اب بھی اکا دکا بوڑھے پھوس گدڑی پوش داستان گو پڑے پھرتے تھے۔ جانتے تھے ان کا زمانہ گزر گیا۔ ان کا آخری شہنشاہ یزدگرد سوم افتاں و خیزاں خراسان میں پناہ لینے آیا تھا۔ مارا گیا۔ اس سے ایک ہزار سال قبل جب سکندر نے دارا کو ہرایا تھا۔ وہ دارا سے بزرگ بھی اسی طرح افتاں و خیزاں خراسان آیا تھا۔ مارا گیا

آغا سید ابوالقاسم اپنے مکان کے سامنے کسی بے کس پھٹے حال داستان گو کو رباب بجاتے بھیک مانگتے گزرتا دیکھتا اور غصے سے پیچ و تاب کھاتا تھا اور رجزیہ جوشیلے اشعار رقم کرتا تھا۔

اور میں تو سمجھتا ہوں واقعۂ کربلا کو رزمیہ میں تبدیل کرتے ہوئے ہم نے بھی اسی قدیم خراسانی روایت کا اثر قبول کیا۔

امام زادوں کی حیثیت سے نیشاپور میں ہماری بہت توقیر تھی۔ غزنوی سپاہی چھاؤنی سے چل کر ہماری زیارت کے لیے آتے اور درود شریف پڑھتے۔ پٹھانوں کا آج تک یہی حال ہے (انہوں نے تو بلخ میں مولا علیؑ کا ایک روضہ بھی تعمیر کرلیا ہے۔ جوق در جوق سنی ازبک ترکمان، افغان "مزارِ شریف" زیارت کے لیے جاتا ہے)

مشہد نیشاپور سے ۹۰ میل دور تھا۔ یہاں سلطان محمود نے روضۂ امام کا گنبد دوبارہ تعمیر کروایا۔ سلطان کی بیٹی نے اس پر چینی ٹائل لگوائے۔ پھر جو بادشاہ خراسان پر حاوی ہوتا سب سے پہلے آکر امام کے روضے پر مزید سونا چاندی جواہرات جڑوا جاتا۔

"جغرافیہ خلافتِ مشرقی" کے مصنف نے لکھا تھا "نیشاپور کے مشرق میں مشہد امام رضا واقع ہے۔ بیچ میں پہاڑوں کا سلسلہ حائل ہے۔ کچھ فاصلے پر طوس کے کھنڈر نظر آتے ہیں جو مشہد سے پہلے شہر تھا۔ طوس سے کچھ فاصلے پر سناباد کا بہت بڑا باغ ہے جس میں

ہارون الرشید اور امام رضاؑ کے مزار ہیں۔" مستوفی قزوینی پہلا مورخ ہے جس نے موضع سناباد کا نام مشہد لکھا ملا حسین واعظ کاشفی نے پندرھویں
صدی میں ذکر کیا کہ بیشتر رضوی یا قمؔ یا مشہدؔ میں رہتے ہیں۔
خراسان پر ہر زمانے میں وسط ایشیائی حملہ آور ہوتے آئے ہیں۔ پہلے بہ خانہ بدوش تورانیوں اور متمدن ایرانیوں کا جھگڑا تھا۔ افراسیاب
تورانی اور رستم ایرانی اس نسلی کشمکش کے دو علامتی کردار تھے۔ تورانی اب اسلام قبول کر چکے تھے اور بسلسلہ ملک گیری یلغار کرتے تھے۔
سلجوق ایک ترکمانی سردار تھا۔ جن دنوں بخارا کے آلِ سامان اور غزنویوں کے درمیان گھمسان کے رن پڑ رہے تھے سلجوق اور اس
کے شہسوار بھی میدان میں کود پڑے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے خراسان کا رخ کیا۔ پھر سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔ یہ ترک بہت بانکے اور پرشکوہ
حکمران ثابت ہوئے۔ جناب میرؔ کی قسم سلاجقہ اعظم کا دور آج ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ کل حقیقت تھا۔
وہ الپ ارسلان سے کہ گھوڑے پر اڑا چلا جا رہا ہے۔ وہ ملک شاہ سلجوقی آئے۔ وہ ان کا وزیر نظام الدین طوسی۔
صنوبروں کے نیچے گلیم بچھائے حکیم ناصر خسرو تکیہ کو سرہانے رکھے چلے جاتے ہیں۔ وہ حکیم سنائی آئے۔ وہ امام غزالی، انوری، عطار،
کس کس کو یاد کروں۔

بازار میں خراسان کی سیاہ مٹی سے کوزہ گروں نے ملامتوں کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر ایک کوزہ گر آ گیا ادھر کھٹ سے ایک رباعی تیار۔
اور سلطان سنجر بن ملک شاہ، شاعر، محدث، حامیٔ علوم معارف۔ صاحب علم و دانش، پایۂ تخت مرو میں محض ایک کتب خانے میں بارہ
ہزار کتابیں موجود ہیں۔ علماء و مشائخ کی اہمیت کا یہ عالم کہ خود کو خسرو ئے دوراں، سکندر سطوت، دارا حشم کہلوانے والے بادشاہوں کو مستقل ڈانٹتے
رہتے ہیں۔

ایک بار ہمارے طوس میں قحط پڑا۔ کڑاکے کا جاڑا، پانی منجمد ندیاں خشک۔ تنور سرد، سر جھکائے لوئیوں میں لپٹے انسان دھندے سایوں
کی طرح بازاروں میں سے گزرتے۔ اپنی پوستین بیچ کر نان خریدتے۔ امام غزالی کو سلطان سنجر دربار میں مدعو کرتا تھا۔ ٹال جاتے تھے۔ ایک روز
غصے سے اس کو خط لکھا "اے بادشاہ! اپنی بھوکی رعایا کی خبر لو اور عاقبت کی فکر کرو۔"
سلطان نے کان دبا کر ڈانٹ سن لی۔
ایک اور حقیقت یہ ہے کہ دولتِ سلجوقیہ کا بھی نام و نشان نہ رہا۔ ان کے بعد خوارزم شاہوں اور غوریوں کا نام و نشان نہ رہا۔ آلِ
عثمان کا ہلال احمر گو اب تک لہرا رہا ہے اس کے بھی لالے پڑے ہیں۔
جس وقت سلطان سنجر کو خراسان میں قبیلہ غز کے ترکوں نے قید کیا ہے۔ علماء و مشائخ قتل ہوئے، کتب خانے جلا دیئے گئے،
مدارس میں گھوڑے بندھنے لگے، سلطان مر گیا۔ انوری نے رو رو کر والیٔ سمرقند سے فریاد کی ؂
بہ سمرقند اگر بگذری اے باد سحر
اجی شاعروں کے رونے دھونے سے کبھی کچھ ہوا ہے۔
چنگیز جس کے نام کا مطلب "شاہجہاں" تھا آکر باقی سب کا صفایا کر گیا۔ جیحون کے گھاٹ پر اترا۔ ترمذ اور بلخ برباد کئے۔ چھوٹے بیٹے
تولی خان کو بالشکر گراں ولایت خراسان روانہ کیا۔ تولی نام کتنا بے ضرر لگتا ہے۔ جیسے ابے او تولی ـــ

تورئی نے اپنی قانون کی کتاب کھول کر دیکھی۔ اسے بند کیا۔ آگے بڑھا۔ منگول قانون میں یہ لکھا تھا۔ فاتح کو چاہئے جو قوم فتح ہو اُسے بے دریغ قتل کرے۔ پھر آگے چلے۔

بعد ازاں ہلاکو ابن تورئی بلا کی طرح ایران و عراق پہ نازل ہوا۔ خون کے دریا بہہ گئے۔ مسلمانانِ عالم آج تک تباہیٔ بغداد یاد کر کے خون کے آنسو روتے ہیں۔

چچا سعدی نے رو رو کے لکھا تھا ؎

خونِ فرزندانِ عم مصطفےٰؐ شد ریختہ
ہم بریں خاکی کہ سلطاناں نہادندی جبیں

آج عباسیوں کے آخری نام لیوا محض ریاست بہاولپور صوبہ پنجاب کے نواب ہیں ۔

اے رودِ دجلہ — اے رودِ دجلہ

— شاہرخ مرزا کا ہرات

وہ بھی ایک وقت تھا۔

جامی۔ میرخوند۔ دولت شاہ۔ علی شیر نوائی۔ ملا حسین واعظ کاشفی کہ بیٹھے نسب نامۂ سادات مرتب کر رہے ہیں

ایک بار پھر آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ در ایں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔

سامنے سے سائبیریا اور دشتِ قپچاق کے شہسوار نگبٹ چلے آ رہے تھے۔ سموری ٹوپیاں۔ فل بوٹ، اونی فرغل، تیز تیز چھوٹی عقابوں جیسی آنکھیں۔ روسیوں والی زردی مائل سفید رنگت۔ پیچھے۔ ہیبت ناک مندرسے کے پیچھے وارخیوں کا شہرِ رواں۔ خوانین اُردوئے معلّا کے رعب سے سارا ایشیائی روس اور آدھا یورپ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اسے بیچے چنگیز کی نامعقول اولاد پھر نازل ہو گئی ۔

---

# باب ۳

## باستان نامہ دہقان دانشور[1]

محمد شیبانی خان ازبک جوجی خان ابن چنگیز کی نسل سے تھا۔ ۱۵۰۴ء میں اس نے ایک تیموری شہزادے بابر نامی کو فرغنہ سے بے دخل کیا۔ اس

---

[1] روایت یہ ہے کہ قدیم عجمی داستانیں نوشیرواں عادل نے اپنے کتب خانے میں محفوظ کروائی تھیں۔ یزدگرد سوئم نے دہقان دانشور (مہابھارت کے ویاس کی مانند یہ ایک علامتی نام معلوم ہوتا ہے) کو حکم دیا کہ گیومرث سے لے کر خسرو پرویز تک کی تاریخ رقم کرے۔ فتح اسلام کے بعد یہ باستان نامہ عمر فاروق اعظمؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جنہوں نے اس کا ترجمہ عربی میں کروایا۔ جدید فارسی میں ترجمہ آلِ سامان کے عہد میں ہوا جس کی بنیاد پر دقیقی اور بعد میں فردوسی نے شاہنامہ لکھا۔ (ق ۔ ح)

سکے بعد ایک دن اپنے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس نے مغرب کی سمت نظر دوڑائی۔ اُردوگاہ کے آگے پہاڑیاں، ندیاں تھیں۔ نیلگوں برف پوش کوہسار۔ بیشہ دل سے گلے۔ کپاس کے کھیت۔ سبزہ زار۔ دور نیلی اور سبز نقاشی کا ایک مینار کھڑا تھا جو شاید طغرل یا سنجر یا جلال الدین خوارزم شاہ سلجوق نے بنوایا تھا۔ اس کے آگے تورانیوں کی پرانی جولانگاہ ــ ایران۔

مغربی ایران[1] میں ایک صوفی شاہ صفی الدین اردبیلی گزرے ہیں کہ امام موسیٰ کاظم کی نسل سے تھے۔ ان کے خانوادے کے معتقدین زیادہ تر شیعہ آذربائیجانی ترک تھے۔ یہ ترک ائمہ اثنا عشریہ کی نسبت سے بارہ کنگوروں والی سرخ بانات کی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ اس وجہ سے قزلباش یعنی سرخ ٹوپی والے کہلاتے تھے۔ شیخ جنید صفوی کے پوتے اسمٰعیل نے ان قزلباش ترکوں افشار، قاچار وغیرہ قبائل اور صوفیائے قراباغ کی مدد سے حکومت ایران کا تختہ الٹ۔ خود تبریز میں تخت نشین ہوا (ہمارے بزرگوں کا خیال تھا کہ شاہانِ صفویہ بنے ہوئے سید تھے۔ خیر)

اس اثنا میں شیبانی خان کی مملکت سلطنتِ صفویہ کی سرحد تک پہنچ گئی۔ سرحدی چوکیوں پہ آئے دن ازبک اور قزلباش سپاہیوں میں جھڑپیں رہتیں۔

بقول فرشتہ شاہِ ایران نے شیبانی خان کو لکھا کہ سرزمینِ ایران و عراق فتح کرنے کے ارادے سے باز آئے اور یہ شعر لکھا ــ

نہالِ دوستی نشاں کہ کام دل ببار آرد
درختِ دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

جواباً شیبانی خان نے تحریر کیا کہ بادشاہت کا دعویٰ کرنا اور حکمرانوں کے مقابلے پر آکر ان سے خط و کتابت کرنا اس شخص کے لئے مناسب ہے جس کے آبا و اجداد بھی حکمراں رہے ہوں۔ اق قونیلو ترکمانوں سے قرابت حاصل کر کے سلطنت کا داعی ہونا نہایت لغو حرکت ہے ساتھ ہی شاہ اسمٰعیل کو ایک عصائے فقری اور کاسہ گدائی بھیجا۔ تمہارا آبائی ورثہ یہی ہے۔ تم بھی گدائی کا پیشہ اختیار کر لو۔

شاہ اسمٰعیل صفوی نے جواب میں لکھ کر اے بیوقوف اگر سلطنت کسی کی میراث ہوتی تو پیشدادیوں سے کیانیوں تک اور کیانیوں سے گھر گھر پھرتی چنگیز کے ہاتھ تک نہ پہنچتی اور خود تجھ کو یہ شرف حاصل نہ ہوتا۔ ٹھہر جا ہے۔ اب میں تیرا سر قلم کرنے کے لئے پہنچتا ہوں۔ ساتھ میں چرخہ اور سوت ارسال ہے کہ تیرے باپ دادا کا پیشہ تھا۔ اسے اختیار کر۔

شاہ اسمٰعیل مع فوج خراسان آیا اور ازبکوں کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ شیبانی خان مارا گیا۔ کس قدر قہرناک رہا ہوگا کہ بابر اور اسمٰعیل صفوی جیسے سورما اس سے لرزتے تھے۔ بابر نے اس مہم میں اسمٰعیل کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ جب اس کے بیٹے ہمایوں کو شیر خاں افغان نے ہندوستان سے بے دخل کیا۔ وہ سیدھا شاہ اسمٰعیل کے بیٹے طہماسپ کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے پہنچا۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ شاہ طہماسپ کو اس کے بھائیوں نے بھڑکایا کہ ہمایوں کو مدد نہ دے اور یاد دلایا کہ بابر شاہ اسمٰعیل سے قزلباش کمک لے کر گیا تھا اور قزلباشوں کو ازبکوں سے قتل کروا کے بھاگ آیا تھا۔ طہماسپ نے ارادہ بدل دیا مگر اس کی بہن سلطانہ بیگم نے ہمایوں کی یہ رباعی شاہ کو سنائی۔

---

[1] ترکستان، ایران، اترک وغیرہ کی مفصل تاریخ راقم چیز مصنفہ کے "دو چمن ہر ورق دفتر حال دگر ست" میں ملاحظہ فرمائیے جس کے چند ابواب "نقوش" لاہور میں شائع ہو چکے ہیں۔ (ق ا ح)

ہستیم ز جان بندۂ اولادِ علیؑ
ہستیم ہمیشہ شاد با دِ یادِ علیؑ
چوں سِرِ ولایت ز علیؑ ظاہر شد
کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علیؑ

شاہ اسمٰعیل خوش ہوگیا۔ دس ہزار فوج قزلباش دے کر رخصت کیا۔

یہ بھی اڑ گئی کہ ہمایوں شیعہ ہوگیا ہے۔ شیخ حمید سنبھلی ایک عالم صاحبِ تفسیر تھے۔ کابل میں جا کر ملے۔ ہمایوں سے کہا: "پادشاہم۔ تمام لشکر شما را فضی دیدم۔ در ہر جا نامِ لشکریانِ شما دریں مرتبہ یار علیؑ، مہر علیؑ، کفش علیؑ و حیدر علیؑ یافتم و ہیچ کس را ندیدم کہ بنام یارانِ دیگر باشد۔"

غرضیکہ ہزارہا شیعہ اس لشکر کے ساتھ دیارِ ہند میں داخل ہوا۔ لیکن اصل فرقہ پرستی ہمایوں کی پوت بہو نور جہاں بیگم نے کی۔

ہمارے میاں ظہور حسینؔ سلمہٗ جو اب ماشاء اللہ سے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں پڑھ رہے ہیں۔ ان کے پردادا میر معصوم علی نے اپنی کتاب "انشائے معصوم"[1] میں تفصیل سے لکھا ہے کب اور کس طرح نور جہاں بیگم کی دعوت پر نہ صرف ہمارے بزرگ بلکہ اور متعدد خاندانوں کے اجداد ایران سے یہاں پہنچے۔

ملکہ تو خیر ایرانی شیعہ تھی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہر ملک میں سنی تورانی حکمرانوں نے بھی سادات کی ہمیشہ بے حد قدر کی علمی خدمات ان کے سپرد تھیں۔ اپنی بیٹیوں سے شادیاں ان کی کیں۔ افواج کا کمانڈر انچیف بنایا۔ سپاہی دوسری نسلوں کے ہوتے تھے لشکر سادات کا ہوتا تھا۔

مگر صد حیف کہ رستم و افراسیاب کا تفرقہ نہ گیا۔ اقلیم ہند میں جب یہ ایرانی تورانی کشمکش زیادہ بڑھتی شیعہ مہم جو دکھن کا رخ کرتے۔ کیونکہ وہاں سلطنتیں قائم کر لیں۔ ارے میاں پچھلے زمانوں کی عجیب حالت تھی جسے دیکھو سلطنت قائم کر لیتا تھا۔ خیر جی ان دکنی شیعہ بادشاہوں نے بھی سب سے پہلے سفیر کہاں بھیجے؟ تبریز و اصفہان! ایران کی رسوم تعزیہ[2] اختیار کیں۔ جو دکھن سے نکلیں تو سارے ہندوستان میں پھیلیں۔ شاہانِ مغلیہ تورانی تھے پر متعصب نہ تھے۔ کیونکہ ان کی مائیں یا بیگمات شیعہ تھیں۔ نور جہاں بیگم نے راجپوت پارٹی اور تورانی پارٹی دونوں کا زور کم کیا۔

مگر ہم کہانی سناتے ہیں آپ کو دورِ شاہجہانی کی۔

لاہور، آگرے، دلّی کی کیا پوچھو ہو کیا شان تھی۔ یہ تو خیر عہدِ مغلیہ تھا۔ صدیوں قبل سلطان شمس الدین التمش کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے عصامی نے لکھا تھا۔ "سیدانِ صحیح النسب، کاسبانِ خراسان زمین اور نقشبندانِ اقلیم چین اور عالمانِ بخارا نژاد اس وقت دلّی میں جمع ہیں جو اس شہر کو کعبۂ ہفت اقلیم بنا چکے ہیں"[3]

---

[1] انشائے معصوم کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔

[2] تعزیت۔

[3] رودِ کوثر از شیخ محمد اکرام۔

ہمارے ایک بزرگ جو اُردو گاؤ منڈیہ کے بازار کی زبان میں سید بڑے کہلاویں ہے۔ قلعے میں پڑھانے لگے تھے۔ شہزادہ مراد کے اتالیقوں کے زمرے میں شامل تھے۔ روز صبح عبا قبا زرتار سبز عمامہ باندھے کتابوں کا بستہ بغل میں دبا تسبیح عقیق انگلیوں سے پیٹ پالکی میں سوار ہو قلعے جایا کرتے تھے۔
ایک روز شہزادے کو پڑھا کر اُٹھے ہی تھے کہ بارگاہ شہنشاہی میں طلبی ہوئی۔ دل دھک سے رہ گیا کسی تورانی حریف نے شکایت تو نہ جڑ دی۔ ناو ملی کا درد کہتے دیوان خاص میں پہنچے۔ شاہجہاں تخت پر بیٹھا تھا (اور کہاں بیٹھتا۔ زمین پر؟) امیر زیر بر حاضر تھے۔ شاید کسی نئی مہم کا منصوبہ بن رہا تھا۔ یا جانے کیا ہو رہا تھا۔ مجالس ملوک سے ہمیشہ خائف اور مشتبہ رہنا چاہیئے۔
سید بڑے نے بارگاہ عالی میں پہنچ کر کہا "السلام علیکم" واضح ہو کہ علماء بادشاہ کو ہمیشہ اسی طرح مخاطب کرتے تھے۔ نہ زمیں بوسی۔ نہ کورنش۔

شاہجہاں نے کہا "وعلیکم السلام مولینا۔ ما بدولت آپ کو ملک کشمیر بھیجتے ہیں۔
مولینا کو یقین ہو گیا کہ یہ ناگہانی حکم جلا وطنی ہے۔ دم بخود۔
بادشاہ نے کہا "مولینا آپ تازہ وارد خراسانی و دہقان زادے ہیں۔ شوریدہ سر رعایا کو قابو میں رکھنا خوب آتا ہوگا"
مولینا نے جواب دیا "جہاں پناہ۔ میں امام زادہ دہقان ہوں۔ آج تک کسی نے میری ایک نہ سنی۔ سب شوریدہ سری کرتے رہے"
سنتے ہیں کہ بادشاہ زیر لب مسکرایا۔ بات ٹال گیا۔ ابرو سے حاجب کی طرف اشارہ کیا۔ جس نے فرمان شاہی مولینا کی خدمت میں پیش کیا۔
قصہ یہ تھا کہ سنبھل کے مغل حاکم نے کٹھیر کے سردار رائے سکھ کو حال میں مطیع کیا تھا۔ رائے سکھ کی گڑھی چوپال کہلاوے تھی۔ رام گنگا کے کنارے تھی۔ عہد اکبری میں چوپال نامی گاؤں اس پرگنے کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ اسی جگہ پر ۱۶۳۲ء میں رستم خاں نے قلعہ تعمیر کیا۔ جامع مسجد بنوائی اور نئی بستی کا نام رستم نگر رکھا۔ سنا تھا کہ اس کے بعد رستم خاں خوش خوش پایۂ تخت آیا اور اپنی کارگزاری کی رپورٹ ظل سبحانی کی خدمت میں پیش کی۔

شاہجہاں نے غصے سے پوچھا "میرے حکم سے تجاوز کر کے تم نے چوپال کا نام رستم نگر کیوں رکھا اور مسجد کیوں بنائی؟"
رستم خاں کا رنگ فق لیکن فوراً حاضر دماغی سے کام لے کر بادشاہ کو خوش کر دیا۔ بولا "جہاں پناہ غلام نے نئے شہر کا نام تو شہزادے کے نام پر مرادآباد رکھا ہے"
شاہان دہلی کا شروع سے دستور رہا تھا کہ مفتوحہ علاقوں پر سادات کو آباد کر کے مختلف کام ان کے سپرد کر دیے تھے۔ القصہ سید بڑے فرمان شاہی ہاتھ میں لیے شاداں و فرحاں گھر لوٹے۔ خانم سے کہا۔ اضلاع میں کوئی جگہ لاکڑی ہے۔ ہم وہاں کے دہقان بنا دیے گئے
خانم نے کہا۔ یا مظہر العجائب
بعد کچھ عرصے کے سید بڑے مع اہل و عیال و لشکر چوپال عرف رستم نگر عرف مرادآباد کی سرزمین پر آن کر اترے۔ سنبھل کی جگہ مرادآباد اب ضلع کا صدر مقام بن چکا تھا۔ نئی بستی میں مغل سپاہیوں کے کیمپ مغل پورے کہلا رہے تھے۔

---

لہ خراسان کے جاگیردار۔

دشتِ لیلی اور سبزوار۔ روضۂ امام زادہ ماہ رخ بخشب بدخشاں۔ مسجد کبود۔ وادی ہری رود۔ فرحت بخش سرد ہوائیں۔ سیب کے شگوفے سرو و صنوبر کے جھرمٹ، سنائی اور جامی اور عمر خیام کی قبریں۔ تاجیکوں کی بستیاں۔ شاہ خراسان کے روضے سے بلند ہونے والی قرأت کی لرزہ خیز آوازیں۔ دارالحفاظ میں عباپوش طلبا کے ہجوم۔ مسجد گوہر شاد کے حوض میں ترکانِ خطا کے حسین چہروں کے عکس۔ ایک دنیا تھی جو نظروں سے اوجھل ہوئی۔

لاکھڑی پہنچ کر سب سے پہلے مسجد اور ماتم سرائے تعمیر کروائی۔ جس رات محرم کا چاند آم کے درختوں پر طلوع ہوا۔ خراسانی خانموں نے بال بکھرائے شمع کی روشنی میں کچے فرش پر بیٹھیں اور بلک بلک کر رونا شروع کیا۔

وا محمداً۔ کشتہ شد حسینؑ۔

رام گنگا کے کنارے وسیع علاقہ جہاں آج مراد آباد کا چوک، ریلوے اسٹیشن اور گورنمنٹ ہائی اسکول ہے، لاکھڑی کی جاگیر میں شامل تھا۔ سید بڑے نے شہر آباد کرنے کی خاطر لوگوں کو یہ زمینیں مفت بانٹ دیں کہ وہ ان پر مکان بنا کر رہیں۔ باقی زمینیں سید بڑے کی اولاد نے دورِ انحطاط میں ایک کوڑی فی گز کے حساب سے بیچ کھائیں۔ محلہ سادات لاکھڑی میں ان کے مکانات اور شہر سے باہر علاقہ لاکھڑی باقی رہ گیا جو نسلاً بعد نسلٍ "خاندان میں تقسیم ہوتا گیا۔

سید بڑے کے بیٹے ضدی اور تندمزاج مشہور تھے۔ اُردوئے شاہجہانی کی زبان میں سیدا ڑے کہلاتے تھے۔

---

## باب ۴

## گومتی

ایک خراسانی امیر نے کہ نام اُن کا میر محمد امین کاظمی نیشاپوری تھا۔ ماں ان کی شاہ عباس ثانی کے وزیر رضا قلی بیگ قزلباش کی بیٹی تھیں بی بی سے خانہ داماد کی کا طعنہ سُن کر ایران چھوڑا۔ شاہجہاں آباد پہنچے۔ فرخ سیر سے نواب سعادت خاں خطاب پایا۔ بعد قتل فرخ سیر (۱۷۱۹ء) بر عہد محمد شاہ بادشاہ، سلطنت میں فتنہ و شورش بڑھی سرکش شیوخ لکھنؤ اور بدانتظامی زمینداران اودھ میں اضافہ ہوا۔ تورانی پارٹی نے جو نواب سعادت خاں سے مخالفتِ مذہب اور ان کی ترقی جاہ سے حسد و رشک رکھتی تھی، بادشاہ کو پٹی پڑھائی کہ نواب کو بغرض بندوبست اودھ بھیج دیا جائے۔ بادشاہ نے خلعتِ صوبیداری و خطاب برہان الملک عطا کر کے حکم دیا کہ لکھنؤ جائیں۔

گورنر کاری فوج ہمراہ جانے کو تیار نہ ہوئی۔ نواب والاشان منافقین کی اسکیم سمجھے۔ نظر بخدا کر ہمت باندھی۔ پایۂ تخت کے ایرانی شیعوں کو جمع کیا جو ہزاروں بیکار یا بازار میں مشغولِ ہر کسب تھے۔ سب نے یہ خوش خبری سُن کر ہجوم کیا۔ نواب نے کہا سنو میرے بھائیو۔ اگر اس وقت کے سوکھے ٹکڑوں پر قناعت کروگے خدا نے چاہا ایک روز پلاؤ بیگی کھاؤ گے۔ کہتے ہیں نواب کے ان سوکھے ٹکڑوں پر ہزار ہا مغل (ایرانی) مفلس پریشان حال جمع ہو گیا، لمبی کالی ٹوپیاں سر پر رکھ، ولائتی تلوار کمر سے باندھ کر آغا صاحب بن گئے۔ نواب جب اپنی قوم کی بھرتی سے فارغ

---

[1] فرمانروایانِ اودھ خلوص انفس قزلباش" قراقوئن لو اور قرایوسف ترک تھے۔ ان کے بزرگوں کو شاہانِ صفویہ نے نیشاپور میں جاگیریں دی تھیں۔

ہوئے، اپنے توپ خانے سے کچھ توپیں چنیں۔ گھر کے زیورات بیچ کر بیل توپوں کے لئے خریدے، با جمعیت کثیر لکھنؤ پہنچے" بعد استیصال شیوخ قلعہ مچھی بھون میں داخل ہوئے۔ ایک شاندار سلطنت کی بنیاد رکھی۔

سادات لاکھڑی مراد آباد کے سید جیتے اور سید اڑتے کا تذکرہ ہم گزشتہ باب میں بیان کر چکے۔ سید اڑتے کے ایک پوتے میر رمضان علی کی شادی سادات بارہہ جان سٹھ میں ہوئی تھی۔ وہ بارہ بستی میں سکونت پذیر تھے۔ جب غل ہوا کہ نواب برہان الملک شاہجہان آباد سے نکل کر جعفرانِ محمد شاہی ملک اودھ پر چڑھائی کے لئے جاتا ہے میر رمضان علی کہ ایک باہمت اور صاحب فراست نوجوان تھے، اور لاکھڑی اور بارہ بستی کی منجمد قصباتی زندگی سے اکتا چکے تھے، فوراً ڈھال تلوار لگا گھوڑے پر سوار ہوئے اور منزلیں مارتے کہاں پہنچے ——— فرخ آباد۔ جہاں نواب برہان الملک بنگش پٹھان نواب کا مہمان تھا اور فوج کے لیے گھوڑے، بابو اور ٹٹو خریدنے میں مشغول تھا۔

میر رمضان علی بھی پیٹے حال مغلوں کے لشکر میں شامل ہو کر لکھنؤ روانہ ہوئے۔

بعد فتح لکھنؤ میر رمضان علی نے دربار نواب سعادت خان تک رسائی حاصل کی، لشکر نے کل کر ۱۷۲۲ء کے لگ بھگ اعیان سرکار میں داخل ہوئے۔ انہی کے بیٹے کا نام میر شیر علی تھا۔ ان کے بیٹے میر ببر علی درباری و مجرئی ہوئے۔ ایک علاقہ امانی حاصل کیا۔

اصلیت اس کی یہ تھی کہ اکثر علاقہ جات سرکار سے عمال کو امانی دیئے جاتے تھے۔ لیکن کسی کو علاقہ زیادہ کا نہ ہوتا تھا کہ صاحب قوت نہ ہو جائیں۔ بہت شرط و شروط پہ علاقہ کا اجارہ دیا جاتا تھا کہ روپیہ سرکار کا علاقے ہی نہ رہ جائے۔ اگر متاجر پورا روپیہ ادا نہ کرتا قید کر دیا جاتا تھا اور بہت کچھ درگت اس کی بنتی تھی۔ متاجر ان کا منصب موروثی نہ تھا۔ جاننا چاہیئے کہ علامہ سعد اللہ خان وزیر اعظم شاہجہاں نے پرگنوں کو چکلوں میں تقسیم کیا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں "سرکار" کی جگہ چکلے نے لے لی۔ ۱۷۷۲ء میں بنگال سترہ اور اودھ سولہ چکلوں میں منقسم تھا۔ چکلے کا حاکم، ناظم، عامل، چکلہ دار یا مستاجر کہلاتا تھا[1]۔

۱۷۷۵ء میں نواب آصف الدولہ بہادر مسند نشین وزارت ہند ہوئے۔ انتظام صوبہ جات دورِ آصفی میں بہترین تھا۔ ناظم یا صوبیدار ہر سال اپنا لشکر لے کر پہنچتا اور کسانوں سے مال گزاری وصول کر کے نصف خود رکھتا نصف خزانۂ شاہی میں داخل کرتا۔ صوبے کا انتظام اس کے ذمے تھا۔ مفتی اثنا عشری اور دیگر عمال اس کے ماتحت تھے۔ چکلے دار کو حکومت سے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس کی فوج علاقے میں پولیس کا کام کرتی تھی۔ دیوانی اور فوجداری کے مقدمے وہ ہی فیصل کرتا تھا۔ ایک چکلا دار کے ماتحت متعدد اضلاع ہوتے تھے۔ بعد میں اس انتظام میں بہت ابتری پیدا ہوئی۔ اضلاع کی زرخیزی یا سیاسی اہمیت کی وجہ سے یہ عہدہ بعض اوقات کئی لاکھ روپے میں بادشاہ اودھ سے خریدا جاتا تھا۔ اس کے بعد چکلے دار اس علاقے کا خود مختار مالک بن جاتا تھا۔ (عہد نصیر الدین حیدر میں حکیم مہدی معتمد الدولہ نے اودھ کے اس ناقص انتظام میں اصلاحات کیں۔ مگر اس وجہ سے بادشاہ نے ان کو برطرف کر دیا)۔

میر ببر علی ابن میر شیر علی (ابن میر رمضان علی) دور آصفی میں چکلے دار تھے۔

جنگ روہیلہ ۱۷۷۴ء میں حافظ رحمت خان کی شکست و شہادت کے بعد انگریز کے قدم باضابطہ ہندوستان میں

---

[1] دیکھئے مغل صوبائی حکومت ۱۵۲۶ء۔ ۱۶۵۸ء از ڈاکٹر پرماتما سرن۔

سے۔ حافظ کا ملک روہیل کھنڈ مع مرادآباد[1] مملکتِ اودھ میں شامل کر دیا گیا۔

روہیل کھنڈ کے اودھ سے الحاق کے بعد میر ببر علی اپنے دادا میر رمضان علی کے بھولے بسرے رشتے داروں سے ملنے مرادآباد محلہ لاکڑی والاں گئے یہ معلوم ہوا کہ لاکڑی (معافی) میں ہنوز پانچویں حصے کے حقدار ہیں۔

جب میر معصوم علی ابنِ میر ببر علی کی بیٹی مجھو بیگم سادات لاکڑی کے میر الف علی سے بیاہ کر مرادآباد آئیں، اس وقت یہ شہر جان کمپنی کی عملداری میں شامل ہو چکا تھا۔

لکھنؤ میں میر ببر علی کی وفات کے بعد میر معصوم علی نے ایک عہدۂ چکلا داری و نظامت خریدا از رطریقِ معقول و سلامت روی سے بندوبستِ علاقہ جات میں مصروف ہوئے۔ میر معصوم علی کے فرزندِ اکبر میر قائم علی کا بیاہ بھی لاکڑی والوں میں میر منور علی نقوی کی بیٹی امراؤ بیگم سے رچایا گیا۔

۱۸۲۰ء میں بعہدِ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ بمقام لکھنؤ میر قائم علی اور امراؤ بیگم کے ہاں میر مظہر علی[2] رضوی پیدا ہوئے۔

یہاں کا تو قصہ یہ چھوڑا یہاں
سناتے ہیں اب اک نئی داستاں

جب شیرِ پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلی بار فوجِ انگریزی کی قواعد پریڈ کا مشاہدہ فرمایا سوچنے اپنی جمعیت کے لشکر کو بھی اسی خوبی سے آراستہ کیا چاہئے۔ بعد ازاں اس عاقل و دانا حکمران نے کمپنی بہادر کی پٹالین کے تربیت یافتہ متعدد افسران و سپاہ کو لاہور مدعو کیا۔ یہ سو رما زیادہ تر پورب کے باشندے تھے۔ ان میں میر معصوم علی لکھنوی کے ایک اولو العزم جانفشاں وجری بھتیجے میر نورالدین بھی شامل تھے جو عساکرِ خالصہ میں داخل ہو کر عہدۂ جلیلہ کرنیلی تک پہنچے۔ مہاراجہ نے توپ خانہ تمام تر مسلمان افسروں کے سپرد کیا۔ جنرل الٰہی بخش[3] خالصہ آرٹلری کے نامور سپہ سالار گزرے ہیں۔

"کیٹیلاگ ریکارڈز آف خالصہ دربار" فارسی سے ترجمہ از سیتا رام کوہلی (پنجاب گورنمنٹ پریس۔ لاہور ۱۹۱۹ء) میں مختلف "کمپنی یا" اور سکھ رجمنٹوں کے PAY ROLLS کی فہرست کے ساتھ زمرہ" حاضران شے اندر رود جگہ" ڈیرہ نورالدین" کا نام ملتا ہے۔ جب مختلف پٹالین پشاور اور دوسری چھاؤنیوں کو روانہ کی جاتیں اس وقت جو افسران ہیڈ کوارٹرز میں موجود رہتے "حاضران" کہلاتے تھے۔ "ڈیرہ" یا کیمپ مع اپنے نشانچی دھونسا نواز، وکیل، منشی اور سکھ گرنتھی کے افسرِ اعلیٰ کے تحت ہوتا تھا۔

---

[1] ایک مختصر سا ٹکڑا رامپور، علی محمد روہیلہ کے بیٹے فیض اللہ خاں کو بطور موروثی ریاست دیا گیا۔ نواب فیض اللہ کے فرزند محمد علی خاں کو آصف الدولہ نے اپنا بیٹا بنایا اور بقولِ صاحب "تاریخ اودھ" ہدایتِ دینِ حق فرمائی "جب سے نوابین رامپور شیعہ چلے آتے ہیں۔

[2] خاکسار مصنف کے پرنانا۔

[3] جنرل الٰہی بخش۔ پنجاب کے عظیم مدبر میاں سر فضل حسین مرحوم کے پردادا تھے۔

اینگلو سکھ جنگ ۴۶-۱۸۴۵ء اور لاہور پر برطانوی قبضے کے بعد معاہدے کی رو سے رنجیت سنگھ کے نابالغ لڑکے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو اپنے عساکر اور توپ خانے میں تخفیف کرنی پڑی۔ وہ توپیں جن کے ذریعے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا گیا تھا انگریز کمانڈر انچیف کے حوالے کر دی گئیں۔ لاہور ۲۰ فروری کو فتح ہوا۔ عین عشرۂ محرم کے روز یہ اطلاع لکھنؤ پہنچی۔ ڈیوڈسن صاحب بہادر ریذیڈنٹ اودھ ایک بد دماغ اور نک چڑھا انگریز تھا۔ اس نے میر حسن علی سفیر کو حکم دیا کہ توپ کی سلامی دی جائے۔ میر صاحب نے عذر غم حسینؑ کا کیا۔ صاحب نے برہم ہو کر ان کو عہدۂ سفارت سے فی الفور برطرف کیا۔

اللہ اللہ۔ ابوالفتح مصلح الدین ثریا جاہ سلطان عادل خاقان زماں محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی بے بسی کا کیا عالم تھا کہ دسویں محرم کو رات فتح برطانیہ کی خوشی منانے کے واسطے خاص شہر لکھنؤ میں شلک سلامی چلی۔

وہ کئی سو ضرب توپ جو انگریزوں نے سکھوں سے چھینی تھیں لاہور سے کلکتہ روانہ کی گئیں تاکہ وہاں پر ہندوستانی رعایا کے سامنے ان کی نمائش کی جائے۔ جس روز یہ اتواپ کانپور پہنچیں ظل سبحانی شاہ جمجاہ نے نواب امین الدولہ بہادر وزیر اعظم اور مشیر الدولہ مہاراجہ بالکرشن بہادر جلادت جنگ کو بخاطر ریذیڈنٹ بہادر کانپور روانہ فرمایا جہاں کیمپ پریڈ آراستہ ہوئی۔ کپتان فریزر نے ان اتواپ کا معائنہ کیا اور سلامی لی۔

"دی ریکارڈز آف خالصہ دربار بعہد مغفور مہاراجہ دلیپ سنگھ ۱۸۴۳ء فروری ۱۸۴۹ء" فہرست حاضران[1] میں ہماری ملاقات دوبارہ نور الدین صاحب سے ہوتی ہے۔

۳۰ مارچ ۱۸۴۹ء کے روز لارڈ ڈلہوزی نے سارے پنجاب پر اختیار کلی حاصل کیا۔ ان کے بعد خالصہ فوج کے بیشتر افراد کی طرح کرنل نور الدین شاہ بھی انگریز سرکار کے وفادار رہے اور مختلف معرکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن اس کے بعد کرنل نور الدین شاہ[2] یا ان کی آل اولاد کا کچھ اتہ پتہ نہیں ملتا۔ جانے کہاں گئے۔ اُن کے چچا میر معصوم علی نے اپنے خاندان اور اپنے زمانے کی تاریخ "انشائے معصوم"[3] کے نام سے قلمبند کی تھی۔ شاید اس میں کرنل صاحب کا ذکر کیا ہو۔

میر معصوم علی نے بعہد سلطان عالم واجد علی شاہ لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ ان کی اچانک وفات کے بعد حسب قانون علاقہ نزول سرکار ہوا۔ ان کے بیٹے میر قاسم علی کو دربار سے خلعت ماتم پرسی ملی مگر نظامت و چکلاداری خریدنے کے لیے روپیہ نہ تھا۔ بزرگوں نے جتنا کمایا اس سے دگنا لٹایا۔ فضول خرچی گھٹی میں پڑی تھی۔ ابھی ہم تو یہ جانتے ہیں جس نے دریائے گومتی کا پانی پیا، بابر بعیش کوش کا سختی سے پابند ہوا۔

لکھنؤ میں عہد نواب سعادت علی خاں سے انگریزیت کی شدت تھی۔ پہلے کوئی کوٹھی و بنگلہ کا نام نہ جانتا تھا۔ اب کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ کلکتہ سے یورپین فرنیچر منگوایا جاتا تھا۔ شاہ نصیر الدین حیدر شاہان برطانیہ جیسی پوشاک زیب تن کرتے۔ فرانسیسی عورات بیگمات کے فرانسیسی

---

[1] حاضران کے چند مسلمان افسروں کے نام ملاحظہ ہوں۔ ڈیرہ الٰہی بخش۔ ڈیرہ حافظ بخش۔ ڈیرہ سلطان محمد خاں۔ ڈیرہ مظہر علی بیگ۔ ڈیرہ نور الدین وغیرہ۔

[2] میری ننھیال کے نوجوان برطانوی دور میں سرکاری ملازمتوں کی درخواست دیتے ہوئے کرنل نور الدین شاہ کا ذکر ضرور کرتے تھے۔

[3] اس نایاب فارسی کتاب کا غالباً آخری نسخہ میر معصوم علی کے پڑپوتے میرزا باقر رضوی (نذر سجاد حیدر کے والد) کے انتقال کے بعد ۱۹۲۰ء تک مرحوم کے سامان کے ساتھ چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں کے ہاں لاہور میں موجود رہا۔ چودھری صاحب کے گھر میں چوری ہوئی۔ اس میں میرزا باقر صاحب کا اسباب بھی مع اس کتاب کے چلا گیا۔
(ق-ح)

وضع کے بال آراستہ کرتیں۔ چند امرا لندن ہو آئے تھے۔ فری میسن لاج کھل گیا تھا۔ شاہی تعزیہ لندن سے بن کر آتا تھا۔ لیکن حصولِ علوم فرنگ کا شوق کسی کو نہ تھا۔

میر قائم علی بھی انگریزی رنگ میں رنگے، مگر کمال عقلمندی سے انگریزی زبان سے بھی کچھ واقفیت حاصل کر لی۔

چراغ سلطنت بجھا چاہتا تھا لیکن کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب عیش و عشرت میں غافل۔ ادھر میر معصوم علی کے سپاہیوں نے ادائیگی تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ سارے خاندان اور متوسلین کی ذمہ داری کم سنی میں میر صاحب پر آن پڑی۔

ایک روز نانی بی بی امراؤ بیگم نے کہا "عہدِ شجاع الدولہ سے لے کر آج تک نورِ عنایاتِ شاہی رہا۔ کسی گھڑی عتابِ شاہی بھی نازل ہو سکتا ہے۔ دُنیا دامِ فریب ہے اور دشمن کمین میں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ مولا مشکل کُشا کا نام لے کر یہاں سے کوچ کیجیے۔ کیا جانیے کس وقت جو کچھ باقی ہے وہ بھی ضبط کر لیا جائے۔"

میر قائم علی نے بی بی کا مشورہ قبول کرنے میں تامل کیا مگر سپاہیوں کے مطالبے میں زیادتی ہوئی۔ اسلحہ جات اسپ ولائتی، بنگلہ، خس خانہ، حویلی اونے پونے بیچ سپاہ و ملازمین کی تنخواہیں اور قرضے ادا کیے۔ ماں بہنوں اور بچوں کو بہلی میں سوار کیا۔ تلوار اور طمنچہ سنبھال گھوڑے پر سوار ہوئے۔ لکھنؤ کو خیرباد کہا۔ مستورات زار و قطار روتی تھیں۔ سوا امراؤ بیگم کے جو دل میں خوش تھیں کہ میکے واپس جاتی ہیں۔

قافلہ روہیل کھنڈ روانہ ہوا۔ اودھ سے نکلے۔ برطانوی عملداری میں داخل ہوئے۔ مراد آباد کے قریب پہنچے۔ دُور سے رام گنگا کا گھاٹ اور قلعے کی مسجد نظر آئی۔

یا ہمیدِ زرگراں وقت مدد است۔

---

# باب ۵

## رام گنگا

دوستو، زمانے کی سیر کر چکے۔ مراد آباد لانکڑی والان واپس پہنچیے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ محلہ ہنوز رستم خاں اور رشید بڑے کے دور میں زندہ ہیں۔ قدامت پرستی ان حضرات پر ختم ہے۔ مکانات جو بزرگوں نے سترھویں صدی میں بنائے تھے۔ انہی میں آج تک موجود ہیں جو مکان ڈھے گئے ان کی جگہ نئے تعمیر کر لیے گئے یا اگر اتنا مقدور نہ ہوا تو انہی کی تھوڑی بہت مرمت کر لی گئی۔ مگر مجال ہے جو کسی نے اس محلے سے باہر قدم نکالا ہو۔ جیسا کہ پچھلے کسی باب میں عرض کیا گیا جاگیرِ لانکڑی میں وہ سارا علاقہ شامل تھا جہاں آج شہر کا ریلوے اسٹیشن، چوک اور گورنمنٹ کالج ہے۔ یہ ساری زمینیں دورِ تنزل میں لانکڑی والے ایک کوڑی فی گز کے حساب بیچ کھا پی کے برابر کر چکے۔ اب اسی اطمینان سے اپنی بیٹھکوں میں رونق افروز، سیاہ مخملیں ٹوپیاں اور بوٹی دار جامے یا نیم آستین پہنے حقے گڑگڑا رہے ہیں۔

محلے کا چوک مرکزِ کائنات ہے۔ اس کے بڑے پھاٹک کے اندر تین طرف امراؤ بیگم کے والد اور چچا میر منور علی اور میر محبوب علی، منجھو بیگم بنتِ میر معصوم علی لکھنوی کے شوہر میر الف علی اور دیگر عزیزوں کے مکانات ہیں۔

سامنے حکیم کرامت علی رہتے ہیں۔ حکیم صاحب کے دادا حکیم سید واثم علی دلی میں طبابت کرتے تھے۔ دلی کے سنی طبیبوں کا قدیم خانوادہ تھا۔ واثم علی کے بیٹے حکیم احمد علی تھے۔ زوالِ دلی کے بعد سید احمد علی کے دو بیٹے حکیم سید کرامت علی اور ضامن علی تلاش معاش میں مرادآباد پہنچے۔ پہلے چل چھ کنوئیں کی سرائے پہنچے۔ بھٹیارن سے روسائے شہر کے بارے میں دریافت کیا۔ لاکڑی والوں سے ملاقات ہوئی۔ مطب قائم کیا۔ شیعہ ہو گئے۔ میر معصوم علی لکھنوی کی نواسی یعنی میر انیف علی کی لڑکی سے شادی کی۔ سید اولاد علی، مہدی علی اور اولیا بیگم پیدا ہوئیں۔

بڑے ہو کر سید اولاد علی باپ کے مطب پر بیٹھے۔ نامی حکیم بنے۔ یہ بنگالی ڈاکٹر جو آج کل نظر آتے ہیں اس وقت کہاں تھے۔ دوا میں ڈالنے کو بھی نہ تھا۔ سید اولاد علی ایک فرنگن بھی کہیں سے اڑا لائے کچھ عرصے زنانخانے میں پردہ نشین رہی۔ لاولد تھی۔ ایام غدر میں فرار ہوئی۔

سید اولاد علی کے دو بیٹے ہیں۔ فرزند علی اور ڈپٹی آل نبی۔ فرزند علی نے آبائی پیشہ طبابت اختیار کیا۔ ان کی شادی امیر بیگم بنت نواب سید داؤد علی خاں ودولت والی سرسی محمود پور سے ہوئی۔

ابھی محمود پور والوں کا قصہ کہاں سے شروع کروں۔ پوری الف لیلیٰ ہے۔ آج نرنن اب بھی اگر قلعہ محمود پور کے اندر داخل ہو، لگتا ہے عہدِ مغلیہ میں پہنچ گئے۔ سچ ہے۔ ہاتھی لٹ جائے تب بھی سوا لاکھ کا۔

ضلع مرادآباد میں یہ دو بڑی ریاستیں تھیں ایک محمود پور۔ دوسری سہس پور بلاری۔ موخر الذکر بیشتر مسلم ریاستوں کی مانند مقروض تھی۔ اس کی آخری مالک ایک بھولی بھالی بیگم صاحبہ تھیں۔ وہ تو حج کو گئیں پیچھے قرض خواہ مہاجن نے ڈگری کروا لی۔ اس مہاجن کا بیٹا سہس پور بلاری کا راجہ بنا[1]

ایک نیشاپوری فوجی مہم جو سید محمود نے سترھویں صدی میں مرادآباد سے پندرہ میل کے فاصلے پر محمود پور کی ریاست قائم کی تھی۔ سید محمود کے متعلق ایک قدیم تذکرے میں مرقوم ہے۔

"—— وہ ملک بنگالہ مراتب یافت و بوطن رسیدہ و بوکی و حبث پورہ وغیرہ پنج موضع را محلوط کردہ۔ محمود پور باسم خود کرد و پسرش سید داؤد قلعہ و دیگر عمارات رفیعہ آنجا بنا ساخت —— ہم بمصداق آثار پدید است صنادید عجم را ——"

شاہجہاں بادشاہ نے سید داؤد کو نواب اور خان کا موروثی خطاب اور محمود پور معافی کی سند عنایت کی۔

محمود پور کے اصالت محمود خاں اور شاہ علی خاں کی مہریں، پر" ۱۱۴۰ھ محمد شاہ بادشاہ غازی فدوی سید اصالت محمود خاں" اور "۱۱۷۵ھ شاہ عالم بادشاہ غازی سید شاہ علی خاں کندہ" ہیں۔ اصالت محمود خاں سنبھل کے گورنر بھی رہے۔ محلہ اصالت پورہ ان کے نام پر آباد ہے۔ عہدِ روہیلہ میں نواب دوندے خاں نے قلعہ محمود پور پر حملہ کیا۔ طرفین سے توپ چلی مگر نواب محمود پور روہیلوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ریاست کا بیشتر حصہ پٹھانوں نے ہتھیا لیا۔ ۱۷۷۴ء میں روہیلہ شکست کے بعد جب روہیل کھنڈ کے حصے بخرے ہوتے ہیں نواب محمود پور نے جان کمپنی کے حضور میں استغاثہ کیا۔ مگر ریاست کا قلیل حصہ اُن کو واپس ملا۔ موجودہ ریاست کی آمدنی محض تین لاکھ روپے سالانہ ہے۔

شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے ادوار میں نوابین محمود پور دربارِ اودھ سے وابستہ رہے۔ پھر روہیل کھنڈ پر سرکار انگریزی کا راج

---

[1] موجودہ رانی صاحبہ سہس پور بلاری اندرا موہنی اجرال مصری چند کی اہلیہ مرادآباد میں رہتی ہیں۔

ہوا۔ ۱۸۲۱ء میں مرادآباد کا ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مسٹر الکاٹ اودھ کے دورِ تسلط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نواب وزیر سالک بہادر کی ملازمت کے تحت ایک سانڈنی رسالہ مرزا مدار علی بیگ کی کمان میں دیوان خانہ محمود پور میں تعینات تھا۔

شاہ علی خاں اصالت محمود خاں کے بھتیجے تھے۔ شاہ علی خاں لاولد رہے۔ ان کے بھتیجے نواب نجم الدین علی خاں تھے۔ نواب محمد داؤد علی خاں نجم الدین علی خاں کے بیٹے تھے۔ انہی کی لڑکی امیر بیگم سے ہمارے حکیم سید کرامت علی کے بیٹے حکیم فرزند علی کی شادی ہوئی۔

نوابین محمود پور غالباً دورِ مغلیہ میں یا عروج روہیلہ کے زمانے میں تقیہ میں سنی ہو گئے تھے۔ یا شروع سے سُنی تھے۔ دربارِ اودھ کے تعلق سے شیعہ ہو گئے۔ نواب محمد داؤد علی خاں کے بیٹے اور جانشین نواب سید محمد علی خاں کا ایک مقدمہ پریوی کونسل تک چلا۔ اس میں نواب صاحب نے اپنا ترکہ بموجب قانونِ محمدی شرحِ امام ابوحنیفہؒ طلب کیا تھا اور خود کو اس فقہ کا پابند بتایا۔

حکیم سید فرزند علی اور امیر بیگم (بنت نواب داؤد علی خاں) کے فرزند اکبر سید اولاد حسین کی شادی لکھنؤ میں ایک وثیقہ دار بیگم سے ہوئی ہے جو سرائے معالی خاں میں امام باڑہ الماس پہ رہتی ہیں۔ منجھلے بیٹے سید عاشق حسین ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ چھوٹے بھائی سید ابراہیم حسین (پیدائش ۱۸۶۰ء) ہیں۔

نواب داؤد علی خاں کے فرزند اور جانشین نواب محمد علی خاں ہیں۔ مولوی عبدالغفار نگینوی رام پوری نے اپنے تذکرے میں سرسری ذکر کیا ہے کہ "ایک دن نواب فتح اللہ ولد دوندے خاں کے صاحبزادے رئیس محمود پور کے رئیس (نواب محمود علی خاں) کو لے کر ڈاکٹر فلاں سے ملاقات کو گئے میں بھی ساتھ ہو لیا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے پرانے دشمن نواب دوندے خاں روہیلہ کی اولاد سے نوابین محمود پور کی دوستی ہو چکی تھی۔ کیوں نہ ہو۔ انگریز کے اقبال سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں۔

نواب محمد علی خاں اولادِ نرینہ نہیں رکھتے۔ دو بیٹیاں ہیں ولایتی بیگم اور سیدی بیگم۔ ان دونوں کی شادیاں اپنے دونوں بھانجوں سید عاشق حسینؒ اور سید ابراہیم حسین سے کیں۔

---

لہ بشکریہ سید حسین مہدی رضوی ایڈووکیٹ مرادآباد۔

لہ مطبوعہ نقوش لاہور۔ آپ بیتی نمبر۔

لہ نواب سید عاشق حسین خاں والدہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ راقم الحروف کو دھندلے سے یاد ہیں۔ کئی برس یو پی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ پچھلی صدی کے شاندار بزرگ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان کی وفات سے صرف چند ماہ قبل دیکھا تھا۔ چھپر کھٹ پر آرام کر رہے تھے۔ بڑی بڑی سفید نوکیلی مونچھیں۔ "ہوں۔ نذر کی لونڈیا ادھر آ۔" کہہ کر تکیے کے نیچے سے شاید ایک اشرفی نکال کر دی تھی۔ "بسکٹ منگوا کر کھا لیجیو۔" اشرفی سے بسکٹ کیسے خریدے جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔ نواب محمد علی خاں نے اپنے نواسے یعنی عاشق ماموں کے بیٹے معشوق علی خاں کو متبنٰی کر کے ریاست کے تین حصے کئے۔ سید معشوق علی خاں کی شادی نواب شمس آباد کی بیٹی سلطنت آرا بیگم سے کی۔ جن کے دادا نواب دولہا شاہانِ صفویہ کی اولاد تھے۔ (ایران میں حکومت صفویہ کے زوال کے بعد متعدد صفوی شہزادے ہندوستان آ گئے تھے) دادی جعفری بیگم اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر اعظم اودھ کی بیٹی تھیں۔ سلطنت آرا بیگم لاولد رہیں۔ ان کے بھتیجے موجودہ نواب شمس آباد سید فرخ حید ایک بیش بہا کتب خانے کے مالک ہیں۔ انہوں نے مجھے تاریخ شمس آباد پر ایک نادر کتاب بھیجی ہے جس کے لئے میں ان کی شکر گزار ہوں (ق ح)

حکیم وحید علی کے دوسرے بھائی سید آل نبی محکمۂ انہار میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ بڑی وجیہہ اور شاندار شخصیت کے مالک ہیں۔ سچ پوچھو تو عہدہ ڈپٹی کلکٹری ہندی مسلمانوں کو بفضلِ خدا بہت راس آیا ہے۔

حکیم فرزند علی اور ڈپٹی آلِ نبی کی بہن اولیا بیگم سید علی جان رئیسِ نگینہ سے بیاہیں، جو کنویں پر ان کا مکان ہے۔

سید علی جان کی پانچ بے حد خوبصورت بیٹیاں ہیں۔ نام ان کے لاڈو بیگم، جانی بیگم، عمدہ بیگم، محمدی بیگم اور اشرف جہاں ہیں۔

ایامِ غدر میں سید علی جان نے بہنوں سے کہا کہ جب گورے یا باغی مکان پر حملہ کریں۔ توے کی سیاہی چہروں پر مل کر آنگن کے کنویں میں کود جائیو۔ حادثے کی خبر پڑھتے ہی یہ بچیاں جگمگاتے چہروں پر کالک تھوپ (کہ دشمن کی نظر پڑے تو وہ چڑیل سمجھ کر ڈر جائے۔) باؤلی میں کودنے کو تیار ہوئیں۔

جناب عباس علمدار نے یاوری کی۔ حملہ آور باہر سے ہی لوٹ گئے۔ بہنوں کی جان بچی۔ ان پانچوں کی ایک بہن سیدنی تھیں کہ ان کی اماں ممتوعہ تھیں۔ باندی گلشن نام تھا۔ زچگی میں مر کے چڑیل ہو گئی تھیں۔ اکثر بھری دوپہر میں صحن کے اندر [illegible] تھیں۔ کبھی پیپل کی شاخ پر بیٹھی نظر آتی تھیں۔ اب عرصے سے غائب ہیں۔

پانچوں بہنوں میں جانی بیگم کنواری جوان مر گئیں۔ کھانا پکا رہی تھیں، کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ ان کے نام کا جوڑا کنبے میں ہر لڑکی کے جہیز سے نکال کر کسی مستحق غریب لڑکی کو دیا جاتا ہے۔

دوسری بہن عمدہ بیگم پر جن کا سایہ ہو گیا۔ بیاہ کے روز جب اُن کو مایوں کی کوٹھری سے باہر لایا جا رہا تھا۔ عین اُس وقت وہ نامعقول جن ایک سانپ کی صورت میں نمودار ہوا اور کوٹھری کی دہلیز پر کنڈلی مار کے بیٹھ گیا۔ بارات واپس گئی۔ عمدہ بیگم اس کوٹھری سے نہ نکل پائیں۔ ساری عمر روزہ نماز میں گذار دی۔ آج تک وہ جن آس پاس موجود رہتا ہے۔

عمدہ بیگم کی چھوٹی بہن محمدی بیگم کا بیاہ میر قائم علی کے بیٹے میر منظر علی سے ۱۸۵۸ء میں ہوا۔

ناظرین آپ کو یاد ہو گا میر قائم علی ابنِ میر معصوم علی مع اہل و عیال انتزاعِ سلطنت سے کچھ ہی قبل لکھنؤ سے ہجرت کر کے مراد آباد آگئے تھے۔ اگر یاد نہ ہو تو پچھلا باب پڑھ لیجئے کہ ترتیب ہے۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ میر قائم علی انگریزی فیشن کے شائق تھے۔ لانگڑی والوں کے دقیانوسی ماحول میں اُن کا دم گھبرایا۔ صندوقچہ جواہرات جو امراؤ بیگم ساتھ لائی تھیں اس میں سے چند سکۂ زر و جواہر نکال کر مہاجن کے ہاتھ پر رکھے۔ سکہ سفید ملکہ وکٹوریہ کا اس سے لیا۔ انجینئر بلوایا۔ لانگڑی محلے کے نزدیک قلعہ کی مسجد سے چند قدم پر کوٹھی[2] ڈاٹ کی، اونچی چھتوں اور اونچی کرسی والی بنوانا شروع کی۔

صاحب کلکٹر ضلع نے عہدہ تحصیلداری پیش کیا۔ انہوں نے فی الفور قبول کیا۔ ایک روز گھر آ کر بی بی سے کہا، لیجئے صاحب ہمیں

---

[1] اولیا بیگم کے پڑپوتے ڈاکٹر سید علی مہدی نقوی فی زمانہ ایک امریکن ماہر فلکیات ہیں۔

[2] "کوٹھی میر قائم علی" ان کے پوتا، نواسہ سجاد حیدر اور میر سید آل حسنین کو ترکہ میں ملی تھی۔ ان دونوں کے پاکستان چلے جانے کے بعد [illegible] میں متروکہ جائداد قرار پائی۔ پنجابی مرزا [illegible] مالک نے اسے گرا کر نئی عمارت تعمیر کر لی ہے۔

نعمت و قلمدان ملا ہے۔ ہم متصدی ہو گئے"۔

تو کیا وجہ کہ انگریزوں نے یہ رسم ضلیعہ قائم رکھی تھی پھیلا کر اس وقت متصدی کہیں تھے۔ جو اب بے چارے غریب اہل کاروں کو منشی متصدی کہا جاوے ہے۔

ایک شام حسب معمول چوک میں تخت پر بیٹھے عزیزوں سے معروف گفتگو تھے کہ کسی نوجوان عزیز سے تکرار ہو گئی۔ یہ حضرت خاص لکھنؤ نام پر کمی نہ بیٹھنے دیں۔ فوراً اُٹھے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر بولے "اے لیجیے اب ہم مراد آباد سے بھی رخصت ہوتے ہیں۔ جب لکھنؤ ہی چھوٹ گیا ساری دنیا ہمارے لئے یکساں ہے۔ اب کبھی یہاں نہ آویں گے"۔

اتفاق کی بات کہ چند روز بعد ہی کانپور تبادلے کا حکم آ گیا۔ بی بی بچوں کو مراد آباد میں چھوڑ کانپور کی راہ لی۔

یا وحشت۔

اب ہم دوبارہ چوکنڑیں پر چلتے ہیں۔ سید علی جان کی بہنوں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ غدر میں اُن کی جانیں بچ گئیں پھر کیا ہوا؟ محمدی بیگم کا بیاہ تو میر قائم علی کے بیٹے میر مظہر علی سے ہو گیا۔ چھوٹی بہن اشرف جہاں کی شادی اُن ہی حکیم سید کرامت علی کے چھوٹے بیٹے سید مہدی علی سے ۱۸۶۰ء میں ہوئی مرتضائی بیگم مصطفائی بیگم اور میر تفضل علی پیدا ہوئے۔ ان سب سے آئندہ ملاقات ہو گی۔ میر مہدی علی کے متعلق یہ سنتے چلیے کہ اُن سے ایک جن کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ مراد آباد میں قلعے کی مسجد جنّات کا خاص مسکن ہے۔ روز رات کو وہاں تہجد پڑھتے ہیں۔ نہایت شستہ اُردو بولتے ہیں اور قیاس ہے کہ شیعہ ہیں۔

حضرات! اب ہم عنقریب مراد آباد سے رخصت ہو کر ایک اجنبی صوبے کا رُخ کرنے والے ہیں۔ لہٰذا چلتے چلتے میر قائم علی کے برادرِ نسبتی یعنی امراؤ بیگم کے بھائی سید منوّر علی نقوی کی اولاد کا احوال بھی سن لیجیے۔ سید منور علی کی ایک بیٹی کی شادی اورنگ زیب عالمگیر رح کے نامور وزیر نعمت خانِ عالی کے حقیقی پڑپوتے معشوق علی[1] سے ہوئی۔

باقی لڑکیوں کے بیاہ شیعوں میں ہوئے کہ اس وقت تک یہ جھگڑا نہ تھا جو بعد میں لکھنؤ کے سیاست دانوں نے شروع کروایا۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان انگریز سے حد درجہ متنفر تھے۔ انگریزی لباس کا فر کُرتی کہلاتا تھا۔ انگریزی طرزِ معاشرت کے لیے جذبۂ حقارت کا اظہار ان عوامی گیتوں سے ہوتا ہے۔

اگلا ناچے، بگلا ناچے، ناچے بوتل خانہ
پلپلی صاحب کی ٹوپی ناچے، میم صاحب کا جامہ

---

[1] سید معشوق علی کی جاگیر وعنانی ضلع علی گڑھ میں تھی۔ ایام غدر میں سرکار انگلشیہ کی تحویل میں دی گئی جس کے عوض گورنمنٹ نے سید معشوق علی کی زندگی پنشن مقرر کر دی۔ بیچارے زبان انگریزی سے ناواقف تھے۔ کاغذات کی جانچ کیا ہوا پھیری دشمنوں نے کی۔ جاگیر ضبط ہو برباد ہوئی۔ صرف "وقائع نعمت خان عالیؔ" ہاتھ میں رہ گئے۔ سید معشوق علی کے مقدر کی پیروی کے سلسلے میں مراد آباد کے سر محمد یعقوب مرحوم نے گورنمنٹ کا بہت پیچھا کیا۔ مگر بے سود۔ سید معشوق علی کے بیٹے سید محسن علی یوپی میں ڈائرکٹر انیمل ہسبینڈری تھے۔ چند سال قبل الٰہ آباد میں انتقال کیا (ق۔ ح)

اور — گورا میم کو نجات کفرا نیم کے تلے ۔ وغیرہ

انگریزی تعلیم لاکھڑی والوں کے نزدیک بھی حرام تھی۔ سید متور علی کے اکلوتے بیٹے سید اصغر علی نے جو ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے تھے غدر کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میں نام لکھوا لیا ۔ جو ہمارے محلے کے نزدیک سن ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا تھا ۔

انگریز مسلمانوں کا نیا وفادار معاشرہ تشکیل کرنے میں مصروف تھا ۔ ہر خاندان پر نظر رکھتا تھا ۔ میاں اصغر علی آٹھویں جماعت میں پڑھ رہے تھے کہ ایک روز کلکٹر کا پیش کار جو چپڑاسی ہمیشہ رہتا تھا بہلا کر ان کو اپنے ساتھ کلکٹر کے بنگلے پر لے گیا ۔ صاحب نے چائے پانی سے خاطر کی ۔ ملازمت کے لئے کہا ۔ میاں اصغر علی بولے ابا سے پوچھ کر بتائیں گے ۔ کلکٹر نے چوکڑی تیار کروائی (کلکٹر ضلع گورنر کی طرح چوکڑی پر نکلتا تھا) صاحبزادے کو پہلو میں بٹھا لا اور لاکھڑی والان روانہ ہوا ۔

ادھر بسم اللہ کے گنبد میں پہلے لڑکے کی تلاش شروع ہوئی ۔ کسی نے اطلاع دی پیش کار صاحب کے ساتھ بازار گئے ہیں کسی نے کہا ابھی ہم نے سول لائن کی طرف جاتے دیکھا سبطے پایا کہ کسی دشمن نے لڑکے کو اغوا کر لیا ۔ سارے رشتے دار تلواریں سونت محلے سے باہر نکلے ۔

کلکٹر کی چوکڑی قاضی کی املی کے نزدیک پہنچی تو اُدھر سے لاکھڑی والے تلواریں سونتے چلے آ رہے تھے ۔

کلکٹر نے گاڑی رکوائی ۔ میاں اصغر علی کا ہاتھ پکڑ کر لاکھڑی والوں کے ہجوم کی طرف پیدل روانہ ہوا ۔ اُن سے بات چیت کی ہمراہ ان کے محلے میں آیا ۔ چوک میں جہاں تخت بچھے تھے ایک تخت پر بیٹھ گیا ۔ مدعا بیان کیا ۔ فرفر اُردو بولتا تھا ۔

میر متور علی نے کہا ۔ ہم نے پہلے سے نوکری نا کروانے کے سیکڑوں برس گزر گئے ۔ آج تک ہمارے ہاں کسی نے نوکری نہ کی غضب خدا کا ۔ کیا ہمارے پاس کھانے کو نہیں ہے ۔ اب بھی اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے :

کلکٹر نے لڑکے کے ماموں ڈپٹی قاسم علی کی مثال پیش کی ۔ بہت بحث مباحثے کے بعد یہ شرط منظور کی گئی کہ مراد آباد سے باہر نہ بھیجا جائے تو خیر آپ کی خوشی پوری کر دیں گے ۔ قصہ کوتاہ میر اصغر علی[1] بھی نائب تحصیلدار مقرر ہوئے ۔

غدر کے بعد مراد آباد کی دنیا بھی بدل گئی ۔ لاکھڑی والے جو محلے سے باہر نکلنا شانِ وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے جانے کہاں کہاں جا پہنچے ۔ آیئے ان کے ساتھ ذرا ہفت کشورِ پنجاب کی سیر کر آویں ۔

## فصلِ دوم ، باب ۶

### راوی

۱۸۴۹ء میں تسخیر پنجاب کے بعد گورنمنٹ نے اس صوبے میں نہریں نکالنا شروع کیں ۔ ۱۸۵۱ء سے بڑی دوآب یا ستلج راوی کنال

---

[1] خان بہادر سید اصغر علی نقوی ۱۹۲۰ء میں کلکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ ۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا ۔ ان کے ایک بیٹے سید غضنفر علی نقوی (انڈین پولیس) کی شادی بجنور کے صاحب طرز ادیب چودھری محمد علی رُدولوی کی بیٹی سے اور ایک لڑکی کی شادی سید کلب عباس اور مانی جائسی کے چھوٹے بھائی سید کلب مصطفےٰ (مصنف ملک محمد جائسی) سے ہوئی ۔ پروفیسر سید محمود علی نقوی مرحوم جنہوں نے راقم الحروف کو بہت سی معلومات فراہم کیں ۔ ڈپٹی اصغر علی کے بیٹے تھے ۔

کی کھدائی کا آغاز ہوا۔ یہ کام ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ ۱۸۵۹ء میں ملتان سے امرتسر تک ریل چلنے لگی۔

صوبے کے بندوبست کے لئے سرکار نے جو تعدد ہوشیار اور مستعد ہندوستانی" افسر پنجاب بھیجے، ان میں میر قائم علی بھی شامل تھے۔ ستلج، راوی کنال کا مستقر گورداسپور رہتا تھا۔ ڈپٹی قائم علی وہیں تعینات کئے گئے۔ مارے غدر کے کانپور سے روانہ ہوتے وقت بیوی بچوں سے ملنے بھی مراد آباد نہ آئے۔ خط بھجوا دیا۔ اب ہم پردیس جاتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد از جلد تم لوگوں کو وہاں بلوالیں گے۔

امراؤ بیگم رو دھو کر چپ ہو رہیں۔ کوٹھی بن کر تیار ہو چکی تھی۔ اس میں میاں کے ساتھ چین سے رہنا نصیب نہ ہوا۔ میاں کے انتظار میں چپ بیٹھی ٹکر ٹکر سب کا منہ دیکھا کرتیں۔ کبھی سوچتیں بری گھڑی کلکتہ سے قدم نکالا تھا۔ منتیں مانیں۔ فریادی ماتم کئے۔ مگر میاں اب آتے ہیں نہ تب۔ عزیز و اقارب نے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر بے سود۔ نگوڑے پنجاب میں نہ جانے کہاں اللہ میاں کے پچھواڑے بھیج دیئے گئے تھے۔

اب خدا کی قدرت کا ایک تماشہ دیکھئے۔ ہمارا ایک خاندانی قصاب تھا۔ لاکھڑی والوں کے یہاں گوشت لاتا تھا فصل پر اس کا حساب کیا جاتا تھا۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں سرکاری گواہ بنا کر اسے مراد آباد سے کہاں بھیجا گیا۔ گورداسپور! وہاں ڈپٹی قائم علی کی عدالت میں پیش ہوا۔

(ڈپٹی کلکٹر کو پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کہتے ہیں)۔ قصاب نے گواہی دی۔ لب و لہجہ سے فوراً پہچان گئے۔

پوچھا "کہاں کے ہو۔؟"

بولا "میاں ؤہیں کا ہوں۔ مراد آباد کا"

پوچھا "فلاں فلاں گھروں میں گوشت لاتے تھے۔؟"

بولا "جی ہاں۔ میاں اب بھی لاؤں ہوں"

ڈپٹی صاحب نے عدالت برخواست کی۔ قصاب کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ گلے لگایا۔ خاطر تواضع کی۔ گھر لے جا کر کئی دن مہمان رکھا۔

قصاب بات کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ ڈرتا بھی تھا کہ کہیں بگڑ نہ جائیں۔ ایک روز شام کو ڈپٹی صاحب کوٹھی کے باہر لان کے گول چبوترے پر مونڈھا بچھائے حسب معمول پیچوان کے کش لگا رہے تھے۔ قصاب آ کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

ڈپٹی صاحب اس سے مراد آباد کے حالات دریافت کرتے رہے۔

"اجی میاں کیا پوچھو ہو۔ غدر کے بعد واں کا تو نقشہ ہی پلٹ گیا۔ لوگ باگ بڑی بڑی جاگیریں لے کے بیٹھ گئے۔ ہم سے واں جیسے بدحال پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک کہتے ہو۔"

قصاب اب مطلب کی بات پہ آنا چاہتا تھا کہ ڈپٹی صاحب نے پوچھا۔

"کس کس کو جاگیریں مل گئیں بھئی؟"

"اجی میاں وہ آپ کے پڑوس میں بھینسیا والے ناہیں، وہی بھینسیا گاؤں جو آگے ہے والے خان بہادر تراب علی کی ملکیت ہے (واضح ہو کہ سارے صوبے میں مراد آباد اور بجنور ایسے اضلاع ہیں جن کے نوے فیصد عوام اُردو بولتے ہیں اور خاص مغربی اردو بولتے ہیں۔)

"ہاں ہاں وہی ڈپٹی تراب علی۔ جانتا ہوں۔ کیا ہوا ان کو؟" ڈپٹی قائم علی نے پوچھا۔

"اجی ہونا ہوانا کیا تھا۔ غدر کے دنوں میں یہ ڈپٹی تراب علی، مرزا عابد علی اور سید احمد دہلوی تین پکے دوست تھے بیتلعہد بجنور میں تھے۔ تینوں نے سرکار کی بڑی خدمت کری۔ تراب علی صاحب کو موضع بچھڑاوں ملا۔ اور مرزا عابد علی کو موضع نواڑی اجی میاں۔" قصاب نے بات کا رُخ پلٹا۔

"آپ گھر چل کر وہاں کا نیا نقشہ خود دیکھ لیجیے نا۔ دنیا بھر سے میں آپ کو تلاش کر لیا۔ اب غصہ تھوکیے۔ چلیے چلیے۔ اب تو ریل گاڑیاں بھی چلنے لگی ہیں جگہ جگہ!"

ڈپٹی صاحب چپ۔

قصاب نے ہمت کر کے پوچھا۔

"میاں یہاں کسی پنجابن سے تو نکاح نا کر لیا آپ نے؟"

ڈپٹی صاحب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

قصہ کوتاہ۔ قصاب نے اپنی چرب زبانی سے ڈپٹی صاحب کو گھر چلنے پر رضا مند کر ہی لیا۔ حقیقت یہ تھی کہ پردیس میں انھیں گھر والے شدت سے یاد آ رہے تھے۔

کچھ عرصے بعد ڈپٹی قائم علی مراد آباد آئے۔ جن صاحبزادے سے تکرار ہوئی تھی، ان سے صلح صفائی کی۔ بیوی بچوں کے علاوہ اپنی بھابی کے لڑکے میر مہدی علی کو بھی ہمراہ لے کر پنجاب آ گئے۔ پنجاب ایڈمنسٹریشن کے بارسوخ افسر تھے۔ مہدی علی اور بیٹے میر مظہر علی دونوں کو تحصیلداری لگوا دیا۔"

"دکھیا امراؤ بیگم کو اب بھی میاں کے ساتھ بسنا نصیب نہ ہوا۔ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع میں جہاں ڈپٹی صاحب کا تبادلہ ہوا تھا ایک ڈاک بنگلے میں مقیم تھیں۔ برسات کا زمانہ تھا۔ جس کمرے میں مع خورد سال بچوں کے سو رہی تھیں، اس کی چھت گر پڑی۔ ماں بچے سب ایک ساتھ اللہ کو پیارے ہوئے۔ ڈپٹی قائم علی پر قیامت گذر گئی۔

یہ کٹھ گھر میں رام گنگا کے پل کے پاس تالو والا مکان نہیں ہے جو محل کہلاتا ہے۔ یہ مکان سید نجف علی سالدار کا ہے۔ یہ غدر سے پہلے کمپنی کے ایجنٹ کے ماتحت لوکل فورس کے رسالدار تھے۔ ان کے بیٹے سید حسین علی تھرڈ بنگال کیولری میں رسالدار تھے۔ سنی خاندان تھا۔ سید حسین کی بیٹی سے ڈپٹی قائم علی نے عقدِ ثانی کیا۔ اپنے سالے اولاد حسین کو ساتھ پنجاب لے گئے۔ وہ بھی خان بہادر اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوئے۔

خان بہادر میر قائم علی سی۔ آئی۔ ای اڈیشنل کمشنر صوبہ پنجاب کی ایک نامور ہستی بنے۔ دنیا جانتی ہے۔ پنجاب کے قوانین اراضی یعنی REVENUE LAWS کی تشکیل میں اُن کا حصہ اُن کا رب سے مشہور کارنامہ ہے۔

ایک ملتان کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ ایک کسان نے ایک مہاجن سے دو سو (۲۰۰) روپے قرض لئے تھے۔ مہاجن بارہ سو[۱۲۰۰] روپے سود مانگتا تھا۔ میر قائم علی نے اس معاملے کی اطلاع لفٹیننٹ گورنر کو بھجوائی۔ اور اراضی و مال کے قوانین مرتب کئے ان کی ایک اہم شق یہ تھی کہ زمیندار کی جائداد غیر زمیندار (پنجاب میں زمیندار کسان کو کہتے ہیں) نہیں خرید سکتا۔ مہاجنوں کے پاس زمیندارا بہت کم تھا۔ اس وجہ سے اب وہ اس نئے قانون کے تحت مقروض کسانوں کو ان کی زمینوں سے بیدخل نہیں کر سکتے۔

امپریل گزیٹیر بابت ۱۸۹۱ء میں تفصیل درج ہے کس طرح قائم علی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر گورداسپور نے ۱۸۷۰ء میں نیا قاعدہ مرتب کیا اور مسٹر پرنسپ کے بنائے ہوئے قوانین میں ترمیم کی۔

نواب رضا علی خاں[1] قزلباش ان کے گہرے دوست تھے۔ رضا علی خاں کابل سے ۱۸۴۱ء میں لاہور آئے، بعد میں انہوں نے اینگلو افغان جنگ کے بعد امیر یعقوب خاں[2] والیٔ کابل کو گرفتار کرنے میں انگریز کی مدد کی جس کے صلے میں انھیں بہرائچ میں زمین دی گئی۔ میر قائم علی جب لاہور جاتے نواب قزلباش کی حویلی مبارک منزل موچی دروازہ میں قیام کرتے۔ اس زمانے میں سو[3] مربع یعنی ڈھائی ہزار ایکڑ زمین جو لفٹیننٹ گورنر ان کو دے رہا تھا انہوں نے نواب قزلباش کو دلوا دی۔ ہم اگر ان کی جگہ ہوتے ایسا نہ کرتے بلکہ کمال عقلمندی سے وہ سو[3] مربعے خود قبول کر لیتے۔

امراؤ بیگم جو صندوقچہ جواہرات لکھنؤ سے لے کر چلی تھیں بہت چلا۔ اسی میں آخری جواہرات فروخت کر کے میر قائم علی نے ضلع گورداسپور میں دو گاؤں ہمیر پور اور جیت پور خریدے۔ دریا کے کنارے کوٹھی اور دکانیں بنوائیں۔ اپنے بیٹے میر مظہر علی کی اولاد بھی دیکھ لی۔ مارچ ۱۸۷۴ء میں بمقام گورداسپور وفات پائی۔ کرنل جے ایل مکر نے اپنے روزنامچے میں لکھا۔ میر قائم علی شاہ کے انتقال کی وجہ سے سارا گورداسپور سوگوار ہے۔

میر قائم علی کی ہردلعزیزی کی سب سے بڑی وجہ ان کے قوانینِ اراضی تھے دوسرے یہ کہ نجیب الطرفین سیّد تھے اور پیر پرستی پنجابی عوام کی سرشت میں داخل ہے۔

چنانچہ میر قائم علی شاہ کا مزار ان کی کوٹھی کے احاطے میں بنایا گیا۔ سبز جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ عرس[4] شروع ہو گیا۔ ہندو،

---

[1] موجودہ نواب مظفر علی قزلباش پاکستانی سیاست داں کے جدِ بزرگ۔

[2] دیکھئے کڑیوں سے کڑیاں کس طرح ملتی ہیں۔ امیر یعقوب خاں سابق والیٔ کابل کا اس داستان سے کس طرح تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے آنے والے ابواب کا انتظار فرمائیے۔

[3] یہ ساری جائداد بھی جو والدہ اور ماموں آل حسنین کو ترکے میں ملی تھی ۱۹۴۷ء کے بعد متروکہ جائیداد قرار پائی۔

[4] یہ عرس ۱۹۴۷ء تک بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا جمیر قائم علی شاہ یقیناً ایک افسانوی ہستی رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی (بٹالہ ضلع گورداسپور کی ایک تحصیل ہے) کے بزرگوں نے انھیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جو چند سال ہوئے ایک پاکستانی رسالے میں چھپا تھا یہ بھی لکھا کہ میر قائم علی شاہ کے خاندان کو پنجاب میں "باونی یعنی باون گاؤں والے کہا جاتا تھا" نجانے اس لقب کی وجہ تسمیہ کیا تھی۔

مسلمان، سکھ عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ان کے فیوض و برکات میں سے ایک یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ مزار کی خاک تھوڑی سی چاٹ لو۔ چوتھی کی باری یعنی چوتھیا جاڑا اتار رہتا۔ اور بچھو کے ڈنک کا اثر بھی چلا جاتا۔

ناظرین! عربستان میں آلِ حسن و حسین شریف کہلاتی تھی۔ ایران میں امام زادے اور توران میں خواجہ اور خوجہ کہلاتے۔ ہندوستان میں اکثر میراں اور میر ہوئے۔ سندھ و پنجاب میں شاہ صاحب۔ اب انگریزی دور میں "ایس" اپنے نام سے پہلے لکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

یہ زمانہ ڈپٹی قائم علی کے پوتے ایس ظہور حسنین کا ہے جو اس وقت مدرستہ العلوم علی گڈھ کے میدان میں فٹ بال کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ مجھ آغا کربلائی کی طویل داستان ختم ہوئی۔ اب ایس ظہور حسنین (مشہدی مرادآبادی) اور ایس سجاد حیدر (ترمذی نہٹوری)، کے ساتھیوں سے علی گڈھ کا افسانہ سنیے گا۔ والسلام

(مسلسل)

# ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی

## قرۃ العین حیدر

رات بھر میرے دریچے کے نیچے آذربائیجانی ترکی میں قوالی ہوا کی۔ صبح منہ اندھیرے آوازیں مدھم پڑیں اور کوہ قاف کے دھندلکے میں ڈوب گئیں۔

جب سورج نکلا میں نے سرائے کے باہر آکر آسمان پر رُخ کو تلاش کیا۔ لیکن رُخ کے بجائے ایک فاختہ ارارات کی سمت سے اڑتی ہوئی آئی فاختہ کی چونچ میں ایک غلط خط تھا۔ صحن میں آکر وہ اس سماوار پر بیٹھ گئی جو انگوروں کی بیل کے نیچے ایک کونے میں تپائی پر رکھا تھا۔

فاختہ نے پتلیاں گھما کر چاروں طرف دیکھا اور مجھ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ پھدک کر سماوار سے اتری لفافہ میرے نزدیک گرایا اور کوہ ارارات کی طرف پھر سے اُڑ گئی۔

سرائے کے مالک نے بغیر دودھ کی چائے فنجان میں انڈیل کر مجھے دی اور بولا "خانم۔ شاید رُخ نے آپ کو اطلاع بھیجی ہے کہ اس نے اپنی فلائٹ پوسٹ پون کی۔"

"ہوسکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ایسا ہے کہ یہ ان دکھیاروں میں سے کسی ایک کا خط ہے جو اپنے لاپتہ عزیزوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے اس قسم کے پیغام مشرق و مغرب دونوں طرف سے اکثر ملا کرتے ہیں۔"

"کوئی تعجب نہیں۔ کیونکہ جنگیں ہر سمت جاری ہیں سرائے کے سفید ریش مالک نے جو بالکل ٹالسٹائی کا حاجی مراد معلوم ہوتا تھا اور روسی بلاؤز کی چرمی پیٹی میں ایک عدد مرصع نقلی پستول رکھتا تھا، اطمینان سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے دریافت کیا۔ "خانم۔ یہ والی جنگ کون سی تھی؟"

میں نے فنجان تخت کے کنارے پر رکھ کر خط پڑھا۔

تب میں نے طے کیا کہ وقت آگیا ہے کہ تلاش شروع کرنے کے لیے بالکل ابتدا کی طرف واپس چلا جائے۔

چنانچہ میں نے اپنا روزمرہ کا ماسک چہرے سے اتارا۔ حاجی مراد کو خدا حافظ کہا اور ارارات کی سمت چل پڑی جو سامنے جگمگا رہا تھا لیکن بہت دور تھا۔

میں دن بھر چلا کی۔ بہت سی وادیاں اور منزلیں طے کیں۔ عین غروب آفتاب کے وقت صنوبروں میں گھرا ایک شفق رنگ چشمہ نظر آیا۔ اس کے کنارے ایک نیلی آنکھوں اور سرخ داڑھی والا فقیر مراقبے میں مشغول تھا۔ میں نے بغور دیکھا۔ وہ خواجہ سبز پوش نہیں

تھا۔ بلکہ جیسا کہ ان علاقوں کا دستور ہے۔ اس بزرگ نے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس کی سفید ندے کی اونچی کلاہ اور دعا کے پیچھے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگلے وقتوں کا بکتاشی درویش ہے۔

اب میں نے دیکھا کہ آفتاب اور بدر کامل دونوں افق پر موجود ہیں۔ صنوبروں پر رات کے پرند نغمہ زن ہوئے۔ پھر سورج اور چاند دونوں جھیل کے پانیوں میں گر گئے۔ جھیل کا رنگ سیاہ ہو گیا۔

اس بزرگ نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور "یا ہو" کا نعرہ بلند کیا جو مجھے معلوم تھا کہ بکتاشی فقرا کے سلام کا طریقہ ہے۔

دفعتاً اس پیرمرد نے بولنا شروع کیا۔ جیسے کسی نے ایک غیر مرئی ٹیپ ریکارڈر چلا دیا ہو۔ اس نے کہا "میں اس عجیب روشنی میں سفر کرتا ہوں جو نہ زمین کی روشنی ہے نہ آسمانوں کی۔ جو انوارِ الٰہی کی سات روشنیوں سے مل کر بنی ہے۔ سنو۔ کہ زندہ ابھی سے مر چکے ہیں۔ اور مُردے زندہ ہیں۔ کھوپڑیاں تپتے غاروں میں گا رہی ہیں۔ جب ان کی آوازیں سمندروں کا شور بن جاتی ہیں میں اپنے تکیے پہ منتظر رہتا ہوں۔

"میں رات دن خوفِ الٰہی کی چکی پیستا ہوں اور خالق کی رضامندی کی چکی میں سے دانہ نکالتا ہوں۔ اے خانم۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"افندم" میں نے عرض کی "ایک اجنبی عورت نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور ایک طوفانی دریا کے کنارے رہتی ہے۔ اور اس نے لکھا ہے —— دریاؤں کی موجیں لوٹ لوٹ آتی ہیں۔ لیکن وقت نہیں لوٹتا کیونکہ زمین بھی بوگس ہے۔ خزاں کی ہوائیں چلیں اور جنگلوں میں اونچے درختوں کے پتے سرخ ہو گئے۔ شاخیں کھڑکھڑائیں اور دلدلوں میں جنگلی بطخیں چلا رہی ہیں۔ دماغ باقی ہیں۔ اور جسم ختم ہو گئے۔

"عرصہ دو سال کا ہوا میرا شوہر اچانک غائب ہو گیا۔ میں باؤری سب سے پوچھتی پھرتی ہوں۔ کوئی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ خاتون آپ کو ترکوں کی سرزمین میں شاید کوئی واقفِ اسرار مل جائے۔"

جس وقت میں یہ خطبہ پڑھ کر سنا رہی تھی شمشاد کے درخت کے نزدیک کھڑے اس بزرگ نے ہاتھ سامنے باندھ کر سر جھکا رکھا تھا۔

تب اس فقیر نے ہاتھ آستینوں سے نکالے اور نظریں اٹھائیں اور کہا "ملک ہنگری میں میرے جدِ امجد حاجی گل بابا نقشبندیؒ کی درگاہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بخارا اور استانبول اور البانیہ اور رومانیہ سے کلمہ گو اس مزارِ پُر انوار کی زیارت کے لیے پاپیادہ ہنگری جایا کرتے تھے۔ اے خانم۔ اب میں وہاں جاتا ہوں۔ اور واپس آ کر تمھیں اطلاع دیتا ہوں۔"

درویش نے ایک صنوبر کے سائے میں کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد آنکھیں وا کیں اور یوں گویا ہوا "میں نے ڈینیوب کے کنارے اس شکستہ درگاہ پر ماضی اور مستقبل کا نظارہ کیا۔ سنو۔ جب میرے پر دادا حاجی عدنان آفندی ایک کارواں کے ہمراہ ملکِ ختا جاتا تھا یارقند کے نزدیک اسے بکتاش قلی یعنی بندۂ خدا کے سلسلے کا ایک نوجوان فقیر ملا۔ اس نے حاجی عدنان کو پلٹ کر دیکھا اور بولا "آغا۔ فکر کرو۔ فکر کرو۔ محتاط رہو۔" اس کے بعد وہ شاہراہ کے کنارے آباد ایک نقشبندی خانقاہ سے روانہ ہوا تک غائب ہوا اور اسی لمحے دوسری طرف نکل گیا اور سمرقند میوزیم میں داخل ہو گیا۔ اب وہ سمرقند۔ ازبک سوشلسٹ سوویٹ ریپبلک کے عجائب خانے کے ایک گلاس کیس میں کھڑا ہے اور اس کی آنکھیں کانچ کی ہیں۔ خانم۔ میرے ساتھ آئیے۔"

درویش نے اپنا عصا سنبھالا اور جھکا جھکا میرے سائے کی مانند میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ہم جھیل وان کے کنارے ایک تکیے پر پہنچے۔ یہ ایک چوبی عمارت تھی جس کی چھت سرخ رنگ کی تھی اور چاروں طرف سیب کے درخت تھے۔ اس قلندر نے کہ اس لفظ کے معنی ہیں خاص سونے کی ۔۔۔ مجھے سیڑھیوں پہ کھڑا چھوڑ دیا اور ہوا کے جھونکے کی مانند اندر چلا گیا۔

جب وہ دیر تک باہر نہ آیا تو مجھے بہت ڈر لگا۔ میں دبے پاؤں دریچے کے نزدیک پہنچی اور اندر جھانکا۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک چوکور کمرہ ہے جس کا فرش چوبی ہے اور چھت نیچی۔ جس کے شہتیر سیاہ رنگ کے ہیں۔ فرش پر ایک آذربائیجانی غالیچے پر دو بالکل ہمشکل صوفی آمنے سامنے خاموش بیٹھے ہیں۔ ایک کونے میں چینی کا ایک فرنچ اسٹوو رکھا ہے جس پہ گلاب کے پھول بنے ہیں۔ ایک شہتیر سے ایک طنبورہ آویزاں ہے اور فرش پہ ایک نے رکھی ہے کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کی روحانی بانسری کی نمائندہ ہے۔

دونوں درویش چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر ان میں سے ایک اٹھا اور جنوب کی طرف رخ کیا جو مجھے معلوم تھا کہ مدینہ منورہ کی سمت تھی۔ درویش نے اپنے سفید پٹکے سے کہ آذربائیجانی بھیڑوں کی اون سے بُنا گیا تھا ایک چھوٹا سا پتھر نکالا کہ المصطفیٰؐ اکثر بھوکے رہنے کی وجہ سے اپنے پیٹ سے پتھر باندھے رہتے تھے۔ اور بکتاشی فقرا اس سنتِ رسولؐ کی پیروی کرتے ہیں۔ درویش نے ایک بکتاشی طریقت کی ایک رسم شروع کی۔ اس نے پٹکے کی گرہ باندھی اور کھولی۔ پھر باندھی اور کھولی اور دہرایا۔ "میں شر کو باندھتا اور خیر کو کھولتا ہوں۔ میں جہالت کو باندھتا اور خوفِ آلہی کو کھولتا ہوں۔ میں طمع کو باندھتا اور فیاضی کو کھولتا ہوں۔ میں عجز و انکسار کی درانتی سے پرہیزگاری کی فصل کاٹتا ہوں میں خودآگہی میں بوڑھا ہوتا ہوں اور صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتا ہوں ——"

تب میں دریچے سے چند قدم پیچھے ہٹی اور آسمان کی طرف منہ کیا اور ایک اور بکتاشی مناجات پڑھی —" اے وہ جس کا کوئی نسب نامہ نہیں۔ او بکتاش جو زمانے کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ جو شبِ تاریک میں سنگِ سیاہ پر رینگتے چیونٹے کی آواز سن لیتا ہے۔"
لیکن اب میں نے بڑی چالاکی سے اپنے پیغام کا اضافہ کیا —" او بکتاش بس تو مظلوموں کی فریاد ہی نہیں سنتا —"
لیکن میری آواز درویشوں کے وظیفے کے شور میں ڈوب گئی۔ وہ اب چلا رہے تھے —" او نبیؐ جس پر بادل ہمیشہ اپنا سایہ کیے رہتے تھے۔ المصطفیٰ — دنیا پر رحم فرما — رحم — رحم — رحم —"

"کریم اللہ — یا ہو —" کے بکتاشی نعروں سے کمرہ گونج اٹھا۔

دوسرے لمحے وہ صوفی (انہوں نے مجھے اپنا نام حاجی سلیم آفندی بتلایا تھا) ایک صراحی اور کوزہ ہاتھ میں لیے برآمد ہوئے۔" خانم۔ اس بد قسمت عورت کے لئے جو کچھ میں کر سکتا ہوں کروں گا۔ لیکن علی مرتضیٰؑ شاہِ ولایت نے کہا ہے جو کچھ لکھا گیا ہے ہمیشہ موجود رہے گا۔"

تب میں نے ایک بہت غیر متعلق بات حاجی سلیم سے کہی۔ میں نے عرض کیا۔" آفندم۔ میرے وطن میں جو یہاں سے ہزاروں میل دور ہے، ہماری آبائی حویلی میں جو اب کھنڈر ہو چکی ہے۔ ایک تہ خانہ ہے۔ اس تہ خانے میں پرانی کتابوں کے انبار

ہیں۔ اور ایک پیلا شکستہ فرنچ اسٹول جس پر گلاب کے پھول بنے ہیں۔ اور انسائیکلوپیڈیا پڑا ہے ان کتابوں کو کترنے میں مصروف ہیں جو دولت عثمانیہ اور برطانیہ اور فرانس اور مصر اور ایران میں کسی زمانے میں بڑے شوق سے لکھی اور چھاپی گئیں — قسطنطنیہ ۱۸۷۱ء۔ لندن۔ ای۔ سی فورڈ ۱۸۸۴ء۔ طہران ۱۸۹۴ء۔ قاہرہ ۱۹۰۲ء۔ اور ایک نسبتاً جدید کتاب بھی وہاں پڑی ہے لندن یونیورسٹی اسکوائر ۱۹۵۱ء۔ اور ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک کہر آلود سہ پہر میں فرنگیوں کے اس بزرگ صوفی سے ان کے فیبر اینڈ فیبر[1] رسل اسکوائر کے دفتر میں ملی تھی۔ اور انہوں نے مجھ سے رقصاں درویشوں کے متعلق باتیں کی تھیں۔ چونکہ آپ خود اس حلقے سے تعلق رکھتے ہیں مجھے قونیہ کے اس مرحوم سلسلے کے متعلق کچھ بتائیے کہ قونیہ بھی اب محض ایک ٹورسٹ اٹریکشن ہے —

درویش نے سر جھکایا اور رونے لگے پھر آنسو آستین سے پونچھے اور خود بھی ایک قطعی غیر متعلق بات کہی۔ "ہاں"۔ حاجی سلیم نے فرمایا "میں اس لیے رو رہا ہوں کہ قانون خداوندی کے مطابق میرا ہمزاد جو اندر بیٹھا ہے۔ میرے مرنے سے ٹھیک چالیس دن قبل مر جائے گا ان چالیس دنوں میں میں کیا کروں گا؟ کیونکہ وہ مجھے خبردار کرتا رہتا ہے۔"

دفعتاً حاجی سلیم پھر چلائے — "مولائے کائنات شاہ نجف نے فرمایا ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے رہے گا —"

"افندم" میں نے عرض کی "اوپر والوں کی باتیں تو میں نہیں جانتی مگر جو کچھ یہاں لکھا جاتا ہے اکثر بیحد خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ آپ کو علم ہے۔ ہر حرف کا ایک موکل موجود ہے۔"

درویش نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "جب اس صاحب زماں نے حکمنامے پر دستخط کیے تو اس کے حروف کے طاقتور موکل اڑ کر گئے اور انہوں نے تباہی پھیلا دی۔ دماغ پاش پاش ہوئے۔ اور جسموں کے پرخچے اڑ گئے —— افندم۔ میں اس اجنبی عورت کو کیا جواب دوں؟"

"فکر کرو۔ محتاط رہو۔ خبردار رہو۔"

"اس اجنبی خاتون نے لکھا ہے کہ اس کے خاوند کا نام ابوالمنصور تھا۔ اور وہ تصویریں بناتا تھا۔"

"کیا وہ اپنی کھوپڑی بچانے کے لیے جنگل کی سمت نہیں بھاگا؟" حاجی سلیم نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ اجنبی عورت نے لکھا ہے کہ وہ ایک تالاب کے کنارے بیٹھا جنگلی بطخوں کی تصویریں بناتا رہا۔"

"نہایت احمق تھا۔" حاجی سلیم نے مختصراً کہا۔

"اور ہزاروں لاکھوں انسان جنگلوں اور دلدلوں اور سرحدوں کی طرف بھاگے اور زمین ان کے پیروں تلے سے نکل چکی تھی اور سروں پر تلواروں کا سایہ تھا۔"

"کوئی تلوار نہیں سوا ذوالفقار علیؑ کے —" حاجی سلیم نے میری بات کاٹی۔

میں خاموش ہو گئی۔

"کیا جب قیامت آئی شخص مذکور تنہا تھا؟" حاجی سلیم نے دریافت کیا۔

---

[1] FABER AND FABER

"جی نہیں ۔ مرگ انبوہ کے جشن میں شامل تھا۔"

"یہ کہاں کا ذکر ہے ؟"

"ہر جگہ کا ۔ مشرق ۔ مغرب ۔ شمال ۔ جنوب ۔ بکتاش کا چہرہ ہر سمت ہے ۔"

حاجی سلیم نے غور سے مجھے دیکھا " ہانم ۔ کیا تم ان میں سے نہیں ہو جو ایمان لائے ؟"

میں نے بات جاری رکھی " اور لاکھوں سرحدوں کی طرف بھاگے ۔ وہ بحالت خموشی مشرق سے مغرب کی جانب آئے اور اسی طرح سر جھکائے پھر واپس لوٹ گئے ۔ تب میں نے بہت سوچا کہ یہ سب کیوں ہوا ۔ اور مجھے یاد آیا ۔ لکھا ہے " جو اپنی روح کا حج کرے اس پر اسرار منکشف ہو جاتے ہیں ۔ میں نے اپنی روح کا حج کیا پر کچھ دریافت نہ ہوا ۔"

" ہانم ۔ شاید تمہارے قلب پر کفر کی مہر گہری لگی ہے ۔" حاجی سلیم نے کہا اور صراحی سے تھوڑا سا پانی کوزے میں انڈیلتے ہوئے ایک بکتاشی دعا پڑھی ــــ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ ۔ اور محمدؐ اس کا رسول اور علیؑ اس کا دوست ۔ اور امام مہدیؑ آخر الزماں ۔ اور موسیٰؑ کلیم اللہ ۔ اور عیسیٰؑ روح اللہ ــــ ہانم ۔ اس پانی میں دیکھو ــــ"

"کیوں ۔ کیا آپ کو جام جمشید مل گیا ہے ؟" میں نے ذرا جھنجلا کر پوچھا ۔

" ہانم ۔ پانی میں دیکھو ۔"

میں نے دیکھا اور کہا " افندم ۔ اس میں تو مجھے ایک عدد گھوڑا گاڑی نظر آتی ہے یعنی اسٹیج کوچ جو ایک جاپانی سے پُل پر سے گذر رہی ہے ۔" پھر دفعتہً میں نے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے COMMENTATOR کی طرح جوش سے کہنا شروع کیا ــــ" اور اس گاڑی میں ایک کٹھ پتلی نوہ ماسک پہنے بیٹھی ہے ــــ اور کوچوان کا چہرہ نہیں ہے ــــ کوچوان کا چہرہ نہیں ہے ــــ اور اب ایک ناؤ جو وسیع دریا کے دھندلکے میں رواں ہے اور کنارے پر نازک سے پہاڑ اور بانس کے جھنڈ اور بید کے پودے ــــ اور پہاڑی کے دامن میں بانس کا جھونپڑا ۔ اس کے برآمدے میں ایک منحنی سا انسان ۔ بکرے کی سی داڑھی ــــ بیٹھا تصویر بنا رہا ہے ــــ افندم ۔ یہ سب تو کچھ زین سا معلوم ہوتا ہے ــــ"

" زین بھی دوست ہے ۔ ہانم ۔ اور غور سے دیکھو ۔ ناؤ یا بکتر بند گاڑیاں ــــ ؟"

" افندم ــــ افندم ــــ آپ کے پیالے کا پانی سرخ ہو گیا ــــ"

" کریم اللہ ــــ یا ہو ــــ" حاجی سلیم نے ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے دہرایا ۔ کوزہ اٹھا کر سر جھکائے سیڑھیاں اترے ۔ سیب کے جھرمٹ سے گذرتے جھیل کے کنارے پہنچے اور اچانک اس مشاق اور پھرتی سے کوزہ دور پانی میں پھینک دیا جیسے کرکٹ کے کھلاڑی گیند پھینکتے ہیں ۔ پھر وہ تیکیے پر واپس آئے اور سیڑھی پر بیٹھ کر کہنا شروع کیا " میں خوف الٰہی کی چکی پیستا ہوں ۔ اور نفرت اور ظلم کو باندھتا ہوں اور محبت اور دردمندی کو کھولتا ہوں ۔ اور غیظ و غضب کو باندھتا ہوں ــــ اے ہانم ہندی ــــ کیا یہ شخص ابو المنصور ایک انسان تھا یا ایک علامت ؟"

" دونوں ۔" میں نے جواب دیا ۔

حاجی سلیم نے سر جھکا کر دوبارہ رونا شروع کیا۔

"کیا میں اس خاتون کو لکھ دوں کہ وہ صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتی رہے؟" میں نے پوچھا "افندم۔ اب میں شاہجہان آباد
واپس جاتی ہوں۔ آپ بھی استانبول لوٹ جائیے اور وہاں محلہ پیر پاشا توپ کاپو میں اپنا تکیہ مرمری آباد کیجیے یا خانقاہ ادمخلو قلی پاشا۔"

"خانم۔ میرے واپس جانے کے لیے اب کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ استانبول کے درویش تکیے نصف صدی ہونے کو آئی ایک
صاحب الزماں کے حکم سے بند کر دیے گئے۔ چند ایک کے تالوں عجائب خانوں میں رکھے ہیں۔ یہ فقیر حقیر بھی ایک گلاس کیس میں کھڑا
ہے ـــ" حاجی سلیم نے کہا اور آنسو بہاتے رہے۔ دفعتاً میں نے نوٹس لیا کہ حاجی سلیم کی نیلی آنکھیں کانچ کی تھیں۔

"بہرحال۔ افندم۔ آپ جہاں کہیں بھی واپس جائیں اس بیکتاش سے کہہ دیجیے کہ ساری دنیا میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب
اس کے متقلوں پر بہت ظلم ہوتے اور ہو رہے ہیں ـــ اور دعا کرتے رہیے۔"

"ہم بیکتاشی محض دعا نہیں کرتے۔ خانم۔ تم نماز پڑھتی ہو۔؟ سیدھی سادی نماز؟ ہم نماز پڑھنے کو دار منصور پہ چڑھنا کہتے ہیں۔
میں روز دار منصور پر چڑھتا ہوں۔ اور فنا ہوتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں۔ چونکہ تم ایسا کبھی نہ کر و گی تمھیں کچھ معلوم نہ ہوگا میں روزانہ خواہشات
کو باندھتا اور قناعت کو کھولتا ہوں۔ خدا صابر ہے کیونکہ حی و قیوم ہے۔ بندہ بے صبر ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی چند روزہ ہے۔ اور
وقت تیزی سے گذرتا جاتا ہے ـــ"

تب میں نے ذرا بے ادبی سے کہا "افندم آپ کو ہسپانیہ کے حاجی یوسف بیکتاشیؒ کا نام یاد ہے؟ پندرھویں صدی عیسوی
میں وہ علیہ الرحمتہ اندلس میں موجود تھے۔ جب مسلمانوں پہ قہر ٹوٹا ان کا اور ان کے مریدوں کا صبر و رضا کسی کام نہ آیا۔"

حاجی سلیم نے میری بات کا مطلق نوٹس نہ لیا اور کہتے رہے۔ "میں انوار الہی کی روشنی میں سفر کرتا ہوں۔ میں ننانوے اسمائے
الہی کی روشنی میں چلتا ہوں۔ ہُو جو بہ رنگ سرخ ہے۔ احد سبز اور عزیز جو سیاہ ہے اور ودود جس کی ذات میں روشنی نہیں ـــ
حاجی سلیم بیکتاشی کی گفتگو ختم ہوئی ـــ"

معاً غیر مرئی ٹیپ ریکارڈر میں سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی نے اسے الٹا چلا دیا ہو۔ کیونکہ وجود متعدد
حصوں میں منقسم ہے۔

حاجی سلیم سامنے دیکھتے اپنا لبادہ سرسراتے تکیے کے اندر جا کر غائب ہو گئے۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس میں زنگ آلود
موٹا قفل پڑا تھا۔ میں نے انگور کی بیلوں سے گھرے دریچے میں جا کر اندر جھانکا۔ حاجی سلیم اور ان کا ہمزاد اپنے اپنے ہاتھ سامنے باندھے
گم سم آمنے سامنے دو زانو بیٹھے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ دونوں پیلے پرانے کاغذوں میں تبدیل ہو گئے۔ کوہ ارارات کی طرف سے ہوا کا
ایک تیز سرد جھونکا آیا جس میں دریچے کے شکستہ پٹ بھڑ بھڑ سے کھل گئے اور وہ دونوں درویش پرزہ پرزہ ہو کر کمرے میں بکھر سے باہر آ کر
یہ پرزے فضا میں چکر کاٹنے لگے اور خستہ فالتو کاغذوں کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔

ترخ تغلق آباد کی سرزمین پر اترا اور اپنے پنکھ پھیلا دیے۔ میں نے نیچے آ کر شہر کا رخ کیا۔ راہ میں سوچی تلاش یہاں از سر نو شروع
کرنے سے قبل اپنے پہلے نے دھرانے ماسک کی مرمت کروانا ضروری ہے۔ اور گو میں زیادہ مدت بعد واپس نہیں آئی تھی شہر بدل گیا تھا۔

تب اندرون شہر کی ایک گلی میں میں نے ایک رتھ بان سے پوچھا "او بھائی رتھ بان۔ جمہوریہ کی تازہ ترین آج کل کی راجدھانی کا راستہ کدھر ہے؟" اس نے کہا "معلوم نہیں۔" اور گھوڑوں پر چابک لگا کر ہوا ہو گیا۔

تب میں اور آگے بڑھی۔ اور ایک تورانی شہسوار سے دریافت کیا۔ "او بھائی شہسوار اگر میں تغلق آباد پہنچ گئی ہوں تو کسی ایسے کارخانے کا راستہ بتاؤ جہاں میں اپنے ماسک کی مرمت کروا سکوں۔"

شہسوار نے جواب دیا۔ "بی بی سامنے قتلق نگار خانم کا مقبرہ ہے۔ لینی تھا۔ اس کے اوپر جو ایر کنڈیشنڈ عمارت کھڑی ہے اس کے اندر۔ وہ قدیم خاتون جو رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں میں SHE کے نام سے ایکٹنگ کیا کرتی تھی۔ اب بیوٹی پارلر چلاتی ہے۔"

لہٰذا میں اس کارخانے پر پہنچی۔ اس کے سامنے ایسا ہجوم تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔ میں نے اندر جھانکا۔ ہیروں سے جگمگاتی بہت سی عورات ایک قطار میں خوفناک مشینوں کے نیچے سر دیئے ساکت و سامت بیٹھی تھیں اور مزید عورات اس طرح آ رہی تھیں جیسے فرنگستان میں مردے MORTICIANS کے ہاں آتے ہیں۔

دہشت زدہ ہو کر میں الٹے پاؤں باہر نکلی تو شاہجہان آباد کی ایک گلی میں ایک چگی داڑھی والے نوجوان نے میرا راستہ روکا اور گویا ہوا۔ "اے اس قدر CONFUSED نظر آنے والی بھارتیہ مہیلا۔ میں ایک پردیسی مسافر ہوں۔ اور مجھے بھوک لگی ہے کسی ایسی جگہ کا پتہ بتلا سکتی ہو جہاں میں دریائی مچھلی اور اچھا بھات کھا سکوں؟"

میں اسے جامع مسجد کے قریب ایک بھٹیار خانے میں لے گئی جہاں قلعے کے چبوترے "سلاطینوں" اور شعرا کی آمد و رفت رہتی تھی۔ دیکھا تو بھٹیار خانہ سنسان پڑا تھا۔ میں بہت مایوس نظر آئی تو اس اجنبی نوجوان نے کہا۔ "بانوئے محترم آیئے نیو دہلی چلتے ہیں۔"

نیو دہلی کے اس MOD ریستوران میں چگی داڑھی والا یوں داخل ہوا جیسے بطخ پانی میں داخل ہوتی ہے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ شخص نامعلوم آرٹسٹ ہے۔ اس طعام خانے میں مرد اور عورتیں بالکل یکساں نظر آ رہے تھے۔ بلکہ عورتیں مرد اور مرد لڑکیاں معلوم ہوتے تھے کہ یہ UNISEX LOOK کہلاتا ہے۔

پردیسی نوجوان نے دریچے کے قریب میز پہ بیٹھ کر دریائی مچھلی منگوائی اور کہا کہ گو وہ اب ہمارا دوست اور حلیف ہے لیکن اپنا بل خود ادا کرے گا۔

تب میں نے اس سے کہا۔ "او بھائی پردیسی مہمان میں تمہاری اس خودداری کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ نوجوان دریچے سے باہر دیکھتا رہا جہاں ترک بادشاہوں کے خستہ مقبروں میں غریب غربا ٹاٹ کے جھونپڑے ڈالے شام کا کھانا پکا رہے تھے۔ کیونکہ بہرحال سب کچھ زین ہے اور بکتاش کا چہرہ ہر طرف ہے۔

اچانک اس نوجوان نے حاجی سلیم آفندی کی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "کٹھ پتلیاں ٹیلیوں سے آویزاں اسٹیج پر اتاری جاتی ہیں۔ تماشا گر ایک پتلی اوپر کھینچ لیتا ہے۔ دوسری کٹھ پتلی نیچے اتار دیتا ہے۔"

"یہ بھی درست ہے۔" میں نے حاجی سلیم آفندی کی مانند جواب دیا۔ پھر میں نے مستعدی سے اجنبی عورت کا خط پرس میں سے نکالا اور بولی۔ "او بھائی مسافر۔ زندہ مردوں کے خواب دیکھ رہے ہیں اور مردے زندوں کے۔ اور تصویروں کی تصویریں باقی ہیں۔ چونکہ تم طوفانی دریاؤں کی سمت سے آئے ہو ممکن ہے تم نے مصور ابوالمنصور کا نام سنا ہو۔"

مسافر کھانا کھاتا رہا کیونکہ کھانا پیدائش اور موت اور ازل اور ابد کے درمیان سب سے بڑی اور اصل حقیقت ہے۔ گو ہم سے کہا گیا تھا کہ بھوک کو بانده رکھو اور قناعت کو کھو دو۔ تاکہ کچھ لوگ باقی لوگوں سے زیادہ کھا سکیں۔

میں نے پھر دریافت کیا " تم یہاں کس بات کی جستجو میں آئے ہو؟"

"کیا جستجو ضروری ہے؟" اس نے کہا "میں یہاں نیشنل اسکول آف ڈراما میں آپ کی حکومت کی اسکالرشپ پر فنِ تماشا گری سیکھنے آیا ہوں جس فن کے آپ لوگ ماہر ہیں۔"

"کیا تم اُن لوگوں کے قبیلے سے ہو جو نقلی چہرے لگا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کوئی اور ہیں؟ کیا تمہارے ماں یا باپ اداکار ہیں؟"

"میرا باپ جنگل بطخوں کی تصویریں بناتا تھا۔"

"کیا اب بھی وہ زندوں میں شامل ہے؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

تب نوجوان نے اکتا کر کہا "شاید میری ماں نے آپ کو بھی خط لکھا ہے۔ وہ طرح طرح کے لوگوں کو خط لکھ لکھ کر میرے باپ کی کھوج میں مصروف ہیں اور یہ یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ میرے باپ کو صبح پانچ بجے طلوع آفتاب سے قبل مکان سے باہر لے جا کر عالم بالا روانہ کر دیا گیا تھا۔"

اس کے بعد اس شخص گمنام نے کھانا ختم کیا۔ سکون سے خدا حافظ کہا اور ریستوران سے باہر چلا گیا۔

میں نے دریچے میں سے دیکھا۔ نیو دہلی کی سڑکیں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ اتنے میں دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور ایک گھوڑا گاڑی تغلق نگار خانم کے مقبرے کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اور سنسان سڑک پر سامنے سے گذر گئی۔ اس اسٹیج کوچ کے اندر ایک کٹھ پتلی نوہ ماسک لگائے بیٹھی تھی کوچوان نے شوگن عہد کا کیمونو پہن رکھا تھا۔ کوچوان نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اور اس کا چہرہ نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے ماسک کو چھوا۔ اور مجھے یہ خوفناک احساس ہوا کہ میں یہ محض ظاہر ہی نہیں کرتی کہ میں کوئی اور ہوں۔ میں واقعی کوئی اور ہوں۔ اور ایک ایسی نوہ تمثیل میں شامل ہوں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔

عزیز من! آج سے چھ سو برس قبل حاجی گل بابا بکتاشی علیہ الرحمۃ نے یہ معمہ اپنے مریدوں کے سامنے رکھا تھا جب وہ نیلے ڈینیوب کے کنارے عثمانی مملکتِ ہنگری میں اپنی خانقاہ کے اندر بیٹھے حکایات قدیم و جدید کے ذریعے درس دیا کرتے تھے۔

"اور اس مقام پر میرا راگ ختم ہوا۔ اے دنیاؤ۔ اب رخصت ہو اور واپس جاؤ۔" مولانا جلال الدین رومیؒ نے کہا اور نے ہاتھ سے رکھ دی۔

---

# مسعود مفتی
## کی تخلیقات

عنوانات

ہم لُٹ گئے ۔ آدھا ملک دے بیٹھے ۔

ہم سے مشرقی پاکستان کوئی چھین نہیں سکتا تھا۔ مگر ہم نے خود دے ڈالا۔ ہم غلطیاں کیں، کچھ نادان دوستی میں، کچھ دانا دشمنی میں۔ مجرم کون ہے ۔ یہ راز نہیں مگر راز رہے گا ۔

میں کسی کو قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ خود کو مجرم گردانتا ہوں ۔ میرے ہاتھ میں قلم کی نعمت تھی مگر میں نے اُس سے فائدہ نہ اُٹھایا ۔ میں نے کسی کو یہ نہ بتایا کہ بوڑھی گنگا کا پانی لہولہان ہو گیا ہے ۔

صرف میں ہی قصوروار نہیں ۔ اِس دَور کے سارے اہلِ قلم مجرم ہیں ۔ جو صرف ترانے لکھتے رہے مگر اس پر کسی نے غور نہ کیا کہ ترانے لکھنے کی نوبت آئی کیونکر؟

اِس سلسلے مسعود مفتی آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔ دل اِن کا دُکھا ہوا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جب بھی لکھنے لگتے ہیں ان کے قلم سے خُون ٹپکنے لگتا ہے ۔

اِس نازک موڑ پر، مَیں اپنے اہلِ وطن سے کہوں گا کہ ذرا تاریخ اسپین کے اوراق کی طرف تو دیکھئے ۔

وہ رو رہے ہیں ۔

محمد طفیل

جیل میں مسعود مفتی نے اپنا اسکیچ خود بنایا۔
اسکیچ پر دستخط، اُن کے جیل کے ساتھیوں کے ہیں۔ جو کہ جنگی قیدیوں کی صورت میں ڈھاکہ سے ہندوستان پہنچے تھے۔

یہ تصویر بریلی کے کیمپ نمبر ۲۹ کی ہے۔ جو رہائی سے ایک دن پہلے کھینچی گئی۔
اور پھر اسے بہ ہزار دقت یہاں تک لانے میں کامیابی ہوئی۔ تشبیہہ مسعود مفتی کی ہے۔

# صدیوں پار

مسعود مفتی

آنکھ ایک ہی ہوتی ہے، مگر کبھی مسکراہٹ سے دمک اٹھتی ہے اور کبھی کرب سے بجھ جاتی ہے...... دونوں کتنی متضاد کیفیتیں، مگر پھر بھی کتنی قریب کہ ایک ہی عضو کی گود میں ساتھ ساتھ پڑی رہتی ہیں۔

وہ شاعر نہیں تھا کہ اسے یہ خیال سوجھا تھا۔ بلکہ سیدھا سادا ایکسپورٹ امپورٹ کا تاجر تھا جس نے اپنی زندگی کے اتالیس سالوں میں اتنی دھوپ چھاؤں دیکھی تھی کہ اسے آنکھ کی دونوں کیفیتوں سے اکثر پالا پڑ چکا تھا۔ اس لئے جب اس نے ڈھاکہ میں اپنے دفتر کی کھڑکی میں سے ارد گرد نگاہ دوڑائی تو جناح ایونیو، سٹیڈیم اور بیت المکرم کا علاقہ دیکھ کر اسے پھر آنکھ والا خیال آ گیا۔ جو پہلے بھی کئی دفعہ اس کے ذہن میں کبھی کبھی سر اٹھاتا تھا...... نہ معلوم اس نے یہ خیال کہاں پڑھا تھا، مگر برسوں سے یہ دماغ میں کسی چمگادڑ کی طرح گھسا بیٹھا تھا۔ جو کبھی کبھی تاریکی میں نکل کر ایک دو بے چین سی اڑانیں لگاتا۔ اور پھر کسی کونے کھدرے میں چھپ جاتا...... اور وہ بعض اوقات سوچنے لگتا۔ کہ ایسی آنکھ کا بالآخر کیا بنتا ہے۔ جس میں کرب اور مسکراہٹ ہر وقت گتھم گتھا ہوتے رہتے ہوں۔

ابھی ابھی یہ سوچ اس طرح ابھری کہ وہ دفتر میں کام کرتے کرتے تھک گیا، تو کھڑکی میں سے منہ نکال کر تازہ ہوا سے سرور لینے لگا۔ اس کا دفتر جناح ایونیو کے کونے والی بلڈنگ میں اوپر والی منزل پر تھا۔ جس کی کھڑکی سے سٹیڈیم، پلٹن میدان اور بیت المکرم اس طرح ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔ جیسے سکھیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سکون جاتی ہیں۔...... جناح ایونیو پر کاروں، رکشاؤں اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم کسی برادری کی شادی کی طرح پُر رونق تھا اور سٹیڈیم کے گرد گھومنے والی گول مارکیٹ بھی جوبن پر تھی۔...... کسل مٹانے کو ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ دیکھا تو بیت المکرم کی شاندار مسجد اپنے عظیم الجثہ بھاری ڈیزائن میں پھیلتی اٹھتی نظر آئی ---- چند سو گز ہی تو دور تھی یہ مسجد جس کی عالی شان سیڑھیوں پر لوگ اتر چڑھ رہے تھے۔ اور فقیروں کے غول سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں بعض اوقات ان کی آواز بھی اس کے کان تک آ جاتی تھی۔ مسجد کے نیچے والی مارکیٹ جو کسی شرمیلی کے خیال کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی چلی گئی تھی۔ گاہکوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ بے فکرے نوجوان، نمکین رنگ کی دبلی عورتیں جو جلد کی مرطوب سی سیاہی کے باوجود گوری حسینوں سے زیادہ جاذب تھیں۔ چیزوں کی طلب میں ڈوبے ہوئے بچے اور برسات کی مکھیوں کی طرح چپکنے والے فقیر...... ایسا لگتا تھا کہ مسجد کے زیر سایہ زندگی نہایت امن اور چین سے رواں دواں ہے...... جیسے مسکراتی ہوئی آنکھ۔

انگڑائی میں ہی جمائی لیتے ہوئے اس نے سامنے منہ موڑا تو پلٹن میدان نظر پڑا۔ جس میں کسی جلسے کی تیاریاں تھیں۔ یہ

میدان بھی بالکل قریب تھا اور اسے جلسہ سننے کے لیے کبھی دفتر سے اٹھنا نہیں پڑا۔ بلکہ اندر ہی سے گردن لمبی کرکے سب کچھ دیکھ سن لیتا۔ . . . . . کاروباری لوگ اپنے وقت کا بڑا خیال رکھتے ہیں اس لیے وہ اکثر خوش ہوتا کہ بیت المکرم اور پلٹن میدان بالکل قریب قریب ہیں۔ جیسے ہی بیت المکرم میں جماعت کھڑی ہوتی۔ وہ لپا جھپ جا کر نماز پڑھتا۔ اور اسی طرح وقت ضائع کئے بغیر پلٹن میدان کا جلسہ سن لیتا۔ جگہیں قریب ہوں تو مزے رہتے ہیں۔ اسی قربت کی وجہ سے اسے آنکھ والا خیال آیا تھا۔ کیونکہ پلٹن میدان بالکل دوسری (کربے والی) کیفیت پیش کر رہا تھا جس سے وہ چند روز قبل دوچار ہوا تھا۔

وہ یوں ہوا کہ ایک دن جب بیت المکرم کے لاؤڈسپیکر پر عصر کی اذان گونج رہی تھی، تو پلٹن میدان کے جلسے سے "جے بنگلہ" کا نعرہ اس زور سے گونجا کہ اذان کی آواز اس میں ڈوب گئی . . . . . . لکھتے لکھتے اس کا ہاتھ جھٹکے سے رک گیا۔ . . . . اس نے چونک کر باہر جھانکا . . . گردن لمبی کرکے ادھر ادھر دیکھا . . . . بیت المکرم اور پلٹن میدان بالکل قریب قریب تھے۔ ایک میں اذان ہو رہی تھی اور دوسرے میں "جے بنگلہ" کے نعرے لگ رہے تھے . . . . . یہ کوئی اچنبھے والی بات نہ تھی۔ . . . . . نعرے لگتے ہی رہتے تھے۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ جلسہ گاہ میں موزن، وہ اس اور اس کے دونوں لڑکے بھی اتنے زور سے "جے بنگلہ" کا نعرہ لگا رہے تھے کہ اذان کی آواز دب رہی تھی تو اسے یوں لگا کہ سکھیوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھوٹ گئے ہیں۔ اور بیت المکرم اور پلٹن میدان ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں . . . . . . بہت دور . . . . . . . حالانکہ علاقہ ایک ہی تھا . . . . . . ایک ہی آنکھ کی طرح . . . . .

جب وہ دفتر میں واپس جا کر کرسی پر بیٹھا تو اس کے دماغ سے سب کام محو ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس گونجدار نعرے سے اس کے ذہن پر لپٹی ہوئی چوبیس سال کی گرد ایک دم جھٹک سے اڑ گئی اور بجلی کے کوندے کی طرح وہ منظر لپک سا گیا۔ جب کئی ہندوؤں نے ۱۹۴۷ء میں "جے ہند" کا نعرہ لگا کر ان پر حملہ کیا تھا . . . . . کرسی پر بیٹھا تو "جے ہند" کے نعرے کی بازگشت دفتر کے ہر گوشے سے نکل کر اس پر جھپٹی . . . . . آنکھوں کے سامنے خون رنگ ترمرے ناچنے لگے . . . . . سارے جسم میں کے پٹھوں میں پچکاریاں سی چل گئیں . . . . . . اور وہ سارے مناظر ابھر آئے جنہوں نے اسے راتوں کو جگایا تھا اور خوابوں میں ڈرایا تھا . . . . . . .

---

وہ ۱۹۴۷ء میں پندرہ برس کا لڑکا تھا۔ جو بہار کے چھوٹے سے قصبے میں اپنے والدین اور خاندان سمیت رہ رہا تھا . . . . . آٹھ دس مکانوں کی کٹڑی تھی جس میں چچا ماموں قسم کے سبھی لوگ سمائے ہوئے تھے۔ مل ملا کر پینتیس [۳۵] کے قریب نفوس تھے پرانی اینٹیں، پرانے درخت اور پرانی گلیاں بتاتی تھیں کہ یہ کنبے برسوں سے یہیں ہیں۔ بڑے دادا اپنے بچپن کے قصے سناتے ہوئے اس بانسوں کے جھنڈ کا ذکر کیا کرتے جس کے اندر جا کر بچے اب بھی کھیلتے تھے۔ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ سامنے والا تالاب کب بنا اور اس کی بجائے ایک تالاب فلاں جگہ ہوتا تھا۔ جہاں آج کل چھوٹی بٹیا کا گھر بنا ہے . . . . کیلوں کے درختوں نے کون کون سی جگہ بدلی ہے۔ اور موجودہ درختوں میں سے کون کون سا ان کی بھی ہوش سے پہلے کا ہے . . . . . . وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ پہلے اس ساری گلی کے مکانات مسلمانوں کی ملکیت تھے۔ مگر کس طرح لالہ گردھاری لال اور اس کے بھائیوں نے آہستہ آہستہ سب خرید لئے۔ پھر انہوں نے اصول بنا لیا کہ جب بھی کوئی مکان خالی ہوتا تو مسلمان کرایہ دار کبھی نہ بساتے۔ ہوتے ہوتے یہ حال ہو گیا کہ ان کے

کنبے کے علاوہ وہ ساری گلی ہندوؤں سے آباد ہوگئی - جو ان کے مکانات خریدنے کے بھی کافی مشتاق تھے مگر انہوں نے ایک نہ مانی -

جب بستی کے ہمسائے آتے تو وہ بھی پرانے وقتوں کا ذکر اس طرح کرتے جس سے اندازہ ہوتا کہ اس بستی کے بسنے والے جنم جنم کے ساتھی ہیں اور نیلی یکساں فضا میں اڑنے والے مکھی کے غول کی طرح اکٹھے ہی دکھ سکھ سہتے ہیں - ان کے گھر آنے والوں میں بابو پرشوتم داس بھی تھے اور تایا رمنال بھی تھے اور مہاجن بجیا ناتھ بھی تھے - جو اسے کھانے کی چیزیں بھی دیتے تھے اور ان کی شادی غمی میں بھی شریک ہوتے تھے -

مگر پھر ایک دم جیسے بھونچال آ گیا . . . . . ۱۹۴۷ء میں سب رشتے اتھل پتھل ہو گئے . . . ان لوگوں نے یا تو آنا جانا ہی چھوڑ دیا - اور اگر آتے بھی تو دبی دبی گھٹی گھٹی باتیں کرتے - نہ گرمجوشی نہ اپنائیت . . . . . پھر جب ایک شام "جے ہند" کے نعرے لگاتا ہوا ایک گروہ ان کی کٹڑی پر حملہ آور ہوا تو اس گروہ میں اسے تایا رمنال اور بابو پرشوتم داس بھی نظر آئے - مگر آج ان کے چہروں پر غیض و غضب تھا - ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی - ان کی آستینیں خون آلود تھیں اور ہاتھوں میں رام داؤ، بلم اور بندوقیں تھیں -

اور پھر بابو پرشوتم داس نے بڑے دادا کو اسی چبوترے پر دو ٹکڑے کر دیا جہاں ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا - اس سے آگے کی تفصیلات اسے یاد نہیں کیونکہ سارا ہجوم کٹڑی کے اندر "جے ہند" کے نعرے لگاتا گھس گیا تھا اور چیخ و پکار میں اسے کہیں خون نظر آیا - کہیں چھوٹی بہن کی لال چوڑیوں والی بانہہ ہوا میں اڑتی نظر آئی اور کہیں باپ کا سر فٹ بال کی طرح لڑھکتا نظر آیا -

اتنا البتہ یاد تھا کہ جس مدن کے ساتھ وہ خود فٹ بال کھیلا کرتا تھا - اس نے رام داؤ سے اس پر حملہ کیا - اور جب وہ کشتی لڑ رہے تھے تو پیچھے سے کسی زوردار ضرب سے اس کا سر تیورا گیا -

اسے ہوش آیا تو رات پڑ چکی تھی - ہلکی پھیکی چاندنی میں اسے کٹڑی کے بعض حصے ملبے کا ڈھیر نظر آئے - جہاں اب آگ کا زور ختم ہو گیا تھا اور چھوٹی موٹی چیزیں سلگ رہی تھیں - اسی راکھ میں دو ادھ سڑی لاشیں بھی نظر آئیں - جس جگہ وہ پڑا تھا - اس کی پشت پر کسی حصے میں آگ ابھی روشن تھی - اسی کی روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان ادھ جلی لاشوں کو پہنچاننے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ پتہ نہ چلا . . . . . . اتنے میں کسی کے سسکنے کی آواز آئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا . . . . . .

اتنے برس گزر جانے کے باوجود وہ اس نظارے کو نہیں بھولا جو اس نے اٹھ کر دیکھا . . . . . . شعلوں کی ہلکی روشنی، جس میں بعض ساتھ اور بھی بھیانک ہو گئے تھے - دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹی ہوئیں، سامان بے ترتیبی سے ادھر ادھر روندا ہوا - لاشیں دائیں بائیں بکھری ہوئیں - کوئی جسم دالان میں چت پڑا ہوا . . . . . کوئی گچھا مچھا ہو کر نالی کے اوپر گرا ہوا . . . . . کوئی لاش دہلیز کے آر پار گری ہوئی . . . . . کوئی کھڑکی میں سے آدھی لٹکی ہوئی . . . . . ایک جگہ گرد اور خون میں لتھڑا ہوا سر لڑھک کر ایک برتن میں اٹکا ہوا . . . . . ایک سڈول سا بازو . . . . . جوتے سمیت ایک پنڈلی . . . .

وہ ادھر ادھر گھومنے لگا -

یہ امی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے نے ماتھے پر ہاتھ لگایا تو سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اور ادھر کھلی آنکھیں آسمان کو تکنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چنگھاڑ کر رو دے۔ مگر نہ معلوم اس کے آنسو کہاں چلے گئے تھے۔ اور گلے میں خشک گولے پھنس رہے تھے۔

یہ دادا بھائی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بے بی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ماموں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ نیم پاگل ہو کر کبھی لاشوں کو دیکھتا کبھی آسمان کو کبھی دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ لیتا۔ مگر "ہر ہر مہادیو" کے نعرے اس کے دل و دماغ میں گونجنے لگتے اور وہ چاروں طرف وحشت ناک چہروں کے ہیولے دیکھ کر گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔

اتنے میں اس کا بڑا بھائی نمودار ہوا۔ جو حملے کے وقت کہیں چھپ گیا تھا اور اب پھر آ گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے لگ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

ذرا سنبھلے تو دونوں نے مل کر سارا جائزہ لیا۔ بعض عزیز بے ہوش تھے۔ مرے نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ کو خود ہوش آ گیا اور بعض کو پانی وغیرہ پلا کر ہوش دلایا۔

آدھی رات ہوئی تو دس آدمیوں کا قافلہ پاکستان کی طرف چل دیا۔

گم سم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خاموش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جسم بریدہ اور ذہن دریدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سسکتے ہوئے، سہمے ہوئے، ہوا اور پتوں کی سرسراہٹ سے بھی بدکتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تھوڑی امید اور زیادہ مایوسی کے درمیان لٹکتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔

مشرقی پاکستان کی سرحد یہاں سے دس میل دور تھی۔ سرحدی گاؤں کا بھی انھیں پتہ تھا۔ جہاں وہ اکثر جایا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان بنے چند روز ہوتے تھے۔ مگر وہ پھر بھی ان کے لیے دارالامان تھا۔ کلمہ طیبہ پڑھنے والوں کی پناہ گاہ تھا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری امید ہے۔

چلتے چلتے سب نے حساب لگا لیا تھا کہ خاندان کے چھبیس (۲۶) افراد مارے گئے تھے۔ مگر کسی میں باآواز بلند دوسروں کو بتانے کا حوصلہ نہ تھا۔

کوئی تیز تھے کوئی سست۔
کہیں گرے..... اٹھے.... پھر گرے..... پھر اٹھے۔
رک گئے۔
چل پڑے.....
پھر رک گئے.......
قدم بہ قدم.....آہستہ آہستہ.....چیونٹی کی چال.... وہ بڑھتے گئے.....اور کسی جگہ اس کے کانوں میں جے ہند کے نعروں کی بازگشت آتی رہی۔
اتنے میں دور.... بہت دور..... ہلکی ہلکی آواز ابھری۔
"اللہ اکبر..... اللہ اکبر"
وہ خوشی سے اچھل پڑا۔
"بھیا۔ ہم پہنچنے والے ہیں.... سرحدی گاؤں کی مسجد میں صبح کی اذان ہو رہی ہے۔"
اور سب کے چہرے اندھیرے میں بھی دمکنے لگے۔

پھر قرب و جوار اندھیرے کے غلاف سے دھیرے دھیرے نکلنے لگے...... پہلے انہوں نے ایک دوسرے کے سوگوار چہروں کو دیکھا.... پھر اردگرد کے شبنم آلود پتوں کی اداس خاموشی کو..... اجنبی فضا کو سونگھا جو رات ہی رات میں بادِ سموم سے بھر گئی تھی..... اور تھوڑی دیر بعد جب افق کا دھندلکا چھٹا۔ تو دور مسجد کا مینار آسمان کی سرخی کے بیچوں بیچ کھڑا ان کو روشنی کے مینار کی طرح راہ دکھا رہا تھا۔ وہ ان کی منزل تھی اور انھیں بہرحال وہاں پہنچنا تھا۔

پھوپھی ذرا ادھیڑ عمر کی تھی۔ اس کا بازو بھی زخمی تھا۔ اور اپنے دو لڑکے بھی اپنے سامنے کٹوا کر آئی تھی۔ جسمانی طور پر نزار اور ذہنی طور پر مغلوج۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دل چھوڑ دیتی۔ زمین پر گر کر بچوں کے نام پکارنے لگتی۔ اور باقی لوگوں سے کہتی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں۔

یہ اسے تسلی دیتا۔ "بس پھوپو۔ وہ سامنے مسجد کا مینار نظر آ رہا ہے۔ اب تو بہت قریب ہے...... وہ دیکھو اب تو اس کے جھروکے اور نقش بھی نظر آنے لگے ہیں...... بس ذرا ہمت کر لو.... تھوڑی سی ہمت۔"
اور وہ پھر گرتی پڑتی چلنے لگتی۔

تھوڑی دیر بعد کوئی دوسرا ہمت ہار جاتا۔ تو یہ پھر مسجد کے مینار کی طرف توجہ دلاتا اور قافلہ لنگڑاتا ہوا روانہ ہو جاتا۔
ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پہ بسنے والے گاؤں کی مسجد کا یہ مینار ان کے لیے مقناطیس کا کام کر رہا تھا۔ اس میں امن اور آشتی کی گارنٹی تھی...... اس کی نوک خدائی رحمت کی چوب تھی...... اس کے سائے میں ایمان تھا، زندگی تھی، بقا تھی..... وہ سب کچھ تھا جس کی ان کو تمنا تھی۔

اور جب وہ سب گرتے پڑتے اس مینار کے پاس پہنچے تو اس نے جھک کر پاکستان کی زمین کو چوما۔ اور سب لوگ تھکاوٹ سے چور ہو کر مسجد کی دیواروں سے لگ کر ایسے ڈھیر ہوئے جیسے بیمار بچہ ماں کی گود میں دبک جاتا ہے۔ ..... مسجد کو دیکھ کر اسے گھری اور بھرپور اپنایت کا احساس ہوا۔

تیئیس برس پر لگا کر اڑ گئے۔

یہ لوگ یہیں شہر میں آباد ہوئے۔ آہستہ آہستہ ان کے باقی عزیز بھی ہندوستان کے مختلف حصوں سے آ گئے۔ نئی جگہ اصل وطن بن گئی۔ ..... اس کی مٹی انھیں کھینچنے لگی..... اس کی گلیاں ان کے اعصاب پر چھا گئیں۔ اس کے پنچھی پکھیرو ان کے گھروں کی منڈیروں پر بیٹھ کر ان کے احساسات سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے درختوں تلے کھیل کھیل کر ان کے بچے جوان ہوئے۔ اس کی برساتوں میں ان کے من کے بھرو کوں میں رنگ برنگی آنچل لہرائے۔ پھر اس کی گلیوں میں سہروں والے گھبرو جیالے ڈولیاں لائے۔ کنبے بنے۔ بن کر بچھڑے اور ایک دفعہ پھر چالیس پچاس رشتے دار ایک دوسرے کے قریب قریب شانتی پاڑا میں آباد ہو گئے جو میمن سنگھ کی نئی بستی تھی۔

اس کا اپنا کاروبار شروع میں ڈھاکہ میں چل گیا تھا۔ پہلے دکان تھی۔ بعد میں کاروبار پھیلنے لگا تو اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم بنالی جس کا دفتر جناح ایونیو میں تھا۔ مگر بیوی بچے اور باقی عزیز شانتی پاڑا میں ہی تھے۔ چھٹی کے پاس۔ یہ خود بھی اکثر جایا کرتا تھا۔

مگر ان تئیس برسوں میں اور بھی بہت کچھ ہوا..... گرتے پڑتے خانماں برباد زخمی قافلے نے جو مینار اداس جھٹ پٹے میں اپنی آنسو بھری آنکھوں سے امید امن اور آشتی کا مظہر بنے دیکھا تھا وہ اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ اسے مسجد کے مینار سے ایک نفسیاتی سا لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ کسی بھی سفر پر جاتا۔ گاڑی یا موٹر میں جاتے ہوئے اگر اسے افق میں کوئی مینار جھانکتا نظر آ جاتا۔ تو وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا۔ اور اسے اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش کے متعلق اطمینان سا ہونے لگتا۔ .....
..... مینار جو پہلے اس کی من کی روشنی تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے ذہن کی کمزوری بنتا گیا۔ ..... ۱۹۴۷ء کے حادثے کے بعد وہ مذہبی تو ویسے ہی بہت بن گیا تھا۔ مگر ہر مشہور مسجد کی زیارت کرنے کا تو اسے جنون سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب کاروبار کے سلسلہ میں اسے باہر کے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوتا تو اپنے سب پروگرام چھوڑ کر بھی وہ وہاں کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتا۔ اور وہاں نماز سے زیادہ تسکین اسے نیلے آسمان میں کھبے ہوئے بلند و بالا مینار کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ کئی سفر تو اس نے محض اس وجہ سے لمبے کر دیئے تھے کہ تھوڑا چکر لگانے سے وہ دو ایک نئی مسجدیں..... اور ان کے مینار..... دیکھ سکتا تھا۔ اسی شوق میں اس نے ایسی ایسی جگہ دیکھ لی تھی۔ جہاں عام زائرین نہیں جایا کرتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں بیت اللہ سے متصل حضرت ارقم کا مکان گو مسجد نہ تھا۔ مگر چونکہ شروع شروع میں حلقہ بگوش اسلام صحابہ کرام یہیں چھپ کر نماز ادا کیا کرتے تھے اس لئے وہ اسے مسجد ہی کہتا تھا۔ اور چونکہ حضرت عمر نے اس مختصر سے گھر میں اسلام قبول کیا اور پھر اعلانیہ تبلیغ پر اتر آئے۔ اس لئے وہ اسے اسلام کی اذان کہتا تھا۔ وہ دو تین دفعہ یہ گھر دیکھنے گیا۔

پھر وہ مدینہ منورہ سے چار میل دور مسجد قبا بھی دیکھنے گیا۔ جو اسلام کی اوّلین مسجد ہے۔ اس کے ساتھی نے بتایا کہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد رسول اکرم اور ان کے ساتھی مدینہ کی طرف آ رہے تھے۔ تو ایک منزل پہلے قبا کی بستی میں مہمان ٹھہرے۔ اور اس چند روزہ کے قیام میں انہوں نے یہ مسجد بنا ڈالی۔ یہ سن کر وہ کئی گھنٹے کھڑا ہو کر اس کے مینار کو دیکھتا رہا جہاں سے پہلے پہل اذان بلند ہوتی ہوگی اور چہار طرف پھیلی ہوگی۔ اس کے کان میں وہ اذان گونجنے لگی۔ جو ۲۷ء ۱۹۴۷ء کی تاریک رات میں ان کے خاندان پر بادِ فلسطینی نے سنی تھی۔

مدینہ منورہ میں اس نے مسجد قبلتین دیکھی جس میں دوسری صدی ہجری میں عین نماز میں حکم ہوا تھا کہ آئندہ سے قبلہ اوّل مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کی بجائے خانہ کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز ادا کریں۔ اس مسجد کے مینار کا نچلا دھڑ چوکور تھا۔ اوپر گنبد لمبوترا اور بیضوی تھا۔ اور اس پر پتلی نوک آسمان کے سینے میں کھبتی جاتی تھی۔ . . . . . اس مینار کی پرشکوہ بلندی کو وہ نہ صرف قریب سے دیکھتا رہا۔ بلکہ واپس جاتے ہوئے رُک رُک کر پلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا ـــ

اسی طرح وہ مسجد اقصیٰ کے میناروں پر فریفتہ ہوتا رہا۔ مکہ معظمہ کے میناروں پر سر دھنتا رہا۔ وادی منا میں مسجد حنیف کے میناروں میں کھویا رہا۔ غرض اسے جہاں مینار نظر آیا وہ اسے اسلام کی پختگی کا مظہر سمجھ کر اس کے نظارے میں جذب ہو جاتا اور اس کے دل میں عجیب سے دلولے اٹھنے لگتے۔

مثلاً ایک مینار ایسا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ بجھ گیا تھا۔ اور اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ . . . . . وہ بھی مسجد کا ہی مینار تھا۔ وہ بھی فضا میں ابھر کر آسمان کو چھوتا تھا۔ اس نے بھی اسلام کی عظمت کو سربلند ہو کر دیکھا تھا مگر یہ مینار اس کے اندرونی غرور کو لوریاں نہ دے سکا۔ اسے ولولہ نہ دے سکا۔ اس کے اندر سرور کی لہریں نہ دوڑا سکا۔ . . . . . بلکہ اس مینار نے اس پر لرزہ طاری کر دیا. . . . . دکھ دیا. . . . . ہیبت اور خوف سے لاد دیا. . . . . . جسم میں رعشہ برپا کر دیا. . . . . . اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری کر دیا۔

یہ مینار قرطبہ کی مسجد کا مینار تھا۔ جو سپین کی اجنبی وادی میں اسلام کی قبر پر کتبہ بن کر کھڑا تھا۔

یہ مینار دیکھتے ہوئے وہ یہ معمہ نہ حل کر سکا کہ سات سو سال تک سپین پر مسلمانوں کی حکومت کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہاں سے مسلمانوں کا نام و نشان بھی مٹ جائے۔ . . . . . اور پھر خیالات کا دھارا اس کے ذہن میں بہنے لگا. . . . . غیر مربوط اور بے جوڑ خیالات. . .

اسی مسجد میں کھڑے ہو کر علامہ اقبال کے جنون نے خدا کی خدائی سے گلہ کیا تھا۔ اور ماضی کی خاموش اذانوں کی سرسراہٹ سنی تھی۔ اور دعا مانگی تھی. . . . . . پھر نسیم حجازی کے تواریخی ناول "شاہین" کے صفحات کے صفحات اس کے دماغ میں پھڑپھڑانے لگے. . . . کس طرح ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت میں چند غدار مسلمانوں نے غیروں سے مل کر سازشیں کیں۔ بھائی نے بھائی کو مارا۔ ملک کو کھوکھلا کیا اور بالآخر مسلمانوں کو تاریخ عالم کے سب سے بڑے قتلِ عام کا شکار ہونا پڑا. . . . . .

. . . . . . قتلِ عام سے اس کے ذہن میں وہ سارے قصے ابھرنے لگے۔ جو سکول کے زمانے میں اس نے سنے تھے۔ معلوم نہیں درست تھے یا نہیں مگر ان کا ماسٹر تو بڑے یقین سے بتایا کرتا تھا۔ کہ فرسٹ اپریل فول سپین میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی یاد کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب غیر مسلم سپین میں مسلمان بچوں اور عورتوں کو چکمے دے کر قتل کرتے تھے اور پھر ان کے معصوم خون پر سب

مل کر مجھے ملا یا کرتے تھے .......

...... یہ خیال آتے ہی اس کا ذہن ۱۹۴۷ء میں جا اٹکا ۔ اور وہ رات بھٹک کر آگے آ گئی ۔ جو اسے اکثر تڑپاتی رہی تھی ۔ اسے یوں لگا جیسے مسجد قرطبہ کی مسجد کا صحن اس پرانے گھر کا صحن ہے ۔ جہاں ادھ موئی آگ اور پھیکی چاندنی میں وہ اپنے گھر والوں کی لاشیں دیکھ رہا ہے ۔

یہ امی ہے ...... اس نے ماتھے پہ ہاتھ رکھا ، تو سر ایک طرف لڑھک گیا ۔

یہ دادا بھائی ہیں .....

ابا ......

بے بی ......

تایا ......

ماموں ......

چھبیس لاشیں ...... چھبیس اپنوں کی لاشیں ......

ایسے ہی خیالات کا تانا بانا اس کے ذہن میں بنتا رہا ...... آنسو اس کالوں پہ بہتے رہے ...... اور ان آنسوؤں کی مہروں میں مسجد قرطبہ کا مینار لہراتا رہا ...... وہ مینار جس پر سے اب اذان دینا حکومت نے جرم قرار دیا ہوا تھا ۔

اس کے تصور میں ظہر کی اذان ابھری ...... مسجد قرطبہ کے موذن کی آواز ...... اس کی آنکھیں غیر ارادی طور پر باہر آبادی کی طرف اٹھیں ...... اور اس کا دل بیٹھنے لگا ...... کیونکہ باہر کی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا ...... :

کوئی جوتا گھسیٹتا ہوا مسجد کی طرف لپکا تھا ...... نہ کسی نے دکان کے تھڑے سے پوچھا دریچھا کہ نماز شروع کی تھی ...... نہ کسی راہگیر کے ہونٹ ہلے یا ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ...... وہاں اذان تو تھی ۔ مگر وہ ذہن کے اندر رہی تھی ۔ باہر ان اثرات میں سے کوئی بھی نہ تھا جو پاکستان میں نظر آتے ہیں ...... اور اس کا دل بجھ کر رہ گیا ۔

اس رات وہ سونے سے پہلے کتنی ہی دیر تک روتا رہا تھا ۔ اور ہسپانیہ کی سرزمین پر خالص پاکستانی خلوص کے آنسو گراتا رہا تھا ۔

دن گزرتے گئے ...... وہ دنیا گھومتا رہا ...... مسجدیں دیکھتا رہا ...... ان کے مینار دیکھتا رہا جو اس کے لئے نفسیاتی اثر رکھتے تھے ...... اس کے لئے جذباتی آسودگی مہیا کرتے تھے ...... مینار ، جو ایک تواریخی کنجی کی طرح ماضی کے تالے کھول کر صدیوں پار کے مناظر کھول دیتے تھے ۔۔۔ انہی میناروں سے اس نے تیرہ صدیوں پہلے کے مہاجروں کے دل میں ایمان اور امید کی جھلک دیکھی تھی ...... انہی میناروں کے کنگوروں سے ٹک ٹک کر اس نے صدیوں پہلے مسلمانوں کی عظمت کا تماشہ کیا ۔ یہی مینار اسے صدیوں پہلے کی ہوئی روحانی برادری کا فرد ثابت کرتے تھے اور وقت کے چوڑے چکلے سمندر پر صدیوں کی تند و تیز لہروں میں سے اپنی بقا کا تسلسل نظر آتا تھا ۔

اس لئے جب اسے پتہ چلا کہ اس کے دفتر کے سامنے بیت المکرم کی تعمیر شروع ہو گئی ہے تو وہ ان دنوں بہت مطمئن

تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت ہی مطمئن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے بچے کے لیے اس کا پنگوڑا بن رہا ہو۔ یا ماتا کی آغوش وا ہو رہی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے بڑھ چڑھ کر چندہ دیا۔ اور گھنٹوں دفتر کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر اس کی عالی شان عمارت کو وجود میں آتے دیکھتا رہتا۔

بیت المکرم کا منصوبہ بڑا وسیع تھا۔ پہلے نیچے مارکیٹ بنی پھر اوپر اور ساتھ مسجد والا حصہ بننے لگا۔ کام مکمل ہو گیا۔ تو نماز کے لیے انتظام کر دیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب وہ پہلی دفعہ نماز پڑھنے وہاں گیا۔ تو ہر چیز دیکھ کر اس کا دل اچھلنے لگا تھا۔ وسیع و عریض سیڑھیاں چڑھ کر جب اوپر جانے لگا۔ تو یوں لگا۔ جیسے کسی عزیز کے محل میں داخل ہو رہا ہو کہ مرعوب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنائیت اور فخر بھی رگ و پے میں موجزن ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وضو کرنے والی جگہ اتنی کشادہ، ماڈرن اور صاف ستھری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جوتے رکھنے کا اتنا اچھا انتظام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسجد کا صحن اتنا کشادہ اور وسیع کہ خدا کی بڑائی دل میں بیٹھنے لگے۔ پھر ایک ہی امام کے پیچھے تین منزلوں میں نمازی بغیر کسی مکبر کے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتنی وسعت اور کشادگی ۔ ۔ ۔ ۔ درمیان میں کھڑے ہو کر اس نے نگاہ اٹھائی تو تین منزل اوپر گول دیوار پر کلمہ لکھا ہوا نظر آیا۔ اور پوری بلڈنگ کی کشادگی۔ وسعت اور خوبصورتی اس کے دل دماغ پر عظمت کا بھید بن کر چھا گئی۔ اور اس کی آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر جب تیسری منزل میں سے اس نے باہر جھانکا تو ڈھاکہ کے مکان ایسے ڈبوں کی مانند لگے جنہیں سادگی اور خلوص میں رنگے ہوئے بچوں نے کھیل کھیل میں سجا کے رکھ دیا ہے۔ اور اب بیت المکرم میں چھپ گئے ہیں۔ جو اس سادگی اور خلوص کا مظہر بن گیا تھا۔

اس کے بعد وہ ہمیشہ بیت المکرم میں نماز پڑھنے لگا۔ اور وہاں کی پرسکون فضا اس کی شخصیت کا حصہ سی بن گئی۔ باوجود اس کے کہ بیت المکرم سے باہر زمانہ قیامت کی چال چلنے لگا تھا۔ اور مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات سمندر کی مہیب لہروں کی طرح پیچ و تاب کھانے لگے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب اس کی سوچیں گہری ہونے لگی تھیں۔ بیت المکرم سے نکل کر جب وہ اپنے دفتر میں بیٹھتا تو سوچ میں ڈوب جاتا کیونکہ پلٹن میدان گو بیت المکرم کے بہت قریب تھا مگر اسے وہاں دوسرا رنگ نظر آنے لگا تھا۔ بیت المکرم میں وہ جس کے ساتھ چاہتا کھڑا ہو کر نماز پڑھ سکتا تھا۔ کبھی ایک تسبیح کے دانے لگتے تھے۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ اسے پلٹن میدان کے جلسوں میں نوکیلی اور کٹیلی نظروں سے واسطہ پڑنے لگا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ عرصہ بعد وہ پلٹن میدان میں ایک نئی تعمیر دیکھنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ نفرت کے میناروں کی ۔ ۔ ۔ ۔ اینٹ گارے کے نہیں بلکہ جذبات اور جوش کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ان کی تعمیر اتنی تیز ہو گئی کہ ان کی اونچائی بیت المکرم کی چھت سے بھی اوپر نکل گئی۔

پھر ۱۹۷۱ء آ گیا۔ ۔ ۔ ۔ بجلیاں برساتا اور چنگھاڑتا ہوا۔

پلٹن میدان میں دن رات جلسے ہونے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نعروں کا شور ۔ ۔ ۔ ۔ گالیوں کی گھن گرج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غنڈوں کے ہنگامے ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب الیکشن کے بعد شیخ مجیب الرحمان نے پلٹن میدان میں تقریریں شروع کیں تو وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے تقریر سنتا رہتا اور کانپتا رہتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "جے بنگلہ" کا نعرہ اتنے زور سے لگتا کہ اس کے ذہن سے تیئس ۲۳ برس کی دھول جھکڑ بن کر اڑ جاتی۔ اور وہ "جے ہند" کی بازگشت میں گم ہو جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر آدھی رات جھانکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چاند اور شعلوں کی پھیکی روشنی سوگوار انداز میں آنکھ کھولتی۔ ۔ ۔

وہ گھروالوں کی لاشیں پہچانتا......اور اس کے منہ سے نکل جاتا "چھبیس[۲۶]......چھبیس[۲۶]"۔

پھر مارچ ۱۹۷۱ء کا مہینہ آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح گزر گیا......اور اس جھکڑ میں وہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا جس کی تمنا لے کر وہ اپنے دس عزیزوں کے ہمراہ ۱۹۴۷ء میں گرتا پڑتا یہاں پہنچا تھا۔ اور بعد میں جو کچھ اس امید پر بنایا گیا تھا......ڈھاکہ میں دکانیں بند تھیں اور نفرت کا بازار گرم تھا......وہ اپنے گھر میں گھسا رہتا اور اپنے عزیز و اقارب کی خیریت کے لئے دعائیں مانگا کرتا...... ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ اس نے ایک لڑکے کی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر اب ۱۹۷۱ء میں وہ لڑکوں اور لڑکیوں کا باپ بن کر دعائیں مانگتا تھا۔

پچیس (۲۵) مارچ کو پاک فوج نے پہلے تو ڈھاکہ میں بغاوت کو دبایا اور پھر دارالخلافے سے چاروں طرف پھیل کر باغیوں کا صفایا کرنا شروع کیا۔ اس افراتفری میں اس کے لئے میمن سنگھ جانا ممکن نہ تھا۔ تاوقتیکہ فوج وہاں پہنچ جاتی اور بیچ کے سارے راستے صاف ہو جاتے۔ مگر چونکہ میمن سنگھ کا علاقہ شمالی سرحد کے قریب تھا۔ اس لئے وہاں پہنچنے میں کئی دن لگے۔

اکیس (۲۱) اپریل کو جب فوج[۱] وہاں پہنچی تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اور شانکی پاڑا، ریوسے کالونی اور بہاری کالونی میں چار دن پہلے قتلِ عام ہو چکا تھا...... مگر وہ ڈھاکہ میں دکان کی حفاظت کرتا رہا۔ اور اسے کچھ علم نہ تھا۔

دو ہفتے بعد وہ جمعہ پڑھنے کے لئے بیت المکرم کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اسے میمن سنگھ کا ایک آدمی مل گیا جو اسے تلاش کر رہا تھا...... اس نے اسے سیڑھیوں پر ہی روک لیا۔

پھر اس نے رک رک کر...... ضبط کر کے...... آنکھیں نیچی کر کے سارا قصہ سنایا۔

اس کے خاندان کے سارے افراد مارے گئے تھے......

اس کے ذہن میں کوندا لپکا...... چالیس[۴۰] لوگ...... وہ ان دنوں ہر وقت سب کا شمار کرتا رہتا تھا۔

اور پھر دوسرا شرارہ لپکا...... پہلے سے کئی گنا شدید...... ۱۹۴۷ء میں چھبیس[۲۶]، اور اب چالیس[۴۰]؟؟؟

پھر وہ بالکل شل ہو گیا...... ایک آنسو بھی نہ ابھرا۔

اس کا ساتھی باتیں بتاتا رہا کہ کس طرح ستائیس (۲۷) مارچ سے لے کر اکیس[۲۱] اپریل تک میمن سنگھ کا علاقہ مکمل طور پر باغیوں کے ہاتھ میں رہا جس میں ہندوستانی فوج اور شہری کھلم کھلا آتے جاتے تھے۔ کئی لوگ ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے انتظار میں گھاٹ تک کئی چکر لگاتے تھے — پھولوں کے ہار لے کر جب انھیں سترہ[۱۷] اپریل کو پتہ چلا کہ پاک فوج قریب آ گئی ہے تو بھاگنے سے پہلے انہوں نے قتلِ عام کیا......

اس نے بتایا کہ سترہ اپریل کو سہ پہر کے وقت موسلا دھار بارش میں انھوں نے شانکی پاڑا کا محاصرہ کر لیا۔ اور چھ گھنٹے تک لوگوں

---

[۱] ملاحظہ ہو وہائٹ پیپر صفحہ ۶۹

گردوں کو اطمینان سے قتل کرتے رہے .....

وہ بظاہر کچھ بھی نہ سن رہا تھا۔ مگر ایک دم پوچھ بیٹھا۔

"مارنے والے ہندو تھے کیا؟" کیونکہ شہر میمن سنگھ کی آبادی کا چوتھائی حصہ ہندوؤں کا تھا.... کوئی بیس ہزار کے لگ بھگ۔

"ہندو بہت کم تھے ...... زیادہ تر تو مسلمان تھے"

"مسلمان !!" وہ کانپ کر بڑبڑایا...... اور پھر اس نے بڑے ہی دھیمے اور سہمے ہوئے انداز میں پوچھا "عورتوں کو تو کچھ نہیں..... کہا؟"

اس کا ساتھی کافی دیر گم سم رہا...... یہ اندر ہی اندر دھواں دھار رہا... پھر اس کے ساتھی کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں میں سے ابھری۔

"پہلے مردوں اور بچوں کو مارا.... پھر عورتوں سے کہا کہ..... ان کی قبریں کھودو.... وہ کھود چکیں تو.... تو.... میمن سنگھ جیل کے دروازے کھول کر جنس کے بھوکے قیدیوں کو ان پر چھوڑ دیا گیا.... شکاری کتوں کی طرح..... اور پھر بعد میں ان عورتوں کو.... بھی..... قتل..... اور اس کی آواز بھرا گئی.......

وہ بالکل شل تھا..... مگر پھر اس کے ہونٹوں سے موہوم سی آواز نکلی "مسلمان تھے.... مسلمان تھے!"

پھر بڑی بے بسی سے سر اٹھا کر اس نے بیت المکرم کی عمارت کو دیکھا....... ۱۹۴۷ء میں جب اس نے ایک مسجد کے مینار کو دیکھا تھا۔ تو وہ ہر لحظہ قریب ہو رہا تھا۔ مگر آج اسے یوں لگا۔ جیسے بیت المکرم کی عمارت دور ہی دور ہوتی جا رہی ہے اور اس کا فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے...... بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

پھر وہ تھوڑی دیر سر نہوڑائے کھڑا رہا۔

اس کے چاروں طرف لوگ سیڑھیاں چڑھ کر جمعہ پڑھنے جا رہے تھے۔

وہ اچانک مڑا۔

"کہاں جاؤ گے"۔ اس کے ساتھی نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے خالی خولی نظروں سے بیت المکرم کی عمارت کو دیکھا اور مایوسی سے دونوں خالی ہاتھ ہوا میں ہلا کر بولا۔

"خدا معلوم"

اور پھر اسی دم اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا ........ آج اس نے پہلی دفعہ نوٹ کیا کہ بیت المکرم کی عظیم الشان بلڈنگ کے ڈیزائن میں مینار کوئی نہ تھا............. مینار نہ ہونے سے اس کا دل بیٹھنے لگا..... اس لمحے اسے مینار کے سائے کی جتنی ضرورت تھی۔ اتنی کبھی نہ تھی...... مینار نہ ہونے سے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسکنے لگی.....

اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بیت المکرم کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ جو اسے ایک دم سے اجنبی لگنے لگ گئی تھیں...... اس کی آنکھیں

کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔

اتنے میں بیت المکرم کے اندر سے اذان کی آواز گونجی . . . . . اذان کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں مینار کا تصور ابھرا۔ کیونکہ اس نے دنیا بھر میں گھومتے ہوئے میناروں سے اذانیں سنی تھیں . . . . . تب غیر ارادی طور پر اس نے ٹھٹک کر واپس نگاہ دوڑائی . . . .

مینار اب بھی کوئی نہ تھا . . . . . مگر اسے یوں لگا جیسے بیت المکرم کی چھت پر مینار کی جگہ مومن داس کھڑا ہے . . . . . . . وہی مومن داس جو پلٹن میدان میں کھڑا ہو کر اتنے زور سے "جے بنگلہ" کے نعرے لگا رہا تھا کہ عصر کی اذان کی آواز ڈوب گئی تھی . . . . . اور پھر یہ مومن داس بڑھتا گیا . . . . بڑھتا گیا . . . . . حتیٰ کہ اس کا چیختا چنگھاڑتا نعرے لگاتا چہرہ آسمان کی بلندی میں کھبنے لگا۔

اس نے گھبرا کر منہ موڑا۔ مگر پیچھے سے ساتھی نے آواز دی۔

"جمعہ نہیں پڑھو گے؟"

وہ ٹھٹکا . . . . رکا . . . . . مڑا . . . . . . مگر معاً اسے یوں لگا کہ یہ بیت المکرم کے موذن کی آواز نہیں بلکہ قرطبہ کے موذن کی آواز ہے . . . . . . اور یہ آج نہیں، بلکہ صدیوں بعد کا کل ہے۔

ساتھی کو جواب دیے بغیر وہ پلٹن میدان سے پہلو بچاتا تیزی سے اپنے دفتر کی طرف چل دیا۔

---

(ستمبر ۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ میں لکھا گیا)

# تشنگی

## مسعود مفتی

تین دن پہلے پاکستانی فوج نے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالے تھے۔

تین دن پہلے بنگلہ دیش قائم ہو چکا تھا۔

مگر بنگلہ دیش کے اس دور افتادہ گنجان آباد شہر میں صرف ایک دن پہلے فضا تبدیل ہوئی تھی۔ جب شہر کی زندگی فتح کے نشے میں لڑکھڑانے لگی۔ ایک دن میں تین مکانات جلائے گئے۔ چند دکانیں لوٹی گئیں اور لوگ تھانے کے باہر پڑی ہوئی چارپائیاں اٹھا کر لے گئے۔ کیونکہ تھانے میں کوئی سپاہی نہ تھا۔

آج منجو صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکلا تھا اور اس نے اپنے ساتھیوں بھولا اور صلو کو بھی ان کے گھروں سے ساتھ لے لیا تھا۔ عمر کے لحاظ سے منجو ان میں سے بڑا تھا۔ اور چار سال سے میٹرک میں فیل ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ابھی دو دو سال ہی میٹرک میں فیل ہوئے تھے۔ اس لئے وہ ہر چیز میں ان کا لیڈر ہوتا تھا۔ آج وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ اگر کہیں کچھ لوٹا جا رہا ہو۔ تو وہ بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے بانس تھے۔ منجو کی جیب میں کمانی دار چاقو اور پستول بھی تھے اور اس نے دل ہی دل میں طے کیا ہوا تھا کہ اگر کہیں بنا بنایا ہنگامہ نہ ملا۔ تو وہ موقع دیکھ کر خود ہی لوٹ مار شروع کر دیں گے اور پھر اور لوگ تو شریک ہو ہی جاتے ہیں۔

جب وہ ندی کے بڑے پل کے پاس پہنچے تو وہاں کافی لوگ جمع تھے اور پل کے جنگلے کو پکڑ کر ندی میں کسی چیز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دور سے انبوہ دیکھ کر یہ بھی بھاگے اور ان میں شامل ہو گئے۔ اپنی سرگرمی کو دباتے ہوئے انہوں نے لوگوں سے سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا ہے؟ — کیا ہے؟" مگر جواب نہ ملنے پر وہ بھی دیکھنے والوں کی نظر کی سمت میں دیکھنے لگے۔

یہ ندی بل کھاتی ہوئی شہر کے بیچ میں سے گزرتی تھی اور شہر کے مزاج کے ساتھ ساتھ اپنا بھی رنگ بدلتی جاتی تھی۔ کہیں شریفوں کی طرح سکڑ کے اور کہیں غنڈوں کی طرح اکڑ کے، جب تن سمیٹنا پڑتا تو من ہی من میں گہری ہوتی جاتی اور جب کم ظرفوں کے انداز میں پھیل کر چلتی تو گہرائی کھو دیتی۔ اس لئے جہاں سمٹ کر گہری ہو گئی تھی وہاں تو اینٹ روڑے بانس پودے درخت انسان کوئی بھی تنگ نہ کرتا۔ اور اس کی سپاٹ سطح خودداری اور اطمینان سے بہتی رہتی۔ مگر جہاں زیادہ چوڑی اور کم گہری تھی۔ وہاں اس کا سینہ چیر کر پودوں نے سر اٹھا لیا تھا۔ اینٹوں اور روڑوں نے کیچڑ سے مل کر سطح پر جزیرے لا دیئے تھے۔ انسانوں نے اس کی کمر میں بانس چبھو کر جھونپڑیاں کھڑی کر لی تھیں جن پر دکانیں اور مکانات دندنا رہے تھے۔ ایسی جگہ ندی کا پانی کسی گم کردہ راہ کی طرح ادھر ادھر ٹکریں مارتا چلتا رہتا — ویرانوں میں آزاد بہنے والی ندی جب انسانوں کی بستی میں سے گزرتی تو انسانی کردار کے سانچے میں ڈھل جاتی۔ اس انحطاط پہ دلجوئی کرنے کے لئے شہر کی ایک سڑک گھوم پھر کر بار بار ندی سے آملتی۔ تھوڑی دور تک اس کے کنارے سے کنارا ملا کر سرگوشیاں کرتی۔ اور پھر اپنا عذاب بھگتنے کو پیچ و تاب

کھاتی ہوئی انسانی بستی کے محلوں میں گم ہو جاتی۔ تھوڑی دیر بعد اپنا دل ہلکا کرنے کو پھر کسی موڑ پر ندی کے ساتھ چلنے لگتی۔

جہاں منجو دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ بڑا پل تھا۔ وہاں ندی کی چوڑائی تیس چالیس گز کے قریب تھی اور پل سے گزرنے والی سڑک ایک فرلانگ جا کر چھوٹے پل پر سے گزرتی تھی جہاں ندی بمشکل پندرہ گز چوڑی تھی اور کوئی میل بھر کا چکر کاٹ کر بڑے پل کے نیچے سے گزرتی تھی۔ اس لئے چھوٹے پل سے بڑے پل تک جانے کے لئے سڑک کے راستے تو چند ہی منٹ لگتے تھے۔ مگر ندی کے کنارے کنارے جانے میں کافی وقت لگتا تھا۔ پانی کا بہاؤ چھوٹے پل سے بڑے پل کی طرف تھا۔

منجو نے دیکھا تو فاصلے پر ایک میلا سا سفید کپڑا بلبلے کی طرح پھول کر آہستہ آہستہ بہتا آ رہا تھا۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔ تو اس کے ساتھ ہی کپڑے کا ایک اور بلبلا ابھرا۔ چند فیٹ آگے بہنے کے بعد یہ دونوں بلبلے آہستہ سے غوطہ لگا کر ڈوب گئے اور کوئی منٹ بھر دور نیلے رنگ کا ایک اور کپڑا اوپر کو ابھرا۔ مگر کسی چیز سے گرد لپٹا ہوا لگتا تھا۔ پانی کا ریلا آیا تو یہ اور ابھرا۔ اور سطح پر نکلے ہوئے گھاس کے چند تنکوں کو دباتا ہوا آگے آ گیا۔

پل پر کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے زیرِ لب کہا " مردہ لگتا ہے "

پھر یہ نیلا کپڑا ایک پودے کے تنے سے ٹکرایا۔ رکا۔ تھوڑا سا گھوما۔ اور نیچے غوطہ لگایا۔ ساتھ ہی گز بھر دور کوئی اور چیز ابھرنے لگی۔

منجو کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ جب اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ کپڑا نہیں بلکہ انسانی لاش ہے۔

لاش بہتی چلی آ رہی تھی۔

ہولے ہولے۔۔۔ دھیرے دھیرے ۔۔۔ رک رک کر۔ اپنے کئے پر نادم گنہگار کی طرح!

چھوٹی چھوٹی لہروں پر نیم ہچکولے کھاتی ہوئی۔ شکوک اور وسوسوں کی طرح!

بانسوں۔ پودوں اور جزیروں سے چھوتی۔ الجھتی اور ٹکراتی ہوئی۔ سہارا ڈھونڈنے والے اس ہاتھ کی طرح جسے نرمی سے رد کر دیا جائے۔

زیرِ سطح گڑھوں پر اس کے سر سے گھوم جاتے۔ کمپاس کی سوئی کی طرح!

جیسے جیسے لاش آگے آ رہی تھی۔ پل پر سناٹا گہرا ہو رہا تھا۔ اور گرد کے کناروں پر بھی خاموشی چھانے لگی تھی۔ سڑک پر ایک سکوٹر رکشے کا شور ایسا بے جوڑ سا لگ رہا تھا، جیسے بھری بارش میں دھوپ نکل آئے۔ لوگ مکانوں سے دکانوں سے اور مچانوں سے گردنیں لمبی کر کر کے اسے دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگ لاش کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کئی پہچان گئے تھے۔ مگر کسی دوسرے کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔ جب یہ شخص زندہ تھا۔ تو اس کی شکل و صورت تھی۔ نام تھا۔ کردار تھا۔ شناخت تھی۔ مگر اب لوگ یہ سب کچھ بھول جانے پر تلے ہوئے تھے۔ اور اپنے ہی شہر میں اپنے ہی لوگوں کے درمیان وہ سابقہ شخص مرے ہوئے گوشت کا گمنام تودہ بن کر بہتا جا رہا تھا۔

لاش لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔

اب منجو اس کے چہرے کے نقوش دیکھ سکتا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ان پر کیچڑ جما ہوا تھا۔ گردن عجب انداز میں پیچھے کو مڑی ہوئی تھی۔ اور اس پر کاٹے جانے کا زخم صاف نظر آ رہا تھا۔۔۔ منجو زیادہ تو نہ دیکھ سکا کیونکہ پانی کے ریلے نے لاش کی کروٹ بدل دی اور چہرے نے لوگوں

کی نظروں سے بچنے کے لئے سطح آب کو پردہ بنا لیا۔ مگر کروٹ بدلنے سے دو ہاتھ نمودار ہوئے جو آپس میں ایک رسی سے بندھے تھے اور پیٹھ کے کسی ٹوٹے سے حصے پر جکڑے تھے جواب پانی سے باہر تھا۔

لاش پُل کے نیچے گھس گئی۔ منجو بھاگ کر پل کی دوسری طرف پہنچا۔ تو لاش اسی انداز میں دھیرے دھیرے بہتی ہوئی اس سے دور جا رہی تھی۔ اور وہ حیران ہو رہا تھا کہ انسان کتنا بڑا ہوتا ہے۔ مگر پانی میں بہتی ہوئی یہ لاش کتنی چھوٹی لگ رہی ہے۔ اس کے دل میں ایک نامعلوم سا جذبہ ابھرا۔ ترس؟؟ — نہیں — ہمدردی؟؟ نہیں — یہ کچھ اور تھا جس کی شدت وہ محسوس کر سکتا تھا۔ مگر نشاندہی نہیں کر سکتا تھا۔

"کون تھا یہ؟" کسی نے پوچھا۔ مگر لوگ نظریں چرا گئے۔

پھر پل پر سے بھیڑ ایک دم چھٹ گئی۔ کچھ لوگ خاموشی سے سر جھکائے چلے گئے۔ باقی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر باتیں کرتے رہے۔ منجو اور اس کے ساتھی کبھی ایک گروپ کی باتیں سنتے کبھی دوسرے کی۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ ساتویں لاش ہے، جو آج اس ندی سے گزری ہے۔ علی الصبح چھ لاشیں تھوڑے تھوڑے وقفے بعد بہتی گئی ہیں۔ جن میں دو لاشیں بچوں کی بھی تھیں۔ عام خیال یہی تھا کہ لوگ رات کو مار کر پھینکتے ہیں۔ اور لاشیں سورج نکلنے سے پہلے آبادی سے دور چلی جاتی ہیں۔ یہ لاش کہیں اٹک گئی ہوگی۔ یا شاید کسی نے دیر میں ہاتھ مارا ہو۔

"بہاریوں کو مار رہے ہیں۔" کسی نے کہا۔

"پاکستانی بنگالیوں کو مار رہے ہیں۔" دوسرا بولا۔

"غداروں کا یہی حشر ہونا چاہئے۔" ایک اور خیال تھا۔

"سارے غدار ہی نہیں ہوں گے۔ لوگ اپنی دشمنیاں بھی پوری کر رہے ہیں۔ پوچھنے والا کوئی ہے نہیں۔ نہ قتل کا پرچہ لکھنے والا نہ لکھوانے والا۔ ذاتی دشمنوں سے نبٹنے کا اس سے اچھا موقعہ کیا ملے گا سمجھدار لوگ ہیں۔"

لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے اور منجو سن رہا تھا۔ لاش کو دیکھ کر اسے جو دہشت اور صدمہ ہوا تھا۔ وہ ان باتوں سے تحلیل ہونے لگا۔ لاش کا نظارہ اسے غیر معمولی چیز لگی تھی۔ مگر ان باتوں کا تاثر یہ تھا کہ یہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ بلکہ مستحسن عمل ہے۔ کچھ لوگوں کی سزا ہے کہ انھیں مارا جائے اور کچھ لوگوں کا حق ہے کہ انھیں ماریں۔ یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ ندی میں لاش کا بہنا کوئی بڑا حادثہ نہیں، بلکہ معمولی چیز ہے۔ کسی کو ماریں گے تو اسے ندی میں ہی پھینکیں گے۔ کوئی اپنے صحن کو تو قبرستان نہیں بنائے گا نا۔ کسی کو ختم کیا۔ ندی میں پھینکا۔ اپنی جان چھڑائی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں۔ سب چلتا ہے۔

یہ باتیں سن کر منجو اور اس کے ساتھی ایک نیا ولولہ لے کر لوٹنے کے لئے روانہ ہوئے۔ سب چلتا ہے۔ کچھ لوگوں کو ضرور سزا ملنی چاہئے اور ہم کیوں پیچھے رہیں۔

انھیں علم تھا کہ بازار میں ایک جگہ سات آٹھ بہاریوں کی دکانیں اکٹھی ہیں۔ چنانچہ وہ پہلے ادھر ہی روانہ ہوئے۔ مگر وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ ابھی ابھی لوٹ ختم ہوئی ہے۔ اور اب کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ منجو کو اتنا غصہ آیا کہ پہلے تو اس نے ایک دکان کے سامنے والے تختے توڑے۔ پھر جیب میں سے ماچس نکال کر ایک کھوکھے کو آگ لگا دی۔ جو کسی پان والے نے، دکان سے ذرا ہٹ کر بنایا تھا۔ راہگیروں میں سے کسی نے اسے نہیں روکا۔ دیکھنے والوں نے مسکرا مسکرا تماشے کا مزہ لیا اور ایک آدمی نے تو اسے تھپکی بھی دی۔

منجو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ بھولا نے بتایا کہ فلاں جگہ ایک مغربی پاکستانی کی دکان ہے۔ ادھر کا رخ کیا جائے۔ چنانچہ تینوں اُدھر چل دیئے۔ مگر وہاں پہنچے تو دکان پر ایک بنگالی بیٹھا تھا۔ انہوں نے ادھر اُدھر سے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ اصل دکاندار لاپتہ ہے۔ بتانے والے لوگ "لاپتہ" کہتے وقت مسکراتے جیسے انہیں پتہ ہو کہ اُس کا کیا حشر ہوا ہے۔

تیسری جگہ البتہ انہیں کامیابی ہوئی۔ جہاں ایک بنگالی کا گھر لوٹا جا رہا تھا جو اعلانیہ پاکستان کی حمایت کیا کرتا تھا۔ یہ لوگ وہاں اتفاقاً پہنچ گئے تھے اور لوٹ میں شریک ہو گئے۔ ببلو کو ریڈیو مل گیا۔ بھولا نے ٹائم پیس گھڑی اور تین دھوتیاں قابو کر لیں۔ مگر منجو زنانہ کپڑوں کی تلاش میں تھا۔ جب ایک صندوق ملا تو اس نے سارے کپڑے زمین پر گرا دیئے۔ اور ایک نئی سی لال ساڑھی اٹھا لی۔ باقی کپڑوں کو اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے بکھیر دیا۔ ساڑھی اٹھاتے وقت اس کا دل دھک دھک ہوا۔ اور یہ اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر گھر کو بھاگا۔ چلنے سے پہلے اس نے ساڑھی کو ایک کاغذ میں لپیٹ لیا۔

یہ ساڑھی اس نے زاہرہ کے لیے اٹھائی تھی جو منجو کے گھر کے سامنے رہتی تھی۔ وہ درمیانی عمر کی بھرپور سی عورت تھی۔ منجو بچپن ہی سے اُس کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ جیسے ہمسایوں کے گھر بچوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ مگر جب سے منجو نے داڑھی منڈوانا شروع کی تھی وہ اس پر مہربان ہو گئی تھی اور اب پچھلے چھ ماہ سے آپس میں جسمانی تعلقات بھی قائم تھے۔ وہ منجو کو پیسے وغیرہ بھی دیا کرتی تھی۔ جن سے وہ اپنے دوستوں کی تواضع کیا کرتا۔ آج پہلی دفعہ وہ اس قابل ہوا تھا کہ زاہرہ کی جملہ نوازشات کے عوض اسے کوئی تحفہ دے سکے۔ اس لئے جب وہ ساڑھی بغل میں دبائے گھر کو چلا تو اس کا دل اچھل رہا تھا۔ آنکھیں بیٹھی سی گئی تھیں۔ منہ خشک ہو رہا تھا۔ اور سردی کے دنوں میں بھی ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔

اپنے گھر میں داخل ہو کر اُس نے ساڑھی کو ڈیوڑھی میں پڑے ہوئے ڈرم کے پیچھے چھپا دیا اور خود ماں کی نظر بچاتا سیدھا اس کمرے میں گھسا جس کی کھڑکی سے سامنے والا مکان نظر آتا تھا۔

سامنے والے مکان کی کھڑکی دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے بے اختیار گالی ٹپک پڑی۔ کیونکہ کھڑکی خالی تھی اور وہاں تولیہ سوکھنے کے لئے نہیں لٹکا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ زاہرہ کا خاوند یا اور لوگ گھر میں ہیں۔ جب تولیہ لٹکتا تھا تو یہ اشارہ تھا کہ اب مطلع صاف ہے۔

تھوڑی دیر بعد منجو کی ماں نے جب اُس سے پوچھا: "آج تم کیوں اتنی بے چینی سے کمرے کے اندر باہر چکر لگا رہے ہو؟" تو منجو ایک دم بھونچک سا رہ گیا۔ جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ مگر فوراً ہی بات ٹالنے کو اپنی ماں کو صبح والی لاش کا قصہ سنانے لگا۔ جو ندی میں بہتی جا رہی تھی۔

ماں بات سنتے وقت غور سے اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی اور جب وہ واقعہ سنا چکا تو اُس نے آگے بڑھ کر اُس کے ماتھے کو چوما اور بولی "اچھا۔ ادھر گلاس میں دودھ پڑا ہے۔ وہ پی لے۔ دیکھ تو خوف سے چہرے کا رنگ کیسا ہو رہا ہے۔"

بالآخر زاہرہ اسے کھڑکی میں نظر آئی۔ منجو نے بے صبری سے اشارہ کیا کہ میں آ جاؤں تو اس نے بند مٹھی دکھا دی۔ جس کا مطلب تھا کہ تھوڑی دیر انتظار کرو۔

پھر چند ہی منٹ بعد اُس نے دیکھا کہ اس کا خاوند نکل کر جا رہا ہے اور ساتھ ہی کھڑکی میں تولیہ پھیلا دیا گیا۔ منجو ماں کی نظر بچا کر نکلا اور سیدھا وہاں جا پہنچا۔

ساڑھی لے کر زائرہ نے اُسے بڑی میٹھی نظروں سے دیکھا اور گال پر ہلکا سا چپت مار کر بولی "بدھو! تو کہاں کا کماؤ مرد ہے۔ جو میرے لئے کپڑے لا رہا ہے۔"

منجو کا لڑکپن کانپتی ہوئی آواز میں منمنایا۔ "کماتا نہیں تو کیا تیرے لئے لوٹ بھی نہیں سکتا؟"

وہ ہنسی پھر ساڑھی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ مگر اچانک منجو نے خود ہی ساڑھی اُس کے ہاتھ سے جھپٹ کر دور پھینک دی۔ اور اُسے دبوچ لیا۔ وہ نہ نہ کرتی رہی مگر منجو نے ایک نہ سنی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ چلنے لگا۔ تو زائرہ نے کہا "منجو ٹھہر۔ تیرے لئے میٹھا بھات بنا کر رکھا ہے۔ کھاتا جا۔"

اور جب وہ سر جھکائے کھا رہا تھا تو نرم سے ہاتھ نے اس کا گال سہلایا۔ ٹھوڑی کے نیچے آ کر ذرا سا لرزا۔ مرتعش انگلیوں سے اُس کا چہرہ اوپر اٹھا لیا۔ وہ مخمور سی آنکھیں منجو کی آنکھوں میں گڑ گئیں۔ اور زائرہ رسیلی سرگوشی میں بولی:

"منجو سندر! آج تو تو بڑے جوش میں تھا۔ کیا بات ہے — ایک دم شیر بنا تھا۔"

منجو کو میٹھا بھات کئی گنا زیادہ میٹھا لگنے لگا۔

---

اگلے دن تینوں دوست سورج نکلنے سے پہلے ہی بڑے پل پر پہنچ گئے۔ منجو نے رات ہی ان سے طے کر لیا تھا۔ اور پھر صبح سویرے انھیں گنگا نے پہنچ گیا تھا۔ نیم تاریکی میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پل پر سے دیکھتے رہے۔ مگر کوئی لاش نہ آئی۔ ایک جھاڑی بہتی ہوئی آئی تو یہ لاش سمجھ کر پل کی ریلنگ سے ٹک ٹک کر دیکھنے لگے۔ جب منجو کو پتہ چلا کہ یہ جھاڑی ہے۔ تو اُس نے زور سے تھوکا۔ مایوسی میں گالی دی اور بےچینی سے سڑک پر ٹہلنے لگا۔

تینوں دوست کبھی کھڑے ہو کر گپ لگانے لگتے۔ کبھی پل پر ٹہلتے۔ اور کبھی ندی کے کنارے کنارے اوپر کی طرف چلے جاتے۔ بالآخر بیزار ہو کر انہوں نے مشورہ کیا کہ چھوٹے پل پر چلا جائے۔ اگر وہاں کچھ نہ ہوا۔ تو پھر ادھر آ جائیں گے۔ چنانچہ یہ سڑک پر چلتے چلتے چھوٹے پل پر آ پہنچ گئے۔ چند منٹ اِدھر اُدھر گھومے۔ پھر پل سے جھک کر پانی کی صاف سطح کو دیکھنے لگے۔

بھولا نے محسوس کیا کہ ان کے پاؤں کے نیچے کوئی چیز ہے۔ دیکھا تو ایک پتھر تھا۔ اُس نے پاؤں سے ذرا آگے سرکا دیا۔ تو وہ آہستہ سے لڑھک کر نیچے گرا۔ پانی ذرا سا اچھلا۔ ہلکے کی تھاپ کی ایک آواز ابھری اور پھر سطح ساکن ہو گئی۔

"مچھلی اچھلی تھی"۔ ملو چلایا۔

بھولا زور سے ہنسا۔ "بڑی بھوک لگی ہے کیا؟ جو مچھلی یاد آ رہی ہے۔ وہ تو میں نے پتھر پھینکا تھا۔"

پتھر؟ — بوریت دور کرنے کے لئے اس سے اچھا شغل اور کیا ہو سکے گا۔ منجو نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پل پر جو پتھر روڑا نظر آیا اسے اٹھا اٹھا کر وہ پانی میں پھینکنے لگے۔ پل صاف ہو گیا تو پل کے عین سرے پر کافی پتھر مل گئے۔ کیونکہ وہاں کچی دکانیں تعمیر ہو رہی تھیں اور سیمنٹ پتھروں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہاں سے پتھر اٹھا کر وہ پل پر کھڑے ہو جاتے اور ایک دو تین کہہ کر زور سے پتھر ندی میں پھینکتے کہ کس کا روڑا دور جائے گا۔

یہ کھیل بڑی سرگرمی سے جاری تھا کہ اچانک بھولا چلایا۔ "رک جاؤ — وہ کچھ ہے۔"

ان کے ہاتھ جہاں تھے وہیں جم گئے۔ جیسے اچانک بجلی بند ہونے سے مشین رک جاتی ہے۔

وہ واقعی لاش تھی۔

تینوں دم سادھ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ بائیں کنارے کے قریب تھی۔ اس لئے جیسے جیسے وہ قریب آتی گئی یہ بائیں طرف کو سرکتے گئے۔ پل کے جنگلے پر قریباً لٹکتے ہوئے وہ مبہوت سے لاش کو دیکھتے رہے اور جب لاش سرکتی سرکتی پل کے نیچے گھس گئی تو یہ چونکے جیسے کچی نیند سے جاگے ہوں۔ منجو بھاگ کر دوسری طرف پہنچا اور بانس سے لاش کو چھونے کی کوشش کی۔ مگر چھوٹا پل پانی کی سطح سے کافی اوپر تھا۔ اور بانس نیچے نہ پہنچ سکا۔ منجو نے کہا اگر ہم بڑے پل پر ہوتے تو یہی بانس پانی تک پہنچ جاتا کیونکہ وہ پل پانی کی سطح کے قریب ہے۔

لاش گزر گئی تو یہ بھاگم بھاگ بڑے پل کی طرف چلے۔ بھٹکتے قدموں اور ہانپتے سانسوں کے بیچ بیچ تبصرے بھی جاری رہے۔ ہم کتنا پہلے پہنچ جائیں گے۔۔ سڑک کے راستے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگتے مگر ندی کا چکر اتنا لمبا ہے کہ آدھ گھنٹے سے پہلے نہیں آئے۔ نہیں آدھ گھنٹہ نہیں بیس منٹ ۔۔۔ بوڑھا تھا۔ اس داڑھی میں مٹی اور کیچڑ بھرا تھا ۔۔۔ معلوم نہیں بنگالی تھا یا بہاری ۔۔۔ بنگالی ہوگا کیونکہ ناک چپٹا سا تھا ۔۔۔ ایک بازو کٹا ہوا تھا ۔۔۔ کٹا کہاں ہوگا۔ پانی کے نیچے ہوگا ۔۔۔ نہیں میں نے غور سے دیکھا ایک بازو تھا ہی نہیں ۔۔۔ جس نے پورا آدمی مارا ہے وہ ایک بازو کیوں کاٹے گا۔ تماشہ دیکھنے کے لئے ۔۔۔ مزہ آتا ہے۔ ۔ اگر ایسا ہے تو ایک آدمی نے نہیں مارا۔ بلکہ بہت لوگوں نے مل کر مارا ہوگا۔۔ تبھی وہ سب مل کر مزہ لیتے ہوں گے ۔۔ ذرا آہستہ چلو۔ میرا تو سانس پھول رہا ہے ۔۔ چلتے آؤ۔ چلتے آؤ۔

جب یہ وہاں پہنچ گئے تو انتظار کرنا مشکل تھا۔ چند منٹ رکے۔ پھر بھولا نے کہا کہ یہاں کھڑے رہنے کی بجائے ندی کے کنارے اوپر کی طرف چلتے ہیں اور پھر لاش کے ساتھ ساتھ کنارے پر چلتے ہوئے نیچے آئیں گے۔

تجویز اتنی معقول تھی کہ کچھ کہے بغیر سب لپک کر چل دیئے۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ لاش سے جا ملے۔ جو اب کم گہرے پانی میں پہنچ گئی تھی۔ کناروں پر کئی لوگ کھڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کئی لوگ ایک آدھ نظر ڈال کر آگے نکل جاتے۔ اب آمد و رفت کافی تھی کیونکہ دن چڑھ آیا تھا۔ مگر کوئی بھی اسے اہم بات نہ سمجھتا تھا۔ کئی لوگ تو ایک آدھ آوازہ بھی کس دیتے۔ جو عام طور پر غداروں کے لئے گالی کی شکل میں برآمد ہوتا۔

بیس پچیس لڑکوں کا ایک جلوس فتح کی خوشی منانے کے لئے بنگلہ دیش کے جھنڈے اٹھائے سڑکوں کا چکر لگا رہا تھا۔ سڑک ان کو ایک جگہ ندی کے کنارے لے آئی۔ عین اسی وقت لاش بھی وہیں پہنچی۔ لاش کو دیکھ کر ہجوم کے نعرے بلند سے بلند تر ہونے لگے۔ اور وہ ایسے چیخ چیخ کر "جے بنگلہ" کہتے جیسے مردہ بڈھے کو ذاتی چڑ چڑا کر اسے تنگ کر رہے ہیں۔ جلوس کے چند شریر سڑک سے روڑے اٹھا کر لاش پر پھینکنے لگے۔ اور جب ایک سیدھا نشانے پر لگا تو ہجوم نے تالیاں بجائیں۔ اور چند لڑکوں نے ہنستے ہوئے اور منہ سے سیٹیاں بجاتے ہوئے ہاتھوں سے فحش اشارے کئے۔ اس کے بعد سڑک مسرور اور پرجوش جلوس کو ندی سے دور لے گئی۔ اور بے جان۔ بے ضرر۔ بے بس اور بے قصور بڈھا پانی کی لہروں پر ہولے ہولے بہتا رہا۔

جلوس چلا گیا۔ مگر منجو۔ بھولا اور مسلو کنارے کنارے چلتے رہے اور ہر چند قدم رک کر لاش دیکھنے لگتے۔ اگر وہ کنارے کے قریب آ جاتی تو یہ خوش ہو جاتے اور اگر وہ دور ہٹنے لگتی تو یہ شور کرتے "ارے بڈھے ادھر نہیں۔ ادھر کو" اور پھر قہقہے لگاتے۔

ایک جگہ لاش ایک مچان کے کنارے سے اٹک کر رک گئی۔ جس پر دکان بنی ہوئی تھی۔ بھولا نے چلا کر دکان والے کو آوازیں دیں اور درخواست کی کہ وہ بانس سے اس کو پانی میں دھکیل دے۔

تھوڑا اور بہنے کے بعد وہ ایک درخت کے تنے سے رک گئی۔ تینوں دوست بڑی بے چینی سے انتظار کرتے رہے کہ ابھی پانی کا ریلا اُسے بہا دے گا۔ مگر جب زیادہ دیر ہوئی تو یہ پتھر پھینکنے لگے۔ جس سے پانی کی سطح پر دائرے بن بن کر چاروں طرف پھیلنے لگے۔ بڈھا جسم اُن لہروں پر اوپر نیچے تو ہوتا رہا۔ لیکن رکاوٹ سے اپنا دامن نہ چھڑا سکا۔ تب منجو کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنا بانس نیزہ پھینکنے کے انداز میں زور سے اچھالا۔ وہ ایک ہوائی جہاز کی طرح فضا میں ابھرا۔ خوبصورت سی قوس بناتا ہوا فضا میں اڑتا گیا اور بڈھے کے قریب ہی جا کر چھپاک سے گرا۔ اسے لگا تو نہیں تھا۔ اس کے گرنے سے اتنی بڑی لہر پیدا ہوئی جس نے مردہ جسم کو جھلا سا دیا۔ اس نے ایک دو ہچکولے لئے اور پھر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح جھول کر درخت سے علیحدہ ہو گیا۔ اور پانی کے ریلے پر بہنے لگا۔

تینوں دوستوں نے خوشی سے نعرے لگائے۔ منجو کو تھپکیاں دیں اور کنارے پر خوشی خوشی چلنے لگے۔ مگر ان کی خوشی زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی اور تھوڑا آگے جا کر مردہ جسم ایک چھوٹے سے جزیرے کے کٹے پھٹے کنارے میں پھنس گیا۔ جزیرہ ندی کے عین درمیان تھا۔ انہوں نے سب حربے آزمائے۔ مگر لاش کو اس پھندے سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ بالآخر باہمی مشورے سے طے پایا کہ صلو جوان سب میں سے سبک بھی تھا اور اچھا تیراک بھی۔ ندی میں چھلانگ لگائے۔ اور وہاں جا کر بڈھے کو چھڑائے۔

صلو چھپاک سے نیچے کودا۔ جسم کو مچھلی کی طرح چراتا۔ پھراتا۔ لہراتا لمبے لمبے ہاتھ مارتا۔ وہاں پہنچ گیا۔ مگر قریب جا کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ بڈھے کے چہرے کی جھریاں۔ ان میں چمکتا ہوا گدلا پانی۔ بے نور اور بے جان نیم وا آنکھیں جن کی سفیدی بہت ہی سفید تھی۔ اور چہرے کی کرختگی سے اُسے خوف آنے لگا۔ چنانچہ مینڈکوں کی طرح اس کے ارد گرد اچھل اچھل کر اُس نے پانی کے چھلاوے اٹھائے۔ جنہوں نے بڈھے کو پہلے ادھر اُدھر ہلایا۔ پھر جگہ سے سرکایا۔ اور بالآخر صلو کے بامقصد ہاتھوں سے اٹھائے ہوئے دھاروں نے اسے پانی کے درمیانی ریلے میں ڈال دیا۔

صلو اپنی کامیابی پر سرشار ہو کر پہلے تو اس کے پیچھے پیچھے تیرتا رہا۔ اور کنارے سے منجو اور بھولا بھی اُسے یہی کہتے رہے۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ دوستوں سے الگ ہو کر اور لاش کی معیت میں۔ اس کا شغل ختم ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ بھی باہر آ گیا۔ اور کپڑے نچوڑتے ہوئے ان کے ساتھ اچھل کود کر چلنے لگا۔

جیسے جیسے لاش پل کے قریب ہوتی گئی۔ منجو کی بے چینی بڑھتی گئی۔ اُسے صلو کی طرح خوف نہیں آیا بلکہ جوش سا چڑھتا گیا۔ راستے میں جو درخت یا کھمبا آتا۔ وہ اُسے اتنے زور سے دھپ مارتا کہ اس کی ہتھیلیاں اپنے سانولے رنگ کے باوجود قرمزی ہو جاتیں مگر وہ خود درد محسوس نہ کرتا۔ اور جب پل کے قریب پہنچے تو اُس نے بھولا کے ہاتھ سے لمبا بانس چھینا اور بھاگتا ہوا پل پر پہنچ گیا۔ وہاں پل کے جنگلے سے پورا جھک کر اس نے بانس سے لاش کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر پانی کا ریلا تیز تھا۔ اور مردہ جسم بانس سے چھوتا ہوا آگے نکل گیا۔ ......

ایک لمحے کے لئے منجو نے اپنے دل میں اُسی غیر معمولی جذبے کا ابال محسوس کیا جو بہت شدت سے گرداب کی شکل میں اس کے رگ و پے میں گھوم گیا۔ یہ نہ تو ترس تھا — نہ ہمدردی — نہ معلوم کیا تھا۔ مگر تھا بہت شدید۔ اتنا شدید کہ جب لاش گزر جانے کے بعد تینوں دوست واپس چلے تو منجو کا دل لوٹنے کو نہیں چاہتا تھا۔

اس کے بعد تینوں دوستوں کا معمول ہو گیا کہ یہ ہاتھوں میں بانس لئے صبح صبح ندی پر آ جاتے اور لاشوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے۔

لاشوں کی کمی نہ تھی۔ ہفتہ بھر میں شاید ایک آدھ دن ہی ناغہ ہوا ہو۔ ورنہ ایک یا دو لاشیں یہ ہر صبح کو دیکھ لیتے۔ بلکہ بعض اوقات تو تین بھی مل جاتیں۔ یہ لوگ پہلے چھوٹے پل سے دیکھتے۔ پھر ساتھ ساتھ چلتے۔ اور راستے میں چھیڑ چھاڑ کرتے اور بالآخر بڑے پل پہ آ کر بانسوں سے دھکے دیتے۔ پتھروں سے مارتے اور کیلے کے چھلکوں سے نشانہ بازی کرتے۔

صلو اور بھولا کے لیے تو یہ شرارت تھی، شوخی تھی۔ مہم جوئی تھی۔ لوگوں پہ رعب جمانے اور ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش تھی۔ مگر منجو کو ان حرکات میں ایک خاص مزہ آتا تھا۔ اس پہ نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ آنکھوں میں ہلکی لالی جھلکنے لگتی۔ سانس پھولنے لگتا۔ جسم کے سارے پٹھوں میں چنگاریاں چلنے لگتیں۔ اس نشے کے مزے میں وہ سب کچھ بھول کر لاش کو نت نئے طریقوں سے چھیڑنے کی کوشش کرتا۔

لوگ دائیں بائیں سے گزرتے مگر کبھی کسی نے مداخلت نہیں کی۔ کیونکہ زیادہ تر لوگوں کے نزدیک یہ لاشیں غداری کی علامتیں تھیں۔ اس لئے قابلِ نفرت تھیں۔ انہیں تنگ کرنا گویا ثواب کمانا تھا۔ روح نکلنے کے باوجود جسم کو بھی معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ان لڑکوں کی حرکات کو جذبۂ حب الوطنی کا مظاہرہ سمجھتے اور کبھی ہنس کر، کبھی مسکرا کر اور کبھی تھپک کر داد اور تحسین دیتے۔

جو چند لوگ مختلف انداز میں سوچتے تھے۔ وہ اس خوف سے خاموش رہتے تھے کہ رعونت کے خلاف بولنے سے کہیں ان کا حشر بھی لاش جیسا نہ ہو جائے۔ لہٰذا تینوں لڑکے بے روک ٹوک ان کھلونوں سے کھیل کر مزہ لیتے رہے۔ اور منجو کے دل میں وہ نامعلوم جذبہ جوان ہوتا گیا۔

بنگلہ دیش کو آزاد ہوئے پندرہ روز گزر چکے تھے۔ بہاریوں اور پاکستان کے حامی بنگالیوں کا سارا سامان لوٹا جا چکا تھا۔ مگر شہر کی فضا میں ٹھہراؤ کی بجائے بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیونکہ ہنگامۂ دار و گیر زوروں پر تھا۔ اور ایسے لوگ دھڑا دھڑ گرفتار کئے جا رہے تھے۔ جنہوں نے مبینہ طور پر پاکستان حکومت اور فوج کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ لوگ چوراہوں اور گلیوں میں کھڑے ہو کر ہر نئی گرفتاری پہ تبصرہ کرتے۔ ہر پکڑے جانے والے کے نامۂ اعمال کے پوشیدہ گوشوں کو سرِ بام اچھالتے یا اس کے فرضی مظالم کی داستانیں پھیلاتے۔ جنگ کے ہیجان کے بعد امن اور آزادی سے سکون نہیں ملا تھا بلکہ غیر یقینی صورتِ حالات بڑھ گئی تھی۔ سرکاری گرفتاریوں کے علاوہ مکتی باہنی کے سربراہ لوگوں کو اپنے طور پر پکڑ دھکڑ کرتے رہتے تھے۔ جن غنڈوں کو سیاسی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ دن دہاڑے جرم کرتے۔ ان تمام حالات سے ماحول ایسے جسم کی مانند تھا۔ جسے بخار چڑھا ہو۔ اور اندر ہی اندر ہلکی کپکپی طاری ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ندی میں بہہ کر آنے والی لاشیں بھی پس منظر کا حصہ بن جاتی تھیں۔ اور ان سے منجو کی دلچسپی اس مکھی کے وجود کی طرح تھی جو بڑے کینوس والے لینڈ سکیپ پر بیٹھی ہے۔ مگر دیکھنے والوں کو اس کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

---

سولھویں دن کی صبح کو تینوں دوست پھر چھوٹے پل پر کھڑے تھے۔ جب انہوں نے وہ لاش دیکھی۔ یہ ایک عورت کی لاش تھی۔ جس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ اور وہ بالکل برہنہ تھی۔ عورت کی لاش وہ پہلی دفعہ دیکھ رہے تھے اور دم بخود تھے۔ جیسے پانچ سالہ بچہ پہلی دفعہ نمائش کی روشنیاں اور رونق دیکھ کر چندھیا جاتا ہے اور وہ کیا خوب عورت تھی۔ بالکل پکی ہوئی جوان عورت۔ جس کے سڈول اعضا کی خوب صورتی کو موت بھی بگاڑ نہ سکی۔ پانی کے ریلوں میں کروٹیں بدلتا ہوا جسم ہلکورے کھاتا آگے بڑھتا تو سانولے رنگ کی بجلی تو سروں پر چمک لہرا سی جاتی۔ پچھلی طرف سورج طلوع ہو رہا تھا۔ جس کی مدھم ترچھی شعاعیں بعض قطروں کو موتیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں اور بعض قطرے قوسِ قزح کے رنگوں کی مبہم پچکاریاں سانولے سڈول جسم پہ پھینک رہے تھے۔ انہی رنگوں سے سر کے بالوں میں اٹکے ہوئے قطرے کرنوں کا تاج بن گئے تھے۔ گیلے جسم سے حسن کے بخارات اٹھ رہے تھے۔ حسرت۔ بے چارگی۔ بے بسی

اور کس مپرسی کے باوجود وہ جسم مردہ نہیں لگتا تھا۔ بلکہ جنوری کی سرد صبح کو اٹھنے والی بھاپ میں ترشا ہوا گدرایا ہوا گرم گوشت لگتا تھا۔ جو حسن، اور زندگی کی حرارت میں نہا کر سو رہا ہو۔

منجو کنارے کنارے چل رہا تھا۔ تو اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ قدم بار بار اینٹ روڑوں سے ٹھوکر کھا رہے تھے اور آنکھیں جلی رہی تھیں۔ ابھی پل کچھ دور ہی تھا کہ وہ بھاگ کر تیزی سے وہاں پہنچا اور جنگلے سے جھک کر بانس نیچے لٹکا دیا۔ اس کے دوست سمجھ گئے کہ وہ لاش کو روکنا چاہتا ہے۔ جیسا پچھلے دنوں میں وہ پہلے بھی کئی دفعہ اکٹھے مل کے کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ بھی بھاگ کر آئے۔ اور اُس کے دائیں بائیں جھک کر بانس نیچے لٹکانے لگے۔ مگر منجو نے دبلے پتلے صلو کا بانس چھین کر جھپاک سے پانی میں پھینک دیا۔ اسے زور سے دھکا دے کر دور گرا دیا۔ اور بھونے کا بانس زبردستی چھین کر اپنے دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔

دونوں دوست احتجاج کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھے تو منجو پوری آواز سے دہاڑا "ہٹ جاؤ ورنہ سر پھاڑ دوں گا"

وہ منجو کے طرز عمل سے بھونچک سے رہ گئے۔ مگر اس سے فیصلہ کرنے کی بجائے وہ اس وقت لاش کا آخری نظارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اور فوراً ریلنگ سے نیچے جھک کر دیکھنے لگے۔

لاش آہستہ آہستہ آگے بڑھتی آ رہی تھی اور ان تینوں کی آنکھیں بھاگ بھاگ کر اس کے سر، چہرے، سینے، ٹانگیں اور بازوں کو نگل رہی تھیں۔ لاش پل کے بالکل متوازی ہو کر وہاں پہنچی تو منجو کے دونوں بانسوں نے راستہ روکا۔ لاش دونوں بانسوں سے بالکل اس طرح ٹک گئی جیسے وہ اسی سہارے کی تلاش میں تھی۔

تینوں دوست آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کے جسم کی ہر تفصیل دیکھ رہے تھے۔

منجو کا سانس بڑے زور سے چلنے لگا۔

پھر وہ بڑی احتیاط سے ایک بانس کو ہلا کر جسم کے درمیان لایا اور دوسرا بانس اٹھا کر لاش کے سینے پر رکھا۔ بانس پتھر کو چھوئے۔ لکڑی کو چھوئے۔ گیلی مٹی کو چھوئے اور روئی کو چھوئے تو ہر ایک کے چھونے کا احساس بانس پکڑنے والے ہاتھ کو مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح منجو بھی بانس کی وساطت سے ایک نئے قسم کے احساس سے دوچار ہوا۔ باوجود اس کے کہ بانس پندرہ بیس فٹ سخت لکڑی کا بے جان ٹکڑا تھا۔ اور لاش کا جسم مردہ تھا۔ منجو نے چھاتی کا نرم لمس اپنے سارے جسم میں ایسے محسوس کیا جیسے وہ خود نرم اور گرم جسم سے ہمکنار ہے۔ اور اس کی انگلیاں اس نرم ابھار میں دھنسی جا رہی ہیں۔

وہ سر سے پاؤں تک لرزنے لگ گیا۔

پھر اس کا دل چاہا کہ وہ بانس سینے سے اٹھا کر پیٹ پر رکھے۔ اس نے اپنی دانست میں بہت آہستگی سے بانس اٹھایا۔ مگر نہ معلوم یہ اس کے ہاتھوں کی لرزش کی وجہ سے تھا یا پانی کے ریلے کی وجہ سے کہ لاش یکدم گھومی۔ اور ایک دم بھک کر پل کے نیچے گھس گئی......

منجو کو یوں لگا جیسے کسی نے اُسے کھولتے ہوئے پانی سے نکال کر برف کی سل کے نیچے دبا دیا ہے۔ اس کا اپنا جسم جس کا رواں رواں لرز رہا تھا۔ ایک دم حسرت اور مایوسی سے سُن ہو گیا۔ اور ایک عجیب قسم کی تشنگی اُس کے تالو سے آندھی بن کر اٹھی۔ کانوں کے پردے سنسنا گئے۔ اور گلے کے نرخرے میں پھنس کر رہ گئی.......

وہ چند لمحوں کے لیے منجمد ہو کر رہ گیا۔

پھر وہ اچانک چونکا۔ جیسے کوئی گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھے۔ اور بھاگ کر پل کی دوسری طرف چلا۔ مگر ٹوٹے بانسوں نے اس کی تیز حرکت میں مزاحمت کی اور ایک بانس، تہ میں اٹک گیا۔ جھنجھلا کر اس نے لٹکا رہنے چھوڑا اور دوسرا بانس سرے اونچا کر کے مڑا۔ وہ ایک رکشے سے ٹکرا گیا۔ خوش قسمتی سے رکشا بہت ہی دھیما چل رہا تھا۔ لیکن منجو نے نہ تو اس سے احتجاج کیا۔ اور نہ چوٹ کی پروا کی۔ بلکہ بھاگ کر پل کے دوسرے دہانے پر جا پہنچا۔

مگر لانچ پل عبور کر کے چند گز پرے جا چکی تھی۔ اور اب لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔

منجو نے یوں محسوس کیا جیسے حسرت، مایوسی اور بے بسی سے اس کے اپنے جسم کے ہر مسام سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ اور تشنگی کا احساس اس کے سینے میں مروڑ بن کر اٹھ رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب بیجو اور دوست واپس چلے۔ تو ٹھلوا اور بھولا اس کے طرز عمل پر احتجاج کر رہے تھے۔ وہ برا بھلا کہہ رہے تھے۔

مگر وہ سر جھکائے چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ جیسے اسے اپنے دوستوں اور ان کی باتوں سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

گھر پہنچا تو سیدھا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ وہ اپنی کیفیت میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اس نے غور ہی نہ کیا کہ سامنے والے مکان کی کھڑکی میں تولیہ سوکھنے کے لیے ڈالا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کروٹیں لیتے ہوئے اس کی نگاہ پڑی۔ تو نہ تو پہلے کی طرح اس کا دل اچھلا۔ اور نہ ہی جسم کے پٹھے اینٹھے۔ بلکہ وہ خالی خولی نظروں سے تولیے کو دیکھتا رہا۔

زائرہ نے کافی دیر انتظار کیا اس دوران میں وہ دو ایک دفعہ جھانک کر اسے بیٹھا ہوا بھی دیکھ چکی تھی۔ مگر جب بھی دیکھتی تو منجو لاتعلق سا پڑا ہوتا۔ وہ نہ تو کھڑکی کی طرف منتظر آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا۔ اور نہ ہی بے صبری سے اشارہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا ہوتا۔

بالآخر ایک دفعہ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو وہ مسکرائی۔

منجو نے بھی دیکھا اور مسکرایا مگر وہ حیرانی کی مسکراہٹ تھی۔ خواہش والی بے تاب مسکراہٹ نہ تھی۔

زائرہ نے اشارہ کیا کہ آ جاؤ۔

منجو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ حیران ہوئی ـــ چند لمحے سوچا ـــ پھر بظاہر نادانستہ طور پر ساڑھی کا پلو گرا کر ایک زوردار انگڑائی لی۔

منجو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ مگر اس دلچسپی میں ابھی تک خواہش کی شدت نہ تھی۔

زائرہ نے وہ سب حربے آزمائے جو فطرت نے عورت کو سکھائے ہیں ـــ بالآخر منجو وہاں چلا گیا مگر اس کا دل بھاری بھاری تھا۔ اور اسی گھر میں داخل ہوتے وقت اس کے دل میں وہ تڑپ اور مچلن نہ تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ وہاں جا کر چارپائی پر بیٹھ کر زائرہ سے باتیں کرنے لگا۔

زائرہ غیر محسوس انداز میں کھسک کھسک کر قریب ہوتی گئی تھی۔ پھر اس نے کچھ چھیڑ چھاڑ بھی کی۔ مگر منجو کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا ـــ نہ ہی اس پر کوئی اثر ظاہر ہوا۔

پھر ایک دم زائرہ پوچھ بیٹھی "منجو آج کیا بات ہے تم بجھے بجھے سے اداس بیٹھے ہو"
منجو بہت خفیف ہوا۔ اسے خود بھی اندازہ نہ تھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ یا کیا ہو رہا ہے۔ دل پر بوجھ طبیعت میں اداسی۔ ہر چیز سے بیگانگی۔
فقط اس کا اسے اندازہ تو تھا مگر یہ کیوں تھا۔ اور وہ کیا چاہتا تھا۔ اس کا اسے کچھ علم نہ تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے دماغ میں ایک دھواں سا گھوم رہا ہے۔ جسے باہر نکلنے کو راستہ نہیں مل رہا۔ اسے خود اپنی طبیعت سے وحشت ہو رہی ہے اس پر اب مزید خفت کا تازیانہ پڑا تو اُسے سمجھ نہ آئی کہ کیا کرے۔ بے بسی سے اُس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک دم زائرہ سے لپٹ کر اُس کے بلاؤز میں منہ چھپا لیا۔
زائرہ مسکرائی کہ اس کی محنت کارگر ہوئی۔ اب منجو خود ہی آگے بڑھتا جائے گا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں اور اپنا رخسار منجو کے سر پر ٹکا دیا۔
مگر منجو جہاں تھا وہیں رہا۔
زائرہ ناک سے گنگنانے لگی۔ اور ساتھ ساتھ منجو کو لوری کے انداز میں ہلکے ہلکے جھلانے لگی۔ مگر وہ بالکل ویسے ہی رہا۔
تھوڑی دیر بعد زائرہ نے ساڑھی کا پلو اٹھا کر اُس کا چہرہ دیکھا تو منجو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔
"کیا ہوا منجو شہزادے؟" وہ حیرت سے بولی۔
"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں"۔ وہ اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ اُسے خود بھی علم نہ تھا۔
"چل رہنے دے آج ۔۔۔ تیری طبیعت اچھی نہیں"۔ زائرہ نے مایوسی چھپاتے ہوئے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نرمی سے الگ کر دیا۔

اس دن کے بعد منجو اکیلا اکیلا گھومنے لگا۔
اگلی صبح وہ ندی پر گیا۔ پہلے چھوٹے پل پر اور پھر بڑے پل پر۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا کہ کوئی لاش آئی یا نہیں۔ آج اسے اشتیاق زیادہ تھا۔ اور کئی دفعہ کل والی عورت کی لاش بھی اُس کے ذہن میں ابھری ۔۔۔ آج وہ اکیلا آیا تھا۔ اور اپنے دوستوں بھولا اور صلو کو ساتھ نہیں لایا۔ البتہ اس کے ہاتھوں میں ایک کی بجائے دو بانس تھے۔ قریباً دو گھنٹے کے انتظار کے بعد جب کوئی لاش نہ آئی۔ تو وہ بہت پژمردہ ہو کر گھر واپس چلا آیا۔ دوسرے کمرے میں دن بھر لیٹا رہا۔ جہاں سے زائرہ کی کھڑکی نظر نہ آتی تھی۔ ماں نے پوچھا بھی کہ آج تو اس کمرے میں کیوں بیٹھا ہے۔ تو وہ مختلف باتوں سے ٹال گیا۔
اگلے دن علی الصبح وہ پھر ندی پر گیا۔ مگر کوئی لاش نظر نہ آئی۔
جب تیسرے اور چوتھے دن بھی یونہی ہوا تو اُسے الجھن ہونے لگی کہ یہ سلسلہ بند کیوں ہو گیا ہے۔ اور وہ گھر واپس جانے کی بجائے دن بھر بازاروں اور گلیوں میں بلا مقصد گھومتا رہا۔ ایک دفعہ اسے بھولا اور صلو بھی نظر آئے۔ مگر ان کو دور ہی سے دیکھ کر منجو آنکھیں چرا کر دوسری گلی میں گھس گیا ۔۔۔ وہ زائرہ سے بھی نہ ملنا چاہتا تھا۔
پانچویں دن وہ عام دنوں سے بھی جلدی چھوٹے پل پر پہنچ گیا اور ندی کے پانی پر نظریں گاڑے کسی لاش کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے دنوں کی نا اُمیدی کے بعد اب انتظار نے بھی خواہش کی شکل لے لی تھی۔
سورج کے افق کے اوپر نظر آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ مشرق کا آسمان روشن ہو چکا تھا مگر مغرب کا آسمان نسبتاً تاریک تھا۔ شہر میں جرائم کی کثرت

اور غیر یقینی صورت حالات کی وجہ سے سڑکیں سنسان پڑی تھیں اس نے دو ایک دفعہ ادھر ادھر دیکھا تو اُسے محسوس ہوا کہ جنوری کی سرد صبح میں وہ اکیلا ہی
کھڑا ہے - اور آس پاس کوئی نہیں . مگر آج کل وہ اپنے اندر اس قدر گم رہتا تھا کہ باہر کسی کی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا - اور وہ ماحول
کو بھول کر ایک دفعہ پھر سطح آب کے جائزے میں گم ہو گیا -

تھوڑی دیر بعد اس نے آہٹ سنی - دیکھا تو ایک عورت پل پر کھڑی تھی اس کنارے کے پاس جس پہ دکان تعمیر ہو رہی تھی اور اینٹ پتھروں
کا ڈھیر تھا -

وہ عورت ریلنگ پر سے جھکی ہوئی تھی - اس کے ہاتھ میں بانس کی تیلیوں کی بنی ہوئی چنگیر تھی جس میں سے کچھ اٹھا اٹھا کر وہ وقفے وقفے سے
پانی میں پھینک رہی تھی - منجو سمجھ گیا کہ یہ عورت عام روایت کے مطابق کسی دعا کی قبولیت کے لئے مچھلیوں کو اناج کھلا رہی ہے - منجو بھی منہ موڑ کر کھڑا
ہو گیا - اور ریلنگ سے ٹیک لگا کر بوریت دور کرنے کے لئے اس عورت کو دیکھنے لگا جو اس کی موجودگی سے بے خبر ریلنگ پہ بہت آگے جھک کر
اپنے کام میں پورے خلوص سے منہمک تھی -

اچانک منجو کو یوں لگا کہ اس کا سر تیزی سے گھوم رہا ہے - اور اُسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ یہ کیسے ہو - اور یہ کیوں ہوا - مگر سب کچھ چشم زدن
میں رونما ہو گیا . . . . . .

منجو سوچے سمجھے بغیر کرتے ہوئے دماغ سے ہی دوڑا - اور عورت کے پیچھے جا کر اپنا چاقو اس کی پیٹھ میں گھونپ دیا - پھر جلدی سے اس کی دونوں
ٹانگیں اٹھا کر اسے ندی میں لڑھکا دیا ــــ ایک ادھ کھلی چیخ اور پھر پانی میں گرنے کا دھماکہ ــــ . . . . .
پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے دوڑا - زیر تعمیر دکان کے تعمیری سامان کے ڈھیر میں سے پتھر اور سیمنٹ کے بلاک اٹھا لایا -
عورت ڈبکیاں کھا رہی تھی - چونکہ وہ منہ کے بل گری تھی اور خوف کی وجہ سے چیخنے میں منہ کھلا تھا - اس لئے پانی سیدھا اس کے گلے میں گھس
گیا تھا - چنانچہ وہ شور نہیں کر سکتی تھی - البتہ جب بھی ڈبکی کھا کر ابھرتی تو ٹوٹی پھوٹی دبی دبی کھانسی کے ادھ مرے جھٹکے سنائی دیتے -
منجو ایک بڑا سا پتھر اٹھائے ریلنگ پر سے جھکا ہوا تھا - جیسے ہی عورت کا سر ابھرا - اس نے تاک کر پتھر مارا - چھپاک کی آواز آئی اور عورت کا سر
پھر ڈوب گیا -

جب منجو دوسرا پتھر اٹھا کر دوبارہ جھکا تو سرخ خون کی ایک لکیر سطح آب پر ابھر آئی تھی - اب منجو نے پاگلوں کی طرح پتھروں کی بارش کر دی - عورت ذرا
نیچے کو بہنے لگی تو وہ کنارے پر ہو لیا - بھاگ بھاگ کر پتھر اٹھاتا اور تاک تاک کر مارتا - حتیٰ کہ اُسے یقین ہو گیا کہ عورت دم توڑ چکی ہے یا بیہوش ہو چکی ہے کیونکہ اب
اس نے ہاتھ پاؤں مارنے چھوڑ دیئے تھے -
آخری پتھر اٹھاتے ہوئے منجو کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا - جب اسے خیال ہوا کہیں اس ضرب سے وہ نیچے نہ ڈوب جائے -
وہ چند لمحے لحظہ بہ لحظہ دور بہتی ہوئی عورت کو ــــ عورت کی نعش کو ــــ دیکھتا رہا - پھر بھاگ کر اس نے دونوں بانس اٹھائے اور لرزتی ہوئی
ٹانگوں سے ندی کے بڑے پل کی طرف اتنی تیزی سے بھاگا جتنی تیزی اس کے ناہموار قدموں کے لئے ممکن تھی - اس کا دل تڑپ اور مچل رہا تھا - اور ٹانگوں کے
پٹھے اینٹھ رہے تھے -
بھاگتے بھاگتے اُسے یوں لگا جیسے دماغ میں گھومنے والے دھوئیں کے مرغولے تیز سے تیز تر ہوتے ہیں

فروری ۱۹۷۲ء

# ناگفتنی

## مسعود مفتی

جب وہ اس دنیا میں آیا۔ تو اس کا ٹھٹھرا ہوا جسم گہرے اُٹے ہوئے فرش پہ آ کر پڑا جس پہ اس کے عزیزوں کے نیم گرم خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اس نے کان میں پہلی آواز جو پڑی۔ وہ قتل و غارت کا شور تھا۔ اور چیخوں، کراہوں اور سسکیوں کی فریادیں تھیں۔

یہ ۱۹۴۷ء کی ایک بھیانک رات تھی۔

اس کا باپ چند روز پہلے صوبہ بہار کے فسادات میں مارا گیا تھا۔ اور اب اس کی ماں مہاجرین کی سپیشل ٹرین میں مشرقی پاکستان کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں ہندوؤں نے ٹرین پہ حملہ کر کے قتلِ عام شروع کر دیا..... ... خوف اور صدمے کی وجہ سے وقت سے چند دن پہلے ہی اس نے لڑکے کو گاڑی کے ڈبے میں جنم دے دیا۔ جہاں پیدائش کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور وہ سہارے کے لئے ادھر ادھر بکھری ہوئی لاشوں کو پکڑ رہی تھی۔ جس گاڑی میں موت دیوانوں کی طرح زندگی کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ اس میں ایک نئی زندگی کا ظہور عورت کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

مشرقی پاکستان پہنچ کر وہ ایک مہاجر کیمپ میں رکے۔ جہاں چند دن بعد اس کی ماں مر گئی۔ صرف ایک بھائی باقی تھا۔ جس کی عمر چودہ برس کی تھی۔

پاکستان بننے کے چند برس بعد زبان کے مسئلے پہ ہنگامے ہوئے۔ تو ایک جگہ فساد اور فائرنگ میں اس کا بھائی بھی ہلاک ہو گیا۔

وہ جوں توں کر کے پلتا پلتا جوان ہو گیا۔ بہار اب بازار میں اس کا گذارہ محنت مزدوری پہ تھا۔ وہیں پاس ایک اور بہاری لڑکی سے عشق ہو گیا۔ اس نے لڑکی کو بانس کا ایک کنگن دیا۔ جس پہ رنگ دار پلاسٹک کے نقش و نگار بنے تھے۔ لڑکی نے اسے اپنی مسکراہٹ دی تھی۔ جس کے تصور ہی سے اس کے من میں ایسی قوس قزح پھوٹنے لگتی تھی کہ عمر میں پہلی دفعہ زندگی سہانی لگنے لگی تھی ....... پھر وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ کرنے لگا۔

مارچ اور اپریل ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان میں بہاریوں کا قتلِ عام ہوا۔ تو وہ کئی دن چھپے رہنے کی وجہ سے بچ گیا۔ کچھ دنوں بعد جب پاکستانی فوج وہاں پہنچی تو وہ باہر نکل کر اپنی منگیتر کو ڈھونڈنے لگا۔ لیکن اس کا کوئی پتہ

نہ چلا ۔ . . . . ایک دن وہ اس علاقے سے گذر رہا تھا ۔ جہاں نالے کے کنارے ایک ہی گڑھے میں بہاریوں
کی بہت سی لاشیں عجلت میں دبائی گئی تھیں ۔ تو اسے ناہموار مٹی میں سے نکلا ہوا ایک نسوانی بازو نظر آیا ۔ جس کا ہاتھ
آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا ۔ اور بانس کی کنگی سے گلے سڑے گوشت میں اٹکا ہوا تھا ۔

فروری ۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ پر ہندوستان کا قبضہ ہو چکا تھا ۔ بنگلہ دیش قائم ہوئے سات آٹھ ہفتے گذر گئے تھے ۔
اور وہ میرپور کی بہاری آبادی کے ایک گھر میں چار روز سے فاقے سے بیٹھا ہوا تھا ۔ کیونکہ میرپور کے گرد محاصرہ تھا ۔ آبادی
کی زندگی پہلے ہی بھاری تھی اور مزدوری ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔

پھر ہتھیار ڈھونڈنے کے بہانے آبادی پر حملہ ہوا ۔ اور کئی لوگوں کے ساتھ وہ بھی مارا گیا ۔

ایک گندے نالے کے کنارے اس کی لاش پڑی تھی ۔ ایک پاؤں کو کتا چاٹ رہا تھا ۔ پیٹ پر کوے بیٹھے ٹھونگے
مار رہے تھے ۔ ایک چیل اس کی انتڑی کھینچ کر پاس بیٹھی تھی . . . . . . اس کی کھلی آنکھیں آسمان کو دیکھ رہی تھیں اور
ان کی بے نور نظریں لاش سے ہٹ کر اپنے بنانے والے سے کتنے ہی سوالات کر رہی تھیں ـــــ ایسے سوالات جو صرف
لاشیں ہی پوچھ سکتی ہیں ۔ گر زندہ لوگ پوچھیں تو سننے والے اُن کا حشر اس لاش سے بھی بُرا کریں ۔

بے زبان سوالوں کی بولتی نگاہ فضا کو چیر کر دور ـــ بہت دور ـــ نکل گئی اور کائنات کی لامحدود وسعتوں
میں بھٹکنے لگی جہاں اس جیسی ہزاروں ۔ لاکھوں ۔ کروڑوں نگاہیں قرن ہا قرن سے بھٹک رہی ہیں ۔"

---

# ۱۸؍دسمبر ۱۹۷۱ء

## مسعود مفتی

مقام ..... ڈھاکہ تاریخ ..... ۱۶، ۱۷، ۱۸؍ دسمبر ۱۹۷۱ء

### کردار

- توفیق بابو
- سلطانہ (بیگم توفیق)
- عبدالسلام (توفیق کا ہمسایہ)
- نسرین (سلام کی بیگم)
- عطاء الرحمان: (عمر سترہ برس، سلام کا لڑکا)
- رمضان اور غلام رسول (مغربی پاکستان پولیس کے دو سپاہی)

(پردہ اٹھتے ہی توفیق بابو کا ڈرائنگ روم نظر آتا ہے۔ ایک صوفہ سیٹ۔ تین آرام کرسیاں۔ تپائین۔ ایک بک شیلف۔ اور ساتھ چھوٹی میز پر دو تین فوٹو پڑے ہیں۔ بائیں طرف والی دیوار میں دروازہ کھلتا ہے۔ جو باہر کے برآمدے میں سے اندر آنے کا راستہ ہے۔ دائیں دیوار کے ساتھ دوسرا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک دروازہ سامنے والی دیوار میں بھی ہے۔ دروازے کے پاس ہی ایک دیوان ہے۔ جس پر چھالر والا کپڑا پڑا ہے۔ اور دو تین گدیاں بھی ہیں۔ دیوار پر کلاک ہے۔ جس پر چھ بج کر پانچ منٹ ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ تاریکی میں ہے کیونکہ کمرے میں ٹیوب روشن نہیں۔ بلکہ ایک ٹیبل لیمپ کے گرد شیڈ اور کاغذ وغیرہ چڑھا کر روشنی کا دائرہ محدود کر دیا گیا ہے۔ اور کھڑکیوں اور روشندانوں پر بھی پردے گرا کر بلیک آؤٹ کی تدابیر کی ہوئی ہیں۔ روشنی کے اس محدود دائرے میں توفیق بابو اور بیگم توفیق کے چہرے اور ٹانگیں نظر آ رہی ہیں۔ کیونکہ وہ جھک کر آگے کو بیٹھے ہیں اور ان کی کمر وغیرہ روشنی کے دائرے سے باہر ہے۔ وہ دونوں جھک کر غور سے ریڈیو سن رہے ہیں۔ جو اس روشنی کے دائرے میں میز پر پڑا ہے۔ ریڈیو پر خبریں نشر ہو رہی ہیں۔ جن کی آواز کافی بلند ہے۔)

**ریڈیو:** ....... نے خاص پیغام میں بری اور بحری فوجوں کو ان کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دی اور کہا کہ ساری قوم بڑے فخر سے ان سپوتوں کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ جواب جنگ کے خاتمے پر گھروں کو لوٹیں گے۔ ..... یہ خبریں آپ آکاش وانی ہندوستان سے سن رہے ہیں۔ ...... آج پچھلے پہر ساڑھے چار بجے ڈھاکہ کے ریس کورس میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کی باضابطہ رسم ادا کی گئی۔ بنگلہ دیش کے پُرجوش ہجوم کے نعروں کے درمیان پاکستانی کمانڈر جنرل اے اے نیازی نے اپنا پستول اتار کر بھارتی

کمانڈر جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کو پیش کیا۔ اور ساتھ ہی پاکستانی فوج کے دستے نے بھی ہتھیار ڈالے۔ (توفیق اور بیگم توفیق ایک دوسرے سے نظریں ملاتے ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے۔ جہاں شیخ مجیب نے سات مارچ کو اپنی مشہور تقریر کی تھی۔ اور جہاں مارچ کے مہینے میں عوامی لیگ کے نمائندوں نے چھ ماہ پہلے حلف اٹھایا تھا۔ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا نے بنگلہ دیش کے پرجوش عوام کو بنگلہ دیش کے قیام پر مبارکباد دی۔ ......

(توفیق پر اس وقت واضح طور پر بے چینی نظر آتی ہے۔ اور یہاں تک سننے کے بعد توفیق بے اختیار ہو کر ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کر دیتے ہیں۔ ہاتھ ریڈیو پر ہی رکھے سر جھکائے اور کسی میں ڈوب جاتے ہیں۔ بیگم توفیق بھی چپ چاپ بت بنی بیٹھی رہتی ہے۔ ہونٹوں سے آنسو رخسار سے بہتے ہوئے۔ توفیق بابو ٹھنڈی آہ بھر کر کرسی پر ٹیک لگا لیتے ہیں اور رک رک کر بولتے ہیں۔)

**توفیق:** ہائے کیا ہوا ...... کبھی یقین نہیں آتا تھا کہ پاکستان کے اس طرح ٹکڑے ہو جائیں گے .... یہ ہمارے سامنے بنا اور آج سامنے ہی ٹوٹ رہا ہے ...... اب تو سب کچھ ہی ختم ہو گیا ہے ...... کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ (مایوسی سے دونوں ہاتھ ملا کر) کچھ بھی نہیں ...... نہ معلوم وہ خواب تھا یا یہ خواب ہے ...... (دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ چند لمحے اسی طرح رہتا ہے) ...... آج ظہر کی نماز کے بعد میں گھنٹہ بھر پاکستان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ اور وظیفے پڑھتا رہا ..... مگر میرا دل اس وقت بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ (دانت کچکچا کر) بنگلہ دیش ..... بنگلہ دیش ... کاش میں بنگلہ دیش بننے سے پہلے ہی مر گیا ہوتا۔

(پھر وہ سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اچانک ہی کہیں قریب سے مشین گن کا فائر ہونے کی آواز آتی ہے۔ بیگم توفیق خوفزدہ ہو کر فوراً اٹھتی ہے۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور متوحش ہو کر پوچھتی ہے۔)

**بیگم توفیق:** یہ کیا ہو رہا ہے؟؟

**توفیق:** (لاپرواہی سے) یہ تو اب ہوتا ہی رہے گا ..... جہاں اتنا کچھ ہو گیا یہ بھی سہی۔

**سلطانہ:** مگر جنگ تو ختم ہو گئی۔ ہتھیار ڈالے گئے۔ پھر یہ فائرنگ کیوں نہیں رکتی ......؟؟

**توفیق:** رک جائے گی ...... رک جائے گی .... (اٹھتے ہوئے) جب پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے ختم ہو جائیں گے۔ یہ بھی رک جائے گی۔

**سلطانہ:** (اور بھی خوفزدہ ہو کر خاوند کی طرف دیکھتی ہے وہ اس کی توجہ کے بغیر سر جھکائے آہستہ آہستہ ٹہلنے لگتا ہے۔ یہ فرش پر نظریں گاڑ لیتی ہے۔ اتنے میں ذرا دور سے رائفل کا فائر سنائی دیتا ہے۔ یہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اور پھر آہستہ سے خاوند کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر مردنی سے پوچھتی ہے) اب ہمارا کیا بنے گا؟

**توفیق:** (چند لمحے نظریں چراتا ہے پھر اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ کر کہتا ہے) خدا ہی جانتا ہے۔

**سلطانہ:** (چند لمحے خاموش رہ کر) آپ تو پاکستانی فوج کی مدد بھی کرتے رہے ہیں ...... کاش ہمیں پہلے پتہ ہوتا۔

(فائرنگ کی آواز آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے ہیں۔ عورت کی آنکھوں میں

جیسے آنے والے خطرے کے متعلق فہمائش ہے اور مرد ان آنکھوں کی تاب نہیں لا سکتا وہ آنکھیں جھکا لیتا ہے۔ اور

پھر دھیرے سے کہتا ہے)

توفیق: میں احتیاط تو کافی کرتا رہا ہوں۔ کہ لوگوں کو اندازہ نہ ہونے پائے۔ مگر کیا معلوم۔

سلطانہ: (چند لمحے توقف کے بعد) ہم چند دنوں کے لئے کہیں جا نہیں سکتے کیا!؟

توفیق: (پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ) کہاں؟؟

سلطانہ: کہیں بھی!!

توفیق: ذاتی الجھنوں سے بھاگا جا سکتا ہے۔ گھریلو جھگڑوں سے بھاگا جا سکتا ہے۔ مگر تاریخ کی کروٹوں سے بھاگنا ممکن نہیں ......

تنکے نہ تو طوفانی لہروں کو توڑ سکتے ہیں۔ اور نہ ان سے بھاگ سکتے ہیں۔

سلطانہ: (الجھ کر) پھر کیا کریں؟؟

توفیق: کچھ نہیں۔ ....... صرف انتظار کریں۔

سلطانہ: کس چیز کا انتظار؟؟

توفیق: حالات کا..... قسمت کا..... بلکہ بدقسمتی کا۔

سلطانہ: ہائے کوئی اچھی بات منہ سے نکالیں۔

توفیق: (فرش پر نظریں گاڑے ہوئے) ہاں منہ سے تو اچھی چیز مانگنی چاہیے۔ مگر..... ذہنی طور پر..... ہمیں بدترین حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے.... چاہے وہ ....... موت ہی کیوں نہ ہو۔ (سلطانہ سُن سی ہو جاتی ہے۔ صدمے کے عالم میں کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ چند لمحے اسی طرح بیٹھی رہتی ہے۔ پھر ساڑھی کا پلو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگتی ہے۔ توفیق تھوڑی دیر ویسے ہی ٹہلتا رہتا ہے۔ پس منظر میں ہیلی کوپٹر کے اڑنے کی آواز آتی ہے۔ پھر وہ اس کے پاس جا کر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتا ہے) سلطانی (اس کی سسکیاں تیز ہوتی جاتی ہیں) ہمت کرو سلطانی ہمت ..... ہم حوصلہ تنکوں کا واحد سہارا ہے۔ (وہ تسلی دینے کے لئے اس کے کندھے پر تھپکی دیتا ہے۔)

(باہر سے اچانک عطاالرحمان کی آواز آتی ہے۔ جو زور زور سے چلا رہا ہے اور گھر میں داخل ہونے کو ہے۔ توفیق کندھوں سے پکڑ کر بیوی کو جھنجھوڑتا ہے اور گھبراہٹ میں جلدی سے کہتا ہے" سلطانی۔ سلطانی۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔" وہ ایک دم اٹھ کر سامنے والے دروازے کی طرف جاتی ہے۔

عطا: (باہر سے) انکل۔ انکل۔ مبارک ہو مبارک ہو (دھڑاک سے دروازہ کھول کر اندر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے) جے بنگلہ۔ انکل جے بنگلہ (سلطانہ سامنے والے دروازے کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ اور چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔) ارے آنٹی کدھر چلیں۔ یہ مٹھائی تو کھاتی جائیں۔ فتح کی مٹھائی ہے (مگر وہ چلی جاتی ہے تو یہ حیران ہو کر دیکھنے لگتا ہے۔) ارے اتنی بھی کیا جلدی ہے۔

توفیق: (جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے۔) آؤ برخوردار آؤ۔ جے بنگلہ۔ جے بنگلہ۔ تمھیں بھی مبارک ہو۔ وہ ذرا آنٹی کی آنکھ میں کچھ پڑ

گیا تھا وہ غسل خانے میں ہاتھ دھونے گئی ہیں۔ ابھی آجاتی ہیں۔

**عطا:** (میز پر پلیٹ رکھ دیتا ہے اور پھر چاروں طرف دیکھ کر) یہ آپ اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہیں جنگ ختم ہو گئی۔ آج کون سا بلیک آؤٹ

**توفیق:** ہاں آج ضرورت تو نہیں۔ مگر ابھی ختم کرنے کا اعلان نہیں ہوا۔ تو ہم نے بھی سوچا کہ احتیاط اچھی ہے۔

**عطا:** کمال کرتے ہیں انکل آپ بھی۔ مر گئے وہ اعلان کرنے والے۔ یہ اُن سالوں کا بلیک آؤٹ تھا۔ بنگلہ دیش کا تھوڑا ہی ہے۔ وہ سالے قبروں میں جائیں گے۔ یا بلیک آؤٹ ختم کرنے کے آرڈر دیں گے یہ پلید خبیث کہیں کے۔ (وہ اٹھ کر بٹن دباتا ہے بجلی کی روشنی سے سارا کمرہ چمک اٹھتا ہے اور گھوم کر چاروں طرف دیکھتا ہے ... اچھا یہ یہ کاغذ واغذ (آگے بڑھ کر ایک کے شیشوں کو ڈھانکنے والے کاغذ پھاڑنے لگتا ہے۔)

**توفیق:** ارے بیٹھو بیٹی۔ یہ لمبا کام ہے۔ کل پرسوں تک نوکر واپس آجائیں گے۔ تو آرام سے کر لیں گے۔ ... یہاں تو پچھلے پانچ دن نہ نوکر رہا ہے نہ نوکرانی۔

**عطا:** (کاغذ اتارتے ہوئے) کون آتا انکل۔ یہاں تو کرفیو تھا یا بمباری۔ کون گھروں سے نکلتا۔

**توفیق:** بس بیٹا تم آؤ بیٹھو۔ کل صبح کاغذ اتاریں گے۔

**عطا:** وہ آپ آرام سے بیٹھے رہیں انکل۔ یہ دو چار کاغذ اتارتے ہیں۔ ان کو ہاتھوں میں مروڑ کر گولہ سا بناتے ہوئے واپس مڑتا ہے) میں تو تھوڑا سا حصہ خالی کر رہا تھا کہ کچھ تو روشنی باہر جائے۔ آزادی کی پہلی رات تاریک نہیں ہونی چاہیے۔ ہر گھر میں چراغاں نہیں تو تھوڑی سی روشنی تو باہر جانی چاہیے۔ یہ تو آزادی کی روشنی ہے۔ بنگلہ دیش کی روشنی ہے۔ (بلند آواز سے) امار شونار بنگلہ دیش (پھر کاغذ کے گولے دونوں ہاتھوں میں بند کر کے نعرہ لگاتا ہے) جے بنگلہ۔

**سلطانہ:** (اندر داخل ہوتی ہے۔ ساڑھی کا پلو درست کرتے کرتے مسکراتی ہے) عطا بہت خوش ہے آج۔

**عطا:** (خوشی سے اچھل کر) آؤ آنٹی آؤ۔ کیوں نہ خوش ہوں۔ شونار بنگلہ بن گیا۔ بھاگ کر پلیٹ سے مٹھائی کا ٹکڑا اٹھاتا ہے اور لپک کر سلطانہ کی طرف جاتا ہے۔ منہ کھولو آنٹی تمہارا منہ میٹھا کرائیں۔ (وہ ہاتھ آگے بڑھاتی ہے مگر یہ زبردستی اس کے منہ میں مٹھائی ٹھونس دیتا ہے۔ پھر اسے کندھوں سے پکڑ کر کہتا ہے) بولو آنٹی جے بنگلہ (وہ ہنستے ہوئے کہتی ہے "جے بنگلہ") نہیں ایسے نہیں۔ ویسے جیسے میں نے اپنی ممی سے کہلوایا تھا۔

**سلطانہ:** (شرماتے اور ہنستے ہوئے) کیسے کہلوایا تھا؟

**عطا:** (اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اوپر ہوا میں اٹھاتا ہے۔ اور کہتا ہے) زور سے بولیں۔ (وہ ذرا زور سے "جے بنگلہ" کہتی ہے) نہیں اور زور سے۔ (وہ اور زور سے کہتی ہے مگر توفیق بابو کہتے ہیں۔)

**توفیق:** ایسے نہیں سلطانہ۔ ذرا کھل کے بولو۔ چلو سب مل کے کہتے ہیں۔ (عطا خوش ہو کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اور متوقع نظروں سے توفیق کی طرف دیکھتا ہے پھر تینوں اوپر ہاتھ اٹھا کر زور سے نعرہ لگاتے ہیں۔ "جے بنگلہ")

**عطا:** (ہنستا ہوا تالی بجاتا ہے اور زور سے کہتا ہے) ویری گڈ۔ ویری گڈ۔

توفیق : (صوفے پر بیٹھ جاتا اور شفقت سے کہتا ہے۔) آؤ بیٹا عطا۔ بیٹھو ادھر۔
(عطا اور سلطانہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

عطا : آنٹی آپ کو کس وقت پتہ چلا سرنڈر کا۔

سلطانہ : ہمیں تو تین بجے کے قریب پتہ چلا۔ میں نے (دائیں طرف اشارہ کرکے) اس طرف والے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ تو سامنے ہی تمہارے لان میں تمہاری ممی کھڑی تھیں۔ انہوں نے بتایا۔

عطا : کمال ہے بہت دیر سے خبر ملی آپ کو۔

سلطانہ : بس دوپہر کی خبریں ہی سن نہیں پائے۔ یہ تو نماز پڑھ کر لمبی لمبی دعاؤں میں ڈوبے تھے اور میں نے سوچا اب ریڈیو لگا کر ان کی دعا کیوں خراب کروں۔

عطا : کیا دعا مانگ رہے تھے انکل ؟

توفیق : (ایک دم گھبرا کر) بس یہی .... یہی کہ ..... پاکستانی فوج جلدی غرق ہو۔

سلطانہ : (جلدی سے) تو تمہاری ممی سے سننے کے بعد ہم نے ریڈیو کی سوئی خوب گھمائی۔ مگر کہیں سے خبر ہی نہیں ملی۔ آسٹریلیا ریڈیو۔ بی بی سی۔ ماسکو ریڈیو کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ حتیٰ کہ ساڑھے پانچ بجے پاکستان ریڈیو نے بھی کوئی خبر نہ دی۔

عطا : (نفرت سے پاؤں زمین پر مارتے ہوئے) دھت تیرے ریڈیو کی ایسی تیسی۔ وہ سالے کس منہ سے خبر دیں گے۔ وہ پٹائی کی ہے ہم نے کہ .......

سلطانہ : (بات کاٹ کر) یہ تو اب چھ بجے انڈیا ریڈیو سے سنا۔ کہ ریس کورس ......

عطا : (جوش سے بات کاٹ کر) انکل آپ کو پتہ ہے ہم نے تو آج ساڑھے بارہ بجے ڈھاکہ ریڈیو سٹیشن پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیا تھا۔

توفیق : (دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے) اچھا وہ کیسے۔ تمہیں کب پتہ چلا تھا۔

عطا : (جوش سے پہلو بدلتا ہے) مجھے تو صبح ہی پتہ چل گیا تھا۔ کوئی گیارہ بجے۔ میرا ایک ساتھی سائیکل پہ آیا۔ اور مجھے ساتھ لے گیا۔ میں نے جانے سے پہلے ممی اور ڈیڈی کو بتا دیا تھا۔

توفیق : پہلے آ کر ہمیں بھی بتا دینا تھا۔ اچھی خبر تو تم نے اپنے پاس رکھ لی۔

عطا : میں جلدی میں تھا۔ وہ مجھے بلانے آیا تھا۔ بس میں نے سائیکل اٹھائی اور بھاگ لیا۔

توفیق : تو کیا ہوا دونوں گھروں کی ساتھ ساتھ ہی تو دیوار ہے۔ ادھر بھی آواز دے دیتے۔

عطا : نہیں انکل مجھے بھی تو یقین نہیں تھا نا۔ اور پھر مجھے بلایا بھی تو فوراً تھا نا۔

توفیق : کس نے بلایا تھا ؟

عطا : (تالی بجا کر زور سے ہنستا ہے) آپ کو تو اندازہ بھی نہیں ہوگا۔ میں مکتی باہنی میں شامل ہو گیا تھا۔ انہوں نے بلایا تھا۔

**توفیق:** (حیرت سے) اچھا وہ کب سے؟ (سلطانہ بھی حیرت سے بیٹا دیکھتی ہے)

**عطا:** (خوشی دباتے ہوئے) بس کوئی دو ماہ سے۔ اور چپکے چپکے بڑی رازداری سے ٹریننگ کر رہا تھا۔

**سلطانہ:** تو تم نے جنگ میں بھی حصہ لیا تھا۔

**عطا:** نہیں آنٹی یہی تو افسوس ہے۔ پچھلے ہفتے میں نے مشین گن اور ہینڈ گرینیڈ کا کورس ختم کیا۔ مگر کرفیو کی وجہ سے سب دھرا رہ گیا۔ دو ہفتے بعد مجھے اور ٹریننگ کے لئے بلایا جانا تھا۔ اور اگلے مہینے کسی مہم میں حصہ لینا تھا۔ مگر جنگ ہی ختم ہو گئی اور میں ایک پاکی بھی نہ مار سکا۔

**سلطانہ:** (بے ساختگی سے) ہائے ہائے کیوں مارو کسی کو؟

**عطا:** (تیزی سے سلطانہ کی طرف مڑتا ہے اور حیرانی سے پوچھتا ہے) کیا مطلب آنٹی؟

**سلطانہ:** (توفیق کی طرف دیکھتی ہے تو وہ اسے تیز نظروں سے گھورتا ہے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کرتا ہے۔ وہ گھبرا کر جلدی سے کہتی ہے) میرا مطلب ہے اتنی چھوٹی تو تمہاری عمر ہے۔ تم کیسے کسی کو مار سکو گے؟

**عطا:** (تن کر سیدھا ہو بیٹھتا ہے) مجھے چھوٹا نہ کہیے آنٹی۔ سترہ برس کا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور عمر سے کیا ہوتا ہے۔ دلیری چاہیے دلیری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آئے تو کوئی سامنے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک چھوڑ دس آ جائیں۔ سب کو مشین گن سے لٹا دوں گا۔ اس طرح۔ ۔ ۔ (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے مشین گن پکڑنے کی پوزیشن بنا کر خیالی مجمع پر فائرنگ کرتا ہوا آہستہ آہستہ گھومتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی منہ سے مشین گن کی فائرنگ کی آواز نکالتا ہے ٹھی ٹھی ٹھی ٹھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔) (پھر بچگانہ جوش سے) ایک ادھر گرے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرا ادھر۔ ۔ ۔ ۔ یہ مارا وہ مارا۔ (جب فائرنگ کے دوران اس کا چہرہ دوسری طرف مڑتا ہے تو سلطانہ مسکرا کر خاوند کی طرف دیکھتی ہے۔ مگر وہ بے صبری سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور گھورتا ہے۔)

**توفیق:** (جلدی سے) شاباش بیٹا۔ اسی دلیری سے تو بنگلہ دیش بنا ہے۔

**عطا:** (ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر تاسف کے انداز میں زور سے مکا مارتے ہوئے) بس انکل یہی افسوس ہے کہ سچ مچ کی گن چلا کر سچ مچ کا پاکستانی نہیں مارا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے ہاتھوں سے خون نہیں گرایا۔ کسی کی لاش کو اپنی گولی کھا کر تڑپتے نہیں دیکھا۔ (تیزی سے پہلو بدل کر) مگر میں ابھی بھی تاک میں ہوں۔ کوئی اکا دکا پھنس گیا تو بائی گاڈ (ہاتھ سے گردن اتارنے کا اشارہ کرتے ہوئے منہ سے تیز سی سیٹی بجاتا ہے اور پھر سر جھکا کر اسی خیال کی شدت میں رومانی انداز میں کھو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہیلی کوپٹر کی آواز قریب آ رہی ہے) انکل!! ہندوستانی ہیلی کوپٹر!!

**توفیق:** اچھا یہ ہندوستانی ہے۔

**عطا:** کمال ہے انکل آپ کو پتہ ہی نہیں۔ آج تو دوپہر کے بعد کتنے ہی ہیلی کوپٹر اڑتے رہے ہیں۔ ادھر ادھر۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ اور آپ نے دیکھا ہی نہیں۔

**توفیق:** آواز تو سنتے رہے ہیں۔ مگر کمرے سے باہر نہیں نکلے۔

عطا : اللہ قسم - پہلی کو پتہ دیکھ کر ہندوستانیوں پہ پیار آتا تھا - ہمارے اصل دوست نکلے یہ ۔ (توفیق جواب نہیں دیتا - کمرے میں چند ثانیے بے چین اور بوجھل سی خاموشی رہتی ہے اور پھر کچھ فاصلے پر مشین گن کا فائر ہوتا ہے - )

عطا : (اچھل پڑتا ہے) دیکھا انکل پاکستانیوں کو مار رہے ہیں - (بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) سالے مجھے موقع ہی نہیں دیتے - ورنہ میں انہیں دکھاتا کہ کیسے مارتے ہیں -

توفیق : تمہاری تو ابھی ٹریننگ ہی مکمل نہیں ہوئی -

عطا : (تیزی سے توفیق کی طرف مڑتے ہوئے) انکل آپ کو پتہ ہے - انہوں نے کہا تھا - کہ ہندوستان سے ٹریننگ کے بعد وہ مجھے پہلا کام یہ دیں گے کہ کسی بلڈنگ یا پہاڑی سے پاکستانی فوجی کانوائے پر گولی چلاؤں . . . . . بائی گاڈ . . . . بائی گاڈ . . . ایک دفعہ چانس دیتے - سالا کانوائے بھک سے اُڑا دیتا (سے توبی سے ادھر ادھر دیکھتا ہے - اور پھر اچھل کر گھٹنوں کے بل صوفے کی کرسی پر چڑھ جاتا ہے - اس طرح کہ اس کا منہ کرسی کی پشت کی طرف ہے - گھٹنے سیٹ اور ٹیک کے جوڑ میں اٹکے ہیں - پنڈلیاں پیچھے کی طرف سیٹ پہ پھیلی ہیں - اور وہ کرسی کی ٹیک کے پیچھے آڑ سے کر دیوار کی طرف نشست بنا لیتا ہے) ڈزگ ڈزگ ٹھک ٹھک (سلطانہ پھر مسکراتی ہے مگر توفیق گھور کر چپ کر جاتا ہے - )

توفیق : پاکستانی فوجی تو اب سارے قیدی بن جائیں گے - اس لئے تم اپنے جوش اور دلیری کو بنگلہ دیش کی تعمیر کے لئے لگاؤ -

عطا : اس کے لیے تو ابھی ساری عمر پڑی ہے - انکل - مگر میں تو ابھی کچھ کرنا چاہتا ہوں - . . . . ابھی . . . . چلو پاکستانی فوجی نہیں قابو آئے - تو نہ سہی - مگر میں صلاح الدین کو نہیں چھوڑوں گا - وہ تو قابو آئے گا ہی -

سلطانہ : صلاح الدین کون ہے ؟

عطا : میرا کلاس فیلو تھا ، کالج میں آنٹی - وہ البدر کا رضا کار بن گیا تھا - اور اب پاکستانی فوج کے ساتھ مل کر لڑ رہا تھا - . . . . سالا . . . . غدار . . . . بے ایمان -

سلطانہ : تمہارا اچھا واقف تھا -

عطا : واقف ؟ آنٹی ہم دونوں اکٹھے بیٹھتے تھے - نہ صرف اب فرسٹ ایئر میں بلکہ سکول میں بھی پانچویں کلاس سے دسویں کلاس تک ہم ایک ہی بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں - میرا بہت اچھا دوست تھا . . . . . مگر اب . . . . مگر اب !!! . . . اب دوستی ووستی سب ختم . . . . . میں تو اب اسے دشمن سمجھتا ہوں . . . . جانی دشمن . . . . اس نے پاکستانیوں سے تعاون کر کے بنگلہ خون کی توہین کی ہے - میں اسے اس توہین کا مزہ چکھاؤں گا - . . . . آج کل میں حالات ذرا ٹھیک ہو لیں - میں اس کے گھر جا کر اس کے ماں باپ کے سامنے اس کو گولی ماروں گا - . . . . لفنگا . . . . . غدار . . . . . پاکستانی ایجنٹ . . . . (جیب سے ریوالور نکال کر دکھاتا ہے) دیکھئے اس سے ماروں گا سالے کو - . . . . اور اگر ماں باپ نے کچھ کہا تو ان کو بھی (جوش میں ریوالور تان لیتا ہے - اتفاق سے اس کا رخ سلطانہ کی طرف ہے - سلطانہ اور توفیق سن ہو کر رہ جاتے ہیں - ان کے رنگ اڑ جاتے ہیں - ) . . . . . دو تین ثانیے ایسے ہی گزرتے ہیں - اور پھر باہر سے آواز آتی ہے " عطا . . . . . او . . . . عطا " (عطا اپنے موڈ سے چونکتا

ہے۔ اوہ۔ یاد آیا (جیب میں ٹٹولتے ہوئے کہتا ہے) اوہ ممی بلا رہی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ مٹھائی دے کر جلدی آنا۔ (اٹھتے ہوئے)
اچھا آنٹی میں چلتا ہوں مجھے اور جگہ بھی مٹھائی لے کر جانا ہے۔

سلطانہ: (سنبھل کر) اچھا عطا اپنی ممی کو سلام کہنا۔

عطا: (جاتے جاتے) وہ آئیں گی یہاں تھوڑی دیر میں۔ ڈیڈی اور وہ دونوں کہہ رہے تھے کہ ہم جائیں گے۔

سلطانہ: (اس کے جاتے ہی سینے پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔ اور اطمینان کا سانس لیتی ہے) ہائے اللہ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔

توفیق: (اٹھ کر ریڈیو کی سوئی گھما دیتا ہے۔ اور واپسی پر کہتا ہے؟) ہوں!! ڈرنا ہی چاہیے۔ ...... قتل و غارت کے متعلق جس شخص کے تصورات رومانی ہو جائیں۔ اس سے ڈرنا ہی چاہیے۔

سلطانہ: یہ تو ضرور کسی دن مار ڈالے گا۔

توفیق: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) مار تو ڈالے گا۔ مگر ...... ابھی بچہ ہے۔ نہ معلوم کسی کو مرتا بھی دیکھ سکے گا یا نہیں۔

سلطانہ: کیوں؟؟

توفیق: تڑپتی لاش کا نظارہ آسان کام نہیں سلطانہ ..... اس کے لئے فولادی اعصاب کی ضرورت ہے۔

سلطانہ: مگر نفرت اعصاب کو سختی سکھا دیتی ہے۔ اور پروپیگنڈے نے اس کو بہت نفرت سکھائی ہے۔

توفیق: ٹھیک ہے۔ مگر نفرت کی پہنچ وار کروانے تک ہے .... ایک دفعہ ہاتھ وار کر دے اور نفرت کا شکار خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ تو دوسری نفسیاتی کیفیات ابھر آتی ہیں ..... نفرت اور پچھتاوا پرانے ہمسائے ہیں۔

سلطانہ: میں نے تو سمجھا کہ وہ مجھے گولی مارنے لگا ہے۔ شاید مجھے روتے دیکھ کر اس کو شک پڑ گیا تھا۔

توفیق: (تھوڑے توقف بعد) سلطانہ ..... (وہ اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔) میرا خیال ہے ..... ہم بھی مٹھائی بانٹ دیں۔

سلطانہ: (تھوڑا سوچ کر) مجھے تو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ہم کیوں بانٹیں۔

توفیق: چونکہ خوشی نہیں ہوئی۔ اس لئے بانٹنا ضروری ہے۔ (سلطانہ حیرانی سے دیکھتی ہے) لوگوں کو ہماری موجودہ ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں ہونا چاہیے۔

سلطانہ: مگر یہ ذہنی کیفیت تو عارضی ہے۔ ہمیں پاکستان ٹوٹنے کا صدمہ ضرور ہے۔ مگر ہم نے کب کہا کہ ہم اب بنگلہ دیش کے وفادار نہیں رہیں گے۔ ہمارے آئندہ طرز عمل سے لوگوں کو یقین ہو جائے گا۔ کہ ہم اس ملک کے مفاد کے خلاف نہیں ہیں۔

توفیق: آئندہ!! (طنز سے نیم ہنسی ہنستا ہے) آئندہ ... تمہیں آئندہ کی مہلت کون دے گا سلطانہ مستقبل میں قدم رکھنے سے پہلے تمہیں عطا جیسے لاکھوں نوجوانوں سے پالا پڑے گا۔ جو تمہارے ماضی کے ہر ہر لمحے کی تلاشی لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ (کمرے میں ٹہل کر ایک دو چکر لگاتا ہے۔) شاید ہمارے لئے مستقبل کوئی بھی نہ ہو ..... صرف حال ہو ..... لمبا اور تکلیف دہ حال۔ جو ماضی کے سائے سے باہر نہیں نکل سکتا ..... اسی حال کا تقاضا ہے۔ کہ ہم مٹھائی بانٹیں۔ مبارک باد دیں۔ جے بنگلہ کے نعرے لگائیں۔ اپنے چہرے پر دوسرے چہرے لگائیں۔ پاکستان کی یاد میں بہنے والے آنسوؤں پر نئے وطن کی خوشی کا لیبل لگائیں ..... ہم وقت

کو آنا تھا ادھوکا دیں کہ خود اس دھوکے میں گم ہو جائیں۔ (ایک دم رک کر) دروازہ کھٹکا تھا؟
(دونوں چند لمحے خاموش رہ کر سنتے ہیں۔ مگر کوئی آواز نہیں آتی۔)
سلطانہ: نہیں۔ کوئی نہیں۔...... تو کل مٹھائی بانٹ دیں گے۔
توفیق: کل نہیں آج۔ سجدہ وقت پر نہ کیا جائے۔ تو دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ سر پھر رہا ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔
سلطانہ: مگر آج کون سی دکان کھلی ہوگی؟
توفیق: کوئی نہ کوئی ضرور کھلی ہوگی۔ اتنے دنوں سے کرفیو اور بمباری نے لوگوں کا روزگار بند کیا ہے۔ وہ کھونے کے لیے بے تاب ہوں گے۔
سلطانہ: مگر یہ کوئی حالات ہیں باہر جانے کے۔ ہر طرف خطرے ہیں۔
توفیق: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) بس یہ ریوالور ساتھ لیے جاتا ہوں۔ اس کا خیال ہی خطروں کو بہلاتا رہے گا۔ (ریوالور نکال کر جیب میں ڈال لیتا ہے اور دروازے کی طرف بڑھتا ہے) تم اندر سے کنڈی لگا لینا۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔
(توفیق جیسے ہی دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگتا ہے۔ دو آدمی دروازہ دھکیل کر اندر گھس آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے گرد کمبل لپیٹے ہیں۔ اور کمبل ہی کے پلو سے سر ڈھانک رکھا ہے۔ صرف آنکھیں اور ناک ہی باہر ہیں۔ کمبل کمر تک ہے اور نیچے پتلونیں نظر آ رہی ہیں۔ پاؤں سے ننگے ہیں۔)
توفیق: (گھبرا کر) کون ہو تم؟ (ایک دم دو تین قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور ان کی طرف کر دیتا ہے۔ سلطانہ چیخ مار کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ایک آدمی کی دبی دبی آواز کمبل میں سے آتی ہے "گولی نہ چلائیے جناب۔ ہم دشمن نہیں دوست ہیں۔" توفیق ذرا سختی سے کہتا ہے) اگر کوئی ہتھیار تمہارے پاس ہے تو زمین پر پھینک دو۔
وہی آواز: نہیں جی۔ کوئی ہتھیار نہیں ہے۔
توفیق: کمبل اتار کر پھینک دو۔ اور ہاتھ اوپر کر لو۔
(دونوں جلدی جلدی کمبل اتار کر ایک طرف اچھال دیتے ہیں۔ ان میں ایک تو تخت پوش پر جا گرتا ہے۔ اور دوسرا ان کے اور تخت پوش (دیوان) کے درمیان فرش پر جا گرتا ہے۔ پھر وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیتے ہیں۔ دونوں شکل سے مغربی پاکستانی نظر آتے ہیں۔ رمضان قدرے لمبا ہے اور غلام رسول درمیانے قد کا ہے انہوں نے خاکی پتلون اور اوپر بھوری جرسیاں پہنی ہیں۔)
رمضان: آپ بے شک ہماری تلاشی لے لیں۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔
توفیق: (غور سے ان کو دیکھتا ہے اور پھر پوچھتا ہے) ویسٹ پاکستانی ہو؟
رمضان: جی سر۔
توفیق: فوج کے یا پولیس کے؟
دونوں: (ایک ساتھ) پولیس کے۔

**توفیق:** یہاں کیوں آئے ؟

(وہ دونوں جھجک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں پھر رمضان کہتا ہے۔)

**رمضان:** سر پناہ لینے۔

**توفیق:** (حیرت سے) پناہ لینے ؟ ... تمہیں کیسے خیال ہوا کہ یہاں پناہ مل جائے گی ؟

**رمضان:** آپ کو میں نے اپنے افسروں کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ اور ہمیں علم ہے کہ آپ ہمارے خیر خواہ ہیں۔

**توفیق:** اور تمہیں میرے گھر کا کیسے پتہ چلا ؟

**غلام رسول:** سر میں عید سے اگلے روز دفتر سے آپ کے لیے کچھ کاغذات لایا تھا۔ آپ نے پہچانا نہیں مجھے ؟

**توفیق:** (غور سے اس کی طرف دیکھتا ہے) نہیں۔ میں نے نہیں پہچانا۔

**غلام رسول:** سر میں خود لایا تھا۔ ..... دوپہر کا وقت تھا۔

**توفیق:** واقعی لائے تھے یا کہیں سے سن لیا ہے ۔

**غلام رسول:** (جوش سے) سر میں نے آپ کے ہاتھوں میں دیئے تھے۔ آپ باہر لان میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ اور اخبار پڑھ رہے تھے۔

**توفیق:** میں اکیلا تھا یا میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا ۔

**غلام رسول:** نہیں سر آپ اکیلے تھے۔ مگر ساتھ والے لان میں چند بچے کھیل رہے تھے۔ اور جب میں آپ کے پاس تھا۔ تو ان کی گیند بھی ادھر آ کر گری تھی۔ اور بچے شور کرتے ہوئے اسے پکڑنے آئے تھے ۔

**توفیق:** (ان کو تیز نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ پستول پیچھے کر کے جیب میں ڈالنے لگتا ہے مگر ہچکچاہٹ کے عالم میں باہر نکال کر ہاتھ میں ہی رکھتا ہے۔ مگر اب اس کا رخ ان کی طرف نہیں ہے) تم لوگ اپنی فورس کے ساتھ کیوں نہیں ہو ؟

**رمضان:** ہماری رات کی ڈیوٹی تھی سر۔ جو صبح دس بجے ختم ہوئی۔ جیپ ذرا دیر سے آئی۔ ہم اس میں بیٹھ کر لائن کی طرف چلے۔ تو وہ خراب ہو گئی۔ کافی دیر ڈرائیور کوشش کرتا رہا۔ جب ٹھیک نہ ہوئی۔ تو ہم دونوں پیدل ہی چل دیئے۔ ہم نے سوچا۔ کرفیو میں کیا خطرہ ہوگا۔ ہمیں تو پتہ نہیں تھا کہ سرنڈر (SURRENDER) ہو گیا ہے۔ اتنے میں دیکھا تو اکا دکا گاڑیاں اور سائیکلیں نظر آنے لگیں۔ ..... ہم نے سمجھا کہ کرفیو تھوڑی دیر کے لئے ہٹا ہو گا۔ جس طرح کل دو گھنٹے کے لئے اٹھایا گیا تھا... ... اتنے میں ایک کار نظر آئی۔ ہم نے ہاتھ دے کر اسے روکا۔ اور کار والے سے کہا۔ کہ ہمیں پولیس لائن تک لے چلے۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ مگر وہ ہمیں دھان منڈی کے ایک گھر میں لے گیا۔ چائے پلانے کے بہانے ہمیں نیچے اتارا اور اچانک دو چار لوگوں نے مل کر ہمیں قابو کر لیا۔ پھر انہوں نے ہماری رائفلیں بھی چھین لیں۔ گھڑیاں بھی اتار لیں۔ پیسے بھی چھین لئے اور بتایا کہ سرنڈر ہو گیا ہے۔ شہر میں ہندوستانی فوج آگئی ہے۔ اگر سلامتی چاہتے ہو تو چپکے سے یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ ہم ابھی تمہیں قتل کرتے ہیں ..... تو ہم وہاں سے بھاگے۔

**توفیق:** اب تک کہاں رہے ؟

۔ہم وہاں سے نکل کر مین روڈ پر آئے۔ تو آگے سے تیس چالیس لوگ جلوس بنا کر جے بنگلہ کے نعرے لگاتے آ رہے تھے ان میں سے چند ایک کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ ہم جلدی سے ایک کوٹھی کے پتوں کی باڑ میں چھپ گئے۔ اور پھر شام تک وہیں دبکے رہے۔......

رسول : دو تین دفعہ ہم نے نکلنے کی کوشش بھی کی۔ مگر جلوس گزرنے کے بعد اور لوگ بھی گھروں سے نکل آئے تھے۔.....

ن : (بات کو کاٹ کر) ہم تو جناب مغرب کے اندھیرے کے بعد باہر نکلے۔ ابھی کافی لوگوں نے بلیک آؤٹ کیا ہوا ہے۔ اس لئے زیادہ روشنی نہ تھی۔

رسول : (بات کاٹ کر) ہم تو جی چھاؤنی کی طرف چلے تھے۔ مگر سڑک پر کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ اس لئے میں رمضان کو لے کر ادھر آ گیا۔

ں : تمہارے جوتے کہاں گئے؟

ان : وہ تو جی وردی کے بوٹ تھے۔ صاف پہچانے جاتے تھے۔ کہ فوج یا پولیس کے ہیں۔ اس لئے ہم نے خود ہی اتار کر کمبل کے کونے میں باندھ لئے۔ (کمبل اٹھا کر دکھاتا ہے جس کے کونے میں کچھ بندھا ہوا ہے)

ں : (پستول جیب میں ڈالتے ہوئے) اب کیا چاہتے ہو؟

ان : ہم بنگالیوں کے ہاتھ میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہمیں ایک دو دن یہاں پڑا رہنے دیں۔ پھر جیسے ہی موقع بنے گا ہم چھاؤنی چلے جائیں گے۔

رسول : یا اگر کوئی ہندوستانی فوجی ادھر آئے تو آپ ہمیں ان کے حوالے کر دیں ......

انہ : (ایک دم بول پڑتی ہے) اور سب کو ثابت کر دیں کہ ہم نے پاکستانیوں کو چھپایا ہوا تھا۔

(رمضان اور غلام رسول دونوں چونک کر سلطانہ کو دیکھتے ہیں۔ جیسے پہلی دفعہ اس کی موجودگی سے باخبر ہوتے ہوں۔)

انہ : (ایک قدم آگے آ جاتی ہے) بھائی صاحب! آپ لوگ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ سے ہمیں ہمدردی ہے۔ ...... ملک ٹوٹنے کا ہمیں بھی صدمہ ہے...... بہت صدمہ...... ہمارا دل بھی چاہتا ہے کہ آپ کی مدد کریں...... مگر...... ہم کر نہیں سکتے۔

م رسول : (سہم کر) آپ کا مطلب ہے کہ ...... (خاموش ہو جاتا ہے)

لطانہ : (نگاہیں چراتے ہوئے) آپ کو پناہ دینا ہمارے لئے ...... ممکن نہ ہوگا۔ ...... (دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے ہیں۔)... .... آپ ہمیں غلط نہ سمجھیں ...... ہم آپ کے خیر خواہ ہیں۔ ...... ہمیں آپ سے ہمدردی ہے۔...... مگر...... مگر... ہم مجبور ہیں۔

مضان : (نرمی سے) ہم سے بھی زیادہ مجبور بیگم صاحبہ؟

لطانہ : بہت مجبور...... واقعی بہت مجبور۔

**رمضان:** آپ لوگ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔۔۔۔ اپنے ملک میں ہیں۔۔۔ اور مجبور ہیں۔۔۔۔ ہم لوگ گھر سے سینکڑوں میل دور ہیں دشمن بندوقیں لئے کر ہر طرف ہماری تلاش میں ہے۔ اور آپ ہمیں مجبور نہیں سمجھتیں۔

**سلطانہ:** سمجھتی ہوں۔۔۔ اور یہ بھی سمجھتی ہوں کہ آپ کا بچنا بہت مشکل ہے۔۔۔۔ بلکہ ناممکن ہے۔۔۔۔ موت آپ کا مقدر ہو چکی ہے۔۔۔ اگر آپ یہاں رہیں گے تو ہمیں بھی آپ کے مقدر میں شریک ہونا پڑے گا۔۔۔۔ آپ کی مجبوری یہ ہے کہ حالات ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ جو تھوڑے سے حالات ہمارے موافق ہیں۔ ان کو ہاتھ سے نکلنے نہ دیں۔۔۔۔ آپ کی مجبوری لاعلاج ہے مگر ہماری نہیں ہے۔۔۔ آپ کے لئے کوئی امید نہیں مگر ابھی تک ہمارے بچنے کی کچھ امید ہے۔ شاید ہمارا ماضی لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ یا شاید وہ اسے بھول جانے پر آمادہ ہو جائیں۔۔۔۔ آپ کو پناہ دے کر ہم وہ تھوڑی سی امید ختم نہیں کرنا چاہتے۔ (بوجھل سی خاموشی طاری ہو جاتی ہے)

**غلام رسول:** مگر ہم کہاں جائیں۔ باہر تو چھوٹے چھوٹے چھوکرے بھی سٹین گن اٹھائے گھوم رہے ہیں۔

**رمضان:** (غلام رسول کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) غلام رسول! بیگم صاحب کی باتیں ٹھیک ہیں۔۔۔۔ چلو چلیں۔

**غلام رسول:** ہم کیسے جا سکتے ہیں رمضان۔ باہر کے حالات تو تم دیکھ ہی آئے ہو۔

**رمضان:** خدا پر بھروسہ رکھیں گے۔ اندھیرے کا سہارا لیں گے۔۔۔۔ پہلے بھی انہی دونوں نے مدد کی ہے اب بھی یہی کریں گے۔

**غلام رسول:** (گھبرا کر) نہیں۔۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔۔۔ خدا نے دشمن کو فتح دی ہے اور اندھیرا دشمن کو چھپا کر ہمارے قریب لے آئے گا۔ مجھے دونوں پر بھروسہ نہیں ہے۔

**رمضان:** کیسی باتیں کرتے ہو غلام رسول۔ سپاہی کا کام حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔۔۔۔ جیسے بھی حالات ہوں۔

**غلام رسول:** (رمضان کی طرف خفگی سے دیکھتا ہے) میں بھی مقابلہ ہی کر رہا ہوں۔ اسی لئے اس محفوظ ٹھکانے کو چھوڑ کر موت کے منہ میں نہیں جاؤں گا۔۔۔۔ تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔۔۔۔ مگر جاؤ گے کہاں؟۔۔۔۔ یہاں کون ہمارا بیٹھا ہے؟

**رمضان:** اندھیرے میں چھاؤنی تک پہنچ ہی جائیں گے۔

**غلام رسول:** مگر چھاؤنی تو یہاں سے تین میل دور ہے۔

**رمضان:** اور رات بھی تو کافی لمبی ہے (غور سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔۔۔۔ فاصلے پر رائفل کے چند فائر ہوتے ہیں۔ غلام رسول سہم کر سکتا ہے۔ اور پھر نفی میں سر ہلا دیتا ہے۔

**غلام رسول:** میں نہیں جاؤں گا۔

(رمضان چند لمحے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر توقف اور بعد ازاں سلطانہ کی طرف دیکھتا ہے جو خود بھی غور سے غلام رسول کو دیکھ رہی ہے۔)

**سلطانہ:** آپ کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہے میں کرنے کو تیار ہوں۔ روپیہ کی ضرورت ہو تو وہ لے لو۔ کھانا لے لو۔ گرم کپڑے لے جاؤ۔ جو چاہتے ہو میں حاضر کر دوں گی۔ اس لیے کہ میں آپ لوگوں کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں تو صرف اتنی درخواست کرتی ہوں کہ آپ ہمیں خطرے میں نہ ڈالیں اور یہاں سے کسی اور جگہ چلے جائیں۔

**غلام رسول:** بیگم صاحب۔ ہم ضرور چلے جاتے اگر ہمارے پاس کوئی محفوظ جگہ ہوتی۔

**سلطانہ:** (فوراً سختی سے) اور آپ کو یہ کیسے یقین ہے کہ یہ جگہ محفوظ ہے۔ (اندر سے ان کے چہروں کو دیکھتی ہے) جان کا خطرہ اگر آپ کو بے خوف اور خود غرض بنا سکتا ہے۔ تو ہمیں بھی بنا سکتا ہے۔ موت کے سائے تلے ہر ایک کا ایمان ڈول سکتا ہے۔

۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو پناہ دینے کے بعد کوئی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دے۔ کہ آپ کو مکتی بھاہنی کے حوالے کر کے ہم اپنا مستقبل بچائیں۔ (غلام رسول یہ بات سن کر سن سا ہو جاتا ہے۔ رمضان سہم جاتا ہے۔ دو چار لمحے وہ سلطانہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر رمضان غلام رسول کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے کہتا ہے)۔

**رمضان:** غلام رسول ..... چلتے ہو؟؟

(باہر فاصلے پر شین گن کا فائر ہوتا ہے۔ غلام رسول پہلے اسے سنتا ہے پھر بڑی آہستگی سے اثبات میں سر ہلاتا ہے۔

...... پھر سلطانہ آگے بڑھ کر زمین پر گرا ہوا کمبل اٹھا کر دیتی ہے۔ جو وہ اس طرح پکڑ لیتا ہے۔ جیسے وہ نیند کی حالت میں ہو۔ پھر وہ تخت پوش پہ سے دوسرا کمبل اٹھانے لگتی ہے۔ مگر توفیق اس پر اپنا پاؤں رکھ دیتا ہے)

**توفیق:** ٹھہرو سلطانہ۔ یہ لوگ مصیبت میں ہیں۔ انھیں باہر مت بھیجو۔

**سلطانہ:** (حیرت سے خاوند کی طرف دیکھتی ہے) مگر ہم بھی تو مصیبت میں ہیں۔

**توفیق:** ٹھیک ہے۔ مگر ان کی مصیبت بڑھانے سے ہماری مصیبت گھٹ نہیں سکتی۔ باہر جانے میں ان کی موت یقینی ہے مگر ہماری حالت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

**سلطانہ:** فرق کیسے نہیں پڑے گا۔ اگر یہ یہاں ہیں۔ تو ہمیں خطرہ ہے اور اگر یہ یہاں نہیں ہیں تو ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔

**توفیق:** (طنز سے) کوئی خطرہ نہیں۔؟؟ ہونہہ ..... سلطانہ ماضی کو مت بھولو ...... ماضی ہمارا سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ہمارا ماضی پاکستان کے سبز رنگ میں رنگا ہے۔ اس کا ہر ہر لمحہ ہم پر پاکستان دوستی کا الزام لگا رہا ہے۔ ہمارا خطرہ پچھلے الزامات کی لمبی فہرست ہے۔ ان کو پناہ دے کر ہم اس فہرست میں فقط ایک الزام کا اضافہ کر رہے ہیں ...... صرف ایک اور الزام ...... ان کو باہر دھکیل کر ہم اس ایک الزام سے تو بچ سکتے ہیں۔ مگر باقی فہرست جلاد کے ہاتھوں میں ہی رہے گی۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ ان بے چاروں کے خون سے ہم اپنے ماضی کا سبز رنگ دھو سکتے ہیں۔ تو یہ غلط ہے۔

**سلطانہ:** مگر تھوڑی دیر پہلے تو آپ خود ہی کہہ رہے تھے۔ کہ ہمیں احتیاط کرنی چاہیے اور لوگوں کو دھوکا دینا چاہیئے۔

**توفیق:** (بات کاٹ کر) ہاں لوگوں کو ..... میں نے لوگوں کو دھوکا دینے کو کہا تھا! اپنے آپ کو دھوکا دینے کو کہا تھا۔ مگر خدا کو دھوکا دینے کو نہیں کہا تھا ..... میں جانتے بوجھتے ہوئے ان بے گناہوں کو اپنے ہاتھ سے موت کے منہ میں کیسے دھکیل دوں۔ ابھی تک ہم پاکستان دوستی کی وجہ سے صرف بنگلہ دیش کے مجرم ہیں۔ مگر اب میں انسان دشمنی سے خدا کا مجرم نہیں بننا چاہتا ..... کیا فائدہ ہماری نمازوں کا۔ اگر ہم مصیبت میں کسی کی مدد نہ کر سکیں۔

سلطانہ : اور اگر کسی کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا ؟

توفیق : خدا پہ بھروسہ رکھو۔ اور کوشش کرو۔ کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ اگر ہم .....

(دروازے پر دستک اور ساتھ عبدالسلام کی آواز " توفیق صاحب ..... سب گھبرا جاتے ہیں ؟ )

سلطانہ : ہائے اللہ یہ تو سلام صاحب آگئے۔

(توفیق بے صبری سے ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ پھر غلام رسول کا ہاتھ پکڑ کر دائیں دروازے کی طرف ایک دو قدم گھسیٹتا ہے۔ پھر اسے دھکا دے کر دروازے میں دھکیل دیتا ہے۔ رمضان بھی پیچھے پیچھے ہے توفیق اُسے بھی اندر دھکیلتا ہے۔ اس اثنا میں دروازہ ایک دو دفعہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ توفیق جاکر وہ دروازہ کھولتا ہے۔ سلام اور نسرین اندر آتے ہیں۔)

سلام : توفیق بھائی۔ کہاں غائب تھے ؟

توفیق : معاف کیجئے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں اندر والے کمرے میں تھا۔ آتے آتے دیر ہوگئی۔

نسرین : سلام تو کہہ رہے تھے۔ شاید ابھی سے سو گئے ہوں۔ اتنے عرصے کی پریشانی کے بعد پہلی رات سکون کی آئی ہے۔

توفیق : آیئے بیٹھئے ہیں۔ یہ تو خوشیوں کی رات ہے۔ بھابی۔ آزادی کی پہلی رات۔ ابھی سے کون سو سکتا ہے۔

(کمرے میں آکر سب بیٹھ جاتے ہیں۔)

توفیق : آپ لوگ خوب وقت پر آئے۔ ورنہ میں تو ابھی بازار جا رہا تھا۔

نسرین : بازار ؟ .... اس وقت ؟

توفیق : ہاں میں نے سوچا ذرا مٹھائی وغیرہ لے آئیں۔ خوشی کا موقع ہے۔

سلطانہ : میں تو کہہ رہی تھی۔ نہ جائیں۔ آج کون سی دکان کھلی ہوگی۔

سلام : نہیں بعض جگہ کوئی کوئی دکان کھل گئی ہے۔ عطا بتا رہا تھا۔ کہ نیو مارکیٹ تو بند ہے۔ مگر نواب روڈ پر چند دکانیں کھل گئی ہیں۔ ادھر ہی سے تو وہ مٹھائی لے کر آیا تھا۔

توفیق : جہاں جہاں دکاندار اوپر رہتا ہوگا۔ اسے نیچے آکر کھولنے میں کتنی دیر لگے گی۔

سلام : اوپر رہتا ہوگا۔ یا قریب ہی رہتا ہوگا۔

سلطانہ : شکر ہے دکانیں کھلیں۔ ورنہ پچھلے چار پانچ روز میں تو بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ نہ دودھ۔ نہ سبزی۔ نہ گوشت۔ جو چند چیزیں خرید کر رکھی تھیں۔ وہ بھی ختم ہوگئیں۔

سلام : (ہنس کر) تو بھئی مارے گئے۔ ہم نے سوچا تھا۔ آپ کے ہاں چل کر چائے پیتے ہیں۔ اور آپ کہہ رہی ہیں۔ دودھ ہی نہیں ہے۔

توفیق : چائے نہیں تو کیا۔ آپ کو بلیک کافی پلائیں گے۔ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ (سب ہنستے ہیں)

نسرین : اس کا مطلب ہے۔ آپ کے ہاں کم از کم پانی تو ہے۔ میں نے آج کئی لوگوں سے فون پہ بات کی تو پتہ چلا کئی بستیوں میں پانی ہی نہیں۔

سلطانہ : (اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھتی ہے) وہ کیوں؟

توفیق : سب شہر کے کئی حصوں پہ دو دن بمباری ہوتی رہی ہو۔ تو کہیں نہ کہیں تو پانی کا نظام تباہ ہونا ہی تھا۔

نسرین : تو یہ تو بہ کیا بمباری تھی۔ ہماری اوپر والی کھڑکی پرلی طرف کو ہے نا۔ اس میں سے ہم جہاز دیکھتے رہے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے سینما ہال میں پردے پر بمباری دیکھ رہے ہیں۔

سلام : جب وہ راکٹ پھینکتے تھے۔ تو جہازوں کے نیچے شعلے صاف نظر آتے تھے۔

نسرین } (ایک ساتھ) { توبہ توبہ۔
توفیق } (ایک ساتھ) { ہاں بالکل صاف نظر آتے تھے۔
سلطانہ } (ایک ساتھ) { اف اللہ۔ مجھے تو خوف آتا تھا۔

سلام : ایمان سے بعض دفعہ حیرت ہوتی تھی۔ کہ سر پہ قیامت برستی رہی ہے اور ہم ابھی زندہ ہیں۔

سلطانہ : (اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے) پتہ چلا کہاں بم گرتے رہے۔

سلام : وہ تو پتہ ہی ہے۔ عظیم پور کے پاس۔ یونیورسٹی میں اور فیل خانے وغیرہ پر راکٹ پھینکتے رہے ہیں۔ جہاں جہاں پاکستانی فوج جاتی تھی۔

سلطانہ : نہیں میرا مطلب ہے کیا کیا نقصان ہوا ہوگا۔

سلام : ہاں نقصان کا ابھی اندازہ نہیں۔ کل صبح ہم شہر کا چکر لگائیں گے۔ پھر ہی کچھ معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے زیادہ نقصان جانی ہی ہوگا۔ پاکستانی فوجیوں کا۔

نسرین : ویسے کمال ہے ان کو اوپر ہوا میں کیسے پتہ چل جاتا تھا کہ یہاں پاکستانی فوجی ہیں۔ سنا ہے وہ تو کرفیو میں دن بھر جگہ تبدیل کرتے رہتے تھے۔

سلام : ہم ہی لوگ خبر دیتے تھے۔ ..... (رک کر) اب تو جنگ ختم ہوگئی ہے۔ بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ گھر میں خود بھی اطلاع دینے والوں میں سے تھا۔ گلی گلی میں وائرلیس سیٹ کام کر رہے تھے۔ ..... ہندوستان کا کام تو ہم لوگوں نے بہت آسان کر دیا تھا۔ ..... اچھا ہے دونوں نے مل کر خبیث پاکستانیوں کا خاتمہ کر دیا۔ (بات کرتے کرتے اس کی نظر کمبل پہ پڑتی ہے۔ تو وہ ذرا غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ توفیق اس کی نظر سے تاڑ جاتا ہے۔ اور اسے پہلی دفعہ غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ کمبل باہر رہ گیا ہے۔ اس لئے سلام کا دھیان ہٹانے کو تیزی سے بات شروع کر دیتا ہے)

توفیق : سلام بھائی عطا کون سی بھاہینی میں شامل ہوا ہے؟

سلام : (توفیق کی طرف دیکھتا ہے۔ مگر بے توجہی سے جواب دیتا ہے۔ جیسے ذہن میں کچھ سوچ رہا ہو۔ اس کے بعد کی باتوں کے دوران میں اس کی نظر بار بار کمبل پہ پڑتی ہے۔ مکتی بھاہینی۔

**توفیق:** (بے چینی سے پہلو بدل کر) میرا مطلب تھا کوئی ایک بھاہنی تو نہیں ہے نا۔ کئی گروپ جنگ میں کام کر رہے تھے۔
**سلام:** ڈھاکہ میں تو زیادہ تر مکتی باہنی ہی ہے۔
**توفیق:** نہیں۔ ساتھ والے ضلعے تنگائیل میں ٹائیگر صدیقی کے جتھے بہت سرگرم ہیں۔ ان کے لوگ بھی تو ڈھاکہ میں ہونگے۔
**سلام:** ہاں ہیں۔ مگر ٹائیگر صدیقی کی فورس میں شامل ہونا کوئی آسان تو نہیں۔ عطا تو ابھی بچہ ہے۔
**سلطانہ:** (محض بات جاری رکھنے کو پوچھتی ہے تاکہ سلام کا دھیان بٹا رہے) کیوں۔ آسان کیوں نہیں ہے؟
**سلام:** بھائی وہ تو بڑا بے جگری سے لڑنے والا شیر ہے۔ پاکستانیوں کے خون کا ایک دم پیاسا۔ اپنے ساتھ صرف ایسے لوگ رکھتا ہے، جو مرنے مارنے کو کھیل سمجھیں اور ڈسپلن کا اتنا سخت کہ اپنے ہی آدمیوں کو ذرا سی غلطی پر سب کے سامنے گولی مار دیتا ہے۔
**سلطانہ:** ہائے اللہ
**توفیق:** سنا ہے پچھلے کئی ماہ سے مادھوپور کے جنگل پر اس کا قبضہ ہے۔ اور اس کے اردگرد کے علاقے میں اس نے پاکستانیوں کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔
**سلام:** ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اور جنگ میں بھی اس نے بہت کام کیا۔ پتہ ہے آپ کو۔ ہفتہ بھر پہلے جو ہندوستانی فوج پیراشوٹوں سے تنگائیل کے قریب اتری تھی سو وہ ٹائیگر صدیقی کے علاقے میں اور اس کی مدد سے اتری تھی۔ وہ نہ ہوتا تو ہندوستانی کبھی بھی فوج نہ اتار سکتے۔
**نسرین:** بہت تجربہ کار آدمی ہے کیا؟
**سلام:** نہیں ابھی نوجوان ہے۔ مگر بہت بہادر آدمی ہے۔

(اتنے میں اوپر سے ہیلی کوپٹر کی آواز آتی ہے)

**سلطانہ:** (چھت کی طرف دیکھتی ہے) ہیلی کوپٹر!!

(سب آواز سنتے ہیں ......)

**توفیق:** (سلام سے) انڈیا نے ہیلی کوپٹروں سے بہت کام لیا ہے اس جنگ میں
**سلام:** (سلام جواب نہیں دیتا جیسے سوچ رہا ہو)
**توفیق:** بی بی سی پر ایک کمنٹری میں انہوں نے بتایا کہ بھیراب بازار پر دریا کا پل ٹوٹا ہوا تھا۔ ادھر والے کنارے پر پاکستانی فوج کی ایک پوزیشن تھی۔ ایسے حالات میں اتنے بڑے دریا کو پار کرنے میں بڑی مصیبت اٹھانا پڑتی ہے مگر ہندوستانی فوج نے ہیلی کوپٹروں کا تانتا لگا دیا اور دریا پار کر کے پاکستانی فوج کو مغلوب کر لیا...... اس کے بعد تو ڈھاکہ کا راستہ صاف تھا۔

(پھر ہیلی کوپٹر کی آواز آتی ہے۔ سب چپ ہو جاتے ہیں اور سنتے ہیں)

**نسرین:** (ایک دم خوش ہو کر) سلطانہ تم لوگوں نے دیکھا تھا آج؟
**سلطانہ:** کیا؟
**نسرین:** (خوشی میں پہلو بدلتی ہے) اللہ اللہ۔ کیا نظارہ تھا۔ کوئی تین بجے کے قریب۔ ہم چھت پر سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی تیس چالیس

ہیلی کوپٹر اکٹھے اڑتے چلے جا رہے تھے۔ (ہاتھ سے اشارہ کرکے) ادھر سے آئے۔ اور ادھر کو سیدھے ایرپورٹ کی طرف چلے گئے۔ پہلے اتنے اونچے اونچے تھے۔ پھر جیسے جیسے ادھر پہنچ گئے۔ نیچے ہوتے گئے۔ پھر باقی تو اوپر چکر لگاتے رہتے اور ایک دو نیچے اترتے۔ زمین تو ہمیں نظر نہ آتی تھی مگر جیسے ہی کوئی ہیلی کوپٹر نیچے جاتا۔ اتنی دھول اٹھتی جیسے بادل ہو۔

**توفیق:** ایرپورٹ پر بمباری بھی تو اتنی ہوئی کہ وہاں اب دھول کے سوا رہ کیا گیا ہوگا۔

(سلام ایک دم کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور دائیں دروازے کی طرف بڑھنے لگتا ہے)

**توفیق:** (گھبرا کر دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے) کدھر؟

**سلام:** میں ذرا باتھ روم تک جا رہا ہوں۔

**توفیق:** (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے) باتھ روم ادھر ہے۔ (سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور پھر اس کی رہنمائی کے لئے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک دو قدم اٹھاتا ہے۔ سلام چند ثانیے جھجکتا ہے۔ اور پھر مڑ کر سامنے والے دروازے میں گھس جاتا ہے۔ توفیق فکرمند حالت میں آکر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر سلطانہ سے کہتا ہے) سلطانہ ذرا جا کے کافی کا پانی تو رکھ دو۔

**سلطانہ:** پانی تو پہلے کا ہی رکھا ہے۔ بس اسے چائے دانی میں انڈیلنا ہے۔

**توفیق:** تو پھر اسے آؤ۔ دیر کا ہے کی۔

**سلطانہ:** (کچھ نہ سمجھ کر) بس جا رہی ہوں (مگر بیٹھی رہتی ہے)

**توفیق:** (تھوڑی دیر بعد ہنس کر) اور سلام بھائی کو راستہ بھی بتا دینا۔ کہیں پھر نہ بھول جائیں۔

**سلطانہ** (ایک دم سمجھ کر تیزی سے اٹھتی ہے) ہاں معلوم نہیں کیوں بھول گئے۔ حالانکہ انھیں پتہ ہے کہ غسل خانہ ادھر ہے۔

**توفیق:** بس وہ کسی سوچ میں ہوں گے۔ خیال نہیں رہا ہوگا۔

(سلطانہ چلی جاتی ہے)

**توفیق:** (نارمل بننے کی کوشش میں) ہاں تو بھابی آپ کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ آپ بتا رہی تھیں ہیلی کوپٹروں کے آنے کی۔

**نسرین:** نہیں بات تو پوری ہوگئی۔ میں تو صرف یہ بتا رہی تھی کہ نظارہ بہت عجیب تھا۔ ...... آپ نے نہیں دیکھا؟

**توفیق:** نہیں۔ بس آج دوپہر کے بعد میں اپنے کمرے میں ہی رہا۔ طبیعت ذرا بھاری تھی۔ کھانے کے بعد نماز پڑھی۔ اور پھر لیٹا ہی رہا۔

**نسرین:** ہم لوگوں نے کئی دفعہ آپ کی طرف دیکھا۔ مگر آپ نظر نہیں آئے۔ حالانکہ سبھی لوگ دوپہر کے بعد چھتوں پر چڑھے تھے۔ بڑی رونق تھی چھتوں پر۔ کبھی ہیلی کوپٹر نظر آتے۔ کہیں آگ کا دھواں تھا۔ ادھر گلشن کالونی میں پتہ نہیں کس نے کیا جلایا تھا۔ کہ کالے دھوئیں کی لمبی لکیر دور تک آسمان میں چلی جاتی تھی۔ اور دن بھر یہ دھواں ایسے ہی آسمان میں گھستا رہا۔

(سلام آتا ہے) ......

**توفیق:** آیئے بھائی بیٹھیے۔

(مگر سلام بیٹھنے کی بجائے دیوار پر لگی ہوئی تصویر دیکھنے لگتا ہے۔ جو دیوان کے قریب ہی ہے۔ اس کی پیٹھ توفیق اور نسرین

کی طرف ہے۔ مگر ناظرین کی طرف پیٹھ ہے جب وہ تصویر دیکھتے ہوئے چہرہ تھوڑا سا موڑ کر کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھتا ہے تو ناظرین کو اندازہ ہو جاتا ہے چند لمحوں بعد سلطانہ کافی کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوتی ہے۔ )

**توفیق :** اب آ بھی جائیے سلام بھائی ۔ کافی ہو جائے ٹھنڈی سی ۔

**سلطانہ :** کافی کا کیا مزہ آئے گا ۔ دودھ تو ہے ہی نہیں ۔

**نسرین :** نہیں نہیں ۔ خوب مزہ آئے گا ۔ اتنے دنوں بعد آج سکون کی فضا میں بیٹھ کر کچھ پی رہے ہیں ۔ مزہ کیسے نہیں آئے گا ۔

(سلام آکر بیٹھ جاتا ہے )

**سلطانہ :** سلام بھائی کتنی شکر ڈالوں آپ کے لیے ۔

## دوسرا ایکٹ

### پہلا سین

( سترہ دسمبر ..... شام کا وقت ۔ عبدالسلام کا بیڈ روم ۔ کافی کھلا کمرہ ہے ۔ دو پلنگ جڑے ہیں ۔ ساتھ تابین کا ٹکڑا پڑا ہے ۔ سامنے دوسری دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل پڑی ہے ۔ نسرین ڈریسنگ ٹیبل کے سٹول پر بیٹھی نیل فائیل ( NAIL FILE ) سے اپنے ناخن ٹھیک کر رہی ہے ۔ دیوار پر کلاک لگی ہے جو نو بجاتی ہے ۔ اتنے میں سلام اندر آتا ہے ۔ وہ بنگالی طرز کا سفید کرتہ اور رنگدار دھوتی پہنے ہے )

**سلام :** عطا نہیں آیا ابھی تک ؟

**نسرین :** ہاں دیکھئے نا ۔ مجھے تو خود فکر ہو رہا ہے ....... میں نے کہا بھی تھا کہ نہ جانے دیں ۔

**سلام :** جانے کیسے نہ دیتا ۔ یہ تاریخی دن روز روز آئے گا کیا ؟ آزادی کے دوسرے دن بریگیڈیر قادر صدیقی ٹائیگر اپنی باہنی کے دستوں کی سلامی لے ۔ اور بچے یہ موقع نہ دیکھیں ..... انھیں کیسے احساس ہو کہ ان کا اپنا نیا ملک بنا ہے ۔ تم دیکھ لینا عطا خوشی سے دیوانہ ہو کر آئے گا ۔ وہ اچھلے گا ۔ کودے گا ۔ نعرے لگائے گا ۔

**نسرین :** وہ تو ٹھیک ہے ۔ مگر دیکھئے نا شہر میں کتنے خطرے ہیں ۔ آج صبح تو میری آنکھ ہی فائرنگ کے شور سے کھلی ۔

**سلام :** ( قہقہہ لگا کر ) بہت مبارک انداز ہے آزادی کا پہلا دن شروع کرنے کا ۔ کہ آنکھ کھلتے ہی آدمی ان گولیوں کی آواز سنے ۔ جن سے بہاریوں کا خاتمہ کیا جا رہا ہے ....... ان سالوں کو بھی اب پتہ چلا ہوگا ۔ بہت پاکستانی بنتے تھے ۔ ہمارے ملک کی بنیادوں کو سیمنٹ کی طرح پکا کرنے کے لئے ان کے خون کی بہت ضرورت ہے ۔

**نسرین :** عطا تو صبح ہی سے بہت بے چین تھا ۔ وہ بھی اٹھ اٹھ کے بھاگتا تھا کہ میرپور پہ حملہ کیا جائے ۔

سلام : نہیں اس وقت اس کا جانا اچھا نہیں تھا۔ حملے میں بعض دفعہ مارنے والے بھی مرجاتے ہیں اس لئے میں نے اسے اس وقت سختی سے روک دیا اور شام کو جانے دیا۔ بس کروہ خواہ مخواہ جوش میں آکر کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھتا۔ . . . . اسی لئے میں نے اُسے توفیق کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔

نسرین : نہ معلوم کب آئے گا۔ اب تک تو ریلی ختم ہوچکی ہوگی۔

سلام : تم فکر نہ کرو۔ وہ لڑکوں کے ساتھ گھوم پھر کر خوشی منا رہا ہوگا۔ . . . . . تم یہ بتاؤ۔ آج کچھ پتہ چلا۔؟

نسرین : توفیق کے گھر کا ؟

سلام : ہاں !

نسرین : (نفی میں سر ہلا کر) اوں ہوں۔ میں نے کئی دفعہ کوٹھے سے چھپ کر دیکھا۔ دو تین دفعہ بہانوں سے سلطانہ سے ملنے بھی گئی۔ پردوں کی باڑ میں کرسی ڈال کر بیٹھی رہی۔ مگر مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ میرا خیال ہے آپ کو ویسے ہی شک ہے۔ آج کل کون کسی فوجی کو چھپانے کی جرات کرسکتا ہے۔

سلام : تم نہیں جانتیں نسرین۔ توفیق بہت چالاک آدمی ہے۔ میں مارچ کے بعد سے جانتا ہوں۔ کہ یہ پاکستانی فوج کی مدد کرتا رہا ہے۔ مگر کبھی کوئی بات ہاتھ نہیں لگنے دیتا۔ حالانکہ میں ہمیشہ تاک میں رہا ہوں کہ کوئی ثبوت ملے۔ تو میں مکتی باہنی سے اس کے گھر کوئی بم وغیرہ پھینکنے کا سلسلہ چلاؤں۔ مگر یہ اتنی رازداری سے کام کرتا ہے کہ کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔

نسرین : ٹھیک ہے اس وقت تو اسے فوج کی سرپرستی حاصل تھی لیکن اگر یہ سمجھدار ہے۔ تو اب اسے احساس ہوگا کہ وہ فوج نہیں رہی۔ اب یہ کیوں خطرہ مول لے گا۔

سلام : تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔ مگر کل جو کمبل ان کے ڈرائینگ روم میں دیکھا ہے۔ ویسا کمبل گھروں میں نہیں ہوتا۔ گھروں میں تو لال پیلے کالے سفید کمبل ہوتے ہیں۔ اس قسم کا گرے (GREY) کمبل تو پولیس یا فوج والوں کے پاس ہوتا ہے۔ نہ ہی اس کمبل میں وہ نفاست تھی۔ جو گھر کے کمبلوں میں ہوتی ہے۔ میں تو تصویر دیکھنے کے بہانے اسے دیکھتا رہا اس پر گھاس کے تنکے بھی لگے تھے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے کونے میں کوئی ٹیڑھی سی چیز بندھی تھی۔ . . . . . اب تم ہی بتاؤ کون اپنے گھروں میں کمبل میں چیزیں باندھ کر رکھتا ہے۔

نسرین : ہاں بات تو ٹھیک ہے۔

سلام : مجھے تو یقین ہے کہ اس نے کوئی فوجی گھر میں چھپایا ہے۔

نسرین : ہاں جان بچانے کے لئے تو وہ دس پندرہ ہزار روپیہ بھی دے جائے گا۔ (سلام جاکر کھڑکی سے ذرا سا پردہ ہٹاکر باہر دیکھتا ہے) یہاں سے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ میں آج سارا دن دیکھتی رہی ہوں۔

سلام : میں نے تمہیں کہا تھا کہ ان کے گھر جاکر کسی بہانے سے سب کمروں میں جانا۔ تم نے یہ کیا ؟

نسرین : صبح جب میں گئی تو اس وقت تو سلطانہ نے موقع ہی نہیں دیا۔ اور میں بھی محتاط رہی کہ اسے شک نہ پڑے۔ دوپہر کو جب گئی

سلام : تو کیا ہوا۔ کسی بہانے وہاں بھی ہو آئیں ۔
نسرین : کیا کرتی ۔ کوئی بہانہ سوجھا ہی نہیں ۔

(باہر کسی جیپ کی آواز آتی ہے ۔ تو سلام جلدی سے نسرین کو بجلی بجھانے کا اشارہ کرتا ہے ۔ اور بھاگ کر کھڑکی کے پاس جا کر پردہ ایک طرف ہٹا کر جھانکنے لگتا ہے ۔ نسرین بھی وہاں پہنچ جاتی ہے ۔ آپس میں کانا پھوسی کرتے ہیں ۔ مگر تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ آتے ہیں ۔ اور بجلی جلا دیتے ہیں )

سلام : آج کھانا وغیرہ جلدی کھا کر بجلی بجھا کر دیں گے ۔ اور کھڑکی کھلی رکھیں گے ۔ تاکہ ان کے گھر کی آواز وغیرہ بھی سن سکیں ۔ اور جلدی سے دیکھ بھی سکیں ۔

نسرین : مگر کمرے میں تو سردی ہو جائے گی ۔
سلام : کوئی بات نہیں ۔ ہیٹر جلائے رکھنا ۔ اور ایک دو کمبل فالتو رکھ لینا ۔
نسرین : مگر مجھے امید نہیں کہ کچھ ملے گا ۔ اگر دن بھر کچھ نہیں ملا تو رات کو کیا ملے گا ۔
سلام : مجھے یقین ہے وہ رات کو انہیں نکالے گا ۔
نسرین : لیکن اگر ہم اس وقت سو رہے ہوئے تو کیا ہو گا ۔
سلام : (سوچ کر) ہم نہیں سوئیں گے ۔ میں جب تک جاگ سکوں گا ۔ دیکھتا رہوں گا ۔ پھر تمہیں جگا دوں گا تم دیکھتی رہنا ۔
نسرین : چھوڑیئے بھی ۔ ہمیں اتنی کیا مصیبت پڑی ہے ۔
سلام : مصیبت نہیں یہ ہمارا فرض ہے ۔ اگر ہم نے بنگلہ دیش کو بچانا ہے تو توفیق جیسے غداروں کو بے نقاب کرنا ہو گا ۔ ان کے وجود سے بنگلہ دیش کی مٹی کو پاک کرنا ہو گا ۔
نسرین : (حیرت سے خاوند کو دیکھتی ہے) مگر ہمارے تو توفیق بھائی سے پرانے مراسم ہیں ۔ وہ ہمارے دوستوں میں سے ہیں ۔
سلام : تم کیسی بنگالن ہو نسرین ۔ اپنے بنگالی کردار کو بھی نہیں سمجھیں ۔ ہم لوگ بھرپور دوستی کرتے ہیں ۔ اور بھرپور دشمنی کرتے ہیں ۔ جب کسی کے دوست ہیں تو تن من دھن سب کچھ اس پر لٹا دیتے ہیں ۔ اور جب کسی کے دشمن ہیں ۔ تو اس کے من پر ڈنک کرتے ہیں ۔ دھن لوٹ لیتے ہیں ۔ اور تن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں ۔ ہماری تاریخ والہانہ محبت اور ظالمانہ نفرت کی آنکھ مچولی ہے ۔ ۱۹۴۷ء میں ہم ہر اس شخص کے جانی دشمن تھے ۔ جو پاکستان کا مخالف تھا اور آج ہم ہر اس شخص کے جانی دشمن ہیں ۔ جو پاکستان کا حمایتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ توفیق پاکستانی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دل سے پاکستانی ہے ۔ اسی لئے میں اس کا جانی دشمن بن گیا ہوں ۔ اسے ذلیل کر کے مجھے راحت ہو گی ۔ اس کا خون بہتا دیکھ کر میرا خون رقص کرے گا ۔ (نسرین حیرت اور وحشت سے خاوند کی باتیں سنتی ہے ۔ وہ ذرا تھم کر اس کی طرف دیکھتا ہے) نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تم نہیں سمجھ سکو گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عورت محسوس تو کر سکتی ہے ۔ ان کا تجزیہ نہیں کر سکتی ۔
نسرین : توبہ ! آپ کے خیال میں تو عورتیں بالکل فالتو چیز ہیں ۔

سلام : نہیں ! فالتو ہرگز نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود عورت کا وجود بہت ضروری ہے ۔ یہ بڑے کام کی چیز ہے ۔
اللہ میاں نے بھی جب آدم کو جنت سے نکال کر زمین پہ ڈالنا تھا ۔ تو عورت سے کام لیا تھا ۔ (رک کر) ٹھہرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (سوچ کر)
خوب سوجھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم بھی عورت سے کام لیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ایسے کرو اگر آج رات ہمیں توفیق کے گھر کا اندازہ نہیں ہوتا ۔
تو کل صبح سے ہی نظر رکھنا ۔ جیسے ہی توفیق باہر جائے ۔ مجھے بتانا ۔ میں جا کر اس کی بیوی سے اکیلے میں بات کروں گا ۔

نسرین : (شک سے) اکیلے میں کیوں ؟

سلام : (غور سے بیوی کو دیکھ کر ہنس پڑتا ہے) توبہ توبہ ۔ یہ عورتیں بھی ۔ بابا میری کوئی نیت خراب نہیں ۔ میں تو صرف یہ کوشش کروں گا کہ کسی طریقے
سے کچھ پتہ چل جائے ۔

نسرین : مگر یہ طریقے اکیلے ہی کیوں سوجھیں گے ؟

سلام : اچھا تم ایسے کرنا ۔ عطا سے کہنا باہر لان میں ٹہلتا رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو ٹھیک ہے ۔

(نسرین خاموشی سے کندھے اچکاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کر ناخن درست کرنے لگتی ہے
صحن میں کوئی سٹول گرنے کی آواز آتی ہے ۔ نسرین بلند آواز سے پوچھتی ہے "کون ہے" مگر کوئی جواب
نہیں آتا ۔ )

سلام : میرا خیال ہے ۔ عطا خوشی سے اچھلتا کودتا آرہا ہوگا ۔

(قدموں کی چاپ قریب آتی ہے ۔ اور عطا کمرے میں داخل ہوتا ہے ۔ مگر وہ خاموش سا ہے ۔ اس کا
چہرہ مضمحل ہے ۔ اس کی چلبلاہٹ اور جوش خروش غائب ہے ۔ وہ سر جھکائے داخل ہوتا ہے اور
بجھے بجھے انداز میں ایک کرسی پہ بیٹھ کر بوٹ کے تسمے کھولنے لگتا ہے)

سلام : عطا بیٹے آ گئے ۔

عطا : (ذرا رک کر) جی ڈیڈی ۔

سلام : (نسرین کی طرف دیکھ کر) کیا خبر لائے ؟

عطا : (خفگی انداز میں) کچھ نہیں ۔

نسرین : عطا تم تو ٹائیگر صدیقی کی ریلی دیکھنے گئے تھے ؟

عطا : جی ممی ۔

نسرین : تو پھر دیکھ لی ؟

عطا : جی ۔

نسرین : اور کچھ دیکھا ؟

عطا : (تھوڑا رک کر) کچھ نہیں ۔

(عطا بوٹ اتار چکا ہے۔ مگر ابھی جراب پہنے ہے۔ وہ دائیں گھٹنے پر بایاں پاؤں رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر پاؤں سے ذرا اوپر پنڈلی کو ہولے ہولے سہلانے لگتا ہے۔ ساتھ ساتھ اسے غور سے دیکھتے ہوئے سوچ میں کھو جاتا ہے)

**نسرین:** شہر میں اب کچھ رونق ہے؟

(مگر عطا اسی طرح سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔ نسرین حیرت سے خاوند کو دیکھتی ہے)

**سلام:** کیا سوچ رہے ہو عطا بیٹے؟

**عطا:** (سر اٹھا کر سلام کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے پھر ہولے سے کہتا ہے) کچھ نہیں۔

**سلام:** (قدرے تعجب سے دو قدم آگے بڑھ آتا ہے) عطا کیا ہوا ریلی میں؟

**عطا:** (خالی خالی نظروں سے باپ کی طرف دیکھ کر) پھر بتاؤں گا ڈیڈی۔

**سلام:** مگر اب کیوں نہیں؟

**عطا:** نہیں دل نہیں چاہ رہا۔

**سلام:** (جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے مگر ہمارا دل تو سننے کو چاہتا ہے۔ ہمیں تو بتاؤ نا۔

**عطا:** (اپنی پنڈلی سہلاتا رہتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے) ڈیڈی... صلاح الدین۔

**سلام:** کون صلاح الدین؟

**عطا:** وہ جو میرا اسکول اور کالج میں دوست تھا.... اور اب البدر میں تھا۔

**سلام:** ہاں تو کیا ہوا اسے؟

**عطا:** وہ بھی وہاں.....

**سلام:** وہاں آیا تھا کیا؟

**عطا:** (نفی میں سر ہلاتا ہے)

**سلام:** تو؟

**عطا:** اسے.... وہاں لائے تھے۔

**سلام:** کون؟

**عطا:** وہی.... ٹائیگر صدیقی کی بھاہنی والے۔

**سلام:** پھر؟

**عطا:** (چند لمحے خاموش رہتا ہے پھر رک رک کر کہتا ہے) جب ریلی ہو چکی..... پریڈ ہو چکی.... میرا مطلب ہے سلامی ہو چکی.... تو وہ تین لڑکوں کو سٹیج پر لائے..... پہلے ٹائیگر صدیقی نے اُن کو گھونسے مارے..... پھر دو چار اور لوگ آ کر ان کو مارنے

گئے ..... میں بڑا خوش ہوا - اور آگے بڑھا کہ میں بھی ماروں ... قریب پہنچا (رک کر اپنی پنڈلی سہلانے لگتا ہے۔)

نسرین : (نسرین کی طرف فکر سے دیکھ کر) آگے بھی بتا دو بیٹے۔

عطا : (جیسے بےخود ہو اور صرف ہونٹوں سے آواز نکل رہی ہو) اتنے میں ... مکتی باہنی کے چار پانچ لوگ بندوقیں لئے آگے آئے ..... بندوقوں پر سنگینیں تھیں ..... باقی لوگ پیچھے ہٹ گئے سنگینوں والوں نے ان لڑکوں میں سے دو کے پیٹ میں سنگینیں گھونپ دیں۔ ..... پوری کی پوری ..... صلاح الدین نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا ..... مجھ پر نظر پڑی تو چیخ کر بولا (عطا چپ ہو جاتا ہے)

نسرین : (آگے بڑھ کر) کیا کہا اس نے ؟

عطا : (کافی لمحوں بعد تین بار ایسے دہراتا ہے کہ آواز بلکی ہوتی جاتی ہے) اس نے کہا - عطا بھائی مجھے بچاؤ ..... عطا بھائی مجھے بچاؤ ... (خاموش ہو جاتا ہے) .... پھر وہ جھک کر آگے بڑھا اور گھسٹ کر میرے پاؤں پکڑ لیے ..... اس کے گرتے ہی کسی نے پیچھے سے گولی چلائی ..... وہ تڑپ کر سیدھا ہوا - تو ایک دم تین سنگینیں اس کے پیٹ میں گھونپ دیں ...... اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں ...... وہ تڑپا بھی نہیں .... وہیں مر گیا ..... اور جب - را تو اس کی کھلی آنکھیں التجا سے میری طرف دیکھتی رہیں ...... اور اس کے ہاتھ نے مجھے یہاں سے (پنڈلی کی طرف اشارہ کر کے) پکڑ رکھا تھا ..... زور سے ..... بہت زور سے ..... بڑے ہی زور سے (آخری فقروں کے درمیان جھکتا جاتا ہے اور پھر گھٹنے پر رکھی ہوئی پنڈلی پر سر ٹکا کر بلک بلک کر رونے لگتا ہے۔)

(نسرین اور سلام آگے جا کر اسے دلاسہ دیتے ہیں - نسرین اس سے لپٹ سی جاتی ہے - سلام اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتا ہے مگر عطا روتا جاتا ہے۔)

سلام : بیٹے پریشان کیوں ہوتے ہو - یہ تو اچھا کیا ان لوگوں نے - ایسے خبیثوں کا ایسا ہی حشر ہونا چاہیے۔

عطا : (روتے روتے) مگر ڈیڈی اس کی آنکھیں .... انتڑیاں ..... آنکھیں ..... خون ... (چیخ چیخ کر روتا جاتا ہے - نسرین اور سلام اسے سہارا دے کر کمرے سے باہر لے جاتے ہیں - رونے کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جاتی ہے) —— (جاری)

## دوسرا سین

وہی کمرہ - اٹھارہ دسمبر کی صبح - نو دس بجے کا وقت کھڑکی سے پردے ہٹے ہیں اور دھوپ آنے کی وجہ سے کمرہ خوب روشن ہے - کرسی پر سلام بیٹھا انگریزی کا اخبار دیکھ رہا ہے اس نے ڈریسنگ گاؤن پہنا ہے - نسرین کمرے میں داخل ہوتی ہے - ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھرمامیٹر کو ڈبیا (case) میں ڈال رہی ہے۔)

نسرین : شکر ہے اب تو عطا کو بخار کچھ کم ہے - مگر رات کو تو بہت تیز تھا۔

سلام : کتنا ہے اب ؟

نسرین : سو سے ذرا کم ہی ہے - مگر رات تو ایک سو تین (۱۰۳) تک گیا۔

سلام : ابھی بچہ ہے۔ دہل گیا۔ مگر بنگلہ دیش میں تو اب یہ کچھ ہوتا ہی رہے گا۔
نسرین : ہائے خیر رکھیں اللہ سے۔ کیوں ہوتا رہے گا۔
سلام : یہ ہم سب کو سہن کرنا پڑے گا۔ جب تک سارے پاکستانی ختم نہیں ہو جاتے۔
نسرین : (اچانک) ارے آج اخبار آگیا کیا؟
سلام : ہاں پورے ہفتے بعد اخبار کی شکل دیکھی ہے۔ دیکھا یہ تم نے۔ اخبار کا نام تو وہی پرانا ہی ہے۔ پاکستان آبزرور۔ مگر پاکستان کے لفظ پر کراس لگا کر ایک طرف "بنگلہ دیش" لکھ دیا ہے۔
نسرین : (نسرین جھک کر دیکھتی ہے (~~PAKISTAN~~ BANGLA DESH OBSERVER) اور پھر شوخی سے کہتی ہے) اخبار کا نام ہی اصل خبر ہے۔ باقی خبر پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (دونوں ہنستے ہیں) اور ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی۔ توفیق صاحب ابھی گھر سے نکل کر باہر جا رہے تھے۔
سلام : (اچھل کر) کمال ہے یہ بھی کوئی بات ہے بھولنے کی مجھے بتایا ہی نہیں۔ (ایک دم اخبار پھینک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جلدی سے الماری کھول کر کپڑے نکالتا ہے) اتنا اچھا موقعہ ضائع کر دیا۔ (کپڑے لے کر غسل خانے کی طرف بھاگتا ہے) میں جلدی سے تیار ہو جاؤں۔
نسرین : (لگے سے) آخر اتنی بھی کیا مجبوری ہے کہ توفیق کی غیر حاضری میں جانا ہے اور بن سنور کر جانا ہے۔
سلام : غیر ضروری باتوں سے میرا وقت ضائع نہ کرو۔ کہہ جو دیا کہ ضروری ہے (دھڑاک سے غسل خانے کا دروازہ بند کرتا ہے)۔

(نسرین بھویں اٹھا کر طنز سے گردن ہلاتی ہے۔ اور پھر ایک دم مڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگتی ہے)

---

## تیسرا ایکٹ

(توفیق کا ڈرائینگ روم۔ سلطانہ ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے دروازے کی طرف جا رہی ہے اتنے میں باہر سے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ سلطانہ رکتی ہے۔ حیرت سے گھڑی کو دیکھ کر پھر دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ جس پر قدرے جلدی جلدی دستک ہو رہی ہے۔ پھر اندر سے ہی پوچھتی)

سلطانہ : کون؟
سلام : (باہر سے آواز) توفیق بھائی۔ دروازہ کھولئے۔
(سلطانہ حیرت اور سراسیمگی سے چند لمحے رکتی ہے پھر آگے جا کر دروازہ کھولتی ہے)
سلام : (جلدی سے اندر آجاتا ہے) توفیق بھائی کہاں ہیں۔
سلطانہ : وہ تو ذرا باہر گئے ہیں۔ کیوں خیریت ہے؟

سلام : ہاں خیریت ہے۔ میں نے ذرا ضروری بات کرنا تھی۔
سلطانہ : آپ پیغام دے جائیں میں بتا دوں گی۔
سلام : نہیں میں ان سے ہی کرنا چاہتا تھا۔ کب تک آئیں گے ؟
سلطانہ : جلدی ہی آنے کو کہہ گئے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر ہو جائے۔
سلام : وہ ہوتے تو اچھا تھا۔ (سوچتے سوچتے واپس مڑتا ہے۔ مگر دو قدم چل کر رک جاتا ہے) مگر بھابی.... وہ بات دراصل یہ ہے کہ گھروں کی تلاشیاں ہو رہی ہیں (سلطانہ چونک پڑتی ہے) کیوں آپ کیوں چونکیں ؟ کچھ ہے آپ کے ہاں ؟ (سلطانہ نفی میں سر ہلاتی ہے) میرا مطلب ہے کوئی ہتھیار وغیرہ۔
سلطانہ : (سنبھل کر) نہیں سلام بھائی ہمارے ہاں تو کچھ نہیں۔
سلام : (بظاہر خلوص سے) ہاں ہاں مجھے معلوم ہے آپ کے ہاں کیا ہو گا۔ شریف آدمی کب ان جھمیلوں میں پڑتے ہیں۔ لیکن آپ جانتی ہیں تلاشی لینے والوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ سمجھ دار اور شریف بھی۔ اور خبیث اور کم ظرف بھی۔ وہ بدتمیزی بھی کر سکتے ہیں گھر کی نقدی وغیرہ بھی لے جا سکتے ہیں اور..... (رک جاتا ہے)
سلطانہ : (گھبرا) اور کیا ؟
سلام : گرفتار بھی کر سکتے ہیں اور..... کھڑے کھڑے گولی بھی مار سکتے ہیں۔
سلطانہ : مگر کیوں ؟ آخر کوئی بات بھی تو ہو ؟
سلام : بھابی۔ آج کل کون ہے کسی کو پوچھنے والا۔ اور اگر کوئی پوچھے گا بھی تو تب نا جب کوئی کسی کے پاس رپورٹ کرے گا۔ مگر اس سے پہلے ہمیں تو نقصان پہنچ چکا ہو گا۔ شریف آدمی کی ایک دفعہ بے عزتی ہو جائے تو بعد میں شور کرنے سے واپس تو نہیں آ جاتی نا۔ (سلطانہ سوچ میں پڑی ہے) جنگ کے دنوں اور خصوصاً خانہ جنگی میں تو جس کے ہاتھ میں بندوق ہے وہی سب کچھ ہے۔
سلطانہ : (فکر کے عالم میں خاموش رہتی ہے پھر بے بسی سے کہتی ہے۔) توفیق صاحب نہ جانے کدھر چلے گئے۔ اس وقت ہوتے تو اچھا تھا۔
سلام : ہاں اس وقت ان کا ہونا بہت ضروری تھا۔ اور میں تو بڑی خاموشی سے گھر سے نکلا ہوں کہ آپ لوگوں کو اطلاع دے سکوں تاکہ اگر کوئی ہتھیار وغیرہ ہو۔ تو اِدھر اُدھر کر دیں۔
سلطانہ : ہمارے ہاں تو کچھ نہیں۔ مگر اطلاع کا شکریہ۔ آپ آرام کریں اب۔
سلام : نہیں بھابی میں تو اب واپس نہیں جا سکتا۔ کیونکہ میرے گھر تو تلاشی والے آئے ہوئے ہیں۔
سلطانہ : (ہڑبڑا کر) آپ کے گھر میں۔؟؟
سلام : یہی تو میں بتا رہا ہوں کہ اس کے بعد آپ کی باری ہے...... وہ ابھی میرے گھر میں گھسنے والے تھے جب میں عطا کرم سے بات کرنے کو چھوڑ کر چپکے سے پچھلے دروازے سے نکل آیا ہوں تا کہ آپ کو اطلاع دے سکوں۔ ان سے تو میں ملا بھی نہیں۔

اب اگر میں یہاں سے نکل کر واپس جاتا ہوں۔ تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں اطلاع دے آیا ہوں۔ پھر میری اور ساتھ آپ کی بھی شامت آ جائے گی۔ ..... ویسے وہ اب ادھر آتے ہی ہوں گے۔

**سلطانہ:** اگبراہٹ بھی ہے، ہائے اللہ توفیق صاحب کیوں چلے گئے۔ ..... وہ کیوں نہیں لوٹتے۔

**سلام:** میرے خیال میں تو وہ ابھی واپس نہیں آ سکتے۔ جب تک تلاشیاں نہ ہو جائیں۔ انہوں نے یہ علاقہ گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ اور کسی کو ادھر ادھر آنے جانے نہیں دیتے ..... ویسے بھی جابر لوگ ہیں۔ تائیگر صدیقی کے جتھے والے ہیں نا۔

**سلطانہ:** (گھبراہٹ میں ایک دو قدم بائیں ہاتھ والے دروازے کی طرف اٹھاتی ہے پھر رک جاتی ہے۔ پھر رک جاتی ہے۔ پھر ذرا بڑھتی ہے اور واپس آ جاتی ہے۔ سلام غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ بالآخر سلطانہ کہتی ہے) سلام بھائی آپ بیٹھیے۔ میں ایک منٹ میں آئی۔ (اور دائیں ہاتھ والے دروازے میں چلی جاتی ہے۔)

(سلام مسکراتا ہے۔ جیب سے ریوالور نکالتا ہے۔ اور اس کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اتنے میں عطا آتا ہے۔ قدرے کمزور اور زرد چہرہ۔ ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر آواز دیتا ہے۔ "آنٹی۔ آنٹی" ..... تھوڑی دیر بعد سلام کی آواز آتی ہے۔ "سیدھے چلتے رہو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔" آگے آگے دونوں سپاہی ہاتھ اوپر اٹھائے دروازے میں سے نکلتے ہیں۔ پیچھے پیچھے سلام پستول تانے ہے۔ اس کے پیچھے سلطانہ آدھے اندازے میں آتی ہوئی زار و قطار رو رہی ہے۔ عطا سب کو حیرانی سے دیکھتا ہے؟)

**سلام:** (فتح مندی اور رعونت سے) تم مغربی پاکستانی ہو؟ (غلام رسول سر ہلاتا ہے) فوج کے ہو؟

**رمضان:** پولیس کے۔

**سلام:** کب سے یہاں چھپے ہو؟

**رمضان:** دو راتیں ہو گئی ہیں۔

**سلام:** کیوں چھپے ہوئے ہو؟

**رمضان:** یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جان بچانے کو۔

**سلام:** بکواس۔ میرا مطلب ہے تمہارا پروگرام کیا تھا؟

**رمضان:** ہم مناسب موقع پر چھاؤنی جانا چاہتے تھے۔

**سلام:** موقع تو مناسب مل گیا آج۔ اب دیکھتے ہیں تم کدھر جاتے ہو۔ (عطا کی طرف اشارہ کر کے) جانتے ہو۔ یہ میرا لڑکا ہے۔ اور مکتی باہنی میں ہے۔

(غلام رسول آنکھیں بند کر کے زیر لب کلمہ پڑھتا ہے۔ رمضان بھی خوفزدہ ہو کر عطا کو دیکھتا ہے۔ سلطانہ روتی رہتی ہے ..... اتنے میں دروازہ کھلتا ہے اور توفیق اندر آتا ہے۔ وہ حیرت سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر غور سے سلام کے پستول کو دیکھتا ہے۔ پھر سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔)

**سلطانہ:** سلام بھائی کہہ رہے تھے کہ تلاشیاں ہو رہی ہیں۔

توفیق : کیسی تلاشیاں ؟
سلطانہ : یہ کہتے تھے سارا علاقہ گھیرے میں ہے۔ اور ساتھ والے گھروں کی تلاشیاں ہو رہی ہیں۔
توفیق : میں تو ادھر ادھر گھومتا رہا ہوں۔ مجھے تو کوئی تلاشی لینے والا نظر نہیں آیا۔ ...... یہ سب جھوٹ ہے۔
سلام : (طنز سے ہنس کر) چلئے جھوٹ ہی سہی۔ مگر میں نے تو جو تلاش کرنا تھا کر لیا۔
سلطانہ : تو آپ نے یہ سب ڈھونگ اس لئے رچایا۔
سلام : یہ سب ڈھونگ اس لئے رچایا کہ توفیق اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا تھا۔ میں پچھلے سات ماہ سے اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ قابو نہیں آیا۔ آج توفیق بابو تمہاری غداری ایسے پکڑی گئی ہے کہ کسی شک کی گنجائش نہیں۔

توفیق : تم کرنا کیا چاہتے ہو ؟
سلام : ایک بات ...... صرف ایک بات۔ ان دونوں کو مکتی باہنی کے حوالے کر دوں گا اور تمہیں بھی۔
سلطانہ : (رو کر) نہیں سلام بھائی نہیں۔ دیکھئے میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا را ایسا نہ کریں۔
سلام : میں ایسا نہ کروں اور تم لوگ جو اتنا عرصہ بنگالیوں کی مخبری فوج کے پاس کرتے رہے ہو۔ اس وقت تمہیں ان کے گھر والوں کے ہاتھ جڑے ہوئے نظر نہیں آتے تھے ...... نہیں سلطانہ بیگم ... میں اب تمہیں سلطانہ بہن نہیں کہوں گا ...... توفیق بابو مکتی باہنی کے پاس جائیں گے۔ یہ دونوں ملیچھ بھی مکتی باہنی کے حوالے ہوں گے .... اور ان کی سنگینیں ان کے پیٹ کے پار ہوں گی۔ تو میں اطمینان کا سانس لوں گا۔
عطا : (جو اب تک حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھ رہا ہے۔ باپ کی آواز سن کر جیسے نیند سے جاگ اٹھتا ہے اور ایک دم چیخ پڑتا ہے) نہیں ڈیڈی نہیں۔
سلام : (حیرت سے) کیوں بیٹے۔
عطا : نہیں ڈیڈی یہ نہ کریں۔ کسی کو بھی مکتی باہنی کے حوالے نہ کریں۔
سلام : بیٹے یہ تم کہہ رہے ہو جو خود مکتی باہنی کے ہو اور پاکستانیوں کے خون کے پیاسے ہو۔
عطا : میں جو بھی ہوں ڈیڈی۔ مگر خدارا ان کو ان کے حوالے نہ کریں۔ وہ ...... وہ ان کا حشر ... صلاح الدین والا کریں گے۔
سلام : بیٹے ان کا یہی حشر ہونا چاہیے۔
عطا : (آگے بڑھ کر توفیق کے آگے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔) نہیں ڈیڈی نہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کریں ..... صلاح الدین والی ... (ایک دم مڑ کر توفیق کو گلے لگا لیتا ہے۔) نہیں انکل نہیں۔
سلام : عطا ایک طرف ہٹ جاؤ۔ توفیق نے دشمن کو اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔ یہ جرم ہے۔ یہ غداری ہے۔
عطا : (ہٹ کر دونوں سپاہیوں کے درمیان چلا جاتا ہے۔) ڈیڈی دشمن کو چلا جانے دیں۔ تو سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔
سلام : چلا کہاں جانے دیں ؟

**عطا:** چھاؤنی ...... ان کو بھیج دیں۔ (دونوں ہاتھوں سے دھکیلتے ہوئے) جاؤ بھائی جاؤ...... خدا کے لئے جاؤ ...... تم یہاں رہو گے تو کوئی اور گڑبڑ ہو گی۔ (رمضان پستول کی طرف دیکھتا ہے تو عطا آگے جا کر باپ کے ہاتھ سے ریوالور لے لیتا ہے اس سے گولیاں نکالتے ہوئے کہتا ہے۔) جاؤ بھائی جاؤ۔ (سلام حیرانی سے دیکھتا ہے)

**توفیق:** عطا بیٹے ان کو کیسے بھیج رہے ہو۔ باہر نکلتے ہی یہ لوگ مارے جائیں گے۔ یا پکڑے جائیں گے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ان کو اپنی کار میں بٹھا کے خود چھاؤنی چھوڑ آؤ۔ راستے میں کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میں گرفتار کر کے مکتی باہنی کے کمانڈروں کے پاس سے جا رہا ہوں۔

**عطا:** (خوش ہو کر) یہ ٹھیک ہے انکل (رمضان کا ہاتھ پکڑ کر) چلو جلدی چلو۔

(تینوں نکل جاتے ہیں۔)

**سلام:** توفیق بابو یہ نہ سمجھو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ میں آج ہی رپورٹ کر دوں گا۔

**توفیق:** سلام بھائی آپ رپورٹ نہیں کریں گے۔ کیونکہ اب میرے جرم میں آپ کا بیٹا بھی شریک ہے۔ جو حشر میرا ہوگا۔ وہی آپ کے بیٹے کا بھی ہوگا۔ اس لئے ...... آپ رپورٹ نہیں کریں گے۔

**سلام:** تو پھر چالاکی کر گئے میرے ساتھ۔ میں ابھی جا کر اسے روکتا ہوں۔

**توفیق:** (راستہ روک کر) آپ نہیں جا سکتے یہاں سے۔ جب تک عطا ان کو چھوڑ کر واپس نہیں آ جاتا۔

(سلام اسے قہر آلود نظروں سے گھورتا جاتا ہے ......)

(فیڈ آؤٹ)

# لاہور، ڈھاکہ

## مسعود مفتی

لاہور

برادرم!

آپ کا خط ملا۔ جس میں لکھا ہے کہ "میری چیزیں چھپنی چاہئیں۔ خواہ انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو" میری سوچ یہ ہے کہ "چیزیں چھپنی چاہئیں جس کا انجام بھی بخیر ہو" اصل میں فن کاری بھی یہی ہے کہ کہہ سب کچھ دیجئے۔ مگر لہجہ دھیما ہو۔ لٹھ نہ ماریں، بلکہ پھولوں کی چھڑی سے لٹھ کا کام لیں۔ پھر آپ یہ کہیں گے کہ "مرو دواں پہ کلام نرم و نازک بے اثر" ــــ جی ہاں! یہ بات بھی ٹھیک ہے۔

آپ پر لکھنے کا "عارضہ" طاری ہو چکا ہو۔ تو پھر لکھتے جائیے۔ میں چھاپتا جاؤں گا۔ آپ کہیں گے سال میں تو دو تین نمبر چھاپتا ہے۔ میں ہوں گا۔ جی ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ مگر میں ایک نمبر میں دو دو تین تین چیزیں بھی چھاپ دیا کرتا ہوں۔ بشرطیکہ کوئی لکھنے والا ہو۔

ایسے "حادثے" میرے اور منٹو کے درمیان ہوا کرتے تھے۔ اُن کی کئی بار دو دو تین تین چیزیں چھپیں۔ سبھی خوش ہوئے۔

خدا کرے آپ خوش ہوں۔ یعنی چند دوستوں کا ایسا ساتھ میسر ہو۔ جس میں غم غلط کیا جا سکتا ہو۔ یا غم کو بڑھایا جا سکتا ہو۔ ورنہ زندگی کسی کام کی نہیں۔

محمد طفیل

9/11/70

---

ڈھاکہ

نقوش بھائی

السلام علیکم۔ افسانہ زیرِ ٹائپ تھا جب آپ کا خط ملا۔ میں اسے جلدی بھجوانا بھی چاہتا تھا ــــ کسی بھی جگہ۔ کیونکہ یہاں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے اس لئے اگر یہ مغربی پاکستان میں کسی کے ہاتھ میں پہنچ جاتا تو مجھے تسلی رہتی کہ محفوظ ہے۔ اسی ذہنی کیفیت میں آپ کا خط ملا۔ تو میں فوراً بھجوا رہا ہوں۔

ایک شرط ہے۔ اس میں سے حذف کچھ نہ کریں اگر کچھ کاٹنے کی خواہش ہو۔ تو ہرگز شائع نہ کریں بلکہ اسے مندرجہ ذیل پتے پر بھجوا دیں بذریعہ ڈاک ہی سہی۔

مسز مسعود مفتی۔ معرفت مسٹر بی اے خان

۱۰، کوئنز روڈ QUEENS ROAD لاہور

میں اسے دوبارہ مشرقی پاکستان میں نہیں منگوانا چاہتا وہاں محفوظ رہے گا۔

جو بھی فیصلہ کریں چھاپنے یا نہ چھاپنے کا ۔ اس سے مجھے مطلع کریں ۔
امید ہے میرا پہلا خط مل گیا ہوگا ۔ جو تین چار روز پہلے لکھا تھا ۔ خدا کے لئے اسے سنجیدگی سے پڑھئے اور کچھ کیجئے ۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے ۔

خاکسار مسعود مفتی

---

لاہور

برادرم ! تسلیم !

آپ کا افسانہ ملا ۔ پڑھا ، دہل گیا ۔ مگر اس معاملے میں نہیں دہلا کہ اسے روک لوں ۔ یا نہ چھاپوں ۔ میں ضرور چھاپوں گا ۔ اور بغیر کسی قطع و برید کے

ارے ہاں !

آپ کا ایک طویل خط پہلے بھی ملا تھا ۔ اجازت دیں تو اسے بھی چھاپ دوں ۔ تاکہ لوگوں کو ، اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی فکر ہو ۔ کیا کچھ ہو چکا اور کیا ہو رہا ہے ۔ یہ سوچتے ہوئے دل ڈوبنے لگ جاتا ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ حالات اب بھی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہماری مشکلیں آسان کریں تو کریں !

اب میں آپ کو ہر روز ایک خط لکھا کروں گا ۔ اس خواہش کے ساتھ نہیں کہ مجھے میرے ہر خط کا جواب ملے ۔ بس رفاقت کے لئے !

محمد طفیل

۲/۱۰/۷۱

---

ڈھاکہ

۵ / ۱۰ / ۷۱

طفیل بھائی

السلام علیکم ۔ آپ کا عنایت نامہ ملا ۔ پڑھ کر تسلی ہوئی کہ آپ افسانہ بغیر قطع برید کے چھاپیں گے ۔ اگر وہ سب کچھ اسی انداز میں چھپتا رہا ۔ جو میں یہاں گرد و پیش دیکھ کر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں ۔ تو مجھے یہاں آنے پر ملال نہیں ۔ بلکہ خوشی ہے ۔

صفحہ ۱۰ پر جو فٹ نوٹ ہے ۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس میں اس طرح ترمیم کر دیں ۔

" درج ذیل واقعات کی سند کے لئے ملاحظہ کریں " مشرقی پاکستان پر حکومت پاکستان کا وہائٹ پیپر ۔
صفحہ ۶۹ ( انگریزی ایڈیشن ) "

خط کے متعلق بھی آپ کا رد عمل دیکھ کر بہت تسلی ہوئی ۔ آپ اسے شوق سے شائع کریں ۔ اور میری سرکاری پوزیشن کا خیال کرتے ہوئے کچھ کاٹنے کا ارادہ نہ کریں ۔ بلکہ سب کچھ بھول کر اسی انداز میں شائع کر دیں ۔ اگر آج بھی برملا باتیں کہنے سے ہم لوگ جھجکیں گے ۔ تو نہ معلوم پھر کب کہیں گے ——— اگر میری قسمت میں گورنمنٹ کے ہاتھوں پھانسی لکھی ہے تو چلیے اسی خط سے شروع کرتے ہیں ۔ آپ اللہ کا نام لے کر سارا ہی شائع کر دیں ۔

یہاں کے حالات پر مصطفیٰ زیدی مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے ؂

کس طرف سجدہ کروں، کس سے دعائیں مانگوں
اے مرے شش جہت قبلہ و کعبہ مدد دے!!

آپ کے خطوط کے وعدہ کے لیے از حد مشکور ہوں۔

خاکسار مسعود مفتی

---

لاہور۔

برادرم۔

میں نے وعدہ کیا تھا کہ جلد جلد خط لکھا کروں گا۔ آج کوئی ضرورت یا دریافت طلب تو کوئی بات نہ تھی۔ بس ایسے ہی خط لکھ رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آج ادھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ "تازہ افسانہ ہی کی بات کریں۔ یہ تو کل لکھ چکا ہوں کہ افسانہ ضرور چھپے گا۔ میری اس رائے سے ظاہر یہ بھی ہوتا ہے کہ افسانہ پسند ہے۔ بلکہ لفظ ضرور سے "خوب پسند" کا اظہار ہوتا ہے۔

آپ نے افسانہ کا نام "صدیوں پار" رکھا ہے۔ کیا اس سے بہتر عنوان اور کوئی نہیں ہو سکتا؟ ذرا سوچئے اور بتایئے۔ میں یہ بات یوں کر رہا ہوں۔ صدی تو فارسی کا لفظ ہے اور پار ہندی کا۔

اور ہاں یہ بھی بتایئے کہ افسانہ کی اگر آخری دو سطریں حذف کر دیں تو آپ کو کوئی اعتراض ہو گا؟

میں بعض الفاظ بدلنا چاہتا تھا۔ مگر آپ کے آرڈر کے مطابق کچھ کر نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر، جہاں آپ نے یہ لکھا ہے کہ کئی ساون کے بعد، میں کبھی لفظ ساون استعمال نہیں کرتا کیونکہ اس سے بیوی کے بھائی یاد آ جاتے ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

۱/۱۰/۷۴ آپ کا محمد طفیل

---

ڈھاکہ
۱۱/۱۰/۷۱

نقوش بھائی

السلام علیکم۔ حسبِ وعدہ آپ کا خط ملا۔ وعدہ تو خوش کن تھا ہی۔ مگر یہ نامہ دیکھ کر اس سے بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ ایسے خوشگوار حادثات سے ہمارے چہرے پر رونق ضرور آجاتی ہے۔ چاہے وہ غالب کے انداز میں بیمار کے اصل حال کو نہ بدل سکے۔

آپ کے سوالوں کا جواب ذرا اُلٹی ترتیب سے دے رہا ہوں۔

۱۔ "ساون" کی بجائے "سال" والی بات سو فی صدی درست ہے۔ ضرور ایسا ہی کر دیجئے۔ میں آپ کے قلم سے "تصحیح" کے خلاف کبھی بھی نہ تھا۔ میں تو اُس قلم زنی کے خلاف ہوں جو کسی خوف مصلحت یا ناگواری سے وجود میں آتی ہو۔ یا افسانے کے تاثر کو ادھ موا کرتی ہے۔

۲۔ عنوان کی بھی سن لیجیے۔ اِس افسانے کے عنوان نے مجھے بھی بہت تنگ کیا۔ کئی ایک عنوان بدل کر رکھے گئے۔ بالآخر یہی ٹھیک جچا

ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ سارے افسانے میں ایک حرف بھی فالتو نہیں۔ عنوان سمیت۔ بلکہ عنوان تو افسانے کا حصہ بن گیا ہے۔ ذرا صفحہ ۱۳ پہ تیسرے پیرے میں لفظ "صدیوں" کی تکرار دیکھئے آخری حصے میں "صدیوں بعد کا کل" پہ غور کیجئے۔ صفحہ ۱۱ پہ "پہلی بار" "سات سو سال تک" کا ذکر دیکھئے۔ صفحہ ۱۰ پہ تیرہ سو سال پہلے کے تین واقعات دیکھئے۔ (حضرت ارقم کا مکان۔ مسجد قبا کی تعمیر اور مسجد قبلتین کا ذکر) یہ ساری چیزیں بتلاتی ہیں کہ افسانے کا کینوس بہت وسیع ہے۔ صدیوں تک پھیلا ہے۔ افسانے کے بنیادی لمحے سے (جو آخری نقطے پر آتا ہے) صدیوں پہلے اور پھر صدیوں بعد کا احاطہ کرتا ہے اور کوئی مناسب لفظ ایسا نہیں ہے جو پہلے اور بعد کو نبھا کر کے وسعت کو برقرار رکھے۔ سوائے "پار" کے۔ جو حال کے دونوں طرف مار کرتا ہے۔ ماضی میں بھی اور مستقبل میں بھی۔ آپ کا فرمانا بجا ہے کہ ہندی اور فارسی کا ملاپ ہو جاتا ہے مگر اب تو دونوں اردو میں مستعمل ہیں اور پھر جو عنوان افسانے کی بنتی میں بنا گیا ہو۔ اُسے بدلنا مشکل ہی ہوگا۔

۴۔ افسانے کی آخری دو سطور کے متعلق آپ کا استفسار بڑا دلچسپ ہے۔ جیسے میں نے عرض کیا کہ افسانے کا کوئی حرف فالتو نہیں۔ آپ ذرا ان سطور کو صفحہ ۱۰ کی ان سطور سے ملا کر پڑھیں:

۱۔ " وہ اچانک مڑا۔"
"کہاں جاؤ گے" اس کے ساتھی نے حیرت سے پوچھا۔
" خدا معلوم "

---

۲۔ " اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بیت المکرم کی سیڑھیاں اترنے لگا جو اُسے ایک دم اجنبی لگنے لگ گئی تھیں ........
اس کی آنکھوں کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی (افسانے کے شروع میں بھی آنکھوں کا ذکر ہے۔ جہاں مسجد کا ذکر زندگی کی مسکراہٹ کے طور پر آیا ہے)

---

۳۔ آج اُس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ بیت المکرم کے ڈیزائن میں مینار کوئی نہ تھا۔ (آپ جانتے ہیں افسانے میں بڑی محنت سے مینار کے ساتھ ایک ذہنی کیفیت۔ روحانی لگاؤ اور جذباتی وابستگی قائم کی گئی ہے)

---

افسانے کی آخری دو سطور کو نمبر ۱، ۲، ۳ سے ملا کر پڑھیں تو وہ ان کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور اگر آپ ان کو حذف کرتے ہیں۔ تو مندرجہ بالا تینوں ادھ بنے دھاگوں کی طرح لٹکتے رہ جاتے ہیں۔

دراصل یہ کہانی ہے۔ ایک آئیڈیل کے بننے اور نمود پانے کی اور پھر مکمل DISILLUSIONMENT کی۔ کہ نہ صرف وہ آئیڈیل ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ بلکہ آگے بھی روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ اپنے گھر کے سب لوگ گنوا کر۔ اور زندگی میں دوسری دفعہ یہ حادثہ سہہ کر۔ اُسے بغیر مینار کی مسجد ایمان کی کمزوری لگتی ہے۔ جس پہ سے اس کا اپنا یقین ڈول جاتا ہے۔ اُس کی واپسی اُس یقین کی موت ہے۔ جو اتنے بڑے صدمے نے اُس پہ ٹھونس دی ہے۔ ان دو آخری سطروں کے بغیر اُس کی مکمل ناامیدی۔ مایوسی اور بے بسی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اور افسانہ اپنے انداز سے ادھورا رہ جاتا ہے۔

ممکن ہے آپ اسے مبالغہ سمجھیں۔ مگر یہاں کے لوگوں سے بات کریں جو ان حادثات کا شکار ہوئے ہیں۔ تو مستقبل کی تاریکی کے احساس کی شدت سے آپ کانپ جاتے ہیں۔ سید ضمیر جعفری یہاں آئے تھے۔ ۱۴ اگست کو ایک مشاعرہ کروایا۔ جس کے وہ صدر تھے۔ بہت طویل مشاعرہ تھا کوئی پینتیس کے قریب شعراء نے شرکت کی۔ ذرا ان سے پوچھئے کہ جو کچھ وہاں پڑھا گیا۔ وہ مشاعرہ والی فضا بناتا تھا۔ یا امام باڑہ میں مرثیہ خوانی کا سماں پیش کرتا تھا۔ حساس لوگوں کا ایمان ہر چیز سے اُٹھ گیا ہے۔ اور انھیں آج کل زندگی محض ایک بھیانک موت کا انتظار لگتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی تلقین امید کی کرن بن رہی ہے۔ نہ پاکستان کی آئیڈیالوجی۔ اور نہ کوئی اور انداز وعظ۔

دو واقعے سن لیجیے۔ ایک چند ہفتے پہلے پیش آیا اور ایک آج ہی کا ہے۔ تصویر کے دونوں رخ ہیں۔

شبیر حسین کاظمی اردو کے پروفیسر ہیں۔ بنگلہ اور اردو کے COMMON الفاظ پر تحقیق کر کے کتاب لکھی اور رائٹرز گلڈ سے انعام پایا۔ یہاں کی زبان کا۔ ادب کا کلچر کا اس طرح مطالعہ کیا کہ نمک بن کر نمک کی کان کو سونگھا۔ میرے پاس آئے کہ مجھے کسی طرح مغربی پاکستان تبدیل کرا دو۔ میں نے ڈھاکہ تو تبدیل فوراً کرا دیا۔ اور تھوڑی بحث کی کہ آپ لوگوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیئے۔ ڈھاکہ میں آپ محفوظ (نسبتاً) ہوں گے۔ یہیں رہ جایئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے "میرے چار لڑکے میری آنکھوں کے سامنے ذبح کئے ہیں۔ میں کیسے رہوں؟" — میرے پاس کوئی جواب نہ تھا ۔۔۔ وہ آج کل چھٹی لے کر کراچی گئے ہیں پرسوں خط آیا ہے کہ جب تک تبادلہ نہیں ہوتا۔ واپس نہیں آؤں گا — ایسے شخص کے ڈولتے ہوئے ایمان کو آپ کیسے سہارا دے سکتے ہیں؟

آج دفتر میں بیٹھا تھا۔ تو دوسرا واقعہ پیش آیا۔ ایک بنگالن خاتون ملنے آئی کسی کالج میں پڑھاتی ہے۔ سیدھی سادی۔ گرہستن سی کاٹ۔ مخلص سے اطوار۔ کرسی پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگی۔ نہ سلام۔ نہ کلام۔ چند منٹ اُس نے جیسے تیسے گزارے ہوں گے۔ مگر میرا سارا کمرہ اذیت سے بوجھل تھا۔ جب وہ بات نہ کر سکی تو بالآخر اُس کے کاغذ دیکھے۔ معلوم ہوا کہ اُس کا خاوند بیرونی ممالک میں P.H.D کر رہا ہے۔ اور یہ اُس کے پاس جانا چاہتی ہے۔ ڈیڑھ سال کا بچہ ہے۔ خاوند کو کورس ختم کرنے میں پانچ سال لگیں گے۔ گر نئے PROCEDURE کے مطابق INTELLIGENCE والوں نے اسے جانے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ ہمیں بھی نہ کرنا پڑا — دونوں کی دو سال پہلے LOVE MARRIAGE ہوئی تھی۔ اکیلی یہاں رہے گی۔ تو نہ معلوم حالات اس سے کیا کھیل کھیلیں۔ کبھی خاوند کو دیکھنا ہی نصیب ہو یا نہیں۔

ذرا انسانی سطح پر سوچئے۔ نہ ادھر والوں کو چین ہے۔ نہ اُدھر والوں کو۔ مشرقی پاکستان میں جو بھی جس طرف ہے آج کل شدید کرب میں مبتلا ہے اور ۹۰ فی صدی لوگ ایسے ہیں۔ جو ہر چیز سے ناامید ہیں۔ ذرا ان کو مذہب۔ مجبوری۔ تقدیر۔ صبر۔ استقامت یا کسی اور فلسفے سے سہارا دینے کی کوشش تو کیجئے۔ اپنے مرنے والوں کے حالات سنا کر ایسے ایسے سوال پوچھیں گے کہ عقل و دانش۔ ایمان اور جذبے کا منہ پھر جائے گا۔ خود میں جب کبھی نماز پڑھنے لگتا ہوں۔ تو نماز کے بیچ میں نماز کے الفاظ کے اندر سے ایسے سوال سر اٹھانے لگتے ہیں۔ جو کہ دل کرتا ہے کہ یا تو مجھے نماز کا ترجمہ نہ آتا اور یا پھر زندگی کے وہ پہلو نہ دیکھتا جو یہاں قدم قدم پر بکھرے ہیں اور افق تا افق چھائے ہیں۔

یہاں آ کر ان لوگوں کی آنکھوں میں جھانکئے۔ ہیبت، بے یقینی، وہم اور ان دیکھے بوجھوں سے لبریز فضا کو دیکھئے۔ ریلیف کیمپوں کی سسکتی ہوئی خاموشی کو سنئے۔ ہر طرف منڈلاتی ہوئی موت کے پروں کو دیکھئے تو ان دو سطروں کی وضاحت خود بخود ہو جائے گی۔ عام فضا اور لوگوں کی ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ روایتی پیمانوں کے مطابق کئی چیزیں جو وہاں ناجائز لگتی تھیں۔ یہاں جائز سی لگنے لگ جاتی ہیں — اور اگر ہمارے افسانے

اس صورتِ حال سے منہ چھپاتے ہیں تو ہمیں قلم توڑ کر پھینک دینے چاہئیں۔ کوئی حق نہیں رہتا ہمیں لکھنے کا۔ ایک خط پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اپنے طویل خط کے متعلق آپ کے استفسار کے جواب ہیں۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔

خاکسار مسعود مفتی

---

لاہور

برادرم۔ سلام مسنون!

میں نے افسانہ [illegible] کے بارے میں بعض باتوں کی وضاحت چاہی تھی۔ اگر آپ مطمئن ہیں تو بندہ بھی اطمینان الرحمٰن بننے کے لیے تیار ہے۔ خط سے ظاہر ہوا کہ آپ کے نزدیک کسی نقطے اور کسی شوشے کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں، (بلکہ گنجائش نہیں) اگر کوئی واقعی پہلے لفظ کی حرمت سے لے کر آخری لفظ کی تقدیس تک کا خیال رکھتا ہو تو پھر اس کی تحریر کے بارے میں سوچنا عبث ہی ٹھہرے گا۔ لہذا صاحب! بندہ ایمان لے آیا۔ چنانچہ طے ہوا کہ میں اب سوانے سالوں کے، سب کے ساتھ نباہ کروں۔ بہت اچھا!

اس دور کا ادیب بے حس ہو گیا ہے۔ پہلے مشرقی پاکستان میں طوفان آیا تھا۔ اس پر کچھ نہ لکھا گیا۔ پھر انتخابی قیامت کی الجھن پر کسی نے کچھ نہ لکھا۔ ایسے میں آپ کی تحریریں مینارۂ نور ثابت ہوں گی۔

بے شک حالات مایوس کن ہیں۔ مگر یہ قوم معجزوں پر ایمان رکھتی ہے اور دیکھا یہ گیا ہے کہ قدرت بھی ہم نالائقوں کا ساتھ دے ہی دیا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس دلدل سے پھر نکل جائیں۔ ویسے بھی جب تک جان میں جان ہو یاوری کیجیے۔ لہذا میاں مسعود الرحمٰن! اپنی مخلصانہ سعی کو، خدا کی خوشنودی جان کر سرگرمِ عمل رہیے۔ ہمارے بس میں تو صرف اتنا ہی کچھ ہے۔

امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔

اور ہاں! خط چھاپ رہا ہوں۔ پیارا خط!
بہ حیثیت تحریر پیارا، بہ حیثیت مطالب پریشان کن!

۱۴/x/۷۱

آپ کا محمد طفیل

---

ڈھاکہ

نقوش بھائی۔ السلام علیکم

غالب نمبر ملا۔ شکریہ۔ دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھے کا وعدہ۔ اسے کہتے ہیں ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ میری دعا ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔

آپ توقع کر رہے ہوں گے کہ میں آپ کو مبارکباد دوں گا۔ بات بھی صحیح ہے۔ مبارک ملنی بھی چاہیے۔ مگر آپ کو مبارک دینے

والوں کا اتنا انبوہ کثیر ہوگا کہ ایک میرے اضافے سے کوئی فرق نہ پڑے گا ۔ اس لئے مبارک کی بجائے ایک اور چیز کرنا چاہتا ہوں ، جو کسی نے نہیں کی ۔ وہ یہ کہ آپ سے ہمدردی کرتا ہوں ۔ جب سے غالب نمبر دیکھا ہے ترس آ رہا ہے ۔ اور آپ کی کوشش محنت اور لگن کے ضائع جانے کے خیال سے لرز اٹھتا ہوں ۔

خاکم بدہن —— مگر آج کل مشرقی پاکستان میں بیٹھ کر اس گناؤنے خیال سے کسی دم چھٹکارا نہیں ملتا کہ اردو کا کوئی مستقبل نہیں ۔ اور آپ کی ساری کوششیں جو آج کے قاری کے علاوہ آئندہ نسلوں پر بھی احسان کی مانند ہیں ۔ بالکل اکارت اور ضائع جائیں گی ۔

آپ کے خیال میں ، دس سال بعد ( بلکہ تیس سال بعد ) اردو پڑھنے والے کتنے ہوں گے ؟ !

ذرا سوچئے اور پریشان ہوئیے ۔

دوسری جنگ عظیم کی بات ہے ۔ اردو بولنے والے افغانستان ، ہندوستان ، برہما ، سیلون اور سنگاپور وغیرہ ہر جگہ مل جاتے تھے ۔ یہ زبان الف لیلوی پیر کا لڑو ہوتا تھا ۔ جو ہر دیار میں راہ دکھاتا تھا ۔

اور آج کیا ہے ؟ ! !

پہلے ہندوستان کو لیجیے ۔ اس کا شمالی اور وسطی حصہ اردو کا گہوارہ تھا ۔ اور اب ایک ایسی زبان پر ایسا انداز میں زور دیا جا رہا ہے کہ اگلی دو نسلوں کے بعد اردو پڑھنے والا میوزیم میں ہی ملے گا ۔ ایک ہندی زدہ نئی زبان ہوگی جسے ہم اپنی خوش فہمی سے اردو زبان کی لچک کہہ کر قبول کر لیں تو اور بات ہے ورنہ وہ اردو نہیں ہوگی ۔ نہ اس کے دامن کی وسعت ہوگی بلکہ دریدہ دامن کے چند ٹکڑے ہوں گے جن سے اصل کپڑے کی پہچان نہ ہو سکے گی ۔

اب پاکستان کو لیجئے اور مشرقی پاکستان سے ہی شروع کیجئے ۔ آپ لوگ وہاں یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں غیر بنگالیوں کو قتل کیا گیا ہے ۔ جو یا تو بہار کے تھے یا مغربی پاکستان کے تھے ۔ جی نہیں یہ تو صرف تصویر کا ایک رخ ہے ۔ مکمل تصویر یہ ہے کہ یہاں اردو اور صرف اردو کو مارا گیا ہے ۔ عجیب الطرفین بنگالی جو صدیوں سے یہاں رہتے ہیں صرف اسی وجہ سے قتل کئے گئے ہیں کہ وہ اردو بول سکتے تھے ( مادری زبان بنگالی کے علاوہ ) یہی وجہ ہے کہ یہاں سے ایسے بنگالی بھی بھاگ کر کراچی وغیرہ بس رہے ہیں ۔ جو یہاں تو اردو والے تھے اور وہاں کبھی اردو والے نہیں سمجھے جائیں گے ۔

یہاں پر تو اردو کے نام سے لوگوں کی آنکھوں میں خون نکل آتا ہے ۔ کیونکہ اُن کی ساری سیاسی ، علمی اور سماجی کوششیں سنسکرت سے جائز یا ناجائز تعلقات بنانے میں لگی ہیں ۔ اسی مخالف فضا میں چند مٹھی بھر لوگ اردو بولنے والے ۔ یعنی سات کروڑ کی آبادی میں صرف پندرہ لاکھ ( زیادہ سے زیادہ ) کے قریب ۔ ان میں سے بمشکل ایک لاکھ تعلیم یافتہ ۔ ان میں سے بھی محض چند ہزار ادب سے دلچسپی رکھنے والے ۔ اور ان میں بھی محض مشت بھر ہی سنجیدہ ادب کی طرف مائل کدھر کھپے گا آپ کا غالب نمبر آج کل —— اور آئندہ ۔

اور پھر یہ نہ بھولیے کہ یہ چند لاکھ اب اپنے لئے یہاں کوئی مستقبل نہیں دیکھتے ۔ موت ان کا مقسوم بن چکی ہے ۔ جلد یا بدیر ان کو نسلی منافرت کی صلیب پر خون دینا ہے ۔ جن کے وسائل ہیں ۔ وہ مغربی پاکستان جانا چاہتے ہیں ۔ اور جن کے نہیں ہیں —— وہ ہندوستان —— سنا آپ نے ۲۴ برس یہاں گنوانے کے بعد واپس ہندوستان ۔ جیسے ہی بارڈر کھلے گی ۔ ان میں سے بیشتر وہاں چلے جائیں گے ۔ کئی تو بڑا کتے

ہیں ——— اور وہاں کیا ہوگا۔ سندھ کے سیل محلوں میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو جائیں گے۔

مجھے بتائیے کہ اسے پار بنگلہ اور اس پار بنگلہ میں آپ کا فاتحہ ممبر کون پڑھے گا؟

آپ سندھ کی طرف آئیے۔ یونیورسٹیوں میں سندھی زبان ہو گئی۔ اندرون سندھ میں اُردو بولنے والے پر پھبتی۔ مضحکہ ——— بلکہ ——— گالیاں۔ راجہ داہر سوسائٹیوں کے چرچے۔ علاقائی زبان اور مادری زبان پر جار حانہ اصرار۔ یہی رفتار رہی تو بقول کسے ۵۰ سال بعد اُردو زبان صرف ناظم آباد کی زبان رہ جائے گی۔

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی کم و بیش یہی حالت ہے کہ ہر جگہ اردو کو کشمش اور پستو کی طرح مارا جا رہا ہے۔ سوکن کی طرح دھکے دے دے کر گھر بدر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لے دے کے پنجاب رہ جاتا ہے مگر وہاں پنجابی زبان علمی انداز کی بجائے سیاسی انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ چار چھ سال تک کئی نئی لہریں بن جائیں گی۔

یہ سب باتیں تو اپنی جگہ پر تھیں۔ مگر آج کل مشرقی پاکستان میں بیٹھ کر ایک اور چیز کا پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے حالات نے اُس طوفان کو راستہ دے دیا ہے جو کوریا اور ویٹ نام میں چنگھاڑتا رہا ہے۔ حضرت نوح والے تندور سے پانی نکل چکا ہے اب صرف وقت اور دیلے کی بات ہے کہ بین الاقوامی قوتیں دائیں اور بائیں بازو کا بھیس بدل کر ٹکرائیں گی۔ جس کی چنگاریاں میرے اور آپ کے دیکھتے دیکھتے پورے برعظیم میں پھیل جائیں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ بائیں بازو کی تحریکیں ہمیشہ علاقائی زبانوں کا سہارا لے کر آگے بڑھتی ہیں ——— یہاں بھی اور وہاں بھی یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اور اس عمل میں اُردو کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔

اس پر ایک ستم اور بھی ہے ——— مشرقی پاکستان آکر دیکھئے۔ کسی زمانے میں یہاں اُردو LINK LANGUAGE کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مگر اب انگریزی ملک تلک تک ہے اور یہ طے شدہ امر ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ تمام صوبوں میں انگریزی کو رابطہ زبان بنانے کی شعوری کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ اسے واحد حل تسلیم کر لیا گیا ہے ——— جی ہاں واحد حل ——— انگریزی نے پہلے تو سکولوں سے کندھے مار مار کر اردو کو نکالا۔ اب ملک سے بھی نکالے گی۔

آپ کہیں گے کہ میں یہاں کی FENSE فضا میں رہ کر دماغی توازن سے ہٹ کر تاریک انداز میں سوچ رہا ہوں۔ براہِ خدا آپ وہاں بیٹھ کر کسی زاویے سے تجزیہ کریں اور مجھے مستقبل میں اُردو کی کوئی امید دکھا دیں تو میں ممنون ہوں گا۔ یہاں تو اس محاذ پر فیض کا شعر یاد آتا ہے ۔

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں، چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

آپ نے اُردو کی اتنی خدمت کی ہے۔ اردو کی دنیا میں آپ کا مقام ہے خدا کے لئے کچھ اس کے لیے کیجیے۔ صرف بڑے بڑے نمبر نہ چھاپیئے بلکہ ان کو آئندہ کے لئے تحفظ دینے کے لئے بھی کچھ کیجیے۔ آپ کی آواز اُٹھ بھی سکتی ہے۔ اور اُس پر کچھ ہو بھی سکتا ہے۔ مگر ہم بالکل بے بس ہیں۔

میں تو خود اسی حکومتی نظام کا پُرزہ ہوں، جو پچھلے ۲۳ برس میں اُردو کی خاموش موت کا نظارہ کرتا رہا ہے۔ اگر کچھ کیا ہے تو کچھ کے

ہی دیتے ہیں۔ چاہے نہیں رکھے۔ میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا ہوں کہ اِس نظام کا حصہ ہونے کی وجہ سے اردو کے جنازے کو کندھا دیتے وقت قدم آہستہ رکھوں اور سسکی زور سے نہ لوں کہ چارپائی نہ ہلے۔ مگر آپ تو آزاد ہیں۔ اگر آج کل آپ لوگ کچھ نہیں کرتے تو پھر یہ وقت نہیں ملے گا۔

پچھلے دنوں لاہور آیا تھا تو خیال تھا آپ سے مل کر یہ رونا روؤں گا۔ مگر آپ کہیں آگے گئے ہوئے تھے۔ اور بات دل میں ہی رہی۔ اب غالب نمبر دیکھ کر لپٹ پڑا ہوں۔ کہ اِسی نمبر کی خاطر کچھ کیجیے۔ جس طرح بچے کے لیے انشورنس پالیسی خریدتے ہیں۔

یہاں کے حالات آج کل اتنے عجیب اور دل فگار ہیں کہ گھبرا کر دھڑا دھڑ افسانے لکھ رہا ہوں۔ مگر ابھی تک یہاں کی روح گرفت میں نہیں آئی۔ بالکل کسی نئی صنف ادب کا تقاضا کرتی ہے یہ روح۔ مگر چال اِس قیامت کی ہے کہ تجربوں کا وقت نہیں دیتی۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔

خاکسار مسعود مفتی

۲۷/۹/۷۱

---

لاہور

بھائی!

آپ سے کتنی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ موقع ہاتھ آتا ہے تو میں ہاتھ نہیں آتا۔

جب بھی سنا کہ آپ تشریف لائے اور میں نہ ملا تو دل ٹوٹ ٹوٹ گیا۔ کاش موقع واردات پر موجود ہوتا۔ آئندہ ایسا موقع تلاش نہ کیجیے گا کہ اِدھر میں نکلوں، اُدھر آپ پہنچیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ بندہ عادت کے خلاف ایک عام شمارہ چھاپ رہا ہے۔ جس میں اچھی اچھی تخلیقات کا ہونا ضروری ہے۔ تو پھر کیا کہتے ہیں، حضورِ والا؟

میں بہت خط چور (کام چور سے) ہوں۔ آپ مجھے ضرور خط لکھتے رہیں۔ میری صحت جو گر رہی ہے سنبھل جائے گی۔

سچ کہتا ہوں۔ آپ کو دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

محمد طفیل

۲۶/۹/۷۱

---

ڈھاکہ

نقوش بھائی

السلام علیکم۔ آپ کے خطوط برکھا کی موسلا دھار بوندوں کی طرح یکے بعد دیگرے مل رہے ہیں اور ذہن میں سرور کی وہی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے بھی اندازہ نہیں رہا کہ میرے کس خط کے جواب میں آپ کا کون سا خط ہے بہر حال یہ تسلی ہے کہ میرے آپ کو مل رہے ہیں اور آپ کے مجھے مل رہے ہیں۔

ابھی ابھی ریڈیو پر سنا ہے کہ پاکستان کی ہاکی ٹیم نے سپین میں ہندوستان کی ٹیم کو ہرا دیا — یوں سمجھئے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ خدا کرے یہی نمونہ سیاسی محاذ پر بھی ہو۔

"باقی سب خیریت ہے۔"

امید آپ ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔

۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

خاکسار مسعود مفتی

---

لاہور

برادرم!

میں یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ "دو بچوں" کا دل بہلا رہے۔ ادیب اور بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کبھی اس پر غور کیا؟ وہ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض—

آپ نے ہاکی کے میچ کی بات کی ہے تو یہ روداد بھی سن لیجئے۔ جس دن یہ میچ ہو رہا تھا۔ اس دن میں اسلام آباد میں تھا اور مختار مسعود کے ہاں! عین اس وقت مجید مفتی صاحب نے ہمیں چائے پر بلا رکھا تھا جب ہم اُن کے ہاں پہنچے تو انہوں نے نہ سلام نہ دعا، لمبا سا منہ لٹکا کر یہ بات کہہ دی "یار پاکستان کو تو ایک گول ہو گیا ہے۔"

"اچھا؟"

"ہاں!"

ہم بوجھل قدموں سے چل کر ڈرائنگ روم تک پہنچے۔

مجید مفتی نے کہا — "اب کیا ہوگا؟"

مختار مسعود نے کہا — "اب کھیل ہوگا اور کیا ہوگا۔"

میں کیا بتاؤں کہ اُس دن مجید مفتی نے ہماری چائے کیسے کیسے حرام نہ کی۔ مگر جب پاکستان کا پلڑا بھاری ہونے لگا تو پھر وہ اُٹھ اُٹھ کر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ جب یہ اعلان ہوا کہ پاکستان میچ جیت گیا ہے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا "یار طفیل کیسے ہو؟" حالانکہ ہم میں توکل کے بادشاہ شیخ منظور الٰہی بھی موجود تھے۔ وہ برابر کہہ رہے تھے "مفتی یہ کھیل ہے۔ ذرا صبر تو کرو۔"

آپ نے لکھا ہے کہ "خدا کرے یہی نمونہ سیاسی محاذ پر بھی ہو۔" اُدھر اتنے گرگ باراں دیدہ، اِدھر ایک سپاہی وہ بھی نادیدہ! انجام معلوم!

۲۶/۱۰/۷۱

آپ کا محمد طفیل

---

ڈھاکہ ۱ر نومبر ۱۹۷۱ء

نقوش بھائی!

السلام علیکم۔ آپ کو جب یہ خط ملے گا تو میں بھی لاہور میں ہوں گا۔ مگر آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔

ناراضگی کی بات نہیں - ترس کا مقام ہے - انشاءاللہ ۱۴ تاریخ کو پہنچوں گا - اور سات کو واپسی براستہ کراچی - خود نہیں جارہا بلکہ سے جایا جارہا ہوں - ہمارے وزیر تعلیم دورے پر کراچی اور لاہور جارہے ہیں - میں اردلی میں ساتھ ہوں گا - چنبہ ہاؤس میں ٹھہروں گا - اُن کے ساتھ ہی - پھر بھی شاید چند لمحوں کے لئے جاسکوں -

میں عید اِدھر ہی کروں گا - آگے پیچھے دو چار چھٹیاں بھی ہیں - مگر لاہور کا سفر کرنے کے لئے آج کل قارون کا خزانہ چاہیے - اور ہماری جیب تو چیل کا گھونسلا ہی رہی ہے - جو چار چھ پیسے پہلے پیٹ پر خرچ ہوتے تھے - وہ سرکاری ملازمت میں آنے کے بعد اب ٹالر کے اخراجات پر منتقل ہو گئے ہیں - لہٰذا عید بقر عید گوشہ نشینی میں کرنے کا جواز بن جاتا ہے - دوسری وجہ یہ بھی ہے - کہ اُن دنوں کی چھٹیوں میں کچھ لکھنے کا بھی ارادہ ہے -

مشرقی پاکستان کے متعلق آپ سننے کو مشتاق رہتے ہیں - ایک تازہ ترین انکشاف سن لیجیے - میں جب سے ان لوگوں کے قصے سنتا تھا کہ کس طرح ساری مخلوق پاگل ہو کر خون و خرابے میں لذت کی حد تک گم ہو جاتی ہے تو سوچتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے - ۱۹۴۷ء میں نواکھالی کے فسادات بربریت میں اپنی مثال آپ تھے - مہاتما گاندھی کو اگر برت رکھنا پڑا تو تب رُکے - ۱۹۶۹ء میں صدر ایوب کے خلاف مہم چلی تو یہاں پھر قتل و غارت شروع ہوا - خالص بنگال نے اپنے سے بھی خالص بنگالی کو قتل کیا - کبھی صلیب کی طرح درخت میں گاڑ کر اور کبھی شیو کرنے والے سیفٹی بلیڈ سے زندہ آدمی کی کھال کھرچ کر - اور پھر اب ۱۹۷۱ء میں زندہ آدمی کے جسم سے سرنج سے سارا خون نچوڑ کر قتل کرنا ایک بات ہے - قتل کرنے میں لذت حاصل کرنا دوسری بات ہے - اور پھر فسادات کا ذکر نہیں عام حالات میں بھی شک شبے اور وہموں کے شکار ہیں -

آخر اس اجتماعی طرزِ عمل کی وجہ کیا ہے؟ بہت سوچا - مگر آج جواب ملا ہے - اور وجہ بھی بڑی معقول ہی ہے کہ ان لوگوں میں SENSE OF HUMAOUR کی کمی ہی نہیں - فقدان ہے - حسِ مزاح نہ ہونے سے یہ لوگ نہ تو اپنے آپ پر ہنس سکتے ہیں - اور نہ دوسروں کے ساتھ مل کر - شعر و نغمہ میں ڈوبے ہیں - موسیقی ان کے رگ و پے میں سرسراتی ہے - مگر یہ ساری خوبیاں حسِ مزاح نہ ہونے سے وقت پڑنے پر ڈھیر ہو جاتی ہیں - ان کو ہنسنا سکھا دیجئے - تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا - یعنی پاکستان کا مسئلہ حل ہو گیا - کمی تو مغربی پاکستان میں بھی ہے - مگر ادھر تو باقاعدہ قحط ہے - اس لیے امپورٹ کی ضرورت ہے -

میرے ہاں "سب خیریت" - آپ کی خیریت کا طالب ہوں -

خاکسار مسعود مفتی

---

لاہور

برادرم!

آپ کے ہنگامی پروگرام کا علم ہوا - بھلا ایسا کیوں نہ ہو جب کہ پوری قوم ہی ہنگامہ پسند ہو - آپ کی ہنگامہ پسندی میں وقت کی کوتاہی کا چکر ہے - قوم کی ہنگامہ پسندی میں وقت کی فراوانی کا! اچھا ہوا کہ آپ نے بتا دیا کہ اب کے وزیر موصوف کی موجودگی میں

ملنا مشکل ہوگا۔ چھپ رہتے تو "ڈانگ سوٹا" ہو جاتا۔

مغربی پاکستان میں بھی سفاکوں کی کمی نہیں۔ امیر محمد خان اور محمد خان اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر وہاں کے سفاکانہ پن کے سامنے ان کی کارروائیاں ہیچ نظر آتی ہیں۔ ہمارے ہاں کے سفاک منٹو کے ممد بھائی ہیں جو قتل کرتے ہیں مگر یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ مقتول کو تکلیف ہو۔ وہاں کی سفاکی میں لطف و حظ کا پہلو ہے۔ جو حد درجہ شرمناک ہے۔ سیفٹی بلیڈ سے کھال کھرچنا، خنجر سے خون نچوڑنا، ایک کلمہ گو کا دوسرے کلمہ گو کے ساتھ یہ سلوک! استغفر اللہ!

آپ کہتے ہیں کہ بنگالیوں میں حسن مزاح کی کمی ہے۔ میں اس بات کو نہیں مانتا۔ جو خطہ قدرتی حسن کے علاوہ رقص اور موسیقی ایسی لطافتوں سے مالا مال ہو۔ وہ حسن مزاح سے اس حد تک بیگانہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سارا کھیل سیاست کا ہے۔ کرسیوں کا ہے۔ محرومیوں کا ہے زیادتیوں کا ہے۔ ورنہ بنگالی ہم سے زیادہ مسلمان ہیں۔

ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کی آماجگاہ ڈھاکہ یونیورسٹی ہے۔ پلان وہاں بنتے ہیں۔ اس کے بعد آگ کو پورے خطے میں بکھیر دیا جاتا ہے اس کا کوئی علاج ڈھونڈئیے۔ ورنہ دشمنوں کے ارادے پورے ہو جائیں گے۔

آپ کہتے ہیں کہ اُدھر والوں کے لئے جنسی امپورٹ کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا تو پھر میں اس بات پر ہنسنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

میں نے اپنی روش سے ہٹ کر سیرۃ رسول پر ایک نمبر چھاپنے کا پروگرام بنایا ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس میں کس حد تک کامیابی ہوگی۔ بہر حال میرا جذبہ بھرپور ہے۔

۱۲/۱۱/۷۱ — محمد طفیل

---

ڈھاکہ

۳۰/۱۱/۷۱

طفیل بھائی

السلام علیکم۔ آج یہ سوچتے سوچتے خط لکھنے بیٹھ گیا کہ آیا آپ کا "نقوش" PIA کی پروازیں بند ہونے سے پہلے چھپ جائے گا یا نہیں؟ کس حال میں ہے وہ؟

ڈھاکہ آج کل مزے میں ہے۔ اور جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں وہ نہیں ہے۔ دھماکے کم۔ آبادی گھروں میں دبکی ہوئی قیمتیں زیادہ اور زندگی معمول کے مطابق جنگ سرحدوں پر ہو رہی ہے۔ اور بڑے زور کی ہو رہی ہے۔ جیسے بیئر شراب کے گلاس پر جھاگ کی ایک —— مگر ہم نچھٹ کے سے اطمینان میں ہیں —— صرف سوچیں بے کل ہیں۔

لوگ آج کل شاہ نعمت اللہ کی آٹھ سو سالہ پرانی پیشین گوئیوں میں اپنی نجات ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور پچھلے ۲۳ برس کی کوتاہیوں پر نظر ثانی کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ہم بھی خوب لوگ ہیں۔ کبھی دیرینہ ماضی میں گم۔ کبھی غیر محدود مستقبل میں امام مہدی کے ظہور کا انتظار اور حال سے ہمیشہ بے حال۔

یہ باتیں چھوڑیئے اور بتائیے کہ نقوش کب تک آ رہا ہے۔ ہمدم دیرینہ کی طلب ہے۔ مسیحا اور خضر کے ستائے ہوئے ہیں۔
اور کوئی نئی تازہ؟

خاکسار مسعود مفتی

---

لاہور

برادرم!

جنگ وہاں ہو رہی ہے۔ دل ہمارے اِدھر دھک دھک کر رہے ہیں۔ ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ انجام سے ڈرتے ہیں۔
۱۹۶۵ء کی جنگ ہم نے میدانِ جنگ میں تو جیت لی تھی مگر تاشقند کے "میدان" میں جا کر ہار دی تھی۔ اب کے کیا ہوگا؟ کون کیا کہہ سکتا ہے؟
پہلے ہمارے مقابلے میں اکیلا ہندوستان تھا۔ مگر اب کے ہندوستان کے ساتھ ساری دنیا ہے۔ اُن میں شامل ہمارے بھائی بھی!
پہلے اِس قوم کے پاس اخلاق تھا۔ ایمان تھا۔ آج اس کے پاس نہ ایمان ہے اور نہ اخلاق، سرخرو کس برتے پہ ہوں گے۔ آپ کا خیال صحیح ہے کہ اب ہم قوتِ عمل کی بجائے معجزوں پر بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ اگر معجزوں ہی پر بھروسہ کرنا ہوتا تو ہمارے رسولؐ نہ ایسا کرتے۔ انہوں نے تلوار کیوں اُٹھائی؟
ویسے لوگ کہہ رہے ہیں کہ ابابیلوں نے اپنی چونچوں میں کنکریاں اٹھا لی ہیں۔ لہٰذا دشمن ـــــ
نقوش بوجوہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔ زیادہ عرض کروں گا تو آپ کی حکومت کا رویہ شرمناک نظر آئے گا۔ لہٰذا آپ ہی بھلی! کوئی کورٹ مارشل کرائیے۔

محمد طفیل

۵/۱۲/۷۱

---

کیمپ ۲۹
۲۵/۶/۷۲

طفیل بھائی

اسلام علیکم۔ ڈھاکہ کی خط و کتابت کا سلسلہ جنگ نے منقطع کیا۔ تو اس کے بعد نہ آپ مجھ تک پہنچے۔ نہ میں آپ تک پہنچ سکا۔ مگر بیگم کے خطوں سے آپ کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی۔ تازہ ترین خط میں آپ کے صاحبزادے کی شادی کی نوید تھی۔ سوچا کہ پہلے نکاح کے چھوہاروں سے محروم رہا۔ اب مبارک سے تو نہ رہوں۔ چھوہارے مجھے ملتے تھے مگر مبارکباد مجھے دینا تھی۔ ملنے والی چیز نہ ملے تو الزام قسمت کے سر منڈھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر دینے والی چیز خود نہ دی جائے تو اپنے پر بخل کا الزام لگتا ہے۔ جو شخص پہلے ہی ناکردہ جرائم کی سزا بھگت رہا ہو۔ وہ ایک اور الزام کا بوجھ کیسے سہے گا۔ اور وہ بھی دوستوں کی طرف سے۔ لہٰذا یہ خط۔ اس تمہید کے بعد مبارکباد قبول فرمایئے۔ میری طرف سے دولہا اور دلہن کو بھی مبارک پیش کریں۔ خدائے تعالیٰ ان کو نئی زندگی کی ساری خوشیوں سے نوازے۔
ویسے آپ سے دھندلی سی عکسی قسم کی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ نقوش کا غالب نمبر ۳ اُن چار کتابوں میں سے ہے جو بمشکل بچا

کر ساتھ لا سکا۔ وہ "سب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی" والا کام کر دیتا ہے۔ مگر اس سے آگے بڑھ کر نصف ملاقات تک آنا چاہا تو غالب والی ہی تکلیف ہوئی کہ ؏

"نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا"

ــــ اور میں یہی سوچ کر خاموش رہا کہ خطوط کے قیمتی راشن کو صرف "خیریت خدا سے نیک مطلوب" وغیرہ کے لیے استعمال کرنا اسرافِ نعمت ہوگا۔

چلو اسی زبان میں ملاقات ہوتی رہے۔ ؎

بات کرنے کے سو طریقے ہیں ۔۔۔ خامشی بھی زبان ہوتی ہے

یہاں کا تعارف یہ ہے کہ ؎

چاند تارے ادھر نہیں آتے ۔۔۔ ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

شب و روز یکساں ہیں۔ بہت ہی یکساں۔ مگر ہر لمحے کا اپنا علیحدہ موڈ ہے۔ کبھی تو یہ حال ہے کہ ؏

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا ۔۔۔ کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا

اور کبھی ؏

کبھی دل مچلا ؏

چین سے جوشِ جنوں دیوارِ زنداں ہم بھی دیکھیں گے

ــــ اور کبھی اسی دل کا یہ عالم کہ ؏

"کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت"

یوں بھی ہوا ہے کہ ؏

"قفس میں چیخ اٹھا ہے سکوتِ تنہائی"

دن یوں شروع ہوتا ہے ؏

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

اور ختم یوں ہوتا ہے ؏

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

مگر ان سب پر یہ موڈ حاوی رہتا ہے ؏

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے ۔۔۔ تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

مسکراہٹ ہی رہی لب پہ بہرحال ندیم  یوں بھی پوچھا ہے مزاجِ غمِ دوراں ہم نے

اور ساتھ یہ تسلی بھی ہے کہ ؎

کوئی تو بات تھی ہم کو طاہرِ تبۂ دار  وگرنہ شہر میں کچھ کم نہیں تھے سودائی

ویں اثنا سیاسی افق پر ہندو پاکستان مذاکرات ایسے آتے اور گذر جاتے ہیں۔ جیسے سواریوں سے بھری ہوئی بس منتظر مسافروں کو بس شاپ پر چھوڑ کر آگے نکل جائے اور ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ؎

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد۔

اگر آپ کو یہ خط مل جائے تو ان تمام دوستوں کے پاس میری وکالت کر دیں جنھیں گلہ ہے کہ میں خط نہیں لکھتا۔ میری کوشش تو اس وردِ تک ہے کہ ؎

اے صبا گر بجوانانِ چمن باز رسی

خدمتِ ما برساں سرو و گل و ریحاں را

ندیم صاحب۔ انتظار حسین۔ عبدالعزیز خالد۔ شہزاد احمد۔ انور سجاد۔ اشفاق احمد۔ محمد خالد اختر اور ناصر زیدی کی خدمت میں مرا سلام عرض کر دیں۔

خدا کرے آپ کی صحت پہلے سے اچھی ہو۔

P.S. معلوم نہیں ریڈ کراس والے رسالہ پہنچانے میں مدد کریں گے یا نہیں اُن سے دریافت کر لیں اور اگر وہ راضی ہوں تو براہِ کرم نقوش کا ایک آدھ پرچہ بھجوا دیں۔ ویسے وہ کتابیں وغیرہ تو پاکستان سے ادھر پہنچا رہے ہیں۔

نیاز کیش مسعود مفتی

۲۵/۶/۷۳

---

لاہور

برادرم،

جب آپ لاہور کی ڈپٹی کمشنری چھوڑ کر ڈھاکہ جانے لگے تھے تو میں نے آپ کی سیکرٹری تعلیمات والی نوکری کو پسند نہیں کیا تھا۔ بلکہ کہا تھا کہ کسی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کر لیں مگر وہاں نہ جائیں۔ کیونکہ میں اپنے سیاست دانوں کے کچھن دیکھ رہا تھا۔ لیکن آپ نے میری بات کا جواب یہ دیا تھا "فرض پکار رہا ہے مجھے جانا چاہیئے۔"

"جائیے۔ شوق سے جائیے!"

آپ کے اندیشے صحیح تھے۔ آپ کہتے تھے۔ ہم ختم ہو رہے ہیں۔ میں کہتا تھا۔ ختم ہونے میں دیر لگے گی یعنی اس بات پر دونوں کا اتفاق تھا کہ ہم ڈوب رہے ہیں۔ آپ کہتے تھے۔ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ میں کہتا تھا۔ ابھی پانی کمر کمر تک ہے۔ آپ کا اندازہ اس لئے صحیح نکلا کہ آپ خود حالات کے سمندر میں تھے۔ دنیا کے نقشے میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر اتنی جلد تبدیلی کا کوئی

تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

آپ کا یہ بھائی خط خوب ہے۔ سراسر رمز آمیز، اس خط میں کتنی آرزوئیں ہیں اور کتنی حسرتیں کون جانے اور کون محسوس کرے! آپ کو میں بھی بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ مگر کیا کروں۔ ہم دونوں آزاد نہیں۔ آپ کا جسم آزاد نہیں، میرا قلم آزاد نہیں۔ تو مصلحتیں ہیں۔ آپ کا یہ خیال صحیح ہے ۔

بات کرنے کے سو طریقے ہیں      خامشی بھی زباں ہوتی ہے

یہ قوم کبھی اپنے فیصلے قوتِ بازو سے کیا کرتی تھی۔ مگر آج وہ بین بین کر رہی ہے اور کوئی سنتا نہیں۔ اسے نیرنگیٔ زمانہ نہیں، اپنے اعمال کا ثمر کہنا چاہیے۔

آپ نے اپنے خط میں اشعار سے خوب کام لیا۔ اگر خدانخواستہ میں بھی آپ کی طرح قید میں ہوتا تو پھر ہو سکتا تھا کہ میں بھی اسی زبان میں بات کرتا۔ ویسے اپنے اوپر اشعار کو اتنا حاوی نہ ہونے دیجئے گا کہ خود بھی شعر کہنے لگیں۔ اگر یوں ہوا تو پھر میں یہ سمجھوں گا کہ دوہری سزا کاٹ رہے ہیں۔

میں اور اہلیہ کبھی کبھی بھابی کے پاس چلے جاتے ہیں۔ چند آنسو بہا کر واپس آجاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم آپ کے لئے کر بھی کیا سکتے ہیں؟

۱۳/۹/۷۲      محمد طفیل

---

لاہور      طفیل بھائی

السلام علیکم۔ تین سال پہلے میں ڈھاکہ میں تھا اور آپ لاہور میں۔ مگر خطوط کا تانتا ملاقات کی شکل بنا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے ایک خط میں برعظیم میں اردو کے مستقبل کے متعلق کچھ خدشوں کا اظہار کیا تھا۔ اُس کے فوراً بعد ہند و پاک جنگ آگئی۔ پھر ڈھاکہ میں دشمن آگیا اور ہمیں گرفتار کرکے ہندوستان لے گیا۔ دو سال وہاں کاٹنے کے بعد آیا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ میرا وہ خط نامکمل تھا کیونکہ اس وقت مجھے بعض کوائف کا علم نہ تھا۔ اب یہ چیزیں نظر سے گزری ہیں۔ تو یہ سطور اسی خط میں اضافہ سمجھئے۔

میں ہندوستان میں قید میں تھا۔ اسی لئے وہاں کی تحریروں کا بہت ہی تھوڑا حصہ نظر سے گزرتا تھا۔ اس میں سے بھی مجھے بہت کچھ مل گیا اگر کوئی وہاں کی ساری تحریریں پڑھ سکے تو کیا کچھ نہ ملے۔ بہر حال جو کچھ مجھے وہاں ملا اور میں بمشکل ساتھ لا سکا۔ وہ بلا تبصرہ آپ کی خدمت میں بھجوا رہا ہوں۔

۱۔ نریش کمار شاد نے ایک کتاب لکھی ہے "جان پہچان" جسے ہند پاکٹ بکس دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہ اُردو کے بارہ مشہور ادیبوں سے انٹرویوز ہیں۔ اس کتاب میں سے چند سوالات اور اُن کے جوابات درج ذیل ہیں۔

۱۔ کرشن چندر

سوال: "کیا موجودہ اُردو ادب جمود کا شکار ہے؟"

جواب :" اردو ادب جمود کا شکار تو نہیں جس بے انصافی کا شکار ہے اس سے تم سب لوگ واقف ہو ۔ یہاں زبان ہی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اور تم جمود کا رونا روتے ہو ۔"

سوال :" کیا ہندوستان میں واقعی اُردو زبان ختم ہوتی جا رہی ہے؟" میں نے کرشن کی بات کاٹتے ہوئے کہا " کیا اردو زبان کا مستقبل . . . . ."

جواب :" (کرشن نے بھی میری بات کاٹتے ہوئے کہا) فی الحال حالات سنگین ہیں ۔ کچھ با اثر لوگ منتقمانہ جذبہ سے متاثر ہو کر اُردو کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں .. .. .. .. .."

ب ۔ راجندر سنگھ بیدی

سوال :" آپ کے نزدیک ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟"

جواب :" بادی النظر میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے لیکن اگر ادیب صحت مند ادب تحریر کریں تو یہ زبان جواب دب گئی ہے ۔ پھر کھل کر سامنے آ جائے گی . . . . ."

سوال :" اور دیوناگری رسم الخط اپنا لینے کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب :" میں تو یہ کہتا ہوں کہ دیوناگری رسم الخط کچھ لوگ استعمال کریں گے لیکن محض خانہ پوری کرنے کے لئے ۔ یہ زبان اسی صورت اور اسی رسم الخط میں زندہ رہے گی ۔ کچھ لوگ ڈرتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں اُردو نصابوں سے خارج کی جا رہی ہے ۔ اس لئے نئی پود اس سے بے بہرہ ہوتی ۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر کے لئے اس زبان کو گھن لگ جائے لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں ہو سکتا ۔"

ج ۔ اوپندر ناتھ اشک

سوال :" آپ کے نزدیک ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟"

جواب :" بہت اچھا نظر نہیں آ رہا ہے ۔ تاوقتیکہ اُردو کو چاہنے والے لوگ اور اردو نواز انجمنیں اس زبان کی اشاعت اور تحفظ کے لئے عملی کوشش نہ کریں .. .. .. .. .. .. .. .. دس بارہ مسودے اُردو کے میرے پاس ہیں لیکن انھیں چھاپنے والا کوئی نہیں "گرتی دیواریں" میں نے اردو میں لکھا تھا ۔ ہندی میں وہ اب تک ساٹھ ہزار سے زیادہ شائع ہو چکا ہے ۔ اور اس کے انگریزی ترجمے کو شائع کرنے کی بات بھی یونیسکو کی طرف سے چل رہی ہے لیکن کتنا بڑا المیہ ہے کہ اُردو میں یہ کتاب ابھی تک نہیں آ سکی ۔"

سوال :" بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اُردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ ہندی رسم الخط کو اپنا لیا جائے ۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب :" ایسا کرنے سے ہندی اردو ہو جائے گی، یا شاید ایک ایسی زبان معرضِ وجود میں آئے جو نہ ہندی ہو گی نہ اردو۔"

۵ - خواجہ احمد عباس

سوال: "آپ کے نزدیک ہندوستان میں اردو ادب کا مستقبل کیا ہے؟"

جواب: "میرے خیال میں اردو ادب کا مستقبل تو ایسا ہی ہے۔ جیسا ہندوستان کی دوسری زبانوں کا۔ البتہ رسم الخط کا مستقبل تاریک ہے۔ موجودہ رسم الخط کچھ برسوں میں ختم ہو جائے گا۔۔۔۔"

۶ - پرکاش پنڈت

سوال: "ہندوستان میں اردو زبان کے مستقبل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

جواب: "خطرے سے خالی نہیں۔"

---

۲ - اخبار "قومی آواز" لکھنؤ - مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۷۲ء

اداریے میں سے اقتباس: (عنوان: اردو کے لئے دشواریاں)

"آندھرا پردیش کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ طالب علم جنہوں نے ایسی درسگاہوں سے ڈگریاں حاصل کی ہیں - جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ ان کو اس وقت تک سرکاری ملازمت نہیں دی جائے گی۔ جب تک وہ ہندی یا ریاست کی سرکاری زبان تیلگو میں مہارت حاصل نہیں کر لیں گے۔ یہ خبر معاصر اخبار "نیو ایج" نے دی ہے۔

اس اعلان کا اثر یہ ہے کہ جن تعلیم گاہوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ وہاں طالب علموں کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی ہے ۔۔۔۔۔ دہلی جو اتر پردیش کی طرح اردو کا گہوارہ ہے وہاں اردو کی حالت برسوں سے خراب چلی آ رہی ہے حد یہ ہے کہ سکولوں میں اردو داخل ہے مگر اس کی نصابی کتابیں فراہم نہیں کی جاتیں۔۔۔"

۳ - السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مورخہ ۱۹/۳/۷۲

انڈیا میں مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد

| زبان | سال ۱۹۶۷/۶۸ء | سال ۱۹۶۸/۶۹ء |
|---|---|---|
| آسامی | ۱۲۵ | ۵۱۰ |
| بنگالی | ۱۲۸۴ | ۱۶۵۴ |
| انگریزی | ۶۱۴۷ | ۶۳۸۲ |
| گجراتی | ۸۸۳ | ۱۲۱۷ |
| ہندی | ۳۱۷۱ | ۴۰۵۳ |
| کنادا | ۳۸۲ | ۱۰۶۰ |

| | | |
|---|---|---|
| کشمیری | .. | ۷ |
| ملیالم | ۵۸۰ | ۸۹۹ |
| مرہٹی | ۱۶۱۵ | ۱۳۲۶ |
| اڑیا | ۲۳۲ | ۵۷۸ |
| پنجابی | ۵۰۴ | ۴۶۵ |
| سنسکرت | ۹۳ | ۲۶۱ |
| سندھی | ۴۶ | ۲۹ |
| تامل | ۹۴۳ | ۹۲۸ |
| تیلگو | ۷۲۲ | ۱۱۰۸ |
| اردو | ۳۳۱ | ۴۸۰ |

(ان میں نصابی کتابیں شامل نہیں ہیں)

۴ ۔ میں نے دیکھا نہیں مگر سنا ہے کہ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو دیوانِ غالب شائع کیا گیا ہے ۔ اس کے ایک صفحے پر اردو اور دوسرے صفحے پر دیوناگری رسم الخط ہے ۔

طفیل بھائی ۔ کیا کسی تبصرے کی گنجائش ہے ؟؟؟

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے ۔

والسّلام
مسعود مفتی

۱۰/۳/۷۴

# ۱

## وہ فن کار

جن کی دو دو تخلیقات شامل ہیں

# گُل دان

## عصمت چغتائی

جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئیں ایک عجیب پُراسراری بدبو کا دھماکا اُن کے دماغ پر چڑھ گیا۔ انہوں نے مینٹل پیس کا سہارا لیا اور حلق میں شور مچاتے پت کو دبوچ لیا۔

کیسی میٹھی میٹھی مامتا کو چونکا دینے والی مہک دار بو تھی۔ چھاتیوں میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں جیسے ننھے ننھے "مبو" کے ہاتھوں نے چھو لیا ہو عجیب یادوں سے بوجھل سوگندھ تھی جیسی زچہ خانہ میں آتی ہے۔ کچے خون اور کالے دانے کے چٹخنے کی ملی جلی بو۔

وہ بو کے منبع کی تلاش میں اِدھر اُدھر سر پٹخنے لگیں۔ آنسو کھُردرے بالن کے پردوں کی طرح ان کے پپوٹوں میں چبھنے لگے۔ کیسا کیسا تر سلیا ہے انہیں اس مہک نے۔ تنہائیوں میں جب سب کی موجودگی میں بھی کوئی نہیں ہوتا تو یہی مہوے کے رسیلے پھولوں کی خوش بو آ کر انہیں درغلاتی ہے۔

"اب آپ بالکل ٹھیک ہیں!" ڈاکٹر کوہلی دو سال سے متواتر کہہ رہے تھے۔ یہ انہیں بھی معلوم تھا کہ وہ ٹھیک تھیں۔ پھر اُن سے انتقام لینے کے لیے ان کا علاج کروا رہے تھے۔ مرض اور علاج ایک دوسرے سے دو مشٹنڈے پہلوانوں کی طرح جوجھ رہے تھے۔ دیکھنا ہے کہ کون پالا مارتا ہے۔ کون چاروں شانے چت گرتا ہے۔ وہ ایک غیر جانب دار ریفری کی طرح اس دنگل کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک غیر فیصلہ کُن مسکراہٹ کے سوا اس اُکتا دینے والے تماشے میں جھونکنے کے لیے اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔

مہک اور قریب آ رہی تھی چکنی چکنی پھسلوان جو انہیں ہر چہار طرف سے ایک نشہ آور چادر میں لپیٹتی جا رہی تھی۔ ان کی نبضیں بے تابی سے اُچھل رہی تھیں۔ ہونٹوں میں خون سمٹ آیا تھا۔ آنکھوں کے کونوں میں ٹوٹے کانچ چبھ رہے تھے۔ ریڑھ کی ہڈی کے نچلے کٹڑے میں کسی نے بھالا مارا اور وہ دہری ہو گئیں لیس دار رس ان کے ٹخنوں تک بہہ آیا۔

پھر انہوں نے بو کی جڑ کو پا لیا۔ پچھلے ہفتے ڈاکٹر کوہلی نے انہیں بنفشے کے پھولوں کا گچھا دیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولے تھے مگر ان کی دیران آنکھیں بول رہی تھیں۔ وہ پھول سسک کر مُرجھا چکے تھے لیکن ان کی آنکھوں کے بول ابھی تک اتگ سے چپکے ہوئے تھے۔ انہوں نے پھول اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیے تھے مگر گل دان کا پانی بدلنا بھول گئیں۔

وہی پانی گلدان میں سڑ رہا تھا اور اتنی بھرپور مدھ ماتی بو اگل رہا تھا جیسے شراب کشید کی جا رہی ہو۔ ناک پر ساڑھی کا پلو دبا کر انہوں نے گل دان اُٹھایا لیکن فوراً سہم کر چھوڑ دیا۔ پانی بری طرح بجبجا رہا تھا۔ خمیر سا اُمڈ رہا تھا۔ کچھوے کی پیٹھ جیسا ابھارا سا اوپر اُٹھ رہا تھا۔ شاید گردش کا کوئی گلابی چیتوں دار پتہ گر کر سڑ رہا تھا۔ بس لسے چپکیلے باسی خون کے رنگ کے بلبلے اُٹھ رہے تھے۔ انہیں بڑے زور سے سردی لگنے لگی۔ ٹھنڈے پسینے کی لڑیاں ماتھے سے رینگ کر گردن میں پھسل گئیں۔

وردمنٹوں سے آ رہے تھے۔ نہ چاہتی تھیں کہیں دور بھاگ جائیں، کسی کو آواز دیں۔ مگر راہ فرار بند تھی۔ اپنا بدن چھوڑ کر وہ
کیسے بھاگ سکتی تھیں۔ اس جسم سے بھاگتے بھاگتے اب وہ شل ہو چکی تھیں۔ یہ لاش ان کا کبھی پنڈ نہیں چھوڑے گی۔
نہیں کر دن کا پتہ نہیں شاید کوئی پیاسا چوہا گل دان میں گر کر مر گیا ہے اور اب سڑ کر اس میں سے خمیر اٹھ رہا تھا۔ ننھے ننھے گلابی
پنجے کلپنٹوں پہ جمے ہوئے تھے بے پلکوں کی پھولی آنکھیں مزندی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ساڑھی کے کنارے لیس وار ٹخنوں پر سے بڑی مشکل
سے نوچے۔ پھر اسپول ز چھوٹے بندر کی طرح ہو گیا تھا اور اب تازہ کھلی ہوئی پٹمین کی مانند گل دان کے دہانے سے جھاگوں کی طرح
اُبل رہا تھا۔

سر آ گیا! انہوں نے اپنی رانوں کے بیچ میں رکھے ہوئے گل دان کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا۔ درد اب پے در پے چٹانوں
پہ سر پٹخ رہے تھے۔ کائنات چیخ رہی تھی۔ کندھے پھنسے ہوئے تھے۔ مسہری کی پٹیاں دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ پیچھے اکڑ گئیں۔
"بیٹی سانس کھینچ!" دور کہیں سے بی اماں مرحوم کے ٹھنڈے ٹھنڈے مرجھائے ہوئے ہاتھ ان کے عضو میں جھنائے ہوئے پیٹ
پر رینگ رہے تھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے پھسلتے ہوئے پیازی رنگ کے مغلوبے کو سمیٹ لیا۔ صدیوں کی پیاسی ممتا کے ہونٹوں
پر میٹھا چپچپا رس گھل گیا اور وہ ایک روپہلے کاسنی دھندلے غبار میں ڈوب گئیں۔
جب ان کی آنکھ کھلی تو کتنے لمبے بیچ میں سے گم ہو چکے تھے۔
بچے کا نال کس نے کاٹا؟ کب جھڑا؟ اس کے تن پہ کپڑے کیوں نہیں ڈالے؟
"اونہہ!" انہوں نے اکتا کر لمحوں کا مجمع پرے جھٹک دیا۔ وہ ان لمحوں کی شرارت سے بور ہو چکی تھیں۔ یوں ہی گڈمڈ ہو جایا کرتے
تھے۔ کھو جاتے پھر بے جگہ مل جاتے جہاں ان کا کوئی مصرف نہ ہوتا۔ وہ فکر مند ہو گئیں۔ لوگ انہیں خبطی سمجھتے ہیں۔ اب تو اور بھی دیوانہ سمجھیں گے
وہ سوچتی رہیں۔

"خدا اور خدا کے رسولؐ کی قسم یہ بچہ گل دان میں سے نکلا ہے... کیسے؟ اب یہ میں کیا جانوں! میں سائنسدان نہیں اور ابھی دنیا کے
بہت سے راز ہیں جن کا جواب بڑے بڑے سائنسدانوں کو بھی نہیں ملا۔۔ ہو گا کوئی قدرت کا راز!
مگر وہ جانتی تھیں کوئی نہ مانے گا سب اسے اُن کے دماغ کا فتور سمجھیں گے مگر فتور ان کی رانوں کی قینچی سے رینگ کر اُن کے
دیکھتے ہوئے پیڑو کو تھپتھپا رہا تھا۔ ایک دم ان کی ہنسی نکل گئی۔
وہ جھنجلایا لبسور تا چڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے بھوکے ہونٹوں میں گدگدی تھی اور میٹھی مدہوش کن ٹیسیں، ہو کے زندہ پلاؤ کی طرح وہ
مُنہ مار رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے کھیل رہا تھا۔ گاڑھا گاڑھا کاسنی دودھ اس کے گلابی ہونٹوں سے چھوٹ چھوٹ کر ناف تک بہہ رہا تھا
ہاتھ کی کہنی سے کاسنی بلور کی دھار داغ دار چادر میں جذب ہو رہی تھی۔
ابھی انسان نے جانا ہی کیا ہے؟ سائنس کا کوئی معجزہ کس وجہ سے ظہور میں آتا ہے کسی کو نہیں معلوم! شاید اس پانی میں کوئی
نو بہار جوڑا نہایا ہو گا۔ بیج کا ملن ہوا ہو گا۔ گل دان میں کچھ ایسے موافق عناصر جمع ہو گئے مہرباں کی کوکھ کا نعم البدل ثابت ہوئے جو ابھی سائنسدان
دریافت نہیں کر پائے ہیں، کچھ ایسے کیمیکل اجزا جن سے جان دار کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ مینڈک کے بیج بھی تو سطح آب پر تیرتے ہوئے تخلیق پاتے

ہیں۔ ہو سکتا ہے انسانی بیج کو بھی کوئی موافق گل دان اور ننھنشے کے سپھولوں کا سڑا ہُوا پانی راس آجائے اور تخلیق کے مدارج طے ہو جائیں
ایک دم ان کی چیخ نکل گئی۔ دانت بھیچے تو انہوں نے سسک کر اسے دور ڈھکیلا۔ حرام زادہ اُن سے کشتی لڑنے پر تُل گیا۔ ہنسی
سے بے قابو ہو کر انہوں نے بڑی مشکل سے پھسلا پھلا کر اتارا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر ان پر حملہ آور ہوتا وہ بدن چرا کر ایک ہی جست میں پلنگ
سے کھڑی ہو گئیں اور اس کا مُنہ چڑاتی جلدی سے غسلخانہ میں گھس گئیں۔

سارا بدن پسینے اور لیس سے چپ چپا رہا تھا۔ ٹھنڈا گرم نل کھول کر وہ پانی کے ٹب میں اُتر گئیں۔ گنگنے پانی کے لطیف لمس نے
انہیں سمیٹ لیا۔

ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ جلی حروف میں سُرخیاں نکلیں گی۔ دنیا بھر کے سائنسدان حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ کانفرنسیں ہوں گی
کمیٹیاں بیٹھیں گی۔ اخباری نمائندے ان سے انٹرویو لینے دوڑیں گے۔ ان کی اتنی شہرت اور ہر دلعزیزی دیکھ کر کبیر کا جی جل جائے گا۔ وہ
تو اسے بلی کے گو کی طرح چھپاتے پھرتے ہیں۔

انہیں ہمیشہ ہی حیرت ہوتی تھی کہ انہوں نے آخر کبیر سے کیوں شادی کی۔ وہ کونسا نازک لمحہ تھا جب انہوں نے فیصلہ کیا؟ ان کے بے پناہ
عاشق تھے۔ کسی کو بھی چن سکتی تھیں۔ سبھی ان پر جان دینے کو تیار تھے۔ کتنا حسین ہوتا ہے عمر کا وہ حصہ جب نرنگاہ لپکتی ہے تب کسی ایک کا
ہو رہنے کو دل نہیں چاہتا۔ غول در غول عاشق ہی بھاتے ہیں۔ ایک فرد اس غول کی کمی کو کیسے پُورا کر سکتا ہے۔ ان میں سے ایک اکیلے کو چن لینا
باقی کو بھول جانا کیسے ممکن ہے اور پھر آئیڈیل تو اس غول میں سے ٹکڑے بین کر بھی کچھ ادھورا سا بنتا ہے۔ کسی کی ناک، کسی کے کان، کسی کے
سلگتے ہونٹ، کسی کے ڈھیٹ ہاتھ۔

مگر دنیا والے دم نہیں لینے دیتے۔ ڈراتے ہیں، سہلاتے ہیں۔ کھونٹے سے باندھنے پر تُل جاتے ہیں۔ اماں بی آنسو بکھیرتی ہیں۔ ابا
صاحب مسکرانا چھوڑ دیتے ہیں اور پھر کہیں سے ایک عدد کبیرا آجاتے ہیں۔ راست باز، معصوم اور کنوارے، بھیگی بلی سنے۔ کچھ نہیں جانتے
کچھ نہیں سمجھتے۔ سوائے عشق کے۔ بدھو بٹھا دو بیٹھیں گے جو کھلاؤ کھا لیں گے۔ عاشقوں سے نہیں جلتے بلکہ خود ان پر عاشق۔ جی چاہے جتنا
مذاق اڑا لیں مسکراہٹ ماند نہیں پڑے گی۔ خاندان والے نہایت متعصب، سخت پردہ اور نماز روزہ کے پابند۔ بھلا ایسی بہو کیوں کر نگلیں گے
ایسا خاندان کیسے جھیلیں گے۔

"میں خاندان کو چھوڑ دوں گا۔ تمہیں اس سے کیا واسطہ؟"

مگر جب برات آتی ہے تو برقعے پر برقعے۔ باہر ڈاڑھیوں کی قطاریں۔ ساسیں، نندیں، دیورانیاں، جیٹھانیاں، سہلیبں، سالیاں
ایک غول بیابانی ہے چاروں طرف سے گھیر کے ابٹن مہندی الابلا۔

"اے تو کیا ہُوا۔ اپنی پرانی رسمیں ہیں۔ اماں بی کو ارمان لگ رہے ہیں۔ غول بیابانی نے سب کو مفلوج کر رکھا ہے۔ سب پر
چھایا ہُوا ہے۔

"جہیز میں ایک جوڑی موزہ نہیں، اوئی لوا!"

خیر فینسی ڈریس کی پارٹی ختم ہوئی اور گاڑی سیدھی سپاٹ سڑک پر جوں کی چال رینگ رہی ہے۔ سسک رہی ہے۔ ڈوریاں

تن رہی ہیں چیخ رہی ہیں خلا بڑھتی جا رہی ہے۔

الجھے گھنگھرؤں جیسے معصوم قہقہہ پر وہ چونک پڑیں۔ بچہ رینگ آیا تھا اور ٹب کے پاس کھڑا پانی میں ڈوبے ہوئے قمقموں کی طرف لپک رہا تھا۔ جھینپ کر انہوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اندر انڈیل لیا۔ وہ مشاق غوطے خور کی طرح مٹکے چہنے لگا۔ انہیں اس کی کہنیوں اور گھٹنوں پر میل کی پپڑیاں دیکھ کر بڑا تاسف ہوا۔

پھر بیچ کے لمحے کسی انجان سمندر میں ڈوب گئے۔ ابھی کی تو بات ہے وہ باسی خون کے بلبلے کی طرح گل دان میں سے اچھلا تھا اور ان کے مجبور لرزتے ہاتھوں میں پھسل آیا تھا۔ پھر کیا ہوا؟ کب ہوا؟ کچھ پکڑ میں نہیں آتا۔ خیالات مچھلیوں کی طرح کلبلا کر گرفت سے پھسل جاتے ہیں۔ خلا چھوڑ جاتے ہیں جو مرے ہوئے دھبوں سے پر ہونے لگی ہے۔ ان ہرجائی لمحوں کی طرح ایک دن خود ان کا وجود کسی انجانی گہرائی میں کھو جائے گا۔ پھر کیسے ملے گا؟ کہاں ملے گا۔؟

انہیں یاد کیوں نہیں آتا کہ تب کیا ہوا؟ دروازوں میں ایک جھری نہیں کھلتی۔ چولوں پر کائی جم کر خس و خاشاک اُگ آئے ہیں۔ اس گمنام جنگل سے نکلنے کے لیے وہ پھڑپھڑاتی ہیں۔ غیرمرئی سلاخوں کو جھنجھوڑتی ہیں۔ پتھریلی دیواروں سے سر مارتی ہیں مگر وہاں دیواریں نہیں ہوتیں، انسان اکیلا نہتا ہوتا ہے۔

اس کے ہونٹوں کے رونئیں اتنے گھنے اور سیاہ کب ہوئے؟ ابھی تو گل دان کے چٹخے ہوئے ٹکڑے ان کی پٹی تلے رکھے ہوئے تھے جما ہوا خون ابھی خشک بھی نہیں ہوا تھا۔ چیونٹیوں کی قطاریں بستر کے نیچے رینگ رہی تھیں، جسم میں چیونٹیاں چٹک رہی تھیں۔ ایک بڑا سا طوفان منہ پھاڑ کر انہیں نگل رہا تھا۔ موم بتی کی طرح وہ اس ولی کی ہتھیلی پر پگھلتی جا رہی تھیں۔

دور بہت دور اسی گنگنے پانی سے چھلکتے ٹب میں کبیر نے بھی طوفان اٹھائے تھے۔ کتنے موتی پانی میں رل گئے ایک بھی سلیقے سے پیر نہ جما سکا اور وقت سے پہلے ہی بہہ گیا۔ اگر گل دان میں بچہ پیدا ہو سکتا ہے تو موری کی غلاظت میں نہ جانے کتنے آنکھوں کے نور جاگے ہونگے زمین دوز گٹر میں سسکیاں لی ہوں گی۔ پھر دم توڑ دیئے ہوں گے۔ کسی ماتا کے لرزتے ہاتھوں نے نہیں جھیلا۔

شاید بہت سوں نے دم نہ توڑے ہوں۔ باہر رینگ آئے ہوں گے۔ یہ جو گلی گلی بل بل کرتے نظر آتے ہیں۔ ٹب کے پانیوں کے سپوت ہوں گے۔ سائنسدان ایک دن ان کی پیدائش کا بھید جان لیں گے اور ان کی حیرت انگیز بڑھوار کا راز بھی جان جائیں گے کہ کلہ پھوٹتے ہی جادو کی بیل کیوں بڑھ کر اپنے شکنجوں میں جکڑ لیتی ہے۔

انہوں نے خود کب سے سوچنا چھوڑ دیا۔ خواب آور ٹیبلیٹوں کی زد پر لمحے کھوتے رہے ملتے رہے۔ انہیں یاد نہیں کب اس نے انہیں اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹا، تولیے سے ان کا جسم خشک کیا۔ وہ تھکی ماندی اور سوئی سی اُسے دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے کپڑے پہنے، پیٹی کا بکل لگایا، میز پر سے کتابیں اُٹھائیں، انہیں ایک پیار اڑایا اور کھڑکی سے باغ میں کود گیا۔

انہیں بڑی شدت کی بھوک لگی تھی۔ کھانے کی میز پر وہ ندیدوں کی طرح کھا رہی تھیں۔ کبیر انہیں حیرت سے تک رہے تھے جیسے انہوں نے چور پکڑ لیا ہو۔ وہ نئی دلہن کی طرح جھینپ رہی تھیں۔ اُن کے رخساروں پر آتِ غضب کی پھبن تھی۔ دھیمی دھیمی سرخی زندگی کو پھاڑ کر سر اٹھا رہی تھی۔ آنکھوں میں رس گھل رہا تھا اور ہونٹوں کے کونوں پر تشنج نام کو نہیں تھا۔

"یہ ٹب کا پانی کہاں جاتا ہے؟" انہوں نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا:
"ٹب کا پانی، لاحول ولاقوۃ، زمین دوز گٹر میں جاتا ہے۔"
"گٹر میں؟" ان کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ "پھر کون سنبھالتا ہوگا انہیں؟"
"کنہیں؟" کبیر سٹر کھل گئے۔ اور جب بڑی تفصیل سے انہوں نے اپنا مطلب سمجھایا تو وہ برافروختہ ہو گئے۔ یہ عورتوں کو ٹب میں کیا مزہ آتا ہے! ان کی داشتہ بھی ٹب میں مچلنے کو بے قرار رہتی تھی۔ ایک نہایت بھونڈا اور احمقانہ فعل! ٹب میں تو اور بھی مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ وہ اب عمر کی ان حدوں کو چھو رہے تھے۔ جب زیادہ گرم چسکی سے زبان جل جایا کرتی ہے۔ ویسے ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ان میں کچھ گڑبڑ نہیں ذرا معتدل مزاج ہیں۔ شعلہ صفت بیگم نے انہیں اور بھی پسپا کر دیا ہے۔

وہ تو پہلے ہی دن بجھ گئے تو پھر نہ بھڑک سکے۔ درمیانیت کے وہ حد درجہ قائل تھے۔ جب خیانت پر برافروختہ ہوئے تو بیگم کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ تب سے ان کے چھکے چھوٹے تو پھر پکڑ میں نہ آئے۔ اسی وقت صفِ ماتم بچھ گئی۔ شب عروسی میں دھڑ سے سورج پھٹ پڑا وہ اپنے قدامت پسند خاندان سے اکتا کر بیگم پر ریجھے تھے، مگر یہ تو۔۔۔ یعنی بالکل حد تھی۔ وہ زندگی بھر اس گھاؤ کو نہ بھولے۔ جب بھی وہ بیگم کو چھوتے زخموں سے کھرنڈ اکھڑ جاتے۔ اعصاب بھیگی رسیوں کی طرح تن جاتے اور وہ برف کے بوجھ تلے سسکنے لگتے۔

بیگم پر بھی ان کے تضحیک آمیز التفات سے تشنج ہونے لگتا۔ طرح طرح کی گرہیں کسنے لگتیں۔ جیسے وہ کسی کی قے نگل رہے ہوں انہوں نے طلاق کی تجویز پیش کی مگر وہ تو انہیں قے سے بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوئی۔ شادی ہتھیلی پہ چپکے ہوئے دہکتے ہوئے انگارے کی طرح بن گئی جسے نہ جھٹک سکیں نہ پھونکیں مار کے بجھا سکیں۔

"یہ قطعی ناممکن خرافات ہے۔" وہ بڑبڑائے۔

"صرف اس لیے کہ سائنس دانوں نے ابھی اس راز کو نہیں پایا ہے۔ اگر عورت اور مرد ایک ہی پانی میں۔۔۔"

"لاحول ولاقوۃ!" انہوں نے پانی کے گلاس کو نادانستہ طور پر دور سرکا دیا۔ بیگم کا دماغ بھی کیا عجیب طور سے قلابازی کھاتا ہے۔ اب وہ کبھی اطمینان سے پیاس بھی نہ بجھا سکیں گے۔ انہیں گلے میں پھندے ڈالنے میں ملکہ حاصل ہے۔ کاش پیاری بیگم اللہ کو پیاری ہو سکتیں وہ قسمیں کھاتے تھے کہ وہ ہمیشہ ان کی یاد میں گریاں رہیں گے۔ کسی دوسری عورت کا منہ نہ دیکھیں گے۔ ان کی محبوبہ بالکل بکسوئے کی طرح ضروریاتِ زندگی میں سے تھی۔ بیگم کی اکڑن سے مفلوج ہو کر انہوں نے قطعی ڈاکٹر کی رائے پر اسے بطور مسہل کے استعمال کیا تھا۔ بس یار دوستوں میں ذرا ناک اونچی رہتی تھی کہ اتنی موڈرن اور حسین بیوی کے ہوتے ہوئے ان کی ضروریات کے لیے داشتہ کی ضرورت تھی۔ ویسے انہیں اس سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ بس ایک اسٹول سے زیادہ اس کی وقعت نہ تھی۔ اس کا خرچ بھی خود ان کی جیب سے نہیں نکلتا تھا۔ کمپنی کے ذمہ تھوپا ہوا تھا۔

"کیوں، کیا ایسا ممکن ہی نہیں کہ بیج کو سازگار کیمیکل اجزا مہیا ہو جائیں۔"

"مگر گل دان میں؟ استغفراللہ۔۔۔ کیا واہیات خیالات تمہارے دماغ میں ٹھنس جاتے ہیں۔ گولیاں پابندی سے کھا رہی ہو؟"

"ہوں!" ان کے ہونٹوں کے کونے تن گئے۔ گولیاں انہوں نے پہلے ہی دن فلش میں بہا دی تھیں لیکن سارے دن کبیر کو بیگم کا سوال یاد آ آ کر ستاتا رہا۔ کیا واقعی یہ ممکن ہے کہ ان کے جگر گوشے زمین دوز گٹر میں رینگ رہے ہوں گے۔ خدا کی پناہ کیا گھپلا ہو رہا ہوگا۔ کچھ

حساب نہ کتاب، بیگم تم سے خدا سمجھے!

"ڈاکٹر صاحب!" کمپیر نے بڑے پُراسرار لہجے میں کہا۔

"فرمائیے"

"اگر... اگر میاں بیوی یعنی کہ عورت مرد پانی میں نہائیں تو...؟"

"جی" ڈاکٹر کوہلی نے ہنکارا بھرا "عجیب احمق انسان ہیں پانی میں نہیں تو کیا مسوبل میں نہائیں گے، خواہ وہ زن وشوہر ہوں یا بھینسیں!"

"یہ پانی سڑتا ہے بجھاتا رہے"

"ہوں" موٹر بھی تسے ماڈل کی۔

"تو... اگر کچھ ساز گار کیمیکل مہیا ہو جائیں میرا مطلب ہے برتن میں"

"پانی کے برتن میں" ڈاکٹر کوہلی نے ٹھنڈے پانی کی بوتل کو دیکھا جو وہ وسکی میں ڈالنے کے لیے نکال کر لائے تھے "بچہ بن سکتا ہے؟"

"جی؟" ڈاکٹر کوہلی اُچھل پڑے۔

"سائنس دانوں نے ابھی زندگی کے بہت سے راز حل نہیں کیے.... اسے کیا آپ آرٹیفشل ان سیمنیشن کہیں گے یا کچھ اور؟"

ڈاکٹر کوہلی بچے وسکی کا گھونٹ کچھ بڑا مار گئے۔ پانی ملانے کے لیے بوتل اٹھائی۔ ایک ننھا سا بچہ نہایت شفاف پانی میں انگڑائی لے رہا تھا۔ جلدی سے انہوں نے بوتل رکھ دی۔ مگر ہمت کر کے وہ بڑی چھوٹی سی ہنسی ہنسے۔

"ارے کیا نئی بوتل کھولی ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب آپ کے سر کی قسم ایک بوند بھی پی ہو تو پیشاب ہی پیا ہو۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہا تھا کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ابھی کچھ دن ہوئے میں نے کہیں ایک آرٹیکل پڑھا تھا کہ آرٹیفشل ان سیمنیشن بہت کامیاب ہوا ہے"

"وہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے... مگر...."

اور کیمیکل کی مدد سے انسان بنانے کی بھی تگ و دو میں چل رہی ہیں۔

"ہاں ابھی ابتدائی اسٹیج میں ہے"

"ممکن ہے تجربہ ایک دن کامیاب ہو جائے"

"ہو سکتا ہے"

"اگر قدرتی طور پر فرمینٹیشن اور ضروری اجزا ایک جا جمع ہو جائیں تو..."

"پاسبل تو ہے" ڈاکٹر کوہلی کی بغلوں میں پسینے کی بوندیں پھسلنے لگیں۔

"اوہ!"

"جی کیا فرمایا؟"

"تو پھر کس کام کی یہ سالی فیملی پلاننگ!"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں عام طور پر اس کا امکان تو نہیں ویسے ..."

"اے جی پہنچے ڈولا ہی ہوں، اب آئیے نا کہ بس ٹیلی فون پر ہی چپک گئے" شریمتی جی نے پکارا۔

"ہاں ہاں، ضرور ... کل ..." ڈاکٹر نے ٹیلی فون بند کر کے ماتھے کا پسینہ قمیض کے کف سے پونچھا۔

"فینائل!" وہ ایک دم چونک کر بولے۔

"جی ہومٹر یا ایک دوں؟" شریمتی جی نے تازہ پھلکا تھالی میں پروس کر پوچھا۔

گٹر میں فینائل ... ہر جگہ فینائل ... پھولے ہوئے پھلکے کے پیٹ میں انگلی گھس گئی ڈاکٹر کا جی جلس گیا۔

پھر رات کو جب بیڈ لیمپ بجھا کر شریمتی نے ان کی پنڈلیاں تھامیں تو فینائل کا ایک زبردست بھبکا ان کے دماغ پر چڑھ گیا۔

"آج سو جاؤ" گٹر میں کلبلاتے کلکاریاں مارتے مکوڑے ان کے بند پپوٹوں کے پردوں سے جھولتے رہے۔

"یہ آپ کا وہم ہے بیگم۔ تکیے کے نیچے گرگٹوں کی طرح"

بیگم نے ایک بند سا قہقہہ لگایا ہی چاہا ہاتھ پکڑ کر لے جائیں اور وہ شاہ بلوط کا نوخیز پودا جو دوشالے کے تلے محوِ خواب ہے دکھائیں اور کہیں اتنا حسین رہم کبھی دیکھا تھا زندگی میں۔ ابھی گیلے بدن بھاگتا ہوا ٹب سے نکلا اور دوشالے میں گھس آیا۔ چھونا مت ہاتھ جھلس جائیں گے۔

"فرض کیجئے ایسا معجزہ ہو جائے تو؟"

"شاید" مین ہول" سے رینگ کر باہر بھی نکل آتے ہوں!" بیگم نے کہا تھا اور اس دن وہ سڑک پر کیڑوں کی طرح رینگتے بلبلاتے بچوں میں اپنی شباہت ڈھونڈتے رہے۔ ان کیڑوں پر انسانوں کا بڑی مشکل سے شبہ ہوتا تھا۔ مگر بے حد کوشش کرنے کے بعد ان گنت مکوڑے انہیں اپنی شکل کی بھونڈی سی نقل نظر آنے لگے۔ ایک لڑکی کی کنپٹیاں تو بالکل بیگم جیسی تھیں تب رقابت سے ان کا خون کھول اٹھا تھا ان کے ساتھ جو بیگم نے خیانت کی تھی اس کا ذکر انہوں نے اپنے کسی دوست سے نہیں کیا تھا۔ سنی سنائی باتیں دہرا دی تھیں ... ماتمی صورت بنائے پھرتے رہے تھے۔

"اگر خداوند کریم چاہے تو پانی پر آگ لگا سکتا ہے" بیگم نے یہاں ان کا گلا دبوچ لیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ خدا کی قدرت پر کبھی کو شبہ کرنے کی ہمت نہیں۔ وہ شراب پیتے ہیں، زنا کرتے ہیں۔ بزنس میں تگڑم لگاتے ہیں لیکن پھر بھی شدید قسم کے مسلمان ہیں اور مذہب کے بارے میں مباحثہ کو کفر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے جھوٹوں کو بھی بیگم سے نہیں کہا کہ پاک پروردگار کو انسان چھوڑ کر گٹر میں بچے لینے کی کیا ضرورت ہوگی۔ ویسے انسان کچھ گٹر سے کسی بات میں ہیٹا ہے؟

"خدا کی ذات سے کوئی شے بعید نہیں۔ بے شک وہ چاہے تو ..."

"اور یہ پانی کسی برتن میں مثلاً گھڑے یا گل دان میں"

"بکواس!"

"مگر اس برتن میں بنفشے کے پھول سڑ جائیں .... پانی رکھا ہے۔ خمیر اٹھتا ہے۔ بج بجاتا ہے ..." انہوں نے کھانے کی میز پہ گل دان کے منہ میں جھک کر دیکھا۔ کبیر کے منہ میں نوالہ غبارے کی طرح دم بہ دم پھولنے لگا۔

"خدارا بس کرو ..." انہوں نے بمشکل نوالہ اندر ڈھکیلا۔

آخر وہ اسے ایک کمرے میں کتنے دن چھپا سکیں گی۔ بسکٹوں اور چاکولیٹ پہ تو انسان جی نہیں سکتا۔ تبھی سے وہ ٹرسے اپنے کمرے میں سے جانے لگی تھیں۔ پھر ایک دن تو کبیر کو بتانا ہی پڑے گا۔ اس لیے وہ ہولے ہولے زمین ہموار کر رہی تھیں مگر زمین کم بخت ایسی اوبڑ کھابڑ تھی کہ قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

"ایسے بچے کی بڑھوار بھی عام بچوں سے مختلف ہوتی ہو گی۔" انہوں نے خود کو سمجھایا۔ "حیرت نہ ہونا چاہیے۔"

"واللہ مجھے کچھ نہیں معلوم!" کبیر چڑھ گئے۔ آرٹ کے طالب علم تھے۔ کبھی تھوڑی سی بیالوجی اور ہائی جین پڑھی تھی۔ ایسے ٹیکنیکل قسم کے سوالات سے بے حد احساسِ کمتری ہونے لگا۔

"قطعی مختلف ہوتی ہے۔ منٹوں میں بڑھتے ہیں ایسے بچے۔ ابھی دودھ پی رہے ہیں اور ابھی ..." وہ کلیجے سے اُلتی ہنسی کو نہ روک سکیں۔

کبیر صرف کھنکار کے رہ گئے۔ یوں بیٹھے بیٹھے بیگم نہ جانے کہاں اُڑ جاتیں۔ ان کی آنکھوں میں اُمنگیں ناچنے لگتیں۔ ہونٹوں میں خون بھر آتا اور ایسے سمٹتیں کھلتیں کہ کبیر بے آگ پانی بھڑک اُٹھتے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ان کی کھوپڑی اُتار کر چکنا چور کر دیتے اور ایک ایک خیال چن کر پیروں تلے مسل ڈالتے نیست و نابود کر دیتے۔ اماں جان ٹھیک ہی فرماتی تھیں کہ مُنہ زور گھوڑی قدم قدم پہ پٹخنیاں دیتی ہے۔ پالتو گدھا بھلا کہ ٹخر ٹخر زندگی کی گاڑی چلتی تو رہتی ہے یوں دم میں دباؤ دم میں اُلار نہیں ہوتی۔

کبیر نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹیلی فون اٹھایا اور ڈاکٹر کولی کو کال کرنے لگے۔

"بھوک؟"

"کھل گئی ہے۔"

"چہرہ؟"

"کھلا ہوا ہے۔"

"گرگٹ؟"

"نہیں اب تکیہ کے نیچے گرگٹوں کی شکایت بھی نہیں۔"

"تو پھر؟"

"ایک نیا پنج شاخہ، گھر میں نہ بچے!"

"جی کیا فرمایا ...؟"

"پانی میں نیچے۔ گھڑوں میں نیچے ... گل دان میں نیچے۔

ڈاکٹر کوہلی مسکرائے۔ تین سال سے بیگم زیر علاج تھیں۔ گھر میں خاصی فراغت بڑھ گئی تھی۔ اب تیرے سے شوہر بھی چلے بانس بریلی! نئی موٹر کا بیتیا ہوا سمجھو!

ڈاکٹر نے گم سم ہو کر کبیر کی طرف دیکھا۔ "شرمیتی جی ٹھیک ہی فرماتی ہیں کہ پاگلوں کے ساتھ سر مارتے مارتے ایک دن خود بھی چٹخنے لگو گے۔ اب اگر معجزہ ہوا تو کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"پھر وہ اپنا کون ہوا۔"

"کون؟" دونوں پھر بدکے۔

"اپنا ہی ہوا نا!" بیگم نے لجا کر خود کو سمجھایا۔

نہ جانے کیوں ادا سے ایک طرف کو جھکی ہوئی گردن اور ہونٹوں پر پُر اسرار مسکراہٹ دیکھ کر کبیر کے دل پر آرے چلنے لگتے تھے پر کمٹمنٹ کے بعد بھی چڑیا اُڑتی جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ جب یوں بیٹھے بیٹھے وہ کسی خیالی محبوب کی بانہوں میں کھو جاتی تھیں تو انہیں وہ خیانت یاد آ جاتی تھی۔ جو بیگم نے ان کی امانت میں کی تھی۔ وہ نصیب کے کھوٹے تھے۔ ہمیشہ کلاس میں پیچھے ہر کھیل میں پیچھے، بیگم تک پہنچے تو گول ہو چکا تھا۔ ویسے داشتہ بھی انہیں خوب برتی ہوئی ملی تھی، مگر وہ دلہن تو نہ تھی۔

"اگر میرے گل دان سے نکلا تو ... میرا ہوا نا ...!"

کبیر نے زور سے اپنی کنپٹیاں دبائیں اور غم غلط کرنے چل دیئے۔

انہوں نے کھانے کی چیزوں سے لبریز ٹرے اٹھائی اور بوجھ سے لچکتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔ چوکھٹ پہ قدم رکھتے ہی ٹرے ان کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔

کبیر سناٹے میں کھڑے دو شالے کا پٹ اٹھائے اس نوخیز معجزے کو دیکھ رہے تھے جو چاروں ہاتھ پیر پھینکے بے سُدھ سو رہا تھا۔ اُن کا وزنی ہاتھ اٹھا اور صندلی بدن پہ چٹاخ سے پڑا۔

"نہیں نہیں، یہ میرا ہے ..." وہ ساری چوٹیں اپنے جسم پر روکتی رہیں۔

"یہ سراسر بہتان ہے، افترا ہے۔ پڑوس کی پیلی کوٹھی والے جھوٹ بولتے ہیں۔ میری بات مانئے نا۔ پرسوں ہی تو گل دان سے اُمڈ کر میری بانہوں میں آیا ہے۔" وہ بکتی ہیں کوئی نہیں سنتا، کوئی نہیں سنتا۔"

چیختے ہوئے گل دان کو وہ بانہوں میں سمیٹے آنکھیں موندے جھوم رہی ہیں۔ پھر گھسٹتے قدموں سے اٹھتی ہیں۔ غسلخانے میں اب بھی دودھیا پانی ٹب میں خاموش پڑا ہے جس میں وہ نہلائے تھے۔ گل دان میں پانی بھر کے انہوں نے اس میں گل بنفشہ کا گچھا اڑس دیا ہے اور ہتیلی پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گئی ہیں۔

ہولے ہولے کمرے میں میٹھی میٹھی پُر اسرار خوشبو رینگنے لگتی ہے۔ کچے خون اور کالے دانوں کے چٹخنے کی بوجھل سوگندھ جیسی بو ٹھر میں آتی ہے۔ اور ننھے ننھے بھورے ہاتھوں کے لمس سے اُن کا سینہ جاگ اٹھتا ہے۔

# گھونگھٹ

## عصمت چغتائی

سفید چاندنی بچھے تخت پر بیٹھے سفید بالوں والی دادی بالکل سنگ مرمر کا بھدا سا ڈھیر معلوم ہوتی تھیں جیسے ان کے جسم میں خون کی ایک بوند نہ ہو۔ ان کی ہلکی سرمئی آنکھوں کی پتلیوں تک پر سفیدی رینگ آئی تھی اور جب وہ اپنی بے نور آنکھیں کھولتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے روزن بند ہیں، کھڑکیاں دبیز پردوں کے پیچھے سہمی چھپی بیٹھی ہیں۔ انھیں دیکھ کر آنکھیں چوندھیانے لگتی تھیں جیسے اردگرد پسی ہوئی چاندی کا غبار معلق ہو۔ سفید چنگاریاں سی پھوٹ رہی ہوں۔ ان کے چہرے پر پاکیزگی اور دوشیزگی کا نور تھا۔ اسی برس کی اس کنواری کو کبھی کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

جب وہ تیرہ چودہ برس کی تھیں تو بالکل پھولوں کا گچھا لگتی تھیں۔ کمر سے نیچے جھولتے ہوئے سنہری بال اور میدہ شہاب رنگت۔ شہاب زمانہ کی گردش نے چوس لیا صرف میدہ رہ گیا تھا۔ ان کے حسن کا ایسا شہرہ تھا کہ اماں باوا کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ ڈرتے تھے کہیں انھیں جنات نہ اڑا کے لے جائیں کیونکہ وہ اس دھرتی کی مخلوق نہیں لگتی تھیں۔

پھر ان کی منگنی ہماری اماں کے ماموں سے ہو گئی۔ کیا مزے دار جوڑی تھی۔ جتنی دلھن گوری تھیں اتنے ہی دولھا میاں سیاہ بھٹ تھے۔ رنگت کو چھوڑ کر حسن و مردانگی کا نمونہ تھے۔ کیا ڈستی ہوئی پھٹارا آنکھیں تلوار کی دھار جیسی کھڑی ناک اور موتیوں کو ماند کرنے والے دانت مگر اپنی رنگت کی سیاہی سے بے طرح چڑتے تھے۔

جب منگنی ہوئی تو سب نے خوب چھیڑا۔

"ہائے دولھا ہاتھ لگائے گا تو دلھن میلی ہو جائے گی۔"

"چاند کو جانو گرہن لگ جائے گا۔"

کالے میاں اس وقت سترہ برس کے خودسر کڑے دل بچھیڑے تھے۔ ان پر دلھن کے حسن کی کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ رات ہی رات جودھپور اپنے نانا کے ہاں بھاگ گئے۔ دبی زبان سے اپنے ہم عمروں سے کہا کہ "میں یہ شادی نہیں کروں گا۔" یہ وہ زمانہ تھا جب چوں چرا کہنے والوں کو جوتے سے درست کر لیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ منگنی ہو جائے تو پھر توڑنے کی مجال نہیں تھی۔ ناکیں کٹ جانے کا خدشہ ہوتا تھا۔

اور پھر دلھن میں عیب کیا تھا؟ یہی کہ وہ بے انتہا حسین تھی۔ دنیا حسن کی دیوانی ہے اور آپ حسن سے نالاں، بدمزاقی کی حد۔

"وہ مغرور ہے۔" دبی زبان سے کہا۔

"کیسے معلوم؟"

چھپ کر کوئی ثبوت نہیں مگر حسن ظاہر ہے مغرور ہوتا ہے۔ اور کالے میاں کسی کا غرور جھیل جائیں یہ ناممکن۔ ناک پر مکھی بٹھانے

۔۔ و دار تھے۔

بہت سمجھایا کہ میاں وہ تمہارے نکاح میں آنے کے بعد تمہاری ملکیت ہو گی۔ تمہارے حکم سے دن کو رات اور رات کو دن کہے گی۔ جدھر

بٹھاؤ گے بیٹھے گی اُٹھاؤ گے اُٹھے گی۔

کچھ ہوتے ہی پڑے اور آخر کار کالے میاں کو پکڑ بلایا گیا اور شادی کر دی گئی۔

ڈومنیوں نے کوئی گیت گا دیا۔ کچھ گوری دلھن اور کالے دولہا کا۔ اس پر کالے میاں بھنبھنا اٹھے۔ اوپر سے کسی نے چبھتا ہوا ایک

۔۔۔ جڑ دیا۔ پھر تو بالکل ہی الف ہو گئے۔ مگر کسی نے اُن کے طنطنہ کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ مذاق ہی سمجھتے رہے اور چھیڑتے رہے۔

دولہا میاں شمشیر برہنہ بنے جب دلھن کے کمرے میں پہونچے تو لال لال چمکدار پھولوں میں الجھی سلجھی دلھن دیکھ کر پسینے چھوٹ گئے۔

۔۔ سفید ریشمی ہاتھ دیکھ کر خون سوار ہو گیا۔ جی چاہا اپنی سیاہی اس سفیدی میں ایسی گھوٹ ڈالیں کہ امتیاز ہی ختم ہو جائے۔

کانپتے ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھانے لگے تو دلہن بالکل اوندھی ہو گئی۔

"اچھا تم خود ہی گھونگھٹ اُٹھا دو۔"

دلھن اور نیچے جھک گئی۔

"ہم کہتے ہیں گھونگھٹ اُٹھاؤ۔" ڈپٹ کر بولے۔

دلھن بالکل گیند بن گئی۔

"اچھا جی اتنا غرور!" دولہا نے جوتے اتار کر بغل میں دبائے اور پائیں باغ والی کھڑکی سے کود کر سیدھے اسٹیشن، پھر

۔۔۔ پور!

اس زمانے میں طلاق ولاق کا فیشن نہیں چلا تھا۔ شادی ہو جاتی تھی تو بس ہو ہی جاتی تھی۔ کالے میاں سات برس گھر سے

۔۔ب رہے۔ دلھن سسرال اور میکہ کے درمیان معلق رہیں۔ ماں کو روپیہ پیسہ بھیجتے رہے۔ گھر کی عورتوں کو پتہ تھا کہ دلھن اَن چھوئی رہ

۔۔۔ ہوتے ہوتے مردوں تک بات پہونچی۔ کالے میاں سے پوچھ گچھ کی گئی۔

"وہ مغرور ہے۔"

"کیسے معلوم؟"

"ہم نے کہا گھونگھٹ اٹھاؤ، نہیں سنا۔"

"عجب گاؤدی ہو اماں کہیں دلھن خود گھونگھٹ اٹھاتی ہے۔ تم نے اٹھایا ہوتا۔"

"ہرگز نہیں، میں نے قسم کھائی ہے، وہ خود گھونگھٹ نہیں اٹھائے گی تو جہنم میں جائے۔"

"اماں عجب نامرد ہو۔ دلھن سے گھونگھٹ اٹھانے کو کہتے ہو۔ پھر کہوگے وہ آگے بھی پیش قدمی کرے۔ اجی لاحول ولاقوۃ۔"

گوری بی کے ماں باپ اکلوتی بیٹی کے غم میں گھلنے لگے۔ نجانے کیا عیب تھا کہ دولہا نے ہاتھ نہ لگایا۔ ایسا اندھیر تو نہ دیکھا نہ سُنا۔
کالے میاں نے اپنی مردانگی کے ثبوت میں رنڈی بازی، لونڈے بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی اور گوری بی گھونگھٹ میں سلگتی رہیں۔

نانی اماں کی حالت خراب ہوئی تو سات برس بعد کالے میاں گھر لوٹے۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر پھر بیوی سے اُن کا ملاپ کرانے کی کوشش کی گئی۔ پھر سے گوری بی دلھن بنائی گئیں۔ مگر کالے میاں نے کہہ دیا: "اپنی ماں کی قسم کھا چکا ہوں گھونگھٹ میں نہیں اُٹھاؤں گا۔"
سب نے گوری بی کو سمجھایا۔ دیکھو تو ساری عمر کا جھگڑا ہے۔ شرم و حیا کو رکھو طاق میں اور جی کڑا کر کے تم آپ ہی گھونگھٹ اٹھا دینا۔ اس میں کچھ بے شرمی نہیں وہ تمہارا شوہر ہے خدائے مجازی ہے۔ اس کی فرمانبرداری تمہارا فرض ہے۔ تمہاری نجات اس کا حکم ماننے ہی میں ہے۔
پھر سے دلھن کی سیج سجی۔ پلاؤ زردہ پکا اور دولہا میاں دلھن کے کمرے میں دھکیلے گئے۔ گوری بی اب اکیس برس کی نوخیز حسینہ تھیں۔ انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی۔ آنکھیں بوجھل تھیں سانسیں بھاری تھیں۔ سات برس انہوں نے اسی گھڑی کے خواب دیکھ کر گزارے تھے۔ ہم سن لڑکیوں نے بیسیوں راز بتا کر دل کو دھڑکنا سکھا دیا تھا۔ دلھن کے حنا آلودہ ہاتھ پیر دیکھ کر کالے میاں کے سر پر جن منڈلانے لگے۔ ان کے سامنے اُن کی دلھن رکھی تھی۔ چودہ برس کی کچی کلی نہیں ایک مکمل گلدستہ۔ رال ٹپکنے لگی۔ آج ضرور دن اور رات مل کر سرمگیں شام کا سماں بندھے گا۔ اُن کا تجربہ کار جسم شکاری چیتے کی طرح منہ زور ہو رہا تھا۔ انہوں نے اب تک دلھن کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ بدکاریوں میں بھی اس رس بھری دلھن کا تصور دل پر آرے چلاتا رہا تھا۔

"گھونگھٹ اٹھاؤ۔" انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں حکم دیا۔

دلھن کی چھنگلی بھی نہ ہلی۔

"گھونگھٹ اٹھاؤ۔" انہوں نے بڑی لجاجت سے روہانسی آواز میں کہا۔

سکوت طاری رہا۔

"اگر میرا حکم نہیں مانوگی تو پھر منہ نہیں دکھاؤں گا۔"

دلھن ٹس سے مس نہ ہوئی۔

کالے میاں نے گھونسہ مار کر کھڑکی کھولی اور پائیں باغ میں کود گئے۔

اس رات کے گئے وہ پھر واپس نہ لوٹے۔

اُن چھوئی گوری بی تیس سال تک اُن کا انتظار کرتی رہیں۔ سب مر کھپ گئے ایک بوڑھی خالہ کے ساتھ فتح پور سیکری میں رہتی تھیں کہ سناونی آئی دولہا آئے ہیں۔

دولہا میاں موریوں میں لوٹ پوٹ کر امراض کا پلندہ بنے آخری دم وطن لوٹے۔ دم توڑنے سے پہلے انہوں نے التجا کی کہ گوری بی سے کہو آ جائیں کہ دم نکل جائے۔

گوری بی کھنبے سے ماتھا ٹکائے کھڑی رہیں۔ پھر انہوں نے صندوق کھول کر اپنا تار تار شہانہ جوڑا نکالا۔ آدھے سفید سر میں سہاگ

تابیں ذرا لالا اور گھونگٹ سنبھالتی لب دم مریض کے سرہانے پہونچیں۔
"گھونگٹ اٹھاؤ" کالے میاں نے نزع کے عالم میں سسکی بھری۔
گوری بی کے لرزتے ہوئے ہاتھ گھونگٹ تک اٹھے اور نیچے گر گئے۔
کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔
انہوں نے وہیں اکڑوں بیٹھ کر پلنگ کے پائے پر چوڑیاں توڑیں اور گھونگٹ کی بجائے سر پر رنڈاپے کا سفید دوپٹہ کھینچ لیا۔

---

# افسر

## ممتاز مفتی

معلوم نہیں یہ خوش قسمتی تھی یا بدنصیبی؟ کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔

بہرحال سبھی یک زبان ہو کر کہہ رہے تھے کہ قائم دین کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا ہے۔ خود قائم دین اور اس کی بیوی عائشہ یہی سمجھتے تھے۔ کیسے نہ سمجھتے۔ جب یہ واقعہ ظہور میں آیا تھا تو رشتہ داروں اور دوستوں کی مبارکبادوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ قائم کی بیوی نے محلے میں لڈو بانٹے تھے۔ قائم دین کے سنیک کارنر کے دوستوں نے اسے ایک شاندار پارٹی دی تھی۔

سنیک کارنر سیکرٹریٹ کے باہر الگ تھلگ سرخ رنگ کی ایک منزلہ عمارت میں ایک سستی قسم کا چائے خانہ تھا۔ جہاں سیکرٹریٹ کے کلرک، اسسٹنٹ۔ سٹینو۔ سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے نچلے درجے کے سٹاف کا اکٹھ ہوا کرتا تھا۔ جہاں لوگ چائے پینے کے بہانے دل ہلکا کرنے کے لیے آتے۔ پیالیوں کی اوٹ میں بات چل نکلتی۔ بات سے بات نکلتی۔ بڑھتی حتیٰ کہ باتوں کا جھاڑ بندھ جاتا۔ پیالیاں ختم ہو جاتیں۔ پھر سے چلتیں۔ لیکن بات ختم نہ ہوتی۔

سنیک کارنر میں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا۔ سرکار کے نئے اصلاحی اقدامات پر نکتہ چینی ہوتی۔ جدید ادب پر اظہار خیال ہوتا۔ لیکن یہ سب کچھ ضمنی طور پر ہوتا۔ دیباچے کے طور پر۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے یا دو ریفرنس ٹو دی کانٹیکسٹ۔ سنیک کارنر کا اصل موضوع تو دفتریات تھا۔ دفتری انکشافات۔ روٹین کے چٹکلے۔ پی۔ یو۔ سی کی گتھیاں۔ افسروں کی مضحکہ خیزیاں۔ فائلوں کے رازہائے درون۔ نوٹوں کی خانہ جنگیاں۔ پیپر سپیک کی چالاکیاں۔

ان سب باتوں پر سنیک کارنر میں ہر وقت رنگ کبڈی چلتی تھی۔ صبح ہو یا شام۔ دفتر کا وقت ہو یا چھٹی کا دن ہر وقت ایک نہ ایک ٹولہ سنیک کارنر میں بیٹھا رہتا تھا۔

دراصل سنیک کارنر سیکرٹریٹ کا سیفٹی والو تھا۔ جہاں ہر شخص دل کا بخار نکال سکتا تھا۔ اپنی قابلیت کی دھاک بٹھا سکتا تھا۔ اپنی انا کی تسکین کر سکتا تھا۔ اور افسروں کی نالائقی۔ بے حسی اور لاعلمی کی کہانیاں سن یا سنا کر اپنی پسماندگی کی کمی پوری کر سکتا تھا۔

سنیک کارنر میں ہر قسم کے لوگ آیا کرتے تھے قابل، ذہین محنتی لوگ اور ایسے بھی جو خالی زعم کی بیساکھیوں پر کھڑے تھے۔ بہرطور سنیک کارنر میں آنے والے ہر فرد کو چاہے وہ لائق ہوتا یا نالائق۔ یہ شکایت تھی کہ اس پر نالائق نکمے سفارشی افسر فائز تھے۔

سنیک کارنر میں مختلف محکموں کے بیسیوں ٹولے آیا کرتے تھے۔

قائم دین کا ٹولہ دس بارہ کلرکوں پر مشتمل تھا اس ٹولے میں چار افراد پیش پیش تھے قیصر۔ زبیر۔ رفعت اور قائم۔

قیصر کو سارے سروس رولز ازبر تھے۔ اور وہ انھیں برتنے میں ماہر تھا۔ جبھی تو سارے دفتر کے افسروں میں اس کی بڑی مانگ تھی۔
جب بھی کسی افسر کو کسی بے ضابطگی پر پردہ ڈالنے کی ضرورت پڑتی تو وہ قیصر کو بلا بھیجتا۔ کیس کو پڑھنے کے بعد اگر قیصر کہہ دیتا۔ سر فکر نہ کیجیے ہو جائے گا۔ تو سر کو تسلی ہو جاتی۔ عام طور سے بڑے بڑے متسکل اور پیچیدہ کیسوں پر بھی قیصر فاتحانہ انداز سے یہ فیصلہ دیتا۔ بڑی گنجائش ہے سر۔ اسی وجہ سے تو قیصر کی بڑی مانگ تھی۔

زبیر کو نوٹ لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ اس کمال کو انگریزی زبان سے تعلق نہ تھا بلکہ فیکٹس کی پریزنٹیشن کا اعجاز تھا۔ مثلاً اگر زبیر چاہتا کہ منظوری مل جائے تو وہ نوٹ یوں لکھتا۔ اگرچہ اس کیس میں فلاں خرابی ہے۔ فلاں خرابی ہے فلاں خرابی ہے لیکن قانون کی رو سے ہم اسے رد نہیں کر سکتے۔

اگر وہ چاہتا کہ منظوری نہ ملے تو یوں لکھتا۔ اگرچہ یہ کیس قانون کے عین مطابق ہے لیکن اس میں فلاں خرابی ہے فلاں خرابی ہے فلاں خرابی ہے اور ہم یہ خرابیاں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ٹیڑھی بات کو یوں پیش کرنا کہ وہ سیدھی اور معصوم نظر آئے اور سیدھی بات کو یوں الجھا دینا کہ پڑھنے والے میں گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ پیدا ہو جائے۔ زبیر کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

لیکن وہ خصوصی نوٹ جس کی وجہ سے زبیر کی بڑی مانگ تھی ایک تیسری قسم کا نوٹ تھا۔

ان کے دفتر کا سربراہ جسے سب بڑا صاحب کہتے تھے ایک سینئر سی ایس پی افسر تھا۔ جس کی ذہانت کی کسی زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ لیکن جسے دیر سے روپیہ اقتدار اور سٹیٹس نے چاٹ لیا تھا۔ شہد ٹپک گیا تھا خالی کھگار رہ گیا تھا۔

اب وہ صرف مطلب کی بات سمجھتا تھا۔ باقی امور میں ہائلی کنفیوزڈ تھا۔ طبیعت میں چڑچڑاپن بہت بڑھ گیا تھا۔ غیر تعمیری نکتہ چینی کی عادت پڑ گئی تھی۔

تجربے کی بنا پر دفتر کے افسروں کو علم تھا کہ بڑے صاحب سے منظوری لینے کے لئے ضروری ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے کے اصول پر عمل کیا جائے یعنی بڑے صاحب کو مزید کنفیوز کیا جائے۔ اتنا کنفیوز کیا جائے کہ ان کی طبعی کنفوژن خود ششدر رہ جائے۔

ایسی کیفیت طاری ہونے پر وہ گھبرا کر بلا چون وچرا دستخط کر دیا کرتے تھے۔

بڑے صاحب کو کنفیوز کرنے والا نوٹ لکھنے میں زبیر کو ملکہ حاصل تھا۔ اسی وجہ سے دفتر میں زبیر کی بڑی مانگ تھی۔

رفعت کو اکاؤنٹس کی پیچیدگیوں پر عبور حاصل تھا زیادہ تنخواہ کلیم کرنے کے لئے۔ الاؤنسز میں اضافہ کرانے کے لئے اور ناجائز مراعات پر حق جتانے کے لئے صاحب لوگ رفعت کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔ دفتر میں رفعت تنخواہ تو سرکار سے لیتا تھا لیکن کام سرکاری مفاد کے خلاف کرتا۔ کیونکہ افسران اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لئے اسے استعمال کیا کرتے تھے۔

قائم کو جدید طرز کی انگریزی لکھنے میں بڑی مہارت تھی۔ اس نے کنسایز آکسفورڈ ڈکشنری کو شروع سے آخر تک متعدد بار پڑھا تھا۔ اور غیر مروجہ ایڈیمز کے استعمال میں دسترس حاصل کر رکھی تھی۔ سنیک کارنر میں بیٹھ کر وہ اپنے دوستوں کو بتایا کرتا تھا کہ فلاں افسر کس قدر غلط انگریزی لکھتا ہے۔ فلاں صاحب کی انگریزی بالکل دفتری رنگ کی ہے۔ فلاں صاحب پریپوزیشن کا غلط استعمال

کرتے ہیں۔ فلاں صاحب کے بچے غلط ہیں اور فلاں صاحب تو انگریزی سے بدفعلی کرتے ہیں۔

سنیک کارنر میں بیٹھ کر قیصر، بیر رفعت اور قائم باری باری افسروں کی نالائقی کے قصے سنایا کرتے تھے جنھیں ان کے ٹولے کے لوگ بڑی دلچسپی سے سنتے۔ ان کی قابلیت پر واہ واہ کرتے اور اسی ضمن میں مزید چٹکلے سنا کر ان کی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے۔

ہاں تو اس واقعہ پر قائم کے سنیک کارنر کے ساتھیوں نے بڑی خوشی منائی تھی اور اسے پیٹیز اور پیسٹری والی چائے کی شاندار پارٹی دی تھی۔ اور قائم نے اپنے ساتھیوں کے خلوص بھرے جذبے سے متاثر ہو کر وہاں خصوصی کی حیثیت سے دھواں دھار تقریر کی تھی اور میز پر مکے مار مار کر اعلان کیا تھا۔ میں قائم ہوں، میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ سنیک کارنر کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ تم سے اپنا رابطہ کبھی نہیں توڑ سکتا۔ میں کبھی جھوٹے سٹیٹس کا شکار نہیں ہوں گا۔ کیونکہ جھوٹے سٹیٹس کا شکار ہونا چھوٹے ذہن کے لوگوں کا کام ہے ایسے لوگوں کا جو خالی ہوتے ہیں۔ کھوکھلے ہوتے ہیں اور ان کی اہمیت کا تمام تر دارومدار سٹیٹس کی بیساکھیوں پر ہوتی ہیں۔ میں۔ میں عوامی افسر بنوں گا۔

اس روز جب قائم دین سنیک کارنر سے باہر نکلا تو اس کی گردن پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ اور دل احسان مندی کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔

ہاں تو قائم دین سمجھتا تھا کہ یہ واقعہ اس کی زندگی کا عظیم ترین واقعہ ہے۔

اس واقعہ کے کوائف سیدھے سادے تھے۔ یہ ایک عام سا واقعہ تھا جو کبھی کبھی کلرکوں کی زندگی میں رونما ہو جایا کرتا ہے۔

ہوا یوں کہ محکمہ کے وزیر نے بڑے صاحب کو فون کیا کہ انھیں پنجاب کے کلچر پر ایک تقریر کرنا ہے لہٰذا دفتر کے کسی افسر کو بھیج دیں تاکہ وہ اسے تقریر کی ضروریات کے متعلق بریف کر دیں۔

اس پر بڑے صاحب نے ایک ان فارمل میٹنگ منعقد کی جس میں سارے افسروں کو بلایا۔ اور انھیں دعوت دی کہ تقریر لکھنے کے لئے والنٹیر کریں۔

دفتر کے افسر بہت پڑھے لکھے تھے۔ حالاتِ حاضرہ اور ملکی سیاست سے ضرورت سے زیادہ واقف تھے۔ پنجابی کلچر کے بارے میں بھی ان کی معلومات خاصی وسیع تھیں چونکہ انہوں نے کلچر پر مغربی مصنفوں کی مستند کتابیں پڑھی ہوئی تھیں —— گرینڈ ٹرنک روڈ پر گاڑی چلاتے ہوئے انہوں نے بیسیوں پنجابی گاؤں دیکھے ہوئے تھے۔ دیہاتی رہن سہن کے متعلق پنجابی فلموں سے بڑی معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔

اس کے باوجود پتہ نہیں کیوں۔ بڑے صاحب کے سامنے سارے افسر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ کسی نے تقریر لکھنے کی حامی نہ بھری شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ دل ہی دل میں لاشعوری طور پر وہ سمجھتے تھے کہ پنجاب اور کلچر دو متضاد چیزیں ہیں۔ اور کلچر وہ ہوتا ہے جو دساور سے درآمد کیا جائے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جو مغربی کلچر کو نہیں اپناتے تھے۔ لیکن پنجابی کلچر کے متعلق وہ بھی مجبور تھے چونکہ ان کا ایمان تھا کہ کلچر زبان کی پیداوار ہے اور زبان اُسے نہیں کہتے جو dialect کی حیثیت سے بولی جاتی ہو بلکہ اسے کہتے ہیں جو کتابی دنیا میں رائج ہو اور جہاں یہ کتابی زبان رائج نہ ہو وہاں کلچر کیسا، وہاں تو ثقافتی خلا ہوتا ہے۔

بہر حال بڑے صاحب کے سامنے سارے افسر سر جھکائے بیٹھے رہے کسی نے تقریر لکھنے کے لیے اپنے آپ کو پیش نہ کیا۔ لہٰذا مجھے

صاحب نے قائم دین کو بلا کر تقریر لکھنے کی ذمہ داری اسے سونپ دی۔

قائم نے بڑی محنت سے تقریر لکھی جسے پبلک اور پریس نے بے حد پسند کیا۔ وزیر صاحب اس واہ واہ پر پھولے نہ سماتے۔
اسے حسن اتفاق کہہ لیجئے کہ ابھی واہ واہ کی کیفیت طاری تھی کہ وزیر صاحب کے پاس ایک فائل پہنچی جس میں ایک افسر کی تعیناتی کے متعلق منظوری طلب کی گئی تھی۔ چونکہ وہ ایک سیلکشن پوسٹ تھی لہٰذا وزیر صاحب نے تعیناتی کے لئے قائم دین کا نام لکھ دیا۔

یوں قائم دین ایک دم بیٹھے بٹھائے افسر بن گیا۔

اپنے نئے عہدے کا چارج لینے کے بعد چار ایک دن تو قائم دین بڑی بے نیازی سے جوں کا توں دفتر جاتا رہا۔ اور اپنے آپ کو یقین دلاتا رہا کہ وہ سٹیٹس کی پرواہ نہیں کرتا وہ تو اپنی قابلیت کے زور پر افسر بنا ہے۔ اور سٹیٹس کیا ہے۔ بیساکھیاں اور کیا۔

پھر چند ایک روز کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ افسروں میں اس قدر نمایاں نظر آتا ہے جیسے راج ہنسوں میں کوا بیٹھا ہو۔ لہٰذا اس نے سوچا کیوں نہ میں اپنا پہناوا افسروں جیسا کر لوں۔ اس سے کیا فرق پڑے گا ——— ظاہر کو بدلنے سے باطن تو نہیں بدل جاتا اصل اہمیت تو باطن کی ہے۔

اسی شام اس نے ریڈی میڈ گارمنٹس کی دوکان سے سکنڈ پولی ایسٹر اور ایجپشن کاٹن کی دو قمیضیں خرید لیں۔ اور دو جدید قسم کی ٹائیاں بھی۔ پھر سوانا خرید کر اس نے دو پتلونیں ——— سینے کے لئے دے دیں۔

بس اتنی سی بات تھی۔ سفید قمیض شفٹ کالر کالی پتلون اور امپورٹڈ ٹائی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے سوچا۔

اسے علم نہ تھا کہ سفید قمیض سے بہت فرق پڑتا ہے۔

پھر ایک روز اس کی توجہ اپنے نام کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے نوٹ کیا کہ ساتھی افسر جب بھی اس سے بات کرتے تو مسٹر قائم کہہ کر دفعتاً رک جاتے جیسے دین کہنے سے ہچکچا رہے ہوں پہلے تو وہ اسے بلا جھجک قائم دین کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ قائم دین یہ رپورٹ سٹڈی کر لو کیا وہ آرٹیکل مکمل ہو گیا۔ قائم دین۔

آخر بات کیا تھی۔ اس لئے تو نہیں کہ اب وہ افسر بن چکا تھا۔ شاید دین کا لفظ آفیسر لائیک نہ ہو۔

بات تو ٹھیک تھی۔ تہذیب و تمدن تو سیکولر قسم کی چیز ہوتی ہے۔ جس میں دین کو شامل کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگرچہ پاکستان اسلامی جمہوریہ بن چکا تھا اور جب نیشنل اسمبلی میں وزرا نے حلف اٹھایا تھا تو پہلی مرتبہ حلف کے متن میں اللہ اور محمد صلعم کے نام شامل کئے گئے تھے۔ لیکن وہ تو ایک سیاسی سٹنٹ تھا۔ اور پھر وزرا تو عوام کے نمائندے ہوتے ہیں۔ افسر تو نہیں ہوتے۔ افسروں کا دستور تو نہیں بدلا تھا۔ ان کا برتاؤ اور زاویہ نظر تو جوں کا توں اسی رنگ پر قائم تھا۔

بہر طور قائم نے شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنے نام کے متعلق کچھ کرنا چاہئے کوئی ایسی تبدیلی عمل میں لانی چاہئے جس سے دوسرے افسروں کو اسے بلانے میں تکلیف نہ ہو۔ یہ تو محض کرٹسی کی بات ہے کوئی بنیادی تبدیلی تو نہیں نا۔

اس مسئلے پر وہ دو دن سوچتا رہا۔

دین تو ایک ایسی چیز ہے جو دل سے تعلق رکھتی ہے۔ نمائش کی چیز نہیں پھر کیوں نہ میں دستور کے مطابق دین کو کیموفلاج کروں۔ اکثر
افیسر دینی قسم کے نام مثلاً اسلام۔ محمد۔ نبی۔ اللہ کیموفلاج کر لیتے ہیں مثلاً ایم ایچ احمد میں کیموفلاج ہیں ایم این قریشی ہیں۔ این ایم خان
ہیں۔۔۔

اس حساب سے میں تو قائم دین بن سکتا ہوں لیکن ڈی قائم کچھ جچتا نہیں۔ اگر نام کے آخر میں کوئی ایسا لفظ بڑھا دیا جائے جو چھوٹی سی بات
ختم ہو تو بات بنے سارے افسروں کے ناموں کے آخر میں ایسے ہی لفظ ہوتے ہیں مثلاً شمسی زبیری حسنی جعفری۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس کے دادا کئی ایک سال مصر میں مقیم رہے تھے۔ کیوں نہ میں اپنے نام کے پیچھے مصری لگا لوں۔

قائم نے اسی وقت ایک فارم منگوایا اور اس پر نام کے سامنے کے ڈی مصری لکھ دیا پھر اس نے تین سلپوں پہ اپنے سپیسمن سگنیچر کئے
ان سلپوں کو نام کے ساتھ پن کیا اور وہ فارم ـ اے جی پی آر کو بھیج دیا۔ اس کے بعد اسی نام سے اس نے بنک میں اکاؤنٹ کھول لیا۔

یوں قائم دین مٹر کے۔ ڈی مصری بن گیا۔

اس تبدیلی کے بعد دو ایک دن وہ بہت مطمئن رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے نئے حالات اور پوزیشن سے ظاہری ایڈجسٹ منٹ مکمل کر لی ہے
اگلے روز تمام آفیسرز مل بیٹھے تاکہ پک نک کا پروگرام طے کریں۔ وہاں برسبیل تذکرہ کسی افسر نے ایک جوک سنایا۔ جسے سن کر قائم یوں قہقہہ
مار کر ہنسنے لگا جیسے وہ سنیک کارنر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنسا کرتا تھا۔

سنیک کارنر میں قائم اپنے قہقہے کی وجہ سے مشہور تھا کئی ایک بار تو وہ میز پر دونوں ہاتھ مار مار کر یوں ہنسا تھا کہ میز پہ رکھی ہوئی
پیالیاں گر کر چور چور ہو گئی تھیں۔

قائم دین کا قہقہہ بہت ہی منفرد تھا قہقہہ مارتے ہوئے اس کے جسم کا اوپر کا حصہ یوں اچھلتا تھا جیسے ربڑ کا گیند اچھلتا ہے۔ اور یہ
عمل دیر تک جاری رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہنستے ہوئے اسے میز پہ بار بار ہاتھ مارنے کی اور میز کے نیچے ٹانگیں چلانے کی عادت تھی۔ اسے
ہنستے دیکھ کر احساس ہوتا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ سنیک کارنر میں قائم کا یوں ہنسنا ایک خوبی سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ سب کا خیال تھا کہ پورے
وجود سے ہنسنا بھرپور خلوص کی نشانی ہے۔

لیکن اس روز افسروں کی موجودگی میں قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے وہ دفعتاً وہ سلف کانشس ہو گیا۔

اس نے محسوس کیا کہ دفعتاً سارے افسر خاموش ہو گئے ہیں اور اس کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس
پر قائم بہت آکورڈ محسوس کرنے لگا تھا۔

افسروں کے چلے جانے کے بعد وہ بے نام احساس ندامت سے بھیگ گیا۔ اور اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ یوں
بچوں کی طرح منہ پھاڑ کر بے تحاشا ہنسنا۔ پروپرائٹی کے منافی ہے۔

بات بھی درست تھی افسر کا کام قہقہہ لگانا نہیں اسے تو تبسم پر اکتفا کرنا چاہئے اور تبسم بھی ایسا جس میں ایپری سی ایشن ہو پارٹی
سی پیشن نہ ہو۔ بلکہ سپیرئیر نالج ریلیشن کی جھلک ہو۔

اس روز قائم نے شدت سے محسوس کیا کہ اسے اپنے برتاؤ اور بیرنگ کی تمام تفصیلات کا جائزہ لینا چاہئے۔

اسی روز دفتر بریک ہونے کے بعد کاریڈور میں چلتے ہوئے اس نے اپنی چال کا جائزہ لیا۔

اونہوں بالکل غیر موزوں۔ میں تو یوں چل رہا ہوں جیسے سر کے بلانے پر پی اے بھاگا بھاگا آتا ہے جیسے ٹنگ چالی میں سمارٹنس تو ہے لیکن ایسی سمارٹنس تو کارکنوں کو زیب دیتی ہے۔ افسروں کی چال میں تو ٹھہراؤ ہوتا ہے گریس فل رو ہم ہوتا ہے وقار ہوتا ہے۔ خود آگاہی ہوتی ہے۔

قائم نے کاریڈور میں افسرانہ چال چلنے کی کوشش کی پھر اسے خیال آیا کہ کاریڈور میں اور لوگ بھی تھے اس پر اس کے پاؤں رک گئے۔

شام کو ٹہلنے کے بہانے وہ باہر نکل گیا اور ویران سڑک پر افسرانہ چال چلنے کی مشق کرتا رہا۔ واپس گھر پہنچا تو کرسی میں بیٹھتے ہی اسے خیال آیا کہ بیٹھنے کے انداز کا بھی جائزہ لینا چاہئے۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ افسر لوگ کس انداز سے بیٹھتے ہیں۔

سب سے پہلے اس کی توجہ بڑے صاحب کی طرف منعطف ہوئی۔ کئی ایک بار بلائے جانے پر وہ اس کے کمرے میں گیا تھا اور اس نے غور سے اس کے بیٹھنے کا انداز دیکھا تھا۔ اس کے بیٹھنے میں مصروفیت کی جھلک نہ تھی جیسے کہ دوسرے افسر بڑی محنت سے پیدا کرتے ہیں مصروفیت کی جگہ اس کے انداز میں فارغ البالی کی جھلک تھی۔

پہلی مرتبہ بڑے صاحب کو بیٹھے دیکھ کر اسے وہ اشتہار یاد آ گیا تھا جو بچپن میں اس نے ایک دکان پر لگا ہوا دیکھا تھا۔ اس اشتہار میں دو تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ دائیں ہاتھ کی تصویر میں ایک تاجر اپنی دوکان پہ بیٹھا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ اردگرد دوکان خالی پڑی تھی جس میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ نیچے جلی حروف میں لکھا تھا WHO SOLDON CRECLIT بائیں ہاتھ کی تصویر میں دکان مال سے لدی ہوئی تھی درمیان میں ایک ہٹا کٹا پہلوان نما تاجر بیٹھا تھا۔ تصویر کے نیچے جلی حروف میں لکھا تھا WHO SOLD ON CASK بڑے صاحب کو بیٹھے دیکھ کر اس نے محسوس کیا تھا جیسے HE HAD SOLD ON CASK-

بڑے صاحب کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سارا سیکرٹریٹ اور ملحقہ باغات اور فوارے اس کی ذاتی ملکیت ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے انداز میں رعونت تھی بے نیازی تھی گرد و پیش کے لیے مبہم سی حقارت تھی۔

چھوٹے افسر جب بڑے صاحب کے کمرے میں جا کر سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھتے تو ان کا انداز لجاجت سے بھر جاتا۔ گردن ڈھلک جاتی۔ اپنے کمرے میں بیٹھتے تو گردن اکڑ جاتی۔ ماتحت سے بات کرتے تو تیوری چڑھ جاتی۔ پبلک کے کسی سرکردہ شخص سے بات کرتے تو مجسم اخلاق بن جاتے۔ ساتھی افسروں سے خوش مزاجی اور قابلیت کا روپ دھار لیتے۔ سائل کے سامنے عدیم الفرصتی اور اصولوں کی وجہ سے مجبور نظر آتے۔

قائم کے لئے افسرانہ انداز کی ساری تفصیلات اپنانا خاصہ مشکل کام نظر آنے لگا اسے احساس ہونے لگا جیسے افسری اس کی زندگی میں سیلاب بن کر آئی ہو۔ اس سیلاب میں پرانی اڈجسٹمنٹس سب بہہ گئی ہوں اور قدم قدم پر نئی اڈجسٹمنٹس پیدا کرنے کی فوری ضرورت پیدا ہو گئی ہو۔

پرانے تعلقات رشتے برتاؤ خزاں زدہ پتوں کی طرح جھڑ رہے تھے اور اس ٹنڈ منڈ تنے پر نئی پتیاں ٹانکنے کی مشکل پیش پیش تھی۔

برتاؤ کی نئی تفصیلات کو عمل میں لانا اس قدر مشکل نہ تھا۔ دقت یہ تھی کہ برتاؤ کی وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات جو سالہا سال سے اس کی نس نس میں رچی ہوئی تھیں اور جو بر وقت ان جانے میں آپ ہی آپ سرزد ہو جاتی تھیں ان سے پہلو بچانا بے حد مشکل تھا۔

کئی ایک دن وہ چلنے۔ بیٹھنے کھڑے ہونے مسکرانے کی مشق کرتا رہا۔ باتھ روم کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر وہ مختلف انداز

کی مسکراہٹیں آزماتا اور پھر دوسرے افسروں کی مسکراہٹوں سے ان کا موازنہ کرتا۔

دفتر میں اس کا آئیڈیل ایم پی رئیسانی تھا۔ اس کا طور طریقہ اور بیئرنگ قائم کو بہت پسند تھے۔

رئیسانی ایک جونیئر سی ایس پی افسر تھا۔

جونیئر سی ایس پی افسر عام طور سے بڑی خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان میں ذہانت ہوتی ہے لیڈر شپ ہوتی ہے چمک ہوتی ہے جذبہ، خلوص اور کام کرنے کا شوق ہوتا ہے۔

سروس کے ابتدائی دور میں وہ بڑے جوش اور انہماک سے کام کرتے ہیں پھر آہستہ آہستہ اقتدار کا نشہ ان کے خون میں سرائت کر جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ برتری کا احساس خود پسندی بن جاتا ہے۔ آرام و آسائش کی دیمک لگ جاتی ہے سیاست کی لت پڑ جاتی ہے۔ آرام، اقتدار اور خود پسندی انسانیت کو چاٹ جاتے ہیں اور پیچھے عفریت رہ جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے آخری دور میں سی ایس پی ڈھانچہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

سلیک کارنر میں اکثر سی ایس پی افسروں پر بحث ہوا کرتی تھی۔ ان کے متعلق وہاں کئی ایک قصے چلتے تھے۔ سب سے زیادہ مقبول قصہ یہ تھا کہ جب سی ایس پی افسر کا تبادلہ کسی نئے محکمے میں ہو جاتا ہے جس کے طریق کار سے اسے واقفیت نہیں ہوتی تو پہلے سال وہ سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ اور سیکشن افسروں سے کام کے کوائف کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا ہے وہ پوچھتا ہے اور ماتحت بتاتے ہیں۔ اور وہ "آئی سی، آئی سی" کہہ کہہ کر وقت گزارتا ہے۔ دوسرے سال میں وہ اپنی ماتحتوں کو "یو سی یو سی" کہہ کر باتیں سمجھاتا ہے۔ اور پھر تیسرے سال "وہائی کانٹ یو سی" کہہ کر انھیں ڈانٹتا ہے۔

سی ایس پی افسروں کی ذہانت و محنت بے شک قابل داد ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس لئے محنت کرتے ہیں کہ ان کی برتری قائم رہے ان کی پوزیشن اور پریسٹیج میں فرق نہ آئے۔ ان کی قابلیت کی دھاک بیٹھی رہے۔

بہرحال رئیسانی جو جونیئر سی ایس پی افسر تھا یقیناً مثالی افسر تھا۔ ابھی افسری اس کی ہڈی تک نہ پہنچی تھی۔ ابھی اس میں ولولہ تھا۔ خدمت کا جذبہ تھا۔

ہاں تو قائم بہانے بہانے رئیسانی کے کمرے میں جاتا تاکہ اس کے برتاؤ کی تفصیلات کا مطالعہ کرے اور انھیں اپنائے۔

انھی دنوں میں قائم پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کا بات کرنے کا انداز آفیسر لائیک نہیں۔ یہ بڑا تلخ احساس تھا۔

دفتر میں افسروں اور ماتحتوں کے بات کرنے کا انداز بالکل جدا جدا ہوتا ہے۔ اس حد تک جدا کہ اگر کوئی آپ سے بات کرے تو آپ کو فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ وہ افسر ہے یا ماتحت۔

بنیادی فرق یہ ہے کہ افسر اردو انگریزی میں بولتے ہیں اور ماتحت انگریزی اردو میں بولتے ہیں۔

حالانکہ قائم انگریزی لکھنے میں بڑا ماہر تھا۔ اسے آکسفورڈ پریس پر ملکہ حاصل تھا۔ لیکن اسے انگریزی بولنے کی مشق نہ تھی۔ چونکہ فونیٹکس پر حاوی نہ تھا۔ الٹا وہ تو انگریزی اردو میں بولا کرتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ منہ بگاڑ کر بولنے کے حق میں نہ تھا۔ وہ اس فیشن کو AFFECTATION سمجھتا تھا۔

سنیک کارنر کے دور میں وہ انگریزی میں اُردو بولنے کے مروجہ فیشن پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ اس نے بار ہا اس بدعت کو دُور کرنے کی تجاویز بنائی تھیں۔ اس نے کئی بار سوچا تھا کہ وزیر تعلیم کو ایک طویل مراسلہ لکھے جس میں یہ اپیل کی جائے کہ پاکستانی کلچر کو معنویت کی وبا سے بچانے کا ایک مؤثر طریقہ یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان کو فارن لینگویج سمجھ کر برتا جائے۔ یعنی انگریزی کو اُردو میں بولنے کی رسم ڈال جائے۔

ان دنوں اس کا ایمان تھا کہ ہمارے کلچر کو سب سے زیادہ نقصان وہ ادارے پہنچا رہے ہیں جو اُردو کو انگریزی میں بولنے کے فیشن کو پھیلا رہے ہیں اور انگریزی کو اس انداز سے بولنے کی رسم ڈال رہے ہیں جیسے وہ ہماری مادری زبان ہو۔ مثلاً ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن انگریزی خبریں یوں پڑھتے ہیں جیسے ابھی ابھی آکسفورڈ سے آئے ہوں۔ ٹیلیویژن کے اکثر کمپیئر اردو کو یوں انگریزی میں بولتے ہیں جیسے اسلام آباد میں ایف سکس تھری یا ڈیپلومیٹک ایونیو مخاطب ہوں۔ صرف یہی نہیں ٹیلیویژن میں تو مغنیہ بھی اردو گانے انگریزی ایکسنٹ میں گاتی ہیں:

" آ آ گر۔ ہائے۔ جا آ ذ بر اسے۔ تا میر ز ندآ "

پھر انگریزی میڈیم سکول میں جہاں ابتدا ہی سے بچوں کو اُردو۔ انگریزی میں بولنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

اس بیماری کے جراثیم کالجوں کے راستے سیکرٹریٹ میں پہنچتے ہیں اور افسران کی گفتگو کو رنگ دیتے ہیں۔ ان دنوں قائم کا خیال تھا اُردو کو انگریزی میں بولنے کے تباہ کن فیشن کی کاٹ کرنے کا موثر ترین طریقہ یہ ہے کہ انگریزی کو اُردو میں بولنے کی رسم ڈالی جائے۔

لیکن یہ تو جب کی باتیں تھیں اب تو وہ خود بولتے ہوئے اُردو الفاظ کو گولائیاں بخشنے کی مشق کر رہا تھا۔ اسی رجحان کے تحت اس نے اپنے نام کے ہجے بدل کر اسے انیگلے سائز کر دیا تھا۔ پہلے وہ قائم کو قلیٹ لکھتا تھا۔ کیو اے آئی ایم۔ اب اس نے ہجوں کے ذریعے اس میں موزوں گولائی پیدا کر لی تھی۔ کے اے اے وائی یو ایم۔

مہذب و متمدن انداز میں بولنے کا تمام تر انحصار ہونٹوں کے پلے پڑتا ہے۔ ہونٹوں کو گول کرنا آواز کو گھمانا۔ رولنا۔ طے کرنا۔ زبان کی نوک کو دانتوں سے چھونا۔

ان چھوٹی چھوٹی ایڈجسٹمنٹس میں اسے کئی مہینے لگ گئے۔

اس دوران میں اسے مکان مل گیا تھا اور وہ ڈائننگ اور ڈرائینگ روم کو سٹ کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

اس نے کئی بار سوچا تھا کہ جب وہ نئے گھر میں منتقل ہو جائے گا اور گھر کو فرنش کرے گا تو پھر اپنے پرانے سنیک کارنر کے ساتھیوں کو ایک ٹھاٹھ دار دعوت دے گا۔ لیکن اب جب کہ کمرے سیٹ ہو گئے تھے تو وہ انھیں بلانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

ابتدائی دور میں اس نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ وقت نکال کر سنیک کارنر میں جائے اور اپنے پرانے ساتھیوں سے ملے۔ لیکن جب بھی وہ جانے کا پروگرام بناتا تو عین موقع پر اسے کوئی ضروری کام پڑ جاتا۔

ایک مرتبہ تو وہ سینک کارنر کی طرف چل بھی پڑا تھا۔ لیکن راستے میں اسے خیال آیا کہ اس وقت اس کے ساتھیوں کا سنیک کارنر میں موجود ہونا ممکن نہیں اس خیال پر وہ لوٹ آیا تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ کسی ایسے وقت سنیک کارنر میں جانا چاہئے جب وہاں زیادہ لوگ نہ ہوں۔ صرف اس کے ساتھی ہوں۔ اگر سٹاف نے اسے وہاں دیکھ لیا تو وہ باتیں بنائیں گے اور چلتے چلتے بات افسران تک

پہنچے گی۔ اگرچہ اسے ایسی باتوں کی ذرا بھر پرواہ نہیں تھی پھر بھی کوئی ایسا قدم اٹھانا جس پر انگلیاں اٹھیں مناسب بات نہیں تھی۔ دوستی بےشک ایک اعلیٰ جذبہ ہے لیکن رکھ رکھاؤ بھی تو کوئی چیز ہے۔

انہی دنوں اس کا دوست رئیسانی سیکرٹریٹ ڈائریکٹوریٹ کا ڈائرکٹر بن گیا۔ حکومت نے اس ڈائرکٹوریٹ کی بلڈنگ سیکرٹریٹ کے باہر تعمیر کی تھی۔

پہلی مرتبہ سیکرٹریٹ ڈائرکٹوریٹ کی طرف جاتے ہوئے دفعتاً قائم چونک پڑا۔ اس کے سامنے ایک سرخ عمارت تھی جو خاصی مانوس نظر آتی تھی۔ پتہ نہیں کونسی عمارت تھی وہ۔ دروازے کے پاس لوئر سٹاف کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں رک گئے۔ گھبرا کر اس نے اپنا رُخ بدل لیا۔

اس کے بعد قائم کو اکثر رئیسانی کے پاس جانا پڑتا تھا۔ رئیسانی قائم کی ڈرافٹنگ کا مداح تھا جب بھی اسے کوئی طویل رپورٹ لکھنی ہوتی تو وہ قائم کو بلا بھیجتا۔

رئیسانی کے پاس جانے کے لئے قائم نے ایک نیا راستہ دریافت کر لیا تھا جو گراج کے پچھواڑے سے ہو کر پارک سے ہوتا ہوا گھوم پھر کر ڈائرکٹوریٹ پہنچتا تھا۔

سال بھر اس راستے سے آنے جانے کے بعد وہ اس امر کو قطعی بھول چکا تھا کہ اس نے وہاں جانے کے لیے اتنا طویل راستہ کیوں اختیار کر رکھا ہے کہ وہ سیدھے راستے سے وہاں جانا کیوں پسند نہیں کرتا کہ سیدھے راستے سے جانے میں کونسی مشکل حائل تھی۔ وہ یہ سب تفصیلات فراموش کر چکا تھا۔

وہ سرخ عمارت تو اس کے ذہن سے بالکل ہی اتر گئی تھی۔ قائم سچے دل سے یہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ طویل راستہ اس نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ راستہ خوبصورت ہے۔ جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں۔ سرخ بجری کی روشیں دو رویہ بڑے بڑے پام۔

ایک روز رئیسانی نے قائم سے فون پر کہا بھئی ابھی چلے آؤ ضروری کام ہے۔

جب قائم رئیسانی کے دفتر پہنچا تو وہ غیر از معمول ٹیرس پر بیٹھا تھا۔

ہیلو مسٹر وہ چلایا ڈِس وے۔

یہ کیا بیٹھنے کی جگہ ہے قائم نے پوچھا۔

کم آئی وانٹ ٹو شو یو سم تھنگ لک اس نے ملحقہ سرخ عمارت کی طرف اشارہ کیا ڈو یو نو دس بلڈنگ۔

قائم نے بڑے غور سے ملحقہ سرخ بلڈنگ کا جائزہ لیا اور پھر سر نفی میں ہلا دیا۔

بھئی یہ سٹاف کا ریستوران ہے سنیک کارنر۔

اوہ۔ آئی سی قائم چونک سا گیا۔

لیکن اس کا نام سنیک کارنر نہیں۔ بلکہ نوائے سنس کارنر ہونا چاہئے۔ یہ شور سن رہے ہو۔

”میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ سنیک کارنر میں کوئی شخص میز پر مکے مار مار کر چلا رہا تھا۔ میں سنیک کارنر کو کبھی نہیں بھول سکتا۔“

یہاں ہر وقت کلرک لوگ مل بیٹھ کر چائے پیتے رہتے ہیں رئیسانی بولا۔ اٹ از اے پرپیچول سروس آف ڈسٹربنس۔
واہی باور۔ قائم نے کندھے جھٹکے۔
اسی لئے تو میں نے آج تمہیں بلایا تھا رئیسانی نے کہا۔ آئی وانٹ ٹو ٹیک اوور دس سنیک کارنر۔
کیا مطلب۔ قائم نے پوچھا۔
فیکٹس یہ ہیں۔ کہ یہ بلڈنگ گورمنٹ کی ہے خیال تھا کہ اُسے ایک جنرل ریسپشن بنایا جائے۔ لیکن بعد میں یہ پروپوزل کینسل ہو گیا۔ پھر گورمنٹ نے اسے سٹاف کے لئے ریستوران بنا کر ٹھیکے پر دے دیا۔ گٹ می۔
یس قائم نے کہا۔
اب ہم چاہتے ہیں کہ یہ بلڈنگ سیکورٹی گارڈز کو ہاؤس کرنے کے لئے ٹیک اوور کریں۔ ایسا کونسنگ ڈرافٹ بنا دو کہ رئیسانی رک گیا۔
سنیک بار سے شور کا ایک ریلا آیا۔
میں تم سے ہمیشہ رابطہ قائم رکھوں گا۔ سنیک بار میں کوئی چیخ رہا تھا۔ میں جھوٹے سٹیٹس کا دیوانہ نہیں ہوں۔ میں عوامی افسر بنوں گا۔
معلوم ہوتا ہے کوئی فنکشن ہو رہا ہے قائم نے کہا۔ کسی کو پروموشن ملی ہے۔
یہاں روز ہی فنکشن ہوتا ہے۔ یہ ٹی ہاؤس نہیں۔ چیپ سینٹیمنٹل ہانگرز کا اڈا ہے۔
یہاں افواہیں مینوفیکچر ہوتی ہیں۔ بغاوت پلتی ہے اٹ مسٹ بی ٹیکن اوور۔
او نو ——— قائم نے پہلی مرتبہ رئیسانی کے خیال کو شدت سے رد کر دیا۔ شاید پرانی یادوں نے اس کے دل میں چٹکی بھری ہو۔ وے آر جسٹ پور چیپس جن کے پاس نہ ذہانت نہیں۔ علم نہیں پوزیشن نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ دے آر اگنورینٹ رن آف دی مل پیپل۔ وہ جسٹ سٹ اینڈ ٹاک آل سارٹس آف بلڈی ڈیش۔
"جھوٹے سٹیٹس کا دیوانہ وہ ہوتا ہے کوئی سنیک کارنر میں چلا رہا تھا جس میں قابلیت نہ ہو ذہانت نہ ہو۔ محنت کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ میں کبھی سٹیٹس کی بیساکھی کا سہارا نہیں لوں گا۔"
سی قائم نے رئیسانی سے کہا۔ او نو۔ آئی ڈو ناٹ اگری ود یو۔ سیکرٹریٹ کے اس سیفٹی والو کو بند نہ کرو۔ ڈونٹ گیگ ویز پور چیپس۔
سنیک کارنر میں وہ سب قہقہے مار رہے تھے نعرے لگا رہے تھے۔ کتنی خوشی کی بات ہے واٹ گڈ لک۔
شاید وہ گڈ لک ہی ہو۔ کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔

---

# آہوئے آوارہ

## جمیلہ ہاشمی

اجنبی شہر میں سردی یونہی بکھرا دیتی ہے اور پھر اُس دن تو صبح سے ہی ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی ہڈیوں میں گودے تک کو جما دینے والے بادل غزل در غزل مصاحبہ داروں کی طرح سورج کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے پھر ذہنوں کی سی سیاہ گھٹائیں امنڈ کر آئیں یورش کرنے کے لئے اکٹھا ہونے کے لئے تیار کھڑی ہوئیں ۔ میں یہاں تبدیل ہو کر آیا تھا ایک بالکل نئے محکمے کے سربراہ کی حیثیت سے جس کا اپنا دفتر تک ڈھنگ کا نہ تھا رہائش کا بندوبست ایک ہوٹل میں تھا جہاں سیاحوں کی آمد و رفت رہتی تھی ابھی کام بھی کچھ زیادہ نہیں تھا اور میری شامیں ناواقف ہونے کی وجہ سے تقریباً خالی ہوتیں کبھی کبھار کلب جانے سے اور بھی وحشت ہوتی اس لئے کہ یہاں میرے کوئی دوست نہ تھے میں شراب نہیں پیتا سگریٹ کا شوقین نہیں اور تاش بھی بس واجبی ہی کھیل سکتا ہوں۔

جس شام کا میں ذکر کرنے جا رہا ہوں اس روز میں نے پکچر دیکھی تھی اُس میں بھی خوشی کی کوئی کرن تک نہ تھی عجیب دل کو اداس کرنے والی غم سے بھری کہانی تھی لگتا تھا سارے عناصر اکٹھا ہو کر آدمی کے خلاف لگے ہیں۔ زندگی کے ناپیدا کنار سمندر میں محبت کے بول کی ایک بوند بھی نہیں ذرا سی خواہش بھی پوری نہیں ہوتی یہ سیاہ المیہ غاروں میں خون کو پانی کرنے والے غم کی داستان ۔ جی چاہا انٹرول میں اُٹھ جاؤں پھر سوچا ہو سکتا ہے کرداروں کو تھوڑا سا امن مل سکے کہیں سے ذرا سی کرن ان بادلوں کے گھیرے کو توڑے اُمید اور خلوص سے یہ سیاہی دور ہو ۔ مگر وقفے کے بعد بھی وہی افسوس ناک فضا رہی بلکہ ہیروئن کو تو حالات کی خرابی نے ناچ کر روز کی روٹی کمانے پر مجبور کر دیا لگا دل میں سے کوئی سارا خون نچوڑ رہا ہے ۔ اُسے مسل رہا ہے ۔ میں نے اپنے سے عہد کیا آئندہ ایسی فلم نہیں دیکھوں گا ۔ بھلا یوں بھی کبھی ہوا ہے خدا کی بنائی اس دنیا میں انسان کے لئے صرف گھٹتے رہنا اور زمانے کی چکی میں پستے رہنا ہی لکھا ہو ایسی کہانیاں دیکھنے کے بعد تو آدمی خدا کی ذات پر بھی شک و شبہ کرنے لگتا ہے اُس کے موجود ہونے پر بھی یقین ڈگمگا جاتا ہے ۔ جیسے وہ ہونے پر بھی نہ ہو یا وہ کسی کو بنا کر بھول گیا ہو ۔

اوور کوٹ کو لپیٹے جب میں پہنچا ہوں تو گرم موزوں کے باوجود میرے پاؤں سن ہو رہے تھے ۔ ہوا کے تھپیڑوں نے مجھے سن کر دیا تھا ناک برف کا ٹکڑا لگتی تھی سائیں سائیں کے شور سے کان بند ہونے لگے تھے ۔ پیدل چلنے کے باوجود جسم گرم نہیں ہو سکا تھا ۔ ہیٹر ایک دم بڑا جاندار لگا آگ کی سرسراہٹ نیلے شعلے کی لپک اور تال تھی جیسے گیت کی بڑھتی اور رجز ہوتی لے ۔ پاؤں گرم کرنے میں قریب ہی مخملیں کرسی میں دھنس گیا باہر ہوا کے شور میں اور زیادتی ہوتی گئی ۔ درختوں سے گھرے اس ہوٹل کو معلوم ہوتا تھا نعرے لگاتے ایک جلوس نے گھیرے میں لے رکھا ہو خوشگواری اور باہر کے مقابلے میں اندر کے اپنے پن ذہنی تھکن تنہائی کے احساس سب نے مل کر مجھے تھپکنا شروع کیا پھر نیلے پانیوں کے خواب میں ساری آوازیں ڈوب گئیں مہاساگر کی لہروں نے مجھے جھولا جھلایا ۔ پتہ نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ دروازے پر دستک ہوئی ہاں مجھے یونہی لگا جیسے کسی نے دروازے کو ہولے سے بجایا ہو وقفوں سے پھر ذرا زور سے ٹھوکا دیا ہوگا ۔ لگا میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں انجانے کا خوف آدمی کو یوں بھی ہلا دیتا ہے ۔ خواب کہیں غائب ہو گئے

رور کہیں آدھی رات کا گھنٹہ بجا۔ "ذرا دروازہ تو کھولیے۔" لہجہ ہرگز غیر ملکی نہیں تھا۔

دوبارہ ذرا وقفے سے پھر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" میں نے جاگ کر ذرا تیزی سے کہا۔

"میری چابی گم ہوگئی ہے۔" نہ شرمیلی اور نہ ہی کھردری عورت کی یہ آواز لگتا تھا زباں کی لکنت اور بدن کی لڑکھڑاہٹ کے درمیان سے کہیں مجسم ہونے کی کوشش ہو۔ اور دروازہ کھولنے کا بھی میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کال گرلز کے چکر میں یونہی میں کبھی نہیں پڑا اور پھر آدھی رات پیچھے پارٹی اور باسی اترنوں سے دل بہلانے کا شوق مجھے کبھی نہیں رہا کوڑے کے ڈھیروں سے یادوں کی بوری میں گو ڈھو بھرنے والوں سے مجھے نفرت ہے آدمی تعفن کو بیٹ منہیں سکتا اسے اوڑھا نہیں جا سکتا۔ روح کی پیاس کبھی گندے گدلے پانی سے مٹی ہے ٹھنڈے کوزوں کے میٹھے دھارے سے ہی مجھے شغف رہا ہے پارسائی کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں گر تیز تیز سانسوں کی گڑبڑ اور پسینے کی بو سے مجھے اپنے وجود کے آلودہ ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ دوست ہنستے ہیں صفائی کی میری اس عادت کو بے جا اسراف سمجھتے ہیں آدمی کبھی مٹھاس سے بھی گندہ ہوتا ہے سو گند سے بھی گھبرایا ہے۔ کہتے ہیں تم تو صدیوں پہلے پیدا ہو گئے ہو جس کا آتش فشاں جواب بیٹھا ہے اور آگ اگلتا ہے تو اس لاوے کو ٹھنڈا ہونے کے لئے صدیاں چاہئیں وہ کہتے ہیں میں بزدل ہوں لکیر کو پیٹتا ہوں خود پسند ہوں اور ذہین تو قطعاً نہیں مگر چابی کے گم ہونے کا میرے دروازے کے کھلنے سے کیا تعلق ہے؟"

میں صرف یہ چاہتی ہوں آپ RECEPTION کو فون پہ کہہ دیں۔

"کونسا نمبر"۔ "تین ہے آپ کے برابر میں کونے والا کمرہ۔"

آپریٹر کی سوئی ہوئی آواز آئی "یہ سدا تین نمبر کی چابی گم رہتی ہے۔"

"میں نے کہا کیا جواب دوں"۔ بڑبڑاہٹ برابر جاری تھی۔

"انہیں کہئے کم از کم آدھ گھنٹہ تو لگے گا جس بیرے کے پاس چابی ہے۔ وہ کہیں سویا پڑا ہوگا۔" پھر ذرا جاگی ہوئی آواز میں کہا۔ "انہیں کہیں انتظار کریں۔"

"میں نے فون کر دیا ہے چابی آتی ہی ہوگی۔" مگر دروازہ نہیں کھولا۔

اوپر کی بتی بجھا کر میں نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا سیاہ سرد رات بادلوں کے لبادے اوڑھے سڑک کی مدھم روشنیوں کے اوپر سے محو پرواز تھی اس کی تیز اڑان کا ساتھ دیتے ہوئے درخت جھکے جاتے تھے شاخیں پاگلوں کی طرح دوڑ میں حصہ لینے کے لئے ایک دوسرے کو دھکیل رہی تھیں پتے تیز تیز گردش کرتے نئے نئے خرگوشوں کی طرح اور وہ عورت تنہا کھڑی ہوئی چابی کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔

ہاں وہ تنہا ہی ہوگی اسے تنہا ہی ہونا چاہیے اگر کوئی ساتھی ہوتا تو وہ خود دروازہ کھٹکھٹاتا۔ آواز میں سلیقہ تھا لفظوں کی ادائیگی عمدہ تھی یہ مہذب سا لہجہ تھا جو کسی غیر ملکی کا تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے بے خیالی میں ایک مجسمہ بنانا شروع کیا ذرا ابھاری تھوڑی اور دوشیزہ نہیں اپنے یقین رکھنے والی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ وہ۔ خیر خیر۔ اور ٹھنڈے بستر میں جب مجھے وہ سردی گوارا ہی لگی تھی میں نے اپنے خوابوں کو پھر سے وہیں جوڑا جہاں سے وہ ٹوٹے تھے۔

اگلی صبح میں نے کاؤنٹر پر چابی دی ہے تو خوشبو کا ایک جھونکا میری ناک سے چھو کر بے چین کرنے والی یہ باس سینٹ کی نہیں تھی دیسی

عمر کی بھی نہیں سستی اور آوارہ سی جیسے استعمال کرنے والے کا اچھا اور بُرے پن تمیز کا سلیقہ ہی نہ ہو جیسے بے ترتیب کپڑے پہننے والے کو دیکھ کر طبیعت الجھ سی جاتی ہے یوں ہی سی کیفیت میری بھی ہوتی ہے۔ آس پاس کوئی نہ تھا پتہ نہیں یہاں سے ابھی ابھی کون گزر رہا تھا؟ دور پڑے صوفوں پر لوگ بیٹھے تھے سوائے چند اگر آس کے انتظار میں اخبار کو جلد جلد ختم کرنے کے لئے صفحوں کو پلٹ کر صرف سرخیاں دیکھتے ہوئے۔ لمبے بالوں والے غلط ملط لباس پہنے مرد اور عورتوں کے جوڑے جو غیر ملکی ہوتے ہوئے مشرقی لباس میں مضحکہ خیز لگتے تھے اور تیز تیز گفتگو کر رہے تھے۔ بارش صبح سے بنا رکے پڑ رہی تھی میں نے کھڑکی کے بڑے اور پرے شیشوں کے پرے جھانکا درختوں کی ہریالی دھل دھل تھی اور بھیگی شاخیں پانی میں کودتے پھاندتے بچوں کی طرح زور زور سے ہل رہی تھیں ٹرن ٹرن ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ "جی ابھی ذرا دیر ہوئی باہر چلی گئی ہیں۔" ...... جی کوئی پیغام کسی کے نام چھوڑ کر نہیں گئیں۔ پتہ نہیں کب آئیں عام طور پر رات گئے لوٹتی ہیں ...... جی اپنا پتہ لکھوا دیجیے۔" پھر اس نے چٹ پر ایک نام لکھ کر اُسے تین نمبر کے خانہ میں جو ڈاک کے لئے بنا تھا رکھ دیا۔

اُداس بھاری دل ہوئے ہوئے گھسٹتا رہا۔

دفتر سے لوٹ کر میں خط لکھتا رہا کھلے پردوں میں سے سڑک پر جاتی موٹریں کھلونوں کی طرح چھوٹی اور کمنٹیٹ پر بھاگتے ریل کے ڈبوں کی طرح چکروں میں گھومتی گئیں ذرا اسی جلدی سے ہر شے کتنی مضحکہ خیز اور بے معنی لگنے لگتی ہے۔

"پھر میں تم سے قطعاً محبت نہیں کروں گی اگر تم کل نہیں آئے خدا کی قسم۔"

"میرا انتظار نہ کرنا کام ختم کر کے ہی آؤں گا۔"

یہ مکالمہ عین میرے سر کے سامنے کھڑے ہو کر دہرایا جا رہا تھا۔

"دیکھو میں مارے بیٹھوں گی تمہاری یہ جرأت کہ میں کہوں اور تم انکار کرو۔"

انکار کون کر رہا ہے آئیڈا مگر کام تو دیکھو ہیں تصویریں کل تک کیسے ممکن ہیں۔ اگر ڈرائنگ بھی بناؤں تب بھی اور تم کہتی ہو انھیں رنگوں بھی سبھی نہیں قمار رنگ مجھ میں یہ ہمت نہیں۔

اوہ اوہ پلیز جاوی میرے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ تمہارے لئے گھڑیاں اور پل بھی اہم ہوتے ہیں اور میں تو پوری ایک رات اور آدھے دن کی بات کر رہی ہوں۔

پھر آوازیں روشنی کے نقطوں کی طرح اندھیرے میں ڈوب گئیں میں نے پردے بند کر دیئے۔

فون کی گھنٹی بجی میں ابھی نیم خوابیدہ تھا سردیوں کی سہ پہروں کی غنودگی بڑی دل خوش کن ہوتی ہے اور پھر جب کوئی کام نہ ہو کہیں جانے کی جلدی نہ ہو تو بستر کی گرمی آدمی کو تھپکتی ہے۔

"میں رات کی جسارت کی معافی چاہتی ہوں۔"

"میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"لگتا ہے میں نے پھر آپ کو سوتے میں سے جگا دیا ہے اور اب دوہری معافی کی طالب ہوں۔"

"یہ تو معمولی بات ہے محترمہ۔"

رات کے وقت سوتے میں سے کسی کو جگانا پسند تو نہیں مگر مجھے لگا تھا آپ سو نہیں رہے تھے۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم نہیں اوپر کی پوری روشنی دروازے کے نیچے سے دکھائی دیتی تھی اس لئے سوچا آپ کو زحمت دی جا سکتی ہے۔ اصل میں میں چیزیں ادھر اُدھر رکھ کر بھول جاتی ہوں — حالانکہ بیماری سے پہلے میں ایسی نہ تھی۔

"جی" بھلا میں اور کیا کہتا۔

یقین کیجئے میری چابی واقعی گم ہو چکی تھی اور سوائے آپ کو تکلیف دینے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ تین منزل اتر کر جانا میرے لئے تقریباً ناممکن تھا میں سارا دن چلتی رہی تھی۔

"چلتی رہی تھیں" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی چلتے رہنا کوئی ایسی حیران کن بات تو نہیں" اُس نے کہا۔

"نہیں" میں نے سوچا خاموش رہوں تب بھی وہ بولتی چلی جائے گی۔

"حیران کن بات نہیں ہے کمال ہے صاحب یعنی کسی خاتون کا سارا دن چلتے رہنا آپ کو بالکل نارمل لگتا ہے" اس کی آواز غصے سے ذرا تیز ہو گئی تھی۔

جی چاہا فون بند کر دوں مگر پتہ نہیں کیوں میں منتظر رہا۔

"کمال ہے صاحب آپ مردوں میں چلتے رہنے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ چلتے رہنا میری مجبوری ہے۔ سائیٹ کی تلاش میں مارے مارے پھرنا" وہ چپ ہو گئی جیسے کسی سوال کی راہ دیکھ رہی ہو مگر میں نے کچھ نہ پوچھا بھلا میں کسی کی زندگی میں نجی معاملے کی نوعیت بنا جانے بُوجھے کیوں دریافت کروں

"اچھا صاحب شکریہ" اور فون بند ہو گیا۔

باہر گھٹا گھٹی ہوئی نیلاہٹ کی تہ یک لخت اتر گئی تھی اور ریتلی ہوئی چادر کبھی دودھیا لگنے لگتی اور کبھی کاجل کا سا سیاہ اندھیرا اچانک ہی اندر گھس آتا پھر ذرا سی سفیدی ہوتی جیسے آنکھ مچولی کھیل جا رہی ہو۔ میں نے وقت دیکھا چھ بج رہے تھے۔ اگر میں اپنے گھر پر ہوتا تو دوستوں سے ملنے چلا جاتا سوچا دریا پار کے ایک رشتہ دار ہیں جہاں اُن کی خیریت دریافت کروں پھر میں نے بیرے کو بلا کر چائے کے لئے کہا اور ایک باتصویر رسالہ دیکھنے لگا چاند اور فضا سے زمین کتنی خوبصورت لگتی تھی اپنے سمندروں اور صحراؤں سمیت بستے دریاؤں اور برف سے ڈھکے پہاڑوں والی گہری نیلی جیسے کسی لاڈلے بچے کی قیمتی گیند اور آدمی اپنے کو کتنا اہم جانتا ہے کائنات کا دل۔

فون کی گھنٹی پھر بجی "صاحب کیا آپ میرے ساتھ چائے پینا پسند کریں گے"

"میں چائے پی رہا ہوں" میں نے یونہی کہا اس حیرت سے کہ اس عورت نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔

"تو کیا پھر میں آپ کے پاس آ جاؤں" یہ سُن کر میں بھلا کیا جواب دیتا شاید سہ پہر اُس نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا اُس نے سوچا ہو گا اور لوگوں کی طرح میں کوئی مہم جُو ہوں اور جانے کیوں ہوٹل میں ٹھہرا ہوں تیز چلتی تصویروں کی ریل سی میرے دماغ میں چل ہولے سے بنا کچھ کہے میں نے فون رکھ دیا۔

حیرت سے میں سوچتا رہا اور پھر بڑے زور کی ہنسی آئی دوسرے سرے پر وہ خاتون میرے جواب کا انتظار کر رہی ہو گی۔

دروازہ کسی نے دھکیلا میں عین ہنسی کے درمیان پکڑا گیا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹائے بنا وہ چلی آئی تھی "کیوں جناب آپ یوں خواتین کی بے عزتی

کرتے ہیں۔" وہ دوسری خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مگر خاتون میں نے ڈرتے ڈرتے ہوئے کہا میں تو آپ کو جانتا تک نہیں۔"

"تو اس کے لیے لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت ہے میرا نام آیڈا ہے میرا مطلب ہے میرے دوست ملنے والے مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں حالانکہ میں عادلہ ہوں پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگی آپ غالباً سگریٹ نہیں پیتے۔

"مجھے اس کی بو ناگوار لگتی ہے۔"

"ناگوار لگتی ہے تو پھر آپ کی ہماری دوستی کیسے چلے گی میں تو بہت پیتی ہوں چین سموکر ہوں۔

مجھے لگا میرا سانس رک جائے گا کبھی آپ لوگ ایسی صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں؟

"آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے۔ اور یہ آپ کا رنگ کیوں اترا جا رہا ہے کسی اجنبی خاتون سے کبھی بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

میں معمول کی طرح بیٹھ گیا اس نے گھنٹی بجا کر خود ہی بیرے کو بلایا، تازہ چائے کا آرڈر دیا۔

مجھے لگا بیرا زیر لب مسکرا رہا تھا۔ "ہاں سنو" اس نے بیرے سے کہا "سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی لیتے آنا۔"

"سگریٹ نہیں پیتے آپ کمال ہے بھئی کمال ہے۔ مگر آپ اگر مجھے یہاں برداشت کریں گے تو آپ کو اس کی بو بھی برداشت کرنا ہوگی۔"

اچھا آپ ابھی بچپنے کی عادتوں سے نہیں نکلے با تصویر رسالوں سے دل بہلاتے ہیں۔ اس نے رسالہ اٹھایا زمین کس قدر خوبصورت ہے مگر چاند سے ہی ایسی دکھائی دیتی ہے کیونکہ اتنی دور سے اس کی گندگی اس کی بدصورتی اس کی خرابی اور اس کے اندر جلتے ہوئے دلوں کی بو کوئی شے بھی تو اوپر تک نہیں پہنچتی۔

"کیوں صاحب؟" اس نے میری طرف دیکھا۔ وحشت سے بھری آنکھیں بکھری بکھری سی عورت معمولی کپڑے پہنے سلیقے سے بال سنوارے اس بے چین کرنے والی خوشبو سے میرا کمرہ بھر گیا۔

"اصل میں چائے تو مجھے آپ کو پلانا چاہیے تھی۔" وہ اب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"کوئی بات نہیں۔"

شکر ہے آپ بولے تو سہی اس نے اپنے پنچ رنگی دوپٹے کو بازو سے گلے میں ڈالا۔ میں اس کے سامنے اسکول کا بچہ لگ رہا تھا۔

بھئی آپ اپنا تعارف تو کروائیے نا۔ میں نے اپنا نام پتہ بتایا۔ ارے صاحب آپ کے محکمے کو سخت پبلسٹی کی ضرورت ہے۔ نیا بلکہ بالکل ایک دم نیا محکمہ ہے نا۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ عوام کو کوئی فائدہ پہنچے تو اسے فوراً پبلسٹی کرنا چاہیئے اور وہ اس کی اہمیت پہ تقریر کرتی رہی یہاں تک کہ چائے آگئی۔ جب وہ کمرے سے نکلی ہے تو دھوئیں کا سفید غبار بھی اس کے پیچھے نکلا میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے پردے کھول کر کھڑکیاں بھی کھول دیں رات جنگالی سے اندر گھس آئی جیسے وہ سیاہ بلی ہو جو بہت دیر سے بارش میں بھیگ رہی تھی۔

اس بو کی وجہ سے جو چھت کے پاس میرے ارد گرد ہر جگہ تھی مجھے نیند ہی نہیں آئی چابی گم ہونے کا ڈرامہ دہرایا گیا مگر چند راتیں بعد۔ سیڑھیوں پہ بہت زور زور سے چڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"ایڈم میں تمہارا یہ سارا کباڑ اٹھا کر اب اور آگے نہیں جا سکتا بھئی۔ یہ سیڑھیوں پر رکھ رہا ہوں۔"

" تمہاری یہ مجال لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی سارا دن مارے مارے پھرنے کے بعد اب لوٹی ہوں تم ہی لوگوں کے لئے گھومتی ہوں اور تم اسے نہ لا سکتے ہو "

" اتنا تو تم سے ہو نہیں سکتا کہ چار گھڑی اپنے کمرے میں بٹھاؤ "

تو یہ میرا مقدر تھا کہ میں ایڈا کی رات کی آخری گفتگو کا شاہد بنتا رہوں ۔ پتہ نہیں پھر کیا ہوا ۔ چیزیں جیسے سیڑھیوں سے نیچے گرنا شروع ہوئیں کمرے کے دروازے کھلے اور پھر بند ہوئے ۔ خاموشی چھا گئی اور پھر میرا دروازہ بجایا گیا ۔

" ذرا چائے کے لئے نیچے فون کر دیجیے گا "

میں نے کچھ کہے بنا فون کر دیا ۔ اگلے دن چائے پر ملاقات ہوئی نہ اُس نے معذرت کی نہ میں نے اُس سے یہ توقع لگائی تھی آتے ہی کرسی پر ڈھیر ہوئی " چائے پلائیے صاحب " میں نے بنا بات کئے چائے بنا دی ۔

" میں زندگی سے تھک گئی ہوں عاجز آ گئی ہوں مگر زندہ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا پڑتا ہے ۔ اگر آپ کو پتہ ہو کہ میں نے کیا کچھ کہا ہے کن چکروں سے نکلی ہوں تو آپ مجھ سے ہمدردی کریں مگر بخدا میں تو دنیا سے یہ آس لگائے نہیں جی رہی بیکار لوگوں سے یونہی اُمیدیں وابستہ نہیں کئے ہوں "

پھر خاموشی کا وقفہ لمبا ہوتا گیا ۔ مجھے لگا جیسے اُسے نیند آ گئی ہو ۔ ایک دم آنکھیں کھول کر کہنے لگی ۔

" اچھا چلو مجھے گولی مارو یہ بتائیں آپ نے اپنے محکمے کی پبلسٹی کے لئے کیا کیا ہے ارے بھائی نوکریاں کہاں ملتی ہیں ۔ اتنا عمدہ محکمہ ہے کام دھام ذرا ہاتھ پاؤں ہلاؤ تھوڑا زندگی میں دلچسپی لو یوں کیوں بیٹھے ہو ۔ مجھ سے جو ہو سکے گا میں تمہارے لیے کروں گی (ملاحظہ کیا فوراً آپ سے تم پر اُتر آئی) تمہیں پتہ ہے میرے اتنے عمدہ جاننے والے لوگ ہیں اُن سے کہہ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تمہارے لئے اشتہارات دلوا سکتی ہوں مگر تم منہ سے تو کچھ بولو ۔

میں نے اب بھی یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا کرتی ہے ۔ طے یہ پایا کہ جس دن مجھے چھٹی ہو اُس کے ایک جاننے والے کے ہاں چلا جائے ۔

عام طور پر اتوار کو جاگ ذرا دیر میں ہوتی ہے ۔ اخبار دیر میں آتا ہے چائے دیر میں پی جاتی ہے لوگ شیو نہیں کرتے دھوپ اگر ہو تو اُس میں ستاتے ہیں ۔ مگر پروگرام کے مطابق میں ذرا جلد اُٹھا شیو کی کپڑے بدلے اور ذرا سی خوشبو لگائی دس بجے تک اُس کی راہ دیکھی دھوپ بڑی جان بخش اور کھلی ہوئی تھی میں نے کھڑکی کھول کر گردن نکال کر اِدھر اُدھر جھانکا پرلی طرف ذرا پرے کھڑکی کے نکلے ہوئے حصے پر اپنا چہرہ نکالے وہ خاموش کھڑی تھی کھلے ہوئے بال شانوں سے نیچے لٹکے ہوئے تھے اور اتنی دُوری سے بھی اُن کی سفیدی مجھے جھلکتی دکھائی دے گئی ۔ میں ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا ۔ یہ عورت جو شور اور مصروفیت سے اپنے گرد قلعہ بنائے تھی ۔ پتہ نہیں کیوں اُس کا سراپا اتنا اُداس کر گیا ۔ اُس نے گردن پھرا کر مجھے دیکھا مگر اُس کی نگاہوں میں کوئی پہچان نہ تھی خفگی کے مارے میرا بُرا حال ہو گیا اور میں لفٹ کا انتظار کئے بنا سیڑھیاں اُتر گیا ۔ بس میں سوار ہو کر اُس کے روٹ ختم ہونے کی جگہ تک گیا وہاں کھیت تھے اور سرسوں کی پیلاہٹ دُور تک پھیلے آسمان سے کہیں ملتی تھی میں نے کسانوں سے باتیں کیں ایک کنوئیں کی منڈیر پر گھنٹوں بیٹھا رہا ۔ چلتے ہوئے رہٹ میں سے بہتے ٹھنڈے میٹھے چمکیلے پانی کے دھارے کو دیکھتا رہا ۔ وہاں سے اپنے دُور کے رشتہ داروں کے ہاں بھی گیا زور زور سے ہنستا رہا ہم مل کر گاتے رہے رشتہ کی بہنوں سے میں نے خوب مذاق کئے آنکھ مچولی کھیلی ، آئس کریم کھائی پتہ نہیں میں اندر سے اُداس کیوں تھا ۔

"عجیب آدمی ہیں آپ بھی کہاں چلے گئے تھے؟" وہ مجھے لفٹ میں مل گئی۔ میں نے حیرت سے اُس دُبلی سانولی اور بے تحاشا سگریٹ پینے والی عورت کو دیکھا۔

"صبح میں جب تیار ہو کر نکلی ہوں تو آپ کہاں تھے بھئی کہاں تھے تم؟" لفٹ والے نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو اُس میں حیرت تھی۔

دس بجے تیار ہو کر جب میں نے جھانکا ہے تو آپ کھڑکی میں کھڑی تھیں اور آپ نے مجھے دیکھا بھی تھا اس وقت تک تو جانے کے کوئی آثار نہیں تھے۔" میں نے شکایتاً کہا۔

تم کتنے ملتے ہوئے ہو عاصم سے جیسے بھائی سے وہ بھی ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جایا کرتا تھا۔ لفٹ رُکی ہم اُترے وہ میرے کمرے کے سامنے رک گئی بخدا تم کتنا اچھا چانس کھو دیا ہے اور اُن کا فون آیا تھا کہ عاصم کو نہیں لائیں۔

"عاصم کون عاصم" میں نے پوچھا۔

"میں نے انھیں کہا ہے کہ تم عاصم ہو اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے تم یوں بھی مجھ سے چھوٹے ہو" اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا "اور تمھیں بھلا اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ہو کیوں نہیں سکتا" میں نے ذرا پرے ہٹتے ہوئے کہا "تمھیں پتہ ہے میری نظر کمزور ہے۔"

"دور کی اور بہت قریب کی بھی" وہ وہاں میرے کمرے کے سامنے کھڑی تھی جیسے اُس کا وہاں سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ ساری رات ہم تاش کھیلتے رہے اُس نے مجھے بہت سی کھیلیں سکھائیں دھوکے سے جیتنے کے داؤ پتے چھپانے کے طریقے وہ ہنستی تو ہنستی ہی چلی جاتی ایش ٹرے میں سگرٹوں کے ٹکڑوں کا ایک چھوٹا سا انبار لگ گیا میرے کمرے میں نیلے دھوئیں کے اوپر ہر شے دُھندلی ہونی چاہیے تھی تاکہ حیرت انگیز طور پر چیزیں واضح تھیں سادہ سی چیزیں۔ دل کا آئینہ تک صاف تھا۔

مجھے میں کرید نہیں ہے از خود پتہ چل جائے ٹھیک ہے ورنہ میں لوگوں سے الجھتا نہیں اُن کی زندگی کے کونوں کھدروں میں جھانکنے کی میری عادت نہیں لہٰذا اسے میں نے خود کچھ نہیں پوچھا۔

"عاصم کو بھی تاش کی کوئی بازی سوائے رمی کے نہیں آتی وہ بھی تمہاری طرح اناڑی ہے اور اپنے سے بےپرواہ لباس کے معاملے میں تم اُس سے ذرا خوش ذوق ہو۔ وہ یہاں ہوتا تو تم دونوں کی خوب بنتی۔ وہ یادوں کے کارواں کے پیچھے چلنے لگی" میں اور وہ خوب جھگڑتے تھے اناڑتے تھے ہر وقت ایک دوسرے کو شکست دینے کی فکر میں یہاں تک کہ کھانا کھانے اور پڑھنے لکھنے میں بھی اندر سے ہر وقت مقابلے کی فکر میں لگے رہتے اماں ایک کو اچھا کہیں تو دوسرا روٹھ جاتا۔ ہر شے ہمارے لیے چیلنج تھی۔

"عام طور پر اُوپر تلے کے بہن بھائیوں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔" میں نے یونہی کہا۔

ایکدم اُسے غصہ آ گیا "اُوپر تلے کے بہن بھائیوں میں اتنی شدت سے رقابت نہیں ہوتی ہم تو جڑواں بہن بھائیوں کی طرح تھے اُسے بخار آتا تو مجھے بھی خواہش ہوتی کہ بیمار پڑ جاؤں۔ مجھے اُس کے بنا ایک پل قرار نہیں آتا تھا۔ اماں عاجز تھیں کہتیں "میری دعا ہے تمہارے درمیان آگ کا پہاڑ ہو تم لوگ جُدا ہو جاؤ تو میں چین سے ہوں گی" اور پھر انھیں بھی چین آ گیا" اُس کی آنسوؤں سے خالی آنکھیں بڑی بےنور لگ رہی تھیں۔

جنگ ہوئی ہے تو وہ بھی بھرتی ہو گیا اُن دنوں لڑکوں کو تھوڑی تھوڑی ٹریننگ دے کر محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔ انھیں فوراً کمیشن مل جاتا تھا۔

اُسے بھی مل گیا لفٹیننٹ کی وردی اس پہ بہت سج رہی تھی۔ مجھے چڑانے کے لیے وہ گھڑی گھڑی میرے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا اور سیلوٹ کرتا۔ "یہ فرق ہوتا ہے لڑکوں اور لڑکیوں میں۔" جی چاہا چیخ چیخ کر روؤں اس لئے نہیں کہ وہ جا رہا تھا اس لئے کہ میں وہاں نہ جا سکتی تھی۔

"عورتیں بھی تو فوج میں جا سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا تم چپکے نہیں رہ سکتے۔" اُس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "اگر میں جا سکتی تو چلی جاتی مگر ایسا ہو نہ سکا۔ وہ واپس نہیں آیا پتہ نہیں اُسے زمین نگل گئی وہ قید کر لیا گیا یا کیا ہوا۔ ہم لوگ منتظر ہیں اور رہیں گے لمبی فہرستوں میں مرنے والوں میں گم ہونے والوں میں کہیں اس کا نام نہ تھا۔"

بیرے نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ "آپ کے ملنے والے کچھ لوگ آئے ہیں۔"

"ابھی آتی ہوں۔" وہ اپنی سگریٹ کا پیکٹ بھی چھوڑ گئی۔ "جانے کون ہو۔"

سات کے اندھیرے میں لمبے گھنٹے ایک کے بعد ایک بجتے رہے کھانا کھا کر میں لیٹ گیا اور دھوئیں سے بھرے اُس کمرے میں خوب گہری نیند سویا۔

سرکاری مکانوں میں بہت سے جھگڑے ہوتے ہیں باورچی خانے کا مسئلہ اس کو صاف ستھرا رکھنے کا مسئلہ نوکروں سے نمٹنے کا مسئلہ اکیلے آدمی کی جان کو یہ روگ بے وجہ کی مصروفیت بن کر لگتے ہیں اور ان سے بچنے کے لئے میں نے وہیں ہوٹل کے اُس سے ذرا بہتر کمرے میں نقل مکانی کر لی اور اپنے حالوں زندگی رواں ہو گئی۔ کام بھی بڑھ گیا تھا اور پھر میں کچھ لکھنے پڑھنے میں بھی لگا رہتا تھا سردی بڑھی اور دن ذرا ذرا سے ہو گئے صبح ہوتی ور شام ہو آتی۔ شامیں میں اکثر کمرے میں گزارتا۔ محکمے کے لوگ ادھر ادھر سے چند لکھنے لکھانے والے دوست بن گئے تھے وہ جمع ہو جاتے اور دیوانی بحثیں ہوتیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی کام میں لگا تھا۔ تجربے ہو رہے ہیں۔ سیاست ہے مذہب ہے اپنا دکھ ہے پرایا غم ہے جب جوانی ہوتی ہے تو کتنا جوش ہوتا ہے کبھی کبھار یہ سب چھوڑ کر ہم کسی ہوٹل میں جا بیٹھتے۔

نئے سال کی شب آئی میرا ارادہ تھا کہ گھر جاؤں گا بہن بھائیوں سے ملوں گا مگر دوستوں نے جانے نہیں دیا۔ ہمیشہ تو تم گھر والوں کے ساتھ ہی ہوتے ہو اب کے یہاں رہو ہم تمہیں کسی سے ملوائیں گے نئے سال کا تحفہ سمجھ لینا اُس دعوت کو ان کے ہاں بڑی زبردست شب منائی جاتی ہے۔ کتنے ہی نئے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سارا شہر اُلٹ پڑتا ہے۔ تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی۔

یہ ایک گالا نائٹ تھی۔ یوں تو میں نے ناچ رنگ شراب ہنسی سبھی کچھ دیکھا ہے مگر اُس گھر میں ہولی کے رنگوں سے بڑھ کر رنگ تھے صورتوں پر گلال بکھرا ہوا جیسے فن کار کی لگن سے اُس نے حسن جمع کیا تھا جانے کہاں سے سینت سینت کر رکھی مورتیوں کو لا سجایا تھا بجتے ہوئے بدن۔ اپنی دلآویزی سے نت دلاتے ہوئے خطوط والی عورتیں کنواریاں جو چھیل سی آنکھیں چہرے پر سجائے تھیں۔ بیا بتا حسن کی کشش کے سامنے فرشتے بھی پگھل جائیں۔ بے خبر ہرنیوں کی طرح اپنے آپ سے گھبرائی ہوئی لڑکیاں۔ شکاری نازنینیں۔ بے سُدھ کرنے والی ناگنیں۔ اپنے بھولپن سے جادو جگاتی الھڑ دوشیزائیں۔ بچپنا اور جوانی کی حدود پر کھڑی کنواریاں۔ کھائی کھیلی ترنگ میں آئی عورتیں۔ اپنے آپ کو سنبھال کر چلنے والیاں۔ شرمائی لجائی، کونوں میں چھپتی مدماتی اداؤں والیاں اور ہر ایرے غیرے کے بازو میں بازو ڈال کر اپنے آپ پر یقین رکھنے اور کسی سے بھی نہ ڈرنے والی بے اختیار جام پر جام لنڈھانے والیاں۔ سب طرح کا جمگھٹا تھا۔

"اپنے آپ کو اس مجمع میں گم کر دو۔" میرے دوست نے کہا اور پھر مجھے ایک کونے میں کھڑا کر کے وہ کہیں غائب ہو گیا۔

"بیگیں کو کیا سمجھتے ہیں صاحب؟" مردوں کے دائرے میں گھری کسی عورت کی آواز آئی۔ "سب کچھ، سب کچھ۔" اپنے جام ٹکرانے کے بعد انہوں نے کہا۔ چھت میں تیاں ستاروں کی طرح جڑی تھیں کمرہ دھوئیں سے ادھا اور روشنی کے باوجود عجیب اُداس اُداس سا تھا۔ کسی نے جام میرے ہاتھ میں تھما دیا پھر اُسے بھر دیا اور میں کونے میں ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ سینٹ۔ سانسوں جسموں کی مختلف مہکیں ملی ہوئی تھیں عجیب بوجھل فضا تھی۔ جام چھلک رہے تھے لوگ مسلسل باتیں کر رہے تھے ہنس رہے تھے۔ ارکسٹرا کوئی دھن بجا رہا تھا جو بیک وقت نئی بھی تھی اور پرانی بھی لہروں کی طرح بہا کر لے جانے والی۔ ناچنے والوں کے جسموں سے یہ موجیں ٹکرا رہی تھیں۔ روشنیاں مدھم ہوتے ہوتے گم ہوتی لگتی تھیں۔

"تم پی کیوں نہیں رہے؟" کسی نے میرے قریب آکر کہا۔ "اکیلے ہو گیا؟ اوہ عاصم تم ہو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم یہاں ملو گے۔ پیو۔"

"نہیں ایڈا میں نہیں پیتا۔" میں نے بھرے ہوئے جام کو پرے دھکیل دیا۔

"سنو پیو ہو سکتا ہے یہ شب لوٹ کر نہ آئے۔ کچھ بھی لوٹ کر نہیں آتا زندگی پلوں کے نیچے سے تیزی سے بہنے والے پانی کی طرح ہے اور دیکھو سرخ شراب میں نرمی اور گھلاوٹ ہوتی ہے۔" اس نے اپنا جام خالی کر دیا۔

"یہ سیال جب رگوں میں اترتا ہے تو لگتا ہے تم قدیم یونانی دیوتاؤں کی شراب پی رہے ہو۔"

"میں تمہارے علم کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہوں۔"

"نہیں تم صرف میرا مذاق اڑا رہے ہو سبھی میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے مجھ پر ہنستے ہیں اور میں سب کا مذاق اڑاتی ہوں۔ خدا کا اور انسانوں کا تمہیں میری ہمت کا اندازہ ہے؟"

"میں غلط اندازے لگانے کا ماہر ہوں صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔"

"شرابوں کے متعلق میرا علم اتنا مکمل ہے کہ تمہیں حیرت ہوگی۔"

"اب مجھے کوئی شے حیران نہیں کر سکتی۔ تمہارے گم ہو جانے کے بعد سے نہیں۔"

سر پیچھے ڈال کر وہ ہنستی رہی یوں جیسے کوئی چیخوں کو روکنے کی کوشش میں لگا ہو۔ شاید وہ نشے میں تھی۔

"میں ساری رات پی سکتی ہوں اور نشہ مجھے نہیں ہو سکتا میں نشے کو ہو جاتی ہوں۔"

"ایسا ہونا ممکن ہے۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"تمہاری باتیں بہت کھوکھلی ہیں جیسے اندر گرہیں ہی گرہیں ہوں گھٹن ہی گھٹن ہو۔"

میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ پورا چاند بالکل اکیلا اپنے زرد ہالے میں سے نیچے زمین کی طرف جھانک رہا تھا ہوا میں باس تھی پھولوں کی رات کی رانی کی پیوندی گلابوں کی۔

صاحب خانہ کے ساتھ وہ پھر میری طرف آئی۔

میں نے مڑ کر اُن کی طرف دیکھے بنا کہا۔ "باغ بہت خوبصورت ہے۔"

"ایڈا ہمیشہ خوبصورت لوگوں کو اپنا دوست بناتی ہے جو اچھی چیزوں کی تعریف کر سکیں اُسے سمجھنے کا سلیقہ اور ذوق رکھتے ہوں مگر مجھے افسوس ہے آپ پیتے نہیں ہیں۔ پتہ نہیں کیوں اگر بُرا نہ مانیں تو ذرا سی چکھ لیں۔ آج جاتے سال کی آخری رات ہے۔"

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو میں اسے سنبھال لوں گی۔" ایڈا میرے برابر کھڑی ہو گئی۔ میزبان نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت چاہی۔

"تم بولتے نہیں ہو کیا خفا ہو؟" اُس نے خاموشی کو توڑنے کے لئے یونہی بات کرنے کے لئے کہا۔

"نہیں میں تو تمہیں جانتا تک نہیں خفا ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔" میں سوچ رہا تھا کہ چلو اچھا ہوا اس اجنبی رات میں اجنبی جگہ میں وہ مجھے مل گئی۔

"تمہاری خاموشی اور ایسی باتیں میرے اندر ہلچل سی مچا دیتی ہیں۔ سوال کرنا تو جیسے تم جانتے ہی نہیں ہو اور تمہاری یہی ادا مجھے دیوانہ بنا گئی ہے۔"
وہ میری طرف جھکی ہے تو مجھے واقعی دیوانی لگی۔

"پی لو ذرا سی ہی سہی میری خاطر۔" اُس نے ہاتھ میں پکڑا جام میری طرف بڑھایا۔

میری طبیعت اتنی بوجھل ہو گئی تھی ایک دم کہ میں اُس کا ہاتھ پرے بھی نہیں ہٹا سکا جیسے کسی نے مجھ پہ جادو کر دیا ہو۔

"بے بی پی لو نا ایک گھونٹ ہی سہی۔" وہ اور جھکی۔

"شٹ اپ۔" میں نے زور سے تقریباً چیخ کر کہا۔

ہاتھ ہٹا کر وہ بہت سنجیدگی سے میری طرف دیکھنے لگی "اچھا تو تم بول بھی سکتے ہو مجھے اپنی بے عزتی گوارا ہے۔ مگر تمہارا یہ گونگا بہرا پن تو دور ہوا۔"

"ایڈا تم ایسی کیوں ہو؟" میں بدستور کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا جہاں صدیوں پرانا چاند جانے کب کے بنے آسمان پہ سے کیڑوں کی طرح کلبلاتے اور اپنے کو خوش کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں کرتے ہوئے انسانوں کو نہایت بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔

"آؤ کہیں بیٹھ جائیں پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں ایسی کیوں ہوں مجھے ایسا ہی ہونا چاہیئے بھلا میں کوئی دوسروں سے الگ ہوں تم میرے معمولی لباس کی وجہ سے جس کی مجھے پرواہ نہیں ہے سمجھتے ہو کہ میں ضرورت سے زیادہ بہکتی ہوں نہایت بیباک ہوں جس طرح جی چاہے گفتگو کرتی ہوں اور مجھے آئندہ کا خیال نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ یہی باتیں ہیں نا؟"

میں اتنے بہت سے سوال نہیں پوچھنا چاہتا میں تو صرف یہ جاننا چاہوں گا کہ تم نے مجھے اپنے مزاج کا فسانہ کیوں بنا رکھا ہے۔

"اوہ بے بی کم آن تم کو پتہ ہے میں تمہیں عالم کی طرح سمجھتی ہوں۔ آؤ۔" اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف بیٹھنے کے لئے کسی جگہ کی تلاش میں چلی۔

"میں بھاگ نہیں جاؤں گا، بس میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

"ایڈا۔ ایڈا۔" کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں اور پرآؤ ہمارے ساتھ نیا سال مبارک ہو۔ نیا سال تمہارے لئے خوشیاں لائے۔ دور کہیں شور کے اوپر سے گھنٹیوں کی صدا آئی جام ٹکرائے سنہری سیال سے بھرے ہوئے شیشے اُٹھے صراحیاں لڑھکیں بھلا نیا سال ان کے لئے کیا لانے والا تھا کون بتا سکتا تھا؟

لوگ ایک دوسرے کو گلے لگا رہے تھے اور پرانا سال زخم خوردہ سپاہی کی طرح وقت کے مورچے میں بے ہوش گر گیا تھا۔ ہنستے ہوئے مدہوش آدمی ساتھیوں کے گھسٹتے پلوؤں کو سنوارنے کی ادھوری کوشش میں عورتیں — اندر بے پناہ گھٹن تھی۔ سٹیج پر لڑکھڑاتی لکنت بھری آواز میں کوئی کچھ کہہ رہا تھا پھر پردہ اُٹھا اور گھنگروؤں کی تال پر سج سج ہلکورے لیتی کشتی کی طرح ایک لڑکی صبح نو کی خوشخبری بنی سامنے آئی۔ میں باہر نکل آیا۔ "تم جا کیوں رہے ہو ٹھہر جاؤ نا۔"

میں مصروف ہوں۔ اناؤنسمنٹ کے لئے کسی سے کہہ دوں۔

میں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ دوست جن کے ساتھ میں آیا تھا اس مجمع میں گم تھے اور سواری کا مسئلہ بہرحال تھا یہ جگہ شہر سے تقریباً پانچ میل پر تھی۔ سردی کا شباب تھا اور چاندنی کے باوجود سڑک پر بکھرے سایوں سے اکیلا آدمی خوف زدہ ہوتا ہی ہے۔

ہوا میں خنکی آ سے دور سے کانپتے دیکھ رہی تھی وہ ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور پھڑپھڑاتے پلو کو اپنے گرد لپیٹنے میں لگی تھی۔ اُس کے بازو بہت ہی کمزور تھے جسم کے خطوط دلآویز بھی نہیں تھے اور ادھورے جیسے کھینچنے والے نے انہیں مکمل نہ کیا ہو مصور نے پہلے اُسے ایک اچھوتا خیال سمجھ کر بنانا شروع کیا اور پھر یونہی چھوڑ دیا۔ تنہائی اور رنگوں کے اس پس منظر میں وہ مجھے بہت مبہم لگی۔ سمٹی ہوئی بے رنگ سی۔ "پہلے تو تم یہ جاننا چاہو گے کہ میں ہوٹل سے جانا نہیں چاہتی تھی تو کیوں آ گئی تھی؟ مجھے کسی سے کچھ کہنے سننے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اماں آئیں اور بس گھیر گھار کر مجھے لے گئیں پھر ہنس کر کہنے لگیں ہوٹل کا بل ادا کرنے کا بھی مسئلہ تھا انہوں نے وہ بھی دیا۔ تمہیں معلوم ہے اگر وہ نہ آتیں تو میں تم سے مدد کرنے کو کہتی سولہ سو روپیہ تو کہاں میرے پاس تو کبھی سولہ روپے بھی نہیں رہتے ہتھیلی میں سوراخ ہے جو آتا ہے خرچ کر دیتی ہوں جو کماتی ہوں اُٹھا دیتی ہوں جوتے بازوں کی سی فطرت ہے میری" تب اُس نے سگریٹ پاؤں تلے مسل دیا میں اندر سے کانپ گیا بخدا وہ اگر کہتی تو میں مجبور ہو جاتا۔ اب تک مجھے ایک ذرا اس بات کا بھی پتہ نہیں تھا۔ اور اس کے باوجود میں اُس کا حکم ماننے کے علاوہ اور کیا کر سکتا۔ وہ میرے لئے نا چہرے کے ایک ہیولے کی طرح تھی۔ جو سایوں سے نکل کر ساری جمی جمائی زندگی میں کھنڈت مچا دے۔

اندر سے کسی نے پکارا "ایڈا۔ ایڈا ایجنٹی کہاں ہو تم؟" آواز میٹھی اور کمزور سی تھی۔

"یہاں ہوں" اُس نے ستون کے ساتھ لگے لگے جواب دیا۔ پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگی "بے بی لوگ تم کو اور مجھے اکٹھے دیکھ نہیں سکتے۔ جانے کیا سوچتے ہیں۔ اچھا سو ڈرائنگ میں چلوں وہ ڈنر کے لئے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور تم تو پوچھتے بھی نہیں ہو" تھوڑی دور گئی مڑ کر آئی اور کہنے لگی میں کل آؤں گی اور تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گی۔ تمہارے ذلیل ہوٹل میں نہیں کہیں باہر چلیں گے۔ کہیں نیم تاریک خاموش سے ریسٹوران میں۔ تصویروں کی ایک نمائش ہو رہی ہے وہ بھی دکھاؤں گی تمہیں۔ اب مجھے خیال آتا ہے تم اس شہر میں نووارد ہو اور میں نے تمہارے ساتھ نہایت سرد مہری کا سلوک کیا ہے" اور وہ بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ کہیں دور گھڑیال نے تین بجائے میں بڑے کمرے کے ساتھ چھوٹے سے کمرے میں صوفے پر نیم خوابیدہ تھا جب دوستوں نے مجھے ڈھونڈا اور ہم واپس ہوئے۔

تصویروں کی نمائش سردیوں کی نیم گرم سہ پہر میں بہت اچھی لگی۔ وہ مجھے لینے آئی تھی دفتر سے لوٹا ہوں تو رات کے واقع کو بدخوابی سمجھ کر تقریباً بھول چکا تھا اور پھر اُس کا آنا پتہ نہیں کیوں مجھے ان ملاقاتوں میں لگا کہ وہ جو کچھ ہے اس سے سوا دکھائی دیتی ہے اُس کی شخصیت میں کوئی رخنہ ہے کہیں کوئی کمی ہے یا پھر زیادتی لوگ اُسے پسند کرتے ہیں اس کے باوجود وہ پُراسراری ہے بھولے ہوئے گیت کی کوئی دُھن میٹھی کی طرح بجاتے ہوئے جب میں کمرے میں گھسا ہوں تو وہ پلنگ پر دراز تھی۔ میں دروازے میں پتھر بن کر کھڑا رہ گیا۔

بے بی اُس نے کمبل سر کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا "میں صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ رخشندہ کے ہاں سے میں گھر نہیں گئی تھی یہاں آ گئی۔ کمرہ صاف ہو رہا تھا میں نے اُسے باہر نکال دیا۔ رات کی تھکن کو کہیں تو اُتارنا تھا نا۔" مزے میں خرخر کرتی بلی کی طرح اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جی چاہا دیوار سے سر پھوڑ لوں وہ مجھے کیا سمجھتی ہے۔ حلوا خوار یا پیشہ ور عاشق اُس کی اداؤں پر ریجھ جانے والا اُس پر نہیں اپنے پر غصہ آیا۔

غصے کے مارے مجھ سے ایک لفظ نہیں بولا گیا۔ اُس نے پھر آنکھ کی جھری میں سے مجھے دیکھا۔ بھئی کھڑے کیا کر رہے ہو جلدی سے منہ دھو لو کپڑے اگر بدلو تو ٹھیک ہے ورنہ یہی چلیں گے کوئی بُرے نہیں ہیں اچھے اسمارٹ لگ رہے ہو۔

میں نے غسل خانے کے آئینے میں جا کر اپنی شکل دیکھی کیا میں اتنا بیوقوف لگتا ہوں؟ پھر تپائی پر بیٹھ کر میں نے بوٹ کھولے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس حرکت کو کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق کچھ سوچنا بھی ناممکن تھا۔ بیرہ کیا کہے گا ہوٹل کے باقی لوگ کیا کہیں گے۔

"کیوں بھئی کیا خواب دیکھنے لگے ہو نمائش میں جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" اُس کی سوئی ہوئی آواز سنائی دی۔ ایک دم جاگ کر جیسے میں نے سوچا اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فوراً باہر چلا جائے۔ باہر جا کر میں اُسے اس حرکت پر بُرا بھلا کہہ سکتا ہوں۔ اپنی شہرت صدا ورا ہیں ہی وغیرہ وغیرہ۔

"عجیب لڑکے ہو تمہارے پاس روز نہیں ہے کوئی ڈھنگ کی خوشبو نہیں ہے۔ اب کبھی میرے پاس پیسے ہوتے تو یہ سب چیزیں تمہیں تحفتاً دوں گی مجھے دوستوں کو تحفے دینا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور پھر تم۔"

باتیں کرتے کرتے اُس نے میری طرف دیکھا میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ بوٹ ٹھیک کرنے لگا اور اُس نے جلد جلد بالوں میں اُوپر سے کنگھی کر کے پرس پکڑا۔ "ہے بی یہ پرس تو خالی ہے" اُس نے اُسے دوبارہ میرے پلنگ پر پھینک دیا۔

"خالی ہونے کی کوئی بات نہیں تم اسے لیتی چلو۔" میں نے پرس اُس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا۔

بادلِ نخواستہ اُس نے اُسے پکڑ لیا ہم باہر نکلے۔

ٹیکسی میں بھی میں نے اُس سے کوئی بات نہیں کی اصل میں حیرت کے مارے اور کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا لگتا تھا مجھے سکتہ ہو گیا ہے۔ میں نے یہ اُمید کبھی نہیں کی تھی کہ میری ذرا سی بزدلی اُس کی اتنی جسارت کا سبب بن جائے گی۔ یہ تو پیشہ ور کال گرلز کے طریقے ہوئے بلکہ اُس سے بھی کمتر جیسے وہ جال کو میرے گرد تنگ کھینچ رہی ہو جو مجھے پھنسانا چاہتی ہو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا۔ میں کوئی رئیس زادہ نہ تھا۔ تنخواہ ملتی جس کا بیشتر حصہ گھر بھجوا دیتا تھا۔ میری ذمہ داریاں تھیں بہن بھائی تھے اماں تھیں میرے لئے انہوں نے بہت دکھ اُٹھائے تھے اس جگہ پہنچانے میں اُن کا حصہ تھا انہوں نے ہی مجھے وہ بنایا تھا جو میں ہوں۔ رنگوں اور شکلوں کے اس میلے میں پہلی بار مجھے اپنے کم علم ہونے کا احساس ہُوا لوگ نہایت سنجیدگی سے بروشر لئے تصویروں کو دھیان سے دیکھ رہے تھے اُن کے مطلب سمجھنے میں لگے تھے۔ تجریدی آرٹ یوں بھی کبھی میرے پلے نہیں پڑا۔ اُس کی باریکیاں میں کہاں جان سکتا ہوں۔ ہیلو۔ ہیلو بہت سی آوازیں ایک ساتھ آئیں تمہیں بھی نمائش دیکھنے کی فرصت مل گئی ہے وہ دوستوں کے نرغے میں تھی جان پہچان والے لوگوں کے درمیان۔ میں الگ سے اُن لمبی گیلریوں اور راہداریوں میں پھرنے لگا۔

بولتی ہوئی تصویروں تمہارے آر پار دیکھتی ہوئی نگاہوں چپ چاپ اور بہت کچھ کہتی آنکھوں کا بازار سجا ہُوا تھا عجیب و غریب اور بعید معمولی۔ احتیاط سے استعمال کئے ہوئے اور بہائے ہوئے رنگ اندھیرے کا احساس دلاتی ہوئی روشنیاں اور روشنیوں کا نشان بتاتے ہوئے اندھیرے۔

"ادھر آؤ میں تمہیں ایک تصویر دکھاؤں ایک خاص تصویر جو زمانوں سے اس نمائش میں سجتی ہے اور پھر اُتار کر رکھ لی جاتی ہے۔" وہ میرے برابر چل رہی تھی۔

"اُس تصویر میں کوئی خاص بات ہے کیا کوئی راز؟" میں آگے چلنے کی کوشش کر رہا تھا اُس سے علیحدہ ہونے کی۔ پتہ نہیں وہ کب تک اپنے آپ کو

مجھ پر مسلط رکھے۔ میں اُس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

"بے بی آخر بھاگ کیوں رہے ہو کیا تمہیں اُس تصویر میں دلچسپی نہیں ہے؟"

میں اُس کے برابر چلنے لگا۔ ساری ان کہی باتیں میرے دماغ میں گھومتی رہیں۔

ایک جوان ہوتے لڑکے کی شبیہ تھی مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نہیں لگی یا پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا وہ خاموش چپ چاپ عبادت کرنے والوں کی طرح سر جھکائے اُس کے سامنے کھڑی رہی میں اگلی تصویر کی طرف بڑھ گیا۔ دیر تک گیلری میں گھومتا رہا۔ سوچا آنکھ بچا کر نکل جاؤں پھر باہر برآمدے میں ٹھٹک گیا میں نے اُس سے کچھ نہیں پوچھا۔ بادل گھرے ہوئے تھے سیاہ دھوئیں کی چادروں کی طرح ایسا اندھیرا پھیلا تھا جو خوشی میں دل کے اندر روشنی کر دے جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں اور سردی [illegible] سڑک پر ہوا کے رخ ہوا کے ساتھ اڑنے لگوں مگر ہم ٹیکسی میں بیٹھے تھے وہ میرے برابر پچھلی سیٹ پر بالکل خاموش تھی۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی۔"

"آخر کہیں تو ٹیکسی والے سے کیا کہوں۔" مجھے پھر غصہ آنے لگا۔

"کسی ریسٹوران میں جہاں چائے مل سکے کھانا مل سکے اور خاموشی ہو۔ کچھ کھائے ہوئے تقریباً چھتیس گھنٹے ہو گئے ہیں۔" وہ پھر مراقبے میں چلی گئی۔

بنا کچھ کہے جیسے میرے وجود سے بے خبر ہو وہ کھانا کھاتی رہی آہستگی سے یادوں میں کھوئی ہوئی اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی دنیا کو بھولی ہوئی

میں کیا اُس کا محافظ تھا؟

تم چائے تو پی سکتے ہو میں نے اپنے آپ سے کہا آخر اس قدر گمبھیرتا کی کیا ضرورت ہے یہ ایسا سانحہ ہے جس پر بعد میں اور لوگوں کے ساتھ تم ہنسو گے بلکہ اب بھی ہنس سکتے ہو اور میں ہنسنے لگا۔

"بڑی بات بڑوں پر نہیں ہنستے۔" اُس نے آنکھیں اٹھائے بنا کہا چائے پی لو پھر مجھے گھر پہنچا آنا اور تم اپنے ہوٹل جا سکتے ہو۔

باہر نکلے ہی تو سیاہ رات نے اور سردی نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا "بے بی مجھے اپنا کوٹ دے دو۔" میں جتنا چڑتا تھا وہ مجھے چڑاتی تھی اس لئے اُس کے بے بی کہنے پر میں نے احتجاج کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بہت دیر ہم یونہی سڑکوں پر چلتے رہے کئی موٹریں ہمارے پاس سے گذر گئیں ٹیکسیاں زن سے نکلتی چلی جاتیں میرے دانت بج رہے تھے بغلوں میں ہاتھ دیئے میں اپنے کو کوس رہا تھا کس جھنجھٹ میں پڑ گیا تھا میں۔

"اوہ اوہ۔ جوتا کاٹ رہا ہے۔" اُس نے پاؤں کو دبانا شروع کیا پھر سڑک کے درمیان بیٹھ گئی۔

خدایا میں نے سوچا اب کیا ہوگا "تم جاؤ بے بی میں اب اور نہیں چل سکتی مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" یہ عورت جو کہتی تھی کہ پیدل چلنا اُس کی مجبوری ہے سارا دن سائٹ کی تلاش میں مارے مارے پھرنا۔

ہوٹل اب نزدیک تھا تقریباً ایک فرلانگ پرے وہ سارا بوجھ میرے کندھے پر ڈالے تھی بھکاریوں کی طرح ہم قدم قدم رکتے ہوئے ہولے ہولے فاصلہ طے کر رہے تھے۔

لفٹ میں وہ میرے ساتھ ہی سوار ہوگئی۔ کمرے کے دروازے پر میں نے کہا: "اچھا خدا حافظ۔"

مگر مجھ سے پہلے وہ اندر تھی۔ "ایسی سرد رات تو کوئی کسی کتے کو بھی ایسے نہیں دھتکارتا اور تم مجھے خدا حافظ کہہ رہے ہو۔"

میں سر جھکائے بیٹھا رہا آنسو میری آنکھوں میں تیزی سے بھر رہے تھے۔
غسل خانے سے باہر نکل کر اُس نے کہا "تم بیچارے مجھے تم پر ترس آتا ہے مشرقی گھروں کے لڑکے بھی لڑکیوں کی طرح شرمیلے ہوتے ہیں۔"
"زمانوں سے میں نے کسی سے بات نہیں کی مطلب ہے اپنی اور شیر علی کی باتیں تم سُننا پسند نہیں کرو گے کیا؟"
سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر وہ صوفے پر گھٹنوں کو سکیڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے روشنی کا سیدھا آنکھوں میں پڑنا سخت ناپسند ہے۔
مگر میں نے بتی اسی طرح جلنے دی۔
"ٹھیک ہے یہ تمہارا کمرہ ہے اور تم بتی جلائے رکھنے کا ہر حق رکھتے ہو تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ۔"
بہت سی گالیاں ساتھ ہوئیں اور لاشعور میں کھولتی میری زبان پر آتے آتے رہ گئیں اُس گھڑی مجھے لگا جو لوگ گالی دیتے ہیں اُن کا صبر آزمایا جاتا ہوگا
آخر کب تک۔

کیسا مردہ گھر سی رات گرم کمرہ کافی کا بھاپ اڑاتا پیالہ خواب آگیں فضا ہو جائے رات پیتے ہوئے میں نے کافی کا آرڈر دیا مرنے والے کی طرح میں
نے دل میں کہا پیرو جو بھی سوچے اُسے سوچنے دیا جائے اب کیا علاج ہو سکتا تھا یہ مصیبت بہر حال تو تھی۔
"ہاں تو شیر علی کی کیا کہانی ہے اصلی یا فرضی" میں کمبل لپیٹ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا بات گزارنے کے لئے اپنی طرف سے تیار ہو کر۔
"تم نے یہ کیوں کہا ہے" وہ لیٹے لیٹے ذرا سی آنکھ کھول کر بولی "جب تمہیں یقین ہی نہیں نہ میری ذات پر اور نہ ہی جو میں کہوں اُس پر تو پھر
کیوں سنتے ہو۔"

"بات گزارنے کے لئے اور کیا کیا جائے آخر" میں چاہتا تھا وہ کسی طرح بے عزتی سمجھ کر وہاں سے جائے۔
"بس شیر علی تھا اور نہیں رہا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا زمین اُسے نگل گئی یا آسمان نے اُسے اُٹھا لیا میرا منگیتر تھا وہ۔" —— پھر تھوڑی دیر
خاموش رہ کر بولی۔ "آج جو تصویر تم نے دیکھی وہ اُسی کی تھی۔"
مگر اُس کی پینٹنگ وہاں کیسے لگی ہوئی ہے۔ تمہارے پاس کیوں نہیں منگیتر تو وہ تمہارا تھا۔
"وہ بہت اچھا مصور تھا اور بہت بڑا۔"
"تم ماضی کے صیغے میں کیوں بات کر رہی ہو۔ لوگ اِدھر اُدھر چلے جایا کرتے ہیں اور واپس آجاتے ہیں اپنی بے یقینی سی میں میں نے پوچھا کتنے
عرصے کی بات ہے یہ۔"
"دس سال ہو گئے ہیں۔ دس سال اور کچھ مہینے میں اُس کے جانے کی تاریخ سے ایک ایک ساعت گنتی ہوں۔ اب آئے گا تو .... مگر وہ آئے
گا ہی کیوں کہیں کسی اور ملک میں کسی اور دیس میں کسی اور کے بازوؤں میں ہوگا اور میں یہاں برہن بنی اُس کی یاد میں جی رہی ہوں کبھی کبھار دل چاہتا ہے خودکشی
کروں پھر موہوم سی آس مجھے پیچھے ہٹاتی ہے میرے ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔"
سامنے بیٹھی اُس عورت کی صداقت اور استقامت اُس کی بہادری یقیناً قابلِ تعریف تھی۔ میں نے بڑی عقیدت کی نظروں سے اُس کی طرف
دیکھا احترام سے میرا سر جھک گیا۔
"وہ آخر کہاں جا سکتا تھا کہاں چلا گیا تمہیں کچھ تو پتہ ہوگا۔"

ایک دن میں اس کے سٹوڈیو گئی دل کرہم پُرانی کتابوں کی کھوج میں نکلنے والے نئے نوادرات جمع کرنے کا خبط تھا۔ گاؤں میں پتہ چلا تھا کسی شخص
کے پاس بزرگوں کا کتب خانہ ہے اور وہ اُسے ضائع کر رہا ہے بھلا پُرانی عربی فارسی کی کتابیں نئے زمانے میں کس کام کی ہیں۔ متروک ہوتے علوم کو کون پڑھتا
ہے کسی کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ بیٹھے اور انھیں کھنگالے، حاصل بھی کیا ہوتا ہے۔ میں یہ شوق بیکار سمجھتی تھی مگر کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اُسے اور بھی بہت
سے شوق تھے عجیب و غریب لوگوں سے ملاقاتیں پُراسرار زندگی! اسی پُراسراریت نے پہلے پہل مجھے اُس کی طرف لگایا۔ جب ہی میں نے اُس کی پرستش کی
تھی ہر لحظہ وہ ایک نیا انسان ہوتا تھا بے چین شعلے کی طرح تابناک اور بے حد خوبصورت۔ تم نے اُس کی آنکھیں دیکھی ہیں ایسی خواب لیتی اور بہہ بھی جاتی
ہوتی۔ مجھے کبھی کبھی لگتا جیسے میرے خواب مجسم ہو گئے ہوں۔

بہت دیر وہ چپ چاپ سامنے پڑی کاپی پر ہولے ہولے جھلی سی آتی گئی رات اپنے گھنگروؤں اور سازوں سمیت ناچ کر ڈھلتی جاتی تھی۔
جب میں گئی ہوں تو وہ نہیں تھا۔ میں بیٹھی رہی اندر آتی دھوپ میں تصویروں کی آنکھیں مجھے اپنی طرف گھورتی لگتی تھیں۔ تھک کر میں نے اپنی
پسند کے موسیقی کے ریکارڈ بجانے کے لئے گراموفون کا ڈھکنا سرکایا لکھا تھا۔
"ایسا میرا انتظار نہ کرنا۔ جانے اب کب ہماری ملاقات ہو اور ہو بھی کہ نہیں۔ میری خواہش ہے۔ تم زندگی کے دل میں رسو بسو اور سکھی رہو۔"
اُس نے آنکھیں بند کر لیں کمبل کو سر پہ کھینچ لیا جیسے دُنیا کے دروازے اپنے پر بند کر لئے ہوں۔
میں نے بتی بجھا دی اور بستر پر چلا گیا۔ جاگتا اور سوچتا رہا کہ دل پتہ نہیں کیا شے ہے یہ ٹکڑا خدا نے آدمی کے سینے میں اُسے بے پناہ اذیت
دینے کے لئے آخر کیوں لگایا ہے؟

رات کے پچھلے پہر میری آنکھ ایک دم کھل گئی جیسے نیند کی چادر کو کسی نے زبردستی کھینچ لیا ہو وہ میرے پہلو سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی "بے بی
مجھے اکیلے سونے کی عادت نہیں" اُس نے زیر لب کہا ذرا پرے ہٹو تھوڑی سی جگہ دو۔ میں تڑپ کر اُٹھا تو بجلی کی سی تیزی سے اُس نے مجھے گھسیٹ لیا مگر
جانے کے لئے تیار ہوا ہوں تو ہاتھ کانپ رہے تھے ٹائی کی گرہ ٹھیک نہیں بندھ رہی تھی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔
عجیب کیفیت تھی اپنے وجود سے شرم آ رہی تھی برہنگی کا احساس تھا اور رگوں میں خون سن سن کر کے سر کی طرف دوڑتا تھا سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔
چکر آ رہے تھے اور ہر لحظہ یہ احساس ہوتا تھا کہ میں گر جاؤں گا وہ بے سُدھ سو رہی تھی میں کمرے سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتا تھا بھاگ جانا چاہتا تھا۔
کوک اور نوکروں کے ساتھ مصروف تھا میں چابی کا گچھا آنکھ بچا کر باہر آ گیا۔ دفتر فون کر کے کہ میں ضروری کام سے جا رہا ہوں اسٹیشن چلا
آیا۔ اسٹیشن سے میں نے ہوٹل فون کیا سامان میرے دفتر کے پتے پر بھجوا دیا جائے اور ایسی ضروری ہدایات دیں۔ دن کی روشنی پھیکی اور بے کیف تھی۔
بہن بھائیوں کی محبت شفقت ماں کی دلداری نے مجھے اپنے ضبط کرنے میں مدد دی پندرہ دن کے بعد میں واپس آیا اور مستقل اپنے دفتر
کے ایک کمرے میں رہنے لگا۔ زلزلے کے بعد کی حالت کو درست کرنے میں بھی کافی دن لگ گئے۔ میں اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا سڑکوں پہ
نکلتے ہوئے گھبراتا تھا مبادا وہ کہیں دکھائی دے جائے۔ بخار پکڑ لے میرے ساتھ لگ نہ جائے۔ سب سے زیادہ مصیبت تو یہ تھی کہ کسی سے بات کر کے
میں فیصلوں کا بوجھ ہلکا نہیں کر سکتا تھا۔ بخار کی طرح یہ خیال مجھے پکڑے رکھتا۔ دوست کہتے نہ کوئی کام کرتے ہو نہ سوچتے ہو شاید ہو گیا ہے تمہیں۔
میں ہنس کر چپ ہو رہتا۔

منیر نے ایک دن مجھے پکڑ لیا "سچ سچ بتاؤ کیا ہوا ہے گم شدہ ہو گئے ہو زخمی ہو گیا؟ کب سے عشق کر رہے ہو ہمیں بتاؤ نا۔ دوستوں سے

... ٹھیک نہیں آدمی اکیلے اکیلے یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ بوجھ کو بانٹ اور ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں یقین کرو ہم تمہیں برا بھلا نہیں کہیں گے۔

میں نے اسے ایڈا کا بتایا اور رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر جیسے گرنے سے بچ رہا ہوں۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "تو تم آئے بھی اُس دیوانی عورت کی مٹھی میں آ گئے۔" اور ہمیں تم نے ہوا تک نہ لگنے دی۔ اس سارے معاملے کا ... مگر اُس نے پھانس لیا تمھیں سے تو اتنے بیوقوف نہیں لگتے مگر ہو سہی نا تجربہ کار ہونا۔ اور تم اندر کیوں گھسے رہتے ہو ساتھ چلا کرو اکیلا پن تو اچھے اچھے سوچنے والے کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔

ہم ایک نئے ریسٹوران میں بیٹھے تھے جو اُس ہوٹل کے بیس منٹ میں تھا۔ صرف گنے چنے لوگوں کو اُس میں داخلے کی اجازت تھی۔ آرکسٹرا بج رہا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں نیم تاریکی میں قدم سے قدم اور چہرے سے چہرہ ملائے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ایک جسم کہاں سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا کہاں ختم۔ پھر کسی نے اشارہ دیا موسیقی کی دھن بدل گئی ساز ہولے ہولے دھیمے سروں میں کوئی نہایت پرانی گت بجانے لگے تیز تیز تھرکتے ہوئے جسموں کے تال دیتے پاؤں بھی ان لہروں پر جیسے بہتے ہوئے۔ چھوٹا سا ہال ایک آہستہ رو دریا کی طرح تھا طوفان اور جوش کے بنا۔

منیر نے کہا میں بھی ناچنا چاہتا ہوں اور وہ اٹھ کر چلا گیا کسی ساتھی کی تلاش میں۔

ہیلو بے بی کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا زمانوں کے بعد دکھائی دیئے ہو کہاں چلے گئے تھے اور میں نے تمھیں ہر جگہ تلاش کیا۔ ہر جگہ تمہارے دفتر میں اور یہ تمہاری امانت ہے میں اسے لوٹانا چاہتی تھی۔

سفید رسٹ واچ مدھم روشنی میں میز پر پڑی اُس کے اور میرے درمیان گزرے اور آنے والے وقت کا نشان بنی چمکتی رہی۔

اتنی بہت سی باتیں تم سے کہنا تھیں مگر تم بولتے ہی نہیں ہو خیر خیر بے بی شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے آدمی تجربات ہی سے گزرتا ہی ہے۔

"شٹ اپ۔" میں نے نہایت آہستگی سے کہا میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتا۔ "چلی جاؤ یہاں سے ایک دم۔"

"بہت خفا معلوم ہوتے ہو۔" اور وہ میز پر سر رکھے رونے لگی زور زور سے جیسے اُس کا سب کچھ کہیں لٹ گیا ہو۔ میں نے اُس کی بے عزتی کی ہو۔ اور میں رو بھی نہیں سکتا تھا۔

ہاتھ بڑھا کر اُس نے کہا "خدا کے لئے ایک لارج جن کا آرڈر دو ورنہ میں یہیں ڈھے جاؤں گی تھکن کے مارے شرم کے مارے۔"

منیر اُس ہلکورے لیتے گروہ میں جانے کہاں تھا اور میرے لئے نجات کی ساری راہیں بند تھیں۔

اپنا گلاس بھرنے کے لئے اُس نے ہاتھ اُٹھایا تو نقاہت کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ بہت بڑی ایکٹریس ہے یہ خاتون اور میں تو اب مکمل جہنم واصل ہو گیا ہوں۔ "تم اُس رات سے ایک دن بھی زیادہ عمر کے نہیں ہوئے۔" وہ ذرا ہنسی۔ اس کے پیسے میں خود ادا کروں گی سنا تم نے آج کل مجھے ایک بہت عمدہ سا کام مل گیا ہے۔ اور کام بھی کیا ہے میری ایک بہت سویٹ دوست ہیں اُس کے انکل کو پتہ نہیں کیوں حکومت نے کسی کی مخبری پر جیل میں بند کر رکھا ہے بس اُن سے ملاقات کے لئے ہر ہفتے جاتی ہوں۔ اتنی دولت کے مالک ہونے پر بھی وہ بے حد سیدھے اور پیارے آدمی ہیں کہتے ہیں جب خدا کو منظور ہو گا انھیں رہا کر دیا جائے گا۔ اُس کی ذات پر اتنا بے حد یقین ہے انھیں۔ بیٹے دور دراز ملکوں میں ہیں۔ بہت پھیلا ہوا کاروبار ہے۔ فرصت نہیں ہوتی کہ باپ سے مل سکیں۔ میں جاتی ہوں تو خوش ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ادھر اُدھر کی باتیں پوچھتے رہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کوشش کر کے انھیں جیل سے باہر نکالا جائے مگر وہ مانتے ہی نہیں کہتے ہیں ابھی وقت نہیں آیا اور اُن کا وہیں رہنا ٹھیک

ہے۔ ایک بار ملاقات کے مجھے تقریباً پانچ سو روپے ملتے ہیں۔ سرحد کی جیل میں ہیڈ اوہ۔ اور مجھے ہوائی جہاز سے یہ سفر کرنا پڑتا ہے۔

ایک کے بعد دوسرا گلاس ختم کرکے اُس نے کہا: "بے بی مت سمجھنا میں یہ روز پیتی ہوں بس کبھی کبھار اور وہ بھی بہکتی نہیں ہوں سمجھے؟" جب میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو کہنے لگی "ناچوگے؟" پھر خود ہی کہنے لگی "تمہیں ناچنا کہاں آتا ہوگا۔ آؤ میں تمہیں سکھاؤں"۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ میں نے زور سے جھٹکا تو وہ پورے قد سے پیچھے گر گئی۔

شرمندہ ہو کر میں جلدی سے جھکا کہ اُسے اٹھاؤں مگر وہ بے ہوش تھی یا پھر مدہوش۔ بیرے بھاگتے ہوئے آئے۔ مُنیر بھی کہیں سے آکر میرے برابر کھڑا ہو گیا۔

"ایڈا اٹھو۔ تم ہمارے دوست کو چٹ پھیریاں کیوں دے رہی ہو بھائی۔ اُسے ناچنا بے آبرا مت کچھو"

"اوہ منیر تم ہو۔" وہ کرسی کا سہارا لے کر اُٹھی۔

"ہاں یہ میں ہی ہوں۔ زمانے ہو گئے تم سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔" منیر نے ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔

"کل رات میں ایک دعوت دے رہی ہوں تمہیں پتہ ہے۔" اُس نے بوتل اپنی طرف کر لی۔

مُنیر نے کہا "میں اور عاصم کل موجود ہوں گے میرے خیال میں یہ بھی عاصم ہی ہوگا۔"

ایڈا نے جیسے سنا ہی نہ ہو اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس غار کی سیڑھیاں طے کر کے ہم آئے تو چاند کہیں بادلوں کی اوٹ سے نکلا تھا اور بھیگی ہوئی ہواؤں میں نمی نہیں خوشگواری تھی زرد کرنوں کے جال میں بندھے ہوا کے نیچے اُڑے جا رہے تھے۔

"چوتھی سڑک ہے چورلیس سے بیسے ہاتھ اُدھر "گولڈ وڈ" گھر کے باہر لکھا ہے۔" اُس نے چیخ کر ہمارے پیچھے کہا۔

"تو کیا تم سنجیدگی سے اُس کی دعوت میں جانے کا ارادہ رکھتے ہو واقعی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک ایسی دعوت کو رد کرنا کور ذوقی ہے عاصم" مُنیر نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا۔

یہ ایسا گھر تھا جس کا خواب دیکھنا بھی مشکل ہے اپنی رونقوں اور شان و شوکت کی وجہ سے پُرانے زمانے کے نوابوں کے محلوں سے کسی طرح کم نہیں باوردی بیرے بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے۔ دبے دبے رنگوں اور عمدہ طور طریقے سے سجائے ہوئے اس محل میں ایڈا کے وجود ہونے کا تو ہم سوچ ہی نہیں سکتے تھے مگر ہمیں جس خاتون نے خوش آمدید کہا وہ سفید بالوں اور عمدہ خدو خال والی بہت ہی مہذب ملکہ کی سی شان والی تھی۔ "آئیے آئیے آپ ایڈا کے دوست ہیں نا۔"

بہت لوگ نہیں تھے مگر خاصا اچھا مجمع تھا۔ ایڈا کا ایک انکل تھا جو بار بار رومال پہ ناک صاف کرتا اور پھر اُسے جیب میں ڈالتا تھا۔ وہی رومال نکال کر ہاتھوں میں گولا بناتا تھا اور اپنے گلاس پہ جھکا ہوا تھا۔ ایک خاتون تھی جو مسلسل گفتگو کرتی تھی اور چڑیا کی طرح پھدک کر کبھی ایک کے پاس جاتی اور کبھی دوسرے کے پاس لگتا تھا اُسے انگریزی بولنے کا بہت شوق ہے گھڑی گھڑی YOU SEE کہتی۔ ہاتھ ہلا کر اپنا مطلب سمجھاتی اور جام رکھ کر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتی تھی۔ جن میں سیاہی اور سرخی کا نہرا روشنی پڑ کر چمک اُٹھتا تھا۔ کچھ لمبے بالوں والے ادھیڑ عمر لڑکے تھے سیاہ عینک لگائے جیسے فلموں کا ہیرو ہو نہایت اسمارٹ ایک شخص تھا جس کے بہت ہی کم ملنے کے باوجود لگتا تھا اگر وہ طارزمیس کی طرح

کرسی کو توڑ دے گا اور یہ شیشہ و جام ہاتھ مار کر بکھیر دے گا۔

ایڈا نے نہایت اونچی چولی پہنی تھی جس کا گلا بہت نیچا تھا کمر سے کھلے حصے پر پاؤڈر کی تہ صاف نظر آ رہی تھی وہ بہت مضطرب تھی اور اس کی ساڑھی کا پلو گھڑی گھڑی گر رہا تھا۔ میک اپ کی وجہ سے کم عمر نظر آتی تھی اور بالوں کے رنگ میں سیاہی نے اس کو دس سال پیچھے کر دیا تھا۔ وہ انکل کے ارد گرد منڈلاتی پھرتی تھی مسکراہٹ سے اُسے رجھاتی ہوئی جیسے بس اُسے دیکھ کر ہنسنے کے علاوہ کوئی کام نہ ہو۔

میں اور منیر شام سے ایک کونے میں بیٹھے تھے ہمارے ساتھ بیٹھی خاتون کے ترشے بالوں میں مصنوعی لہریئے تھے جو بھیگتی رات کے ساتھ ساتھ اور دلفریب لگنے لگے تھے۔ اُس کا دہانہ چھوٹا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ وہ اپنے دنیا کے سفر کا قصہ سنائے چلی جا رہی تھی جب میں پیرس میں تھی جب میں ہانگ کانگ میں تھی۔ منیر مفت کی شراب کو بڑی بے دردی سے انڈھار رہا تھا اور مجھے ایڈا کی نقل میں بے بی کہہ رہا تھا وہ تو کب سے بہک رہا تھا اور ہم سے ذرا اُدھر ایک جوڑے میں بہت دلچسپی لینے لگا تھا۔ ابھی تک سب لوگ ذرا لئے دیئے تھے۔ اپنے کو سنبھالے ہوئے۔ انکل نے ایڈا سے کہا "میوزک کا بندوبست کیوں نہیں ہے"۔ اُس کی آواز میں جھگڑا کرنے والے کی سی تلخی تھی ایک نہایت بیہودہ قسم کا گانے والا بلایا۔ اس کا ساز درست نہیں تھا جیسے آؤٹ آف ٹیون ہو طبلہ نواز بیمار تھا اور کھانس رہا تھا۔ طے یہ ہوا کہ محفل میں ہر کوئی گائے جس کو گانا آتا ہی نہ ہو وہ بھی کوشش کرے۔ انکل نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا۔ وہ بے ہنگم پھٹی ہوئی آواز میں گانے لگا تو چپ ہی نہیں ہوتا تھا۔ منیر اب اپنے قصے سنانے لگا تھا اور گانا سن نہیں رہا تھا "اگر تم سننا نہیں چاہتے ہو تو نکل جاؤ"۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور آدمی کو کالر سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں جھگڑا زیادہ نہ بڑھ جائے مائیڈا کبھی ایک کے آگے ہاتھ جوڑتی کبھی دوسرے سے کہتی "میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں منیر ساری فضا خراب نہ کرو۔

میں نے بہت مشکل سے منیر کو چپ کروایا پھر وہ اُس مرد سے اُلجھ پڑا "آؤ بیرونی آخر ہم سے بھی بات ہو سکتی ہے"۔ اس نے بہت خوبصورت بالوں والی میکسیکی پہنے خاتون سے کہا "آپ کو شاید محفل کے آداب نہیں آتے"۔ اُس کے ساتھی نے منیر سے کہا۔

"آداب کس چڑیا کا نام ہے؟" اُس نے خالص غنڈوں والے انداز میں جواب دیا اور اُس عورت کو بازو سے پکڑ لیا۔

"بے بی تم منیر کو سنبھال نہیں سکتے"۔ ایڈا نے منت کی۔

"تم اب میرے دوست کو مزید اپنے مطلب کے لئے نہیں برتو گی"۔ منیر جلدی سے میری طرف آیا "یہ تم اس کے کان میں کیوں بات کر رہی ہو"۔ میزبان کی حمایت میں آدمی منیر کو ڈانٹنے لگے بات بڑھ گئی۔

ایڈا نے کہا "منیر تم کیا کرنا چاہتے ہو سنبھلو ہوش میں آؤ مجھے شبنم کے یہاں ہونے کا بالکل پتہ نہیں تھا"۔

میں نے کہا "یہ تم اتنے جھگڑالو کیوں بنے ہوئے ہو"۔

"میں اس کی بے عزتی کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس کی محفل درہم برہم کرنا چاہتا ہوں"۔

"یہ تو تم ویسے بھی کر سکتے تھے۔ مگر تمہاری اپنی ڈگمگی۔ اُس کا عورت ہونا۔ گھر والے میزبان۔ انکل میری بات کاٹ کر اُس نے کہا تم اس

حواؤ کو عورت کہتے ہو۔ یہ کون سی شریف گھردار عورت ہے اور یہ انکل دعیزہ بھی فراڈ ہی ہوں گے۔ تم زیادہ تلخ کیوں ہوتے ہو؟"
ایڈا نے کہا: "میزبانوں کا کچھ خیال کرو۔ جس بڈھے آدمی کو تم نے کالر سے پکڑا تھا وہ گھر کے مالک کا خاص الخاص جان ہے تم پہلے تو کبھی یوں نہیں بہکے نہایت تمیزدار مشہور ہو۔"

نیلیفا اور اس کا ساتھی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ کھانے پر بھی بہت کم لوگ نظر آئے۔ کچھ صوفوں پر نیم خوابیدہ تھے صرف ایڈا لوگوں کی خاطر داری کرتی پھر رہی تھی۔ کمروں کی لمبی قطار اندھیری تھی اور راہداری میں کوئی روشنی نہ تھی۔ ہم باہر نکلے ہیں تو چاند کا ایک کونہ ریت میں دبے سکے کی طرح آسماں کے کونے پر چمک رہا تھا۔

"خوب دنگا کیا۔ زیادہ ہی پی گئے تھے تم؟" میں نے سیدھی سڑک پر آ کر کہا۔

"کون پیئے ہوئے تھا۔ میں تو سارے جام پاس پڑے گلدان میں گراتا گیا۔" منیر کی ہنسی میں شرابیوں والی ڈھلک نہ تھی۔

"کیوں آخر کیوں؟ اور پھر دعوت میں جانے کا کیا فائدہ ہوا۔ یہ ساری شام بلکہ رات برباد گئی۔" پچھلے پہر کا چاند بھی ڈوبنے والا تھا۔ تاروں کی ضیا پھیکی پھیکی تھی سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

"کسی کیوں کا بھی جواب نہیں دیا جا سکتا یونہی کبھی کبھار آدمی کو ماضی بہت پریشان کر دیتا ہے اور اپنے اندر کی سبلجھی اُسے نہایت مضحکہ خیز حرکتیں کرنے پر مجبور کرتی ہے۔"

منیر آیا: "چلتے ہو ذرا ایک جگہ جانا ہے اُس دن کی طرح تمہاری شام غارت نہیں جائے گی۔"

"وہ کئی دنوں کے بعد ملا تھا میں نے اُس کی غیر حاضری میں خوب لمبی نظمیں لکھی تھیں اور خوش تھا اپنے سے مطمئن آدمی تو جہنم میں جانے سے بھی ڈرتا نہیں"۔

"جوتے ذرا چلنے والے پہننا گلیوں میں سے ہو کر گذرنا پڑے گا۔"

"آج کی مہم کو کیا نام دیا جا سکتا ہے؟" میں نے تسمے باندھتے ہوئے پوچھا۔

"ذرا نوادرات دکھلانے لے جا رہا ہوں تمہیں اندرون شہر کی زیارت کرنا چاہو گے کیا؟" منیر سیٹی بجاتا ہوا آگے آگے چلا۔

تنگ گنجان بازاروں، دیچی اور تاریک عمارتوں پیچ در پیچ راستوں سے ہوتے ہوئے ہم بہت دیر میں پہنچے۔ گھر کا دروازہ پرانا تھا اور ڈیوڑھی میں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا گھنٹی بجا کر خاموش کھڑے رہے پھر گھنٹی بجائی منیر نے باہر نکل کر گلی میں جھانکا آس پاس کے مکانوں میں کئی سر دکھائی دیئے۔ اندھیرے میں بتی جلی جو پیار دکھائی دیتی تھی "بیٹے منیر تم ہو اندر آ جاؤ۔"

پھر میں اور منیر ایک اور ڈیوڑھی میں سے گزر کر صحن میں گئے۔ ایک دم کشادگی کا احساس ہوا۔ گملوں میں رنگ برنگ پھول تھے سلیقے سے کیاریوں میں موتیا اور بیلا کی ترشی ہوئی جھاڑیاں کھڑی تھیں ایک انار کا درخت تھا جس میں کلیاں آئی ہوئی تھیں اور پھر قطار اندر قطار کمرے اور اوپر کے پیڑھتے۔ طوطا اور مینا اپنے پنجروں میں بہت بیتاب ہو کر ایک دم بولنے لگے "کون ہے کون ہے۔"
کسی دالان میں کتا بھونکا۔

"کنگ پیڑا ابھی تک کسی کو نہیں پہچانتا اماں" سامنے کھڑی خاتون کی طرف بڑھتے ہوئے منیر نے کہا۔

پیچ سا اُن آنکھوں میں گڑا تھا۔

"آؤ بیٹے تم بھی آؤ" اماں بولیں "جیسے منیر ویسے تم۔"

جس کمرے میں ہم بٹھائے گئے اُس کی کھڑکیاں اونچی اور بڑی بڑی تھیں گلی میں سے ہوا مسلسل آ رہی تھی دیوان قاعدے سے بچھائے ہوئے ستھرے تھے اور گاؤ تکیوں پر غلاف خوب کسے ہوئے تھے اس روشن کمرے میں بیٹھے ہوئے نیم تاریک ڈرائنگ روم اور بیمار روشنی کسی اور گھر کی بات لگتی تھی۔

"چائے پیو گے یا پان کھاؤ گے؟" انہوں نے تخت پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اگر ممکن ہو تو دونوں" منیر نے اِدھر اُدھر دیکھا غور اور تجسس سے۔

"جہاں کی تصویر دیکھ رہے ہو گئے۔ مجھ سے ٹوٹ گئی۔ فریم ایک دم شیشے سمیت کرچیں ہی ہو گیا۔ ایسا تو میرے پاس کوئی نہیں نا جو بنوا کر لا دے جگہ خالی خالی بُری لگتی ہے خود مجھے بھی اور دن ہوتے تو وہم سے میرا جی ہول جاتا مگر اب تو میں وہموں میں نہیں پڑتی۔ اُن سے کیا ہوتا ہے اُلٹا کرچیں تکلیف دیتی ہیں۔ یہاں اتنا سُونا ہو گیا ہے۔" پتہ نہیں اُن کا اشارہ کس طرف تھا؟

میں دھوپ کو دیواروں سے اُترتے اور نیچے صحن میں آتے دیکھتا رہا روشنی کا دھارا جو آبشار کی طرح اُونچی چھتوں کے درمیان بہہ رہا تھا۔

"پان نہیں کھاتے بیٹے تم؟" اماں اب میری طرف مخاطب تھیں "لے لو نا پسند کرو گے۔"

"ہاں بھئی اماں کے ہاتھ کا پان تم واقعی پسند کرو گے" منیر نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ چائے پی کر بھی ہم بیٹھے رہے میں حیران تھا کہ منیر تو مجھے نوادرات دکھانے لایا تھا۔

"اماں یہ میرے نہایت عزیز دوست ہیں؟" اُس نے انہیں بہت دیر خاموش پا کر کہا۔ انہوں نے سر اوپر اُٹھایا۔

"بیٹا تم اپنی سعادت مندی کی وجہ سے شاید میری مصیبت کو سمجھ سکو۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے تمہیں بلایا ہے تم میری مدد نہیں کرو گے تو کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔" جانے وہ کس کی بات کر رہی تھیں؟

"اماں اُسے سمجھانا اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ فاصلے بہت ہو گئے ہیں۔" منیر نے جواب دیا۔

"میرے لیے تم ایک کوشش اور کر دیکھو وہ اپنا سامان لے گئی ہے اور کہیں مشرقِ وسطیٰ میں یا جانے کہاں جانے والی ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" منیر فکرمند ہو گیا۔

"ایک ہفتہ پہلے ہی دن تھا دوپہر کو آئی اور اپنا سارا سامان کتابیں، تصویریں پُرانے جوتے تک سب کچھ سمیٹ کر چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں جاتے ہوئے کہنے لگی اچھا اماں اب حشر میں ملاقات ہو گی یا نہ بھی ہو تو آپ کو کیا غم۔ دروازہ دھڑ سے بند کیا اور بس۔ اُجاڑا ڈھنڈار گھر تمہیں تو پتہ ہے میں نے سب بچوں کو اس آفت ماری کی وجہ سے الگ کر دیا ہے۔ کوئی آتا جاتا نہیں گھر میں اکیلی پڑی ہوں۔ اگر ممکن ہو تو اُسے روکو۔ تم سے کچھ دبتی ہے وہ۔"

"اماں میں آپ سے کیسے کہوں وہ پہلی سی بات نہیں بلکہ کوئی بات ہی نہیں میرا اُس پر کوئی دباؤ نہیں اُسے تو ملے ہوئے بھی زمانے ہو گئے ہیں۔ تھوڑے دن ہوئے وہ ایک دعوت میں ملاقات ہوئی تھی۔" پتہ نہیں وہ کس خاتون کی بات کر رہا تھا۔ میکسی پہنے اور ڈھیروں میک اپ کئے اُس لڑکی کی جس کا اُس نے ہاتھ پکڑا تھا یا پھر کسی اور کی۔ میرا دماغ اُس رات کی دعوت اور اُس کی بدمزگی کی طرف گیا۔ سب عورتیں لڑکیاں لگتی ہیں آجکل تو کسی کی عمر کا

پتہ نہیں جیتا مصنوعی پلکیں لگائے، مصنوعی جوڑوں کے طومار باندھے ہر خاتون COSEMETIC کی کسی کمپنی کا اشتہار لگتی ہے۔ میزبان خاتون منیر تو اس
کو پہلے نہیں جانتا تھا ناممکن۔ چڑیا کی طرح چہک گئے اور انگریزی بولنے والی کوئی سوال ہی نہیں۔ اپنے سفر کے قصے سنانے والی ہرگز نہیں اور ایڈا ایڈا تو بالکل
ہی نہیں۔ اس لاہور سے نکل کر بھی تھوڑا سا رشتہ تو آخر محسوس ہوتا نا کچھ مناسبت۔ کوئی تعلق۔ ایڈا تو مجھے بے جڑ کی پانی میں زندہ رہنے والی بیل لگتی
جسے کسی سے نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔

پچھلے سال مجھ سے ذرا سی بات پر اختلاف ہوا بس گم ہو گئی دو دن رشتے کے ایک بھتیجے کو ادھر ادھر دوڑایا پتہ چلا ہوٹل میں رہ رہی ہے۔ ملنے گئی تو
دھتکار دیا جانے کون کون لوگ بیٹھے تھے میں نے کہا گھر چلو تو دھمکایا اگر پھر یہاں آئیں تو دھکے دلواؤں گی بیروں سے۔" ایسی بے عزتی پر بھی نہ میرے آنسو
نکلے اور نہ ہی میں نے دل برا کیا پھر خدا نے میری مدد کی اس کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے سولہ سو روپے کا بل تھا وہ میں نے چکایا اور اسے گھر لائی۔ تم ہی بتاؤ
یہ گھر کیا ہے؟ ایسے میں آنے جانے پر کوئی پابندی اس کے نہیں رکھتی۔ گھر نہ آئے راتوں غائب رہے تب بھی کچھ نہیں کہتی۔ ہر طرح کا آرام مہیا کرنے میں
لگی رہتی ہوں مگر اسے تو جیسے اس گھر سے چڑ ہو گئی ہے۔

وہ ذرا کی ذرا رکیں۔ میں نے سوچا عجب ہے اس پرسکون آرام دہ ماحول سے وہ اس قدر مختلف ہے یہ گھر تو خاصا خوب صورت تھا پر شکوہ سا
محلوں کے دور کی یادگار حویلی

اماں جن لوگوں کے ساتھ اب اس کی دوستی ہے اور جہاں ہر کوئی اس کا انکل اور ہر عورت اس کی دوست ہے پتہ نہیں وہ کیسے ہیں۔ میرا خیال
ہے انہی کے ساتھ جا رہی ہو گی۔ منیر نے کہنے کو کہا۔

"بیٹے لوگ کسی پر یونہی بے فائدہ جان نہیں نکالتے کوئی ایک پائی بھی فالتو خرچ نہیں کرتا۔ میں کہتی ہوں کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔"
ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔

"جب پہلے پہل اس کی حالت خراب ہوئی ہے اور یہ ہسپتال گئی ہے تو میں نے صدقے دیئے خیراتیں کیں۔ آدھی آدھی رات کو دعائیں کیں خدا
سے گڑگڑا کر رو رو کر اپنی خطاؤں کی معافی مانگی۔ پتہ نہیں میرے کن کرموں کا پھل ملا ہے کہ یہ خراب سے خراب حالت میں ہوتی چلی جاتی ہے"
"دیوانی بھی نہیں اور پھر بھی دیوانی ہے کیا کروں بیٹے۔" وہ رونے لگیں — آنسو اتنے گسے لگ رہے تھے اتنے میلے جیسے دل پر
غبار کا ڈھیر ہو۔

"روئیں نہیں اماں میں اپنی سی کوشش کروں گا۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ شان و شوکت موٹریں، کوٹھیاں آج کل کی گریٹڈ زندگی کی تو وہ سدا سے
شیدائی رہی ہے اور اس کی تلاش میں بھی ہے۔ اب ایسے لوگ اسے ملے ہیں جن کے نوابی ٹھاٹھ اور بے حد رکھ رکھاؤ ہے وہ سمجھ تو نہیں سکتی۔ میرے
خیال میں ابھی تو نہیں۔ کچھ ٹھوکریں لگے دھتکاری جائے تب اسے ہوش آ سکتا ہے۔ مگر اپنی جگہ ہر طرح نکال لینے میں اس کا جواب نہیں۔" منیر نے
نہایت بے چینی سے پہلو بدلا۔

پان کی گلوری بنا کر دیتے ہوئے کہنے لگیں۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اتنی فرمانبردار اتنی نرم مزاج تھی بچپن میں۔ عاقلہ اور زاہدہ کو بھی گئے ہوئے
زمانے ہو گئے ہیں وہ لوگ وہیں جم گئے ہیں واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتے بلال نے امریکہ میں شادی کر لی ہے رشتہ داروں کی باتوں سے عاجز

آ کر میں نے انھیں منا چھوڑ دیا ہے۔ تنہا پڑی رہتی ہوں اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ کوئی آتا ہے تو لوگ کھڑکیوں سے جھانکتے ہیں اور اس گھر کی شان کے سامنے بڑے بڑے دم نہیں مار سکتے تھے۔ اپنے سامنے ہی زندگی کا قصر ڈھتے رہا ہے اور میں کچھ کر نہیں سکتی کسی سے فریاد نہیں کسی سے مدد کی امید نہیں۔

ہنس اٹھتے ہوئے منیر نے کہا: "ایک بات کا تو میں بھی اعتراف کرتا ہوں ایڈا میں بے پناہ طاقت ہے لوگوں کو گھیرنے اُن کے دل میں گھسنے کی ایک عجیب بات ہے اس کے اندر۔ جس کو بھی چاہے پھانس لیتی ہے جس کا ساتھ بھی چاہے چھوڑ دیتی ہے بلکتا ہے اُس کے اندر چشمے پھوٹ رہے ہیں کسی آبشار کے اب مجھے ہی دیکھو شینا سے ملوایا اور پھر جب ہماری محبت اُس کے سامنے پروان چڑھی تو اُس نے ہمیں جدا کر دیا۔ دیکھا تھا تم نے اس دن بنا رہی تھی جیسے اُس کا میرا کبھی ساتھ ہی نہ رہا ہو مجھے پہچان ہی نہیں رہی تھی۔

خاموشی سے ہم گلیاں اور سڑکیں طے کرتے ہوئے باہر آ گئے۔

"ہو سکتا ہے وہ دونوں دلوں کو محبت کرتے دیکھ ہی نہ سکتی ہو۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے۔" بہت دیر بعد میں نے کہا۔

"نہیں"۔ منیر بولا۔ "جب میں اور شینا ملتے تھے تو وہی ہمارے لئے مواقع فراہم کرتی تھی اصل میں یہ پودا اس کا لگایا ہوا تھا پہلے پہل جب میں ایڈا سے ملا ہوں تو بہت متاثر ہوا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں جیسے خواب لیتی جھیلیں ہوں بہت شفاف تھیں۔ باتیں کرنے کا ایک مخصوص انداز اور سر ہلا کر چپ ہو جانے کی ادا میں اس پہ فدا ہو گیا تھا۔" وہ پھر ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔

شینا نے اُن دنوں یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اُس جلال اور شکوہ سے بہت مرعوب تھی۔ سنی ہوئی داستانوں اور آزادی کی فضا میں جیسے پھول چاندنی لگنے سے کھلے وہ بھی روز بروز زیادہ حسین اور شوخ ہوتی گئی میرا وہاں آخری سال تھا جلسے جلوسوں کی فضا تھی دھواں دھواں سی۔ ہم لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے جو بات کہتا اُسی کی بات جی کو لگنے لگتی دھڑے بندیاں سیاست قوت کا نیا احساس اپنے کچھ ہونے کا اپنے وجود کا میں بھی سٹوڈنٹ لیڈر تھا اور ایڈا بھی شینا اور مجھے کچھ لو اپنی حفاظت میں لے لیا اس لئے۔

کہنے لگی "منیر تمہارے لیے شینا ٹھیک رہے گی اچھی مہذب لڑکی ہے ٹھہراؤ ہے طبیعت میں۔ میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتی تمہیں بہرحال زندگی کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہو گی اور مجھے اس لڑکی سے بہتر کوئی نہیں لگتا۔" ہم ملتے رہے ہمیں قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا۔ پھر اچانک شینا میں میں نے ایک تبدیلی محسوس کی جب ہم تینوں موجود ہوتے تو عجیب گھٹن ہوتی۔ ایڈا ادھر اُدھر نہ جاتی۔ میں یونیورسٹی سے خاصی دور ایک فرم میں ملازم ہو گیا تھا اور مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا بس شینا اور میں اور وہ بنا ایک دوسرے سے زیادہ باتیں کئے بیٹھے رہتے۔ ایڈا نے دوبارہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا پھر شینا کوئی بہانہ بنا کر چلی جاتی یا اُسے کوئی بلانے آ جاتا میں اور ایڈا بیٹھے رہتے میں اُٹھتا اور خدا حافظ کہتا تو وہ اسی طرح سے بیٹھی رہتی۔ چند ماہ میں ساری کایا پلٹ گئی۔ میرے خواب میری زندگی کچھ بھی تو پہلے جیسا نہ رہا۔

شینا سے دو ایک بار اُس کے گھر جا کر ملا بھی تو وہ بہت رُکی رُکی سی تھی میں محبت کی کرچیوں پر چلتا دور نکل آیا ایڈا نے شینا کی شادی کا سُن کر مجھ سے رسمی افسوس بھی نہ کیا جس لڑکے سے اُس کی شادی ہوئی ہے وہ بھی ایڈا کا لے پالک تھا اس کا ایک پرانا چاہنے والا۔

"ہو سکتا ہے تم جو الزام اُس کے سر دے رہے ہو اُس میں اُس کا ذرا سا قصور بھی نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں میں اتنا جذباتی اب نہیں رہا ٹھنڈے دل سے غور کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ کسی نہ کسی احساس میں شدت سے مبتلا ہے اور شینا کو مجھ سے بدظن اسی نے کیا ہو گا۔"

"اگر شیتنا کو تم سے کوئی لگاؤ ہوتا تو ......"

"تم بچکانہ جوش محبت میں اور لگاؤ میں کوئی فرق نہیں کر سکتا۔ آدمی میں بہت سنجیدہ ہوں۔"

"تم شیتنا پر الزام نہیں دھرتے اور ایڈا کو سارا قصوروار ٹھہراتے ہو۔"

"جو لڑکا تم نے شیتنا کے ساتھ دیکھا وہ اُس کا تیسرا یا چوتھا شوہر ہے۔" میٹر نے تلخی سے کہا۔

"تو اِس سے کیا ہوتا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"ہوتا کیوں نہیں کچھ اگر وہ میرے ساتھ ہوتی تو یہ ساتھ نہ ہوتا ہم دونوں خوش رہتے۔"

"تو پھر اُس کا نصیب، تم اتنے تلخ کیوں ہو یہ کیوں نہیں سوچتے جو لڑکی ایک کے ساتھ وفا نہیں کر سکتی کسی کے ساتھ بھی وفا نہ کرتی۔ تم میں کیا خصوصیت تھی کیا محبت کی شادیاں ناکام نہیں ہوتیں۔ شیتنا میں یوں بھی وفا کا فقدان ہوگا۔"

وہ چپ ہوگیا شاید میری بات کا کوئی جواز ڈھونڈ رہا ہو۔

سڑک کے چوراہے پر ہم پھر کسی وقت ملنے کے لئے جدا ہوگئے۔ زندگی کتنی عجیب ہے۔ نہ سمجھ میں آنے والی پہیلیوں سے عبارت ــــ اس عرصے میں دو ایک بار میٹر سے ملاقات بھی ہوا مگر یہاں وہاں کسی سرکاری فنکشن میں کہیں کلب میں ذرا ذرا سی دیر کے لیے۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے کیا کیا تھا۔ یہ موضوع میں نے خود نہیں چھیڑا۔ لگتا تھا کام کی مصروفیت میں وہ جھول بھی گیا ہے بعد بوڑھی عورتوں کے لئے کون پریشان ہوتا ہے؟ پھر نئی نسل کے اپنے مسائل اور اپنے حل ــــ

اُس رات بارش تیز تھی اور آسمان زمین والوں پر نہایت خفگی سے برس رہا تھا۔ روشنی بھی ڈرتی کانپتی لگتی تھی ٹیبل لیمپ ہوا کے زور سے ہل رہا تھا۔ شیڈ میں لگی جھالر کپکپاتی تھی گرج کی آواز آسمانوں پر رقص کرتی ہوئی ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتی۔ کہیں بجلی گرتی تو کڑک دل کو ہلا دیتی۔ میں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، بیٹھا تھا مگر لفظ ہلتے تھے اور کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ اپنے آپ کو لپیٹے نیلے پھولوں والی بیل سو نہیں سکی ہوگی۔ دن میں آکر دھوپ میں لوٹ لگانے والی بلی کا رزق ٹھکانے کی تلاش میں اِس کا گھومنا، دبے پاؤں میرے دروازے پر آکر پنجے مارنا اور پھر واپس جانا۔ درختوں کی شاخیں ٹوٹ کر گر رہی تھیں پرنالوں سے پانی بڑے زور سے گر رہا تھا بہتے ہوئے دھارے کی صدا جیسے میں ندی سے گھرا ہوں۔ کھڑکی کے پٹ کھٹکے کے ڈھیلے ہونے کی وجہ سے آگے پیچھے ہوتے جھٹکے اور ایسی آواز آتی تھی جیسے کوئی کھٹکھٹا رہا ہو۔ میں پریشان ہو رہا تھا۔ اُٹھ کر میں نے چاہا کہ کتابوں کا ایک ڈھیر اس کے آگے لگا دوں تاکہ ان بے چین روحوں کی آمد و رفت کا یہ منظر تو رکے۔ پتلے پردے کے پیچھے سے مجھے ایک چہرہ دکھائی دیا کتابیں میرے ہاتھ سے چھوٹ گئیں ایسے وقت کون ہو سکتا ہے۔ پسینے کے قطرے میرے ماتھے پر آگئے اور ڈر کی وجہ سے دل ٹھہرتا لگا۔ یہ کیفیت ایک دو منٹ رہی۔ پھر سوچا ہو سکتا ہے چوکیدار ہو اور بارش سے ڈر کر اپنی کوٹھڑی کی بجائے برآمدے میں آگیا ہو۔ میں نے اُسے پکارا۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے پھر زور سے پکارا اور جلال اتنے زور سے تاکہ میں خود میں بھی تو کوئی ہمت پیدا کر سکوں۔ کبھی کبھار اپنی آواز کا آسرا بہت ہوتا ہے۔

"چیخ کیوں رہے ہو یہ میں ہوں ایڈا دروازہ کھولو۔"

اگر کوئی کہتا کہ ساری پرانی روحیں جاگ کر تمہارے کمرے کے باہر جمع ہیں تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اُس نام کے سننے سے ہوئی۔ جانے کب تک میں حیران کھڑا رہا۔

"کیا اب مجھے ساری رات باہر کھڑا رکھنے کا ارادہ تھا تمہارا۔" بھیگتے ہوئے ایک بڑے بنڈل سمیت۔ "اوہ خدا کی قسم نہایت عجیب صورتِ حال ہے۔" کہہ کر وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

"عالم بھائی کچھ خیال نہ کرنا تم اس کرسی کو پھر سے ٹھیک کروا سکتے ہو مگر میں بہت بھیگی ہوئی ہوں کھال کے اندر تک پانی ہی پانی ہے۔" خاموشی سے الماری کھول کر میں نے اُسے ایک پاجامہ اور قمیض پکڑا دی۔ جلدی کپڑے بدل کر ٹپکتے بالوں کو تولیے سے خشک کرتی ہیٹر کے سامنے نیچی تپائی پر بیٹھی ہوئی وہ مجھے بڑی بے آسرا لگی۔ "اگر چائے مل سکتی تو . . . . مگر تمہیں کیونکر تکلیف دوں؟"

ایسے ہی وہ مجھے جو حکم بھی دیتی مانتا۔

چائے پیتے ہوئے لگتا تھا وہ خوابوں میں کھو گئی ہے۔ چپ چاپ پتہ نہیں کن ویرانوں میں بھٹکتی ہوئی اکیلی بے ٹھکانہ۔

"بے بی بہت بڑے خطرے میں ڈال رہی ہوں تمہیں! پتہ ہے میرے پیچھے پولیس لگی ہے اور اس بنڈل میں وہ سارے کاغذات ہیں جن کی انہیں تلاش ہے۔ جب ہم لوگ بھاگے ہیں تو ناز آپا اور میں ایک ہی موٹر میں تھیں۔ تمہارا ٹھکانا قریب آیا تو جیسے الہام ہوتا ہے میں نے سوچا یہاں رک جاؤں بارش میں نشان مٹ جاتے ہیں کھوج نہیں نکالا جا سکتا۔ پتہ نہیں کس نے نہایت تفصیل سے ہمارے متعلق ایک ایک بات بتا دی ہے۔"

"تم ناز آپا کو نہیں جانتے؟ وہی جو دعوت والی رات سب لوگوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں؟"

میں پاس کی کرسی پہ خاموش بیٹھا تھا اور لگتا تھا میرے ارد گرد آسمان گر رہا ہے۔

"مگر تم یہ مت سمجھنا کہ اس سارے ریکٹ کا مجھے معلوم تھا۔ ان لوگوں نے مجھے کہا تھا کہ جیل میں صرف انکل سے ملاقات کرنا ہوگی یہ بات تو اتنی بے ضرر تھی بظاہر ناز آپا کہتی تھیں کہ کسی وجہ سے وہ ایسے انکل کے ساتھ اپنا تعلق لوگوں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتیں جو جیل میں ہو۔ میں نے سوچا میرا کیا جاتا ہے۔ روز روز ملنے پھرنے سے ایک دن ہفتے میں جا کر مل آنے سے کون جانے انکل کی کچھ لگتی بھی ہوں کہ نہیں اور پھر ناز آپا اس پیار سے مجھے رکھتی تھیں سوچو تو سہی میں جو بے ٹھکانہ تھی جس کا اپنا اس بھری پری دنیا میں کوئی نہیں ہے یوں چاہی جاؤں، ایک گھر کا تصور جس میں اپنا پن ہو کتنا مکمل عیش تھا۔"

"مگر تمہاری اماں تھیں اور سولہ سو روپے کا بل چکا کر وہ تمہیں واپس گھر لے گئیں تھیں ہوٹل سے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے بہت قطعیت سے بات کی۔

وہ چپ ہو گئی پھر جیسے لفظوں کے لیے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہو ٹھیک ٹھیک نشانے پر تیر مارنا چاہتی ہو۔

"اماں کتنا اچھا میٹھا نام ہے۔" بہت دیر بعد اُس نے کہا۔ "وہ میری اماں کہاں ہیں انہوں نے مجھے میری ماں کے مرنے کے بعد پالا تھا۔ بابا کی کچھ ہوتی تھیں یا یونہی انھیں ترس آ گیا تھا مجھے نہیں معلوم مگر بڑے ہونے پر میری بہنیں مجھے اتنی شدید نفرت اور حقارت کا سلوک کرتی تھیں۔ صرف انہی اماں کا وجود ہی مجھ پر محبت نچھاور کرتا۔ بابا نے دوسری شادی کر لی تھی وہ کہیں دور رہتے تھے افریقہ یا مشرقِ وسطیٰ میں کہیں انہوں نے پلٹ کر خبر نہیں لی سنا ہے خرچ بھجواتے رہتے تھے۔ اس بڑی حویلی کے دالانوں میں محبت اور نفرت کے شدید جذبوں کے درمیان میں بڑھی۔ پتہ نہیں اماں جتنی شدت سے مجھے چاہتی تھیں اتنی ہی شدت سے وہ لوگ مجھے دھتکارتے کیوں تھے۔ میں سمجھتی ہوں یہ اماں کا قصور ہے مجھے ان لوگوں سے بچانے کے لئے اپنے پر مجھ پر پھیلائے رکھتیں کوئی میلی آنکھ سے میری طرف دیکھتا تو اس پر برس پڑتیں۔ کبھی عاتکہ یا زاہدہ میں سے کوئی ان کے ساتھ سونا چاہتا تو ڈانٹ دیتیں اُس محبت پیار کا حق تھا مگر میں نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ انہوں نے مجھ سے دوستی نہیں کی وہ میری نہیں ہو سکتی تھیں مگر دشمن ہو گئیں۔ عاتکہ تو تقریباً میری ہم عمر تھی۔ جب تک میں اسکول میں رہتی خوش رہتی مگر گھر آنے کے نام سے ہی مجھ پہ بخار سا چڑھ آتا۔ نہایت تھکے قدموں سے اکیلی دالانوں اور کمروں میں پھرتی۔ دیکھا تم

سنے شروع سے ہی میرے خلاف اتنا بُرا محاذ تھا میں اور اماں ایک طرف باقی گھر ایک طرف - اماں کہیں جاتیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں اگر کبھی غلطی سے وہ مجھے چھوڑ جاتیں تو وہ لوگ طعنوں سے میرا ناک میں دم کر دیتے اتنا رُلاتے اتنا رُلاتے کہ مجھے ہوش نہ رہتی - ہوتے ہوتے گھر سے مجھے نفرت ہو گئی۔ میں بابا کو یاد کرتی اُن کی شکل کا تصور باندھتی جی چاہتا تھا اُڑ کر اُن کے پاس چلی جاؤں۔ مگر میرے تو پَر کٹے ہوئے تھے کبھی کبھار سینے میں اتنی گھٹن ہوتی اتنی گھٹن کہ چیخیں مار کر رونے لگتی بہنیں کہتیں "یونہی مسخرا ہو گیا ہے - اماں تو پہلے ہی تمہاری ہیں انھیں پریشان کرنے زیادہ محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ اب اس کے ہاتھ آگیا ہے "

پھر وہ سب ہنس کر ہنسنے لگے۔ جلاّں اور جماں اور باقیلا اور زاہدہ -

اُن کی ہنسی نے مجھے اتنا خوفزدہ کر دیا کہ آنسوؤں کو میں نے اپنے اندر ہی خشک کر دیا ہے - سہارے کے بیسے ہیں نے ہر راہگیر کا دامن کپڑا ہے اپنے آپ سے بچنے کے لئے میں نے قہقہوں اور ہنسی میں پناہ چاہی ہے مگر بے بی میں پھر بھی اکیلی رہی " شیر علی یہاں رہتا تو شاید حالات کچھ اور ہوتے پتہ نہیں وہ کیوں چلا گیا - میرے اندر کے خلا کا اُسے احساس ہو گیا جس خلا کو محبت کے سمندر بھی نہیں بھر سکتے " بہت دیر چُپ رہنے کے بعد اُس نے پھر کہا تھا

" پتہ نہیں کیسے سجا ٹک یا میرے اندر میں پتہ نہیں " اُس نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے سلجھایا - کہا کرتا تھا " قوس قزح کے رنگوں سے بھی تمہاری تصویر اصلی نہیں لگتی " اور میں ہنس کر یہ بھی اُس کی محبت سمجھتی تھی بات کہنے کا ایک انداز -

زمانے نے مجھے بہت ٹھوکریں ماری ہیں یونیورسٹی کے بعد جہاں بھی میں نے قدم جمانے کی کوشش کی ہے مجھے اکھاڑ دیا گیا ہے۔ امربیل کی طرح لوگوں نے مجھے ہر ہر درخت سے زبردستی جدا کیا ہے۔ جہاں کہیں میں لپٹی ہوں -

رات طوفان میں اُڑی جا رہی تھی -

میں نے آتشدان میں آگ جلائی اور بنڈل کو کھول کر کاغذ جلاتا گیا۔

نازآپ نے تو کہا تھا انھیں سنبھال کر رکھنا اب میں کیا جواب دوں گی - کچھ بوسے بنا میں نے آگ میں انھیں جھونک دیا - تپش سے ایڈا کی زردی میں سرخی جھلکنے لگی آنکھیں بند ہونے لگیں -

جب میں اُسے لینے گیا ہوں تو وقت تنگ تھا اور میری بستہ کی بہنیں اس کے گلے سے لگ کر رو بھی نہیں ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا اور برقعے میں الجھتی پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے اُس نے کہا " بے بی میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتی - تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے "

تمہیں معلوم ہے منیر نے ایک دن کہا " جن لوگوں کے ہاں ہم اس دن دعوت میں گئے تھے وہ بین الاقوامی سمگلنگ کرنے والا گروہ تھا اور انہیں کے ساتھ اُن کے ذریعے ہی تو ایڈا مشرق وسطیٰ جانے والی تھی - وہ سب لوگ تو یہاں وہاں سے پکڑے گئے ہیں - صرف ایڈا کا پتہ نہیں چلا اور ساتھ ہی ایک کاغذ نہیں ملا - اُن کے خلاف ذرا سا ثبوت نہیں -

" تم نے مجھے اتنے دنوں بتایا ہی نہیں " میں نے شکایت کی -

میں اپنے طور پر ایڈا کی کھوج میں تھا گر ایسے تو جیسے آسمان نگل گیا ہے زمین نے کھا لیا ہے اب میں اماں کو کیا جواب دوں گا - میں نے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا ----

جب آسمان پر چاند نہیں ہوتا اُن راتوں میں تارے ٹوٹتے ہیں تو روشن چمکدار لکیری کھنچ جاتی ہے اندھیرے کے پس منظر میں وہ زیادہ تابناک لگتی ہے۔ اور پھر فضا کو یا دھی نہیں خلا کو احساس ہی نہیں ہوتا ان تاروں کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا - پتہ نہیں تارے ٹوٹتے کیوں ہیں ؟

# نگارِ وطن

## جمیلہ ہاشمی

"زمین سے محبت نہ بھی کرو تو بھی زمین تم سے محبت کرتی ہے۔" گل شیر نے اپنی زخمی ٹانگ کو ہلانے کی کوشش کی۔

نرس نے بستر ٹھیک کرتے ہیں سیدھے ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔ "کیا کہہ رہے ہو گل شیر؟ کتنی عجیب باتیں کرتے ہو زمین کس طرح تم سے محبت کرتی ہے بے جان شے مٹی بھلا وہ تم سے کیسے محبت کر سکتی ہے؟"

ہنس کر گل شیر نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ "یہی تو تم کو پتہ نہیں چل سکتا مس یہ باتیں تم کیا جانو۔ زمین کی بھی پکار ہوتی ہے وہ ہر لحظہ تمہیں اپنی طرف بلاتی ہے۔"

اور پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر اُس نے کہا۔ "اسی لئے میں چاہتا ہوں جلد سے جلد ٹھیک ہو جاؤں اپنے وطن کے لئے میری جان بے تاب ہے وہ پکار مجھے سنائی دیتی ہے۔"

کیتھرین مارڈے نے جب اُس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس بھی نہ سکی۔ گل شیر کے میلے چیکٹ بالوں میں کنگھی کرنے کے لئے وہ پھر جھکی تو اُس نے بہت لجاجت سے کہا۔ "مجھے بتاؤ میں کب تک ٹھیک ہو جاؤں گا کب واپس جا سکوں گا؟"

"تم واپس جانے کے لئے اتنے پریشان ہو تو ٹھیک ہونے کی کوشش کرو نا۔ نرسیں کہتی ہیں تم انھیں ستاتے ہو دوا نہیں پیتے کچھ پوچھا جائے تو جواب نہیں دیتے۔ یہ ٹھیک ہونے کا طریقہ تو نہیں نا؟"

"وہ میری بات نہیں سمجھتیں تو میں اُن کی بات کیسے سمجھ سکتا ہوں۔ اس پرائے دیس میں صرف تم ہی تو ہو جو میرے وطن کی بولی بول سکتی ہو۔ اُن کے ہاتھ سے دوا بھی مجھے اچھی نہیں لگتی تم مجھے زہر بھی دو تو میں خوشی سے پی لوں گا۔" گل شیر طمانیت سے ہنسا کیتھرین کا ہاتھ جانے کیوں لرز گیا اس نے دھیرے سے اپنی اُس جیب کو چھوا جس میں گولی تھی۔

گیلے تولیے سے مُنہ صاف کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ "میں تمہارے لئے ایک گولی لائی ہوں یہ تمہارے سارے درد دور کر دے گی۔"

"چلو اچھا ہوا تم اتنی مہربان تو ہوئیں لاؤ گولی مجھے دو۔" اُس نے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں گل شیر یہ گولی میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی اور پھر آج تم جتنی باتیں جی چاہے مجھ سے کرو مجھے ذرا دیر کو فرصت ملی ہے۔"

"اچھا عجیب بات ہے مہینوں کے بعد آج تمہیں فرصت ملی ہے باتیں کرنے اور بیٹھنے کی۔" ایک لمحے کے بعد پھر بولا۔ "میری عادت بہت خراب ہے جب کبھی مجھے ذرا سا بخار آیا ہے ماں ساری ساری رات میرے پاس بیٹھی رہی ہے ہائے یہ درد رہ رہ کر اٹھتا ہے۔ لاؤ گولی دو۔" اُس نے میلے کمبل کے تکیے پر اپنے بھاری سر کو زور زور سے اِدھر اُدھر مارا۔

"سنو مجھے اپنے گھر کی باتیں بتاؤ اپنے گاؤں کی اپنی بیوی کی۔" نرس نے تکیہ برابر کیا

"اور دیکھو پینے نہیں دیتا گولی دے دو نا پھر میں تم سے باتیں کروں گا۔"

پانی کا گلاس پکڑانے میں نرس کا ہاتھ کانپا اور پانی چھلک کر کمبل پر گر گیا۔

"تمہاری طرح میری ماں بھی ذرا ذرا سی باتوں پر گھبرا جایا کرتی ہے۔ بابا کی طبیعت میں البتہ ٹھہراؤ ہے وہ دلگیر ہو تو بھی اپنے آپ کو سنبھالے رہتا ہے۔ حیرت ہے تم اس بہانے دیس میں ماں کی طرح کیسے ہو؟ یہاں کتنی سخت سردی ہے اور ہم وطن سے اتنی دور ہیں اور پھر جبری بھرتی کر کے یہاں لائے گئے ہیں۔"

"جبری بھرتی ۔ مگر جبری بھرتی کیوں؟ تم لوگ تو اپنی مرضی سے اپنے حاکموں کو خوش کرنے کی خاطر لڑتے ہو۔" کیتھرین اب اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔

گل شیر ہنسا تو اس کے ننھے ننھے صاف ہوئے دانتوں کی چمک ان بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے مقابلے میں بڑی دلآویز تھی وہ اس اپنے پن سے بہت مطمئن تھا۔

"تمہیں کیا پتہ جبری بھرتی کیا ہوتی ہے؟ مگر خیر تم جان کر بھی کیا لو گی۔ میں اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہوں ہمارا پہاڑی علاقہ کھیتی باڑی میں بہت محنت مانگتا ہے اس دن جب تحصیلدار کے کارندے مجھے پکڑ کر لے گئے اور میرا نام فوج میں لکھوایا تو میں اپنے کھیتوں کے کنارے گھوم رہا تھا اور بہت خوش تھا ہماری مکئی اس بار خوب ہو رہی تھی اور میں اس پگڈنڈی کی طرف گھڑی گھڑی جھانکتا تھا جہاں سے نور آنے والی تھی۔ نور پہاڑ کے دوسری طرف کے گاؤں کی بہت خوب صورت مٹیار ہے اس کی شربتی آنکھوں پر آدمی اپنا آپ وار سکتا ہے جب وہ گھنی پلکوں کی اوٹ سے دیکھتی ہے تو شرم کی لالی اس کے گالوں پر بہت بھلی لگتی ہے۔ جب میں ان کے ساتھ جا رہا تھا تو وہ تیز تیز قدم رکھتی اس پگڈنڈی سے مجھے دکھائی دی پہلے میں نے چاہا کہ اس سے بات کروں پھر دوسرے لوگوں کے خیال سے میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں وہ کتنی حیران ہوئی ہوگی مگر حیران ہونا بھی تو آخر آدمی کے لئے بنا ہے۔ اس شام جب میں واپس آیا تو گھر رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے بھرا تھا سب لوگ بہت اداس تھے ماں روتے روتے بیہوش ہوئی جاتی تھی مگر کوئی اسے تسلی بھی تو نہیں دیتا تھا نور گھونگھٹ منہ پہ کھینچے ایک طرف بیٹھی تھی اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی اس کی ماں نے میری بلائیں لیں نور میں بیاہ کے دو سال بعد تک بھی میکے نہیں آئی تھی پھر رات آ گئی۔ آسمان سیاہ لگ رہا تھا اور تارے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے بہت بہت چمکتے تھے۔ مہمانوں کے ساتھ میں چوپال میں سو رہا۔ مگر اس رات مجھے نیند کہاں آ رہی تھی۔ سردی بڑی بھلی تھی اور میرا دل یوں اتھل پتھل ہو رہا تھا چاروں طرف ہم سے اونچے ہم سے نیچے دور دور پہاڑ کی چوٹی تک دیئے ذرا دیر کے لئے ٹمٹماتے اور بادل کی اوٹ میں ہو جاتے پھر بجھ جاتے جھرنے کا شور بہت زور سے پتھروں سے ٹکراتا دھارا کہیں کہیں کوئی بکری سوتے میں سے جاگ کر ممیاتی تو اس کی گھٹی گھٹی آواز بند کمرے میں یوں گونجتی جیسے وہ موت کو دیکھ کر ڈر رہی ہو۔ بادام کے پودے مزے میں جھومتے تھے اور پانی پر سے ہو کر آتی ہوا ان کی ٹہنیوں میں جھول جھول جاتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا میں نور سے بات کروں مگر ایسا کرنا بھی تو ممکن نہ تھا۔"

"تم اسے بلا لیتے بلا سکتے تھے وہ تمہاری اپنی بیوی تھی۔" کیتھرین نے کہانی سننے والے کی طرح ہنکارہ بھرنے کی خاطر کہا۔

"بلا لیتا۔" گل شیر طنز یہ ہنسا۔ "مس ہمارے گھروں میں یہ ممکن نہیں ہوتا۔ جب بڑوں اور رشتہ داروں سے گھر بھرا ہو تو کوئی جوان

اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ہمارے ہاں کے دستور میں مگر تم انہیں سمجھ نہیں سکتیں۔"

"شاید یہ ایسی بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ سکتی" کیتھرین نے کہا۔

"تم بیوی سے ملنے تو نہیں آئے نا؟"

"یہ نہیں ہو سکا میں دور سے مل نہیں سکا مجھے اور گاؤں کے دوسرے جوانوں کو وداع کرنے کے لئے تھوڑی دور تک عورتیں آئیں مگر اس بھیڑ میں دور کی صورت میں کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ لاری کے آنے تک ہمارے باپ اور بھائی کھڑے رہے پھر وہ بھی ہاتھ ہلا کر اور اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے بھاری قدموں سے بوجھل دلوں کے ساتھ چپ چاپ لاری ہمیں نامعلوم منزلوں کی طرف نامعلوم وقت کے لئے لے کر چل پڑی۔ راستے کے وہ سب موڑ وہ سارے کنج میری یاد میں اکثر ابھرتے ہیں۔ وہ سامنے کی [illegible] میں ہم کھیل کود کر بڑے ہوئے وہ جھرنے جن کے ٹھنڈے میٹھے پانی کی پیاس مجھے اپنی روح میں محسوس ہوتی ہے۔ تمہیں نہیں پتہ دھوپ کتنی تیز اور گہری اور دن کتنے چمکیلے ہوتے ہیں سردی اتنی مزیدار ہوتی ہے اور کھیتوں کے کنارے کے درختوں پر چڑیوں کے جھنڈ یوں فراٹے بھرتے ایک سے دوسرے درخت پر جا بیٹھتے ہیں جیسے مٹھی بھر دانے یہاں وہاں کوئی پھینک کر مارے ہوا سو طرح کی خوشبوؤں سے بھری رہتی ہے اور مست ہو کر کوئلیں یہاں وہاں اندھیرے کنجوں میں بولتی ہیں عجیب عجیب رنگوں والے پرندے ست رنگے پھولوں کی طرح کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔

"ست رنگے پھول تم تو خوابوں کی باتیں کرتے ہو گل شیر" کیتھرین نے اس کا بازو اٹھا کر نبض دیکھنے کے لئے اپنی انگلیاں اس پر رکھیں۔

"مجھے یہ خواب ہر شے سے زیادہ پیارے ہیں۔ مجھے ان کی باتیں کر لینے دو نا۔ اس زمین کی باتیں جو مجھے پکارتی ہے" گل شیر کی آواز بوجھل ہوتی جاتی تھی۔ "مہینوں کے بعد اب اس گھڑی جب مجھے درد محسوس نہیں ہو رہا اور تم ذرا فرصت سے میرے پاس بیٹھی ہو مجھے خواب کی باتیں کہنے دو نا۔" گل شیر ضدی بچے کی طرح اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔

"میں سن رہی ہوں گل شیر یہ باتیں مگر تعجب ہے تمہارے باغوں میں ست رنگا پھول ہوتا ہے" کیتھرین یوں بیٹھی تھی جیسے اسے کوئی کام ہی نہ ہو۔

دور کہیں سے توپوں کی گھن گرج سنائی دی۔

"ہمارے جھرنوں کا پانی اتنا صاف ہوتا ہے اور اتنا نیلا کہ تم اس کے آرپار گہری جھیل کے آخر تک دیکھ سکتی ہو۔ میرا وطن دنیا میں سب سے پیارا ہے۔ جب میں اچھا ہو جاؤں گا اور واپس چلا جاؤں گا تو تم ہمارے ہاں آنا تمہیں ضرور پسند آئے گی ان دو سالوں میں اس کا رنگ اور بھی نکھر گیا ہو گا۔ تم نے گندم کے کھیت دیکھے ہیں مگر تم نے کہاں دیکھے ہوں گے۔ اس کا رنگ سنہرا ہے مگر ذرا سا زرد جیسے چنبیلی ہو مگر نہیں چنبیلی کی زردی میں وہ چمک نہیں ہوتی جو اس کے رنگ میں ہے خیر جب تم دیکھو گی تو تمہیں اس کے رنگ کی آپ سے آپ ہی سمجھ آ جائے گی اور پھر وہ باتیں بہت اچھی کرتی ہے دھیرج سے بات کرنے والی اور بھاگوان۔ تمہیں پتہ ہے بھاگوان کون ہوتا ہے بھلا نہیں تمہیں کیسے معلوم ہو گا۔ اس کے آنے سے ہماری گایوں اور بھینسوں نے زیادہ دودھ دینا شروع کر دیا ہے جب سے وہ آئی ہے ہمارے

کھیتوں میں اناج بہت جھنے لگا ہے ہر شے دھل گئی ہے جیسے بارش کے بعد درختوں پر نکھار آجاتا ہے ، میری ماں اُسے بہت پیار کرتی ہے جب اُس کے لیے سیاہ بالوں میں تیل ڈالتی ہے تو کہتی ہے میری بہو کو کسی کی نظر نہ لگ جائے اور اس کے کان کے پیچھے سیاہی کا ٹیکا لگا دیتی ہے۔ نور مجھ سے کہتی ہے :" پتہ نہیں ماں کو میں کیوں ساری دنیا سے زیادہ خوب صورت لگتی ہوں"۔ میں اُسے ستانے کے لئے کہتا ہوں :" ماں پتہ نہیں کیوں ہر ماں کو اپنی بہو دنیا کی ساری کنواریوں سے زیادہ حسین کیوں لگتی ہے"۔ وہ چپ سی ہو جاتی ہے پھر اُٹھ کر اِدھر اُدھر چلی جاتی ہے اور پھر کہتی ہے :" اچھا ماں کو ہی لگتی ہوں تمہیں تو نہیں لگتی" ۔ پھر اپنی گہری نیلی چادر کو بہت اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر کہتی ہے :" گاؤں کی لڑکیوں میں سے تمہیں کون لگتی ہے اچھی ذرا بتاؤ تو سہی"۔

"میں سر ہلا دیتا ہوں ہم دونوں ہنسنے لگتے ہیں اُسے پتہ ہے اس کا نیلی چادر میں یوں چمکتا چہرہ مجھے آسمان پر پورے چاند کی طرح کا دکھائی دیتا ہے اس کی ہنسی میں بڑی موہنی ہے ۔ جب وہ ہنستے تو تم اسے پسند کئے بنا رہ ہی نہیں سکتیں۔ تمہیں نہیں معلوم جب سے وہ آئی ہے لگتا ہے ہمارے گھر کا آنگن سکھ کا سانس لے رہا ہے گھر بدل گیا ہے گھر کے ساتھ زمین بھی بدل گئی ہے مجھے اُس زمین سے محبت ہے مس ۔

" اپنے وطن سے سب کو محبت ہوتی ہے"۔ کیتھرین اس کی نبض کے بوجھل پن کو محسوس کر کے مطمئن تھی ، گولی کا اثر وقت کے ساتھ ساتھ ہو رہا تھا وہ اب کرسی پر آگے کی طرف جھکی بیٹھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی ۔

" نہیں ہماری زمین میں ایک جادو ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے اُس زمین کی چاہت کی چھاپ بہت گہری ہے پکے رنگ کی طرح وہ تمہاری روح میں اُتر جاتی ہے تمہیں اپنی طرف بلاتی ہے اور اس لئے دیس سے دُور ہونے پر بھی آدمی اُس کے سپنے دیکھتا ہے ۔ اُن صبحوں اور شاموں میں کچھ ہے جو آواز دیتا ہے وہ آوازیں جو نہ بولنے پر بھی بولتی ہیں تارے جو نیلاہٹ میں آنکھیں جھپکاتے ہیں راہ دکھلانے والے جو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سفر کر چکیں تو رات ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے نیلے پربتوں پہ نیلے دھوئیں کا جادو اور شاموں کا سناٹا پھر ایسی صدائیں جن کا کوئی نام نہیں پھول اور درختوں کی خوشبو اور پانی کی ٹھنڈک وہ جگہیں جہاں میٹھے پانی کے ذرا ذرا سے سوتے رہتے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جو آنکھ مچولی کھیلتے میں شیطان کی طرح تیز اور دوڑنے میں بکریوں سے بھی زیادہ چالاک ہیں وہ جگہیں جو بدل بھی جائیں تو یاد رہتی ہیں ۔ تم محسوس نہیں کرتی ہو کہ اپنے لاتعداد بازو پھیلائے زمین محبت کی جھولی میں بلاتی ہے اور آدمی اگر اس پیار کو محسوس نہ کرے تو اُس کے لئے جان قربان کیوں کرے یہ محبت یک طرفہ نہیں ہوتی "۔

" گل شیر اب تم سو جاؤ بہت باتیں کر چکے ہو"۔ کیتھرین نے افسوس سے سر ہلایا ۔

" تم نے خود ہی تو کہا تھا آج تمہیں فرصت ہے "۔ شیر دل نے جس ہاتھ سے اسکا ہاتھ پکڑا ہے وہ بے جان سا ہو رہا ہے بوجھل سویا ہوا جیسے اُس میں سے روح نکل جا رہی ہو ۔

"میری بات سنو مجھے تو زمین بھی دلہن کی طرح لگتی ہے ۔ آدمی اُس کے لئے جان دے سکتا ہے اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے آدمی ساری عمر سفر کر سکتا ہے ۔ وہ زمین جس کے لئے وہ زندہ ہے وہ مر کے بل چل کر اُس تک جانے کے لئے ایک عمر نہیں دس عمریں بھی گنوا سکتا ہے "۔

" کاش تم اپنی ایک عمر اور یہ چھوٹی سی زندگی اُس کے لئے دے سکتے ۔ تم نے اپنی جان ایک ایسے جھوٹ کے لئے دی ہے

جس میں تمہیں یقیناً کوئی تک نہیں ہے اور کبھی نہیں تھا۔" کیتھرین اُس کے کان کے پاس جھکی کہہ رہی ہے۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" اُس نے ایک دم بوجھل پلکیں اُٹھائیں اور اپنی اُونچی پیشانی پر سے پسینے کے قطرے پونچھنے کے لئے ہاتھ اٹھانا چاہا جو اُٹھ نہ سکا جیسے وہیں کی ہو ایک دم زور سے بھڑکے اور پھر وہ بے دم ہو کر کمبل کے تکیے پر گر پڑا۔

"گل شیر دھیرج سے کام لو میں تمہارے لئے دعا کروں تم اب خاموش لیٹے رہو۔"

"میرے لئے تم دعا کرو گی، تم میرے لئے دُعا کرو گی۔ تمہیں میرے ساتھ میری ماں کی دعائیں ہیں میری نورہ کی دعائیں ہیں۔ میرے گاؤں کے راستے منتظر ہیں اور دعا کرتے ہیں میری زمین منتظر ہے پکارتی ہے اور دعا کرتی ہے۔" وہ چپ ہو گیا۔

تمہاری زمین میں کوئی اور زمین تمہیں پکارتی ہو گی تمہاری زمین نے اپنی بولی بدل دی ہے۔ کیتھرین آنکھیں بند کر کے دعا کرنے لگی اُس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

"تم مجھ سے بات کرو یوں چپ نہ بیٹھو مجھے وحشت ہوتی ہے آنکھیں بند نہ کرو۔ تمہاری آواز میرے کانوں میں میٹھے گیت کی طرح آتی ہے۔" گل شیر لگتا تھا پوری ہوش میں ہے۔

"اچھا جو تم چاہو۔" کیتھرین نے خیمے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ "کاش یہ وقت اتنا لمبا نہ کھنچے۔"

"کیا کہہ رہی ہو میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔" گل شیر کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔

"میٹھا گیت، میری آواز تمہیں میٹھے گیت کی طرح لگتی ہے موت کا راگ اندوہناک اندھیرا اور سمجھ میں آنے والا نہیں ہوتا۔"

تب خیمے کے دروازے سے جھانک کر ڈاکٹر نے کہا۔ "نرس خالی بستر کے انتظار میں وہ زخمی کرنل کو لئے باہر کھڑے ہیں۔ پھر اس کو ذرا متذبذب دیکھ کر وہ اندر آ گیا کیوں تم نے اُسے گولی وقت پر نہیں دی تھی؟"

"دی تو تھی مگر پتہ نہیں کیوں لگتا ہے وہ مسلسل ہوش میں ہے باتیں کئے جاتا ہے۔" اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "بے ہوش بھی تو نہیں ہوتا۔"

"مگر باہر ناقابلِ برداشت ٹھنڈ ہے اور وہ زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ تم نے اُسے باتیں کرنے سے روکا نہیں۔"

"روکا تھا ڈاکٹر مگر اُسے اپنا وطن یاد آ رہا تھا وہ کہتا تھا اُسے اپنی زمین کی پکار سنائی دیتی ہے۔"

"جذباتی یہ لوگ بہت بیوقوف ہوتے ہیں اور بہت ہی جذباتی اگر اسے اپنی زمین کی پکار سنائی دیتی تھی تو اس نے غلط سُنا ہو گا۔" ڈاکٹر نے اشارہ کیا۔

"شاید کبھی کبھار آدمی موت کے سفر تک غلط سوچوں کا غلط آوازوں کے جادو کا اور غلط پکاروں کا جواب دینے کا شکار ہوتا ہے۔" کیتھرین نے جھک کر گل شیر کی ناک کے آگے اپنا ہاتھ رکھا پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر سر ہلا دیا۔ وہ آنسو چھپانے کے لئے اپنی آنکھیں جھکائے ہوئے تھی

یہ کہانی میں نے ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں زمانوں پہلے پڑھی تھی تب سے اب تک کتنا پانی پلوں کے نیچے بہہ چکا ہے۔ وقت نے سات رنگ بدلے ہیں وطن اور وطن کے معنی بدلے ہیں ہم نے اپنے سبق سیکھے ہیں قربانیاں دی ہیں اور قربان ہونا

سیکھ رہے تھے کتنی جگہیں لڑی ہیں مگر جانے کیوں مجھے ہر سپاہی کی کہانی گل شیر کی کہانی لگتی ہے گولی سے لائی موت عزت کی موت اور زمین کا بلاوا لگتی ہے۔ پتہ نہیں کون نگارِ وطن ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے اور گھونگھٹ کے پرے جس کے گالوں کی لالی پر شربتی آنکھوں پر جان وار دینے کی آس لئے وہ پیچھے مڑ کر اندھیرے اور اندوہناک راگ سنتے ہیں؟ وہ کون ہے جس کی چاہت میں وہ سب اپنی جان سے گزر جاتے ہیں پتہ نہیں اس چاہت کا جادو کیا ہے اور کون سی زمین کس کو کب پکارتی ہے؟ ڈاکٹر کے لفظوں میں یہ جذباتی لوگ جانے کیا ٹھیک سنتے ہیں اور کیا غلط؟

---

# مولانا کوثر نیازی

## محمد طفیل

صاحبِ صدر اور معزز خواتین و حضرات[1]!

ہمارے کئی دوست دیکھتے دیکھتے وزیر ہو گئے اور ہم اُن کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ مجھے اس بات کا غم نہیں کہ کوثر نیازی وزیر کیوں ہو گئے۔ غم اس بات کا ہے کہ اچھا بھلا دوست تھا جو وزیر ہو گیا۔

لوگ مولانا کوثر نیازی کو جانتے ہیں۔ میں محمد حیات خان کو جانتا ہوں۔ میرے اور دوسروں کے مضمونوں میں جو چکر پڑے گا وہ یہی چکر ہو گا۔ آپ جو کئی مضمون مولانا کوثر نیازی کے بارے میں سنیں گے۔ اُن میں ایک مضمون محمد حیات خان کے بارے میں بھی سن لیں۔ تاکہ اِن میں جو بشریت کی شان ہے۔ اُسے کوئی ضعف نہ پہنچے۔

ایک دن میں اپنی لالک میں بیٹھا تھا کہ ایک نسوانی آواز نے مجھ سے یہ کہا "مولانا کوثر نیازی کے بارے میں ایک تقریب ہو رہی ہے۔ آپ بھی اُن پر کچھ لکھیں۔"

میرا مؤدبانہ جواب یہ تھا "بی بی! وہ کوثر نیازی جو ہمارے دوست تھے اور اِس کوثر نیازی میں جو وزیر ہیں۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ ہمارے دکھ درد میں شریک تھے۔ یہ قوم کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ پہلے اُن کے پاس جتنا خلوص تھا۔ وہ ہمارے لئے تھا۔ اب یہ اُتنے ہی خلوص میں پوری قوم کو رِجھا رہے ہیں۔

جہاں تک خلوص والے مسئلے کا تعلق تھا۔ اُسے میرے ذہن نے فوراً حل کر دیا۔ کیونکہ لوگ دودھ میں جتنا چاہتے ہیں پانی ڈال دیتے ہیں۔ میرے نزدیک دودھ اور خلوص میں زیادہ فرق نہیں جتنا چاہیں بڑھا لیں۔

کسی پیاری شخصیت کا ذکر، جب یوں اچانک چھڑ جاتا ہے تو پھر ذہن میں دوستانہ مراسم کی ریل سی چلنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ مولانا کے گھر دری پہ بیٹھے کباب کھا رہے ہیں اور مولانا کبابوں کی اہمیت پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ بیمار ہُوا تو مولانا مزاج پُرسی کے لیے آ رہے ہیں اور ڈاکٹر کی غلط تشخیص پہ ناراض ہو رہے ہیں۔ غزل نمبر کا نیا ایڈیشن چھاپا تو مولانا فرما رہے ہیں۔ ذرا سنبھل کے دینا۔ اب کے تمہیں بہت سی لڑکیوں کے خطوط آئیں گے۔ اپنی کتاب "زرگل" کا جب پہلا ایڈیشن چھاپنے کے لیے دیا تو زبان سے یہ کہا۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اُٹھے۔ غرض مولانا بڑے پیارے آدمی تھے۔ عالم کے عالم، یاروں کے یار! حالانکہ اس کلجگی دور میں جو عالم ہے۔ وہ کسی کا یار نہیں۔ کیوں کہ علم، عمل کو آواز دیتا ہے۔ اگر عمل جواب دے تو ٹھہر جاتا ہے۔ ورنہ کوچ کر جاتا ہے۔

---

[1] صدرِ اس تقریب کے جسٹس سجاد احمد جان تھے۔ مہمان خصوصی مولانا کوثر نیازی تھے اور معزز خواتین و حضرات میں اب تو آپ بھی شامل ہو گئے — سمجھ لیجیے کتنی طاقتوں کے درمیان کھڑا، ایک بندۂ ناچیز کچھ عرض کر رہا ہے۔ (م۔ط)

تھوڑی دیر کے لئے دھیان اور پھیلا تو یہ بھی دیکھ کر ۱۹۵۳ء میں جب ان کی شادی ہوئی تو یہ گرفتار ہو گئے۔ اب کے سال ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں جب یہ گرفتار ہوئے تو وزیر بن گئے۔ گویا گرفتاری کے ساتھ ساتھ، کسی نہ کسی اہم واقعہ کا، ان کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن اب ان کا مقدر بدل چکا ہے۔ اب اہم واقعات کا تعلق، ان سے متعلق ہو کے رہ گیا ہے۔ گرفتاریوں کا تعلق دوسروں سے متعلق ہو گیا ہے۔

ذہن جب ایک بار بھٹک جائے تو بھٹکتا ہی چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ذہن کی سکرین پر دیکھا کہ مولانا وجیہہ ہیں، شکیل ہیں، پھر ادیب ہیں، خطیب ہیں ـــــ اور مولانا شاہ عالم مارکیٹ کی ایک مسجد میں درس دے رہے ہیں۔ لوگ تقریر سے متاثر ہو رہے ہیں، جھوم رہے ہیں۔ پھر ایکا ایکی مولانا مذہب سے سیاست کی طرف نکل گئے۔ اور مجھے ان سے یہ کہنا یاد نہ رہا کہ جب مذہب کا نام لے کر سیاست کے گھوڑے دوڑتے ہیں تو سب سے پہلے مذہب ہی کی لگام کو توڑ دیتے ہیں۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ ان کے عہد میں مذہب پر کیا گزری؟ اس لئے کہ آج سرابوں میں حقیقتوں سے زیادہ دلکشی پیدا کر دی گئی ہے۔ اپوزیشن والے کہتے ہیں۔ ملک ہمارے دم سے ہے۔ برسرِاقتدار پارٹی کہتی ہے۔ ہم نہ ہوں گے تو یہ ملک بھی نہ ہوگا۔ ہم سب اپنی اپنی مسجد کے عالیشان گنبد کو تو دیکھ رہے ہیں مگر اس سے جو آواز آ رہی ہے۔ اُسے کان لگا کر نہیں سُن رہے۔

سنا ہے کہ دنیا کی عمارت کے چار ستون ہیں ـــــ وہ علم جو علما کے سینے میں ہو ـــــ وہ عدل جو ارکانِ حکومت کے ارادوں میں پایا جائے ـــــ وہ دعا جو صالحوں کے دلوں سے نکلے ـــــ اور وہ جلال جو بہادروں کے تیور سے ظاہر ہو۔

اس کلیہ کے اعتیار سے بھی، ان ستونوں پہ جو عمارت کھڑی ہے۔ اُن میں مولانا کے کندھوں کا سہارا بھی شامل ہے۔ بوجھ ان کے کندھوں پہ کتنا ہے۔ میرے لئے یہ سوال قابلِ غور نہیں۔ میرے نزدیک مسئلہ، نیّت کے ثواب میں ثرکت کا ہے۔

آج جو ہم یہاں جمع ہوئے ہیں تو یہ بتانے کے لئے کہ انسان جو ماضی کی روایات کا وارث ہے۔ وہ کتابوں ہی سے اپنی وراثت حاصل کرتا ہے اور کتابیں ہی اس کی وراثت کی دستاویز ہوتی ہیں۔ آج مولانا کوثر نیازی بھی، اپنے ورثہ میں ایک دستاویز کا اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ کتاب شعری مجموعہ پر مشتمل ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاعر کے الفاظ سے ترنم پیدا ہوتا ہے۔ میری گزارش یہ ہے کہ اس کی روح کے ترنم سے الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔

میں ایسی باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اتنی نسوانی آواز نے ٹھوکا دیا۔ "آپ کا وہ دوست جو آپ کے نزدیک کھو گیا ہے۔ کیا آپ انھیں ڈھونڈھنے کے لئے بھی نہیں آ سکتے؟"

میرا جواب یہ تھا۔ "بی بی! میں انھیں کیسے ڈھونڈھ سکتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ خاکسار وزیروں اور سفیروں سے دُور بھاگتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ان دنوں، وزیر اور سفیر عوام سے بھاگنے لگے ہیں۔

دعویٰ مولانا کا بھی یہ ہے کہ میں عوام کے قریب ہوں۔ دعویٰ میرا بھی یہ ہے کہ میں مولانا کے قریب ہوں۔ خدا آبرو ان کی بھی رکھے۔ خدا آبرو میری بھی رکھے۔

---

# ۳

## مزید افسانے

# میر مرحوم عجب تھا کوئی

## رشید احمد صدیقی

محمد فاروق دیوانہ مرحوم (ایم۔ ایس۔ سی۔ علیگ) کی رحلت کی خبر تمہاری زبان سے ملی۔ ایک مدت سے یاد نہ آئے تھے بڑے علیل و صاحب فراش تھے۔ خط و کتابت بھی نہ تھی لیکن جب کبھی وہ باتیں ذہن میں آتیں جو علی گڑھ کہلاتی ہیں تو مرحوم کا سراپا اور شخصیت سامنے آجاتی۔ کیا بتاؤں جب سے علی گڑھ گردش میں آیا ہے اولڈ بوائز کی ناموری اتنی نہیں یاد آئی جتنی موجودہ نوجوان طلباء کی معصیت و محرومی مضطرب رکھتی ہے۔

ہر آدمی کی وفات پر خواہ وہ اچھا ہو یا برا مسلمان کی زبان پر بے ارادہ دعائے مغفرت آتی ہے۔ دعائے مغفرت مانگ کر مرحوم کو جوار رحمت میں دے دینا ٹھیک ہے۔ لیکن مغفور کو محبت و احترام سے اپنے شعر و ادب میں آنے والی نسل کی محبت و احترام کے لیے محفوظ کر دینا اور اس کی امانت میں دے دینا دعا سے آگے کی ایک چیز ہے۔ یعنی دعائے مقبول۔ اپنے ناچیز بندے کو خدا نے یہ ایک اختیار امتیاز بخشا ہے کہ وہ دعا مانگ کر اسے خود بھی قبول کر سکتا ہے۔ اس عطیہ الٰہی کی طرف ہمارا دھیان کم جاتا ہے، ورنہ دعا کی طرف سے کبھی کبھی مایوس یا بدگمان ہونے کے بجائے ہم ہمیشہ اپنے کو مسرور و مظفر محسوس کریں۔ کبھی کبھی میں اس طرح کی بھی دعائیں مانگ لیتا ہوں۔

مرحوم کتنے ناموں سے مشہور تھے، اور یہ سارے القاب ان کے شیدائیوں نے کس محبت و عزت سے ان کو دیئے تھے حاجی بلغ العلیٰ حاجی بغلول اور یہ سب غالباً مشہور کلاسیکی بہلول دیوانہ کی یاد و احترام میں، اپنے بارے میں ایک شعر بھی کہا ہے۔

بلغ العلیٰ تھا نام مرا اس کو دیکھیے　　　اتنا بگاڑا لوگوں نے بغلول کر دیا

اگلے زمانے میں جب حکومت مطلق العنان ہوتی تھی مخلص اور عقلمند لوگ دیوانے اور وحوش و طیور کی زبان سے کلمۂ حق کہلواتے اور اس کی تلقین کرتے۔ جابر، آدمی کو نہیں پہچانتا، جانوروں سے ڈرتا ہے۔ ظالموں اور بچوں کو اس زمانے میں اسی طرح اچھی باتیں بتائی سکھائی جاتی تھیں۔ دیوانے کی باتیں فرزانوں کی فرمودات سے زیادہ متاثر ہوتی تھیں، اس لیے کہ نالائق سے نالائق بھی دیوانے کو مخلص سمجھتا ہے۔

فاروق صاحب علی گڑھ کے اس زمانے کے طلباء میں سے تھے جب ہم سب علی گڑھ کو مسلمان کا اندلس اور یونان سمجھتے تھے، کیسے کیسے ذوق و ذہن اور ہمت و حوصلہ کے طالب علم یہاں تھے کتنے قیمتی اور قوی عوامل و عناصر اور کیسی صحت مند و صحت بخش فضا میں ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت ہوتی تھی۔ ان میں سے کس کس کے نام لوں اور کہاں تک ان کی تفصیل سناؤں۔ علی گڑھ کے اس زمانے رندانِ باصفا ان کو جانتے پہچانتے ہوں گے۔ موجودہ صدی کے ابتدائی ۳۰ - ۲۵ سال جتنے نامور طلباء اس ادارے سے فارغ التحصیل ہوئے وہ پھر کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ جیسے اقدار اعلیٰ کے وہ سانچے ٹوٹ چکے ہوں جن میں نوجوانوں کی سیرت و شخصیت ڈھلتی تھی یا وہ روایات اپنا

سارے علمی ہوں، جن میں ہماری فکر و نظر بیدار و بالیدہ ہوتی تھی۔ جس نسل کا ذکر کر رہا ہوں وہ اس تہذیب کی شکست و ریخت سے برآمد ہوئی تھی ... میں ایسی تہذیب قرار دیا گیا ہے جو اپنی ترکیب، توانائی اور تازگی کے اعتبار سے تہذیب ہی نہیں تحریک بھی ہے۔ یہ تہذیب اور ایسی تہذیب ختم نہیں ہوتی بلکہ کلامِ الٰہی کے لفظوں میں اپنی شان بدلتی رہتی ہے۔ کم تہذیبیں تحریک رہی ہیں!

فاروق صاحب ریاضی (میتھمیٹکس) کے ام۔ ایس۔ سی تھے۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا سائنس یا ریاضی میں یہ امتیاز حاصل کرنا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ہم میں جو اس علم سے واقفیت رکھتے تھے، ان کو کچھ اس طرح کا اسکالر سمجھتے تھے جو ریاضی کا معلم ہی نہ ہو جیسا کہ اکثر لوگ ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ ریاضی کے ادا شناس تھے، وہ ریاضی سے دوسرے علوم کی بھی تعبیر و تصدیق کر سکتے تھے۔ وہ تمام علوم کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں بلکہ ایک ہی نامیاتی رشتے میں منسلک سمجھتے تھے۔ اس طور پر ریاضی کو انہوں نے اپنے طلبا کے لیے بہت دلچسپ اور سبق آموز بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب نے ان کو لکچر شپ کے علاوہ قانونِ مسعودی کے ترجمے کا کام بھی سپرد کر دیا تھا۔ فاروق صاحب ڈاکٹر صاحب کے بڑے چہیتے اور لائق شاگرد تھے۔ ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور تمام عمر ڈاکٹر صاحب کے منتخب وفا شعاروں میں رہے۔ مہمان ہاؤس میں قیام تھا، لیکن دن رات حالتِ سفر میں رہتے کوئی ساتھ نہ ہوتا، صرف ایک کمبل کندھے پر ڈالے ہوتے جس سے وہ جس طرح کا سلوک چاہتے کرتے، چلتے ہوئے تو کمبل گردن پر سوار رہتا جہاں بیٹھنے کو ہوتا وہاں کمبل کو ٹیک کر اس پر خود سوار ہو جاتے۔ جاڑے، گرمی، بہار، برسات کسی کی قید نہ تھی۔ کمبل ان کا سمبل یا سلف رسپکٹ بن گیا تھا۔

یاد نہیں آتا ان سے کب کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی، شاید یہ سب کچھ نہ ہوا ہو۔ وہ خود مجھ پر منکشف ہو گئے ہوں۔ اس کا صلہ اس طرح دیا کرتے کہ جب تک علی گڑھ میں رہے دن رات میں کسی وقت ایک بار مجھے دیکھنے اور اپنے کو دکھانے کے لیے ضرور آ جاتے۔ موجود نہ ہوتا تو بچوں کو طرح طرح کے حرکات و سکنات سے لبھاتے، بچوں سے بھی زیادہ۔ بچوں کی طرح باتیں کرتے اور کھلا ہنسا کر چلے جاتے۔ کوئی نہ ملتا تو نوکروں سے اظہارِ تلطف کی بنا پر کوئی چھوٹی موٹی سی فرمائش کر دیتے اور ان کو خوش کرنے کے لیے اپنے خاص انداز سے پرسشِ احوال کرتے اور چلے جاتے۔ میں گھر آتا تو یہ ملازم فاروق صاحب کی تشریف آوری کو اس طرح بیان کرتے جیسے فاروق صاحب میرا نہیں ان کا کارنامہ تھے۔ نوکروں اور بچوں میں شاید ہی کوئی فرزانہ اتنا مقبول تھا جتنا یہ دیوانہ!

جیسا کہ اوپر بیان کر آیا ہوں وقت کا زیادہ حصہ گھومتے پھرتے کاٹ دیتے جیسے کوئی ناقابلِ تسخیر باطنی تقاضا یا طاقت چین سے بیٹھنے نہ دیتی۔ نووارد طلبا یا اجنبی اشخاص سے راستے میں کھڑے کھڑے گفتگو کرنے لگتے جو ان کی ہیئت اور اکھڑی اکھڑی باتیں سن کر ان کو نیم پاگل سمجھتے لیکن مخاطب کو وہ باتیں اتنی عجیب اور دل کش معلوم ہوتیں کہ ان سے اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک یہ خود گفتگو کے دوران ہی میں ان کو متحیر چھوڑ کر کسی اور طرف نہ نکل جاتے۔ فاروق صاحب کا سراپا اور طور طریق دیکھ کر قدیم یونان کے اربابِ دانش اور اہلِ فن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا، ترشا ہوا ناک نقشہ متناسب اعضا، کھلتا ہوا رنگ، آنکھیں متجسس، کبھی اتنی گہری اور پُراسرار اور ٹھہری ہوئی جیسے گہرا، خاموش بے کنار سمندر، غیر معمولی طور پر نمایاں، چوڑی ہموار اونچی پیشانی، سر کے بال صاف، لمبی گھنی ہواؤں میں بکھرتے رہنے والی کھچڑی داڑھی جو ان کے اندازِ گفتگو کے ساتھ اس طرح متحرک رہتی اور خفیف سے خفیف ارتعاش کو ریکارڈ کرتی جیسے راگ آواز ہی نہیں جنبش (رقص) بھی ہو۔ اوسط عمودی قد، آواز بھاری نہیں تھی لیکن اشعار ہمیشہ ایسی گمبھیر آواز و انداز میں پڑھتے

جس میں گونج اور کھنک ہوتی، بالعموم ایسے ہی شعر پڑھتے جس میں ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے جزالت ہوتی۔ ان کی زبان سے شاید ہی میں نے کبھی ایسا شعر سنا ہو جس میں غزل کا رنگ و آہنگ ہو۔ پتلے دُبلے لیکن ہلکے پھلکے نہیں، اعضا اور عضلات میں بڑی لچک اور توانائی معلوم ہوتی تھی، یونانی دانشوروں ہی کی طرح مسائل کو سنجیدہ گفتگو اور سوال جواب سے منقح کرتے کیسے ہی غبی یا برخود غلط سے کیوں نہ سابقہ ہو نہ اکتاتے تھے نہ بیزار ہوتے تھے۔

یونیورسٹی میں اکثر رزم و بزم کے معرکے پیش آتے رہتے۔ ایسے مواقع پر بعض محترم مہمانوں کا اجتماع میرے یہاں ہو جاتا، فاروق صاحب حسب معمول گھومتے پھرتے گنگناتے آنکلتے۔ ان کی پذیرائی جس رکھ رکھاؤ، لطف، شگفتہ روی اور شائستہ بے تکلفی سے ہوتی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں میں مہمان اکابر کے لیے کتنی کشش و احترام تھا۔ فاروق صاحب کو جس نے قریب سے دیکھا ہے وہ جانتا ہوگا کہ ان کے ظاہر اور باطن میں اختلاف ہوتے ہوئے کتنا اتحاد تھا۔ ایسا اتحاد جس کو اتنا آرٹسٹ نہیں جانتا عارف سمجھ سکتا تھا تاوقتیکہ آرٹسٹ اور عارف "بیک ناقہ دو محمل" نہ ہوں "یہ قران" "دلِ پوشیدہ اور کافر کھلا" ذرا کم ہی دیکھا گیا ہے۔ اس صحبت میں کوئی نہ کوئی سیاسی علمی یا تہذیبی مسئلہ بغیر ارادہ کے چھڑ جاتا، فاروق صاحب ان لوگوں میں تھے جن کی موجودگی میں موضوعِ گفتگو کچھ بھی ہو اس کی سطح ہمیشہ بلند ہوتی۔ یہ بڑی معتبر پہچان حقیقی آرٹسٹ، اسکالر یا شخص کی ہے۔ باتیں سنجیدہ اور شگفتہ ہوتیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال سے لے کر آخرت میں ان کے عروج تک کے سارے مسائل زیرِ بحث آجاتے۔ درمیان میں تفنن کی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتیں۔ فاروق صاحب کہیں بند نہ تھے۔ یکایک پہلو بدلتے، مجلس برخاست ہو جاتی اور اس طرح رخصت ہو جاتے جیسے جھونکا نسیم کا تھا، ادھر آیا اُدھر نکل گیا!

سال نہیں یاد آرہا تقریب یاد ہے۔ طلبا نے اسٹریچی ہال میں ڈرامہ کیا تھا۔ فاروق صاحب چیف ایکٹر تھے۔ ایسے ایکٹر جس کے "نمونے زیبا کے لیے مزید کسی "آب و رنگ و خال و خط" کی حاجت نہ تھی، وہ سماج ہی نہیں سنسار کے سنسر ایکٹر تھے۔ اسٹیج پر نمودار ہوئے تو پورا تحسین اور تالیوں سے ہلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے فاروق صاحب اپنے حلیہ و ہیئت اور اپنے سے متعلق جس حرف و حکایت کی صدائے بازگشت میں نمودار ہوئے تھے وہی بھرپور ڈرامہ تھا۔ از اوّل تا آخر! جیسے مثیت میں مدت گم یا مشتمل ہو۔ پھر اپنا خطبہ پڑھا جو صنعت "متشابہات" میں لکھا گیا تھا۔ اس صنعت کی کھوج میں نہ پڑیے فاروق صاحب کو نظر میں رکھیے۔ پہلے ہی فقرے سے متشابہ گنا شروع ہوا۔ ہر متشابہ کی برجستگی پر سامعین دل کھول کر داد دیتے اور لطف اٹھاتے۔ اس صنعت کو فاروق صاحب نے کہیں سے کھوکھلی یا آورد سے بے کیف نہیں ہونے دیا تھا، وہ جانتے تھے کہ ان کے سامعین جن میں کبھی وہ خود رہ چکے تھے، بڑے سخت گیر اور صرف آمد کے قائل تھے آورد اور پینترے کو کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے ہر موڑ پر ہر لفظ اور فقرے میں کوئی نہ کوئی گدگدی، چٹکی یا چبھن رکھ دی تھی۔ معلوم نہیں یہ خطبہ کہیں محفوظ ہے یا نہیں۔ یہ صنعت اتنی صنعت نہیں ہے جتنا لطیفہ یا تفریح ضلع جگت سے ملتی جلتی ایک چیز اس سے کام لینے والا اگر کوئی اچھا فن کار ہو تو وہ اپنے عہد کے اہم اور دلچسپ واقعات حالات و تجربات کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ اس خطبے کا اختتام کچھ اس طور پر ہوا تھا۔ "الخاتون والشیخ عبداللہ!" اس زمانے میں ویمنز کالج علی گڑھ کے بانی اور سیکرٹری خان بہادر شیخ عبدالغفور ایک رسالہ خاتون نکالتے تھے۔

فاروق صاحب اچھے شاعر تھے اور ایسے ہی شعر کہتے جس کے بارے میں ان کو یقین ہوتا کہ وہ شاعر شاعری اور سامعین سب کا حق ادا کر رہا ہے۔ لکھے اور بار بار کے پڑھے ہوئے اشعار مجھے یاد نہیں رہتے۔ چہ جائیکہ سُنے سنائے۔ سر راس مسعود مرحوم کے اسکول کے ساتھی تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو اشاف کلب میں فاروق صاحب نے بڑی دھوم کا ایک خیر مقدمی قصیدہ پڑھا کس اعتبار و افتخار سے یہ مصرعہ پڑھا تھا۔

بہ ہمت جوان و بتدبیر پیر!

اس وقت جنگ بلقان کے زمانے کی ایک نظم کا مشہور شعر یاد آ رہا ہے جو مدتوں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر رہا۔

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے　　　پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ نظم فاروق صاحب ہی کی تصنیف تھی یا کسی اور کی۔ عام طور سے منسوب انہی کی طرف کی جاتی تھی' ان کی اردو نثر میں بڑی جان اور روانی تھی جس میں جا بجا طنز و ظرافت کے جگنو جگمگاتے تھے۔ طنز و ظرافت کے لیے نہ چہرہ باندھتے نہ مواقع تصنیف کرتے۔ ان کی تحریر سے طنز و ظرافت اسی طرح بر آمد ہوتی جیسے پیڑ پودوں سے پھل پھول۔ مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" سے کچھ دنوں وابستہ رہے۔ اردو کے بیشتر مضامین اسی میں شائع ہوئے۔ بات میں بات نکلتی ہے اور جب" دیوانے کا پاؤں درمیان ہو" تو ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں' میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل فن ہے۔ ہنس ہنس کے اور ہنسا ہنسا کے مار ڈالنا بہر حال فساد کرا کے مار ڈالنے سے بہتر اور بڑا کارنامہ ہے۔ متشابہات کا تعلق ظرافت سے ہے اور متشابہات میں پتے کی بات کہتے جانا آسان نہیں ہے لیکن یہ کوئی اعلیٰ اسلوب نہیں ہے البتہ اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ کوئی اچھا لکھنے والا ہو تو وہ اپنے عہد کے اہم واقعات' حالات اور تجربات کی نشاندہی اس پیرائے میں دلنشیں انداز میں کر سکتا ہے۔

ہمدرد کے دفتر دہلی میں ایک بار فاروق صاحب کا مہمان ہُوا۔ فاروق صاحب اپنے (CELL) حجرہ یا زاویۂ زہدان) میں زیادہ تر چارپائی پہ لیٹے چھت کو تکتے اور گنگناتے رہتے، اکتا جاتے یا خیالات یکسو ہو جاتے تو سر سے پاؤں تک کمبل اوڑھ لیتے۔ یہ ایک طرح کا نوٹس تھا کہ جو کچھ سوچ لیا ہے وہ دم پخت ہو رہا ہے۔ پھر یکلخت اٹھ بیٹھتے اور پنسل سے کٹے پھٹے کاغذ پہ جلد جلد لکھنا شروع کر دیتے۔ دو چار صفحے لکھے کاتب آیا مسودہ لے گیا۔ محمد علی صاحب کے احکام و دشنام پائدار آواز سے مسلسل براڈ کاسٹ ہوتے رہتے۔ شام ہو رہی تھی مولانا کی آواز گونجی، " دیکھو فاروق کیا کر رہا ہے" پاس سے شائد کسی نے کہہ دیا ہو کمبل میں روپوش ہیں، مری خلفشار کو رد و ندہا پسپا کرتا ہوا محمد علی صاحب کا تڑاقا موصول ہُوا، جیسے ریڈیو پہ بجلی کے بجائے آواز گری ہو" ارے اس سے کہو اٹھ بیٹھے ورنہ دیوانہ تو ہے ہی پاگل ہو جائے گا"

محمد علی جیسے تھے سب جانتے ہیں' ایسی کھلی کتاب کہاں ملتی ہے۔ زندگی کی جس منزل اور زمانے کی جس گردش سے گزر رہا ہوں اور علی گڑھ کو جس درماندگی میں پاتا ہوں' اس میں ایسا محسوس ہوتا ہے' جیسے اب کسی محمد علی کو نہ دیکھ پاؤں گا۔ مرحوم کے بارے میں متضاد رائیں رہی ہیں مجھے تو ان کی خامیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں' جیسے وہ ان میں نہ ہوتیں تو شاید ان کی شخصیت اتنی مسحور کن' ناقابل تسخیر اور دلآویز نہ ہوتی جتنی کہ تھی۔ کاش ناظرین نے ان کو اپنے خوردوں میں سے کسی پر برہم ہوتے پایا ہو۔ اس کے بعد یہ دیکھا کہ اس برہمی کے طفیل اُس

اس کی تلافی میں محمد علی کی شرافت، شفقت، شجاعت اور سخاوت کا کیا عالم ہوتا تھا۔ کیسے کہوں کہ اب ایسے لوگ نہ پیدا ہوں گے اس لیے کہ مشیت مشاق ہے۔ لیکن مٹنے نہیں دیتی، وہ مشاق ہی ہے بنانے کے لیے شاید طرفہ تر اور عظیم تر شئے یا شخصیت بنانے کے لیے۔

محمد علی مرحوم تین شخصیتوں کا غیر معمولی لحاظ کرتے تھے۔ میرے علم میں یہی تین ہیں، بہت ممکن ہے دوسرے بھی ہوں، سید محفوظ علی بدایونی، راجہ غلام حسین اور فاروق صاحب کا، راجہ غلام حسین کامریڈ میں محمد علی کے دستِ راست تھے۔ تھوڑے سے وارستہ مزاج بھی۔ محمد علی صاحب ایک دن ان کی تلاش میں پتہ لگاتے لگاتے بام نشینوں تک جا پہنچے، راجہ مرحوم کو پکڑ لائے، اور یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے دفتر پہنچے،

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

غلام حسین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا، محمد علی صاحب بے قرار ہو گئے۔ جانگداز مرثیہ لکھا، ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

خوب کٹتا بہشت کا رستہ
ہم کو بھی ساتھ گر لیے ہوتے

ان دنوں کبھی کبھی بے اختیار جی چاہنے لگتا کہ ایک دفعہ پھر یونین میں محمد علی کی زبان سے وہ شعر سن سکتا جس کا قصہ یہ ہے، چھندواڑہ میں طویل نظر بندی سے رہا ہو کر علی گڑھ پہنچے تھے، علی گڑھ کے طلبا، علی گڑھ کے محراب و منبر علی گڑھ کی فضا، علی گڑھ کے تقاضے۔ اس سے بہتر اور کون موقع ہو سکتا تھا جب محمد علی اپنی محبت، مسرت اور افتخار کا اظہار کرتے جیسے۔

ابر اٹھا تھا کعبے سے جھوم پڑا میخانے پر

شعر کا پہلا مصرعہ پڑھا کہ

شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد

دیر تک اور طرح طرح سے اسے پلٹے دیتے رہے کبھی سنجیدہ ہو کر کبھی بلند بانگ ہو کر کبھی بڑے ہلکے پھلکے تفریحی انداز سے اور ہم سب کے شوق کو مہمیز کرتے رہے جب دیکھا کہ پیالے کے چھلکنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تو دوسرا مصرعہ پڑھا اور اس طرح پڑھا اور ایسے ادا کیا کہ کیا کوئی مشاق شاعر یا ایکٹر ادا کرے گا۔ اس سے پہلے انیس نے اتنا اور کہہ دیا، صاحبو یہ شعر میرے وطن رامپور کے ایک شاعر کا ہے، اتنا کہہ دینے سے شعر کی تاثیر اس موقع پر جتنی بڑھ گئی، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، پورا شعر یہ ہے۔

شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد
بند سے دیوانہ رہا ہو گیا

کیا بتاؤں محفل کا کیا حال ہوا، ثانی مصرعہ طرح طرح سے بار بار پڑھتے، کیسا مژدہ اور کیسی دعوت تھی، یہ اسیری اور یہ رہائی، جس کا احساس و اظہار جگر صاحب کے اس شعر میں ملے گا۔

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

یہ ان اشعار میں ہے جسے اچھے شاعر بھی اتفاقیہ ہی کہہ پاتے ہیں ہم میں پاکر اور ہم میں پہنچ کر محمد علی سے زیادہ دھوم مچانے والا جان چھڑکنے والا اور فخر کرنے والا مجھے تو اب تک ملا نہیں، جیسے ان کی ساری اعلیٰ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہوں اور ہاں یہ کہنا تو بھولا ہی جاتا تھا کہ کیسا ہی سورما کیوں نہ ہو محمد علی کو ( PATRONISE ) نہیں کر سکتا تھا۔

۱۹۲۹ء میں اودھ ہائی کمیٹی نے جتنے اراکین اسٹاف کو یونیورسٹی کی ملازمت سے برطرف کیا، ان میں ایک فاروق صاحب بھی تھے۔ علی گڑھ چھوڑنے کا ان کو بڑا صدمہ ہوا، ایسا معلوم ہوا جیسے علم و فن اور دید و دانش کی جتنی رنگین و دلکش عفیف اور کشادہ آغوش وادیاں تھیں، ان سب کو اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے بند کر لیا ہو، اس حادثے پر فاروق صاحب کا قلندر جاگ پڑا اور یہ پکار کر کہ

تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ان کو عرش پر سے فرش پر اتار لایا اور ایک نیا دل تفویض کیا، اس قلندر نے ان سے پہلے اور سب سے پہلے ہمارے جدِ اولین کو بھی یہی کہہ کر سہارا دیا تھا اور زمین پر اتار لایا تھا، پھر معلوم نہیں کتنے بہانے اور کیسے کیسے بھیس میں اس کارگاہِ عمل کو وہ حیثیت یا منزلت بخشی جس کا بارگاہِ عبادت میں تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ داستان لمبی ہے اور رات تھوڑی۔ قصہ کوتاہ فاروق صاحب اپنے وطن گورکھپور کو مراجعت کر گئے شاید پھر کبھی علیگڑھ نہ آئے وہاں انہوں نے شکر سازی کے ایک کارخانہ کی منیجری قبول کر لی اور فیکٹری کو ایسا عروج دیا کہ اس زمانہ اور اس کے نواح میں ان کے اس کارنامے کی دھوم مچ گئی۔ علی گڑھ کے رندانِ قدح خوار کے ایسے کتنے کارناموں میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔

یہ سب تو ہوا لیکن اس سوسائٹی کو کیا کہیے جہاں ہر عظمت کی تقدیر میں عبرت لکھی ہو!

---

# اے سرزمینِ اُندلس

## منظور الٰہی

اُندلس کی فضائیں اُداس ہیں، اُس کے در و بام پر ایک ناقابلِ بیان افسردگی سحر کی طرح مسلط ہے، اس BROODING SADNESS کی وجہ ایلین پول نے لکھی ہے "جب یورپ میں چار سُو ظلمت تھی عربوں نے علم و ادب کی شمعیں روشن کیں، شجاعت کے اصول وضع کئے۔ ہسپانویوں نے مُوروں[1] کو جلا وطن کر کے کیا پایا؟ کچھ عرصہ ہسپانیہ چاند کی طرح مستعار روشنی سے چمکتا رہا، پھر گرہن لگ گیا اور اُس وقت سے یہ ملک تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے۔"

ابھی نور کا تڑکا تھا، گاڑی آہستہ آہستہ سیرا مورینہ کا سلسلہ کوہ طے کر رہی تھی۔ تاریخ کے فیصلہ کن موڑ پر یہ پہاڑیاں خون میں نہا گئی تھیں؛ اس خون میں طوائف الملوکی اور خاندان پرستی کی بے سود قربانیاں بھی شامل تھیں۔ لرزاں احساسات کے ساتھ قرطبہ کے نواحی علاقے میں پہنچتا ہے۔ انہی ریگزار پہاڑیوں پر عربوں نے AQUEDUCTS بنا کر سارا علاقہ شاداب کیا تھا، چاول، کپاس، نیشکر اور زیتون کی کاشت پہلی بار کی، انار، آڑو، بادام اور سنگترہ مقامی پھولوں پر پیدا کئے، اب یہ علاقہ زبوں حالی کا شکار ہے، مٹی کے ٹیلوں میں گہرے شگاف نظر آ رہے ہیں۔

دیہی علاقے میں لوگوں کے دن نہیں پھرے، پہاڑیوں سے چپکے ہوئے دیہات محرومی کی تصویر ہیں، گھر میں مٹی کا فرش، تن کے کپڑے، کم عمری میں شادی، کم عمر میں موت۔ اسٹرک کے کنارے ایک نوجوان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ہماری غربت کی بڑی وجہ اہلِ کلیسا اور زمینداروں کا گٹھ جوڑ ہے؛ بڑے زمیندار نہیں چاہتے کہ علم کی روشنی عام ہو۔ کبھی سنو کہ اس علاقے میں کسانوں نے بغاوت کر دی ہے تو حیران نہ ہونا!"

عربوں کے آنے سے پہلے بھی غریب کسان، جاگیرداروں اور پادریوں کے رحم و کرم پر تھے اور ایک ہزار برس بعد بھی! کیا گذشتہ پانچ سو برس ترقیِ معکوس کی نذر ہوئے؟

عرب حکمرانوں نے کاشتکار کو اراضی اور آب رسانی کے حقوق دیے، یوں ملک کی خوشحالی میں اُسے حصہ ملا تھا، شکست سے پہلے یہ عافیت خانہ جنگیوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔

بدنظمی کے مختصر وقفے کے سوا اڑھائی سو برس قرطبہ مغرب کا عظیم ترین شہر رہا، اس کے کمالِ عروج کا زمانہ دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے، صاف پانی بکثرت مہیا کیا گیا تھا، معبدوں کے طلائی گنبد اور خوشنما باغات دور سے نظر آتے تھے۔ آئندہ دو برس تک یورپ

---

[1] رومی شمالی افریقہ کے باشندوں کو ماؤری یا اہلِ مغرب کہتے تھے۔ ہسپانوی میں یہ لفظ مورو ہوا اور انگریزی زبان میں مور، دراصل بربر مور تھے لیکن آہستہ آہستہ سب مسلمان جو ہسپانیہ میں بس گئے تھے مور کہلانے لگے۔

میں کوئی ایسا شہر نہ تھا جہاں گلی کوچوں میں سنگی فرش ہو نہ ہی اسکول یا پبلک حمام ایسی نعمتوں کا خیال کیا جا سکتا تھا۔

قرطبہ میں ستر لائبریریاں اور بے شمار کتابوں کی دکانیں تھیں، کاغذ سازی کا فن مراکو اور ہسپانیہ نے عربوں سے سیکھا جہاں سے وہ یورپ تک پہنچا، لکھائی کے لئے عرب کاغذ کی بہترین قسم استعمال کرتے تھے، جامعہ قرطبہ نظامیہ بغداد اور الازہر کی پیشرو تھی، قرطبہ کے عظیم فرزند ابن رُشد نے ارسطو کی شرح لکھی اور اُس کے بہت سے نظریات کو رد کیا، مدت تک ابنِ رُشد کے افکار نے یورپ کے فلسفیوں کو متاثر کیا، اندلس میں ابتدائی تعلیم عام تھی، یورپ میں جہالت کا دور دورہ تھا، راہبوں یا پادریوں کے علاوہ لوگ مروجہ علوم سے بے بہرہ تھے۔

قدیم شہر کا محیط چودہ میل تھا، وادی الحسن، جنان العجوبرا ایسے دلکشا مضافات دریا کے کنارے پر پھیلے تھے، کوچوں میں پتھر کا فرش اس نفاست سے بچھا تھا کہ آج بھی لکڑی کے پہیوں والی گاڑی شور مچاتی اُن گول پتھروں پر سے گزرتی ہے جو ایک ہزار برس پہلے عربوں نے ترتیب سے جوڑے تھے، دیدہ زیب پل دریا کے دونوں کناروں کو ملاتے تھے، سب سے بڑا پل اب بھی وادالکبیر کی حدِ سیلاب سے بلند، دعوتِ فکر دیتا ہے۔

قرطبہ نسبتاً چھوٹا شہر ہے لیکن وضع قطع کے لحاظ سے اُس میں ایک جاذبیت ہے، اُمرا کے مکانات جیسے مشرقی طرز کی ڈیوڑھی دار حویلیاں، اندر سنگِ مرمر کا صحن اور فوارہ، اِرد گرد بیل بُوٹے، باہر صیقل شدہ جنگلہ، مکان مکینوں کی خوش ذوقی اور نفاستِ طبع کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک چوک سے دوسرے چوک تک عرب کوچوں کے پیچ و خم، فواروں سے آراستہ چھوٹے چھوٹے دلآویز چوک، فضا میں شگوفوں کی مہک تھی، گھروں اور کوچے کے درمیان گلاب اور حنا کے چمن تھے۔ پھول دار بیلیں دو منزلہ مکانوں پر چڑھ گئی تھیں، منظر کی رنگینی میں کچھ کمی تھی تو وہ پھولوں سے لدی پھندی ٹوکریوں نے پوری کر دی جو شہ نشینوں میں لٹک رہی تھیں۔

قرطبہ کے بھرے بازاروں میں سیاہ فام حبشی، گندمی رنگ بربر، عرب علما اور اُمرا، ملکوں ملکوں کے تجار، شاہی محلوں کے پاسبان اور عقب میں کاریگر اور مزدور قافلہ بن کر گزر گئے، آج سوادِ شہر میں بگولے اٹھتے ہیں جیسے شوکتِ پارینہ کا ماتم کر رہے ہوں۔

مسجد اس عُروس البلاد کا دل تھی، اندر قدم دھرتے ہی اُس کی عظمت کا نقش دل پہ ثبت ہو جاتا ہے، لاتعداد ستون اور محراب عجم اور پائیداری کا شعور ناثر دیتے ہیں، اُن کے حسنِ ترتیب سے مسجد کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ وسعت کا تقاضا تھا کہ مسجد بلند بام ہو، اُونچی چھت اور ستونوں کی کثرت سے بے پایاں کشادگی کا احساس ہوتا ہے، مسجد کی خوب صورتی اُس کی سادگی اور پہنائی میں نہاں ہے، اطراف میں نظر بے محابا دوڑتی ہے، سنگِ یشب، سنگِ موسیٰ اور سنگِ سُرخ کے ستونوں کی طویل روشیں بھگے سایوں میں کھو جاتی ہیں، چار سُو ایک حسین جھٹپٹا ہے، انجانے گوشوں سے چھنتی ہوئی روشنی منظر کو لطیف نورانی چادر اوڑھا دیتی ہے، ستونوں سے اُبھرتی ہوئی دوہری محرابیں چھت کو سہارا دیتے ہیں، محرابوں پر قرمزی اور پیلی دھاریوں کی وہ فراوانی ہے کہ نظر اُچٹتی چلی جاتی ہے اور ایک نکتے پہ نہیں ٹھہرتی، اس سے عمق کا دلکش تاثر ملتا ہے چار سو ستون گرا کر شمالاً جنوباً کلیسا بنا دئے گئے ہیں لیکن کلیساؤں کی بے جا مداخلت بھی اُس طلسم کو نہیں توڑ سکی جو بیکراں فراخی سے پیدا ہوتا ہے۔

مسجد کی وجاہت لازوال ہے، انسان اندرونی حصے کی زیبائی دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے، امتدادِ وقت نے بہت سے نقش و نگار مٹا ڈالے، دولتِ قرطبہ برباد ہوئی تو زبرجد کے ستون اور چاندی کے جھاڑ گرجوں کی زینت ہوئے، آبنوس اور ہاتھی دانت کا بنا ہوا بیش بہا

منبر پارہ پارہ کر دیا گیا لیکن ہجر میں تڑپتے ہوئے ویرانی اور شیشے کی پھول پتیاں پرانی آب و تاب کی یاد دلاتی ہیں۔

ہسپانیہ میں اموی سلطنت کے بانی عبدالرحمٰن اوّل نے آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ مسجد تعمیر کی۔ المنصور اور دیگر حکمرانوں نے گرانقدر اضافے کئے۔ رمضان کی راتوں میں مسجد اسلام کی عظمت کا مظہر ہوتی۔ پیتل کے فمعدانوں میں ان گنت بتیاں جگمگاتیں، صحن کے متوالوں سے صحن اور دالان پُر ہوتے۔ تسبیح و تراویح کے تواتر اور عنبر کی خوشبو سے فضا مہک اٹھتی۔

نصرانی ہونے کے باوجود اہلِ قرطبہ نے کلیسا بنانے کی مخالفت کی تھی۔ وہ آخر دم تک کہتے رہے کہ کلیسا کی تعمیر سے مسجد کی خوبصورتی تباہ ہو جائے گی لیکن آرچ بشپ نے اُن کے خلاف فیصلہ دیا۔ دو برس بعد آرچ بشپ وہاں سے گزرا تو اسے پہلی مرتبہ مسجد دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اپنے کئے پر متاسف ہوا اور اس نے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا مسجد اتنی حسین ہے تو میں کبھی کلیسا کی تعمیر کا حکم نہ دیتا" یہ روایت قرطبہ کے میونسپل ہال میں ایک دستاویز کی شکل میں محفوظ ہے۔ ہمارے راہبر نے کہا "مسجد کے بیچوں بیچ کلیساؤں کی تعمیر افسوس ناک ہے لیکن مجھے یہ سوچ کر اک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ اگر یہ کلیسا نہ ہوتے تو شاید اس مسجد کا بھی وہی حشر ہوتا جو قرطبہ میں چھ سو مساجد اور سات سو حماموں کا ہوا۔ یعنی ڈھونڈھے سے بھی اس کا نشان نہ ملتا۔"

حاکم وقت ابن ابی عامر المنصور نے مسجد کی توسیع کی تو عام مزدور کی طرح ٹوکری ڈھوئی اور کدال سے کھدائی کی۔ المنصور جس نے بے شمار جنگیں لڑیں لیکن کبھی شکست نہیں کھائی، جو شوقِ شہادت میں ہر جنگ میں کفن ساتھ رکھتا تھا، چشمِ تصور نے دیکھا عمامہ باندھے عربی شہسوار اپنی آرام گاہوں سے نکل کر کہہ رہے ہیں "باری تعالیٰ! تو نے اپنے دیوانوں کو دیکھا، جہاں ایک ستون ہوتا ہم نے وہاں نصب کئے، دراز قامت مجلّا ستون قطار اندر قطار اور اُن پہ سایہ فگن محرابوں کے خیاباں، تیرے عشق میں ہر مشقت راحت تھی، تیرے نام لیوا کب کے ختم ہو چکے لیکن در و دیوار پر سونے کے جلی حروف آج بھی حمد و ثنا کر رہے ہیں ؎

شعلہ بودیم شکستیم و شرر گردیدیم
صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم"

اقبال کی طویل نظم 'مسجد قرطبہ' اسی ذوق و شوق کی آئینہ دار ہے۔ 'اندلسی نظموں' میں اقبال کھوئے ہوؤں کی جستجو میں نکلتے ہیں۔ راہِ محبت کا یہ راہرو اہلِ صفا کی تلاش میں سرگرم سفر ہوتا ہے۔ پڑھنے والے پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی جذبہ اس سرزمین میں کشاں کشاں لے آیا تھا۔ اقبال کی نظر میں سلسلۂ روز و شب ہی اصل حیات و ممات ہے ؎

من حیاتم من مماتم من نشور
من حساب و دوزخ و فردوس و حور

روز و شب کا لامتناہی سلسلہ تند رو میں ڈھل کر دریائے تخریب ہوتا ہے، اس کے سامنے سعیٔ انساں ہیچ ہے لیکن عمل کی پرکھ بھی اسی سے ہوتی ہے۔ حق و باطل، خوب و ناخوب کی پرکھ، زرِ کم عیار رد کر دیا جاتا ہے۔ جریدۂ عشق پہ مہرِ دوام ثبت ہوتی ہے، معجزہ ہائے ہنر ہوں یا نقشِ کہن و نو سب کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ کی زد میں ہیں۔ پھر اقبال منفی سے مثبت کی طرف اٹھتے ہیں، وہ ایسے فن پارے کو لازوال ہونے کی بشارت دیتے ہیں جس کی اساس عشق پر ہو۔ عشق وقت کے تصادم و تلاطم کے خلاف ڈھال ہے۔ وقت کا بے رحم ریلا گزر چکا، مسجد کا جاہ و جلال

پائندہ ہے،
زندگی کا دھارا پیہم دواں ہردم رواں ہے لیکن من حیث زمان ومکاں، زمان ومکاں کی کوئی وقعت نہیں، یہ محض خودی کے مظاہر ہیں۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَانٍ (سورہ الرحمٰن)

وہ (باری تعالیٰ) ہر لحظہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے

زنجیرِ ایام سے یہی دکھلانا مقصود تھا۔

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　که ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

ناتمام کائنات بتدریج ارتقا کی منازل طے کر رہی ہے، تخلیقی مقاصد کے حصول میں بندۂ مولا صفات خالقِ حقیقی کا ممد ومعاون ہے عظیم کام کی انجام دہی میں انسان کی شخصیت ذات کے ساتھ متصل ہوتی ہے، جب تک کائنات اور انسانیت معراجِ کمال تک نہیں پہنچتیں مومن کی تگ ودو ختم نہیں ہوگی،

اقبال نے مسجد کو کسی مادی چیز سے تشبیہ نہیں دی، اُن کے نزدیک وہ ایسی مناسبت سے ماوراء ہے، عظیم مسجد کے جلال وجمال میں اقبال کو مردِ خدا کے خد وخال نظر آئے، حسن میں مسجد قلبِ مسلماں سے مشابہ ہے..... قلبِ مسلماں جو انوارِ ذات کی جلوہ گاہ ہے، جو حق پرستوں کے لئے نعمت ہے لیکن باطل کے خلاف ازل سے برسرِ پیکار ہے۔

اشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (سورۃ الواقعۃ)

وہ کفار کے حق میں بہت سخت ہیں لیکن آپس میں رحم دل

مسجد کی رفاقت میں شاعر کو یکسوئی حاصل ہوئی، فضاؤں میں ایک غیر مرئی پاکیزگی تھی، یکایک نہاں خانۂ دل نغمے کی جھنکار سے گونج اٹھا۔ زمین و آسماں منور ہو گئے۔

تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیلؑ

تاریخ کے گم گشتہ اوراق نظر کے سامنے تھے؛ اقبال نے اُن مجاہدوں کو پکارا جو اندلس میں فاتح بن کے آئے لیکن عالی ظرفی، رواداری اور شائستگی میں نئی اقدار کے نقیب تھے، اُسے اُن صحرا نشینوں کی یاد نے ستایا جو خبر اور نظر میں ہم آہنگ تھے، جن کے لئے اذانِ سحر کیف ومستی کا پیام لاتی تھی۔

ساقی بہ صبوحی نفسی پیشتر از صبح
برخیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم　　قدسی

جبینِ نیاز میں تڑپتے ہوئے سجدے خاک میں روپوش ہو گئے، مسیحا نفس اذانیں بادِ سحر میں تحلیل ہو گئیں، پھر زمان ومکاں کے فاصلے شاعر کے دل میں سمٹ آئے، وقت، شاعر اور ابدیت کی تثلیث، وقت اور ابد کے درمیان مسجد قرطبہ نقطۂ ارتکاز تھی، حکمت واد بار کی صبر آزما صدیاں ایک لمحے میں مرتکز ہو کے رہ گئیں۔

انقا کے فیضان سے مقام و وقت کی سرحدیں معدوم ہوگئیں۔ دنیاوی بندھنوں کی گرفت سے آزاد ہوکر شاعر کو وہ لمحۂ منزہ میسر آیا جس میں ماضی، حال اور مستقبل ایک وحدت میں ضم ہوتے ہیں، ایسے میں کہے گئے کلام کی آفاق گیر پہنائی اُس کے لازوال ہونے کی ضمانت تھی، وجدانی لمحات میں اِک وکمپاڈو ع نے وہ رفعتیں چھوئیں جن تک از خود پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔

وہ خیالِ عظیم، جس کی گونج رہتی دنیا تک سنائی دے کس طرح روح کی گہرائیوں میں جنم لیتا ہے۔ الہامی کیفیات کے نزول سے پہلے شعور و لاشعور کی دنیاؤں، روح نے مدتوں دکھ جھیلے ہوں گے، برسوں کرب سہا ہوگا۔

جوہرِ اندیشہ دل خوں گشتنی درکار داشت — غالب

بالآخر ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور درد کا لاوا بہہ نکلا۔ اُس دل فروز فضا میں اک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک بلند ہوئی، اِک 'کافر ہندی' کی صدا جس کے رگ و پے میں نعرۂ اللہ ہو شعلہ زن تھا۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

کیا یہ حرم مرتبت سجدہ گاہ ہمیشہ بے اذاں رہے گی؟ عاشقانِ دردمند کا قافلہ کہاں بھٹک گیا؟ میرے اللہ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں؟

بگوشم می رسد از دور آوازِ درا امشب
دلِ گم گشتہ دارم کہ در صحراست پنداری — غالب

شاعرِ مشرق شاعرِ اُمید بھی ہیں، خونِ صد ہزار انجم سے سحر پیدا ہونے کی نوید دینے والے نے کنارِ کبیر عالم تو کر بے نقاب دیکھا اور روحِ مسلماں میں اضطراب کو نیک شگون جانا لیکن فخر سے سر اونچا کر کے

در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست
ملتِ اسلامیاں بود است و ہست

بجھنے والا بے چراغ مسجد دیکھ کے تڑپ اُٹھا، ایک لمحے کے لئے رجائیت بادل کی اوٹ میں آگئی۔

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

اسے نیرنگیٔ زمانہ کہہ لیجئے لیکن دُنیا بھر میں ہسپانیہ ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں صدیوں اذان کی صدا بلند ہوئی لیکن جہاں آج ایک کلمہ گو بھی باقی نہیں!

سلطان سعود ہسپانیہ کا سرکاری دورہ کر رہے تھے، جب وہ اپنی جماعت کے ساتھ مسجدِ قرطبہ میں داخل ہوئے تو نماز کا وقت ہوگیا۔ سلطان نے نماز ادا کرنے کے لئے پروٹوکول کے افسران سے اجازت چاہی، انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ مسجد کلیسا میں تبدیل ہو چکی ہے۔ سلطان کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ انہوں نے کہا "میں اُس رسولؐ کی اُمت سے ہوں جس نے نصرانیوں کے وفد کو مسجدِ نبوی میں عبادت کرنے کی اجازت دی اور تم مجھے اپنی مسجد میں نماز ادا کرنے سے روکتے ہو؟" سلطان نے ایک مصاحب سے اذان دینے کو فرمایا اور یوں سات صدیوں بعد مسجد کی خاموش فضاؤں میں اذان کی صدا گونجی۔

مدینۃ الزہرا کے بغیر قرطبہ کی داستان تشنہ رہے گی، خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے اپنی محبوبہ زہرا کی یاد میں قرطبہ سے تین میل اس
مرادیمانہ کی بنیاد رکھی، رنگین سنگِ مرمر دنیا کے مختلف حصوں سے لوایا گیا۔ سلاطین قسطنطنیہ اور روم نے ستونوں کے تحائف بھیجے۔ آبنوس افریقہ
سے، خوشبودار لکڑی مشرق سے، سونے کے جاڑھ، معلوم ہال کرے۔ سالم سنگِ ساق سے ترشا ہوا پارے سے لبریز حوض، اپنے عروج
پر قصرِ زہرا دنیا کے نوادر سے بھرپور تھا، یہیں سفیر باریاب ہوتے اور خلیفہ صوبائی حکام کی رپورٹیں سنتے۔

شہر تین مدارج پر بنا تھا، شاہی محل بلندی پر تھا، اس کے قرب وجوار میں اُمرا کی رہائش گاہیں تھیں نچلے درجے میں چمن اور باغات تھے اور زیریں حصے میں دفاتر اور شاگرد پیشہ، دارالحکومت کے لئے شہری منصوبہ بندی کا شاید یہ پہلا منصوبہ تھا، یوں یہ شہر کینبرا اور برازیلا کا پیشرو تھا، مدینۃ الزہرا کی زندگی مختصر تھی۔ اس کی تکمیل چالیس برس میں ہوئی پچاس برس بعد یہ مشقتِ رفتہ کی نظر ہو گئی، اس دلہن کا سہاگ بربروں کے ہاتھوں لٹا تھا، تہذیب و تمدن سے ناآشنا افریقی سپاہی ایک سیلاب کی طرح اس حسین مرقع پر ٹوٹ پڑے اور وحشیانہ نفرت کے ساتھ آرائش و زیبائش کی دھجیاں اڑا دیں، پھر اس لٹے ہوئے شہر کو دیا سلائی دکھلا دی، آج مختلف سطحوں پر گھاس کے بیچ ٹکڑے باقی ہیں، اندلس باقی ہو بس!

کئی سو برس بعد تک جھیلیں اور باغات باقی تھے، شاعر ابنِ زیدون شہزادی ولیدہ کو وہ خوشگوار لمحات یاد دلاتا ہے جو اس کی صحبت میں بسر ہوتے جب عالمِ خیال میں انہوں نے اجڑے ہوئے قصر پھر سے تعمیر کئے تھے،

یادِ ایامے کہ با او گفتگو ہا داشتم
اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنا　　　گرامی

قرطبہ کی شہزادی ولیدہ حسن و جمال کے علاوہ شاعری میں یکتا تھی۔ مشہور شاعر ابنِ زیدون کو محبت کرنے کی پاداش میں جلا وطن ہونا پڑا تھا

زیرِ زمین گنج ہائے گراں مایہ صدیوں تعصب اور غفلت کا شکار رہے۔ کھنڈرات اب پیہم ظاہر ہو رہے ہیں، فرینکو کا محکمۂ آثارِ قدیمہ ٹکڑوں اور ٹھیکریوں کی لمبی قطاریں لگائے ہوئے تھا، یہ توقع عبث ہے کہ ہسپانوی قصرِ زہرا کو اصلی حالت پہ لا سکیں گے آج کل کے صناع ویسے منقش ستون یا ظروف تک بنانے سے قاصر ہیں، اسی لیے وہاں ایک عجائب خانے پہ اکتفا کر رہے ہیں۔

اشبیلیہ، اندلس کی روحِ معطر، بنی امیروں کا مغرور دارالسلطنت جہاں فضا یاسمین اور گلاب سے مہکی ہوئی ہے، سنہری مچھلیاں آب آلود حوض کے شفاف چشموں میں ابھرتی ہیں۔ "القصر" کا دیوان السفیر شوکتِ رفتہ کا راز داں ہے، وہاں گھومتے ہوئے ایک ہسپانوی نے شکوہ کیا خلیفہ حرم میں لاتعداد بیویاں باندیاں رکھتے تھے۔ رنگ رلیاں مناتے تھے اور بے چاری عیسائی رعایا ٹیکس ادا کرتی تھی، بھائی سچ ہے لیکن شمال میں عیسائی حکومتوں کے حالات کون سے بہتر تھے۔ آج بھی اک مجہول معاشرے کے طفیل حسن سرِ بازار نیلام ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اقتدار نے دوسرے روپ دھار لئے ہیں۔

اشبیلیہ میں آسودگی ہے، مسکراہٹیں ہیں۔ شام کو پلازا میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے لیکن مجھے ایک زریں عہد کی یاد یہاں لے آئی تھی۔

یہ ٹریجک ہیرو معتمد کا اشبیلیہ ہے۔ میدانِ جنگ کو روانہ ہونے سے پیشتر وہ "القصر" کے وسیع صحن میں فوج کا معائنہ کرتا تھا۔ تلواروں کی خیرہ کن چمک میں عسکری پھریرے لہراتے۔ عربی النسل گھوڑے آقاؤں کے منتظر ہوتے۔ ڈھول بجتے، لوگوں کو روتا چھوڑ کر

فرماں روا نہ ہو جاتی، شمشیر زن معتمد اجنگ زلاقہ میں اُس کی ران تلے تین گھوڑے کام آئے، زرہ بکتر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن جو سامنے آیا زیر ہوا۔

گر دو پیش شکست و ریخت کا سلسلہ جاری تھا۔ تاریخ کے اس المناک موڑ پر، پیش آنے والی تحقیر و تذلیل سے پہلے خبر معتمد، عظیم الشان تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی طور ہارون الرشید کے بغداد سے کم نہ تھی، علم دوست، علم پرور معتمد اعرب ہسپانیہ کا عظیم ترین شاعر جو بیک وقت حکومت عشق اور شاعری کر سکتا تھا۔

ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق

بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اُس کی اصیل       اقبال

سیاست دانوں اور سپہ سالاروں کی بجائے معتمد کو شعرا اور موسیقاروں کی صحبت مرغوب تھی، ایک روز وہ اپنے شاعر دوست ابنِ عمار کے ساتھ کنارِ دریا ٹہل رہا تھا، شعر گوئی ہو رہی تھی، معتمد نے ایک مصرع کہا۔ پیشتر اس کے کہ ابنِ عمار جوابی مصرع کہتا کپڑے دھوتے ہوئے ایک حسین کنیز نے برجستہ مصرع کہہ دیا، اس ادا پر فریفتہ ہو کر بادشاہ نے اُسے اپنے عقد میں لے لیا۔ شاہی محلوں میں رومیکیہ کے قہقہے گونجتے رہے۔ معتمد کی راتیں اُس کی رعنائیوں سے روشن تھیں۔ رومیکیہ نے جلاوطنی میں معتمد کا ساتھ دیا اور مراکش کے قریب اُس کے پہلو میں دفن ہے۔

مسلم ہسپانیہ میں گیارھویں صدی عیسوی طوائف الملوکی کا زمانہ تھا، اندلس تیئس طائفوں میں بٹ گیا تھا جو باہمی آویزش اور اندرونی خلفشار کا شکار تھے، اس پُر آشوب زمانے میں بھی اہلِ علم کا شغف کم نہیں ہوا تھا، بادشاہ کا محل ہو یا غریب کی کٹیا ہر جگہ شعر و شاعری کا چرچا تھا، ستاروں کے اس جھرمٹ میں اشبیلیہ درخشندہ ترین ستارا تھا۔ افسوس شعر و سخن کی حسین بہار دولتِ مستعجل تھی، جب پے بہ پے یورش کر کے نصرانی حکمران مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رہے تھے اقصائے مغرب میں ایک تابناک ستارا اُبھرا، شمال مغربی افریقہ کا فرمانروا اور عظیم فاتح یوسف بن تاشقین جسے ہسپانیہ میں ملتِ اسلامیہ کا محافظ ہونا تھا، جس نے دور افتادہ صحراؤں سے تازہ دم بربروں کو منظم فوج کے سانچے میں ڈھالا، یوسف بن تاشقین معتمد کے بلاوے پر مراکش سے آیا کہ عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے سیل کو روکے، جنگِ زلاقہ میں الفانسو نے مُنہ کی کھائی لیکن مسلمان حکمران آپس میں دست بگریباں رہے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے نصرانی حکومتوں سے ساز باز کرتے رہے، جب نصرانی فوج کے ہاتھوں خواتین کی عصمت محفوظ نہ رہی اور مسلمان غلام ہو کر بکنے لگے تو یوسف بن تاشقین نے اسلامی حکومت کی حفاظت کے لئے ہسپانیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ معتمد جس نے عیسائیوں کا آلۂ کار بننے کی بجائے مسلمانوں کی محکومی کو ترجیح دی تھی، جس نے قشتالیہ میں سؤروں کی نگہداشت کی بجائے افریقہ میں اونٹوں کا چروانا پسند کیا تھا آخر حرص و آز کے دام میں آ گیا اور اپنا تخت بچانے کے لئے الفانسو سے مدد کا طالب ہوا۔ یوسف بن تاشقین کے نائب ابوبکر نے اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا، معتمد مردانہ وار لڑا لیکن تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا شکست کھا کر قید ہوا۔

مردِ حُر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج

معتمد ابن اللبانہ کا مربی تھا، قیدی کی حیثیت سے اُس کی اشبیلیہ سے روانگی کا دردناک منظر ابن اللبانہ نے نظم کیا ہے:۔

سب باتیں یاد سے محو ہو جائیں گی
لیکن آہ! وادالکبیر کے کنارے وہ قیامت خیز صبح
اسیر جہازوں میں یوں دبکے تھے جیسے مُردے اپنی قبروں میں
دونوں کناروں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔
وہ دیکھ رہے تھے کہ آبدار موتی دریا کی جھاگ پر کیسے تیرتے ہیں!
دوشیزاؤں نے نقابیں الٹ دیں: چہرے ڈھانپنے کی ضرورت نہ تھی
چہرے نوچ لئے گئے جیسے کہنہ عبا تار تار ہو جائے
وہ جانکاہ لمحہ آن پہنچا۔ الوداع کہنے والوں کا شور
کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی
نالہ و شیون میں نازک اندام حسین اور تنومند بہادر برابر تھے
آہیں اور ہچکیاں جہازوں کی ہم سفر ہوئیں
جیسے ساربان سست کارواں کو حُدی خوانی کی مہمیز دے
آہ کتنے آنسو دریا کی نظر ہوئے
چپّو چلانے والے غلام
کتنے شکستہ دل اپنے ساتھ لے گئے
اور انھیں خبر تک نہ ہوئی!

معتمد جو فی البدیہہ مصرع چُست کرنے پر ایک کنیز پر عاشق ہو گیا تھا۔ جس نے قصیدہ کہنے پر ایک شاعر کو ایک ہزار دینار دئے تھے مراکش کے قریب اغمات میں مقید رہا، پا بجولاں اور نادار، اس کے آخری ایام بہت تلخ تھے۔ اس کی نازو نعمت میں پلی ہوئی بیٹیاں گذارے کے لئے سُوت کاتتی تھیں، اُن دنوں ایک مقامی شاعر حصری نے اس کی تعریف میں چند اشعار لکھ بھیجے معتمد نے اُسے چاندی کے پینتیس سکّے بھجوا دیئے اور تحفے کی کم مائیگی کے لئے معذرت چاہی، یہ آخری پونجی تھی جو جلا وطن ہوتے وقت وہ اپنے خون آلود موزے میں چھپا لایا تھا، معتمد کی بہترین نظمیں جلا وطنی میں لکھی گئیں، وہ آخر دم تک شعر کہتا رہا، اس کے یہ اشعار کتبۂ مزار ہو سکتے تھے۔

آہ وہ سہانا خواب!
کہ شباب کی تیغِ آبدار کبھی زنگ آلود نہ ہو گی
ہم نے سراب سے چشمہ مانگا، ریت سے گلاب کی تمنا کی
زندگی کے معمّے لاینحل رہیں گے اور
بالآخر خرد خاک کا بستر بنائے گی

---

غرناطہ جاتے ہوئے گاڑی میں ایک سفر بہ تمام ہسپانوی خاتون رات بھر باتیں کرتی رہی، نیند کا جھونکا آتا لیکن بڑی بی کے مسلسل شور مچانے سے آنکھ کھل جاتی، بہرکیف غرناطہ پہنچتے ہی ساری کلفت دُھل گئی۔

فطرت اور فن کا امتزاج غرناطہ کو رعنائی و زیبائی بخشتا ہے، پس منظر میں سیرا نوادا کی برف پوش چوٹیاں ہیں، اڑھائی ہزار فٹ کی بلندی پر ایک خوبصورت شہر اور اُس کے قدموں میں پھیلا ہوا زرخیز میدان۔ قصرِ الحمرا پہاڑی پر ہے، قلعہ اٹک کی طرح فصیل اور مینار سطحِ مرتفع کے نشیب و فراز طے کرتے ہوئے دریا تک چلے گئے ہیں۔ نشیب میں شہتوت کے جُھنڈ ہیں اور سدا بہار اشجار جن کی آبیاری سیرنوا سے پگھلی ہوئی برف کرتی ہے۔ جنارلیف — جنت العارف — الحمرا کا نشاط باغ ہے۔ گھنے قد آور درخت، بیا رسے گلبن، وارفتگی یہاں اپنے خزانے لُٹاتی ہے۔ جنارلیف نہروں اور چشموں کے سنگم پر ہے، شفاف آبِ رواں پھولوں اور خوشبو دار جھاڑیوں میں کھو جاتا ہے۔ ہر بند صحن چمن میں عہدِ رفتہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے، عنادل نوحہ خواں ہیں جیسے ہُو حق ویران گھر کا ماتم کر رہے ہوں۔

محمد ابن نصر الاحمر شہابِ ثاقب کی طرح اندلس کے اُفق پر اُس وقت نمودار ہوا جب ہسپانوی مسلمان خانہ جنگی میں مصروف تھے اور عیسائیوں کے ہاتھوں شکستیں کھا رہے تھے، الاحمر نے جس خانوادہ کی بنیاد رکھی اُسے اندلس میں نصرانی اقتدار کے اڑھائی سو برس بعد تک حکومت کرنا تھی۔ اس فاتح کو جب لوگ 'غالب' کہہ کر پکارتے تو اُس کا جواب ہوتا لاغالب الا اللہ۔ یہ ابدی حقیقت الحمرا کے گوشے گوشے میں مرتسم ہے گو مرورِ زمانہ سے تحریر مدھم ہو گئی ہے۔

واشنگٹن اروِنگ نے کہا تھا "چاندنی رات میں الحمرا کا حُسن مسحور کر دیتا ہے"۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے سحر میں اسیر ہوئے بغیر قصر کی تعریف کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ الحمرا میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے انسان پریوں کی دُنیا میں آ گیا ہو، سورج کی شعاعیں اِس مرقع کو رنگوں میں رنگ دیتی ہیں، پچی کاری سے آراستہ ہال کمرے، منقش چھتیں، سنگِ مرمر کے ستون جن پر طغرا وی گلکاری ہو رہی ہے۔ قوسیں نازک ستونوں سے ابھرتی ہیں اتنے نازک کہ تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنا بوجھ کیسے اُٹھائے ہیں، چھتوں اور دیواروں پہ نایاب چوبی ٹکڑیاں یوں جڑی ہیں کہ دیکھنے والا پیچ و خم میں کھو جاتا ہے، رنگوں کی بوقلمونی اور ٹکڑیوں کے رد و بدل سے بیک وقت توازن اور تنوع کا تاثر ملتا ہے۔ آرائشی مرقعوں کے اردگرد اور وسط میں آیات وابیات فنِ خطاطی کا بے مثل نمونہ ہیں، یہ بیل بوٹوں کے ساتھ یوں مدغم ہوتے ہیں کہ ذہن متوجہ نہ ہو تو محض نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں، کثرتِ زیبائش کے باوجود نفاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، لاغالب الا اللہ کی تکرار ہر جگہ ملتی ہے، کوفی حروف میں یہ عبارت یوں لکھی ہے کہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسے ملک میں جہاں لوگ سورج کی تمازت سے جھلس جاتے ہیں زیریں حصّے کے لیے ہلکے ثانوی رنگ مخصوص تھے جن سے آسودگی کا احساس ہوتا ہے، استرکاری کے لیے مونیگوں، سنہرا اور شنگرفی رنگ استعمال کرتے تھے تاکہ بالائی حصّے کی آب و تاب نمایاں ہو، محرابدار چھتیں زیبائش کی بہترین مثال ہیں، شش پہلو آرائش میں ہزاروں خانوں کو جلا دی گئی ہے، کمیال کی طرح ایک خانہ دوسرے سے الگ تھلگ لیکن وحدت کا تاثر دینے کے لئے سب ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں،

ایوان السفیر کا سنہرے پھول کی طرح کھلتا ہوا، ہموار گنبد جیسے بادل ساکت ہو گئے ہوں یا ٹڈی دل یلغار کر گئے ہوں اور اوپر سنہری چھتری تن جائے، ٹھوس ہونے کی بجائے ہلکا اور سُبکسار، صحن رضا میں کھجور کی شاخ ایسی سبک قوسیں ستونوں سے اُبھر کر خیرہ کن رعنائی کا

منظر پیش کرتی ہیں، دیوار پر سنہرا کام جیسے سورج کی شعاعیں طلاکاری میں ڈھل جائیں یا پتھر پہ کروشیا اور سوزن کاری کا باریک نمونہ ہو۔ نازک ہونے کے باوجود الحمرا کے محلات سات سو برس سے قائم ہیں۔ کارلوس پنجم نے ایک بے ہنگم سنگین محل الحمرا کے زیریں حصے میں بنوایا جس کا بھونڈا پن ذوقِ نظر کا خون کرتا ہے، موروں کے ذوقِ تزئین کے ساتھ یہ اچھا خاصا مذاق تھا۔

الحمرا کے معمار عرب خیمے سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے، ہوا دار اور لطیف خیمہ گاڑنے کے لئے نیزوں کی بجائے ترشے ہوئے نازک ستون! وہ سنگِ مرمر تراشتے رہے حتیٰ کہ ستون پھول کے غنچے کی طرح نازک ہو گئے، مشجر کی جگہ دیوار پر زردوزی، ہم آہنگ رنگوں سے ہر چیز فضا میں تیرتی معلوم ہوتی ہے، سیمیں آبشار کی مدھم آواز بھی منظر کا حصہ ہے، الحمرا کے خاموش ایوان اس تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔

جب غرناطہ پر ہلالی پرچم لہراتا تھا، انہی ایوانوں میں ایک مردِ حُر کی آواز آخری بار گونجی تھی: "فرڈیننڈ اور ازابیلا کے وعدوں کا اعتبار نہ کرو، اہلِ قشتالیہ نے کب وعدے ایفا کئے، تمہارا ناموس کوڑیوں کے مول نیلام ہو گا۔ اگر کچھ حمیت باقی ہے تو میرے پیچھے آؤ، بہادروں کی طرح میدان میں کٹ مرنا غلامی کی کربناک زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔" موسیٰ بن ابی الغزان کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر اس کے پاس لوٹ آئی، ابو عبداللہ اور اس کے امرا کی نظریں زمین میں گڑی رہیں، غیرت و حمیت کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ "جو اللہ کی مرضی" موسیٰ نے گھوڑے کو ایڑ دی، گھوڑے کے سُم پختہ فرش سے ٹکراتے ایک اندوہناک خاموشی کو چیرتے ہوئے گزر گئے، فصیل کے باہر اس کی مڈ بھیڑ عیسائی جنگجوؤں کے ایک دستے کے ساتھ ہوئی، دست بدست لڑائی میں اس نے چھ سات کو ابدی نیند سلا دیا، خود زخموں سے چُور ہو کر دریا میں کود پڑا اور زرہ بکتر کے بوجھ سے اس کی گہرائیوں میں اتر گیا۔

غرناطہ کے شجیع شہر سے باہر حریفوں کو للکار کر دادِ شجاعت دیتے، وہ شیولری کے آداب ملحوظ رکھتے تھے، موسیقی کے دلدادہ، ہم پلہ حریف سے جنگ، بیکسوں کی حمایت . . . . . . . . چودھویں صدی عیسوی میں الفانسو نے شاہِ غرناطہ یوسف کے خلاف فوج کشی کی اور جبل الطارق کا محاصرہ کر لیا، محاصرہ جاری تھا کہ الفانسو طاعون کا شکار ہو گیا، مور بہادروں نے جنگی کارروائی بند کر دی تاکہ ماتم کی رسومات ادا ہو سکیں، جب سوگوار نصرانی اپنے بادشاہ کی میت سے چلے تو اشبیلیہ تک مور افواج کے سپہ سالاروں نے یہ قافلہ اپنے علاقوں میں سے بلا تعرض گزرنے دیا، کیا عجب دشمنوں کو بھی اعتراف تھا "ہمارے مور حریف انسانیت اور شجاعت کے آداب سے آگاہ تھے۔"

ہسپانویوں کا 'بوب دل'، اہلِ غرناطہ کا 'سلطان الصغیر'، سر جھکائے آہستہ آہستہ جا رہا ہے، حرماں نصیب ابو عبداللہ، زوالِ اندلس کی مجسم تصویر، غرناطہ کے آخری فرمانروا نے اپنی ماں عائشہ کے زیرِ اثر ایک مطلق العنان حکومت کا خواب دیکھا تھا، اس کی خاطر اس نے فرڈیننڈ کی کٹھ پتلی بننا منظور کیا اور اپنے جری باپ مولائے حسن کے خلاف بغاوت کی اور بغاوت بھی اس وقت جب وہ اہلِ قشتالیہ سے الحمہ چھیننا ہی چاہتا تھا، مولائے حسن جس نے خراج طلبی پر فرڈیننڈ کو کہہ بھیجا تھا "باجگزار فرمانروا مر گئے، اب ہماری ٹکسال میں سکوں کی بجائے شمشیر و سناں تیار ہوتے ہیں۔"

سقوطِ غرناطہ کے بعد ابو عبداللہ جلاوطنی کے دن گزارنے وادیٔ برجینہ کی سمت جا رہا تھا، مڑ مڑ کر بعد حسرت الحمرا کی طرف دیکھتا، کچھ دیر بعد وہ پارول کی چوٹی پر ٹھہر گیا اور آخری نظر اپنے محبوب شہر پر ڈالی، سرو مسلمانوں کے مقابر پر جھوم رہے تھے، گلستانوں کی آغوش میں قصرِ الحمرا جلوہ گر تھا، دور افق پہ بیکراں سمندر تھا جس کی موجیں چیر کر طارق اور موسیٰ کے جانباز ایک اجنبی

ملک مسخر کرنے آتے تھے، اُسے ہتا دیکھ کر ابو عبداللہ کی ماں نے کہا: "جس ملک کو بچانے کے لئے تم نے جان کی بازی نہیں لگائی اُسے کھو دینے پر عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو"

غرناطہ کا زوال تدریجی نہیں ہوا، موروں کے زیر نگیں رقبہ ہر شہر شکست کے بعد دھڑام سے نیچے آ رہا، وہ اُمٹ کھسوٹ جو فرڈیننڈ اور ازابیلا نے شروع کی تھی اُن کے پوتے کارلوس پنجم کے عہد میں وسیع پیمانے پر ہوئی، فن کے نادر برباد کر دیئے گئے، "وحشی" موروں کے آثار ایک ایک کرکے مٹا دیئے گئے۔

ہسپانوی مورخوں کا ایک گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ انہوں نے عربوں سے ورثہ میں کچھ نہیں پایا، نہ ہی کسی چیز کے لئے وہ اُن کے احسان مند ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ سات سو برس تک حکومت کرنے کے باوجود مور اُن کی ثقافت اور طرزِ معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوئے، یہ نظریہ محلِ نظر ہے، اس دور میں بھی ہسپانوی باغوں میں مور طرز کی جھلک نظر آتی ہے، اشبیلیہ میں پلازا ہسپانیہ کی عظیم ترسس اور حاشیے پر ستونوں اور محرابوں کی قطاریں مور فنِ تعمیر کی یاد دلاتی ہیں، یہ چوک ۱۹۲۹ء کی نمائش کے لئے بنایا گیا تھا، عربوں کی طرح ہسپانوی کھانا پکانے کے لئے زیتون کا تیل استعمال کرتے ہیں جس کی تیز مہک ہر مطبخ سے اٹھتی ہے "خوش دل و گرم اختلاط" اس حد تک کہ زبان سے اجنبیت کے باوجود بات کرنے پر اصرار کرتے ہیں، ہر نو وارد کو خوش آمدید، ٹرین سے اترتے وقت فرداً فرداً الوداعی سلام، "منانا" "آج نہیں" کا بکثرت استعمال یعنی آج کا کام کل پہ ڈالئے! اور لنچ کے بعد طویل قیلولہ، قصہ مشہور ہے کہ گرمیوں میں ایک امریکن تاجر ایک سرکاری ادارے کی گھنٹی بجاتا رہا، کواڑ کھٹکھٹاتا رہا لیکن دیر تک جواب نہ ملا، عرصے بعد ایک اونگھتا ہوا چابی بردار نمودار ہوا تو امریکن نے پوچھا:

"یہ لوگ دوپہر کے بعد کام نہیں کرتے؟"

"جناب یہ لوگ صبح کے وقت کام نہیں کرتے، بعد دوپہر تو دفتر ہی نہیں آتے!"

مستشرق رائبیرو کی تحقیق کے مطابق ہسپانوی زبان اور شاعری بلکہ تخیل اور احساسات عربوں سے متاثر ہوئے، ہسپانیہ اور مغربی یورپ کے لوک گیت اندلس سے وابستہ ہیں، سقوطِ غرناطہ کے بعد بھی کچھ مسلمان موسیقار باقی تھے جن کی دھنیں مغربی یورپ میں مقبول تھیں، عقیدہ میں اختلاف کے باوجود نصرانیوں اور مسلمانوں میں بہت سی اقدار مشترک تھیں، جہاں گیتوں میں ہسپانوی قوم کی شجاعت کا ذکر ہوتا ہے مور بہادروں کی تعریف ضرور ہوتی ہے۔

غرناطہ کے مضافات میں پہاڑ کاٹ کر خانہ بدوشوں نے رہائش کے لئے گپھائیں بنا لی ہیں جو رات کو بجلی کی روشنی میں جگمگ کرتی ہیں، جپسی رقاصہ بل کھا کھا کر تیزی سے رقص کرتی رہی، کبھی ایک انداز سے مجیرے بجاتی کبھی ہتھیلی کی تھاپیاں ٹکرا کر نغمگی پیدا کرتی، سامعین "اُسے اُسے" یعنی واللہ کہہ کر داد دیتے! ہمارا راہبر تیزی سے سفید شراب کے جام خالی کرتا رہا اور بڑھ چڑھ کے داد بھی اسی نے دی، شعلہ رخ مغنیہ نے "غرناطہ سے مور کی ہجرت" کا پُر سوز گیت چھیڑا ہے

سورج غروب ہو رہا تھا کہ غرناطہ سے چیخیں سنائی دیں
کوئی تثلیث کو پکار رہا تھا، کوئی رسولؐ کا واسطہ دے رہا تھا
قرآن رخصت ہوا، صلیب اندر لائی گئی

الحمرا کے میناروں سے ہلالی پرچم اتار پھینکا گیا۔

الوداع غرناطہ! اے بے مثل شہر

سات سو برس تو اہلِ ایمان کا گہوارہ رہا

افسوس اب کافر تجھ پہ نازاں ہوں گے

یہاں بہادر ناموسِ مصطفےٰ کے لئے جان دیتے تھے یا وطن کی آبرو پہ

یہاں باغات تھے، لہلہاتے کھیت تھے اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں۔

صد افسوس! روپ رخصت ہوا، پھول کملا گئے!

غرناطہ سے رخصت ہوتے وقت تحائف خریدنے کا خیال آیا، تین لڑکیاں دکانداری کے فرائض انجام دے رہی تھیں، خوش خلق ہنس مکھ اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے پہ مصر، لیکن زبان دیوار کی طرح راستے میں حائل تھی، زیادہ گفتگو اشاروں سے ہوئی، اُن کے اندازِ گفتگو میں عامیانہ پن نہ تھا جیسے فرانس یا اٹلی میں محسوس ہوا۔ چلنے سے پہلے میں نے سوچا ہسپانیہ سے کچھ تعلق جتلانا چاہئے لیکن زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔

"ہسپانیہ پہ کبھی مور حکمران تھے۔"

"جی؟" (لاعلمی کی مسکراہٹ)

"ہمارا موروں سے روحانی تعلق ہے۔ ہم بھی مسلمان ہیں۔"

"جی!" (ایک اور مسکراہٹ)

مسلمانوں کے آثار دیکھنے کے لئے ایک دوست کار سے ہسپانیہ پہنچے اور حد عبور کرکے دو سو کلومیٹر تک چلے گئے، مشروبات کے لئے رکے تو کیفے میں انہوں نے ایک اجنبی سے پوچھا "بھلا اب ہسپانیہ میں مسلمانوں کی کیا آبادی ہوگی؟" استعجاب اور بے یقینی کی پرچھائیاں ہسپانوی کے چہرے پر پھیل گئیں "اس وقت آپ کے سوا شاید کوئی اور نہ ہو!" یہ بات سن کے وہ اتنے آزردہ ہوئے کہ آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی الٹے پاؤں لوٹ آئے۔

مورخ نے اس سوال کا جواب تفصیل سے دیا ہے، عیسائی حکمران اندلس کی غلامی اور ہلال کے عروج پہ کڑھتے تھے، وہ عربوں کو کبھی معاف نہ کر سکے، بدعتوں سے متنفر بربر فلسفیوں کی عبارت حقارت سے دیکھتے تھے، یہ چکی کے دو پاٹ تھے جو عرب ہسپانیہ کو پیس دینا چاہتے تھے، طلیطلہ، قرطبہ، بلنسیہ، اشبیلیہ ایک ایک کرکے روشنیاں گل ہو گئیں مگر داستانِ خونچکاں کا آخری باب لکھا جانا باقی تھا، موت سر پہ منڈلا رہی تھی، عین اُس وقت جب فرڈیننڈ اور ازابیلا لڑکھڑاتی ہوئی سلطنت پر آخری ضرب لگانے کے لئے تیار تھے الزغل اور ابو عبداللہ کے درمیان دولت غرناطہ کا بٹوارہ ہو رہا تھا! پندرھویں صدی ختم ہوئی تھی کہ الحمرا کی آخری شمع ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی، ملکہ ازابیلا کی شاطرانہ چالیں بالآخر رنگ لائیں، سیدی یحیٰی اور الزغل جیسے جانباز مجاہد مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے ۱۴۹۲ء کے پہلے مہینے کی دوسری تاریخ تھی کہ نصرانی فوج غرناطہ میں داخل ہو گئی، فاتحین نے عہد نامے کی خلاف ورزی کی، کارڈینل کی سرپرستی میں مسلمانوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا، مسلمانوں کی اکثریت ہسپانوی نژاد تھی، انھیں یاد دلایا گیا کہ اُن کے آباؤ اجداد نصرانی تھے، عرصہ تک

سے پچھ مسلمان بظاہر عیسائیت کا دم بھرتے رہے لیکن سولہویں صدی میں شاہی فرامین کے ذریعے انھیں مذہبی طور طریق ترک دینے کی ہدایت کی گئی، سترھویں صدی کے آغاز میں پانچ لاکھ مسلمان کشتیوں میں سوار کر کے افریقہ کے ساحل کی طرف دھکیل دئے گئے، چونکہ ان میں بیشتر دستکار اور حرفت پیشہ تھے ہسپانیہ مدتوں اقتصادی بدحالی کا شکار رہا، ایک اندازے کے مطابق سقوطِ غرناطہ سے جبری انخلا تک تیس لاکھ مسلمان جلا وطن ہوئے یا تہ تیغ کئے گئے۔ یہ تھا ہسپانوی مسلمانوں کے مسئلے کا قطعی حل!

اہلِ بینش کو شکایت ہے کہ رُو بہ زوال قوم تاریخ کی اہمیت نہیں سمجھتی، قوتِ فہم سلب ہو جاتی ہے نوشتۂ دیوار پڑھنے کے باوجود لوگ افتراق و انتشار اور جنگ و قتال سے باز نہیں آتے، وقت کا دھارا بہتا رہا، اس تند و سبک سیل میں ایک پُرشکوہ تمدن اور جگمگاتے ہوئے شہر خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

دیدۂ خوں بار نہ رو! اس قوم کی ہلاکت لابدی تھی، اغیار کی عیاری، حکمرانوں کی بدعہدی، مسلسل خانہ جنگی اور خوں ریزی، بدظن رعایا، مضمحل معاشرہ، ایمان و ایقان کی روشنی بے نور ہوئی، آفاقی نظریے نسلی اور قبائلی جوہڑ کے کم آب میں گھٹ کے رہ گئے، بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے والے یاسیت کی پستیوں میں اُتر گئے۔

جنرل فرینکو نے اعتراف کیا تھا "ہماری جد و جہد کی تاریخ شاہد ہے کہ ہسپانوی زندگی کی اساس مذہب پر ہے، اگر مذہبی جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو موروں کے خلاف ہماری کوششیں بار آور نہیں ہو سکتی تھیں" اپنے تحفظ کی خاطر اقوامِ عالم نے مذہب کو اپنایا لیکن ملتِ اسلامیہ نے متعدد بار اس لیے انحراف کیا، اللہ نے حکومت کو اپنا انعام قرار دیا، ہسپانیہ کے مسلمانوں نے اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر نہ کی اور روئے جہاں سے مٹا دئے گئے، صداقت، عدالت اور شجاعت کا سبق بھلا دینے والے امامت کے سزاوار کیونکر ٹھہرتے؟

وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ؏ (سورہ محمدؐ)

اور اگر تم (ان حقائق سے) رُوگردانی کرو گے (تو تم بھی تباہ ہو جاؤ گے اور) اللہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا جو تم سے مختلف ہو گی۔

لاریب اللہ کا فرمان برحق ہے،

---

# قربانی کا بکرا

## سیّد انور

میں کراچی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ کراچی کہاں ہے؟ جہاں کراچی ہوتی تھی، وہاں بکرا پیڑی ہے اور میرے دوست کے اخبار کا دفتر کہاں ہے؟ جہاں میرے دوست کے اخبار کا دفتر تھا وہاں بکرا پیڑی ہے۔

اخبار کے دفتر کے دروازے میں ایک لمبا تڑنگا موٹا تازہ ڈب کھڑبا بکرا کھڑا تھا اور اس کے پاس ایک آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ اور دروازے کے سامنے لوگ جمع تھے۔

میں جلدی جلدی ہجوم کی طرف بڑھا۔

او ہو! یہ آدمی جو بکرے کے پاس بے ہوش پڑا ہے یہ تو میرا دوست ہے۔ یہ تو اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ اور یہ شخص جو اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا ہے، اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر ہے۔ اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مجھے بتا رہا ہے کہ ان کی بیگم نے دھمکی دی تھی کہ اگر یہ آج قربانی کے لیے بکرا خرید کر نہیں لائیں گے تو وہ ہمیشہ کے لئے اپنے میکے چلی جائیں گی۔ انہوں نے بکرے کی قیمت پوچھی تو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

اچھا ہوا! میرا دوست اسی قابل تھا۔ اس نے عہد نامۂ بکرا پیڑی کی خلاف ورزی کی تھی، اس کو اس کی سزا ملنی چاہئے تھی۔ اس نے حال ہی میں عہد نامۂ بکرا پیڑی پر دستخط کئے تھے۔ عہد نامۂ بکرا پیڑی کی رُو سے اس نے بقر عید کے دن قربانی سے توبہ کی تھی۔

پھر یکایک میری توجہ اُس لمبے تڑنگے موٹے تازے ڈب کھڑبے بکرے پر مرکوز ہو گئی اور میں اپنے دوست کو اور دوست کے اخبار کو اور اخبار کے دفتر کو بھول کر اُس کی طرف لگاتار دیکھنے لگا، دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔

اور مجھے اپنا ڈبّو یاد آ گیا، ڈبّو بالکل اس بکرے جیسا تھا، ایسا ہی لمبا تڑنگا موٹا تازہ ڈب کھڑبا، دونوں بکروں کے بالوں میں سفید اور سیاہ ڈبّے پڑے ہوئے تھے تھوڑا سا فرق تھا، اِس بکرے کے ڈبّے چھوٹے تھے۔ میرے ڈبّو کے ڈبّے بڑے تھے۔

اور پھر چند لموں میں پچھلے پندرہ سال کے وہ تمام واقعات ذہن کے افق پر اُبھر آئے جن میں ڈبّو نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔

ڈبّو کی ماں کا نام چتلی تھا۔ وہ ایک بڑی خوبصورت بکری تھی۔ اُس کے بدن پر بڑی خوب صورت سفید اور کالی چتّیاں تھیں، اُس کے ماتھے پر دو سفید نشان تھے، ایک چھوٹا گول سا، دوسرا بڑا المبوترا۔ لوگ کہتے تھے چتلی کے ماتھے پر چاند تارا بنا ہوا ہے۔ ایک اخبار نے چتلی کی دو تصویریں ایک نمایاں جگہ پر چھاپ دیں۔ ایک پروفائل میں۔ دوسری سامنے سے ماتھے کے ساتھ اور ان کے نیچے یہ لکھ دیا: گیندے گڈریے کے ریوڑ میں ایک ایسی بکری ہے جس کے ماتھے پر چاند تارا بنا ہوا ہے۔

گیندے گڈریے کی جھونپڑی میری جھونپڑی کے پاس تھی، میں نے سوچا میں خود جا کر اس عجیب الخلقت بکری کو دیکھوں گا۔

جس دن میں نے گیندے گڈریئے کی خبر پڑھی تھی، اُس دن میں بہت اداس تھا۔ میرے گھر میں تیرھواں بچہ پیدا ہونے والا تھا، اب میری جھونپڑی میں پندرہ افراد ہوں گے۔ مجھے کثرتِ اولاد کا غم نہیں تھا۔ اللہ کا فضل تھا۔ میں برسرِ روزگار تھا۔ ایک دفتر میں چپڑاسی تھا پہلے پہلے میں نے دفتر کے کام کے بعد اخباروں اور رسالوں میں کہانیاں لکھ کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب اخباروں اور رسالوں نے مجھے ایک پیسہ بھی نہ دیا، تو میں نے افسانہ نویسی چھوڑ کر عرضی نویسی، خطوط نویسی اور منی آرڈر نویسی شروع کر دی، اور صبح کو تین بجے اٹھ کر اپنے سائیکل پر ڈبل روٹی اور انڈوں کی پھیریاں کرنے لگا۔ زائد آمدنی سے نہ صرف میں نے اپنے بچوں کو تعلیم دی بلکہ میں نے بھی پرائیویٹ تعلیم حاصل کی اور اپنی بڑی لڑکی کے ساتھ میٹرک کے امتحان میں بیٹھا اور پھر اسلامیات میں ایم اے کیا! اب میں ایک کالج میں پروفیسر ہوں۔ نئی کراچی میں رہتا ہوں جو پرانی کراچی سے بھی بدتر ہے۔

میں بھٹک گیا ہوں۔ میں کہہ رہا تھا کہ جس دن میں نے گیندے گڈریے کی خبر پڑھی تھی اُس دن میں بہت اداس تھا۔ میرے گھر میں تیرھواں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ اور تیرہ کا عدد منحوس ہوتا ہے، ایسا نہ ہو کہ میرا یہ تیرھواں بچہ میرے اور میرے کنبے کے لیے تباہی اور بربادی کا پیغام لے کر آ جائے لیکن میرے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ میری وفادار بیوی نے میری مدد کی، اُس نے ایک نہیں۔ دو بچے پیدا کئے۔ جڑواں بچے۔ اب میرے تیرہ بچے نہیں تھے۔ چودہ بچے تھے۔ سات لڑکے، سات لڑکیاں۔

میں خوش خوش گیندے گڈریئے کی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ جھلنگی چارپائی خالی پڑی تھی۔ ٹوٹی ہوئی پائنتی میں سے میٹی ہوئی رسّی ودی لٹک رہی تھی، ٹوٹے ہوئے بان میں سے پھٹا ہوا میلا لحاف نکل کر فرش سے لگا ہوا تھا۔ گدڑی تکیے کی شکل میں سرہانے پڑی تھی، چارپائی کے ارد گرد پیشاب اور مینگنیوں کے کیچڑ میں بکریاں جگالی کر رہی تھیں۔ جھونپڑی میں بڑی گندی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

شاید گیندا گڈریا ساتھ والی جھونپڑیوں میں دودھ دینے گیا ہو گا۔ میں اپنی دودھ کی دیگچی لحاف پر ٹکا کر چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

توبہ! کتنی بدبو ہے! کتنی تنہائی ہے! گیندے گڈریئے نے اپنی زیادہ عمر اس بدبو اور تنہائی میں گزار دی۔ جنگ سے واپس آیا تو بیوی تین بچوں کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ تین بچے اور اس کا باپ ہیضے کی ایک وباء میں فوت ہو گئے تھے۔ بیمار ماں چارپائی پر پڑی تھی اور ایک بکری اس کے پائے سے بندھی ہوئی تھی۔ کمزور، ضعیف ماں اپنے بیٹے کو جنگ سے زندہ لوٹ آنے کی خوشی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ اُس کا بیٹا اُس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اُس کا دل اُس کے بیٹے کے چہرے کے پُرسکون لمس سے ہمیشہ کے لیے ساکن ہو گیا تھا۔ گیندا اپنی بکری کو ساتھ لے کر پاکستان آ گیا۔ وُہ اب اپنی بکریوں کے ساتھ اس جھونپڑی میں اکیلا رہتا ہے۔ جانوروں کو انسانوں سے بہتر سمجھتا ہے۔ بدبو اور تنہائی کو ہمیشہ ساتھ دینے والے دوست سمجھ کر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

میرے سامنے بکریوں میں بیٹھے ہُوئے ایک سفید سر والے بکرے کی سفید داڑھی میں جنبش پیدا ہُوئی اور پھر وُہ پچھلے دو پیروں پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور میری طرف آنے لگا۔ جب وُہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو مجھے معلوم ہُوا کہ وہ بکرا نہیں ہے۔ گیندا گڈریا ہے۔ گیندے گڈریے کے سر کے بال سفید ہیں اور اُس کی ٹھوڑی پر سفید بکر داڑھی ہے۔ بکر داڑھی اُس داڑھی کو کہتے ہیں جو بکرے کی داڑھی جیسی ہوتی ہے۔ چہرے پر کہیں نہیں ہوتی صرف ٹھوڑی پر چند بال لٹکے ہُوئے ہوتے ہیں۔ گیندا بکریوں کا دودھ دوہ رہا تھا۔

میں نے کہا:

"گیندے چاچے! ایک خوشخبری لایا ہوں، میرے گھر میں ایک ساتھ دو بچے پیدا ہوئے ہیں، جڑواں بچے۔ اب اللہ کے فضل سے میرے چودہ بچے ہو گئے ہیں۔"

گیندا چاچا بولا:

"دُر پھٹے منہ! اس میں خوشخبری کی کون سی بات ہے۔ منچلے ہی ہیں۔ بکریاں تو نہیں۔"

گیندا چاچا جب غصے میں ہوتا تھا تو اس کی بکرہ داڑھی زور زور سے ہلتی تھی۔ گیندے چاچے کی بکرہ داڑھی دو تین دفعہ زور زور سے ہلی اور پھر ساکن ہو گئی۔ اس نے دودھ سے بھری ہوئی بالٹی میرے پیروں کے پاس رکھ دی۔ لحاف کے اوپر سے میری دیگچی اٹھائی اور اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کی بکرہ داڑھی آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔

"تو جب اندر آیا تو تیرے ہاتھ میں گلاس نہیں تھا۔ دیگچی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا بہو بیٹی نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ کتنا دودھ؟"

میں نے جواب دیا:

"دو سیر! آج سے دو سیر دودھ جائے گا۔"

"میری مان تو ایک بکری لے جا۔ دو سیر دودھ لے گا تو میرا نقصان ہو گا۔"

"تیرا نقصان کیسے ہو گا، گیندے چاچے؟ میں پیسے دیتا ہوں دودھ کے۔"

"ٹھیک ہے تو پیسے دیتا ہے۔ جب تو گلاس میں اپنی چائے کے لیے دودھ لے کے جاتا ہے تو تو پیسے دیتا ہے۔ پر یہ دودھ تو بہو بیٹی کے لیے جائے گا ——"

پھر وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ پھر وہ میری طرف غصے سے بھری ہوئی لال انگارہ آنکھوں سے دیکھنے لگا اور پھر اُس کی بکرہ داڑھی زور زور سے ہلنے لگی۔

"ڈنگر دیا پُترا! ظالما، خبیثا! تو نے بکری جیسی بے زبان بہو بیٹی سے اکٹھے دو بچے پیدا کر کے اس کی کمر توڑ دی ہے۔ تو بہو بیٹی کو بکری ہی سمجھتا ہے۔ اب وہ بیچاری ہڈیوں کی مٹھی تیری قبر جیسی جھونپڑی میں پڑی کراہ رہی ہو گی۔ یہ دودھ بہو بیٹی کے لئے ہے۔ میں اس کے پیسے نہیں لوں گا۔"

وہ پھر چپ ہو گیا۔ اور چپ چاپ دیگچی میں دودھ ڈالنے لگا۔ اور پھر اس کی بکرہ داڑھی آہستہ آہستہ ہلنے لگی:-

"پر جو تو میرا نقصان پورا کرنا چاہتا ہے۔ تو میری مان ایک بکری لے جا۔ بکری کا خرچہ دودھ کے خرچے سے کم ہو گا۔ بچوں کو بہو بیٹی سے ہٹا کر بکری کے تھنوں پر ڈال دے۔"

میں گیندے چاچے کی سادہ اور بے لوث ہمدردی سے حیرت زدہ اس کو دیگچی میں دودھ ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر شکریے کی مسکراہٹ تھی! میں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"گیندے چاچے! تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں تجھ سے ایک بکری لے جاؤں گا! اور اس کی قیمت قسطوں میں ادا کروں گا۔"

گیندے چاچے کی بکرداڑھی زور زور سے ہلنے لگی:

"او بیوقوفا! گدھیا! میں تجھ سے دُودھ کے پیسے نہیں لوں گا تو بکری کی قیمت کیوں لوں گا۔ ان بکریوں میں سے جو تجھے پسند ہے، لے جا۔ جب تک دُودھ دیتی رہے گی، رکھنا۔ جب دُودھ دینا چھوڑ دے گی، واپس کر دینا، پھر دوسری لے جانا۔"

یہ انسانی ہمدردی اور ایثار کی معراج تھی۔ میرے جذبات اُمڈ آئے۔ میں نے آنسو چھپانے کے لیے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا:

"گیندے چاچے! گیندے چاچے! تُو کتنا اچھا ہے تُو کتنا عظیم انسان ہے۔ میں تیرا شکریہ کیسے ادا کروں مجھے لفظ نہیں ملتے۔ مجھے رونا ——— میرے آنسو ———"

ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ میرے آنسو بہ نکلے۔ میں گھٹنوں تک جھلنگی چارپائی میں اتر گیا۔ میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

گیندا چاچا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر وُہ چپ چاپ میرے پاس کھڑا رہا۔ پھر وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا اور بولا:

"او ئے احمقا! احمق کیوں بنتا ہے، ہوش کر۔ اُٹھ، میں نے دیگچی میں دُودھ ڈال دیا ہے۔ جا بہو بیٹی انتظار کر رہی ہو گی۔ شام کو ان بکریوں میں سب سے زیادہ دودھ دینے والی بکری تیری جھونپڑی میں پہنچ جائے گی۔"

میں نے اپنا سر اُٹھایا اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی دونوں آنکھوں کے آنسو پونچھے اور اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ میں دیر تک خاموش شکریے سے لبریز نظروں سے گیندے چاچے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جب الفاظ میری زبان پر واپس آئے تو میں بولا:

"گیندے چاچے! وہ بکری کونسی ہے جس کی تصویریں کل ایک اخبار میں آئی ہیں۔ اور جس کے ماتھے پر کہتے ہیں چاند تارا بنا ہوا ہے۔"

گیندے چاچے نے اپنی جھونپڑی کے ایک کونے میں کھڑی ہوئی ایک بکری کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"وہ رہی۔ چتلی۔ کل سے لوگوں نے میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس کو دیکھنے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ ایک سیٹھ اس کے ایک ہزار دے رہا ہے۔ دوسرا تین ہزار دینے پر تیار ہو گیا۔"

چتلی بڑی خوبصورت بکری تھی۔ اُس کے چمکدار سفید رنگ میں کالے رنگ کی چتیاں تھیں۔ اُس کے کالے ماتھے پر دو سفید نشان تھے۔ ایک چھوٹا گول، ایک بڑا لمبوترا۔ میں اُس کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا اور اُس کے ماتھے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

"گیندے چاچے! لوگ بیوقوف ہیں۔ چتلی کے ماتھے پر کوئی چاند تارا نہیں یہ تو دو چتیاں ہیں۔ ایک ذرا چھوٹی گول سی کنگروں والی ہے۔ دوسری بڑی لمبوتری دو کونوں والی۔ اخبار کے نمائندے کو کہیں خبر نہ ملی تو اُس نے چتلی کو خبر بنا دیا۔ چھوٹی چتی کو تارا اور موٹی چتی کو چاند سمجھ کر اس کے ماتھے پر چاند تارا بنا دیا۔ یہ تجھے کیا۔ تُو لوگوں کی بیوقوفی سے فائدہ اٹھا۔ بنا لے تین ہزار۔"

بکر داڑھی زور زور سے ہلنے لگی۔

"او مردکا! احمقا! بکری کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے؟ بکری تو انمول ہے۔ پر تیرا کیا ہے۔ تُو تو خود غرض۔ روپے کو بکری

سے بڑا سمجھتا ہے مجھے تو لگتا ہے کوئی لاوارث سیٹھ تجھے دو ہزار روپے دے دے تو تو اپنے دونوں جڑواں بچے اس کے حوالے کر دے۔ یہی تو تجھ میں اور مجھ میں فرق ہے۔ تو بچوں کو روپوں کے درخت سمجھتا ہے۔ درخت جن پر پتوں کی جگہ نوٹ لگتے ہیں اور پھلوں کی جگہ روپے۔ میری بکریاں تو دودھ کی نہریں ہیں۔ بکری کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ بکری تو انمول ہے اور یہ چتلی تو بالکل انمول ہے۔ اس کا مزاج اور اس کی عادتیں سب کو حیران کرتی ہیں۔ ذرا دیکھنا یہ کہاں کھڑی ہے؟ سب بکریوں سے دور ایک کونے میں اس کو پیشاب اور مینگنیوں کی بدبو اچھی نہیں لگتی۔ یہ رات کو دوسری بکریوں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ وہ پیشاب اور مینگنیوں میں پڑی رہتی ہیں۔ یہ الگ ایک کونے میں دری پر ہوتی ہے۔ صبح کو پیشاب اور مینگنیاں کرنے کے لیے باہر جاتی ہے۔ اس وقت چتلی مجھ سے ناراض ہے۔ میں نے اس کی دری اس کے نیچے سے اٹھا کر باہر دھوپ میں ڈال دی ہے۔ اب یہ کھڑی رہے گی، جب تک دری کہیں بچھائی جاتی یہ کھڑی رہتی ہے۔"

میں بڑا حیران ہوا۔ چتلی ہماری طرف سے منہ پھیرے جھونپڑی کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے بھی احساس ہوا وہ ہم سے ناراض ہے۔

میں نے کہا:

"گیندے چاچے! یہ تو بڑی عجیب و غریب بکری ہے۔ تو اسے ناراض نہ کر۔ منا لے۔ اس کی دری اس کے نیچے بچھا دے۔"

گیندا چاچا بولا:

"بچھاؤں گا، دودھ دوہنے کے بعد۔"

"کتنا دودھ دیتی ہے؟"

"اچھا خاصا ہوتا ہے۔ خوراک ملے تو زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں پیار سے چتلی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا، چتلی نے میری کوئی پروا نہ کی، وہ بدستور جھونپڑی سے باہر دیکھتی رہی۔ جھونپڑی سے باہر نیم کے درخت کی ایک ٹہنی پر اس کی دری لٹک رہی تھی۔

میں نے کہا:

"گیندے چاچے! تو نے چتلی کی دری باہر سوکھنے کے لئے کیوں ڈال دی ہے؟ کیا اس نے دری پر پیشاب کر دیا تھا؟"

وہ بولا:

"نہیں چتلی کبھی دری پر پیشاب نہیں کرتی۔ صبح کو جب اس کے نیچے سے دری نکال لی جاتی ہے تو یہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ میں اس کا دودھ دوہ لیتا ہوں۔ اس کے نیچے سے دری نکال کر میں باہر نیم پر لٹکا دیتا ہوں! اگر میں دری کو جھونپڑی میں کہیں رکھ دوں۔ تو چتلی اس کو اپنے دانتوں سے کھینچ کر پھر اپنے نیچے بچھا لیتی ہے اور اس پر بیٹھ جاتی ہے۔"

چتلی ابھی تک ہم سے ناراض ہماری طرف منہ پھیرے اپنی صاف ستھری جگہ پر اکیلی کھڑی تھی۔ میں نے دوسری بکریوں کی طرف دیکھا۔ وہ پیشاب اور مینگنیوں کے کیچڑ میں بیٹھی جگالی کر رہی تھیں۔ کوئی بکری کھونٹے سے بندھی ہوئی نہیں تھی۔

میں نے کہا:

"گیندے چاچے، تُو اپنی بکریوں کو کھونٹے سے باندھ کر کیوں نہیں رکھتا۔ چتلی اگر کھونٹے سے بندھی ہو تو تجھے اس کی مدد کو باہر نیم پہ تو نہ جانا پڑے۔ جھونپڑی میں جہاں مرضی رکھ دے۔ پیتل اس کے پیچھے تو نہ پڑے!"

بکر داڑھی زور زور سے ہلنے لگی۔

"او پاگلا! احمقا! اگر میں اپنی بکریوں کو رسیوں میں جکڑ کے رکھوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ میرے پالتو جانور ہیں۔ میں ان کا مالک ہوں۔ یہ میری غلام ہیں، نہیں۔ میری بکریاں تو میرا کنبہ ہیں یہ جھونپڑی میری نہیں، ان کی ہے، یہ اپنی جھونپڑی میں بالکل آزاد ہیں اپنی جھونپڑی میں یہ جہاں مرضی بیٹھیں۔ جہاں مرضی کھڑی ہوں جہاں مرضی پھریں۔"

ایک لال رنگ کی بکری کھانسنے لگی۔ نتھنے پھڑپھڑانے لگی اور کراہنے لگی۔ گیندے چاچے نے بے قرار ہو کر اس کی طرف دیکھا اور بولا:

"لالو کو کل سے بخار ہے۔ سخت نزلہ ہے اور کھانسی ہے۔ آج ملٹھی منقہ اور گڑ ٹکڑ کا جوشاندہ پلاؤں گا۔ کیا بات ہے بیٹی؟ میں آیا ہوں۔"

وہ لالو کے پاس جا کر اس کی گردن سہلانے لگا۔ اور اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ جب وہ لالو کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ میں چپکے سے نیم کے درخت کے پاس گیا اور اس کی ٹہنی سے چتلی کی دری اتار کر اندر لے آیا۔ میں نے دری کو چتلی کے سامنے بچھا دیا۔ چتلی دری پہ ہماری طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔

میں نے خوش ہو کر شور مچا دیا:

"گیندے چاچے، گیندے چاچے! چتلی مان گئی۔"

گیندے چاچے نے لالو کے پاس کھڑے کھڑے میری طرف جھنجلا کر دیکھا اور بولا:

"یار! اب تو جا، اٹھا اپنی دیگچی۔ مجھے چتلی کا زور دھڑ دو پہلے ہے۔"

گیندا چاچا چتلی کے پاس آیا۔ اُس نے چتلی کے نیچے سے دری پھر کھینچ لی اور اس کو نیم کی ٹہنی پر پھر لٹکانے کے لئے باہر چلا گیا۔ چتلی پھر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں اُس کے ماتھے کو پیار سے تھپکنے لگا۔

جب گیندا چاچا اندر آیا تو میں نے کہا:

"گیندے چاچے! ایک بات کہوں؟"

"بول۔"

"مانے گا؟"

"ماننے والی بات ہو گی تو مانوں گا۔"

"چتلی مجھے دے دے۔"

گیندے چاچے نے ایک دھچکا محسوس کیا۔ اُس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ پہلے پیلا ہوا، پھر سفید ہوا اور پھر سیاہ ہو گیا، اُس کی آنکھوں میں غصے کے لال انگارے دہکنے لگے۔ اُس کا جسم جذبات کو دبانے کی کوشش میں لرزنے لگا۔ اُس نے اپنی بکریوں کی طرف دیکھا، اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس نے میری دیگچی کی طرف دیکھا اور بولا:

"نکل جا۔"

اس طرح چتلی ہمارے گھر میں آگئی۔

میں نے جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی شور مچا دیا:

"منی کی ماں! دیکھو میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں؟ گیندے چاچے نے تمہارے لئے بکری بھیجی ہے۔ بڑا عظیم انسان ہے گیندا چاچا۔ اُس نے اِس کی کوئی قیمت نہیں لی۔ تمہیں تحفے کے طور پر دے دی ہے۔ میں نے اُس کو جڑواں بچوں کی خوشخبری سنائی تو وہ بہت ناراض ہوا۔ بولا: مجھے بچوں کا شوق ہے۔ بہو بیٹی کی صحت کا خیال نہیں۔ یہ بکری جب تک دودھ دے گی ہمارے پاس رہے گی۔ جب اس کا دودھ سوکھ جائے گا، گیندا چاچا اِس کو واپس لے جائے گا اور اس کی جگہ دوسری دودھ دینے والی بکری دے جائے گا۔ تمہاری بیماری میں اب تمہیں ہمیشہ دودھ ملے گا۔"

مُنی کی ماں چھیچھڑے کی طرح چارپائی پر پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں بچے اُس کی دونوں طرف اُس کے پہلوؤں میں چھیچھڑوں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ جھونپڑی میں دودھ دینے والی بکری کو دیکھ کر منی کی ماں کے چھیچھڑے میں جان آگئی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور آسمان طرف منہ اُٹھا کر بولی:

"اللہ! گیندے چاچے! خدا تیرا بھلا کرے۔"

تمام بچے گھر میں موجود تھے۔ شاید وہ نومولود ننھے مہمانوں کے استقبال کے لیے جمع تھے۔ بکری کو دیکھ کر انہوں نے اس کے گرد دائرہ بنا لیا اور ناچنے گانے اور شور مچانے لگے۔

میں شور سے اونچی آواز میں چلایا۔

"بچو! شور بند کرو۔ میری بات سنو!"

بچے چپ ہو گئے۔

میں نے کہا:

"منی کی ماں! تم نے سنا ہو گا کل کے ایک اخبار میں خبر آئی تھی کہ گیندے گڈریے کے ریوڑ میں ایک ایسی بکری ہے جس کے ماتھے پر چاند تارا بنا ہوا ہے۔"

منی کی ماں نے جواب دیا:

"ہاں۔ کی تو تھی کسی پڑوسن نے ایسی کوئی بات۔"

میں نے کہا:

"یہ وہی بکری ہے۔"

بچے بکری کے ارد گرد جمع ہو کر اُس کے ماتھے پر چاند تارا ڈھونڈنے لگے۔ پھر سب نے یک زبان ہو کر اعلان کیا:

"ہاں، ابا! صاف چاند تارا بنا ہوا ہے۔"

جب میں نے بچوں کو بتایا کہ اخبار کی رپورٹ غلط ہے۔ بکری کے ماتھے پر کوئی چاند تارا نہیں۔ تو وہ مجھ سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور زور زور سے بول کر مجھے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب میں نہ مانا تو وہ بکری کو کھینچ کر منی کی ماں کے پاس لے گئے۔ اور سب اکٹھے بولے:

"دیکھو امّی! ہے کہ نہیں یہ چاند تارا صاف تو نظر آ رہا ہے۔"

منّی کی ماں نے غور سے بکری کے ماتھے کو دیکھا اور بولی:

"کیوں نہیں؟ ہے تو۔"

میں نے کہا:

"ارے منّی کی ماں کہاں ہے چاند تارا؟ یہ تو دو چھوٹے بڑے سفید دھبے ہیں۔"

منّی کی ماں کا ہڈیوں کا ڈھانچہ غصے سے کانپنے لگا۔

"کچھ بھی ہو، تم قدرت کے کاموں میں ضرور دخل دو گے۔ تم اپنی حرکتوں سے کبھی باز نہیں آؤ گے، تم کبھی نہیں مانو گے کہ قدرت سب کچھ کر سکتی ہے۔ ارے! میں کہتی ہوں وہ قادرِ مطلق جس نے یہ زمین، یہ آسمان، یہ سمندر، یہ پہاڑ بنائے ہیں کیا ایک بکری کے ماتھے پر چاند تارا نہیں بنا سکتا؛ مگر تم کہاں مانو گے؛ تم تو کافر ہو، بے دین ہو، ملحد ہو، مرتد ہو، اللہ کو تم نہیں مانتے، رسولؐ کو تم نہیں مانتے، اپنے ملک سے تمہیں پیار نہیں، اپنے جھنڈے سے تمہیں محبت نہیں۔ پھر تمہیں چاند تارا کہاں نظر آئے گا؛ تم قدرت کے اشارے کیا سمجھو گے؛ تمہیں تو کوئی چاند تارے کی پوری تصویر بنا کر دے دے تب تمہیں چاند تارا نظر نہ آئے گا۔ مگر میں حیران ہوں کہ تم اتنے کوڑھ مغز کیوں ہو؛ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ قدرت تو صرف اشاروں میں بات کر سکتی ہے؛ قرآن کریم کی مثال تمہارے سامنے ہے تیرہ سو سال سے لوگ اس کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں ابھی تک نہیں سمجھے۔ کہ قدرت تو صرف اشاروں میں بات کر سکتی ہے۔ معلوم نہیں تمہاری سمجھ کو کیا ہو گیا ہے، دن رات یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھتے ہو۔ اسلامی تاریخیں۔ مذہبی کتابیں۔ فلسفے۔ حدیثیں۔ تفسیریں اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ مگر معلوم نہیں یہ سارا علم تمہارے دماغ کی دلدل میں کہاں غرق ہو جاتا ہے۔"

اب منّی کی ماں کا پتنگ غصے کے آسمان پر اتنی دور پہنچ گیا تھا اور اس زور زور سے ڈگمگا رہا تھا کہ ڈور ٹوٹنے ہی والی تھی۔ خیریت اسی میں تھی کہ اس کی باتوں کا جواب نہ دیا جائے اور اس کو مزید گفتگو سے روکا جائے۔

میں نے موضوع بدلنے کے لئے بچوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"بچو! اس بکری کا نام چتلی ہے۔"

اور پھر میں نے چتلی کے بارے میں وہ سب حیرت انگیز باتیں بیان کر دیں جو گیندے چاچے نے مجھے بتائی تھیں اور میں نے دیکھی تھیں۔ بچے چتلی سے فوراً مانوس ہو گئے۔ اور جھونپڑی کو جلدی جلدی صاف کرنے لگے۔ تاکہ ایسا نہ ہو چتلی ناراض ہو کر واپس گیندے گڈریئے کے ریوڑ میں چلی جائے۔ انہوں نے جھونپڑی کے ایک صاف کونے کو اور بھی زیادہ صاف کر کے وہاں ایک نرم دبیز چٹائی بچھا دی اور چٹائی کے اوپر دری بچھا دی۔ چتلی فوراً اس پر بیٹھ گئی۔

چتلی بہت جلد ہمارے کنبے کا ایک رکن بن گئی۔ ایسا احساس ہونے لگا جیسے میرے چودہ بچے نہیں۔ پندرہ ہیں۔ چتلی کے آنے کے بعد ہمارے گھر میں نفاست اور صفائی آ گئی۔ بچے صاف رہنے لگے۔ جھونپڑی صاف نظر آنے لگی۔ بستروں کی چادریں اور تکیوں کے غلاف صاف ہو گئے، گندے پانی کی نالیوں سے بدبو غائب ہو گئی۔ کچی اینٹوں کی دیواروں پر سفید قلعی ہو گئی، اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ

بچے گلیوں میں آوارہ پھرنے کی بجائے گھر میں رہنے لگے۔ سکول سے واپس آکر وہ چتلی کے ارد گرد بیٹھ کر سکول کا کام کرتے، اُس کے بالوں کو صابن سے دھو کر ان پر برش کرتے۔ اُس کے ماتھے کے چاند تارے سے کھیلتے۔

دن، مہینے اور سال اچھلتے کودتے ناچتے گاتے گذرتے چلے گئے۔ اور پھر ایک قیامت خیز دن آیا، چتلی مر گئی۔ میری جھونپڑی میں ماتم کی صفیں بچھ گئیں۔ میری بیوی نے اور میرے بچوں نے رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کر لیا میرے سارے کنبے کے لیئے دنیا ویران ہو گئی۔

چتلی مر گئی۔ اور جس دن چتلی مری اُس دن میرا ڈبّو پیدا ہوا۔ یہ حیرت انگیز بکری جس کا نام چتلی تھا میرے ڈبّو کی ماں تھی۔ میرا ڈبّو جو اس کہانی کی بنیاد ہے۔ میرا ڈبّو جو اس افسانے کا ہیرو ہے۔

اُس دن صبح کو گیندا چاچا آیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ شام کو ایک اور بکری لائے گا۔ اور چتلی کو واپس لے جائے گا۔ کیونکہ چتلی بیاہنے والی ہے لیکن جب وہ شام کو آیا تو جھونپڑی میں کہرام برپا تھا۔ بچے رو رہے تھے۔ منی کی ماں رو رہی تھی۔ میں رو رہا تھا۔ ہمارے سامنے چتلی مری پڑی تھی، اُس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ اُس کی ٹانگیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اُس کے پاس اُس کا ڈبّو لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

چند لمحوں تک گیندا چاچا سکتے کے عالم میں یہ دردناک منظر دیکھتا رہا۔ پھر اُس کی بکر داڑھی زور زور سے ہلنے لگی۔

"او بیوقوف دیا ہیرا! ظالما! خبیثا! تُو نے چتلی کو مار ڈالا۔ چتلی کے پیٹ میں ابھی ایک اور بچہ ہے۔ تو نے مجھے کیوں نہیں بلایا۔ ایک بچہ ہو گیا۔ دوسرا پیٹ میں رہ گیا۔ اس سے چتلی کے جسم میں زہر پیدا ہو گیا۔ چتلی مر گئی۔ میں ہوتا تو دوسرا بچہ بھی پیدا ہو جاتا۔"

میں نے کہا:

"میرا بڑا لڑکا گیا تھا تجھے بلانے۔ تو بکریاں چرانے گیا ہوا تھا۔"

"او ڈنگرا! مورکھا! تجھے تو معلوم تھا کہ میں بکریاں چرانے کہاں جاتا ہوں۔"

اندر سے میری بیوی کی غمگین آواز سنائی دی۔

"گیندے چاچے! ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ ہمیں معاف کر دے۔ چتلی ہم سب کو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ قدرت کو یہی منظور تھا اور گیندے چاچے، تیرا احسان ہم کبھی نہیں بھول سکتے اتنا دودھ خریدنا پڑتا تو ان کی ساری تنخواہ لگ جاتی۔ ہم بہت شرمندہ ہیں ہم تیری امانت کو سنبھال نہ سکے۔"

گیندے چاچے نے دلاسا دیتے ہوئے متفکر لہجے میں کہا:

"اے بیٹی! تو غم نہ کر، تیری صحت پہلے ہی خراب ہے۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ تو اپنا اور بچوں کا خیال کر۔ میں تیرے لیے ایک اور بکری لایا ہوں۔"

وہ کالے رنگ کی بڑے بڑے سینگوں والی بکری کو صحن کے دراڈے کی بلی کے پاس لے گیا، بکری کو بلی کے ساتھ باندھ کر اُس نے چند گھنٹوں کے لڑکھڑاتے ہوئے ڈبّو کو اُس کے پاس لا کے کھڑا کر دیا کالی بکری جس کا نوزائیدہ بچہ فوت ہو گیا تھا، ڈبّو کے خوبصورت ذب کھرے جسم کو چاٹنے لگی گیندے چاچے نے بکری کے تھن ڈبّو کے منہ میں دے دیئے۔ •

پھر وہ میری بیوی سے مخاطب ہو کر بولا :

" بیٹی ! یہ بکری چتلی سے بھی زیادہ دودھ دیتی ہے ۔ آٹھ دس دن یہ چھیلا بھی اس کا دودھ پئے گا ۔ اس کے بعد میں چھیلے کو لے جاؤں گا۔ پھر تجھے سارا دودھ ملے گا ۔"

بچوں نے شور مچا دیا :

" گیندا بابا ! گیندا بابا ! یہ چھیلا ہمیں دے دو ۔ کتنا اچھا لگتا ہے ۔ کتنا پیارا ہے ۔"

میری بیوی بولی :

" ہاں ، گیندے چاچے ! بہت پیارا چھیلا ہے ۔ یہ ہمارے پاس رہے تو اچھا ہو گا ہم چتلی کا غم بھول جائیں گے ۔ بچے کھیلا کریں گے اس سے ۔ باہر آوارہ نہیں پھریں گے اور گیندے چاچے ! اللہ تیرا بھلا کرے ۔ اس بکری کا ہم بہت خیال رکھیں گے ۔ خدا تجھے تیری نیکیوں کا اجر دے ۔ اب اتنی مہربانی اور کر بچوں کو یہ چھیلا دے دے ۔ ہم اس کو بڑے لاڈ پیار سے پالیں گے اور اگلی بقر عید پر اس کی قربانی دیں گے ۔"

گیندا چاچا کچھ دیر چپ رہا ۔ پھر بولا ۔

" اچھا ! بہو بیٹی ، جیسی تیری مرضی ۔ اب میں چلتا ہوں ۔"

گیندا چاچا چلا گیا ۔

ڈبو اپنی ماں چتلی کی طرح خوبصورت تھا ۔ اس کی ماں کے جسم پر سفید اور سیاہ چتیاں تھیں ڈبو کے جسم پر سفید اور سیاہ ڈبے تھے ۔ چتلی کی طرح ڈبو بھی بڑا نفاست پسند تھا ۔ گندگی سے نفرت کرتا تھا ۔ چتلی رات کو صاف زمین پر صاف دری پر سوتی تھی ۔ ڈبو رات کو میرے بستر میں میرے ساتھ سوتا تھا ۔ چتلی صبح اور شام مینگنیاں اور پیشاب کرنے کے لئے جھونپڑی سے باہر دور جاتی تھی ۔ ڈبو بھی صبح اور شام میرے ساتھ سیر کو جاتا تھا اور جھونپڑی سے باہر مینگنیاں اور پیشاب کر کے آتا تھا ۔ چتلی کی طرح ڈبو بھی اپنی ذہانت کی وجہ سے سارے گھر میں محبوب تھا اور سارے محلے میں مشہور تھا ۔

ویسے بھی قربانی کے بکرے کو بہت پیار کیا جاتا ہے ۔ اس کے ناز اٹھائے جاتے ہیں ۔ اس کو خوب کھلایا پلایا جاتا ہے ۔ نہلایا دھلایا جاتا ہے ۔ صاف ستھرا رکھا جاتا ہے ۔ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں ، اس کے جسم کو مہندی کے رنگوں سے سجایا جاتا ہے ۔ قربانی کے بکرے سے انتہا کی محبت کی جاتی ہے ۔ خدا اپنے بندوں سے ان کی سب سے پیاری چیز کی قربانی مانگتا ہے ۔ جب خدا نے اپنے پیارے پیغمبر ابراہیمؑ سے ایسی چیز کی قربانی طلب کی جس سے اس کو سب سے زیادہ محبت تھی تو اس نے اپنے پیارے بیٹے اسمٰعیلؑ کی قربانی پیش کی ۔ اس لئے قربانی کے بکرے سے اپنے بیٹے کی طرح محبت ہونی چاہیے ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ۔

اور مجھے تو واقعی ڈبو سے اپنے بیٹوں کے مقابلے میں زیادہ محبت تھی ۔ میرے بیٹے سب نالائق تھے ۔ میں ان کے لئے سخت جاڑوں میں صبح کو سائیکل پر انڈے اور ڈبل روٹی بیچ بیچ کر سکول کی فیس پیدا کرتا تھا ، لیکن ان میں سے کسی نے میٹرک پاس کر کے نہ دیا ، میرے بیٹے بے ادب تھے ۔ میرے سامنے بولتے تھے ۔ میری پروا نہیں کرتے تھے ۔ میرا کہنا نہیں مانتے تھے ۔ ڈبو مجھ سے بے تحاشا محبت کرتا تھا ۔

میرے ساتھ ساتھ رہتا۔ میرا حکم مانتا تھا۔ میرا احترام کرتا تھا۔ اس لئے ڈبو مجھے اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ پیارا تھا۔

اور عجیب ہے کہ ڈبو مجھے اپنی بیٹیوں سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ میری بیٹیاں میرے بیٹوں سے زیادہ لائق تھیں۔ میری بڑی بیٹی نے نہ صرف یہ کہ میٹرک پاس کیا بلکہ مجھے بھی میٹرک پاس کرا دیا۔ اب میرا کوئی رشتہ دار اس کا رشتہ نہیں لیتا کیونکہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور ملازمت کرتی ہے۔ لڑکیوں کی شادی بہلا بڑا تکلیف دہ مسئلہ ہے۔ اچھا ہوتا اگر لڑکیوں کی قربانی جائز ہوتی۔ لڑکیاں ہمارے معاشرے میں ہر روز قربان کی جاتی ہیں۔ لیکن بقر عید پر ان کی قربانی جائز نہیں۔ اُن سے تو بکرا بہتر ہے جس کی قربانی اللہ تعالیٰ بڑے شوق سے قبول کرتا ہے۔ اُن سے تو میرا ڈبو بہتر تھا۔

جب ڈبو اچھا خاصا بڑا ہو گیا اور کالی بکری کا دودھ چھوڑ کر گھاس پتے اور دانہ کھانے لگا اور میرے ساتھ سونے میں دقت محسوس کرنے لگا تو بچوں نے رات کی رانی کے پودوں کے پاس چٹائی پر موٹا گدا بچھا کر اس کا بستر بنا دیا۔

اسی دن شام کو گینڈا چاچا آ گیا۔ منّی کی ماں اور بچوں کی خیریت پوچھ کر وہ ڈبو کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اونچی آواز سے پکارا:

"ڈبو!"

ڈبو نے جگالی بند کر دی اور گردن موڑ کر گینڈے چاچے کی طرف دیکھنے لگا۔ گینڈے چاچے نے مجھ سے پوچھا:

"سمجھتا ہے؟"

میں نے جواب دیا:

"سب کچھ سمجھتا ہے۔ بچے صبح سے شام تک اس سے باتیں کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں یہ بھی کرتا ہے۔ معلوم نہیں کیا کیا سکھاتے رہتے ہیں وہ اس کو۔"

"پودوں اور پھولوں کو تو خراب نہیں کرتا؟"

"نہیں۔ جس بات سے منع کرو، نہیں کرتا۔ رات کی رانی کے پتے کھانے لگا تو بچوں نے منع کر دیا۔ اب کسی پودے کے پتوں اور پھولوں پر منہ نہیں ڈالتا۔ گلاب اور چنبیلی اور مہندی کے پودوں کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ گل عباس اور گل داؤدی اور سدا بہار کے پھولوں کو سونگھ کر ان کے نزدیک کھڑا ہو جاتا ہے۔ کوئی چیز اس کے سامنے ڈال دیتے ہیں تو خوش ہو کر کھاتا ہے۔"

"بچے خوش ہیں؟"

"بہت! ہر وقت کھیلتے ہیں اس کے ساتھ۔ کل شام کو یہاں صحن میں دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور ڈبو ڈبو پکارنے لگے۔ ڈبو اپنا نام سن کر فوراً نام پکارنے والے کی طرف چل پڑتا۔ پھر دوسرا ڈبو کہہ دیتا۔ ڈبو اس کی طرف چل پڑتا۔ پھر تیسرے کی طرف پھر چوتھے کی طرف۔ اس طرح بچوں نے ڈبو کو دیر تک دائرے میں گھمایا۔ انہوں نے تالیوں اور قہقہوں سے جھونپڑی کو سر پر اٹھا لیا۔ اُن کی ماں ناراض ہو کر چیخنے لگی۔ میں نے چیخ چیخ کر اُن کو جھونپڑی سے باہر جانے کو کہا۔ وہ سب باہر کے دروازے کی طرف چل پڑے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ڈبو بھی چل پڑا۔ میں نے ڈبو سے کہا:

"ڈبو! تم مت جاؤ۔ میرے پاس آ جاؤ۔ ڈبو واپس آ کر میرے پاس کھڑا ہو گیا۔ بچے باہر چلے گئے۔"

میں جب گیندے چاچے کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، ڈبو بھی سن رہا تھا، جب جب اُس کا نام آیا اُس نے میری طرف دیکھا پھر جب اُس نے آخر میں اپنے نام کے ساتھ میرے پاس آجاؤ سُنا تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

گیندے چاچے نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا اور بولا:

"اپنی ماں پر گیا ہے۔ چتلی کی عادتیں بھی ایسی ہی تھیں۔"

"ہاں، بالکل چتلی کی طرح صفائی پسند ہے، وہ سامنے بادام کے درخت کی جڑ میں کالی بکری باندھی جاتی ہے۔ یہ وہاں نہیں جاتا کیونکہ اُس جگہ سے پیشاب اور مینگنیوں کی بدبو آتی ہے۔"

"کالی بکری کہاں ہے؟"

"بچے باہر چرانے کے لئے گئے ہیں۔"

"کتنا دودھ دیتی ہے؟"

"اب کچھ کم ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔ کالی بکری بیاہنے والی ہے۔ میں اُس کو لینے آیا ہوں۔ تو اُس کو مار ڈالے گا۔ جس طرح تو نے چتلی کو مار ڈالا تھا چتلی بھی بیاہنے والی تھی۔ میں نے تجھے کہا تھا جب اس کا دودھ کم ہونے لگے تو مجھے بتانا۔ میں چتلی کو واپس لے جاؤں گا۔ تجھے دوسری بکری دے دوں گا۔ پر تو نے مجھے نہیں بتایا۔ میں کالی بکری کو لینے آیا ہوں۔ کل دوسری بکری چھوڑ جاؤں گا۔"

پھر اندر سے چائے آگئی، پھر باہر سے بچے کالی بکری کو لے کر آگئے۔ پھر گیندا چاچا کالی بکری کو لے کر چلا گیا۔

اب بقرعید نزدیک آرہی تھی۔ ڈبو کی محبت ہمارے دلوں میں گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمارے خون میں ہمارے گوشت میں ہمارے جسم میں ہماری روح میں داخل ہو گیا تھا۔ اب بقرعید آرہی تھی۔ بقرعید جو ہمارے جسم میں سے ہمارے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کے لے جائے گی۔ بقرعید جو ہمارے جسم ہمارے گوشت اور ہمارے خون میں سے ہماری روح کھینچ کے لے جائے گی اور ہمیں دکھ نہیں ہو گا۔ ہم خوش ہوں گے۔ ہم خوش نصیب ہوں گے۔ یہی قربانی ہے۔ یہی ایثار ہے۔ یہی عبادت ہے۔

لیکن بقرعید کی آمد سے پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ڈبو کو میرا ہیرو ہونے کے علاوہ ہمارے سارے علاقے کا ہیرو بنا دیا۔

شام کا وقت تھا۔ میں دفتر سے واپس آرہا تھا۔ میری جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر ایک مداری کا مجمع لگا ہوا تھا۔ مداری کے پاس دو بندر اور ایک بکرا تھا۔ میں مجمعے میں کھڑا ہو گیا۔ وہیں ایک کونے میں میرے لڑکے ڈبو کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب میں مجمع میں شامل ہوا۔ بندروں کا تماشا ختم ہو چکا تھا۔ بکرا کرتب دکھا رہا تھا۔ مداری نے ڈگڈگی بجاتے ہوئے اپنے تھیلے سے ڈگڈگی کی شکل کا ٹھوس لکڑی کا ایک آلہ نکالا جس کی اونچائی آدھا فٹ تھی اور جس کا قطر اوپر اور نیچے کی فلیٹ سطح پر تین انچ اور درمیان میں ایک انچ تھا۔ مداری نے وہ آلہ سب کے سامنے ہموار زمین پر رکھ دیا۔ اور بکرے کو اپنی چھڑی سے اشارہ کیا۔ بکرے نے تین انچ قطر کی فلیٹ سطح پر اپنا ایک کھر رکھا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا۔ اور پھر وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کو بیلنس کر کے اس آلے پر کھڑا ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آلے کو گرائے بغیر نیچے اتر گیا۔ اب مداری نے ڈگڈگی بجاتے ہوئے ایک اور ایسا ہی آلہ اپنے تھیلے سے نکالا اور اس کو پہلے آلے کے اوپر رکھ دیا۔ مداری کے اشارے

پر کھڑا دوسرے اُسکے پر بھی اپنے چاروں کُھر جا کر پورے توازن کے ساتھ کھڑا ہو گیا - پھر مداری نے وہ ٹوں کے اوپر تیسرا آلہ کھڑا کر دیا پھر اس پر بھی اپنے آپ کو بیلنس کر کے کھڑا ہو گیا - اسی طرح چوتھے پر - مجمعے میں تالیاں بجنے لگیں - تالیاں ابھی بج ہی رہی تھیں جب میرا بڑا لڑکا بھاگا بھاگا ایک چارپائی لے آیا اور اس کو مجمعے کے درمیان بچھا کر تماشائیوں سے بولا : " بھائیو! اب ہمارے ڈبو کا کمال دیکھو " پھر وہ منہ آواز سے بولا : " ڈبو ! ادھر آؤ "! ڈبو سب مجمعے سے نکل کر مجمعے کے درمیان آ گیا - اُس نے کہا : " ڈبو ! چارپائی کی چاروں پٹیوں پہ گھوم جا اور ہر پائے پر کھڑا ہو کر سب کو سلام کر " ڈبو چارپائی کے ایک پائے پر اپنے چاروں پیر جا کر مکمل توازن کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور پھر اُس نے اپنا سر جھکا کر گول پائے پہ چاروں طرف گھوم کر سب کو سلام کیا - پھر وہ بڑے اعتماد کے ساتھ پٹی پہ چلنے لگا - دوسرے پائے پر پہنچ کر وہ پھر اس پہ اپنے آپ کو بیلنس کر کے کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کے چاروں طرف گھوم سب کو سلام کرنے لگا - اس طرح ڈبو نے چاروں پٹیوں پہ چہل قدمی کی اور چاروں پایوں پہ کھڑا ہو کر سب کو سلام کیا - مجمع تالیوں سے گونج اُٹھا - لوگ میرے اردگرد جمع ہو گئے اور ڈبو کے بارے میں سوالات کرنے لگے - اُس دن کے بعد میری جھونپڑی پر ڈبو کو دیکھنے والوں کا جمگھٹا رہنے لگا -

اب میری اور ڈبو کی محبت ہیرو ورشپ میں تبدیل ہو گئی - میں اس کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے لگا - وہ ہر جگہ ہر لحظہ میرے خیالوں میں رہنے لگا - کبھی میں اس خیال سے ڈر جاتا کہ میں ڈبو کو جس عظیم مقصد کے لئے تیار کر رہا ہوں اُس کے پورا ہونے سے پہلے وہ کہیں گم نہ ہو جائے ، بیمار نہ ہو جائے ، مر نہ جائے ، کبھی میں اس خیال سے اطمینان محسوس کرتا کہ میرا پیارا ڈبو مجھے میرے گناہوں کے عذاب سے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دے گا اور میرا اور میرے گناہوں کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پہ اُٹھا کر پل صراط پر سے گذر جائے گا اور میرے لئے جنت میں مقام پیدا کرے گا - کبھی میں اس خیال سے آبدیدہ ہو جاتا کہ بقر عید کا دن ، اسلامی دنیا کی خوشیوں کا دن ، میرے ہیرو میرے ڈبو کی قربانی کا دن ہو گا - مجھ پر ایسے جذبات طاری ہو جاتے جو اُن موقعوں پر ہوتے ہیں جب میں ایک دوست کا جنازہ پڑھنے کے بعد دوسرے دوست کی شادی میں شریک ہوتا ہوں - میں بے قرار ہو کر ڈبو کو آواز دیتا - جب ڈبو میرے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا تو میں اُسے بہت پیار کرتا - میری محبت میرے دل اور میرے سینے سے پھوٹ کر میری آنکھوں میں آ جاتی - میری آنکھیں ڈبو کی آنکھوں میں اُس مسافر کی اداسی دیکھتیں جو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہو ، ایسے حالات میں محبت کی انتہا ہو جاتی ہے - محبت کی بلند چوٹیوں پر قربانی کی صدائیں سنائی دینے لگتی ہیں ، آخری حدوں تک پہنچی ہوئی محبت کی قربانی - ہم اپنے بلند مقاصد کے حصول کے لئے اپنی محبتوں کی بلندیوں کو قربان کر دیتے ہیں - یہ قربانی کا فلسفہ ہے - یہ بقر عید کا پیغام ہے -

اور پھر بقر عید آ گئی -

بقر عید کے دن میرے بہت سے عزیز رشتے دار جو قربانی نہیں دے رہے تھے ، میرے ہاں مدعو تھے - وہ ایک دن پہلے ہی میرے ہاں آ گئے تھے - جھونپڑی میں خوب رونق تھی - میرے بچے شام تک اُن کو ڈبو کے کرتب دکھاتے رہے - ساری رات ڈبو کی اور چتلی کی باتیں ہوتی رہیں -

بقر عید کی نماز کے بعد میں قصاب کو لینے چلا گیا ، میرے لڑکے اور رشتے دار ڈبو کو قربانی کے واسطے تیار کرنے کے لیے واپس جھونپڑی میں چلے گئے -

جب میں قصاب کو لے کر آیا، ڈبّو مردوں اور بچوں کے جمگھٹ میں بادام کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اُس کے پنڈے پر چپکتے ہوئے سینگ چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کے جسم پر مہندی کے نقطے لکیریں اور نقش و نگار جھلک رہے تھے۔ اُس کے گلے میں گیندے کا گلاب اور ندی کے ہار لٹک رہے تھے۔ وہ ہجوم میں گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف بھاگا۔ لیکن پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہو گیا کیونکہ وہ بادام کے درخت کے ساتھ ایک زنجیر سے باندھا ہوا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا۔ وہ میرے گھر میں ہمیشہ رسی یا زنجیر کے بغیر آزاد پھرتا رہتا تھا۔ اب وہ زنجیر سے جکڑا ہوا رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی گردن تھپتھپانے لگا۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اُس کو پچکار پچکار کر پیار کرنے لگا۔

اور پھر میں اپنے لڑکوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا،

"کس نے باندھا ہے ڈبّو کو؟ کیوں باندھا ہے؟"

سب چپ کھڑے رہے۔ میرے خاندان کے ایک بزرگ نے جواب دیا:

"میاں! اب اِس کی قربانی کا وقت ہے۔ باری تعالیٰ سے دعا کرو اُس کی جناب میں تمہاری قربانی قبول ہو جائے۔ اب اس کی زنجیر کا کیا فکر کرتے ہو؟ بچوں کے ساتھ کھیل تماشے میں مشغول تھا۔ ابھی ایک سٹول پر چڑھا ہوا ڈانس کر رہا تھا۔ اب اِس کا دھیان دنیا سے ہٹا کر خدا کی راہ پر بھی تو لگانا ہے اِس کے کھلنڈرے پن کو قابو میں رکھنے کے لئے زنجیر پہنانی پڑی۔"

پھر وہ بزرگ میرا خیال چھوڑ کر قصاب سے مخاطب ہوا:

"میاں، اب دیر مت کرو۔ اِس بادام کے نیچے قربانی ہو گی، خون بادام کی جڑوں میں جائے گا۔ بکرے کا خون انگوروں اور باداموں کے لئے بہترین کھاد ہے۔"

قصاب نے زنجیر کھینچ کر ڈبو کو میرے بازوؤں میں سے نکال لیا۔ اور اس کی مرضی کے خلاف کھینچتا ہوا اُس کو بادام کے تنے کے پاس لے گیا۔ اُس نے ڈبو کے گلے سے ہار اتارا، کر رات کی رانی کی ٹہنیوں پر ٹانگ دیا۔ قصاب کی ہدایت پر میرا بڑا لڑکا ڈبّو کی پچھلی ٹانگوں کو پکڑنے کے لیے بڑھا اور دوسرا لڑکا اس کی اگلی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈبو نے ان پر سینگوں اور دولتیوں سے حملہ کر دیا اور اپنی ٹانگیں چھڑا کر میری طرف بھاگا۔ لیکن مجھ تک پہنچنے سے پہلے اس کو قصاب نے اور لڑکوں نے دبوچ لیا اور اس کو کھینچ کر بادام کی جڑ کے پاس لے گئے۔ لڑکوں نے اس کی ٹانگوں کو جکڑ لیا۔ قصاب نے اس کے طاقتور لحیم شحیم جسم کو زور کا دھکا دیا۔ ڈبّو زمین پر گر پڑا۔ اُس نے بے بس نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ ایک دل دوز آواز میں ممیایا۔ میں بے چین ہو کر چیخا،

"ٹھہرو! ایک منٹ ٹھہرو۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں۔"

سب مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ قصاب اور لڑکوں کی گرفت ڈبو پر ڈھیل ہو گئی۔ ڈبّو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کا ماتھا چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کی گردن کو تھپتھپایا اور قصاب سے اپنے آنسو چھپاتا ہوا بولا:

"مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ تھوڑی دیر ٹھہرو۔ مجھے باہر چلا جانے دو۔"

اور میں باہر کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ جب میں نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ اٹھایا، قصاب نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

"میاں، فدا کیو!"

میں دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے تھیلے میں سے ایک تیز دھار والی چھری نکالی اور اُس کو میرے سامنے پیش کرتے ہوئے بولا،

"اللہ کی راہ میں قربانی کی نیت کرکے تکبیر اور کلمہ پڑھو اور اس چھری کو ہاتھ لگا دو۔"

میں نے خاموش سوگوار نظروں سے چھری کی طرف دیکھا۔ زیرِ لب تکبیر کہی۔ کلمہ پڑھا اور چھری کو چھونے کے لئے آگے بڑھا۔ مجھے چھری کے پیچھے ڈبو کے خوبصورت مجسمے کا شاہکار نظر آیا۔ میں ہچکچا کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر میں نے اپنے خاندان کے بزرگ کا ناراض چہرہ دیکھا۔ میں نے اپنے اردگرد ہجوم کی حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھیں اور میں نے جی کڑا کرکے چھری کو ہاتھ لگا دیا۔

اور میں جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔

لیکن میں بہت دور نہیں گیا۔ میں بہت دور کیوں نہیں گیا؟ مجھے بہت دور چلا جانا چاہیے تھا لیکن میں بہت دور نہیں گیا۔ میں سب کچھ سن رہا تھا۔ میں نے اپنے ڈبو کے زمین پر گرنے کی آواز سنی۔ میں نے اپنے ڈبو کی زور زور سے ممیانے کی دردناک آوازیں سنیں۔ میرے تخیل میں ڈبو نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر کو اپنی پوری قوت سے کھینچا۔ میرے دماغ کے گنبد میں فریاد کی گھنٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ میرے دل کے محلوں میں جہانگیر کا عدل غفلت کے نشے سے جاگ اٹھا۔

میں بھاگا بھاگا اندر گیا اور چلایا۔

"ٹھہرو! یہ نہیں ہوگا، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

قصاب کی چھری ڈبو کی شہ رگ کے پاس ٹھہر گئی۔ ہجوم حیران حیران آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میرے خاندان کے بزرگ کی غضب ناک آواز گونجی:

"ایسے کیا نہیں ہو سکتا، پگلے؟ تو کیا بک رہا ہے؟ تُو تو باہر چلا گیا تھا۔ اندر کیوں آ گیا ہے؟"

میرے خاندان کا بزرگ انتہائی غصے میں جھلنگی چارپائی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، اندر سے میری بیوی کی غصے سے لرزتی ہوئی آواز سنائی دی:

"پھوپا ابا، یہ تو ملحد مرتد ہیں۔ انہوں نے تو ساری عمر ایسی کفر کی باتوں سے میری زندگی اجیرن کی ہے۔ آپ ان کی ایک نہ سنیں۔ قربانی کریں۔"

پھوپا ابا کے ساتھ قصاب اور بہت سے لوگ مجھ سے ڈبو کو چھیننے کے لئے بڑھے۔ میں نے بادام کے درخت کی جڑ کے پاس پڑی ہوئی چھری اُٹھالی۔ سب پیچھے ہٹ گئے۔ میں ڈبو کو لے کر جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

گیندے چاچے کی جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر میں نے آواز دی:

"گیندے چاچے! گیندے چاچے!"

میں اپنی آواز میں روحانیت کی آمیزش پر حیران ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ میری آواز نہیں تھی۔ کسی اور کی آواز تھی۔ کسی پیغمبر کی آواز!

جب گیندا چاچا باہر آیا، میں نے کہا:

"گیندے چاچے! عید مبارک!"

میں اس سے بغلگیر ہو گیا، اور دیر تک اس کو اپنے سینے سے لگائے کھڑا رہا پھر میں نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا اور معلوم نہیں کیوں زار زار رونے لگا اور روتے ہوئے بولا:

"گیندے چاچے! میں چتّی کو نہیں بچا سکا تھا، لیکن میں نے ڈبّو کو بچا لیا ہے۔"

---

# مرد کا فولاد

## آغا بابر

"اتنی بڑی کوٹھی ہے۔ نوکروں کے اتنے سارے کوارٹر ہیں کوئی کنبہ مل جائے جو ایک آدھ کمرے میں پڑا رہے تو کیا برا ہے۔"

"اپنے جو ہیں۔"

"صرف دو۔ ایک باورچی اور ایک اوپر کا کام کرنے والا لڑکا۔ یہ اِدھر اُدھر کھسک جاتے ہیں تو کوٹھی بالکل غیر محفوظ ہو جاتی ہے اور شام کو جب ہمیں کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو کوئی کنبہ ایسا ہونا چاہیئے جو مستقل طور پر یہاں رہتا ہو۔ جو گھر بار کا خیال تو رکھ سکے۔"

"اگر کوئی خاوند بیوی مل جائیں تو رکھ لو۔"

یہ بات جمال کی سٹڈی میں ہوئی جب وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا اور اس کی خوبصورت بیوی جسے وہ کانٹوں والا گلاب کہا کرتا تھا آکر اس کے پاس بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ جمال نے کتاب نیچے رکھ دی کیونکہ اگر کتاب نیچے نہ رکھی جاتے تو بیویاں ناراض ہو جاتی ہیں۔ اُن کا پارہ ایک دم چڑھ جاتا ہے اور یہ بات خاوندوں کے بھی ذہنوں میں اس وقت گھستی ہے جب ایسی کئی لڑائیاں وہ ہار چکے ہوتے ہیں۔ کئی لڑائیوں میں تو بیویاں خاوندوں کو جنگی قیدی بھی بنا لیتی ہیں۔ نہیں جانے دیتیں فلاں جگہ پہ۔ مار دو اپنا سارا زور۔ چھپ چھپ کے خاردار تاروں پر سے ٹاپ کر جاؤ تو؟ حد یہ کہ خاوند جب کیمپ کی خلاف ورزی کرنے پر تل جائے تو بیوی جبراً سے اچھا کھانا بھی نہیں دیتی۔ اُس کا جنرل سے سپریم ایک دم جنیوا کنونشن کی مخالفت پہ اتر آتا ہے۔

فون کی گھنٹی بجی تو خاور فون سننے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جمال سوچنے لگا۔ ہم سب P.W. ہیں۔ پرزنرز آف میرج۔ جس طرح فوج بینڈ بجاتی ہوئی میدانِ کارزار میں آیا کرتی تھی، اُسی طرح ہم باجے گاجے سے میدانِ کارزار میں اترتے ہیں اور شکست کھا کر P.W. بن جاتے ہیں۔ مہینے کے مہینے عورت مرد کی ساری تنخواہ رکھوا لیتی ہے۔ پھر P.W. پانچ پانچ دس دس روپے سگرٹ کے لئے اُس سے مانگتا ہے اور وہ خوش ہوتی ہے کہ اُس نے مرد کے اندر کا سارا فولاد کس طرح پگھلا کر اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال لیا۔ مرد بہت بڑا کباڑیا ہے۔ دھسے کے گدڑ، میلی کی چادریں۔ میموں کے اترے ہوئے فراک۔ انڈرویئر۔ باڈیاں۔ لیونڈر کی خالی شیشیاں۔ چادریں۔ پردے سبھی کچھ اُس کی جنک شاپ پر ہوتا ہے مگر عورت ذات یہ بلاتر مفت میں خرید کر کباڑیئے کو کنگال سے کنگال تر کرنے کا سوچتی رہتی ہے۔ عورت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ مرد کو کنگال کر دے اُس کے اندر اور باہر جو کچھ ہے لوٹ لے۔ کہتے ہیں ایک عورت نے ایک نواب صاحب کو کنگال کر دیا۔ جب دھکے دے کر نکالا تو اس کی اچکن کے تکمے اور ڈوریاں بھی نوچ لیں کہ چراغ میں بتی ڈالنے کی بجائے یہ ڈوریاں کام آئیں گی ۔۔۔ یہ کہانی تو کسی طوائف کی ہے۔ تو کیا ہوا؟ تھی تو وہ عورت ذات۔ مرد کو لوٹنے کے معاملے میں طوائف اور غیر طوائف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب عورت کا احمق مرد باہر سے لوٹتا ہے تو وہ خوش ہوتی ہے کہ اسے شیخ چلی فوج سے۔ گھر میں تجھے اندر سے اس طرح کھوکھلا کروں گی کہ تجھے معلوم بھی نہ ہونے پائے گا

کو ٹو لے گیا لیا اور کیا ہوا۔ اور جب تک وہ گھر کے پاس ٹھہرا رہے تو آہن نہ ہو اور تو پھر آہنگر کی بیوی اپنے سارے خوفوں کو تکیہ کے نیچے رکھ کر زندگی میں پہلی بار بے فکری سے سوتی ہے۔

۱

شہزادہ سلیم شہزادگی کے زمانے میں کتنا نڈر شکاری تھا۔ شیر سے تنہا نکٹ لیتا تھا۔ درندوں کی کھال کھنچوا دیتا تھا۔ پھر نورجہاں کا اس طرح قیدی بناکہ دربار کرتا تو نورجہاں کا ہاتھ کندھے پر رکھا رہتا۔ بیٹھا تھا تو دور تک پھیلا ہوا عدل جہانگیری سمٹ کر رکھ بن جاتا اتنا وسیع مردہ پڑا رہتا۔ عورت کبھی اُس کے کان میں تنکے دیتی کبھی اُس کی سلطنت کی دُم مروڑتی۔

مرد کو قیدی بنا کر کتنی فتحمندانہ تسکین محسوس کرتی ہے۔ اندرا گاندھی نے P.M کا ایم اٹھا کر دیا۔ وہ W بن گیا اور وہ فتحمندانہ تسکین محسوس کرنے لگی۔ جینوا کنونشن والے ٹاپتے رہے اُس نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ تمام قومیں اُس کا منہ دیکھتی رہ گئیں مگر اُس کے من میں جو تسکین و قرار کی ہلچل یا چل رہی تھیں وہ صرف وہی محسوس کر سکتی تھی۔

سوچتے سوچتے جمال کے دل میں سوال اٹھا یہ جنگی قیدی واپس آ جائیں تو کیا اُن کی بیویاں اب اُن سے کوئی بہتر سلوک کریں گی۔ یہ عمل تو صرف ڈیلو کر آئی کر دینے کا ہے وہ P.W سے پھر P.M بن جائیں گے۔ ایک عورت کی قید سے نکل کر دوسری کی قید میں ٹرانسفر ہو جائیں گے۔ بیسویں صدی کے جدت پسند مرد نے عورت کو اتنی ساری مراعات دے کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ پھر پانچ لفظوں کا بنیادی سلوگن اُس کے ذہن میں آنے لگا۔ WHAT DIFFERENCE DOES IT MAKE جس کے تحت مختلف وقتوں پر مراعات بخشی جاتی رہیں۔

اُس نے سوچا ابھی عورت ذات کا اختیار نہیں چلا ورنہ ایک پردہ خود جنتی دوسرا برابری کی خاطر مرد سے جھگڑتی اور دن مرد بہ مرد WHAT DIFFERENCE DOES IT MAKE کہہ کے جن بھی دیتا۔ مرد کے بنانے والے کی کارسازی کو دعا دیجئے جس نے بچا لیا ورنہ بیسویں صدی کا آزاد خیال مرد عورت کی خاطر یہ بھی کر گزرتا۔ جس کی کمزوری عورت ہو وہ ہر حرکت کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

جمال نے جہاں کتاب رکھی تھی وہیں پڑی رہنے دی اور اُس کے قریب کا رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ جنگی قیدیوں پر ادیبوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اُس نے مضمون رواں دواں پڑھ ڈالا۔ جب قوم اور حکومت دونوں گو مگو کے عالم میں تھی تو ادیب کہاں کا چنگیز خان تھا جو حیرت کدہ کا قلعہ پھلانگ جاتا۔ ادیب پیغامبر بھی نہیں ہوتا۔ اُسے تو جو اپنے شیشۂ حالات سے نظر آتا ہے وہ اُس کی آئینہ سازی کرتا ہے۔ وہ خفیہ پولیس کا کوتوال تھوڑا ہے کہ یہ بات اُس کے علم میں ہو کہ قیدیوں کے کیمپوں میں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں تو ایک ملک دوسرے ملک کو اپنی بھنک نہیں پڑنے دیتا۔ ریڈ کراس والے کو کیمپ میں جانے کی اجازت نہیں بیچارے ادیب کی بساط کیا۔ ورنہ وہ اپنے آپ کو جو مرضی ہو سمجھے۔ سو سال پہلے کی بات ہے غالب نے کھلے بندوں کہہ دیا تھا کہ شہر میں اُس کی کوئی آبرو نہیں۔ کوتوال اُسے قید کرنے کے درپے ہے۔ نور غالب تھا۔ نار کوتوال یا کوتوال نور تھا۔ غالب نار۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کیا دونوں کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے۔ یہ تو کاروبارِ حیات کے ہنگامہ ہائے نو بہ نو ہیں۔ قیدی نور ہے۔ اُس کی بیوی نار۔ یا قیدی سراسر نار ہے اُس کی بیوی نور۔ یہ فیصلہ کون کر سکتا ہے۔ کب پراسراریت نور اور نار دونوں میں ہے۔ اگر سلاخوں کی اوٹ میں قیدی کا پُرنور چہرہ کہانی کا موضوع نہیں بن سکتا تو قیدی کی بیوی کی دہکتی آگ کہانی کا موضوع تو ضرور بن سکتی ہے۔ مگر ایسی کہانی لکھ کر ادیب کو اپنی پٹائی کرانی ہے۔ عورت میں REASON کہاں؟ وہ تو محض جذبات کا پٹارہ ہے اور پٹارے سے سانپ نکلتا ہے۔ پانچ انگلیاں برابر

تو نہیں ہوتیں۔ یہاں ہمارا گھر نہیں ہمیں کسی کا ڈر نہیں۔ اگر ادیب اس طرح کی کہانی لکھ ڈالے تو ترقی ہو جائے۔ ایک چپ سو سکھ کا مرزا ہاوس برسوں سے ادیبوں کو دیا جا رہا تھا۔ اب پنک میں آیا ہوا ادیب آہستہ آہستہ ہی ہوش میں آئے گا۔

خاور کمرے میں داخل ہوئی تو جمال نے اُس کی پذیرائی میں یہ رسالہ بھی میز پر رکھ دیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کوئی خاندانی ہوی مل جائے تو پچھلے کوارٹروں میں رکھ لیں۔ اگر کوئی با اعتبار آدمی مل جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ جیسے تمہاری مرضی ہو کرو۔"

چند دنوں بعد جمال نے کوٹھی کے پچھواڑے میں مختلف عمروں کے چھ سات بچے ناچتے ناچتے دیکھے تو معلوم ہوا بیوی نے ایک کنبہ رکھ لیا ہے۔ میاں صبح صبح نوجی ورکشاپ میں چلا جاتا ہے اور بچوں کی کمپنی بیوی کی کمان میں چھوڑ جاتا ہے بیوی کبھی کبھی کوٹھی کے اندر باورچی خانہ میں آکر برتن دھو جاتی ہے یا باورچی کا ہاتھ بٹا جاتی ہے۔ تابڑ توڑ بچے پیدا کرنے سے بیوی میں خون کی کمی تھی جس کی وجہ سے اُس کا رنگ زرد رہتا تھا۔ کسی کسی روز وہ کمزوری کی وجہ سے نڈھال ہو کر چارپائی پر پڑی رہتی اور سر پہ دوپٹے کی پٹی باندھ لیتی۔ کمائی کم اور کھانے والے اتنے۔ سارے پیٹ ہمیشہ بھوکے رہتے۔ پہلی تاریخ کی عبادت کرتے کرتے تیس دن گذر جاتے۔ پہلی تاریخ آتی تو یہ ساری بندگی اور عبادت دھری رہ جاتی۔ پچھلے ماہ کا قرض ادھار اترتے ہی تیس دن کا پہاڑ ہمینہ منہ پھاڑے دیکھنے لگتا۔ پھر سے ادھار کی ڈوری کنویں میں لٹکا کر بوند بوند پانی نکال کر حلق تر کیا جاتا۔ غربت کے عذاب سے جب اس قدر شناسائی ہو جاتی تو بیویوں کو بچوں کی لام ڈوری کو چھوڑ چھاڑ کر نئے بالم کے ساتھ بھاگ جانے میں بھی کوئی عذر نہیں ہوتا۔

سر سے پیر تک الف ننگا لڑکا باپ کی کھلی کھلی واسکٹ پہنے ہاتھ پر رکھے نمک کو انگلی سے چاٹ چاٹ کر رکھ رہا تھا اور رات کی سوکھی روٹی کو کاٹ کاٹ کر چبا رہا تھا۔ پچھواڑے میں تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی زینب اُسی بچے کی میلی قمیص نچوڑ کر دیوار پر ڈال رہی تھی۔ جمال جب اندر داخل ہوا تو خاور روٹیوں کے سوکھے ٹکڑے ایک پیپے میں ڈلوا رہی تھی اور باورچی کی سرزنش ہو رہی تھی کہ اس جھگڑے سے میں اس طرح آٹا ضائع کیا جا رہا ہے۔

"جاؤ بیبی بچی ہوئی دال زینب کو دے آؤ۔"

خاور جمال کی طرف دیکھ کر بولی "دال بھی اب چار روپیہ سیر ہو گئی ہے کبھی سستا تھا یا اندھیر۔ ہمارے نوکروں کے تو پیٹ سے پیٹے ہوتے ہیں۔ یہ زینب کا کنبہ جو میں نے پچھلے حصے میں بسا لیا ہے دو دن سے مرچوں کے ساتھ روٹی کھا رہا ہے کل تھوڑا سا بچا ہوا سالن تھا۔ میں نے زینب کو دے دیا۔ کہتی تھی بچے اس طرح ٹوٹ کر پڑے جیسے برسوں کے بھوکے ہوں۔"

جب جمال اور خاور شام کو کسی دعوت پر جاتے تو اپنی بچیوں کے پاس زینب کو بٹھا جاتے۔ یہ بڑی ذمہ داری کا کام تھا جس کو وہ بڑے اعتماد اور شوق سے سرانجام دیتی۔ رفتہ رفتہ اُسے ٹیلیفون اٹھا کر بات کرنا بھی آگیا کمروں کی جھاڑ پونچھ بھی کرنے لگی۔ اُس نے چند دنوں میں بھانپ لیا کہ گھر پر مکمل قبضہ اور اختیار اُس کی مالکن کا تھا۔ اس پر اُسے ایک قسم کا فخر ہونے لگا ہر کام خاور کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا۔ وہی نوکروں کو ڈانٹتی ڈپٹتی۔ راشن دیتی۔ حساب لیتی۔ یہاں تک کہ صاحب کے لئے بلیڈ صابن کپڑا رومال بھی خرید کر وہی لاتی۔ صاحب دیر سے آتے تو جواب طلبی کرتی۔ لڑتی جھگڑتی تو لال پیلی ہو ہو جاتی۔ بچوں کو پیٹتی۔ صاحب کچھ نہ بولتے۔ پھر جب میٹھے بول بولتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے پیدائشی نام شیریں تھا رواجی نام خاور پڑ گیا۔

جمال موڈ میں ہوتا تو کہتا تمہارے نام میں واقعی خاتمہ پڑ گئی تھی ورنہ تمہاری زبان کی چبھن خار سے کم نہیں۔

ایک روز زینب ساتھ والے کمرے میں جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ خاور صبح سے بستر پہ بیٹھی جمال سے لڑ رہی تھی۔ زینب اپنی عقل کے مطابق کچھ اتنا سمجھ سکی کہ وہ کراچی گئے تھے تو کسی رشتہ دار لڑکی سے مل کر آئے تھے۔ سارا فساد یہی تھا کہ فیدہ کیمپ سے باہر کیسے نکل گیا۔ وہ کراچی سے پنک

پہچاننے کے لئے اجرک والے نے جو پلنگ پہ بچھا ہوا تھا۔ زینب نے خاور کی غصیلی آواز سنی۔

"میں اس اجرک پہ مٹی کا تیل ڈال کر جلا دوں گی۔ تمہاری سب چیزیں آگ میں ڈال دوں گی۔"

لڑائی سننے کے لئے زینب دور کے کونے سے نزدیک کے کونے میں آکر کرسی پر جھاڑن پھیرنے لگی۔

جمال کی آواز سنائی دی "میرے بچوں کو بھی آگ میں ڈال دو گی؟"

خاور کی آواز سنائی دی "کیا تمہیں یقین ہے یہ تمہارے بچے ہیں؟"

زینب کا ہاتھ کرسی کے پائے پہ منجمد ہو گیا، اُس نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی اوٹ سے دیکھا۔ جمال ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ایک قوی ہیکل بُت کی طرح کھڑا منہ پر صابن کی کوچی پھیر رہا تھا۔ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ بولا "ڈارلنگ ہوش میں۔ ہوش میں آؤ۔"

زینب جس کا دم گھٹنے لگا تھا موقع غنیمت جان کر کمرے میں سے جھاڑن ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی کھلی ہوا میں جا کر اُس نے لمبی سانس لی۔ اس لمبی سانس کے اندر جانے ہی مزے سے اُس کے پھیپھڑے پھول گئے کہ اُس کی ہمجنس بی بی کس طرح تنی ہوئی ملکہ کی طرح اپنی ساری سلطنت کو جلانے کے لئے ہاتھ میں ماچس لئے پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ مزا آیا نہ زندگی کا — ایک لطف آ رہا ہے بی بی کی نوکری میں جو بیان نہیں ہو سکتا، اُس کی روزمرہ کی زندگی اکتاہٹ کے عذاب سے بھری ہوئی تھی جیسے زندگی کی معراج اکتاہٹ ہی اکتاہٹ ہو۔ مگر اب اکتاہٹ نے جیسے پہلو بدل لیا اور ساری اکتاہٹ پہ ایک عجیب قسم کی مسرت اور حرارت مسلط ہونے لگی۔

اس واقعہ کو کوئی ایک ہفتہ ہوا ہو گا۔ جمال جب دفتر سے واپس آیا تو برآمدے میں کچہری لگی ہوئی تھی۔ خاور بید کی ایک تخت نما کرسی پہ بیٹھی ہوئی تھی دوپٹہ گردن کی شہ رگ کے ساتھ لگا ہوا تھا جس کے دونوں کنارے کندھوں کے پیچھے لٹک رہے تھے۔ سامنے بیٹھے تھانیدار سے سینہ پھلا پھلا کر باتیں کر رہی تھی فرش پہ زینب بیٹھی تھی جس کی بائیں آنکھ نیلی ہو چکی تھی اور تمام چہرے پہ چوٹوں کے نشان تھے۔ مضروب بازو اُس نے اپنی گود میں یوں رکھا ہوا تھا جیسے نومولود بچہ ہو۔ پولیس کا ایک سپاہی ساتھ والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ زینب کے چھ بچے سیاہی کے دھبوں کی طرح برآمدے کے فرش پر بکھرے پڑے تھے۔

خاور جمال سے خطاب کرتے ہوئے بولی "دیکھئے تو اس کے خاوند نے اس غریب کو مار مار کر نیلا کر دیا ہے۔ اب یہ ان چھ بچوں کو لے کر کدھر چلی جائے۔ ایک ان غریبوں کو کھانے کو نہیں دیتا اوپر سے الٹا اس طرح کی بے رحمی کرتا ہے جلاد۔ یہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ لے جائیے اس کو پکڑ کر تھانیدار صاحب۔"

جمال نے اپنے مجرم سے مخاطب ہو کر پوچھا "تم نے مارا ہے؟"

"جی۔"

"کیوں؟"

"میرے آگے بولتی ہے۔"

"تھانیدار بولا" اسے اتنا تو نہیں مارنا تھا کہ مرن برابر ہو جاتی۔ صاحب کے گھر میں کام کرتی ہے۔ بیگم صاحب اتنا خیال رکھتی ہیں ...."

یہ سن کر زینب سسکیاں بھرنے لگی۔

خاور بولی "دیکھو، غریب کا بازو توڑ دیا۔ اس لئے کہ اس کا کوئی والی وارث نہیں۔ بچہ ہونے والا ہے غریب کا اگر وہ ضائع ہو جاتا تو؟"

جمال نے پوچھا "تم نے اس بری طرح لہو لہان کیوں کر دیا اسے؟"

زینب کا خاوند رک رک کر کہنے لگا "جی۔ جی۔ دیکھئے نا۔ یہ کوئی عورت کہہ سکتی ہے۔ کوئی عورت کہہ سکتی ہے۔ خاوند قتل نہ کر دے اُسے۔ کوئی کہہ سکتی ہے جی"

پھر وہ چپ ہو گیا۔ خاموشی کا ایک لمحہ گزر گیا۔ گزرتا چلا گیا۔

تھانیدار نے پوچھا "تمہیں گالی دی ہے؟"

"جی گالی سے بھی بدتر"

"کیا کہا ہے اِس نے؟" تھانیدار نے غصے سے پوچھا۔

"کہتی ہے۔ یہ بچے۔ چھ کے چھ۔ میرے نہیں ہیں۔ باہر سے لے کر آئی ہے"

اب خاموشی کا لمحہ بوجھل ہو گیا۔ اِس لمحہ کا سارا سنگین بوجھ زینب پر جا پڑا۔ جمال کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے پہلے خاور کی طرف دیکھا پھر تھانیدار کی طرف دیکھ کر بولا "اتو کی پٹھی۔ دونوں کو لے جاؤ تھانے"

اور خود دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

نوکر نے سامنے چائے لا کر رکھی تو بولا "بیگم صاحب سے جا کر کہو چائے تیار ہے"

نوکر آ کر بولا "کہتی ہیں۔ میں صلح کرا کے آتی ہوں"

اگلے روز جمال جب دفتر سے آیا تو خاور نے بتایا کہ زینب کا خاوند بڑا کمینہ نکلا۔

"کیا ہوا؟"

"حالانکہ رات میں نے اور تھانیدار نے صلح صفائی کرا دی تھی۔ صبح آپ کے جانے کے بعد بیوی بچوں کو ہانک کر لے گیا۔ بیوی اور بچے میری طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں اُن سب کی دشمن ہوں"

جمال نے باورچی سے پوچھا "تم نے نہیں روکا"

"جی چاچا چاچا کہہ کر بہت روکا۔ کہا دیکھو مفت میں کوارٹر تھا۔ پانی تھا سو سہولتیں تھیں۔ مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ الٹا مجھ سے گرم ہو کر کہنے لگا "جاؤ جی، جہاں مرد کو مرد بن کر رہنے نہ دیا جائے وہاں کون رہ سکتا ہے"

خاور بولی "دفع کرو"

"باورچی نے کہا "دفع کرو جی۔ کوئی اور آ جائے گا۔ جسے مفت کا کوارٹر ملے گا۔ کیوں نہیں آئے گا"

دوسرے تیسرے دن ہی ایک ناٹے قد کی عورت نے آ کر خاور سے بڑی لجاجت سے پوچھا "بیگم صاب سنا ہے آپ کے پاس ایک کوارٹر خالی ہے۔ بیگم صاب ہمیں رکھ لیجیے۔ دعائیں دیں گے۔ پندرہ روپے ایک کوٹھڑی کا کرایہ دیتے ہیں وہ بچ جائے گا۔ ہم غریب آدمی ہیں، بدلے میں آپ کا چھوٹا موٹا کام کر دیا کروں گا"

"کل کتنے ہو؟"

"چار جی ہیں۔ میں میرا گھر والا۔ بارہ سال کا لڑکا۔ لڑکی بیاہی ہوئی ہے جو اپنے گھر چلی جائے گی۔"

"مرد کیا کام کرتا ہے؟"

"شہر میں نوکر ہے۔ صبح چلا جاتا ہے شام کو آتا ہے۔"

"وہ سامنے والی کوٹھڑی ہے وہ چھوٹا بنا ہوا ہے۔ باہر نل اور پیچھے ہے۔"

ایک ہی دن میں انہوں نے کوٹھڑی کے سامنے کی زمین کھود کھاد کر تلسی کے پودے لگا ڈالے۔ ماں اور بیٹی نے جھاڑ و پکڑ کر سارا حصہ صاف کر ڈالا۔ چھ مہینے اور بلند قسم کے بچوں نے جو گندگی پھیلا رکھی تھی ساری صاف ہو گئی پچھواڑے کا سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ عورت ستھرا اور صفائی پسند معلوم ہوتی تھی۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ بھرا بھرا بدن۔ برتنوں کو ملتے دھوتے وقت برتنوں کی کھنکھناہٹ سے چوڑیوں کی چھنک زیادہ سنائی دیتی۔ جمال کو دیکھتے ہی سر پر دوپٹہ سے لیتی۔ جب آتی سلام کرتی۔ جب کام سے فارغ ہو کر جاتی سلام کر کے جاتی۔ نہالی پلیٹ میز پر قرینے سے رکھتی۔ کمروں کی جھاڑ پونچھ کرتی۔ جمال اور خاور کی غیر حاضری میں بچوں کے پاس بیٹھ کر سوداگروں اور تجاروں کی کہانیاں سناتی۔ ٹیلیفون اٹھا کر بات بھی کر لیتی۔

جب مہراں نے چھٹی والے دن بچیوں کے سروں میں سے جوئیں نکالیں اور شیمپو سے ان کے بال دھو ڈالے تو معلوم ہوا گنوں والی عورت ہے اور زینب سے کئی گنا بہتر۔ زینب تو صرف بچہ کش عورت تھی۔ بغیر بریک کے چلتی چلی گئی تھی۔ ایک دو تین چار پانچ چھ۔ ساتواں شاید پیٹ میں تھا یا جھوٹ بولتی تھی اطراتی اور سیٹھنے پر ضائع نہ ہو جاتا۔

اتوار کو جو شخص ڈاڑھی والا شخص بوکے پھولوں کے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ مہراں کا خاوند تھا۔ کسی افسر کی پرانی خاکی قمیص پہن رکھی تھی اور نیچے بہت گھیردار شلوار تھی۔ چہرے مہرے سے خاصا معقول شخص معلوم ہوتا تھا۔

"سر اگر آپ اجازت دیں تو یہ جو تھوڑی سی زمین خالی پڑی ہے اس میں آپ کے لئے پیاز اور لہسن لگا دوں۔"

"بڑا اچھا خیال ہے۔" جمال بولا۔ "تم زمین تیار کر دو میں کل ہی بیج منگائے دیتا ہوں۔"

وہ بیلچہ لے کر زمین کھودنے لگا۔ اگلے روز کھاد ڈال دی اور اس سے اگلے روز بیج ڈال دیئے۔

جمال دفتر گیا ہوا تھا۔ خاور بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی کہ مہراں کے کوارٹر میں سے زور زور سے رونے کی آواز آئی۔ یہ مہراں کی جوان لڑکی کی آواز تھی۔ جیسے اُسے کوئی مار رہا تھا۔

خاور کوارٹر کی طرف چل دی۔ وہاں چارپائی پر دو مونچھوں والے مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مرد مہراں کی لڑکی کے سر پر پیار دے کر پچکار رہا تھا اور وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی۔

خاور کو دیکھ کر مہراں کوٹھڑی سے باہر آ گئی۔ بولی۔ "ضد کرتی ہے۔ سسرال نہیں جا رہی۔"

لڑکی ایک ہی بات رٹے جا رہی تھی: "میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے مار دو۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

خاور نے پیار کے دو بول کہہ کر گلے لگایا۔ وہ چپ ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟ تم اپنا دکھ مجھ سے کہو۔ روتی کیوں ہو۔ کوئی زبردستی تو نہیں بھیجتا۔"

لڑکی کے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ بولی: "میری انگلیاں دیکھو، ساری پوریں زمین سے مونگ پھلی نکال نکال کر چھل گئی ہیں۔ میں جھاڑو بہاری کا کام یہاں بھی کرتی ہوں۔ وہاں بھی کر سکتی ہوں مگر میں ان کے طعنے نہیں سہہ سکتی۔ ماں کے باعث میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا ہے۔"

مہراں نے لڑکی کو سینے لگانا چاہا تو لڑکی نے اُسے یوں دور پھینک دیا جیسے لڑکی کے وجود میں کوئی جن آ گیا ہو۔ وہ بدرنگ صورت شخص جو لڑکی کے سر پر پیار دے کر پچکار رہا تھا خاور کے قریب آ کر بولا "میں لڑکی کا سسر ہوں۔ یہ لڑکی کا ماموں سسر ہے۔ یہ لڑکی کا چاچا سسر ہے۔ ہم سب اس کو لینے آئے ہیں۔ یہ کئی مہینوں سے روٹھ کر آئی ہوئی ہے۔ حالانکہ یہ ہماری عزت ہے ہم اس کی عزت ہیں۔"

سمجھوتے کا امکان دکھائی دیا تو لڑکی پھر سے دھاڑیں مارنے لگی: "یہ سب جھوٹے ہیں۔ مر جاؤں گی پر جاؤں گی نہیں ان کے ساتھ۔"

لڑکی کا سسر شرمندہ ہو کر بولا: "اچھا نہ جاؤ۔ بلا شک نہ جاؤ۔"

پھر سرگوشی سے بولا: "بیگم صاحب آپ سے ایک بات پردے میں کرنی ہے۔"

خاور اُسے لے کر کوٹھی کے برآمدے کی طرف چل دی۔ وہاں بیٹھ کر اُس آدمی نے کندھے پر پڑے ہوئے رُمال سے اپنا منہ پونچھا اور بولا۔

"جی بات صرف یہ ہے کہ برادری میں ہم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔"

خاور بڑی حاضر ہو کر بولی: "لڑکی کا کسی اور سے تعلق ہو گیا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"اپنے مرد سے شکایت ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر جاتی کیوں نہیں؟"

"ماں کی وجہ سے۔"

"ماں پٹی پڑھاتی ہے۔"

"جی نہیں۔"

"تو پھر بات کیا ہے؟"

"جی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس کی ماں بے نکاحی رہ رہی ہے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"آپ کو علم نہیں۔ جس کے ساتھ رہتی ہے۔"

"یہ اس کا خاوند نہیں؟"

"جی نہیں۔ لڑکی اور لڑکے کے باپ کو چھوڑ کر اس مرد کے ساتھ رہ رہی ہے۔ آدمی بندہ بشر ہے کبھی غصے میں آ کر ساس یا نند کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ تیری ماں بے نکاحی رہ رہی ہے تو یہ بات لڑکی کو بری لگتی ہے۔ گاؤں والے بھی اس بات کا طعنہ دیتے ہیں تو لڑکی روٹھ کر ادھر آ بیٹھتی ہے۔ بس بات صرف اتنی ہے۔ لڑکی کو بلا شک پوچھ لیجیے۔"

لڑکی کو نہ جانتا تھا نہ گئی۔ باورچی خانے کے ساتھ والے کمرے میں تنہا بیٹھ کر خاور نے مہران کو بہت سمجھایا کہ تو اپنی خاطر جوان لڑکی کی زندگی تباہ کر رہی ہے۔ اپنی اولاد کے باپ کو چھوڑ کر ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ تمہاری جوان جوان لڑکی کے سسرال والوں کا یہ طعنہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ اپنے داماد کا کچھ خیال کر وہ کیا کہتا ہوگا۔ مگر مہران خاموش۔ ایک چپ۔ سب باتوں کا جواب خاموشی۔ جب خاور نے بہت زور مارا تو اُس نے کہا: "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ چھوڑ دوں گی۔"

دوسرے روز باورچی نے آ کر اطلاع دی کہ مہران کا کنبہ راتوں رات کہیں چلا گیا۔

جمال کو جب خاور نے مہران کا قصہ سنایا تو اُس کا خیال تھا کہ جمال کچھ کہے گا۔ لیکن وہ صرف مسکرا کر دفتر چلا گیا۔ جیسے اُس کے لیے ہوا ہی کچھ نہیں وہ جانتا تھا عورت اپنے قیدی کو کیوں رہا کرے۔ وہ قیدی کو لے کر بھاگ گئی۔

کوٹھی کا یہ حصہ اب سنسان دکھائی دینے لگا۔ کوئی کام کی عورت نہ ملتی تھی۔ آخر خاور کی اجازت سے باورچی نے گھر خط لکھ کر اپنی بیوی کو بلا لی۔ دوسری کوٹھڑی میں جمال کا ایک چپراسی اپنے بیوی بچوں سمیت آ رہا مگر کونے والی کوٹھڑی خالی پڑی رہی۔ جمال کی ہدایت تھی کہ دفتر کے چپراسی کی بیوی سے گھر کا کوئی کام نہ لیا جائے استحصال ہوتا ہے اور اس طرح گھر کی بات دفتر تک پہنچ جاتی ہے۔ باورچی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اُس کی بیوی بغیر تنخواہ کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔ ضرورت ویسی کی ویسی رہی۔ گھر میں ایک ایسی معمر عورت ہونی چاہیئے جو وقت بے وقت چھوٹی بچیوں کے پاس رہ سکے۔

ایک روز خاور دھوبن سے دھلائی لے رہی تھی کہ کسی ملنے والی کا رقعہ پکڑے ایک بی بی حاضر ہوئی۔ رقعہ میں لکھا تھا اگر کوارٹر خالی ہے تو اس غریب عورت کو رکھ لو۔

عورت کے چہرے پر عبادت کی شرافت تھی۔ چہرہ اور ہاتھ اس طرح صاف ستھرے تھے جیسے اُس نے کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے کہیں باہر بیٹھ کر صابن سے منہ ہاتھ دھویا ہے اور پھر دوپٹے سے اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا ہے۔ چہرے کی کھری گندمی کھال پر نام کی چکناہٹ نہ تھی۔

خاور نے اُس کی طرف دیکھ کر پھر پرچہ پڑھنا شروع کر دیا۔ لکھا تھا۔ پانچ وقت کی نمازن ہے۔ پاک صاف رہتی ہے۔ دکھیا ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ دعا دے گی۔

"بال بچے نہیں ہیں؟"

"جی نہیں تو۔"

"خاوند؟"

"جی ہے سیمنٹ فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ صبح صبح چلا جاتا ہے شام کو آتا ہے۔"

"ہے نا۔ میرا مطلب ہے۔ نکاح پڑھا ہوا ہے نا؟"

"میں خنزیر کھانے والی ذات نہیں ہوں۔ خدا کو جان دینی ہے بیگم ساب۔"

"تمہارے ساتھ رہے گا نا۔"

"جی۔ اگر آپ مہربانی کریں۔"

"بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہو؟"

"بہت اچھی طرح"۔

"یہاں تم سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ وقت بے وقت ہمیں باہر جانا پڑے تو تم بچیوں کے پاس آ کر کمرے میں بیٹھ جایا کرو۔ بس اتنا ہی کام ہے۔ نوکروں کے پاس تو بچیوں کو نہیں چھوڑا جا سکتا نا؟"

"آپ مجھے اپنی کوٹھی کا تالہ سمجھیں۔ میں آپ کے در پہ آ بیٹھی تو پھر مجھے کہاں جانا ہے۔ میرا کون ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اپنے خاوند کو لے کر آؤ۔ میں اس سے بھی بات کروں۔"

"آج شام لے آؤں۔"

"لے آؤ۔"

خاوند کالا رنگ جیسے کوئی حبشی۔ طوطے جیسی ناک۔ بلی کی سی آنکھیں۔ پھرتیلا بدن۔ جتنے بیوی کی گندمی کھال کے مسامات خشک اور دبے ہوئے تھے اُس کے خاوند کی سیاہ کھال کے مسامات کھردرے اور شور آلود، جتنا سوتلی سے اور مونجھ سے بٹی ہوئی رسی میں فرق۔

دن میں وضو کا پانی پانچ وقت جب نجر کیاری میں گرنے لگا تو تلسی کے پودے یوں کھڑے ہو گئے جیسے کوئی دیوی گاؤشالہ میں اشنان کرنے آ پدھاری ہو اور اُسے دیکھنے کو تلسی کی پتیاں آنکھوں آنکھوں میں سرگوشیاں کرنے لگی ہوں کہ دیوی کے ننگے ننگے رنگ کو دو سروں سے کپڑا پورا چھپاتا ہے اور آپ آپ جی بھر کے دیکھنا ہے۔

زیباں چلتی پھرتی منہ میں کچھ پڑھتی رہتی۔ اُس کی پانچ وقت کی نماز کا باورچی اور چپڑاسی کی بیوی پر بڑا رعب پڑنے لگا۔ بچیوں نے مہرال سے سوداگروں اور بنجاروں کی کہانیاں سنی تھیں۔ اب زیباں انھیں پیغمبروں کی کہانیاں سنانے لگی جو بچیوں کے کمزور ذہن کے لیے بہت ٹھوس اور ثقیل تھیں مگر وہ سن لیتیں جیسے زیباں اُن کی کوئی اتالیق بن کر آئی تھی۔

یہ سب باتیں جمال کے علم میں بھی آتی رہیں مگر جو ہوں کرے نہ ہاں وہ فقط خاموش تماشائی کہلاتا ہے اور کئی خاموش تماشائی خوش ہوتے ہیں یہ دیکھ کر کہ چلو بیوی کسی کام میں لگی ورنہ بیوی تو لڑتے ہی لڑے۔ قیدی پر گولی چلانے کو آوے ہی آوے۔

خاور غسل کر کے نکلی تو دو چار چھینکیں آئیں۔ پھر اعضا شکنی محسوس ہوئی اور بخار ہو گیا۔ کھلے بالوں کے ساتھ ہی بستر پر لیٹ گئی۔ نیند بند ٹوٹنے لگا تو اُس نے زیباں کو بلوا کر کہا "میرے کندھے اور ٹانگیں زور زور سے دباؤ مجھے بخار ہو رہا ہے۔"

پھر خاور اپنے تپتے ہوئے ماتھے پر سے بالوں کی لٹوں کو ہٹاتے ہوئے بولی "زیباں تم نے یہ دبانا کہاں سے سیکھا؟"

"کیوں بی بی، اچھا دباتی ہوں؟"

"دائیوں کی طرح دباتی ہو۔ دائی رہی ہو؟"

"دو سال دائی گیری کی ہے۔"

"چھوڑ دی کیوں؟"

"بس چھوڑ دی۔"

"پھر بھی"

"سلطان میرا دوسرا خاوند ہے"

"یہ سلطان حبشی . . . . . ."

زیباں منہ پر چوڑے کر مسکرائی "میرا مزازی خدا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر مجازی خدا کا کوئی مسئلہ نہ چھیڑنا۔ پہلے کو کیا ہوا؟"

"بڑی مختی تھا خاوند۔ بچے چھین کر مجھے طلاق دیدی۔ وہ بچے اب جوان ہیں۔ اُن کو دیکھنے کو ترستی ہوں۔ مگر وہ ملنے نہیں دیتا۔ آپ کے بال ماتھے پر پڑ رہے ہیں۔" زیباں نے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں سے لے کر سمیٹا پھر کچی پکی چٹیا کر ڈالی۔ نمارہ چڑھنے کے ساتھ ساتھ خاور کا جی باتیں کرنے کو چاہنے لگا۔

"میں جانوں۔ آپ کو سر دھونے کے بعد ٹھنڈ لگ گئی۔"

"ایسا ہی ہوا۔"

"سائیں سلامت رہے۔ آپ روز روز سر دھوئیں۔ مجھے حکم دیں تو ابٹن بنا دوں۔ نہانے سے پہلے بدن پر مل کر غسل کریں تو کھال ریشم جیسی ہو جائے اور خوشبو الگ پھوٹتی رہے۔"

"اچھا یہ تو دائی کیسے بن گئی۔ یہ تو بتاتی نہیں۔"

"جی اللہ آپ کا بھلا کرے آپ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں جب اُس نے گھر سے نکال دیا تو ماں کے گھر ہی آ بیٹھی تھی۔ ہمسائی ہماری دائی تھی۔ میں نے کہا مجھے بھی ساتھ لے لیا کرو۔ تھا ہی کیا۔ میں نے دائی گیری سیکھ لی۔ لوگوں کو بچے جنا کر یوں معلوم ہونے لگا جیسے میں نے جنے ہوں۔ میری ماتنا جاگتی اسے مارتی پھر کسی اور محلے میں بچہ جناتی میری ماتا پھر جاگتی۔ پھر مارتی۔ یہ روگ جب مجھے سختی سے کھانے لگا تو میں نے ماں سے کہا۔ وہ سمجھدار تھی بولی دائی گیری چھوڑ کر کسی کے گھر بیٹھ جاؤ۔ مجھے پیر ساب کے پاس لے گئی انہوں نے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکا اور کہنے لگے۔ مزازی خدا تیرے انتظار میں کھڑا ہے۔ ایڑ لگا اور خندق پار کر جا۔ اب جس گھر دائی گیری کے لئے جاؤ وہاں جو مرد سب سے پہلے ملے ہمیں یاد کر و اور اُس کی طرف دیکھو۔ سلطان کے گھر چوتھی لڑکی جنوانے گئی تو سب سے پہلے سلطان ہی ملا۔ میں نے پیر ساب کو یاد کیا۔ سلطان کی طرف دیکھا اور دیکھتی چلی گئی اور وہ میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ پھر نکاح پڑھوا لیا۔ اب وہ میرا مزازی خدا ہے۔"

"اُس کی پہلی بیوی؟"

"اب یہ اُس کے پاس نہیں جاتا۔ وہ گاؤں چلی گئی۔"

"میرے اوپر چادر دیدو۔ جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

سہ پہر کو جب باورچی چائے کی پیالی بنا کر لایا تو خاور کی آنکھ کھلی بخار قدرے ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ گھٹنوں پر چادر لے کر بیٹھ گئی اور چائے پیتے پیتے سوچنے لگی ان عورتوں کو کس طرح پہچانا جائے۔ مگر وہ تو اُس کی ذاتی زندگی ہے۔ جمال کو یہ باتیں بتانے کی کیا ضرورت ہے جیسے عام رائے شماری میں اپنی ہم جنس کی عزت کا سوال بیچ میں آ پڑے۔

باورچی کی اپنی بیوی کے ذریعہ روایت تھی کہ زیباں پانی پہ کچھ پڑھ پڑھ کر اپنے خاوند کو پلاتی رہتی تھی کہ اُس کا دل اُس کی طرف مائل رہے۔ تیُسی کے پردوں کے نیچے کانسی کی مورتی گیلے بال شانوں پہ ڈالے ہاون دستے میں کچھ کوٹتی چھانتی رہتی۔ یا مُصلّا بیٹھے نماز پڑھتے وضو کرتے دکھائی دیتی۔

ایک روز زیباں نے پلاسٹک کی ٹوکری میں پڑیاں ڈالیں۔ اوڑھنی لی اور اپنی کوٹھڑی کو تالا لگا کر چلدی۔ باورچی سودا لینے گیا ہوا تھا۔ چپڑاسی اور باورچی دونوں کی بیویاں سلام کر کے خاور کے پاس آ بیٹھیں اور بولیں "آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" پھر شرمانے لگیں۔

"کہو۔"

وہ پھر ہچکچائیں۔

باورچی کی بیوی بولی "لاج آرہی ہے۔"

خاور نے چپڑاسی کی بیوی کی طرف منہ کر کے کہا "تمہارے تین بچے ہیں۔ تمہیں بھی لاج آرہی ہے؟"

چپڑاسی کی بیوی نے کہا "بیگم صاب ہم زیباں سے بہت تنگ ہیں، صبح صبح اٹھ کر سر دھو لیتی ہے۔ پھر بالوں کو جھٹکتی پھرتی ہے، اور مٹک مٹک کر کہتی ہے نی نابکارو۔ گندیو۔ صبح اٹھ کر اپنا سر دھویا کرو۔ سارا دن ناپاک رہتی ہو خدا رسولؐ کا حکم ہے کہ عورت کو پاک صاف رہنا چاہیے۔ میری طرف دیکھو میں پہلے اٹھ کر اپنا سر دھوتی ہوں پھر اپنے مزازی خدا کو چائے پلا کر کام پہ روانہ کر دیتی ہوں اور شام کو اس کے لئے پھر تیار ہو جاتی ہوں۔ نہ میری کبھی ناف ٹل ہے۔ نہ میری کبھی کمر دکھتی ہے۔ نہ مجھے کبھی کمر میں درد نہ کبھی پسلی میں درد۔ بیگم صاب کی ناف ٹل گئی تھی۔ میری دوا کھا کر نو بر نو ہو گئی ہیں۔"

"کیا؟"

"جی۔"

"یہ کہتی تھی۔"

"جی۔"

"مجھے تو بخار آیا تھا۔"

چپڑاسی کی بیوی بولی "جی باورچی نے بتایا تھا ہمیں۔ آپ کو سردی لگ گئی تھی۔"

"اور کیا کہتی تھی؟"

باورچی کی بیوی بولی "مجھے اگر پتیاں دیتی تھی کہ دم کی ہوئی ہیں انھیں اپنی کوٹھڑی میں اس وقت جلا لیا کر جب تمہارا خاوند تمہاری چارپائی پہ آئے۔"

چپڑاسی کی بیوی بولی "مجھے کہتی تھی۔ نی جھلیئے عورت کو کبھی خاوند کی چارپائی پہ نہیں جانا چاہیے۔ مرد کا تو ہا مانو۔ مگر اپنا زیادہ مزا اُٹھ۔ مرد تو ہے ہی چھلنے پھٹنے والے کسی دھوبی لوہار کی اولاد۔ عورت کیوں نہ دھوبن بن کر دھوبی کی میل صاف کر ڈالے اور لوہار کے لوہے کو اپنی بھٹی میں گال کر اُس کا گھگھو گھوڑا بنا ڈالے۔ یہ ایک ایک روپے کی پڑیاں ہیں۔ ان سے منہ دھویا کرو اور مسامات کو خشک کرنے والی یہ بھی ایک دوا ہے یہ بھی لے لو۔"

"پھر؟"

"بیگم صاب۔ نہ میں نے برتی نہ اس نے۔ یہ پڑیاں ہم دو پٹے میں باندھ کر آپ کو دکھانے کو لائی ہیں۔ ہم نے تو ابھی تک پیسے بھی نہیں دیئے۔ روز پوچھتی ہے۔ تم سالی استعمال کی۔ ہم جھوٹ بول دیتی ہیں ہاں۔ پھر ہم سے اور طرح کی باتیں پوچھنے لگتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بس آگے مت بولو۔ خاموش ہو۔ یہ پڑیاں یہیں رہنے دو اور تم جاؤ۔"

خاور کے سر پہ بہت دیر تک بوجھ کی ایک سل پڑی رہی کہ اس نے کس طرح کی عورت کوٹھی میں رکھ لی۔ کتنی بار وہ اُس کو اپنی معصوم بچیوں کے پاس چھوڑ کر گئی تھی۔

دن چڑھا۔ جمال دفتر گیا تو خاور نے زیباں کو بلا کر ساری باتیں پوچھ ڈالیں۔ پڑیاں دکھائیں۔ باورچی اور چپڑاسی کی بیویوں کے روبرو بات کر ڈالی۔ زیباں پہلے تو خاموش سوچتی رہی پھر خاور کے گھٹنے پکڑ کر بولی "معاف کر دو بیگم صاب بھول ہو گئی۔"

پھر اپنے کانوں کو پکڑ کر کہنے لگی "آئندہ سے توبہ۔ اِس بندی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلے گی۔"

"بس ابھی ابھی اپنا سامان اٹھاؤ اور کوٹھڑی خالی کر دو۔"

اِس وقت میرا مرد گھر نہیں ہے۔ بی بی وہ شام کو آئے گا۔ مجھے معافی دے دو۔ معافی دینا تو سنتِ رسولؐ ہے۔ بندے کو خدا معاف کر دیتا ہے۔"

"دفع ہو جا۔ شام کو جب وہ حبشی غلام آئے تو کمرہ خالی کر دو۔ تمہارا زیادہ بولنا اب مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

مغرب کے وقت جمال برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ سلطان نے آ کر سلام کیا اور دبے دبے لفظوں میں کہا کہ بیگم صاحب زیباں سے کسی بات پر ناراض ہو گئی ہیں۔ اُن سے معافی دے دی جائے اور کوٹھڑی سے نکالا نہ جائے۔

"مجھے تو کچھ معلوم نہیں کیا ہوا۔ پوچھ کر بتا سکتا ہوں۔"

اندر آ کر اُس نے خاور سے وجہ پوچھی تو اس نے اُسے ساتھ والے کمرے میں لے جا کر آرام سے ساری بات سنا ڈالی جسے سن کر جمال صرف مسکرا دیا اور برآمدے میں آ کر بولا "اے اسیرِ زلف، تمھیں کوارٹر خالی کرنا ہو گا۔ سن لیا۔ ہمارے مہمان آ رہے ہیں۔ ان کا ڈرائیور وہاں ٹھہرے گا۔"

اگلے روز مہمان آئے نہ ڈرائیور البتہ کوئی غرض مند مرغیوں سے ٹھسا ٹھس بھرا ٹوکرا دے گیا۔

باورچی نے آ کر کہا "جی۔ میں نے ٹوکرے سے نکال لی ہیں۔"

خاور نے پوچھا "کتنی ہیں؟"

"دو مرغے، سات مرغیاں مگر اُن کو بند کہاں کروں گا۔"

"جو کوٹھڑی کل خالی ہوئی ہے اُس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جمال طنزاً بولا "جادوگرنی والی۔"

خاور نے کہا "حبشی غلام والی۔"

یہ دو خطابات سن کر باورچی مسکرایا اور چل دیا جیسے اُس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی کسی سے تخصیص نہ کرو مالکو، ہر عورت جادوگرنی اور ہر مرد حبشی غلام ہے۔ کوئی نر ہے نہ نار، سارا جھگڑا مرد کا کشتہ بناتا ہے۔ اُس کے یہاں فولاد جو بہت ہوتا ہے۔

# توجّہ کی طالب

بانو قدسیہ

جس انسان کو اپنا دل نہ چاہے اُس کا تو پیار بھی پنجالی کی طرح گلے کا بوجھ بن جاتا ہے۔ لاکھ جی کو مناؤ وہ محبّت کا جواب محبّت سے دے ہی نہیں سکتا۔ نصرت بھی اپنے چاہنے والوں کے سینے کا بوجھ، گلے کا پھندا اور ضمیر کی کڑکی رہی تھی۔ اُس کے چاہنے والے سیاحوں کی طرح آتے اور پھر وقت بیتنے پر اپنے اپنے دیس لوٹ جاتے۔ پرانی پیالیوں جیسی سوغاتیں ٹوٹی پھوٹی یادیں بھی عموماً اُن کے پاس نہ ہوتیں۔

نصرت نے کل آٹھ عشق کئے۔ لیکن زیادہ تر ان میں ایسے تھے جو اوورکوٹ کے اندر لگے ہوئے قیمتی استر کی طرح چھپے چھپائے ڈھکے ڈھکائے ہی رہ گئے۔ نہ گھر میں دھماکا ہوا نہ دل میں۔ وجہ غالباً اتنی تھی کہ گھر کے جن پینٹ شدہ لڑکیوں پر نصرت نے توجہ کی ٹارچ ڈالی وہ یکسر نصرت کی محبت سے خالی تھے۔ ہر شعلہ زبردستی اُسی نے انگیخت کیا لیکن چونکہ سلگنا سلگانا ان عاشق صفتوں کا اپنا اندرونی فعل نہ تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ جامد رہے اور کوئی حرفِ محبت اُن کی ذات سے جنم نہ لے سکا۔

نصرت دراصل آکسیجن گیس تھی جتنی دیر وہ بھڑکاتی رہتی آگ لپکتی رہتی جونہی وہ خود آزمانے یا تسانے کو خود علیحدہ ہو جاتی عشق کا شعلہ چھوٹی چھوٹی تحقیقاتی کمیٹیوں کی طرح اپنی موت آپ مر جاتا۔ اتنے سارے عشق کرنے کے بعد جب وہ مکمل طور پر پچھاڑے ہوئے پہلوان کی طرح منہ سے بدنامی کی دھول پونچھتی ہوئی اٹھی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ اپنے چاہنے والوں کے جی کا جنجال تھی اور جس کو انسان کا اپنا دل نہ چاہے وہ چاہے ہیرے موتیوں سے بنا ہو اُس کا پیار بھی پنجالی کی طرح گلے کا بوجھ بن جاتا ہے۔ گھر کے چچیرے ممیرے خالہ زاد پھوپھی زاد سب بھائی قسم کے رشتے اُس کے لئے بیکار تھے۔ عشق کی منزلوں سے وہ یوں فارغ ہوئی جیسے عمر رسیدہ عورت حیض کی لعنت سے فراغ پا جائے۔

نیم چھتی میں جہاں اَن گنت پرانے کھوکھے، ٹوٹے ہوئے بیڈ لیمپ، ان کھدے مٹی سے اٹے صندوق، پینل کے سبک رو بگلے، تیلیوں سے بنی ہوئی تصویریں، میڈیکل اور لاء کی پرانی کتابیں، تین ٹانگوں والی کرسیاں، بغیر تانت والے ریکٹ، ادھڑی ہوئی نواڑ، ٹیڑھے کیرم بورڈ، سائیکلوں کی پرانی چینیں اور کاروں کے پنکچر ٹائر ٹھسم ٹھسا بھرے ہوئے تھے۔ وہیں ایک پرانا تخت پوش نانی اماں کے عہد کی نشانی بھی پڑا تھا۔ یہ شکستہ پٹیوں والا تخت پوش نصرت کی راجدھانی تھی۔ اس پر نیم دراز ہو کر وہ بڑی آزادی سے ہر قسم کی بات سوچ سکتی تھی۔ مذہب، جنس، خاندانی تعلقات، دوستی، رشتہ داری، عہد شیرات کے معاملات، مغربی ممالک سے لوٹنے والے رشتہ دار، جنگ امن، ہندوستان، اسرائیل غرضیکہ سوچ کی کوئی سمت ایسی نہ تھی جو اُس کے جہان نما میں نہ سمائی ہو۔ یہاں لیٹ بیٹھ کر اُس نے اپنے گھر والوں کے برہنہ، نیم برہنہ ایکسرے تیار کر رکھے تھے۔ یہاں اُس کے پاس اپنے رشتہ داروں کے ایسے زائچے تھے جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے مشابہہ نظر آتے تھے۔ اسی پر کیا موقوف تھا۔ سوچ نے تو خود اُس کی اپنی ذات کو نہیں چھوڑا تھا۔ جب وہ اپنے آپ پر ترس کھاتے کھاتے ادھ موئی ہو جاتی تو پھر اُس کے اندر والا اپنے ہی خلاف تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ اپنے ہی وجود کے پیچھے یوں بھاگتی پھرتی جس طرح کمرے میں اچانک گھس آنے والے پتنگوں کو مارنے کے لیے بچے

سلیپر، ریکٹ کبھی بار ہاتھوں میں لئے دوڑتے پھرتے ہیں۔ اُس کا اندر والا بھی ہبابا کی طرح کبھی کسی شیشے سے ٹکراتا کبھی کسی دیوار سے کبھی جالیوں میں پھنستا کبھی بجلی کے پنکھے میں ـــ نہ آزاد ہو سکتا نہ نفرت سے بچ ہی سکتا۔

ایسے ہی لمحوں میں جب سینے سے جنگ ہو رہی تھی۔ نصرت پر اچانک ایک دن یہ عقدہ کھلا کہ اُس کی ساری عمر اُن اشتہاروں کی طرح بسر ہوگی جو کسی عمدہ کتاب کے آخری صفحے پر ہوتا ہے۔ کتاب کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن کتاب کے اصل متن سے جس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس گھر میں کسی اور گھر میں ـــ ان لوگوں میں کسی اور قسم کے لوگوں میں، اس شہر میں کسی اور شہر میں ہوگی۔ لیکن اُس کا تعلق کسی گھر، کسی انسان، کسی شہر، کسی ملک، کسی مذہب کسی نظریے کے ساتھ اصل متن کا سا نہ ہوگا۔ اُس کے سارے عشق ایسی آئس کریم کی مانند تھے جو پوری طرح جم نہ سکے اور تھالیوں پلیٹوں میں اتارتے اتارتے ایک بار پھر گندی سی شکل اختیار کرے۔ ان ساری محبتوں سے صرف اتنا پتہ چلا تھا کہ مرد سے محبت کرنے کا صرف ایک ہی گُر ہے یہ ویسا ہی گُر ہے جو خالہ بلّی نے شیر کو نہ سکھایا تھا۔ یعنی کہ جب مرد موڈ میں ہو اختلاط چاہے تنہائی کا آرزومند ہو اُس وقت وہ مکمل سپردگی کے ساتھ گھڑا بھر شہد اُس کے سر پر انڈیل دے۔ اس کے بعد گونگی، بہری، انجان لاتعلق بنی رہے۔ کسی بند چھتری کی طرح کسی الماری کے کونے میں چپ چاپ کھڑی رہے اور برسات آنے کی راہ دیکھے۔ اگر کبھی اس گُر کو عورت بھلانے بیٹھ گئی تو اُس کا بھی وہی حشر ہوگا جو نصرت کا ہوا۔ یا پھر جو مجید اور نصرت کے عشق کا ہوا۔ ویسے سارے عشق کچھ تھوڑے بہت ہیر پھیر کے آخر اسی انجام کو پہنچے۔ وجہ معمولی تھی۔ عام طور پر وجہ بہت ہی معمولی ہوا کرتی ہے۔ جس روز مجید کو انٹرویو کی کال آئی۔ نصرت ایک شادی سے لوٹی تھی۔

شادی والے گھر میں عموماً لڑکیوں پر ایک کیمیاوی اثر ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقت سے ایک خواب بن جاتی تھیں شادی والے گھر میں جو ایک ہلڑ بازی بے فکراپن ہوتا ہے۔ ڈھولک پر شادیانے بجتے، ماہیے کے نام دوہراتے رہنے سے جو ایک گرمی اور جوش لہو میں پیدا ہو جاتا ہے وہ نصرت کے انگ انگ پر چھایا تھا۔ وہ ذہنی طور پر آج خود دلہن بنی ہوئی تھی۔ اس پر ظلم یہ ہوا کہ آج اُس کی سہیلیوں نے اُس کے ہیر سٹائل اور ساڑھی کی بھی بہت تعریف کر دی تھی۔ شادی والے گھر سے جلد لوٹ آنے کی وجہ بھی یہی تعریف تھی۔ نہ اُس کی سہیلیاں اُسے یوں ساتویں آسمان پر چڑھاتیں نہ اُس کا جی چاہتا کہ اُس کا یہ سارا جمال مجید بھی دیکھ لے۔ مجید کی نظروں میں ہمیشہ کے لئے بچ جانے کے لئے اُس نے سارے گھر والوں کو شادی والے گھر میں چھوڑا اور خود لوٹ آئی۔

اس روز مجید گھر میں اکیلا تھا۔ اُس کی جیب میں انٹرویو کی کال تھی اور وہ بیڈ کے ساتھ پاؤں کے پُرانے گھٹے صاف کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انٹرویو کے وقت اُسے کیا پہن کر جانا چاہیے۔ اگر باقی لڑکے ولایتی کپڑے کے سوٹ پہن کر گئے تو وہ اُن کے مقابلے میں ویسا سوٹ کیسے فراہم کرے گا اگر سادہ شلوار قمیص پہن کر جائے اور پیپر میں عوامی خیالات کا نہ نکلے تو پھر کیسی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ بالفرض انٹرویو لینے والے لباس کے معاملے میں فراخ دل ثابت ہوئے تو پھر بھی وہاں نشست و برخاست، آداب اور سلیقے کے وقت کیا کیا احتیاط لینی ہوگی؟ سوالات کی نوعیت کیا ہوگی؟ اور ان سوالات کا جامع گائیڈ کہاں سے مل سکتا ہے؟ میرے ساتھ آنے والے جملہ امیدواروں کا آئی کیو کیا ہوگا؟ اور اُن کی فیملی بیک گراؤنڈ کس حد تک تصدیق شدہ مانی جائے گی؟ چلیئے اگر ان مرحلوں سے بھی نکل گیا تو آگے سفارش کی یہ لمبی گہری اور ان جانی کھائی ہے آخر سی ایس پی کا امتحان ہے۔ شہر کے بڑے بڑے کاربن لمبی لمبی گاڑیوں میں اپنے اپنے سپوتوں کے لئے بھاگیں گے۔ یہ اللہ کی مہربانی تھی کہ ماموں نے اپنے گھر ٹھہرا کر امتحان دلوایا۔ اب وہ سفارش تھوڑا ڈھونڈتے پھریں گے۔ وہ تو کہیں گے بھیا MERIT پر نکلنا چاہیے آگے ـــ مجھے

کون پوچھے گا میرے نمبروں پر؟ مجھے کون بُلائے گا صرف نمبروں کے حوالے سے۔ صرف نمبر ے کر میں جاؤں؟

دراصل اس وقت نصرت اور مجید کی ذہنی فضا میں ہم کلامی نہ تھی۔ نصرت میں میمودن راگ کی طرح سات سُروں میں کھیں رہی تھی اور مجید کا وہی جی فلیٹ بج رہا تھا۔ انٹرویو ـــ انٹرویو ـــ انٹرویو!

نصرت نے آنگن کا دروازہ کھولا اور ایک فلمی ایکٹرس کی طرح اتراتی ہوئی آگے آئی۔ مجید نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا اور گھٹنے کو بلیڈ سے کھدیڑتا رہا۔ نصرت نے اپنے سبے اور ٹھنڈے ہاتھوں سے پچھلی طرف آ کر مجید کی آنکھیں بند کر لیں۔ اس بے احتیاطی میں تھوڑا سا بلیڈ مجید کو لگ گیا اور ایک سرخ بوند لہو کی بیچ انگلی پر ابھر آئی۔

"کون ہے ـــ" مجید نے جھڑک کر کہا۔

نصرت چپ رہی۔ اُس کا خیال تھا کہ مجید اچھی طرح سے اُس کے ہاتھ پہچانتا ہے۔

"کون ہے بھئی ایسا بدتمیز"

اسے بھی نصرت ادائے دلربا نہ سمجھتی تھی۔

اب مجید نے بلیڈ پرے پھینکا اور پھر کر خشگی سے اُس کے ہاتھ پرے کرتے ہوئے کہا " تو یہ کیا بچگانہ حرکت ہے پہلے ہی میرے سر میں درد ہو رہا ہے "

نصرت نے آنکھیں جھکا لیں۔ اُسے عجیب قسم کی ندامت محسوس ہوئی۔ کچھ دیر مجید غور سے اپنے بائیں پاؤں کی آخری انگلی پر آئی ہوئی لہو کی بوند دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے جیب سے رومال نکال کر پاؤں صاف کیا اور اس کے بعد اٹھ کر غسلخانے میں چلا گیا۔ غسلخانے کا دروازہ کھلا تھا لیکن نصرت اندر جاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی۔ کافی دیر نلکا چلتا رہا۔ پھر مجید کھانستا رہا۔ دوائیوں کی الماری میں سے کچھ نکالنے دھرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد مجید باہر نکلا تو اُس کی چھنگلیا پر چھوٹی سی پگڑی بندھی تھی اور مجید سے ہلکی ہلکی ڈیٹول کی بو آ رہی تھی۔

" زیادہ چوٹ تو نہیں آگئی ـــ نصرت نے چور بن کر پوچھا۔

" نہیں ـــ ٹھیک ہے ـــ" مجید نے احسان کا ٹوکرا اُس کے سر پر لاد دیا۔ اُس کی آواز میں کوئی ایسی چھپی ہوئی شکایت تھی گویا بہت زیادہ چوٹ لگ گئی ہو۔

پہلی ہی چال غلط پڑی۔ نصرت پر ایک قسم کی انفعالی کیفیت طاری ہو گئی۔ بھلا یہ کہاں کی شرافت تھی کہ دیکھے بغیر اُس نے مجید کی آنکھیں بند کر لیں اور جو کہیں بلیڈ انگلی کے پار ہو جاتا تو؟ ـــ

گھٹتی لڑائی میں اس نے ایک اور فنِ حرب میں غلطی کی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ اتنی خوبصورت لگ رہی ہے کہ مجید اُس کے حُسن کے سامنے ماضی، مستقبل، حال سب کے ہتھیار ڈال دے گا۔ نصرت نے اپنے پلّو کو مجید کے منہ پہ لہرا دیا۔

مجید اس وقت حاضر نہیں تھا۔ وہ چیئرمین کے سامنے بیٹھا اس وقت اس سوال کا جواب سوچ رہا تھا کہ ویت نام میں امریکی فوجوں کی کل جمعیت کتنی تھی؟ اُس نے ہاتھ سے پلو پرے کر کے اوں ہوں کہا تو نصرت سوچ میں پڑ گئی۔

نصرت ابھی تک بیاہ والے گھر میں پھر رہی تھی۔

"ساری لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ یہ ہیئر سٹائل مجھے بہت سجا ہے۔ میرا چہرہ گول لگتا ہے اس جوڑے میں۔ ہیں؟——"

مجید کی طبیعت حاضر نہیں تھی۔ گیس کی بیماری میں مبتلا مریض کی طرح اُس کا چہرہ خالی خالی تھا۔

"ہوں؟—— ہاں —— وہ تو ہے۔"

نصرت پہ تھوڑی سی اوس پڑ گئی۔ پر اُس نے ڈھٹائی سے پوچھا "کیسی لگ رہی ہوں میں؟—— سب مجھے بہت ADMIRE کر رہے تھے۔"

مجید نے اپنی طرف سے بات میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی اور بولا "ہمارے ہاں سکینہ میراثن کی بیٹی کبھی کبھی شادی بیاہ کے موقعہ پہ سلمیٰ پہن کر آیا کرتی ہے——"

باقی بات نصرت نے نہ سُنی۔ کتنی دیر وہ چپ چاپ تپتی ٹرنک پہ بیٹھی سوچتی رہی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ واپس اُن لڑکیوں کی طرف لوٹ جانا چاہیے جو مجھے زیبا ایکٹرس سے ملا رہی تھیں یا یہیں رہنا چاہیے سکینہ میراثن کی بیٹی بن کر——

کچھ عرصہ بعد مجید نے صلح کی جھنڈی لہرائی۔

"کیا کچھ ہوا وہاں شادی پہ——"

"دلہن بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ڈیڑھ سو کا تو جوڑا ہوا یا اُس نے فلمسار چاندنی دلہن بنانے آئی تھی اُسے۔"

ایک بار پھر نصرت شادی والے گھر میں پہنچ گئی۔ پتہ نہیں شادی والے گھر کی یہ تعریف سن کر مجید کو کیوں لگا گویا وہ انٹرویو میں فیل ہو جائے گا۔

"تم لڑکیوں کو دولہن بننے کا اتنا خبط کیوں ہوتا ہے؟"

"بس ہوتا ہے —— ہر مذہب، ہر ملک، ہر نسل کی لڑکی کو ہوتا ہے۔" اترا کر نصرت نے کہا۔

"غالباً اور کوئی شوق نہیں ہوتا تمہیں۔ دراصل عورت ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ دلہن بننے سے زیادہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔" مجید نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ نصرت کو یک دم اپنا سر چھوٹا ہوتا محسوس ہوا——

"عورت کی کھوپڑی دراصل حجلۂ عروسی ہے۔ اس میں ہمیشہ ڈھولک بجتی ہے۔ سہرے گجرے ہوتے ہیں۔ پھر کمبخت چاہتی ہے کہ اسے مردوں کے برابر حقوق دیئے جائیں۔ عورت پروفیسر ہو چاہے وکیل چاہے ملک کی ادیبہ ہو یا لیڈر اُس کے دماغ میں ہمیشہ عشق و عاشقی ہی گھسی رہتی ہے۔"

نصرت نے چاہا کہ پوچھے کہ آخر اس میں برائی کیا ہے؟ لیکن مجید کا چہرہ ماسٹر جی کے بید کی طرح تنا ہوا تھا۔ پھر وہ شادی کے گھر سے آئی تھی بحث مباحثہ کے لئے اس وقت اُس کی طبیعت حاضر نہ تھی۔

مجید کو اس وقت یہ دبلی پتلی لڑکی بیحد مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ اور وہ کسی قسم کی ذان وکشنا کے موڈ میں بھی نہ تھا۔ چپ چاپ اٹھ کر وہ باورچی خانے میں چلا گیا اور پانی کی کیتلی بھر کر گیس کے چولہے کو جلا کر اُس پہ دھر دی۔ کچھ دیر نصرت وہیں چپ چاپ کھڑی رہی۔ سوچتی رہی کہ چلو پھر کیا ہوا۔ خوبصورت تو وہ کبھی تھی نہیں نہ کبھی آئینے نے اس بات کی گواہی دی تھی نہ ہی اُس کے جان پہچان والوں نے۔ اگر مجید نے دو تعریفی جملے نہیں کہے تھے تو کونسی بری بات تھی رہ رہ کر اُسے اپنی ایک سہیلی کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ نادرہ کی ناک چپٹی، آنکھیں چندھی اور آدھی انگلی کے ماتھے پر جیسے گھنگھریالے بال تھے۔ رنگ صرف سیاہ ہوتا تو بھی بات تھی پر اُس کے سیاہ چکنے چہرے پہ ننھے ننھے اَن گنت داغ دھبے

اور گرنے بھی تھے اور اُس کا چاہنے والا جیسے محبت نامے اُسے لکھتا تھا۔ وہ پڑھ پڑھ کر نصرت دنگ رہ جاتی تھی۔ موتیوں جیسی ہموار لکھائی میں ہر خط نادرہ کے حسن کا قصیدہ ہوتا۔ ایک دن اُس نے نادرہ سے پوچھا تھا کہ جادو کا طریقہ کیا ہے تو وہ بولی تھی "جادو وادو کچھ نہیں بھئی عظیم بتا ہے کوئی عورت نہ خوب صورت ہوتی ہے۔ نہ بدصورت۔ بس چاہنے والے کی نظر میں سب کچھ ہے ———"

نصرت کا جی بھی چاہتا تھا کہ چاہنے والوں کی نظر میں کچھ ہوتا۔ لیکن آج تک تو ایسا معجزہ ہو نہ سکا تھا۔ کافی دیر وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر ڈھیٹ بن کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اُسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ میز پر چائے کے برتن لگائے کہ پیچھے سے دونوں بازو ڈال کر مجید کو گھیر کر تاکہ وہ گناہوں کی معافی مانگ سے۔ اس وقت نصرت سے ایک بڑی بھیانک غلطی ہو گئی اُس نے مجید کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا اور آہستہ سے بولی ——— "میں جانتی ہوں مجید مرد ہمیشہ خوب صورت عورتوں سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ لاڈ پیار، تعریف سب خوب صورت عورتوں کے لئے ہوتا ہے مجھ جیسی لڑکیوں کو ہمیشہ خود اظہار محبت کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں خود مرد کے پیروں میں بچھ بچھ جانا پڑتا ہے۔"

مجید چولہے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ایسی خاموشی اختیار کر رکھی تھی گویا نصرت کی ہر بات ٹھیک ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد اُس نے بات "یہ چولہا میڈ فلیم کیوں نہیں دے رہا ———؟"

نصرت نے حیرانی سے چولہے کی طرف دیکھا پھر آخری بار غلط چال چلی ———

"میں جانتی ہوں تم مجھ سے کبھی کھل کر اظہارِ محبت نہیں کرو گے۔ تم مجھے اتنا چوگا کھلاتے رہو گے کہ میں زندہ رہوں لیکن پھولنے پھلنے کے لئے یہ مقدار کافی نہیں۔ اسے مسلسل بارش چاہیے۔ ریگستان کی بارش نہیں ——— چائے کے باغوں جیسی بارش ——— دھان کے کھیتوں جیسی بارش ——— امجید مجھے تم سے عشق ہے۔ خدا کی قسم اماں چاہے مجھے قتل کر دیں میری بوٹی بوٹی تمہاری ہے ———"

یہ سب شادی والے گھر کا کیا دھرا تھا۔ ورنہ آج تک نہ نصرت نے محبت کی بھیک مانگی تھی نہ اپنے عاشقوں کو دل کا سراغ دیا تھا۔

مجید کو یوں لگا جیسے نصرت کو انڈر ورلڈ کے بلاوے کا پتہ چل گیا ہے اور وہ اپنے مستقبل کے تحفظ کی پہلی قسط ادا کر رہی ہے۔ وہ عورتوں کی چھٹی حس پر لعنت بھیجتا ہوا اٹھا اور صافی تلاش کرنے لگا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ ———" بڑی دیر بعد مجید بولا۔

نصرت کو چپ سی لگ گئی۔ وہ ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ چاہے دو دن کی محبت ہو لیکن فریقین ایک دوسرے کو ٹوٹ کر تو چاہیں۔ زندگی میں کبھی تو پیالہ منہ تک بھر جائے۔ ورنہ پھیکی سکنجبین پیتے پیتے تو اُسے پورے آٹھ برس گذر چکے تھے۔ اُس نے آہستہ آہستہ میز پر برتن لگائے۔ اس سے پہلے جب کبھی مجید چولہے پر کیتلی رکھتا۔ وہ دو پیالیاں میز پر سجایا کرتی تھی۔ آج اس نے ایک پیالی پرچ رکھی اور چمچ لگانا بھول گئی کیونکہ وہ اور بہت کچھ سوچ رہی تھی۔

"نصرت تم چائے نہیں پیو گی؟ ———" پوری پیالی چائے کی ختم کرنے کے بعد مجید نے سوال کیا۔

"نہیں میں شادی والے گھر سے پی آئی ہوں ———" نصرت نے آنکھوں میں آتے ہوئے آنسو روکے۔

"اچھا ———"

"خاموشی گہری گھاٹی کی طرح دونوں کے درمیان آ بیٹھی۔"

بڑی دیر تک مجید سگریٹ پیتا رہا۔ وہ چپ چاپ اُسے دیکھتی رہی۔ دراصل زیادہ دیر تک مٹنے رہنا نصرت کے بس کی بات نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اُسے مجید پر ترس آنے لگا۔ بلستہ بن ماں کا بچہ کتنی مصیبتوں سے پلا ہے کبھی ہمارے گھر کبھی تمہارے گھر۔ جانے کتنی کتنی محرومیاں ہوں گی اس کے دل میں۔ اللہ جانے کیسی کیسی تلخ یادیں ہوں گی اس کے ماضی میں۔ نصرت کو جون آف آرک بننے کا بہت شوق تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ سیاہی چوس ہے جو دوسرے لوگوں کے سارے غم اپنے وجود میں سمونے کی اہلیت رکھتی ہے۔

وہ ہمت کر کے اٹھی اور اپنے ڈایافرام پر مجید کا سر رکھ کر بولی۔

"کیا بات ہے مجید —؟ آج تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں —" بجھی بجھی آواز آئی۔

نصرت مجید کا سر اپنے سینے پر رکھنا چاہتی تھی لیکن اپنے سینے کے متعلق اُسے بڑا احساس کمتری تھا۔ اس احساس کمتری کو مٹانے کے لئے اُس نے دو چار نقلی انگیا منگا رکھی تھیں اور جو بھی بارہ یا لنڈی کوتل جاتا۔ اُس کی بس ایک ہی فرمائش ہوتی کہ اچھی فش یونٹرز والی فوم لگی محرم میرے لئے لیتے آنا۔ اس وقت پسلیوں پر مجید کا سر رکھنے سے نہ تو مجید کو آرام ملا نہ ہی نصرت کی تسلی ہوئی۔ مجید نے کچھ دیر کے لئے اس لڑکی کے جسم کا فائدہ اٹھانے کی سوچی۔ پھر اُسے مبتہم کی طرح خیال آیا کہ ماموں کے اتنے احسانات ہیں مجھ پر کیا میں انھیں اسی طرح چکانے کے اہل ہوں؟

آہستہ سے مجید نے نصرت کے بازو پر بوسہ دیا۔ ٹھنڈا اور بے کیف بوسہ۔

مجید نے اس وقت نصرت کو اپنی انٹرویو کال کے متعلق سب کچھ بتانا چاہا لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ یہ پھولدار ساڑھی پہننے والی لڑکی ہے۔ یہ کیا سمجھے گی کہ انٹرویو کا خوف کیا چیز ہے؟

نصرت نے اُسے شادی والے گھر کی باتیں بتانا چاہیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ مجید کو تو اپنی شادی کا شوق نہیں دوسری اور کی شادی کو کیا سمجھے گا چپ ہو رہی۔ دونوں جتنی دیر بیٹھے رہے خود کلامی میں مصروف رہے۔ دل کے دروازے کھول کر ایک دوسرے کو بلانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

دوسری صبح جب مجید گھر سے روانہ ہوا تو سارے اُسے برآمدے تک چھوڑنے آئے۔ لیکن نصرت غسل خانے کی چٹخنی لگائے نہاتی رہی گاتی رہی۔ ہوائی جہاز کی ٹکٹ جیب میں ٹٹولتے ہوئے آخری وقت مجید غسل خانے کے دروازے تک آیا۔ اس وقت اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ دروازہ کھل جائے اور بوندوں میں بھیگی نصرت کی ایک جھلک وہ دیکھ لے۔ آہستہ سے اُس نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟ —" لمبی سی آواز آئی۔

"میں ہوں۔ مجید — میں جا رہا ہوں — ابھی دروازہ کھولو۔" اُس کی آواز جسمانی لذت کے احساس سے بوجھل ہو گئی۔

نلکہ بند ہوا۔

"کون ہے؟ —"

"مجید بھئی — ہوائی جہاز جانے والا ہے۔ جلدی دروازہ کھولو —"

نصرت نے امریکی فلمستاروں کی طرح اپنے گرد تولیہ لپیٹا۔ چٹخنی تک ہاتھ سے کھولی اور پھر رک کر بولی۔

"تمھیں دیر ہو رہی ہے؟"

"ہاں —— خدا کے لیے دروازہ کھولو —— ایک لمحہ بھر کے لئے ——"

جسم جسم جسم —— یہاں سب کچھ جسم تھا۔ جسم کی ایک جھلک ... ایک رگڑ —— ایک لمس۔

"خدا حافظ مجید میں نہا رہی ہوں۔"

"ذرا —— ذرا سا دروازہ کھولو پلیز —— میں تمھیں آخری بار دیکھنا چاہتا ہوں ——"

"میری آنکھوں میں صابن لگ رہا ہے خدا حافظ ——"

کچھ دیر مجید دروازے سے ہونٹ لگائے کھڑا رہا۔

اندر نلکا جاری ہو گیا۔

"خدا حافظ ——" مجید نے بالآخر کہا۔

"خدا حافظ ——"

شاور کی بوندوں کے ساتھ آہستہ آہستہ اُس کے آنسو بھی شامل ہوتے رہے۔ وہ نہاتی رہی۔ روتی رہی اور سوچتی رہی۔ شاید محبت کا لمحہ آ پہنچا تھا۔ لیکن اُس کی کوتاہی نے یہ ٹرین بھی مس کر دی۔

اسی عشق جیسے اور کئی عشق تھے۔ یہ سارے عشق مرغی کے اُن انڈوں کی طرح اُس کے اندر سے نکلا کرتے ہیں۔ ان کو مکمل ہونے کا اللہ کی طرف سے حکم ہی نہ ہوا۔ سب ہی اسقاط ہوئے۔ کوئی چھ ہفتے بعد کوئی پانچ ماہ سات دن ٹھہر کر۔ ہر عشق کے دوران اُسے اماں نے خوب مارا تھا۔ اماں اُس کی عاشقانہ طبیعت سے بہت نالاں تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ جب تک وہ کوئی صحیح بر تلاش نہیں کر لیتیں ان کی ہر بیٹی کو چھچھوندر کی طرح اندھی بن کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چل کر زندگی بسر کرنی چاہیے۔ مجید کے معاملے میں تو اماں اور بھی آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ مجید کے گھر والے چور بھی ہیں اور چیٹر بھی۔ تین سال سے مجید اُن کے گھر پڑا تھا اور اس دیکھ ریکھ کے بدلے جو جو باتیں اُن کی نند نے کی تھیں الاماں!

جتنی بار اماں نے نسرت کی پٹائی کی۔ اتنی ہی بار کسی نہ کسی طرح نصرت مجید کے پاس ضرور پہنچی اور پتہ نہیں مجید کے ہاتھ میں کیا جادو تھا۔ جہاں وہ ہاتھ رکھ دیتا۔ زخم جاتا رہتا درد ختم ہو جاتا۔

اس میں کسی کا قصور نہیں تھا کہ مجید یوں لاتعلق سے چلا گیا۔ سارا قصور نصرت کا اپنا تھا۔ وہ خود آکسیجن گیس تھی۔ ہر شعلہ اُس کی وجہ سے بھڑکتا تھا ہر جگہ اس کی وجہ سے آگ لگتی تھی۔ یا یوں سمجھئے شعلے کے روپ میں وہ خود جلتی تھی۔ ادھر آکسیجن علیحدہ ہوتی ادھر شعلہ خود بخود ختم ہو جاتا!

عشق کے مرحلوں سے حیض کی طرح فارغ ہو کر اب وہ جنسی، ذہنی اور جسمانی طور پر عجب سکون کے دن بسر کر رہی تھی۔ اپنے ہی پیچھے سلیپر لے کر بھاگنے میں عجب لطف ملتا تھا۔ پارسائی کا لطف، خود ترسی کا لطف، تیاگ کا لطف۔ اپنے آپ کو ملامتیہ فرقے سے ذہنی طور پر منسلک کرنے میں ایک بڑی اعلیٰ فرار کی راہ نکل آئی تھی۔ اب اُس کے وجود پر اپنی انا کا بوجھ ذرا کم تھا۔ اب وہ گھر کا جوکر بن گئی تھی۔ بڑے سائز کے مردانہ سلیپر پہنتی سر پر اخبار کی ٹوپی، جسم پر کسی بھائی بھتیجے کا کرتا کھڑی غرارے کر رہی ہے ٹرائی سیکل چلا رہی ہے۔ ثابت پیاز مٹھی مار کر توڑنے کے بعد چبا رہی ہے۔ جہاں کہیں نوجوان لڑکے بیٹھے ہوں وہاں ہائیڈروجن پر آکسیڈ پلیٹ میں ڈال کر بیٹھ جاتی اور پہروں بال براؤن کرنے میں گزار دیتی۔ بالوں میں سرسوں کا تیل

تھا کہ وہ وہ دن نہ نہانا اُس کی عادت بن چکی تھی۔ مبی مجلاسی تو تھی ایسے میلے میں جو لوگ اُسے بار بار دیکھنے لگے تو اُس کی بدصورتی اور بدسلیقگی کی داستان دور دور تک جا پہنچی۔ اب وہ ہنستی تو پہروں ہنستی رہتی۔ رونے کو جی چاہتا تو نیم چھتی میں سسکیوں کا ریڈیو سٹیشن کھل جاتا۔

اماں کی باقی لڑکیوں نے ادھر ہی لے لیا۔ ادھر گھر میں جوڑ توڑ، پھنس ہر غا۔ ہیرا پھیری، پھندے غرضیکہ جاگیر جیسی گرم بازاری شروع ہو جاتی۔ کوئی ایک توجہ مرکوز ہوتی لڑکیوں پر۔ دیکھنے والیاں آ رہی ہیں بازاروں میں سارا سارا دن گذر رہا ہے کہاں روپیہ دو روپیہ کے لئے کئی کئی دن چخ چخ ہوتی تھی اب اباکی چیک بک پر ہی گویا دسترس ہو جاتی۔ پسند ناپسند کے پرپیچے، آرام بے آرامی کا خیال۔ بیوٹی کلنک کے چکر۔ گھر کی لڑکیاں تو اس دور میں بالکل مہارانیاں معلوم ہوتیں۔ اللہ نے اگر راستہ بند کیا تو نصرت کا۔ خدا جانے یہ اُس کا حلیہ تھا کہ اُس کی بدقسمتی تھی یا یوں بھی اُس کی ایک ہوا بندھ چکی تھی کہ جتنے رشتے اُس کے لئے آئے کسی کی چول ڈھیلی کسی کے سپرنگ ناقص، کسی کے نٹ بولٹ پرانے — کوئی لوہے کا دروازہ اُس کی خالی چوکھٹ پرفٹ نہ ہوسکا اور وہ نیم چھتی کے کاٹھ کباڑ کی طرح بن کر رہ گئی۔

ویسے بھی نصرت نے اپنے جملہ تجربات سے بہت ساری عبرت خیز باتیں سیکھ لی تھیں اور اسی لئے اب وہ ہمیشہ آسمان اور دل سے ڈرتی رہتی تھی۔ پہلے ہی عشق کے بعد جب جعفر نے سارے گھر والوں کے سامنے اماں کی ریشمی رضائی پر نصرت کے محبت نامے لاکر پھینکے تو وہ دنگ رہ گئی۔ ایک ایک خط پر سرتاج کی سُرخی تھی اور ہر ایک خط ہمیشہ تمہاری نصرت پر ختم ہوتا تھا۔ خط باری باری سب کے ہاتھوں میں گئے حتیٰ کہ پانچ سال کے ستے نے لفافوں پر سے پاکستان اپنی دوسری اور آر سی ڈی والی ٹکٹیں اتار لیں۔

اس عشق سے نصرت نے یہ سبق سیکھا کہ مرجاؤ پر کسی کو خط نہ لکھو ورنہ بوقت ضرورت انھیں کام میں لایا جائے گا۔ نعیم نے پہلے تو ان گنت تحفے چوری چھپے نصرت کو دیئے جن میں میڈ و رینا رسٹ واچ بھی شامل تھی۔ پھر جب ناچاقی ہوئی تو یہ سارے تحفے واپس طلب کر لئے۔ ساتھ ہی دھمکی دے دی کہ اگر اُس کے سارے تحفے مقررہ تاریخ تک نہ لوٹے تو وہ یو این او میں رپورٹ درج کر دے گا۔ نصرت کو گھر کی یو این او سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اُس نے سارے تحفے بمع معافی نامے کے واپس کر دیئے۔

اس عشق کے بعد تحفے تحائف لینا دینا اُس کے کوڈ میں حرام ہو گیا۔

اختر نے بظاہر اپنا تن من دھن اُس کے سپرد کر رکھا تھا اور وہ بات بات پر مصر ہوجاتا کہ عاشقوں میں دوئی کیسی؟ اس لئے آدھی آدھی رات تک نصرت اُس کی چارپائی میں اُسی کا لحاف اوڑھے دوئی مٹاتی رہتی لیکن جب اختر نے ان تعلقات کا ذکر اپنے دوستوں میں فخریہ کرنا شروع کیا اور بات چلتے چلتے نصرت تک پہنچی تو اُس نے یہ عبرت حاصل کی کہ دوئی کو بہرکیف شادی تک قائم رہنا چاہیئے۔

اسی طرح چھوٹے چھوٹے کئی سبق تھے جنھوں نے اُسے بڑا سیانا کر دیا تھا۔ اب اُس کے پاس تعزیزاتِ عشق کی کافی جامع کتاب بن چکی تھی۔ وہ اتنے سبق سیکھ چکی تھی کہ اب سبق ہی سبق باقی تھے اور عشق کا کہیں نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ شادی سے پہلے عشق کرنے کا اب اُسے خیال بھی نہ آتا تھا۔ اُس نے اپنے عبرت نامے کی مدد سے شادی کے بعد بھی اپنا ایک خاص پروگرام مرتب کر رکھا تھا۔ وہ سوچتی رہتی کہ شادی کے بعد عورت کو ایک ایور ریڈی قسم کے سیل کی طرح ہونا چاہیے جب اُسے ٹارچ میں ڈالو بٹن دباؤ روشنی ہو جائے۔ ٹرانسسٹر میں لگاؤ کھٹ سے بولنے لگے۔ بچوں کے کھلونوں میں فٹ کر دو تو کار چلنے لگے ٹرین بھاگنے لگے ریچھ تالی بجا بجا کر ہلکان ہو جائے میم ناچ ناچ کر باؤلی ہو جائے۔ سیل نکال کر رکھ دو تو ساری چیزیں بے جان ہو جائیں۔ وہ مرد کی بیٹری سے چارج ہونے والا سیل ہونا چاہیئے تاکہ جب وہ چاہے چارج

کرے نہ چاہے تو ٹھیک دے سے پیچھے اس کا جستی ٹوں اتار کر سارے گھر میں کاربن کی سیاہی اٹھاتے پھریں..... اور پھر کسی کو پتہ نہ چلے کہ اسی سیل میں نچانے، روشن کرنے اور بولنے کی قوت کیسی تھی!

اب تو نیم چھتی میں اخبار کی ٹوپی پہن کر جانے وہ اپنے آپ سے کیسے کیسے بدلے لیتی! کہ اچانک اللہ نے اُس پر چھپر پھاڑ دیا۔ راتوں رات وہ پردۂ سیمیں پر جگمگانے والی صف اول کی اداکارہ بن گئی۔

نصرت کی اماں سارے گھر میں ڈیڈو کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اماں نے اپنے سسرال میں عجیب قسم کی زندگی بسر کی تھی۔ کچھ عرصہ انہیں نئے برتن کی طرح کبھی یہاں کبھی وہاں رکھا گیا۔ شوہر نے چند سال جسمانی لذت کے لیے استعمال کیا اور پھر غافل ہو گیا۔ اماں نے ابا کو واپس لانے کے لئے ہزار جتن کئے۔ لیکن اُس کا کوئی بوم رنگ اُس تک واپس نہ آیا۔ ایسے میں جب اُس کے پاس دینے کو لاکھوں کی محبت تھی اور اس جنس کے اصلی خریدار کو دوسری عورتوں سے فرصت نہ تھی۔ اماں نے اس محبت سے دوست دشمن پر کنڈیں ڈالنا شروع کر دیں۔ اب سارے گھر میں اُس کی شفقتوں۔ اُس کی قربانیوں کے چرچے تھے۔ سارے خاندان میں شاید ہی کوئی ایسا رشتہ دار باقی ہو جس پر عصمت بیگم کی پوری توجہ نہ پڑی ہو۔ پٹھن بھر لڑکے اس گھر سے تعلیم حاصل کر کے رخصت ہوئے۔ کئی ٹیڑھی بینگی لڑکیوں کے ایسے ناطے کرا دیئے کہ خود لڑکیوں کو باقی ساری عمر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا رہا۔ کئی پھوپھیاں، خالاؤں عدت، زچگی، بیماریوں کا عرصہ خوشی خوشی گزار کر گئیں۔ کئی اکھڑے ہوئے رشتہ داروں نے یہاں بیٹھ کر گھر تعمیر کئے بزنس سدھا کیں بیرونی ممالک آنے جانے کے راستے کھوسے۔ عصمت بیگم ساری عمر شوہر کے دل کی ایک کھڑکی نہ کھول سکی۔ لیکن اپنے دل کو اُس نے ایک کھلی غلام گردش بنا دیا۔ جس میں بسرام کرنے کا کوئی کرایہ نہ لگتا تھا۔ کوئی پاسپورٹ ویزا درکار نہ تھا۔

ایسی عورت جب اچانک بیمار پڑی تو سارے مغلیہ خاندان میں غدر مچ گیا۔ اتنے بڑے خاندان کی سربراہ خاتون جس روز بیمار ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے جس روز اماں کو دورہ پڑا اس روز گھر پر صرف نصرت اور ابا موجود تھے۔ باقی بہن بھائی بھاولپور چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے۔ طفیلی، مہمان، رشتہ دار حتّٰی کہ ملازم نوکروں میں سے بھی گھر پہ کوئی نہ تھا۔

نصرت برسوں پہلے جعفر کے واقعے کے بعد ہی سے اماں سے بچھڑ چکی تھی، اس وقت وہ اپنی نیم چھتی میں تخت پوش پر لیٹی ناول پڑھ رہی تھی۔ ہر ناول کو پڑھتے وقت نصرت دو حصوں میں بٹ جاتی تھی۔ ایک نصرت ہمیشہ ہیروئن کے عشق کا مذاق اڑاتی اُسے احمق سمجھتی۔ دوسری نصرت کی آنکھوں میں ہیروئن کی خوش قسمتی کا پڑھ پڑھ کر پل پل آنسو آتے۔ اُسے یقین ہی نہ آتا۔ کہ ایسی خوش نصیب لڑکی بھی کوئی ہو سکتی ہے جس کو اتنی شدت سے چاہا گیا۔ کیونکہ ہر کتاب کا عشق عموماً سچا، اکلوتا اور جان لیوا ہوا کرتا تھا۔ اُس کے منہ سے رال ٹپک ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟—" اُس نے خشکی کے ساتھ پوچھا۔

"میں ہوں— اباجی —"

نصرت نے سر سے کاغذی ٹوپی اتاری۔ سلیپر پہنے اور باہر نکل آئی۔ اس اجنبی معمر شخص کی موجودگی میں نصرت عموماً گھبرا جاتی۔ اس گول مول شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور اُس کا پیٹ پورے حمل کی طرح بوسکی کی قمیص میں باہر کو بڑھا ہوا تھا۔ نصرت کے لئے یہ مرد کسی اور مذہب نسل اور کسی ملک کا باشندہ تھا۔ اگر وہ اپنی اور اباجی کی ملاقاتوں کا کل میزان لگاتی تو چند گھنٹوں سے کبھی زیادہ نہ نکلتا۔

"جی —" اُس نے سر پر خوف سے دوپٹہ لے لیا۔

ہر اجنبی سے ملنے کا اُس نے سیدھا سا یہی فارمولا تیار کر رکھا تھا۔

"تمہاری اماں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ وہ پیڑھی پہ بیٹھی بیٹھی لڑھک گئیں۔ وہ تو میں سامنے نہ ہوتا۔ تو گیس کے چولہے میں گر جاتیں ——"

وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی نیچے پہنچی۔

اماں پلنگ پہ چت لیٹی تھیں۔ ان کے چہرے کا دایاں حصہ کچھ ٹیڑھا سا نظر آ رہا تھا۔

"اماں! —— اماں جی ——"

عصمت بیگم نے آنکھیں کھولیں تھوڑی سی پہچان اُن کی دائیں آنکھوں میں آئی اور گم ہو گئی۔

"اماں —— اماں . . . . نصرت نے اُن کا دایاں بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ لیکن بازو گویا بے جان لکڑی کی مانند اُس کی گرفت میں گونگا ہی بنا رہا۔

اس نے پلٹ کر اپنے اجنبی باپ کی طرف دیکھا جس کا ازار بند بوسکی کی قمیص کے نیچے لٹک رہا تھا۔ آج ساری عورتوں سے عشق کرنے کے باوجود یہ مرد بالکل اکیلا اور بے حد خوفزدہ تھا۔

"کیا کریں اباجی —— اب ہم کیا کریں؟ ——"

اُس نے ڈر کے مارے اباجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اجنبی، مضطر، خوفزدہ بھولے بھالے باپ نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔ "ڈرو نہیں میں ابھی ایمبولینس لے کر آتا ہوں۔ تم اماں کے پاس رہو۔"

جب تک ایمبولینس نہیں آئی۔ وہ اماں کا بازو دباتی رہی ہاتھ پاؤں رگڑ رگڑ کر گرم کرتی رہی۔ لیکن اس وقفے میں ایک بار بھی اُسے اماں کے وجود پہ پیار نہ آیا۔ اُسے اماں کی بیچارگی پہ ترس آ رہا تھا اور بس ماں بیٹے کے جذباتی رشتے سے وہ کبھی کی آزاد ہو چکی تھی۔

گھر سے ہسپتال پہنچتے پہنچتے اماں کا دایاں حصہ مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ نصرت اور اُس کا اجنبی باپ دو دن بڑے ہراساں رہے لیکن پھر سارے حالات نصرت کے قابو میں آ گئے جس طرح لکڑی بانک میں پھنس کر پھسل نہیں سکتی۔ یہ موقع اُسے خدا نے چھپر پھاڑ کر دیا تھا۔

یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ جب عصمت بیگم مفلوج ہوئیں نصرت کے علاوہ گھر پر اور کوئی عورت موجود نہ تھی۔ اس طرح پورے چار دن ملاشرکت غیرے پرائیویٹ وارڈ میں نصرت اپنے ماں باپ پہ مکمل طور پہ قابض رہی۔ جو بھی نرس آتی اُسے مریض کی حالت نصرت کی زبانی پتہ چلتی۔ اباجی بیچارے اعظم کلاتھ مارکیٹ میں بہت بڑی دوکان کے مالک تھے لیکن انگریزی بولتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ نصرت کا بی اے گو زنگ آلود ہو چکا تھا۔ لیکن چوبیس گھنٹوں میں اُس نے اپنے لیے کو براسو کر کے خوب چمکا لیا تھا۔ اب جس وقت اباجی ڈاکٹروں کے سامنے شرماؤ سے بیٹھے رہتے نصرت انگریزی بولتی مشورے کرتی ہر ڈاکٹر کے ساتھ دور تک برآمدوں میں چلی جاتی۔ ہر ہر بات میں جلد ہی نصرت نصرت ہونے لگی۔

دوسری رات کا ذکر ہے۔

اماں بیہوشی کے عالم میں ساری دنیا کی شہرت بھلائے لاش سی پلنگ پہ پڑی تھی۔ اُن کے بائیں بازو میں گلوکوز لگا تھا۔ اباجی گلے میں صافہ ڈالے بڑے حواس باختہ گھٹنوں پہ دونوں ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ یک دم غنودگی کی حالت میں جھولتے ہوئے نصرت کو یوں لگا جیسے قریب ہی کوئی سسکیاں بھر رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی چند لمحے اُسے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ نیم چھتی میں ہے کہ ہسپتال میں اماں کے پلنگ پہ بیٹھی ہے۔

رفتہ رفتہ جب وہ اپنے ماحول کو سمجھنے کے قابل ہوئی تو اُس نے دیکھا کہ سامنے والی کرسی پہ اباجی بیٹھے رو رہے ہیں اور اُن کے آنسو

ٹھنڈوں پہ دھرے ہاتھوں پر بے تحاشا گر رہے ہیں۔

وہ اپنے ابا جی سے بے تکلف نہ تھی۔

لیکن اس وقت اُسے اپنا باپ ایک ایسی معمر عورت نظر آ رہا تھا جس کا اکلوتا بیٹا لام پہ جا رہا ہو۔ وہ ٹھوڑی مار کر اونچے پلنگ سے اتری اور ابا جی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔

"ابا جی خدا کے لئے آپ فکر نہ کریں جی۔ اماں ٹھیک ہو جائیں گی۔ ابا جی ہوش کریں پلیز۔ ڈاکٹر صاحب کہہ تو رہے تھے۔ ابا جی .... ابا جی...!"

ابا جی کی جھڑی جاری تھی وہ ابوالہول کی طرح جامد بیٹھے تھے صرف آنکھوں سے جھرنے بہ رہے تھے۔

"میں ڈاکٹر فاروق سے ملی تھی .... اُنہوں نے خود مجھ سے کہا تھا۔ ابا جی مجھے سب نرسیں کہہ رہی تھیں آپ فکر نہ کریں میری بات پہ اعتماد کریں ابا جی ——"

اُسے خود تعجب ہوا کہ دو ہی دن میں وہ کتنی اہم ہو گئی ہے!

"حوصلہ کریں ابا جی ——"

بڑی دیر بعد ابا جی بولے۔

"اس کے سوا میرا دنیا میں اور ہے کون؟ یہ نہ رہی تو پروا نہ رہے کہ خاندان نہ رہے گا۔ میری تو ساری جد کی ہے اس کے دم سے ——"

"آپ کو میری بات ماننا ہو گی ابا جی —— اگر آپ کو اماں سے رتی بھر پیار ہے تو آپ کو چُپ کرنا ہو گا۔ دیکھئے وہ کیسی پریشان ہو رہی ہیں آپ کے آنسو دیکھ کر ——"

ابا آہستہ آہستہ بریک لگاتے لگاتے صبح اذان سے پہلے چُپ ہو گئے نصرت نے یہ پہلا شکار کیا!

اب وہ جس وقت چاہتی جس طرح چاہتی ابا جی کو سمجھانے بجھانے اور مشورے دینے لگ پڑتی۔ ساری عمر ابا جی بھی کسی عورت کے پیچھے نہیں لگے تھے۔ اب انہیں بھی جی حضوری میں عجب لطف ملنے لگا۔ دوائیوں کی خریداری سے پہلے وہ اچھی طرح نصرت سے سارے نسخے سمجھ کر جاتے کبوتروں کی یخنی اور بٹیروں کی آش بنانے کے طریقے غور سے سمجھتے، اماں کو کروٹ دلانے سے پہلے وہ ایک آدھ مرتبہ مشورہ طلب نظروں سے نصرت کو مڑ کر دیکھتے۔

نصرت کو کھل سم سم کا منتر ہاتھ آ گیا۔

"ابھی اماں سوئی ہوئی ہیں ——"

"ابھی بیڈ پین لگایا ہے ——"

"ابھی اماں نے قے کی ہے ——"

جب وہ چاہتی دروازہ کھول کر ابا جی کو اماں سے ملا دیتی۔ جب اُس کا جی چاہتا ایک اشارے میں ابا جی کو کرسی سے اٹھا دیتی۔ جس وقت بقایا خاندان وارڈ پہ ٹوٹا نصرت سارے حالات پہ اس طرح قابض ہو چکی تھی جس طرح پرائیویٹ وارڈ کا یہ کمرہ ہائی جیک کیا ہوا طیارہ ہو۔

پہلا حملہ آور تائی جی تھیں۔

یہ بڑی دبلی پتلی سینک سلائی عارف دنیا خاتون تھیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پہ ہر گھر میں جہیز بری کی سنبھال اُن کے ہاتھ میں ہوتی۔ رشتے ناطے اُن کی رضا سے ہوتے۔ ہر مرگ میں لوگ زیادہ تر اُن ہی گلے لگ کر رویا کرتے۔ اُن کی گھر داری، سلیقے، اور ہانڈی روٹی کا شہرہ سارے خاندان میں تھا۔

آتے ہی انہوں نے بڑی معرفت کے ساتھ کہا۔ "اچھا نصرت اب تم گھر جاؤ۔ جوان لڑکی کا ہسپتال میں کیا کام۔ اب تمہاری اماں جانے اور میں جانوں ——"

نصرت کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

سسٹروں سے باتیں کرنا، نرسوں پہ حکم چلانا، ڈاکٹروں سے معتبری لڑانا، آیا جمعدارنی کو بچا کھچا کھانا دے کر مہربانیاں کرنا.....

اتنا سارا کچھ اُس کے ہاتھوں سے سرکنے لگا۔

"نہیں جی آپ تکلیف نہ کریں تائی جی۔ اماں کو بھلا میں اکیلی چھوڑ سکتی ہوں۔"

"ہوش کرو بیٹی۔ جوان لڑکی کو چھوڑ کر میں جاتی ہوں گھر۔ یہ بھلا ٹھیک لگتا ہے کوئی۔"

"ٹھیک کیوں نہیں لگتا تائی جی۔ آخر تین دن سے میں جوان لڑکی اکیلی ہی تھی اماں جی کے پاس۔"

تائی جی بھی ہار ماننے والی عورت نہ تھی۔ پر اسی وقت ڈاکٹر فاروق آگئے اور نصرت انہیں کھٹ کھٹ انگریزی میں گذشتہ رات کی ساری کیفیت بتانے لگی۔

کتنا پیشاب کرایا —— کتنے سی سی؟

کتنا گلوکوز لگا —— کتنے سی سی؟

بلڈ رپورٹ —— میکسیم کتنا اور مینیم کتنا؟

ایکس رے —— گلے کی رپورٹ کلچر —— آج اور کل کی کیفیت۔

ایک ایک تفصیل نصرت کو اچھی طرح یاد تھی۔ گویا ان ہی تفصیلات پر اُس کی زندگی کا دارو مدار تھا۔

تائی دانۂ اسپند کی طرح چند لمحے خوب بھڑکی، تڑکی اور پھر ٹھنڈی پڑ گئی کیونکہ اس بار نصرت کی طرف ابا جی تھے۔

"یہ اپنی ماں کی بیماری کو سمجھتی ہے۔ اب تم نئے سرے سے تکلیف کرو گی بھابھی!"

تائی کے لئے یہ زندگی کا پہلا موقعہ تھا کہ کوئی اور انسان اُن سے زیادہ کوئی معاملہ سمجھ رہا تھا۔ پر پانی ڈوبا تو تھا۔ وہ ایک دن تو پرائیویٹ وارڈ کے باہر چٹائی بچھا کر سیکنڈ پوزیشن پہ نصرت کے احکامات مانتی رہی۔ پھر اچانک اُن کی ڈاڑھ میں درد ہو گیا اور وہ اپنی بہن کے پاس چیچو کی ملیاں چلی گئیں۔

افسوس یہ خاندان کا پہلا تاریخی واقعہ تھا جب تائی کا طنبورہ بے سُر بجا۔

دوسرا وار اماں کے میکے والوں نے کیا!

اماں کو اپنا میکہ چھوڑے پورے تیس سال ہو چکے تھے۔ یہ بات تک بہ مرتبہ صفت لوگ یہی منوانے میں وقت صرف کرتے تھے کہ تیس سال پہلے انہوں نے اماں کو پالا پوسا اور جوان کیا تھا۔ اماں کی بڑی بہن اپنی بیٹی اور نواسی سمیت نرسنگ کے لئے آئیں۔ اُن کے ساتھ مختلف سائز کی

تھرموس، ٹفن کیریر، بستر بند، ڈھاکے کی بنی ہوئی ٹفن باسکٹ، نماز پڑھنے کی چٹائی، اوپر اوڑھنے کے کمبل، اور دو چار تکیے تھے۔ یہ سارا سامان انہوں نے پرائیویٹ روم کے سامنے قرینے سلیقے اور خود نمائی کے ساتھ برآمدے میں سجا لیا۔

لیکن نصرت بین چوکس ہو گئی تھی اور ساز و سامان سے ڈرنے والی نہ تھی۔ اب اس نے سسٹر کو کہہ کر اماں کے کمرے کے سامنے "داخلہ ممنوع ہے" کا بورڈ لگوا دیا۔ اب نصرت کو آسانی ہو گئی۔ وہ باری باری مہمان کو اندر لے جاتی۔ پانچ منٹ کے بعد گھڑی دیکھتی اور مہمان کو آنکھ کے اشارے سے باہر نکل جانے کا حکم دیتی۔

نصرت کے رویے سے تو سارے گھر میں گویا بھونچال آ گیا۔ یہی موقعہ ہوتا ہے جب عام طور پر رشتے کی دوری نزدیکی واضح شکل میں سب کے سامنے آ جاتی ہے اب نصرت نے سب کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار پھینکا تھا۔ اس کے اس رویے سے ایک اور مشکل یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وارڈ کے ملحق برآمدے میں جہاں اماں کی بڑی بہن نے مہری سی دری بچھا رکھی تھی۔ رفتہ رفتہ سیاست کا میدان کھل گیا تھا۔ رشتہ دار عورتیں مریضہ کی خدمت کرنے سے معذور ہوئیں تو انھیں کئی کئی گھنٹے جوڑ توڑ کرنے لگے۔ اپنی اپنی محبت کا گراف سب بنا رہی تھیں اور اسی لئے بیشتر وقت ان کا ہسپتال میں ہی گزر رہا تھا گو نصرت انھیں اندر جانے ہی نہ دیتی تھی۔

اب برآمدہ دو کیمپوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک گروہ وہ تھا۔ جو اماں کی بہن یعنی میکے والوں کے ساتھ مل کر مصر تھا کہ یہاں علاج بڑی سست روی سے ہو رہا ہے اس لیے جلد ہی مریضہ کو گھر منتقل کرانا چاہیے اور کسی ہومیو پیتھک ڈاکٹر یا جاندیدہ یونانی حکیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ دوسری پارٹی تائی کے اثر تلے تھی اور اسی بات پر اڑی ہوئی تھی کہ یہیں ہسپتال میں مریضہ کو رکھنے چاہے کچھ سال ہی کیوں نہ گزر جائیں۔ دونوں کیمپ اس ٹاپک کے علاوہ جنسی مذاق، لڑکیوں کے رشتے، شوہروں کی بے وفائیاں اور کنجوسیاں، سسرالی رشتہ داروں کی ناگوار حرکتیں، قیمتوں کی گرانی، بازار اور ریڈیو کی کے کپڑے، قمیصوں کی لمبائی اور پائنچوں کی چوڑائی، لڑکوں کی پڑھائی، نوکروں کی کام چوری، پنجابی فلموں میں ہیرو کی شادی، کھانے پکانے کی ترکیب اور دوسری عورتوں کی زیادتیاں اور ان کی اپنی کم زبانیاں یہ سب زیر بحث آتا تھا۔

ان دو گروہوں کے علاوہ نوجوان لڑکیاں امتحانوں سے فارغ نو بالغ لڑکے اور چھوٹے بچے بھی بڑے شوق سے ہسپتال آیا کرتے تھے۔ لڑکوں کو گھر کی لڑکیاں جانچنے، آنکنے اور پھر اپنے ڈھب پر لانے کا فکر رہتا تھا۔ لڑکیاں گھروں کے ولدوں اور یکسانیت سے بچنے کے لئے چلی آتی تھیں۔ بچوں کو پھل فروٹ اور کھیلنے کا شوق ہسپتال لاتا۔ غرضیکہ پرائیویٹ وارڈ کے ملحق برآمدے میں ایک ایسا اردو بازار کھلا ہوا تھا کہ بہت کم لوگوں کو علم ہو سکا کہ اس لشکری کیمپ کا فائدہ صرف نصرت کو ہو رہا ہے۔ خود نصرت کے بہن بھائی تار ملتے ہی بہاولپور سے لوٹے تو چونکہ ان کی محبت قدرتی تھی۔ اس میں غلبہ پانے یا نمبر اتارنے کا اندیشہ نہ تھا اس لئے وہ سب یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ آنکس کی ماری ابلی جھلڈ نصرت بھی کسی کام آ ئی۔ وہ ہسپتال کا سارا کام نصرت کے ذمے لگا کر خود شام کو گھڑی کی گھڑی ملاقاتیوں کے وقت میں آتے۔ تھوڑی دیر بیٹھے روتے رہتے۔ پھر گھر جا کر ٹیلی ویژن دیکھتے۔ سونے سے کچھ دیر پہلے پھر اماں کی باتیں کر کے روتے اور پھر جوانوں اور بچوں کی میٹھی نیند سو جاتے۔

بغلی برآمدے میں جو پالٹکس چل رہی تھی اس کی روح رواں اماں جی تھیں اور اماں جی پر نصرت قفل بنی بیٹھی تھی۔ اب جو بھی مدعا علیہ آتا اسے پہلے نصرت کے دوار پہ ماتھا ٹیکنا پڑتا۔

"کیا حال ہے خالہ جی کا ——؟" میرے چچیرے پھوپھی زاد سکنی نائلہ کے پوچھتے۔

نصرت جالی کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر بڑی میٹھی آواز میں کہتی۔
"اب تو رات سے بہتر ہے ــــ"
"کچھ کھایا پیا؟" پھوپھیاں، تائیاں، خالائیں پوچھتیں۔
"دو تین چمچ شوربہ پیا تھا مجھ سے بس ــــ"
"کوئی بات کی تم سے؟ ــــ" جوان لڑکیاں سوال کرتیں۔
"ہائے ابھی کہاں ــــ؟ ــــ" وہ دکھ سے جواب دیتی۔
"ہم آجائیں اندر جی ــــ؟" بچے سوال کرتے۔
"شاباش ــــ باغ میں جاکر کھیلو شاباش۔"

اتنے سارے سوال اس سے کب کسی نے پوچھے تھے؟ اتنے سارے سوالوں کا جواب آج تک کبھی اسے درست آیا بھی کب تھا؟ سارا نسبی خاندان اس کی طرف اس طرح دیکھتا تھا جیسے وہ صبح چڑھنے والا سورج ہو جس کی آرتی اتارنا پوجا کرنا ضروری ہو۔

بی اے کا امتحان دیئے پانچواں سال تھا لیکن ابھی تک کبھی کبھی جب نیم چھتی میں کھوے چلے تخت پوش پر بیٹھی بیٹھی وہ اونگھ جاتی تو اسے خواب آتا۔ جیسے وہ امتحان گاہ میں داخل ہو رہی ہے۔ پرچہ شروع ہوئے پونا گھنٹہ ہو چکا ہے۔ ساری ہم جماعت سر جھکائے کھٹا کھٹ لکھ رہی ہیں۔ حساب کا پرچہ ہے اور وہ تاریخ یاد کر کے آئی ہے۔ سارا پرچہ گڈمڈ ہے۔ کوئی سوال اسے نہیں آتا۔

سوال اتنے زیادہ ہیں کہ تین گھنٹوں میں ان کا جواب ممکن ہی نہیں۔ اس کے پاس پین نہیں۔ اگر ہے تو اس میں سیاہی نہیں ہے۔ لڑکیاں پلٹ پلٹ کر اس کی طرف دیکھ رہی ہیں ممتحن اعلیٰ انگلی اٹھا اٹھا کر تنبیہہ کر رہا ہے۔ ناظر امتحانات سپاہیوں کی طرح آ جا رہے ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں بھاگ رہی ہیں وہ چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کی چاروں کنیاں بالکل خالی ہیں۔ پر وہ کھڑی ہے ــــ کھڑی ہے ــــ کھڑی ہے۔ انصاف طلب نظروں سے نہیں رحم طلب نظروں سے دیکھتی جاتی ہے ــــ اور کچھ نہیں سوچتی!

ان دنوں جیسے ہسپتال آتے ہی اس خواب کی تعبیر یک دم الٹ نکل آئی۔ اب وہ سارے جواب جانتی تھی۔ اب لوگ اس کی طرف دیکھتے تھے اس کی توجہ چاہتے تھے۔ آتی نگاہوں کا مرکز بنی تو بدصورتی پولکیشس کی چھال بن کر جھڑنے لگی۔ عورت کا سارا حسن ہی دراصل ان توصیفی نگاہوں سے بنتا ہے جو اس پر وقتاً فوقتاً ہلکی پھوار کی طرح پڑتی رہتی ہیں۔ اب نصرت کانوں میں چاندی کے گول گول بالے لٹکائے لمبی زلفیں چھوڑے برآمدوں میں ڈاکٹروں سے باتیں کرتی نکل جاتی تو کئی لڑکوں کا دل کرتا کہ کبھی نصرت اس طرح ان سے بھی مخاطب ہو۔
"کیا حال تھا رات خالہ ابا کا ــــ" لڑکا پوچھتا۔
"ٹھیک تھیں رات نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ویلیم کھلائی تو سو گئیں بیچاری۔"

توصیفی نگاہ اس پر پڑتی۔ یک دم اس کا دل بلبلے کی طرح ابھر اٹھتا۔ ہائے میں ویلیم کھلانے والوں میں سے تھی۔ مجھے ویلیم کھلانے کے لئے کسی گھر والے سے اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی!

ان ہی دنوں مجید سے اس کی ملاقات ہوتی جو ان دنوں فارن سروس میں تھا اور جس کی بیوی اس کے ساتھ تمغے کی طرح سجتی تھی۔

نصرت انھیں کمرے کے باہر ملی۔ مجید نے سگار جلا کر لیے سائیڈ برن درست کرتے ہوئے اپنی بیوی کا نصرت سے تعارف کرایا۔
" یہ میرے بہت ہی پیارے ماموں کی بیٹی نصرت ہے —— میں تمھیں اس کے متعلق بتا چکا ہوں نورین —"
" سلام علیکم —" لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر مسز نارمن سروس بولی۔
کیا بتا چکا ہے میرے متعلق یہ کراڑ آدمی!
" ہم دونوں بڑے FRIENDS ہوتے تھے۔ ہے نا نصرت —— ہر بات ایک دوسرے سے کرتے تھے۔"
" مجید نے بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تا کہ اس کی تنے وائی کو یقین آ جائے کہ اس رشتے تلے کبھی کوئی تکلف نہ تھا!
" جی ہاں —— بڑے —— بڑے FRIENDS " ہاتھ چھڑا کر نصرت بولی۔
" دن میں کئی کئی مرتبہ ہم چائے بنایا کرتے تھے کیوں نصرت ——"
" ہاں کیوں نہیں —— ؟ —— واقعی! ——"
نصرت کے سانس ہل رہے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ مجید کے چہرے پر اشتیاق تھا۔ جیسے کباڑی کی دوکان پر اپنی ہی بیچی ہوئی کوئی کتاب مل جائے۔
" ماموں جی کا کیا حال ہے ؟"
" بہتر ہیں پہلے سے ——"
" میں نے نورین سے کہا کہ فرانس جانے سے پہلے میں ماموں جی سے ضرور ملوں گا —— خدا قسم نورین YOU SHOULD MEET HER
—— گریٹ گریٹ گریٹ ——"
نورین نصرت کو اشتیاق اور حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ جس طرح ہر وہ بیوی دیکھتی ہے جو اپنے شوہر کے ماضی، حال اور مستقبل میں دھاگے کی طرح پروئے جانے کی آرزو رکھتی ہو۔
" ماموں جی کو مل لیں ہم ——"
نصرت نے لمحہ بھر کو سوچا پھر بولی۔ " ہائے آئی ایم سوری۔ وہ تو ابھی سوئی ہیں۔ بھابی آپ مائنڈ نہ کرنا پلیز —— ڈاکٹر نے منع کیا ہے جگا نہیں سکتے۔"
نصرت نے دل ہی دل میں اونچا سا قہقہہ لگایا —— اللہ! اب ہم بھی اس قابل ہوئے کہ مجید کچھ چاہے اور ہم نہ کریں!
مجید پر اس انکار کا عجب الٹا اثر ہوا۔ گویا اس مرتبہ آکسیجن کے بغیر آگ بھڑکی۔
" چلو ہمارے ساتھ ذرا —— انٹر کونٹی نینٹل میں چائے پئیں گے ——"
" کون؟ ——" نصرت نے پوچھا۔
" ہم —— تم اور میں . . . . اور نورین۔"
نصرت مسکرائی۔
" اور اماں جی —— ؟ ——"

"اُن کے پاس کسی کو چھوڑ دو بھئی یہ کیا شغانہ کتنا بھرا ہوا ہے —"
نصرت پر یہ نہر سو بزکو فتح کرنے کا موڈ تھا۔
"ہائے اماں تو میرے بغیر ایک منٹ نہ رہ سکیں گی"
"اچھا پھر —" مجید کے بچے میں تھکان تھی۔
"اچھا پھر —" مسز فاران سروسلس بولی۔
"خدا حافظ —"

"خدا حافظ —"

پھر الیاس آیا!
کامران آیا!!
جعفر آیا!!!

نصرت نے چھوٹے بڑے کُل آٹھ عشق کئے تھے۔ جن میں سے پانچ گریس گے، پیکٹ بند سلوفین کے کاغذ میں قرینے سے پہلے اُس نے دل کے موتھ پروف خانوں میں بند کر رکھے تھے۔ باقی تین عشق ایسے تھے جن کی تفصیلات سارے خاندان کو رتی رتی معلوم تھیں۔ یہ تینوں ڈھیری بند، سیل شدہ عشق اُس کے اندر اس طرح پڑے تھے جیسے کوئی جہاز سمندر بُرد ہو جائے اور پھر کپتان کے کیبن میں سے تین جواہرات سے بھرے صندوقچے سمندر کی خوردہ بُردہ میں لٹکتے پھریں کبھی یہاں کبھی وہاں۔ شعلے کا بھی ایک اصول ہوتا ہے سوکھی چیز میں جلد حلول کر جاتا ہے ۔ کیبن ملے تو بہت لپک لپک کر جلتا ہے۔ اس کے چاہنے والے رطوبت بھرے پھپھوندی لگے سیلے سیلے عاشق تھے۔ سیل بیٹریوں کی طرح جلے۔ گیلے پاپڑ کی طرح سلگے اور پھر پانی کی طرح سارے راکھ میں بدل گئے۔ کوئی بجھا ہوا کوئلہ باقی نہ رہا۔

سارے عاشقوں میں کامران ابھی تک کنوارا تھا۔ لیکن دونوں کے درمیان وہ مقناطیسی قوت ختم ہو چکی تھی۔ جس کے ہوتے ہوئے کھٹ سے دونوں شمالی اور جنوبی قطب بن کر ایک دوسرے کے سامنے آ جایا کرتے تھے۔ اب تو بس دو نولے تھے۔ وزنی — سیاہی مائل ٹھنڈا لوہا۔

"کیا حال ہے خالہ جان کا؟ —"
"ٹھیک ہیں —"
"آپ کیسی ہیں؟ —"
"ٹھیک ہوں —"
کامران فلرٹ کرنے کے موڈ میں تھا۔

وہ ہمیشہ فلرٹ کرنے کے موڈ میں رہتا تھا۔ نصرت کو وہ دن یاد آ گئے جب کامران پہلے پہل اُس کی زندگی میں اسی خاصیت کے باعث داخل ہوا تھا۔ نصرت کا دل بھی ایک ہارسنگھار کا درخت تھا۔ جس کی ڈالیوں پہ سے بارہ ماہ یادوں کے ننھے ننھے پھول گرتے رہتے تھے۔

کامران شاعر تھا لیکن نصرت کے عشق کو اُس نے گڈا بنا دیا۔ اُس نے نصرت پر کبھی کوئی نظم یا گیت نہیں لکھا تھا۔ لکھا ہی لکھا تو ایک چو مصرعی خاکہ!

پہلی شام جب کامران گھر آیا تو اس روز نصرت بطخ کا شوربہ بڑے ڈونگے میں اٹھائے لا رہی تھی۔

"بطخ دیکھی ہے تم نے؟" کامران نے پاس بیٹھی طاہرہ سے پوچھا۔

"جی ــ"

"کیسی ہوتی ہے بھلا؟ ــ"

"سفید ــ"

"غلط ــ خشکی پر تیرتی ہے اور پانی میں چلتی ہے۔ جو کبھی بیٹھی ہو تو لگتا ہے دونوں بغلوں تلے کچھ چھپایا ہوا ہے ــ"

پھر کامران نے نصرت کی طرف دیکھ کر پوچھا ــ "کیوں بی بطخ پسند ہے آپ کو ــ"

نصرت کھلکھلا کر ہنس دی!

ان دنوں اُس پر کھانے پکانے کا بھوت سوار تھا۔ وہ کبھی چینی شوربے پکاتی کبھی فرانسیسی سوفلے تیار کرتی۔ کبھی ایرانی کباب کو بیدہ کوٹتی۔ لیکن اُس کے ہر کام میں آخری آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔ سارے گھر والے اُس کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ لیکن اعلانیہ صرف کامران نے اُس کا ٹھٹ بنایا۔

جونہی وہ میز پر پہنچتا۔ ڈش اٹھا کر کہتا۔ "حاضرین یہ دولمے ہے غور سے دیکھیے۔ دولمے! ایران میں اسے دولمہ برگ کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت آپ سب اسے بلا تکلف گر بر کہہ سکتے ہیں۔ واللہ اعلم الصواب۔"

کبھی کبھی وہ کھاتے کھاتے رُک جاتا اور تیکھا سا منہ بنا کر پوچھتا۔ "حضرت یہ کیا ہے؟"

پھر وہ بڑی توجہ سے ساری ترکیب، ترکیب استعمال سب کچھ سنتا اور کہتا ــ "بی بی سیدھا آ قیمہ کیوں نہ پکا لیا تم نے؟ ــ"

شروع شروع میں یہ باتیں ہنسی مذاق میں ہوتی رہتیں۔ خود نصرت کو علم نہ ہو سکا کہ اُس کے اندر ایک پن کُشن تیار ہو رہا ہے۔

اُس روز بھی معمول دھوپ چڑھی تھی اور ایک عام سا دن تھا۔ لیکن نصرت نے کئی عام دن خاص فیصلے کر کے بڑے علیحدہ کر لئے تھے۔ درزی اُس کے لیے نیا بل بوٹم سی کر لایا تھا اور وہ اسے ٹرائی کرنے کے لئے پہن کر جا رہی تھی کہ کامران دانتوں سے اخروٹ توڑتا ہوا اُسے نظر آ گیا۔

"واہ کیا پاجامہ ہے! کس کی گُڈی کا اُتارا ہے بھئی ــ؟"

"یہ پاجامہ نہیں ہے ــ"

"ستار کا غلاف ہے پھر؟ ــ"

"آپ سے کسی نے پوچھا ہے کہ کیا ہے ــ؟"

"ذرا انفرمیشن بڑھ جائے گی میری بتا دو پلیز یہ جو تم نے پہن رکھا ہے کیا نام ہے اس کا ــ"

کامران نے ہونٹ لٹکا کر پوچھا۔

"بیل بوٹم ــ"

"ہائے بوٹم لیس بل۔

"ہر بات میں سامنے کون آتا ہے آپ نے خواہ مخواہ !—" نصرت روہانسی ہو کر بولی۔

"میں پاکستان کا معزز شہری ہوں۔ مجھے یہاں کے ہر معاملے میں رائے دینے کا کلی اختیار ہے۔"

"تو رکھیے اختیار اپنی جیب میں ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کے ساتھ۔"

نصرت جھگڑ کر اندر چلی گئی اور بل بوٹم درزی کو لوٹا دیا۔ اسی پاجامے کے ساتھ ساتھ اس نے کامران کی ساری توجہ بھی واپس کر دی۔ یہی کامران دوسری لڑکیوں پہ کیا خوبصورت نظمیں لکھتا تھا۔ اُن کا لباس اُن کی صورت چال ڈھال سب کی تعریف کرتا تھا۔ کبھی کسی کو دیا سے ملا رہا ہے کبھی کسی کو ایوا گارڈنر اگرڈ برگمن کی کاپی بتلا رہا ہے۔ کوئی اُس کے نزدیک زیبا نفی کوئی مینا کماری۔ اس سارے عشق میں اُسے بلّخ سے بہتر کوئی خطاب مل سکا۔ نصرت چپ چاپ دور ہوتی گئی اور جب آکسیجن کافی دور ہو گئی تو شعلہ آپ سے آپ بجھ گیا۔

اب کامران ہسپتال کے دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اور فلرٹ کرنے کے موڈ میں تھا۔

"کیسی ہیں —؟"

"ٹھیک ہیں —"

"کون بھلا ؟"

"آپ کی پھوپھی —"

"نہیں بھائی ہم پھوپھی زاد کو پوچھتے ہیں —"

نصرت نے منہ پھیر لیا۔ پتہ نہیں کیوں آج اس کی آنکھوں میں اتنی سی بات پر آنسو آ گئے اُس نے جالی کا دروازہ کھول دیا اور آہستہ سے بولی۔

"آپ خود جا کر مل لیں —"

کچھ لمحے کامران حیرانی سا اس خوبصورت سی لڑکی کو دیکھتا رہا اور پھر اندر پھوپھی کے پاس چلا گیا۔

اس سے پہلے بھی کئی بار گھر چلنے کا مشورہ ٹھہرا تھا۔ بلکہ زیادہ وہ ہیں اسی بات کے حق میں تھیں کہ یہاں خارج کے مریض کو رکھنے سے کہیں بہتر ہے کہ گھر پر چل کر علاج بدل لیا جائے۔ کون جانے اللہ شفا ہی دے دے۔ کامران سے ملنے کے بعد پتہ نہیں نصرت نے ایک بار بھی مدافعت نہ کی۔ کامران کو دیکھنے کے بعد اُسے اماں کی خدمت کا چاؤ نہ رہا تھا۔

گھر آتے ہی وہ گھر والوں سے یوں کٹ گئی جیسے پان لگانے والے قینچی سے سخت ڈنڈی کاٹ پھینکتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنا وجود گھر والوں سے کاٹ رکھا تھا۔ اس بار اس کا جی نیم چھتی میں بھی نہ لگا۔ ہر وقت جی اکتا کر نیچے چل۔ شاید ابا کوئی مشورہ چاہیں۔ شاید اماں کی کیس ہسٹری ہی بتانا پڑے۔ شاید اُس کی خدمت گزاری، فرمانبرداری کے چرچے ہو رہے ہوں۔

ادھر اماں اب چھڑی سے کر آہستہ آہستہ چلنے لگی تھیں مگر میں سیوا کرنے والوں کا ایک ہجوم جا تھا۔ وہ اکیلی ایک ٹوٹے آئینے کے سامنے کھڑی رہتی۔ سارے زمانے میں ٹھپّہ کھانے کے بعد اُس کی انا اب اُسی کے گرد تھپ تھپ کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس کے دل میں ایک نئے عشق نے جنم لیا — اپنی ذات کا عشق۔

وہ پہروں بیٹھی اپنے ہی ہاتھ دیکھتی اپنے جسم کے ایک ایک حصہ پر مساس کرتی —

اس عشق کے باوجود دل کے کہیں اندر کوئی کہتا رہتا کوئی چیز اپنی مزور ہونی چاہیے ایک سکاپی سہی جس سے انسان پھندا سے کر مر جائے ایک تیشہ ہی سہی جو اپنے آپ کو مار کر مر جائے ایک چٹکی زہر ہی سہی!

پھر ایک بارش کا ریلا آیا۔

ایک شام نیم چھتی کے دروازے پہ دستک ہوئی۔ اباجی سامنے کھڑے تھے اور ان کے گریبان کے دونوں بٹن کھُلے تھے۔

"نصرت —"

"جی اباجی —"

"تمہاری اماں کو پھر فالج کا دورہ پڑ گیا ہے۔"

جب وُہ نیچے پہنچی تو اُس کی ماں کا چہرہ چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ گھر والے زور زور سے بین کر رہے تھے۔

دروازے کے ساتھ اباجی گُم سُم اُس کے گریبان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں ایک آشناسی چمک تھی! غم آشنا چمک! اُس کے قریب آنے کی ڈوری ڈوری سی چمک۔

نصرت نے ایک چیخ ماری اور اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ اور اباجی سے لپٹ گئی۔ اُسے یوں لگا گویا کوئی صبح کا بھولا گھر آ گیا ہو۔

آج تک سب کہتے ہیں جیسا غم نصرت نے اپنی ماں کا کیا۔ پھر کسی گھر کی لڑکی کو نصیب نہ ہوا۔ لیکن نصرت جانتی ہے کہ ایک اس غم میں کئی اور غم بھی شامل تھے۔ نئے اور پرانے سب غم جو ایک ہی شاہراہ سے پگڈنڈیوں کی طرح ملتے تھے......

اس سے پہلے وہ سمجھتی تھی کہ وہ عشق کی منزل سے فارغ ہو چکی ہے — لیکن اس کے بعد اُسے پتہ چلا کہ اس منزل سے جیتے جی کوئی فارغ نہیں ہوتا نہ اس منزل کی کوئی سمت ہوتی ہے نہ مقام — بس یہ بگولے کی طرح جہاں چاہے بیٹھ جاتی ہے۔ جہاں سے چاہے اٹھ کھڑی ہوتی ہے!

---

# سنڈریلا

## اختر جمال

زمین محو رقص تھی۔ آسمان مسکرا رہا تھا۔ ستارے دم بخود تھے۔ پھر سب زمین کے ساتھ رقص کرنے لگے۔ جیسے سب اس کے اشارے پر ناچ رہے ہوں۔ چاند سورج سارے سیارے نور کے ہالے میں رقص کر رہے تھے اور خدا مسکرا رہا تھا۔ نورانی پروں والے سب فرشتے سجدے میں مصروف تھے۔

اچانک سنڈریلا کی نظر گھڑی پر پڑی وہ شہزادے کا ہاتھ چھوڑ کر بھاگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا شہزادے نے کچھ پوچھنا چاہا مگر سنڈریلا کو اس کی طرف دیکھنے اور بات کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ سنڈریلا کو کچھ پوچھنے کی بھی ضرورت نہ تھی شہزادے کی خوبصورتی علم اور ہنر کا دور دور شہرہ تھا۔ سنڈریلا پہچان گئی کہ اس کا ہم رقص شہزادہ ہے اور اس نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا شہزادے کو نہیں معلوم کہ اس کی ہم رقص لڑکی قسمت کی سوتیلی بیٹی ہے جسے قسمت نے وجود کی تنہائی میں ہمیشہ کے لئے قید کر رکھا ہے اور اس وقت وہ قسمت کا جادو توڑ کر نیکی کے فرشتے کے ساتھ اس مینائی محل میں رقص کرنے آئی ہے۔ مگر اب اسے نیکی کا فرشتہ بھی نہیں روک سکے گا اس لئے کہ نیکی بھی قسمت سے لڑ نہیں سکتی۔ وہ فرشتہ جو پری بن کر اسے لایا تھا چپ چاپ سر جھکائے بے بسی سے اسے بھاگتا ہوا دیکھتا رہا۔

پھر جب گھڑی نے پورے بارہ بجائے تو رقص کرتی ہوئی زمین پر سنڈریلا اتنی دور جا کر اتنے زور سے گری کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ ہر بچہ ہی روتا چیختا دنیا میں آتا ہے مگر سنڈریلا کے چیخنے کی ایک وجہ اور بھی تھی اس کے پیر کا جوتا خدا جانے آسمان پہ رہ گیا تھا یا جس جگہ وہ رقص کر رہی تھی وہاں یا پھر وہ خلا میں ہی رہ گیا تھا اور ایک سیارہ بن گیا تھا۔

سنڈریلا زمین پہ گرتے ہی گرد و غبار میں اٹ گئی۔ وہ ایک جوگن نظر آ رہی تھی۔ جب سنڈریلا نے اپنا ایک پیر خالی دیکھا تو اس نے سوچا ایک جوتے کا کیا فائدہ اس لئے اس نے دوسرا جوتا اٹھا کر حفاظت سے یاد کے صندوق میں بند کر دیا۔ تاکہ کبھی کوئی اللہ کا بندہ اس کا دوسرا جوتا لا دے تو پھر دونوں جوتے پہن کر آرام سے چلے۔ لیکن اب جب وہ ننگے پیر کھڑی ہوئی تو پھر جوگن بن کر رقص کرنے لگی۔

دشت کے سب کانٹے دعا مانگ رہے تھے کہ کوئی "آبلہ پا وادئ پُرخار" میں آئے۔ سنڈریلا نے جب رقص شروع کیا تو اس کے پیر لہولہان ہو گئے۔ دھرتی کے سب نوکیلے کانٹے منہ کھولے کھڑے تھے اس کے لہو کی ایک ایک بوند پی کر وہ سب پھول بن گئے۔ اور ہر طرف سرخ پھولوں کی بہار مسکرانے لگی اور پھر وہ سب پھول زندہ ہو کر لعلِ بن گئے۔

سنڈریلا ناچتی رہی۔ سوچتی رہی اس کا وہ جوتا جو اس کی ذات ہے یاد کے صندوق میں بیکار ہی پڑا ہے بالکل بے مصرف کیا اچھا ہو کہ اس کا دوسرا جوتا مل جائے تو پھر وہ آرام سے چلنا شروع کرے۔ لیکن اگر سنڈریلا دونوں جوتے پہن کر رقص کرتی تو پھر دھرتی پر سرخ پھول کیسے کھلتے اگر اس کے پاس دونوں جوتے ہوتے تو اسے جوگن بن کر رقص کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی وہ آرام کی میٹھی نیند سو جاتی، دشت سے اپنے دامن کی احتیاط نہیں

ہوتی قدم قدم پر خاک میں خار مژہ پڑے تھے اگر سنڈریلا ننگے پیر نہ ہوتی تو خدا جانے کن کن شہزادیوں کے پاؤں زخمی ہوتے مگر دشت کے وہ سب کانٹے سنڈریلا نے اپنی پلکوں میں اٹھا لیے اور سب شہزادیاں سُرخ پھولوں سے اپنی جھولیاں بھر کر چلی گئیں۔

شہزادے نے اپنی ہم رقص کا جوتا اٹھا لیا۔ اسے وہ خوبصورت جوتا بہت اچھا لگا جب اس نے جوتے میں پیر ڈالا تو اس کے تعجب کی حد نہ رہی وہ جوتا شہزادے کے پاؤں میں پورا تھا۔ اس نے حیران ہو کر سوچا کہ یہ جوتا اس کے پیر میں کیسے پورا آ گیا۔ ہر شخص کے پیر میں اپنا ہی جوتا پورا آتا ہے وہ جوتا شہزادے کی اپنی ذات تھی۔ شہزادہ جو نور تھا وہ جوتا سے کر زمین پر آیا اور اپنے پیر کا دوسرا جوتا ڈھونڈنے لگا۔

شہزادہ اپنے عالیشان محل کے اونچے مینار پر چڑھ گیا وہاں سے چاروں طرف نظر دوڑائی اس کے دوسرے جوتے کا کہیں دور دور نشان نہ ملا۔ اس نے سوچا اس کا جوتا کہیں دور کسی ملک میں گرا ہے یا آسمان پر ہی رہ گیا ہے۔ پھر شہزادہ ایک جوتے کا کیا کرتا اس لیئے وہ جوتا جو شہزادے کی اپنی ذات تھی شہزادے نے اسے حفاظت سے محل کی الماری میں بند کر دیا۔

شہزادے کو ننگے پیر چلتے بھلا کون دیکھ سکتا تھا ملک کے سب خوبصورت جوتے اس کے قدموں میں آ کر ڈھیر ہو گئے اتنے سارے خوبصورت جوتے پا کر شہزادہ اپنا جوتا بھول گیا۔ اس نے پھر دوسرے جوتے کی تلاش ہی نہ کی۔ شہزادے کو تو ہر وقت یہ مشکل پیش آتی تھی کہ وہ کونسا جوتا پہنے کونسا نہ پہنے۔ شہزادے کی رسم ہر جوتے میں پاؤں ڈال کر تھوڑی دور چلتی پھر وہ جوتا بدل لیتا۔ اسے بھلا جوتوں کی کیا کمی تھی لیکن اپنا ہی جوتا پیر میں پورا آتا ہے کوئی اسے تنگ لگتا کوئی ڈھیلا اور کسی کی شکل پسند نہ آتی۔ کوئی پیر میں کاٹتا۔ اس لیئے جوتے بدلنا اور پہننا شہزادے کا مشغلہ بن گیا۔

جب یہ بات مشہور ہوئی کہ ملک کا وہ شہزادہ جو علم اور ہنر میں اپنا ثانی نہیں رکھتا جوتوں کا بھی شوقین ہے تو دیس بدیس کے سوداگر اپنے اپنے ملک کے جوتے لے کر اس کا دل بہلانے آ گئے۔ جوتوں کی خریداری میں شہزادہ اتنا مصروف رہنے لگا کہ اسے کتابیں پڑھنے کا وقت بھی کم ملتا تھا۔ اس لیئے اکثر لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ شہزادے کو جوتا کتاب سے زیادہ پسند ہے۔

دیس بدیس کے خوبصورت جوتے بھی شہزادہ بے دردی سے پہنتا اور اتارتا رہا مگر کبھی کوئی جوتا اسے پورا نہ آیا جب کبھی شہزادہ محل میں تنہا اپنے خوبصورت چھپر کھٹ میں بیٹھتا تو اسے اپنے جوتے کا خیال آ جاتا جو محل کی الماری میں بند تھا اور جو شہزادے کی اپنی ذات تھا اور پھر شہزادہ سوچتا کہ کاش اسے اس کے ساتھ کا دوسرا جوتا مل جائے تو پھر وہ اپنا ہی جوتا پہن کر آرام سے چلا کرے۔

شہزادہ بہت نیک دل تھا ایک دن اس نے محل میں کھڑے کھڑے سوچا کہ یہ تو بڑی خود غرضی ہے کہ جوتا محل کی الماری میں بند کر کے رکھا جائے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو دیکھا جو قصرِ دانش کے سامنے والی مشکل اور ناقابلِ عبور گھاٹی پیر میں ایک جوتا ڈال کر عبور کر رہے تھے شہزادے نے اپنا جوتا رہ گذر پر رکھوا دیا کہ جس کے پاس ایک جوتا ہو وہ شہزادے کا جوتا پاؤں میں ڈال کر گھاٹی عبور کرے اور پھر واپسی میں جوتا اسی جگہ رکھتا جائے۔

شہزادے نے تعجب سے دیکھا کہ اس کا جوتا پہن کر سب کو دل کی مراد مل جاتی تھی وہ سب واپسی میں اپنا جوتا ڈھونڈ لاتے اور شہزادے کا جوتا ہاتھ میں لا کر اسے احترام سے وہیں رکھ دیتے۔ پھر تو یہ بات مشہور ہو گئی کہ جس کے پاس ایک جوتا ہو اور وہ اپنا دوسرا جوتا ڈھونڈنا چاہے تو شہزادے کا جوتا پہن کر مشکل گھاٹی عبور کرنے سے اس کا جوڑا پورا ہو جائے گا پھر تو دیس بدیس کی وہ سب خوبصورت شہزادیاں جو سنڈریلا کی طرح ایک ہی جوتا

پہن کر بارہ کے گھنٹے سے پہلے بھاگ کھڑی ہوتی تھیں وہاں جمع ہوگئیں۔ وہ شہزادے کا جوتا پہن کر جاتیں اور واپسی میں اپنے جوتے دونوں پیروں میں پہن کر لوٹ آتیں اور شہزادے کا جوتا رہ گزر پر دوبارہ رکھ جاتیں۔ شہزادے کا جوتا جادو کی چپل بن گیا جسے پہن کر انسان اڑنے لگتا ہے اور اسے سب راستے نظر آنے لگتے ہیں اور اس طرح ہر شخص اپنی اپنی مراد اور منزل پالیتا ہے۔

شہزادے کو اکثر اپنی اس ہم رقص کا خیال آتا جو آسمان کے مینائی فرش پر اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر ناچ رہی تھی اور جو بارہ کے گھنٹے سے پہلے ہی بھاگ کھڑی ہوئی تھی مگر شہزادے کی گھڑی کی رفتار ہی اس کے بھاگ جانے سے رک گئی تھی۔ وقت تو جسم نہیں ——— وہ تو گذرنے والوں کے ساتھ گذرتا ہے۔ شہزادے کی ہم رقص آئی نہیں اس لئے وہ گئی بھی نہیں اور وقت ٹھہر گیا۔ شہزادے کی گھڑی میں بارہ بجے ہی نہیں ——— شہزادے کو یہ بھی نہ انتظار رہنے لگا کہ کب رات گذرے اور سحر ہو وہ لمبی رات سے اکتا گیا تھا اور سارے خوبصورت جوتے پہن پہن کر تھک چکا تھا۔

شہزادے کو چپکے چپکے ایک دکھ ستاتا تھا اسے سب دولتیں میسر تھیں علم و حکمت کے سب خزانے اس کے سامنے کھلے ہوئے تھے اور اس کا جوتا پہن کر ہر شخص گھاٹی پار کر سکتا تھا اور اپنا جوتا لے آتا تھا مگر شہزادے کو آج تک اپنا دوسرا جوتا نہیں مل سکا۔ وہ سدا دوسروں کے جوتے پہنتا رہا شہزادے کی اداسی دیکھ کر چاند نگر کی نیک دل شہزادی نے اسے اپنے جوتے پہنا دیئے وہ جوتے شہزادے کے پیر میں پورے تھے وہ آرام سے چل سکتا تھا۔ چاند نگر کی شہزادی بہت نفس مکھ تھی اور خوبصورت تھی شہزادہ اس کو پاکر زمین کی سب شہزادیاں بھول گیا۔

ایک دن چاند نگر کی شہزادی نے کہا "تم زمین پر تنہا تھے۔ اگر میں اپنا دیس چھوڑ کر تمہاری خاطر زمین پر نہ آتی تو تم زندگی بھر اکیلے رہتے سدا دوسروں کے جوتے پہنتے کسی جوتے کو اپنا نہ کہہ سکتے اور زمین کی سب شہزادیاں اپنا جوتا لے کر تمہارا جوتا رہ گذر پر اتنی بے دردی سے ڈال جاتی ہیں جیسے انھیں اس سے واسطہ ہی نہ ہو۔"

چاند نگر کی شہزادی کی بات سن کر شہزادہ اداس ہوگیا اس نے سوچا واقعی اگر وہ زمین پر نہ آتی تو وہ ہمیشہ تنہا رہتا کیونکہ اپنا دوسرا جوتا اسے کبھی نہیں ملے گا۔ زمین کی شہزادیوں میں کوئی بھی چاند نگر کی شہزادی کی طرح محبت کرنے والی نہ تھی بس وہ تو شہزادے کے جوتے کی فکر میں آتی تھیں مگر جب سے شہزادے نے اپنے جوتے کو رہ گذر پر رکھ دیا تھا شہزادیوں نے چوری چھپے آنا چھوڑ دیا تھا اب وہ جوتا سب کا تھا کسی کو چرانے کی ضرورت نہ تھی۔ اسے پہن کر سب اپنی اپنی منزل اور مراد پا چکی تھیں۔ چاند نگر کی شہزادی کی بات پر شہزادے کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے سوچا علم و حکمت کے یہ سب خزانے بیکار ہیں ان کی مدد سے وہ اپنی ذات کو نہ جان سکا اپنا دوسرا جوتا نہ ڈھونڈ سکا۔ پھر وہ اداس ہو کر گیت گانے لگا۔ اس کے گیت میں اتنا درد تھا۔ اتنے پیارے بول تھے سب دلوں میں اترتے چلے گئے چاند نگر کی شہزادی برا مان جاتی تھی وہ اس سے کہتی تم اپنے جوتے کے لیے اداس رہتے ہو۔ تم صبر کیوں نہیں کر لیتے۔ شہزادے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ جب تک اس کا دوسرا جوتا نہ ملے سب خوشیاں اور دولتیں بیکار ہیں۔ اپنی ذات کے درد میں اپنی ذات کی تلاش میں وہ درد سے بیقرار ہو کر گاتا رہا۔ پھر شہزادہ مایوس ہو کر سوچنے لگا جب میں خود نامکمل ہوں تو میں آسمانوں اور زمینوں کے مالک کو کیسے کل، مانوں۔ خدا جانے وہ ہے یا نہیں ہے۔ کہاں ہے؟

وہ مکمل ہے یا نامکمل ——— اگر خود مکمل ہے تو نامکمل کیوں بناتا ہے۔ میرا دوسرا جوتا کیوں نہیں بنایا؟ وہ جوتا اتنی حقیر سی چیز ہے میری اپنی ذات ——— میرا مکمل وجود!! میں وہ پہن لوں تو آگے چلوں۔ اس لئے کہ میں نامکمل وجود کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا اور آسمانوں میں ہر طرف خلا ہے۔

راستہ ہے۔ جوتا نہ ملنے سے شہزادے کا سفر رک کر رہ گیا۔ اس سفر کے لئے اسے اپنے جوتے کی ضرورت تھی۔

شہزادے کی تنہائی کا اداس گیت دلوں میں اترتا گیا اتنا درد تھا اتنے سچے بول ــــ سچے بول ہی سب سے زیادہ خوب صورت ہوتے ہیں۔ پھر وہ درد سب کا درد بن گیا۔ بول سب کے بول بن گئے۔ شہزادے نے سوچا جو اکیلا ہو سب اس کے ہیں اور وہ سب کا ہے پھر شہزادہ سچائی کا خوب صورت اور امر گیت گانے لگا۔ اور سب کو سچ کا مطلب سمجھانے لگا۔ مگر جب تک پوری بات نہ سمجھے پوری صداقت کیسے سمجھائے۔ اُسے ایسا لگتا تھا کہ جب تک اس نے اپنی ذات کو نہ جانا اس کا گیت ادھورا ہے اور شائد خدا بھی اپنی ذات سے مکمل نہیں ہے شاید اسی لئے سب کا ہے۔ شاید یزداں کو بھی جوتے کی تلاش ہے اسی لئے موسیٰ سے موچی نے یہ بات کہی تھی کہ وہ خدا کے لیئے جوتے سیئے گا اور جب موسیٰ آسمان پر گئے تو حیران رہ گئے کہ خدا نے ان کے پڑوس میں اس موچی کو جگہ دی تھی جسے خدا کے جوتے سینے کی فکر تھی اور یہ آسمان، زمین، چاند، سورج سب تارے شائد یہ یزداں کا جوتا ہی ڈھونڈ رہے ہیں جو "کن" کہتے ہی افلاک سے گر پڑا ہے۔ وہ بھی تنہا ہے ــــ میں بھی تنہا ہوں۔ شائد وہ میں ہوں یا وہ میں ہے۔ بس میں ہوں ــــ میں ــــ میں ــــ!

شہزادے کو اداس دیکھ کر دیس بدیس کی سب خوب صورت شہزادیوں نے اسے گھیر کر رقص شروع کیا تو وہ گانے لگا لیکن اب وہ "میں نہیں ہم" کا گیت گا رہا تھا اور سب شہزادیاں خوش ہو کر گیت کے تال پر رقص کر رہی تھیں۔

قسمت جو سنڈریلا کی سوتیلی ماں تھی اس نے جب سنڈریلا کو ننگے پیر ناچ کر سرخ سرخ پھول کھلاتے دیکھا تو سوچا کہ اگر اس نے رقص کر کے ساری دھرتی پر سرخ پھول کھلا دیئے تو وہ ایک دن پھولوں کی شہزادی بن جائیگی اور پھر ایک نہ ایک دن اسے شہزادہ بیاہ کر لے جائیگا۔ اس لئے قسمت نے چپکے سے سنڈریلا کو وجود کے ڈربے میں بند کر دیا۔

ایک دن سنڈریلا کی نظر ایک شخص پر پڑی وہ دکھی اور اداس جا رہا تھا۔ سنڈریلا نے پوچھا اجنبی کیا بات ہے۔ اجنبی نے آہ بھر کر کہا "افسوس میرا جوتا دریا میں گر گیا اور اب میرے پاس ایک ہی جوتا ہے میں بیمار اور کمزور ہوں۔ راستہ طویل ہے۔ میں ایک جوتے میں مشکل سے چل رہا ہوں۔ کبھی ایک پیر میں ڈالتا ہوں کبھی دوسرے پیر میں ــــ میں نے سحر سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور اب شام ہو گئی۔ اب کالی رات ہے ــــ! میری قسمت میں چاندنی بھی نہیں ہے ــــ!"

سنڈریلا نے کہا "دیکھو صبح کا بھولا شام کو ہی گھر لوٹتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ایک جوتا جو میرے پاس ہے یہی تمہارا جوتا ہو۔ اور تم سمجھ رہے ہو کہ وہ دریا میں گر گیا ہے۔"

وہ آدمی غم سے اپنے بال نوچ رہا تھا بولا "نہیں ــــ نہیں تمہارا جوتا کتنا ہی خوب صورت ہو میرا جوتا نہیں ہو سکتا۔ میں اسے جانتا تھا وہ دوسرا جوتا میری ذات کا حصہ تھا۔ جس کے بغیر اب میں مکمل نہیں ہو سکتا۔ میں نے خود اُسے دریا میں ڈوبتے دیکھا ہے۔ میں موت سے نہیں لڑ سکا مجھے اس کے غم نے پاگل بنا دیا۔ میں نے دنوں کھایا پیا نہیں ــــ اس جوتے کے ماتم میں میری زندگی کے سب خوب صورت لمحے گذر گئے۔ ہاں اگر تم مجھے اپنا جوتا دے دو تو یہ ہو سکتا ہے کہ میرا دکھ کم ہو جائے پھر میں آسانی سے چل سکوں گا۔ کیونکہ ایک جوتے سے سفر نہیں ہوتا اور راستہ دشوار اور تاریک ہے۔"

سنڈریلا بہت ہی نیک دل اور مہربان لڑکی تھی اس نے سب سے چھپا کر چپکے سے اپنا جوتا اجنبی کو دے دیا ــــ!

اجنبی سنڈریلا کا جوتا پہن کر چلنے لگا۔ مگر وہ بات میں ٹھنڈی آہیں بھرتا اور سنڈریلا سے کہتا کہ "یہ میرا وہ جوتا نہیں ہے جو دریا میں گر گیا تھا۔" وہ اپنے جوتے کو نہ بھول سکا، وہ جوتا اس کی ذات تھی۔ اس لئے کہ کوئی انسان جیتے جی اپنی ذات کو بھول جائے تو پھر وہ مہاتما بن جاتے۔ وہ سدا اپنے جوتے کے لئے روتا رہا۔ دکھ اٹھاتا رہا اور یہ سب دیکھ کر سنڈریلا کا دل غم سے بھر گیا —— اجنبی کا غم اس کے معصوم دل کو گھن بن کر کھانے لگا۔ وہ سوچتی کاش اجنبی کا جوتا دریا میں سے نکال کر دینا اس کے اختیار میں ہوتا!

کبھی کبھی سنڈریلا اس بات پہ پچھتاتی کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے اپنا جوتا ایک ایسے شخص کو دے دیا جسے اس کی کوئی قدر نہیں ہے۔ مگر وہ نیک دل لڑکی تھی۔ کوئی چیز دے کر واپس لینا اسے پسند نہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے سنڈریلا سے کہا کہ اس نے ایک دکھی بیمار اور مردم بیزار انسان کو اپنا جوتا پہنا کر غلطی کی ہے کسی ایسے شخص کو جوتا دیا ہوتا جسے جوتے کی کچھ تو قدر ہوتی، اپنا تو سمجھتا۔ وہ اجنبی ہر لمحہ کھو رہے رہنے جوتے کے غم میں اکیلا پڑا کڑھتا رہتا۔ وہ نہ سنڈریلا کے ساتھ گھومتا پھرتا نہ ہنستا بولتا۔ اس نے سنڈریلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کبھی کوئی پیار کی بات نہیں کی کبھی اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔ کبھی کوئی میٹھا بول نہیں سنایا۔ سنڈریلا جب اپنی سب سوتیلی بہنوں کو خوش دیکھتی پھولوں کے گجرے اور ہار پہنے خوشبو سے مہکتی دھنک کے سب رنگوں میں مسکراتی اور میٹھے پیار بھرے بولوں کے نشے میں سرشار تو سنڈریلا وجود کے ڈربے میں بند اداس بیٹھی رہتی۔ اس کا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ پھر وہ اداس ہو کر ڈربے میں ہی ناچنے لگی وہ جو جنگل میں ناچتی تھی اور ہر کانٹے کو پھول بناتی تھی اب خوشبو اور رنگ سے محروم ہو کر وجود کے تنگ اور تاریک ڈربے میں ناچنے لگی جہاں دم گھٹتا تھا سانس بھی نہ لی جاتی تھی۔ سنڈریلا مہربانی۔ ہنسی، خوشی اور سب چیزوں کے لئے ترسنے لگی وہ میٹھے اور پیار بھرے بول کے لئے ترستی رہی —— اور ناچتی رہی۔ اس امید پہ کہ شاید اس کی خدمت محبت اور محنت سے اجنبی کسی دن اپنے جوتے کا غم بھول کر اس کا ہو جائے۔ شاید پھر وہ سنڈریلا کے جوتے کو ہی اپنا جوتا سمجھنے لگے اور پھر پیار کا کوئی ایسا بول سنائے جو امر ہو!

سنڈریلا کے جوتے کو اجنبی نے کبھی اپنا جوتا نہ سمجھا وہ اپنا جوتا تو سائے میں رکھتا اور سنڈریلا کا جوتا دھوپ اور کبھی بارش میں ہی بھیگنے کے لئے چھوڑ کر اسے بھول جاتا۔ جب کبھی اسے ضرورت ہوتی وہ پیر میں ڈال لیتا اور پھر بھول جاتا۔ سنڈریلا کا خوبصورت جوتا بارش اور دھوپ سے خراب ہو گیا اس کا رنگ و روپ بدل گیا۔ سنڈریلا چپ چاپ اپنے جوتے کا انجام دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ سب سے چھپا کر اجنبی کو جوتا پکڑانے کی سزا ہے جو قسمت نے اسے وجود کے ڈربہ میں قید کر کے ہمیشہ کے لئے تالا ڈال دیا ہے۔

ایک دن وجود کے تنگ اور تاریک ڈربے میں جب سنڈریلا رقص سے تھک گئی تو اس کے سرخ خون سے اس کے وجود کے ویران سناٹے میں ایک خوبصورت گلاب کھلا! گلاب کی خوبصورتی اور مہک دیکھ کر سنڈریلا رقص بھول گئی وہ دن رات پھول کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔

اجنبی نے اس دوسرے جوتے کی طرف جو سنڈریلا کی ذات تھی پہلی مرتبہ ہمدردی سے دیکھا۔ سنڈریلا نے سوچا اب وہ اپنا جوتا بھول جائے گا اور اس کے جوتے کو ہی اپنا کہے گا اپنا سمجھے گا اور پیار کا امر بول سنائے گا لیکن اجنبی نے پھول کی مہک سونگھ کر بھی اپنا وہ جوتا یاد کیا جو دریا میں ڈوب چکا تھا۔ سنڈریلا نے اداس ہو کر سوچا کہ اس کے دل سے اس جوتے کا غم کوئی نہیں نکال سکتا۔ کبھی کبھی سنڈریلا کا جی چاہتا کہ وہ اپنا جوتا اجنبی سے چھین کر دریا میں ڈال دے تاکہ جب وہ نہ ہو تو اجنبی کو معلوم ہو کہ وہ کون تھی اور کیا تھی وہ اسے کھوئے گا تب ہی اسے پا لے گا۔ سنڈریلا آنکھوں میں آنسو بھر کر سوچتی۔

سنڈریلا اکثر سوچتی کہ اگر قسمت اسے وجود کی تنہائی میں ہمیشہ کے لئے بند نہ کرتی تو شاید اسے اس کا اپنا جوتا ہی مل جاتا ۔ اگر وہ آزاد ہوتی تو وہ اسے ڈھونڈتی ۔ مگر وہ تو ایک ایسے اجنبی کو ہمیشہ کے لئے اپنی ذات دے چکی ہے جو اسے صرف جوتا سمجھتا ہے سنڈریلا نہیں سمجھتا ۔ ! کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ کوئی نیک آدمی اس کا جوتا ڈھونڈ کر لا دے تو وہ بھی اجنبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات تو کر سکے اجنبی اتنا روکھا سلوک اسی لئے کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اکیلی ہے۔ اس کا جوڑ نہیں ہے ۔ دنیا میں بے جوڑ چیز کوئی قیمت نہیں رکھتی ۔ سنڈریلا اداس ہو کر سوچتی آخر وہ بے جوڑ کیوں ہے ۔ ۔ اسے بارہ کے گھنٹے سے پہلے بھاگنے کی اتنی جلدی کیوں تھی ـــــ ؟ اس جلدی کی سزا میں وہ بے جوڑ رہ گئی ـــ ایک بےمصرف تنہا جوتا ـــــ ! خدا نے تو دنیا کی ذات بھی بے مصرف نہیں بنائی تو پھر سنڈریلا جو ساتھ پیر ناچتی اور سرخ پھول کھلاتی رہی بے مصرف کیسے ہے ـــ ؟ اس کے رقص کا آخر کوئی تو مقصد ہو گا ؟

ایک دن سنڈریلا کی سوتیلی ماں قسمت کو اس پر ترس آگیا ۔ اس نے کہا " اگر تو چاہے تو وجود کے ڈربے میں سے ذرا سی دیر کے لئے باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لے لے ! !

سنڈریلا نے حیران ہو کر سوتیلی ماں کو دیکھا ۔ پھر کہا " اب تو وجود کی تنہائی ختم ہو گئی میرے لہو سے ایک سرخ پھول اس ڈربے میں کھلا ہے ۔ جس کی رات دن گھر میں نے دیکھ بھال کی ہے اس پھول کو پا کر میں سب کچھ بھول گئی ہوں ۔ یہ بات بھی کہ میرا ایک جوتا کہاں رہ گیا ـــــ اب میں اپنی ذات بھول چکی ہوں ۔ اب یہ پھول ہی میرا وجود ہے اس میں میری ذات کی مہک ہے ۔"

قسمت مسکرائی اور بولی " دیکھ اس قید کا مطلب تجھے یہ سمجھانا تھا کہ ذات کی قید سے نکل کر ہی وجود کی تنہائی ختم ہوتی ہے ۔ اب تو اس قابل ہوئی ہے کہ صاف اور تازہ ہوا میں سانس لے اور علم و دانش کے اونچے محل کا نظارہ کر سکے ۔ تو اس پھول کی فکر نہ کر میں خود اس کی دیکھ بھال کروں گی ۔ تب سنڈریلا اپنے لہو سے کھلاتے ہوئے اس سرخ پھول کو قسمت کے حوالے کر کے صاف اور تازہ ہوا میں نکل آئی ۔ اس نے پہلی مرتبہ کھلی ہوا میں سانس لیا ـــــ ! اس کا اپنا جنگل تھا مگر اب وہ اس میں مہمان بنی حیران اور پریشان کھڑی تھی ۔ اس کے پیروں سے رسنے والی لہو کی بوندوں نے اس جنگل کو باغ بنا دیا تھا ـــ ! سنڈریلا نے حیران ہو کر سوچا کہ ایک ننگے پیر ناچنے والی جوگن جنگل کو باغ بنا سکتی ہے ۔ سنڈریلا کا دل خوشی سے بھر گیا ـــ ! یہ باغ اس کی محنت اور ریاضت ہے !

سنڈریلا کی نظر علم و دانش کے محل پر پڑی اسے محل کے سامنے والی رہ گذر پر دور سے شہزادے کا جوتا نظر آیا ۔ سنڈریلا ٹھٹک کر رہ گئی اور وہ جوتا اسے بہت اچھا لگا ـــ وہ حیران ہو کر سوچنے لگی کہ یہ جوتا اس جوتے سے کتنا مشابہ ہے جو اس نے اجنبی کو دے دیا ـــ جو اس کی اپنی ذات تھی مگر وہ شہزادے کے جوتے کے قریب نہیں گئی ۔ اس لیے کہ اسے تو ننگے پیر چلنے کی عادت ہو گئی تھی اب اگر اسے اپنا جوتا واپس مل جاتا تو اس کے لئے بیکار تھا قسمت کی بڑی بیٹی حسن نے کہا " وہ جوتا سنڈریلا کا نہیں ہو سکتا میرا ہے " اس لئے وہ دور سے ہی شہزادے کے جوتے کو دیکھ کر آگے بڑھ گئی وجود کی قید سے نکل کر پھر جوتے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی جوتے کی ضرورت تو زمین پر ہی ہوتی ہے ۔ شہزادہ زمین سے بہت اونچا اڑ رہا تھا وہ سنڈریلا کی طرف حیران ہو کر دیکھتا رہا ـــ بار بار دیکھتا رہا مڑ مڑ کر دیکھتا رہا ۔ مگر وہ بہت اونچا تھا ـــ بہت دور قسمت کی بیٹی تہذیب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ـــــ سنڈریلا سر جھکائے چپ چاپ کھڑی رہی اور شہزادہ اڑتا اڑتا دور نکل گیا ـــ ! پھر جب سنڈریلا علم و دانش کے محل کا نظارہ کر کے پُر خطر گھاٹی کو ننگے پیروں پار کر کے واپس آئی تو اسے پھر رہ گذر پر اچانک شہزادے کا جوتا دوبارہ نظر آیا ۔

شہزادہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ــــ!
وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا ــــ مگر سنڈریلا کچھ نہ بولی ــــ! پھر شہزادے نے قسمت کی بیٹی شہرت سے پوچھا کہ "یہ کون ہیں ــــ؟
شہرت بلا کی نک چڑھی تھی بھنویں تان کر بولی:" میں نہیں جانتی کہ تم اسے کیوں جاننا چاہتے ہو یہ تو مٹی اور تنکوں میں اپلے تھاپنے والی ہے"۔
شہزادے کو شہرت کا یہ انداز کچھ اچھا نہ لگا اس نے سنڈریلا کے قریب آکر کہا۔" اچھا اس وقت تو میں جلدی میں ہوں نیکی کا فرشتہ مجھے بلا رہا ہے تم سے تو اطمینان سے ملاقات ہونی چاہیے"۔ ــــ وہ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ نیکی کا فرشتہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لے گیا ــــ شاید وہ اس کا نام پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر سنڈریلا نے سوچا اس کا نام اس قابل کہاں ہے کہ وہ شہزادے کو بتاتی اچھا ہی ہوا جو وہ چپ چاپ کھڑی رہی ــــ!
سنڈریلا اکثر سوچتی کہ شہزادہ مڑ کر رکا۔ آخر کیا پوچھنا چاہتا تھا پھر وہ سوچتی اس نے کہا ہے" تم سے اطمینان سے ملاقات ہونی چاہئیے"۔ تو شاید جب اسے فرصت اور اطمینان حاصل ہو تو وہ خود ہی آجائے ــــ پھر سنڈریلا خوش ہو کر ناچنے لگی اور اپنے رقص کا مطلب اس کی سمجھ میں آگیا۔ ــــ! وجود کے ڈربے میں اس کے لہو سے کھلایا ہوا سرخ پھول اتنا مہک رہا تھا کہ سنڈریلا کو وجود کی قید جنت معلوم ہونے لگی وہ خوشی خوشی پھر رقص کرنے لگی۔ اور جب رقص نے اسے تھکا دیا اور اس نے اپنے تھکے ہوئے قدموں کو دیکھا تو ایک بہت خوبصورت سرخ گلاب ڈربے میں دوسرے گلاب کے پاس مسکرا رہا تھا۔

اس کے اجنبی ہم سفر نے دوسرے پھول کو دیکھا تو اس کے چہرے پہ خوشی کھیل گئی۔ اس نے سنڈریلا سے کہا۔" تم بہت اچھی ہو تم نے اپنے لہو سے ایک اور خوبصورت پھول کھلایا ہے ــــ! تم نے کتنی محنت کی ہے ــــ! اب اس پھول کو پاکر تو سچ مچ میں اپنا جوتا بھول گیا ہوں۔ مجھے لگتا ہے۔ یہی پھول میرا جوتا ہے میری ذات!"
سنڈریلا کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے! اس نے خوش ہو کر سوچا کہ اس کی ذات بڑی ہو کر پھیل گئی ہے۔ یہ دونوں خوبصورت پھول اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ سنڈریلا کو ان پھولوں کی مہک اور مکان نے سب چیزوں سے بے نیاز کر دیا۔ وہ مسکراتی رہی ــــ ناچتی رہی پھول کھلاتی رہی پھر اسے اپنے چمن کے ہی نہیں ہر چمن کے پھول اپنے معلوم ہونے لگے۔
پھر ایک دن سنڈریلا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ زندگی بھر جن خوبصورت میٹھے اور پیار بھرے بول کے لیے ترستی رہی ہے وہ بول تو اس کے اپنے منہ سے جھڑتے ہیں۔ جب وہ بولتی تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے وہ پھول سنڈریلا سب کو بانٹ دیتی جب وہ روتی تو اس کی آنکھوں سے موتی برستے۔ سب نے کہا وہ سچے موتی ہیں۔ اور اپنی اپنی جھولیاں پھیلا دیں۔ سنڈریلا غریب جوگن جو سدا دھول اور مٹی میں ننگے پیر ناچتی رہی تھی حیران اور پریشان ہو گئی۔ پھر سب باتیں اس کی سمجھ میں آنے لگیں۔ اس نے جانا کہ اس کے پیر میں ایک جوتا کیوں تھا۔ اس نے کہ اسے بغیر جوتوں کے ننگے پیر رقص کرنا تھا اگر وہ ننگے پیر رقص نہ کرتی تو منہ سے پھول نہ جھڑتے اور آنکھوں سے موتی نہ برستے۔ یہ راز جان کر سنڈریلا کو خوشی مل گئی۔ اس نے کبھی کسی جوتے کی طرف نہیں دیکھا اور سوچا کہ جوتا سب سے زیادہ بے حقیقت چیز ہے اور جسم کے جوتے کا بوجھ ہی اڑنے سے روکتا ہے۔
سنڈریلا نے ایک دن قسمت کی چہیتی بیٹی عزت کی مسند پر شہزادے کو دیکھا ــ! وہ مسکراتی رہی اور سوچتی رہی کہ شہزادے کو اب یہ بات یاد نہیں رہی ہے کہ اس نے کبھی ننگے پیر ناچنے والی دھول اور تنکوں میں اٹی ہوئی ایک اپلے تھاپنے والی لڑکی سے یہ بات کہی تھی کہ وہ

اس سے کبھی اطمینان سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتا ہے ——! شہزادے نے سنڈریلا کو پہچانا بھی نہیں کیونکہ اس بار بھی وہ بہت دور اور بہت نیچے تھی۔
اس بار سنڈریلا اکیلی بھی نہیں تھی وہ بہت سے لوگوں کے درمیان اپنے اجنبی ہم سفر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ لیکن شہزادہ سب لوگوں کی موجودگی کی پروا کئے بغیر
عزت کی اونچی مسند پہ بیٹھا دور دور سے اسے دیکھتا رہا جیسے وہ اسے پہچاننا چاہتا ہے۔

سنڈریلا کے دل میں شہزادے کے قریب جاکر اس سے بات کرنے کی آرزو ہوتی اس نے اجنبی سے کہا چلو ہم بھی شہزادے کو قریب سے
دیکھ آئیں سب لوگ اس کے پاس جا رہے ہیں مگر اجنبی نے روکھے پن سے کہا "کیا ضرورت ہے"۔ وہ چپ ہوگئی —! اس نے سوچا واقعی کیا ضرورت
ہے۔ وہ عزت کی اونچی مسند پر ہے اور وہ گمنامی کے غار میں رہتی ہے۔ اس لئے کہ وجود کے ڈبے میں سے نکل کر پھر گمنامی کا غار ہی اچھا لگتا ہے۔
علم و حکمت اور عرفان کا خزانہ اس غار میں ہی دفن ہے —! اور ساری عمر کھوج کرنے کے بعد وہ خزانہ ہاتھ آتا ہے ——سنڈریلا کو اس خزانے کی بھی
کھوج نہ تھی۔ اس کے وجود نے جو پھول مہکائے تھے سنڈریلا کو ان کی مہک علم حکمت اور عرفان سے زیادہ عزیز تھی اور ان کو تیز آندھیوں سے بچانے کے
لئے سنڈریلا گمنامی کے غار میں چھپ گئی تھی ——جب وہ چھپ گئی تو اسے بغیر تلاش کے وہ خزانے نظر آگئے ——! اس نے کہا مجھے ان کی کوئی ضرورت
نہیں ہے ——! کیونکہ میں تو ننگے پیر رقص کرنے والی جوگن ہوں جس کا کام سرخ پھول کھلانا ہے ——! جب میرے ہنسنے سے پھول کھلتے ہیں اور رونے
سے موتی برستے ہیں تو پھر میں کسی خزانے کو لے کر کیا کروں گی۔ میں ان خزانوں سے بھی بڑے خزانے کی مالک ہوں ——!

جب وہ گمنامی کے غار میں سے ہنستی ہوئی نکلی تو آسمان اور زمین کی سب وسعتیں اسے رقص کے لئے بلانے لگیں۔

سب ویرانے اپنے اپنے کانٹوں کی زبان سے اسے دعوت دینے لگے۔ چاند، سورج، مریخ، مشتری، عطارد —— کہکشاں کے دمکتے راستے
——! سنڈریلا حیران پریشان سوچتی رہی کہ وہ کہاں جائے اور کہاں نہ جائے —— ایک ننگے پیر چلنے والی جوگن بھلا کسی کو راہ کیونکر دکھا سکتی ہے۔ وہ تو
آج تک یہ راز بھی نہ جان سکی کہ آخر وہ جوتا جو علم و دانش کے محل کے سامنے رہ گزر پر پڑا تھا آج تک وہاں کیوں رکھا ہے ——؟

وہ اسی سوچ میں تھی کہ اس کی نظر اچانک خضر پر پڑی وہ اس کے گہرے سبز لباس کو پہچان گئی، اس لئے کہ خضر سچ ہے وہ ہمیشہ ہرا بھرا
ہی رہتا ہے سب زمانوں میں وہ خزاں سے ناآشنا ہے۔ وہ دیکھتے ہی خضر کو پہچان گئی۔ خضر ہمالہ کی سب سے اونچی چوٹی پہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ راستے میں مشکل
گھاٹیاں تھیں —— سیڑھیاں ہی سیڑھیاں کانٹے ہی کانٹے ——!

سنڈریلا کے لیے خضر تک پہنچنا بہت آسان ہوگیا تھا۔ وہ ذات کی قید سے نکل چکی تھی —— وہ اپنی ہتھیلی پر اپنا سر کاٹ کر رکھ چکی تھی۔
اس لئے وہ مردوں کی طرح تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی ——! اور جب وہ سب سے اونچی چوٹی پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ خضر کو اس کی آہٹ بھی محسوس
نہیں ہوئی ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ اس اونچی چوٹی پہ ایک جوگن بھی اس کے پیچھے کھڑی ہے —— اس نے خضر کو قریب جاکر دیکھا تو اسے یکایک ہنسی
آگئی اس لئے کہ خضر بھی سنڈریلا کی طرح ننگے پیر تھا۔

خضر چونک پڑا۔ اس کے ہنسنے سے جو پھول پہاڑ کی سفید برف پر گرے تھے خضر نے وہ ہاتھ میں اٹھالئے اور حیران ہوکر سوچا کہ برف میں
سرخ پھول اچانک کہاں سے آگئے۔ خضر سرخ پھول ہاتھ میں لئے برف پر ننگے پیر چلنے لگا اس نے سنڈریلا کو نہیں دیکھا۔ سنڈریلا خضر کے پیچھے چپ چاپ
چلتی گئی۔ جو لوگ ننگے پیر چلتے ہیں انھیں ایک دوسرے کی خبر ہی نہیں ہوتی خضر ان سب کی آہٹ تو سن لیتا تھا جن کے پیر میں جوتے تھے اور وہ اپنا عصا
لے کر فوراً ان کی آہٹ سنتے ہی مدد کے لئے جا پہنچتا تھا اور انھیں راستہ دکھا کر پھر ہمالہ کی چوٹی پر بیٹھ کر ستانے لگتا تھا۔ سنڈریلا بغیر آہٹ کے چل رہی تھی

اس لئے خضر کو اس کی خبر ہی نہ ہوئی۔ سنڈریلا نے خضر کو زہر کا پیالہ پیتے دیکھا۔ سولی پر چڑھتے دیکھا مصلوب ہوتے دیکھا۔ پھر اس کا سر بانس پر ٹنگا دیکھا۔ پھر بجلی کی کرسی پر جھٹکا کھا کر مرتے دیکھا۔ پھانسی کے سائے میں بیٹھ کر خط لکھتے دیکھا ——— وہ برف پوش پہاڑی سے اتر کر اس کے پیچھے چلتی چلتی ایک کھیت کھنڈر میں چلی گئی جہاں اس نے چند مٹھی بھر گوریلوں کے ساتھ اسے ایک بڑی فوج کا مقابلہ کرتے دیکھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کی پیٹھ میں گولی لگی تھی اور اس کی ٹانگوں میں اتنے زخم تھے کہ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ پھر جب انہوں نے اسے پکڑ لیا تو وہ چوبیس گھنٹے درد سے تڑپ کر مسکراتا رہا اور جب اس نے دیکھا کہ اس کے قاتل کا ہاتھ کانپ رہا ہے تو اس نے کہا: "ڈرو مت ——— گولی چلاؤ" اور آخری گولی اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ پھر اس نے خضر کے مردہ ہاتھوں کی انگلیاں کٹتے دیکھیں۔ اور اسے راکھ ہوتے دیکھا اور پھر ہوا اسے ہر طرف اڑا لے گئی ——— اور وہ راکھ پھر زمین میں پھیل گئی ——— !!

میرے خضر! خضر راستہ میں دل بہلانے کو کیسے دلچسپ کھیل تماشے دکھاتا جاتا ہے۔ آخر تم کتنی بار زہر پیو گے کتنی بار مصلوب ہو گے ——— کب تک ننگے پیر چلتے رہو گے ——— ؟ سنڈریلا کا دل خضر کی محبت سے بھر گیا وہ کچھ بھی نہ بولی اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی اور سوچتی رہی کہ وہ تو ازل سے ابد تک ہے ——— پھر اسے کیا غم ہے ——— شاید اسے کوئی غم نہیں جب ہی اس نے دوسروں کے غم کو اپنا غم بنا لیا ہے ——— کبھی خشکی پر چلتا ہے کبھی پانی پر اور کبھی ہواؤں میں اڑتا ہے ——— پھر سنڈریلا نے اداس ہو کر سوچا کہ اتنا لمبا سفر اس نے چپ چاپ اس کے پیچھے چل کر طے کیا اور اسے اس کی خبر بھی نہیں وہ اسے جانتا بھی نہیں ہے۔ سنڈریلا نے دیکھا خضر ایک ویرانے میں چپ چاپ کھڑا گہری سوچ میں غرق تھا اور اس نے پھر زہر کا پیالہ ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ اداس نظر آ رہا تھا۔ سنڈریلا اس کی اداسی کی وجہ سمجھ گئی اس نے سوچا کہ خضر یہ سوچ رہا ہے کہ وہ ازل سے ابد تک ننگے پیر کیوں چل رہا ہے ———
تب سنڈریلا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ خضر کو یہ بات بتا دے گی کہ وہ بھی ازل سے اس کے پیچھے ننگے پیر چلتی رہی ہے۔ سنڈریلا کچھ بھی نہ بول سکی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے زمین پر گر پڑے خضر نے تپتے ہوئے صحرا میں حیران اور پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا اور پھر جھک کر اپنے دوسرے ہاتھ میں موتی اٹھا لیے۔ سنڈریلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی سنڈریلا نے دیکھا کہ خضر کے ہاتھ میں اب تک وہ سرخ پھول تھے جو اس کے منہ سے برف پوش پہاڑ کی چوٹی پر گرے تھے ——— ! ایک ہاتھ میں پھول اور ایک ہاتھ میں موتی لے کر خضر اتنا خوش ہوا کہ اس نے اپنا عصا وہیں ڈال دیا اور پھر مڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

سنڈریلا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ خضر تو وہی شہزادہ ہے جو ساری عمر دوسروں کو اپنا جوتا پہنا کر گھاٹی کے پار پہنچاتا رہا۔
سب کو منزل پر پہنچا کر ازل سے ابد تک اکیلا چپ چاپ ننگے پیر چل رہا ہے۔ سنڈریلا کا دل اس کی محبت سے اتنا بھر گیا کہ چھلکنے لگا!

سنڈریلا نے سوچا کہ شہزادے نے اتنا لمبا سفر طے کر لیا وہ محل سے نکل کر گوتم بن گیا۔ خضر بن گیا۔ لیکن جب تک ایک سچائی بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ ہے وہ نروان حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ مکمل سچائی کا علم چاہتا ہے۔ اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ازل سے ابد تک اکیلا ننگے پیر نہیں چل رہا ہے اس کے پیچھے گرد آلود کپڑے پہنے ایک جوگن بھی ننگے پیر چل رہی ہے۔ یہ بات جانے بغیر وہ نروان حاصل نہیں کر سکتا ——— پھر سنڈریلا کا دل گوتم کی محبت سے دھڑکنے لگا وہ رقص کرنے لگی۔

جب وہ ناچ رہی تھی تو اسے معلوم ہوا کہ وہی رادھا ہے وہی سیتا ہے اور جب تک کرشن رقص نہ دیکھے وہ پورا گیان حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ کرشن کے سامنے رقص کرنے لگی اور خضر جو کبھی گوتم تھا اور کبھی کرشن تھا جس کے بہت سے نام اور زمانے تھے اسے رقص کرتا دیکھ کر بانسری بجانے لگا۔ پھر سنڈریلا کو یہ محسوس ہوا کہ سیتا کا بن باس ختم ہو گیا ——— ! اس نے رام کو پا لیا ——— !

جب رقص ختم ہوا تو شہزادے نے بانسری ہونٹوں سے ہٹا کر کہا "مجھے ساری زندگی تمہاری تلاش رہی میرا جوتا تو تمہارے پاس ہے "
سنڈریلا جو رادھا تھی ہنس پڑی اس نے کہا "تمہارا جوتا راہ گذر پر پڑا ہے وہ سب گوپیوں کا ہے اور اپنا جوتا میں نے ایک شخص کو دے دیا جس کا جوتا دریا میں گر گیا تھا اب تو مجھے ننگے پیر رقص کرنے میں مزا آتا ہے جوتا پہننے کو جی بھی نہیں چاہتا اس لئے اب تم وہ جوتا رہ گذر پر ہی رہنے دو اب اُسے وہاں سے اٹھایا تو دوسروں کو تکلیف ہوگی "
خضر مسکرایا اس نے کہا "میں تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ میں نے اسی لئے تو جوتا رہ گذر پر ڈال دیا کہ مجھے جوتے کی کبھی ضرورت نہ ہوئی تھی۔ میں تو ازل سے ننگے پیر ہوں۔ گوتم بھی ننگے پیر تھا اور کرشن بھی ننگے پیر تھا "
سنڈریلا نے مسکرا کر کہا "رادھا بھی ہر دور میں ننگے پیر ناچی ہے اس لئے کہ جوتے تو ان سب کے پاس تھے " اس نے ایک ایک کر کے سب گوپیوں کے نام لئے تو کرشن حیران رہ گیا۔
شہزادے نے پوچھا تمہیں گوپیوں کے نام کیسے معلوم ہوئے ؟
تب سنڈریلا مسکرائی اور بولی وہ سب میری ہی سکھیاں تھیں اس نے تالی بجائی تو وہ سب وہاں آ گئیں اور چور بن کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ سب رادھا سے یہ بات چھپاتی رہی تھیں کہ وہ چوری چھپے شہزادے سے ملا کرتی ہیں۔ مگر رادھا ان سب کا راز جانتی تھی۔ وہ خوش تھی کہ وہ سب اس کی ذات سے چوری چھپے محبت کرتی تھیں پھر وہ سب شرماتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئیں اور رادھا مدھوبن میں اکیلی سر جھکائے کھڑی رہ گئی!
شہزادے نے کہا "اصل چور تم ہو ــــ اتم کیوں چھپی رہیں ــــ کاش تم آ جاتیں ــــ یقین کرو تم سے اچھی کوئی صورت نہ تھی !"
سنڈریلا نے کہا "تم ازل سے بانسری بجا رہے تھے اور میں ازل سے ناچ رہی تھی لیکن اگر ہم ایک دوسرے کے سامنے آتے تو نہ تم بانسری بجاتے اور نہ میں مدھوبن میں اکیلی ناچتی۔ تمہاری بانسری کی آواز میرے ساتھ تھی اور میری ہی پائل کی آواز پر تم آ رہے تھے۔
مگر ہر موڑ پر ہر دور میں تمہیں راہ میں روک لینے والی میری ہی کوئی نہ کوئی سکھی تھی۔ میں جب بھی تمہارے قریب سے گذری میں نے اپنی کسی سکھی کے ساتھ تمہیں راز و نیاز میں مصروف دیکھا، اس لئے میں تم سے کبھی نہیں بولی، کبھی نہیں ملی "
شہزادے کو اب بھی قرار نہ تھا اس نے کہا "میں نے ہر ویرانے میں تمہیں بلانے کو بانسری بجائی تھی مجھے کسی گوپی کا رقص پسند نہ آیا۔ اس لئے کہ وہ سب جسم کے جوتے پہن کر رقص کرتی تھیں میں روح کی تلاش میں تھا میں ننگے پیر مدھوبن میں اکیلی ناچنے والی رادھا کا رقص دیکھنا چاہتا تھا آخر تم کو کون روک رہا تھا ــــ ؟ "
تب سنڈریلا نے شہزادے سے کہا کہ " پہلے تم نے وہ جوتا جو تمہاری ذات تھی محل کی الماری میں بند کر دیا تھا پھر تم نے اسے رہ گذر پر دوسروں کے لئے ڈال دیا جب تم نے اپنی ذات کو چھوڑ دیا تو قسمت نے مجھے چھپا لیا اس لئے کہ میں تمہاری ذات تھی۔ تم مجھے خود بند کر چکے تھے۔ پھینک چکے تھے۔ پھر میں تمہارے سامنے کیسے آتی ؟ اس لئے میری سہیلیاں دربان بن گئیں انہوں نے مجھے نہیں آنے دیا "
تب شہزادے نے سر جھکا لیا۔ اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔
سنڈریلا نے کہا وہ سب شہزادیاں تمہارا جوتا پہن کر اپنی اپنی مراد پا چکی ہیں۔ مگر میری مراد تو تم تھے۔ تمہارا وہ جوتا نہیں یہ تمہارا جسم تھا۔ اور تمہاری مراد میں تھی وہ جوتا نہیں جو میرا جسم تھا ــ اب ہم دونوں اپنے جوتے دور پھینک آئے تب ہی ایک دوسرے کے سامنے آ سکے ہمارا رشتہ

تو بس بانسری اور رقص کا رشتہ ہے ... روح کا رشتہ ہے۔"

خضر کے چہرے پر نورانی مسکراہٹ پھیل گئی ——! گوتم خوشی سے چپ کے نیچے چیخ مار کر کھڑا ہو گیا "مجھے نروان مل گیا"۔ کتی — شانتی ——! شہزادے نے کہا "میں اپنی ذات سے باہر آ گیا ہوں اب سچ بول سکتا ہوں۔ وہ بول جو ازلی اور ابدی صداقت ہیں۔ میں نے تمہیں پا لیا تم حقیقت ہو!"

منصور نے خوشی خوشی پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا۔ سقراط نے زہر کا پیالہ مسکرا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ مسیح کے پہلی کیل ٹھونکی گئی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس لئے کہ وہ سب تھکے ہیر تھے وہ تو پہلے ہی اپنے جسم میں سے نکل چکے تھے وہ ان نادانوں پر مسکرا رہے تھے جو انھیں زہر پلا رہے تھے۔ سولی چڑھا رہے تھے میخیں ٹھونک رہے تھے۔

خضر نے سنڈریلا سے کہا: "میرے ساتھ آؤ میں تمہیں وہ عجائبات دکھاؤں جو تمہاری آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔ ازل سے ابد تک میں تمہیں سیر کراؤں آؤ ہم ماضی میں چلیں ——!"

سنڈریلا نے کہا: "تم ازل سے ابد تک سب آگے ہو اس لیے تم پیچھے مڑ کر دیکھ سکتے ہو چاروں طرف دیکھ سکتے ہو —— مگر میں صرف آگے دیکھ سکتی ہوں۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتی ورنہ میں پتھر کی ہو جاؤں گی۔"

خضر نے محبت سے اس کی طرف دیکھا اور شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا: "جب میں نے جھک کر برف پر سے سرخ پھول اٹھائے تو میں نے تمہیں دیکھا جب تپتے صحرا کی ریت پر سے موتی اٹھائے تو تمہیں پہچانا اور اب مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میری تنہائی ختم ہو گئی ہے۔"

شہزادے نے محبت سے سنڈریلا کی آنکھوں میں دیکھا اور اسے پیار کا امر بول سنایا وہ بول جس کو سننے کے لئے اس نے ساری زندگی ننگے پیر رقص کیا تھا۔ سنڈریلا مسکرانے لگی۔ تب اس کی سوتیلی ماں قسمت نے اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا اور کہا "تیرا نام خوشی ہے اور تو مجھے اپنی سب سگی بیٹیوں سے زیادہ پیاری ہے!!

سنڈریلا خاموشی سے خضر کے پاس سر جھکائے کھڑی تھی اس کی نظروں کے سامنے سے ایک ایک کر کے سارے پردے ہٹتے جا رہے تھے —— وہ حیرت کے سرور میں ڈوب گئی!

سنڈریلا سرور کے عالم میں مسکراتی رہی خضر کتنا سادہ لوح ہے وہ جو دوسروں کو سچی راہ دکھاتا ہے اسے یہ نہیں معلوم کہ اگر وہ اسے نہ دیکھتی تو سچ نہ بول سکتی! اور نہ اس کے منہ سے پھول جھڑتے اور نہ آنکھوں سے موتی برستے ——!! زہر کے جام کی ساری کڑواہٹ اور تلخی بیچارے خضر کے حصہ میں آتی اور اس کا سارا سرور —— اور نشہ سنڈریلا محسوس کرتی رہی —— ! میٹھے بول کا سرور اور نشہ ہی تو جنت کی شراب ہے! بیچارے خضر کو یہ نہیں معلوم وہ چپکے چپکے کوثر کے چشمے سے پیتی رہی ہے پیروں میں جوتے پہن کر تو سب ہی سیڑھیاں چڑھتے ہیں مگر اپنا ہی سر اپنے ہاتھ میں لے کر سیڑھیاں چڑھنا کسی کو نصیب ہوتا ہے اور یہ سب سے مشکل سب سے دلچسپ اور خوبصورت سفر ہے!

تب اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے اجنبی ہم سفر کو یہ بات بتا دے کہ وہ دریا میں جو نا گر جانے کا ساری زندگی غم کرتا رہا مگر وہ تو اپنا جوتا اپنے ہاتھ سے دریا میں ڈال آئی ہے اور اپنا سر ہاتھ میں لے کر ساری سیڑھیاں چڑھ چکی ہے۔ اب میں کہیں نہیں ہوں —— ! اور میں ہر کہیں ہوں!! وہ قطرہ جو میری انتہا تھی اب مجھے دور دور نظر نہیں آتا۔ ہر طرف سمندر ہے!

خضر نے اس کے دل کی بات پڑھ لی اور بولا "بیوقوف تم سمندر میں کہاں ہو۔ سمندر تو خود تمہارے دل میں ہے۔"

سنڈریلا نے مسکرا کر کہا: "مجھے تو وہ جوتا بھی جو تمہاری ذات تھی اب رہگذر پر نہیں سمندر میں ہی نظر آرہا ہے۔
خضر نے کہا: میں ازل سے وہی وہ جوتا سمندر میں خود پھینک آیا تھا اور تب سے ننگے پیر ہوں وہ جوتا وہ جسم تو میں بار بار بدلتا ہوں۔ مگر یہ سبز رنگ کا لباس میرا اصلی لباس ہے۔"

سنڈریلا نے کہا: "میں ازل کے دن وہ جوتا کہیں بھول گئی تھی میں ننگے پیر ہی ناچتی ہوئی زمین پر خلا سے اتری تھی اس طرح کہ میں زمین کے ساتھ ہی قدم ملا کر رقص کر رہی ہوں۔ زمین کی گردش میرا ہی رقص ہے اور میرا رنگ اصلی رنگ مٹی کا رنگ ہے!"

خضر نے کہا: "میں پیاسا ہوں۔"

سنڈریلا نے کہا میں خوشی ہوں —! خوشی جو ہمیشہ ننگے پیر چپ چاپ پچ کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے میں تمہارے ساتھ ازل سے ہوں اور ابد تک رہوں گی۔

خضر نے محبت سے اپنا ہاتھ بڑھایا: "تو میرا ہاتھ تھام لو۔"

سنڈریلا نے کہا: "اگر ہم ساتھ چلے تو پھر ہم نظر نہیں آئیں گے۔ ایک لفظ بن جائے گا۔ میں تمہارے پیچھے چلتی ہوں تو لوگوں کو دو لفظ نظر آتے ہیں۔"

خضر نے کہا: "ہم ساتھ چلتے تو لوگوں کو ایک ہی صورت نظر آئے گی۔ یہی خوشی! آؤ ہم لوگوں کو یہی خوشی کا مطلب سمجھائیں۔ مکتی۔ شانتی۔ نجات۔ نروان۔ فنا فی اللہ —!"

سنڈریلا نے کہا: "میری کیا مجال ہے جو تمہارے قدم سے قدم ملا کر چلوں! یہ خاصہ ادب ہے! میں تو اس جگہ پر آگئی ہوں۔ جہاں جبریل کے پر جلتے تھے۔ دیکھو میری زندگی بھر کی محنت میں نے عرش کی صفائی کی کوشش کی ہے میں دھول میں اٹی ہوئی سنڈریلا ہوں"۔

خضر نے کہا: "عرش تو آئینہ ہے —! تیرا دل ہے!

سنڈریلا نے کہا: "یہ آئینہ کہاں تھا میں ازل سے زنگ کھرچ رہی ہوں۔ جھاڑ دے رہی ہوں۔ ننگے پیر رقص کر رہی ہوں۔ تب یہ آئینہ بنا ہے مگر تو سچ ہے عرش کا مالک ہے!"

خضر مسکرانے لگا: "میں تو ازل سے جوہر جمع کر رہا تھا۔ پھر سب جوہر جمع ہو گئے تو آئینہ بن گیا۔ مگر اس آئینہ میں سب کو اپنی صورت نظر آتی تھی اور کوئی انسان بھی اپنی اصلی صورت نہیں دیکھنا چاہتا اس لئے ان سب نے اپنا چہرہ دیکھ کر آئینہ پر پتھر کھینچ مارا جتنے ٹکڑے ہوئے اتنے ہی ٹکڑے ہو گئے اور جب میں نے ٹکڑے جوڑ کر اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تو شہر الم سے غم کے بادل آگئے آگ اور دھواں — ناگا ساکی اور ہیروشیما —! اور اتنا اندھیرا چھا گیا کہ میرے عصا نے ہی ٹھوکر مار کر آئینہ کو پاش پاش کر دیا —! اور پھر میں اپنی صورت نہ دیکھ سکا۔ جسے تو آئینہ کہہ رہی ہے وہ تو یہ کرچیاں ہیں۔ میرا آئینہ تو تیرے پاس ہے — تو ہے —! جہاں زنگ ہی نہیں — تو نے کتنی محنت سے صفائی کی ہے۔ ذرا سا بھی گرد و غبار نہیں ہے۔ میں اپنا چہرہ صاف دیکھ سکتا ہوں:" خضر نے محبت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کی کمر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا: "اگر تو نہ آتی تو میں کبھی اپنا چہرہ نہ دیکھتا —! خود کو نہ جانتا —!! لیکن اب مجھے یہ ڈر لگ رہا ہے کہ یہ سب کرچیاں — میرے وجود کی کرچیاں تیرے نہ چبھ جائیں۔"

سنڈریلا نے مسکرا کر خضر کی آنکھوں میں دیکھا پھر وہ ادب سے جھک کر کرچیاں چننے لگی تو اسے یہی خوشی مل گئی۔ اسے آئینہ کی ہر کرچی میں

اپنا ہی چہرہ نظر آیا۔ وہ کرچیاں چنتی ہوئی ننگے پیر چپ چاپ خضر کے پیچھے ہولی۔ وحشت کے ہر کانٹے نے اپنی ننگی زبان پر آئینہ کی ایک کرچ رکھ لی جس میں سنگھمترا نے اپنا چہرہ دیکھا۔ خوشی ——— شانتی ——— نروان ——— فنا فی اللہ ———! وہ سب چیزوں کا مطلب سمجھ گئی! آگہی کا باب کھلا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ سب پہلیاں بھی اس کا اپنا وجود تھیں۔ اس نے خضر کی طرف محبت سے دیکھا اور سوچا کہ اگر اس آئینہ کی اتنی بہت سی کرچیاں نہ ہوتیں تو اس کے وجود کے اتنے ذرّے نہ ہوتے جتنے صحرا میں کانٹے ہیں۔

---

# باہر کے بھیتر

## جوگندر پال

بات صرف اتنی سی ہے کہ اُسے اِدھر سے اُدھر جانا ہے۔

یہ سڑک کوئی سو فٹ چوڑی ہے اور وہ اِس پٹڑی پر کھڑا ہے اور بے چینی سے دم ہلا ہلا کر اُس طرف دیکھ رہا ہے اور بیچ میں بیسیوں گاڑیاں موت کے مانند آناً فاناً آجا رہی ہیں۔ بس چند قدم کی بات ہے۔ اگر وہ آنکھیں بند کرکے سڑک پر اُتر جائے تو ــــ تو جنھیں اُس جانب جانا ہے وہ بھی، اور جنھیں اِس جانب، وہ بھی ذرا سے رک جائیں گے تاکہ وہ بدستور آنکھیں بند کیے چپ چاپ یونہی بیچ گزر کر وہاں جا پہنچے ــــ؟ چپ چاپ؟ ــــ یعنی کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ وہ اِدھر سے اُدھر جا پہنچا ہے ــ؟ ایسا کیسے؟ زندگی کی ٹریفک کا یہ چلتا پھرتا وطیرہ ایک لمحہ اُدھر کر دو بھر جائے (اپنی ایک ہی قوت کو دونوں مخالف سمتوں کی طرف کھینچتا ہوا دومنہی اژدہا!) تو قیامت سی آجائے۔ وہ بے چارہ کتے کی ذات ہے، کوئی اوتار تو نہیں کہ اِس قیامت میں بھی چپ چاپ یہاں سے وہاں جا پہنچے۔

کتے کا بچہ وہیں کا وہیں کھڑا ہے اور اُسے لگ رہا ہے کہ وہ واقعی سڑک پر اتر گیا تھا اور اپنا آپ وہیں چھوڑ چھاڑ کر اب سرپٹ پیچھے بھاگ آیا ہے اور جہاں وہ کھڑا ہے وہاں اُکھڑا ہوا ہے اور ہانپ رہا ہے پر اُسے اپنے ہانپنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اُسے بڑی شدت سے بھونکنے کی خواہش ہوئی ہے لیکن اُسے بھول ہی گیا ہے کہ بھونکا کیسے جاتا ہے، یا شاید وہ بھونک ہی رہا ہے اور اِس لیے نہیں بھونک رہا ہے کہ اُس کا وجود تو سڑک پر ہی رہ گیا ہے۔

کتے نے محسوس کیا ہے کہ اگر اُس نے اپنا آپ بخوبی دیکھ کر اپنی تسلی نہ کرلی تو وہ اپنے وہم سے بے وزن ہو کر زمین سے اوپر اٹھنا شروع ہو جائے گا ــــ وہ اپنی چاروں ٹانگوں پر دوڑ کر یہاں پٹڑی کے اِس کونے میں چلا آیا ہے جہاں سے ابھی ابھی کوئی اپنا رکا ہوا پیشاب کرکے اٹھا ہے۔ گیلی گیلی مٹی میں اپنی شکل دیکھ کر کتے کا اطمینان ہو گیا ہے اور اپنے رہ جانے کے احساس سے خوش ہو کر وہ بھونکنے لگا ہے اور ابھی بھونک ہی رہا ہے کہ سامنے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک بھیک منگے نے پورے زور سے اُس پر راہ کا ایک پتھر ٹیک دیا ہے جس سے اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے لیکن اُس کی دوڑ جانے کی فوری خواہش سے ٹوٹ کر جڑ گئی ہے اور پٹڑی کی سیدھ پر لگاتار دوڑ دوڑ کر اُسے یاد ہی نہیں رہا ہے کہ اُسے اِدھر ہی دوڑتے چلے جانے کی بجائے وہاں جانا ہے، اِدھر سے اُدھر!

یہ سڑک چوبیس گھنٹے چلتی رہتی ہے۔ سیمنٹ اور پتھر کی ہے نا، گوشت پوست کی ہوتی تو چوبیس گھنٹے میں دو چار گھنٹے تو آنکھیں میٹ لیتی، نامعلوم کہاں سے کہاں تک ہے، لیکن چونکہ ساری کی ساری ہر دم بیک جنبش چلتی رہتی ہے اِس لیے سدا اپنے ساتھ رہتی ہے، جوں کی توں، کبھی کوئی مقام آگے پیچھے نہیں ہوتا ہے ــــ یہ سڑک وہیں کی وہیں رہتی ہے اور اِس پر ہر لحظہ لاتعداد پہیے تیز تیز گھومتے رہتے ہیں۔

ارے بھئی، ٹھہرو! سب کے سب کہاں جا رہے ہو؟

پتہ نہیں، کہاں؟

مجھے بھی پتہ نہیں!

مجھے بھی —!

مجھے —!

لیکن مجھے پتہ ہے، آؤ میرے ساتھ! — آؤ!

کہاں؟ — کہاں جا رہے ہو؟

پتہ نہیں، کہاں؟ — ہم کھوئے ہوئے ہیں۔ اگر تم واقعی ہماری مدد کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ، کیا ہم ہیں کہیں تمہارے دیکھنے میں آئے ہیں؟ یا ہمارے بارے میں تم نے کسی سے کچھ سنا ہے؟ — یا ہماری کوئی نشاندہی کر سکتے ہو؟ — جلدی بتاؤ! — نہیں! — تو راستہ چھوڑ دو، چھوڑ دو راستہ، ورنہ ہمارے نیچے آ جاؤ گے — شاید — ارے ہاں! کہیں ایسا تو نہیں ہو گیا کہ ہم کبھی اپنا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے ہوں اور — اور اپنے آپ کو روندکر گزر گئے ہوں — ایسا ہی ہوا ہوگا، یقیناً ایسا ہی، — تو پھر — تو پھر ہماری ہی ہڈیاں یہاں کُٹ کُٹ کر پکی ہو گئی ہیں، انہی سے یہ پکی سڑک بنی ہے — لیکن شاید — شاید ایسا نہ ہوا ہو، شاید ہم ابھی تک بہ سلامت ہوں — اگر ہم ابھی تک بہ سلامت ہیں تو اسی سڑک پر کہیں ہوں گے — آؤ! —

سڑک کی اس پٹڑی پر بھاگتے ہوئے کتے کو خیال آیا ہے کہ اُس قصاب کی دوکان تو پیچھے رہ گئی ہے۔ نامعلوم کچے کچے گوشت کی خوشبو واقعی یہاں تک آ رہی ہے، یا کتے کے ذہن میں پیدا ہو ہو کر اُس کے نتھنوں میں آ پہنچی ہے اور وہ قصاب کی دوکان کی طرف پلٹنے کی سوچ رہا ہے اور اسی اثنا میں اپنے آگے چند قدم پرا سے ایک پلی ہوئی کتیا دکھائی دی ہے اور — اور عجیب بات ہے: وہ اپنی اگلی دو ٹانگوں سے اُس کتیا کی جانب جا رہا ہے اور پچھلی دو ٹانگوں سے قصاب کی دوکان کی جانب! — یا خدا! وہ وہی ایک کتا ہے یا دو انسان!!

اور پھر اسی پٹڑی پر یہاں:

آئیے! کیا لیں گے! بکرے کی زبان، مرغ کی ٹانگ، بھیڑ کے پستان —؟

میرے پاس پیسے نہیں ہیں!

چل ہٹ! — ہٹ! قصاب نے اپنی لمبی چھری کی تیز دھار کو اتنی بے پروائی سے کتے کی گردن کی طرف گھمایا ہے کہ وہ سرعت سے وہاں سے ہٹ نہ جاتا تو تھوڑی دیر میں اُس کا تازہ تازہ گوشت بھی قصاب کی میٹ سیف میں سجا کر رکھ دیا جاتا —

کتے نے جی ہی جی میں قصاب کی میٹ سیف میں منہ ڈال دیا ہے اور بڑے مزے سے اپنا ہی گوشت کھانے لگا ہے اور کھاتے کھاتے فوراً لذت سے اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہے اور — اور قصاب نے اُس کی پیٹھ پر ایک نوکدار ہڈی دے ماری ہے جسے اپنے منہ میں لئے چیختے ہوئے — کچھ اس طرح چیختے ہوئے کہ منہ سے ہڈی نہ گرے — وہ وہاں سے دوڑ پڑا ہے —

اور پھر یہاں:

مارو! خوب مارو! — اور مارو! اِس کے بال منڈوا کر، منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھاؤ!

کتے کی ذات!

وہ ہنس پڑا ہے کہ کتے کو گدھے کی پیٹھ پر بٹھایا جائے گا۔

بے شرم ہنس رہا ہے! مارو —— اور مارو! ——!

بات کیا ہے!

بات کیا ہونی ہے صاحب!

میں ذرا اُس دوکان میں گیا ہوا تھا اور میری بیوی یہاں کھڑی تھی —— کیوں ڈارلنگ، یہیں کھڑی تھیں نا!

ہاں، میں یہاں کھڑی اِن کی راہ تک رہی تھی کہ اِس کتے نے پیچھے سے آکر میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

کتے کے ہاتھ! ؟ مادام کو کتے کی اگلی ٹانگوں پر ہاتھوں کا گمان ہوا ہو گا۔

مارو! —— خوب مارو!

اور خوب مار کھا کر کتا اب یہاں آ پہنچا ہے اور اتنی مار کے باوجود اپنی چاروں ٹانگوں پہ ثابت و سلامت موجود ہے اور ایک اپاہج فقیر کو دیکھ دیکھ کے اُس پر ترس کھا رہا ہے کہ بے چارے کے ایک بھی ٹانگ نہیں۔

فقیر کتے کو اپنی طرف اتنے دھیان سے دیکھتے ہوئے پا کر بہت خوش نظر آنے لگا ہے۔

جو دو پیسے دیتا ہے بابا، وہ بھی نجر بھر کے میری ترپہ نہیں دیکھتا، اور جو دو گالیاں دیتا ہے، وہ بھی دیکھے بگیر اُوپر اُوپر سے بول کر چلا جاتا ہے —— اور تو اور، میں کھدا آپ بھی اپنے آپ کو اِس کابل نہیں سمجھتا کہ جرا اپنے آپ کو دیکھ کر کھش ہو لوں —— پھکیر کو کھش کرتی جاؤ میم ساب، داتا تمھیں کھش کرے گا —— بہت تیری! —— کئی! حمام جادی کو اپنے سوا کوئی اور نجر ہی نہیں آتا —— میرے پاس پیسہ ہوتا تو دس ہجار کے نوٹ منہ پہ مار کر کہہ دیتا کہ میرے گلیج چہرے کو سب کے سامنے بڑی موبت سے چوم لو —— دس ہجار کا بھی نہیں، تو یہ لو، اور لو! میری ترپہ دیکھو، مسکراؤ! ——

کتا مسکرا رہا ہے اور فقیر نے اُس سے کہا ہے، اِدھر آؤ، آؤ! آکر اِدھر میری گود میں بیٹھ جاؤ ——

کتا فقیر کے پاس آ بیٹھا ہے اور اُس کی دُم فقیر کی بے ٹانگ گود میں ہل رہی ہے۔

لو، کھاؤ! فقیر نے اپنی جھولی اُس کے منہ کے سامنے کھول دی ہے، اور کتے کے ساتھ خود آپ بھی کھانے لگا ہے۔ مزا آ رہا ہے نا؟

کتے نے اپنے منہ سے اُس کا ہاتھ پرے ہٹا دیا ہے۔ پہلے کھا تو لینے دو!

فقیر کی جھولی جھٹ ہی خالی ہو گئی ہے لیکن وہ دونوں اپنے خالی منہ بدستور ہلائے جا رہے ہیں، پھر نہ جانے فقیر کو پہلے خیال آیا ہے یا کتے کو، اور ایک نے اپنا منہ ہلانا بند کر کے دوسرے کی طرف دیکھا ہے اور دوسرے نے بھی منہ ہلانا بند کر دیا ہے۔

جاؤ حرام کھور، اب کیا میری ہڈیوں کو بھی کھانا ہے؟ —— فقیر نے اپنی گود میں کتے کی ہلتی ہوئی دم کو ذرا سا کھینچا ہے اور کتا چیخ کر وہاں سے دوڑا ہے اور ذرا دور جا کر فقیر کی طرف پلٹ کر رک گیا ہے —— یہ کوئی شرافت ہے ؟

چل ہٹ، شریر کی اولاد! —— فقیر نے اُس کی طرف کنکر پھینکا ہے جسے وہ روٹی کا بچا کھچا لقمہ سمجھ کر اُس کی طرف لپکا ہے اور اُسے

سونگھ کر فقیر کی طرف سر اُٹھا کے بھونکنے لگا ہے۔ تمہاری ماں کی بہن کی ـــــ!

چل ہٹ! فقیر کو بھی غصہ آگیا ہے اور اُس نے پے در پے دو چار کنکر اُس کی طرف پھینکے ہیں جن کی پروا کئے بغیر وہ آگے ہو لیا ہے اور پیڈسٹری اَن کراس پر لوگوں کے ہجوم کے پاس آ کھڑا ہوا ہے۔

زندگی سڑک کی دونوں مخالف سمتوں کی جانب بے تحاشہ لڑھک رہی ہے۔

آپ کہاں جا رہے ہیں؟

جہاں سے آپ آتے ہیں! ـــــ اور آپ؟

جہاں سے آپ آتے ہیں!

مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں۔

تعجب ہے، جہاں سے میں آیا ہوں، وہاں بھی کچھ نہیں!

کچھ تو ہوگا؟

نہیں، کچھ بھی نہیں! کچھ ہوتا تو مجھے پتہ نہ چل جاتا۔

پیڈسٹری اَن کراس پر انتظار کرتے ہوئے لوگوں کے چہروں سے لگ رہا ہے کہ اُن کی روحیں سڑک کے اوپر سے پرواز کر کے اُس پار جا بھی پہنچی ہیں اور وہاں سے ہاتھ ہلا ہلا کر اُنھیں بلا رہی ہیں۔

یہ کیونکر ممکن ہے کہ جہاں سے آپ آتے ہیں، وہاں کچھ بھی نہ ہو؟

آپ کہہ رہے ہیں تو شاید کچھ ہو۔ مجھے پتہ نہ چلا ہو۔

ہاں، شاید مجھے بھی پتہ نہ چلا ہو۔

کراس پر کھڑے کھڑے کتا اچانک بھونکنے لگا ہے اور بھونکنے سے اُسے کوئی منع نہیں کر رہا ہے۔ شاید اُسے معلوم ہو گیا ہے کہ انتظار کر کر کے وہاں سڑک پار کرنے والوں کے صرف جسم ہی جسم رہ گئے ہیں اور اُسے ڈر محسوس ہونے لگا ہے کہ وہ سارے جسم کسی وقت بھی اُس پر گر پڑیں گے ـــــ اور وہ جھٹ کراس سے پرے ہٹ کر اُن کی جانب سر اٹھائے بے اختیار بھونکتا چلا جا رہا ہے۔

ایکا ایکی روڈ ٹریفک کی سرخ بتی جل پڑی ہے اور سڑک کی مخالف سمتوں میں کراس کے دونوں جانب گاڑیاں ایک دم رک گئی ہیں اور کراس کے اِس کونے میں کھڑے یہ لوگ زندگی کے جنازے کو کندھوں پر اُٹھائے سڑک میں کراس کے نشانات پر اتر آئے ہیں۔ اور اِن لاشوں کو اِدھر سے اُدھر جاتے دیکھ دیکھ کر کتے نے اور زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا ہے اور پیہم بھونکتا جا رہا ہے مگر کسی لاش نے مڑ کر اُس کی طرف دھیان نہیں دیا ہے جس سے کتے کا خوف اور غصہ بڑھ گئے ہیں اور وہ بھی اُن کے پیچھے پیچھے سڑک کو پار کرنے لگا ہے اور اس سے پہلے کہ اُسے احساس ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے، وہ یہاں آ پہنچا ہے، سڑک کے اِس پار!

لیکن یہ کیا! سڑک کا یہ پار بھی ویسا ہی ہے جیسا وہ پار تھا۔ یہاں پہنچ کر کتے کو لگ رہا ہے کہ وہ اپنے پیچھے وہیں رہ گیا ہے

اسے بھی آنا تھا لیکن ابھی وہ یہاں آیا ہی نہیں ۔ وہ دم ہلاتے ہوئے اس قصاب کی دوکان کے پاس جا کھڑا ہوا ہے اور قصاب نے اُس کے منہ پر بڑی بے رحمی سے ایک بڑی سی ہڈی دے ماری ہے اور وہ پرے اچھل جانے کی بجائے ہڈی کی جانب اچھلا ہے اور پھر بے اختیار چلاتا ہوا اُسی طرف بھاگ نکلا ہے جدھر اس کا منہ تھا، اور اُس کے جسم کے اندر اُس کے منہ کی چوٹ کا درد اُس سے بھی تیز تیز دوڑ رہا ہے اور دوڑتے دوڑتے ایک نوجوان خوش پوش جوڑے کی پشت پا اُس کی رفتار سست پڑ گئی ہے اور وہ اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ہے گویا اُس نے یکبارگی یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ اُسے ہمیشہ انہی کے ساتھ چلتے جانا ہے ——— کہاں؟ ——— کہیں بھی! ——— یا کہیں بھی نہیں! اُس کے حیوانی نتھنے اپنی پیش رو انسانی محبت کی بُو سے بھرنے لگے ہیں اور وہ اپنے منہ کی چوٹ کو بھول گیا ہے اور چلتے چلتے فرطِ شوق سے اُس کی پچھلی ٹانگیں اگلی ٹانگوں سے آگے آ گئی ہیں اور اگلی ٹانگیں پیچھے رہ گئی ہیں ——— مرد اور عورت اس طرح جُڑ جُڑ کر چل رہے ہیں جیسے ایک دوسرے میں سما جانا چاہتے ہوں کتے کا جی چاہ رہا ہے کہ وہ اُن سے آگے جا کر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر اس سے یا اُس کے وجود پر چڑھ جائے۔ اُن کی آپسی محبت سونگھ کر اُس کی بے چینی بڑھ رہی ہے اور وہ آنکھیں میچے، نتھنے پھیلائے اپنی چاروں ٹانگوں سے بھی آگے آگے چلنے لگا ہے ——— اُس کی خواہش ہے کہ وہ دونوں پریمی اُسے بھی آپسی چاہ میں شامل کریں۔ لوگ باگ انھیں دیکھ دیکھ کر کہیں، وہ دو نہیں، تین ہیں، دو انسان اور ایک کتا، یا کوئی کتا نہیں، کوئی انسان نہیں، تینوں ایک ہیں۔ وہ بہت خوش ہے، حالانکہ اُس کے منہ پر چوٹ آئی ہوئی ہے اور اُسے بھوک محسوس ہو رہی ہے، اور اُسے ڈر ہے کہ کوئی راہگیر یونہی اُسے ٹھوکر مار دے گا ——— مجھے دھتکارو نہیں لوگو! مجھ سے محبت کرو، یا کم سے کم نفرت نہ کرو۔ تمہاری محبت بھی اور اپنی بھی ——— ساری کی ساری محبت میں ہی کر لوں گا۔ سب کچھ میں ہی کر لوں گا، تم کچھ بھی نہ کرو، تم سے اپنا رشتہ جوڑنے کا سارا کام میں ہی کروں گا ——— وہ اُس جوڑے سے اپنا رشتہ جوڑ کر بہت خوش ہے اور بار بار اِدھر اُدھر دیکھتا جا رہا ہے کہ سب اُس کی خوشی کو دیکھ لیں، دیکھ دیکھ کر اس کی خوشی میں شریک ہو جائیں ——— کتا بے حد خوش ہے کہ ساری دنیا اُس کی خوشی بانٹ رہی ہے۔ اُسے ساری دنیا پر پیار آ رہا ہے ——— اُس بدمزاج پہلوان پر بھی۔ وہ پہلوان کی دودھ لسی کی دوکان کے سامنے ذرا ٹھہر گیا ہے۔ پہلوان اپنی گدی پر بیٹھا لسی پی رہا ہے اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے اور لگتا ہے کہ اُس کے منہ میں دو کتے ایک دوسرے کی طرف چہرے موڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور اُن کی تنی تنی دُمیں پہلوان کے اوپری ہونٹ سے برآمد ہو رہی ہیں۔ کتے کو دیکھ کر پہلوان کے منہ میں دونوں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ پہلوان کے منہ سے کود کر اُس پر جھپٹ پڑیں، وہ اُن دو خوش پوش پریمیوں کا خیال کر کے پٹڑی پر دوڑنے لگا ہے، بے سدھ ہو کر دوڑتا چلا جا رہا ہے لیکن وہ دونوں کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں، نہ معلوم کہاں کھو گئے ہیں۔ شاید سڑک کے اُس پار چلے گئے ہیں۔

کتا سڑک کے قریب فٹ پاتھ کے سرے پر رک گیا ہے اور اُس پار دیکھنے لگا ہے اور اُسے یاد نہیں رہا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے وہ اُدھر سے ہی اِدھر آیا ہے اور وہ سوچ رہا ہے کہ اُسے اُس پار جانا ہے، اور یہ کہ اُسے کئی سال سے، شروع سے ہی اُس پار جانے کا انتظار ہے لیکن اُس کا وہاں جانا نہیں ہو رہا ہے، وہ ازل سے وہیں کھڑا اِدھر سے اُدھر دیکھے جا رہا ہے اور درمیان میں یہ زندگی حائل ہے جو اِس لمبی سڑک پر بیک وقت مخالف سمتوں پر دوڑ رہی ہے، وہ بیچ سے گزر کر اُدھر جائے تو کیونکر؟ ———

کتے نے سڑک سے منہ موڑ لیا ہے اور اُسے اپنے سامنے کپڑے کی ایک دوکان سے نکلتا ہوا وہی جوڑا نظر آیا ہے اور وہ خوشی سے کانپ کانپ کر اُن کی جانب لپکا ہے اور پیچھے سے عورت کی ساڑھی کو اپنے دانتوں میں لے کر کھینچ لیا ہے اور عورت چیخ پڑی ہے اور کئی لوگ اُن کی جانب دوڑے ہیں

— پتھر، لاٹھی، لات، پتھر — وہ عورت اپنے شوہر کو بتا رہی ہے، یہ کوئی پاگل کتا ہے ڈارلنگ، اگر کاٹ لیتا تو — تو — جانتے ہو، کیا؟
— پچھلے ہفتے خواب میں مجھے اس کتے نے کاٹ لیا تھا اور میں مر گئی تھی اور — اور —

اُس عورت کا شوہر لوگوں سے کہہ رہا ہے، مارو! — جان سے مار دو! پاگل ہے، کسی کو کاٹ لے گا تو —

عورت اُسے بتا رہی ہے، اور جانتے ہو، ڈارلنگ، کیا؟ پچھلے ہفتے سے ہر روز میں جہاں بھی جاتی مجھے یہی معلوم ہوتا کہ یہ کتا میرا پیچھا کر رہا ہے پر مڑ کر دیکھتی تو کہیں بھی نظر نہ آتا — ساڑی کی بجائے اگر میرا ٹخنہ اس کے دانتوں میں آجاتا تو — تو — اور — اور ڈارلنگ، ذرا سوچو، میری ساڑی اس بھرے بازار میں کھل جاتی تو — تو —

مارو! — حرامی! کتے کی ذات! —

کتا ڈھیر ہو جانے کو ہے لیکن ڈھیر ہونے سے پہلے اُس نے انسانی سمجھ بوجھ سے کام لے کر اپنے بچاؤ کی تدبیر کرنے کی سوچی ہے اور اپنی ساری قوت کو مجتمع کر کے گولی کے مانند پڑوس کے عقب میں نکل گیا ہے اور خالی الذہن ہو کر حیوانی تندی سے بھاگ رہا ہے۔ چند لوگوں نے اُس کا تعاقب کیا ہے لیکن تھوڑی دور جا کر لوٹ آئے ہیں۔ کتا بدستور دوڑتا جا رہا ہے اور دوڑتے دوڑتے یہاں درختوں کے اس جھنڈ کے نیچے گوبر کے اس ڈھیر کے پاس آ پہنچا ہے اور تعفن کی بو سونگھ سونگھ کر جھوم سا گیا ہے اور ٹھہر کر اپنے پیچھے دیکھا ہے اور اپنا اطمینان کر کے پورے انہماک سے غلاظت کے ڈھیر پہ سر جھکا لیا ہے۔

کتے کا پنجہ غلاظت کے ڈھیر میں لگاتار چل رہا ہے اور اُس کی ناک پھول پھول کر اُسے یقین دلا رہی ہے کہ اس ڈھیر میں کام و دہن کی ساری لذتیں میسر آجائیں گی اور اُس کے منہ میں دریاؤں پانی بھر آیا ہے — اور اپنے منہ ہی منہ میں تیرتے ہوئے وہ اپنے سارے دکھ درد بھول گیا ہے۔
کرچ۔ کرچ۔ ٹرچ۔ پچ۔ ! کتے کا پنجہ گویا گندگی کے ڈھیر کی بجائے اپنے ذہن میں اپنا پنجہ چلا رہا ہو۔ انسان کی ذات اپنی گندگی کو ہمیشہ ڈھیلے کپڑوں تلے کیوں کھسا چاہتی ہے! اپنی گندگی بے خبر ہے! — کتا ہنسنے لگا ہے — یا بھونکنے لگا ہے — کرچ۔ ٹرچ۔ پچ! — یہ لوگ بار بار نہاتے ہیں اور اپنی کھال کو صاف کر کر کے چھیل چھیل کے اپنی پہچان کی ساری علامتوں کو کھو دیتے ہیں — کتے نے ایک چیتھڑے کو پاؤں تلے دبا کر دانتوں سے پھاڑ دیا ہے: کپڑے کے اندر سے کچھ بھی نہیں نکلا ہے — کتا پھر ہنسنے لگا ہے، یا بھونکنے لگا ہے — انسان کے لباس کو پھاڑ دیا جائے تو اندر سے برآمد ہوتا ہے — خالی پن! — اُس کا ہنسنا (بھونکنا) تھمنے میں نہیں آ رہا ہے — آج سویرے اُس نے ایک آدمی کو کاٹ لینا چاہا تھا لیکن اُس کے اوپری اور نچلے دانت اُس شخص کی پتلون سے گزر کر آپس میں ہی جا ٹکرائے اور وہ بے چارہ تعجب سے اُس شخص کی طرف دیکھتا رہ گیا کہ آخر اُس کی ٹانگ کہاں ہے؟ اپنے لباس کے اندر وہ آپ کہاں ہے؟ — اپنے ذہن میں؟ — لیکن اُس کا ذہن کہاں ہے؟ — اُس کی پہچان کا تو ایک ہی ذریعہ ہے، اُس کے کپڑے، جنہیں کاٹنا چاہیں تو دانت آپس میں ہی ٹکرا کر ڈھیلے ہو ہو جائیں — کتا پھر ہنس دیا ہے (بھونک دیا ہے) - اصل میں یہ ساری باتیں اُس کی اِس سوچ سے چل نکلی تھیں کہ اگر وہ کنوئیں والی خوبصورت کتیا انسان کی ذات کے مانند کپڑے پہن کر اُس سے عشق کیا کرے تو — تو — نہیں! — وہ اتنی بے وقوف تھوڑا ہی ہے، اور اگر ہے بھی تو وہ اُس کے کپڑے پھاڑ کر پرے پھینک دے گا اور انسان کے مانند کپڑوں کے اندر اُس کے وجود کا سراغ بھی نہ ملے گا تو وہ خالی خولی ہوا میں اپنے دانت اُس وقت تک کھبوتا رہے گا جب تک وہ زخموں سے لہولہان نہ ہو جائے اور لہولہان ہو کر اپنے جسم میں نظر نہ آنے لگے — یہ تو بات ہوئی نا! — خیال ہی خیال میں کتا بڑی محبت سے اپنی محبوبہ کی کھال کے زخموں

کو چاٹنے لگا ہے اور چاٹتے چاٹتے اُسے کتیا کے خون کا ذائقہ اتنا اچھا لگنے لگا ہے کہ اُس نے فرطِ محبت سے پھر اپنے دانت اُس کے زخموں میں گاڑ لیے ہیں۔

دراصل ہوا یہ ہے کہ گندگی کے ڈھیر کو کُرچ کُرچ کریدتے ہوئے اُس نے ایک ننھے انسانی بازو کو کاٹ لیا ہے جو ڈھیر میں اِس طرح پڑا ہے جیسے دیگر غلیظ اشیائے —— اور ڈھیر کے عقب سے ایک انسان چیخ کر اٹھا ہے اور —— کتا بھاگ نکلا ہے، اُسی طرف، جدھر سے آیا تھا، اور اُس کے پیچھے پیچھے وہ آدمی چیخ چیخ کر دوڑ رہا ہے —— پکڑو! —— مارو! —— کتے کے پیچھے کئی اور لوگ ہو لئے ہیں —— پاگل ہے! —— پاگل کتا! —— جان سے مار دو! —— جانے نہ پائے! ——

کتے کے تعاقب میں ہجوم بڑھتا جا رہا ہے اور کتا اپنی موت سے بچنے کے لئے اپنی موت کی جانب دوڑ رہا ہے۔ اُس کی رفتار اور تیز ہو گئی ہے —— اور تیز! —— اور وہ اب اُسی سڑک کے کنارے اُسی فٹ پاتھ پر آ پہنچا ہے جہاں سے جان بچا کر نکلا تھا —— اور اُس فٹ پاتھ پر کوئی چلّایا ہے، وہی ہے وہ! —— وہ! —— پاگل کتا! —— مارو!

کتے نے بے بس ہو کر اپنے پیچھے دیکھا ہے جہاں کئی لوگ اُسے مارنے کو آ رہے ہیں، پھر بوکھلائی ہوئی بے بسی سے اُس نے دائیں بائیں دیکھا ہے جہاں ٹھٹ کے ٹھٹ اُس پر ٹوٹ پڑنے کو حرکت میں آ چکے ہیں، اور —— اور کتے نے خالی الذہن ہو کر دمادم جیتی ہوئی زندگی کی سڑک میں اتنی سرعت سے چھلانگ لگا دی ہے گویا چھلانگ نہ لگائی ہو، وہیں کھڑے کھڑے ہوا میں غائب ہو گیا ہو! —— آمنے سامنے سے آتی ہوئی زندگی کی اَن گنت گاڑیاں گزر گئی ہیں، گزر رہی ہیں، اور کتے کا وجود کہیں بھی نظر نہیں آ رہا ہے! —— نامعلوم وہ کہاں ہے، اِس پار، اُس پار، یا کہاں؟

---

# لینڈ سلائیڈ

## رضیہ فصیح احمد

لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میں پاگل ہوں جو لینڈ سلائڈ کی فکر سے بے نیاز گاڑی سے اتر کر اخروٹ کی چھاؤں تلے بیٹھا کچے اخروٹ کا کچا چھلکا چبا رہا ہوں۔ اخروٹ کی چھاؤں خوشگوار ہے، دریا کا قرب بھی۔ دریا کے عین دوسری طرف پہاڑی پر چھوٹا سا ایک گاؤں ہے جس کے کچھ مکانوں میں سے ٹین کے کنستر کی چادروں کا بنا ہوا مسجد کا مینارہ الگ نظر آ رہا ہے۔ ٹین کے یہ مینار میرے لئے بالکل نئی چیز ہیں۔ کالام جاتے ہوئے میں نے جگہ جگہ مینار دھوپ میں چمکتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس وقت دھوپ نہیں ہے شاید اسی لئے سامنے کا یہ منظر کسی تصویر کی طرح دلکش ہے۔ اجلا پانی جس کا رنگ ہلکا فیروزی ہے۔ سبزے کے بہت سے شیڈ۔ گھاس سے لے کر اخروٹ کے درختوں، اخروٹ کے درختوں سے لیکر چیڑ کے پیڑوں اور چیڑ کے پیڑوں سے لیکر پتھروں پر جمی ہوئی سبز کائی تک ہر شیڈ خوبصورت ہے۔

ابھی جب میں چلا آ رہا تھا تو کوئی بیس گز پیچھے ایک تھانے کے نزدیک دس پندرہ آدمی اور بچے کچھ غیر معمولی انداز میں جمع تھے۔ مجھے کچھ شک ہوا کہیں آگے لینڈ سلائڈ نہ ہو۔ رات جب میری آنکھ کھلی ہے تو آسمان کے پرنالوں سے بے تحاشا پانی گرنے کی جل جل آواز آ رہی تھی۔ عجب بے روک ٹوک بارش تھی کہ بس برسے ہی جا رہی تھی۔ کالام چھوڑنے کی مجھے کچھ ایسی جلدی نہیں تھی مگر مجبوراً چھوڑنا پڑا کیونکہ ریسٹ ہاؤس میں میرا ریزرویشن ختم ہو چکا تھا اور وہاں کے واحد ہوٹل فلک سیر میں میں رہنا نہیں چاہتا تھا، میں ہر ایسی جگہ سے بچتا تھا جہاں غیر ملکی ہوں۔ میں نے تھانے کے نزدیک جمع ان مقامی باشندوں سے واٹنی اردو میں پوچھا۔

"آگے سڑک کیسا ہے، کوئی لینڈ سلائڈ تو نہیں بابا"

"نئیں سڑک صاف ہے۔ جاؤ جاؤ چلاؤ چلاؤ۔ . . . ." سب نے یک آواز اور بہت بلند آواز سے کہا۔ میں نے محسوس کیا ان کے لہجے میں غیر معمولی جوش و خروش تھا اور چند گز آگے جانے کے بعد ہی پتہ چل گیا کہ پہاڑی کا ایک ٹکڑا سڑک پر آن پڑا تھا اور سڑک بند تھی۔

آدمیوں کی یہی بھیڑ اب تماشا دیکھنے آہستہ آہستہ میرے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ ان ہی میں سے کچھ لوگ مجھے رائے دینے آئے کہ میں نزدیک کے تھانے جا کر فون کر کے گینگ بلواؤں یا کسی کو دو ایک روپیہ دے کر گاؤں بھیج دوں کہ وہ وہاں سے پھاوڑے اور آدمی لے آئے۔ ہو سکتا ہے ان کی مرضی ہو کہ میں کچھ تاوان نکالوں تو یہ دس بارہ آدمی ہی ہاتھ پاؤں مار کے میری نیا پار لگا دیں مگر میں وہ مانجھی ہوں کہ پتوار ہاتھ سے رکھے، بے فکر بیٹھا ہوں کیونکہ مجھے کہیں جانا ہی نہیں ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں ایک نہ ایک پڑاؤ تو ایسا آتا ہی ہے کہ جس کے بعد اسے کہیں جانا نہیں ہوتا۔ یہ اور بات کہ یہ پڑاؤ اس کی منزل نہ ہو۔ اور پھر ابھی تو مجھے اپنی زندگی کا، اپنے مستقبل کا فیصلہ بھی کرنا ہے۔ شاید اسی فیصلے سے بچنے کے لئے میرا ذہن ایسی باتیں سوچ رہا ہے کہ اس سبز چھلکے کے نیچے قدرت نے کیا چھپا رکھا ہے اور پھر اس سخت چھلکے کے نیچے اخروٹ کی گری کس شکل میں موجود ہے۔ . . . یعنی ایسے آڑے وقت میں میں اخروٹوں کے اندر کے بھید جاننے کے چکر میں پڑا ہوں مگر یہ بھی ہے کہ یہ میری زندگی کا پہلا لینڈ سلائڈ تو ہے نہیں۔

ہر شخص کی زندگی میں نہ جانے کتنے لینڈ سلائڈ پر زندگی کی چلتی ہوئی گاڑی رک جاتی ہے مگر جب ملبہ ہٹا کر جگہ ہموار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو لشتم پشتم گاڑی نکل ہی جاتی ہے، یہ اور بات ہے کہ کبھی کوئی کمانی ٹوٹ جاتی ہے، کبھی سائلنسر بے کار ہو جاتا ہے، کبھی بریک پہلے کی طرح کام نہیں کرتا مگر ہر مشین چاہے گوشت پوست کی ہو یا دھات کی جلد یا بدیر خراب ہو ہی جاتی ہے تو پھر اس کو بچا بچا کے رکھنے سے فائدہ اور لینڈ سلائڈ تو گھر بیٹھے بھی آ جاتے ہیں۔

میری زندگی کا پہلا لینڈ سلائڈ گھر بیٹھے ہی آیا تھا اس وقت میری عمر پانچ سال کی ہو گی۔ میں نے پڑھنا شروع نہیں کیا تھا مگر باجیاں مجھے اکثر اسکول کے ڈراوے دینے لگی تھیں۔ کہتے ہیں چھ سات سال کی عمر سے پہلے مشکل سے ہی کوئی بات یاد رہتی ہے مگر مجھے یاد ہے بس ایسا جیسے کوئی خواب ہو۔ مگر وہ خواب نہیں تھا کیونکہ بعد کی حقیقتیں اس کی شاہد ہیں۔ رات کا کیا بجا تھا مجھے اندازہ نہیں۔ میں بچہ تھا اور جلد سوتا تھا۔ ان دنوں ٹی وی نہیں اور آج کے بچوں کی طرح گیارہ بجے تک جاگنا بچوں کا معمول نہیں تھا۔ میں تو کوئی سات آٹھ بجے ہی سو جاتا تھا۔ اس کے بعد جب بھی آنکھ کھلتی میرے لئے آدھی رات ہی ہوتی تھی۔

ہاں وہ آدھی رات کا وقت تھا جب کسی کے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ ہم نے نیا نیا گھر بدلا تھا شاید ہی کسی کو پتہ ہو کہ ہم اس گھر میں آئے ہیں۔ ابھی تو سارا سامان بھی بکھرا پڑا تھا۔ باجیاں صبح سے گھر ٹھیک کرتے کرتے نڈھال ہو کر سوئی پڑی تھیں۔ جتنی چیزیں سمٹوائی گئی تھیں ان سے کہیں زیادہ بکھری پڑی تھیں۔ اس اجنبی جگہ اور ایسے غیر معمولی ماحول میں اتنے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا تو ہم سب ہی جاگ اٹھے۔ بجائے دروازہ کھولنے کے ابو اور امی کھسر پھسر کرنے لگے۔ ابو بنیان کے اوپر قمیص پہنتے ہوئے صحن میں آئے اور پھر جلدی سے اندر چلے گئے۔ امی نے دل پر ہاتھ رکھ کر بظاہر کڑک دار آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

مگر میں نے دیکھا کہ ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ باہر سے کڑاکے دار آواز آئی۔

"پولیس، دروازہ کھولو۔"

پولیس کی آواز سنتے ہی میں نے رونا شروع کر دیا۔ ہمارے ملک میں چھوٹے بچے پولیس کے نام کے ساتھ کبھی کوئی اچھی توقع وابستہ کر ہی نہیں سکتے اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ سب ہی گھر والے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ امی نے کچھ دیر اندر سے بحث کرنے کی کوشش کی مگر جب دروازے پر دوبارہ بمباری شروع ہوئی تو انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ان لوگوں کو پھر بھی روکنا چاہتی تھیں مگر وہ ڈراتے ہوئے اندر چلے گئے۔ باجیاں دم سادھے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھیں۔ سب کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ کچھ سوچ سمجھ نہیں سکتا تھا مگر پولیس کا جو خوف میرے اندر چھپا ہوا تھا اس کی وجہ سے میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ بڑی باجی نے آ کر مجھے گلے لگایا اور زبردستی لٹانے کی کوشش کی مگر میں اس گڈے کی طرح جس کے پیندے میں سیسہ لگا ہو جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جس وقت پولیس کے ساتھ ابو نکلے تو چور سے بنے گردن جھکائے ان کے ساتھ چلے گئے۔ امی، دادی اماں، باجیاں اور میں ہم سب روتے رہ گئے۔ اس کے بعد کی ساری باتیں تو مجھے یاد نہیں، بس اتنا خیال ہے کہ گھر میں اور دل میں ایک خلا سا تھا۔ ابو نہیں تھے۔ زندگی کی گاڑی لشتم پشتم چل نکلی تھی مگر میرے لئے یہ ایک زبردست ذہنی سلائڈ تھا جس کا اثر تمام عمر میرے اوپر رہے گا۔ باجیاں شاید کچھ سمجھتی ہوں یا جانتی ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ابو کہاں گئے، کیوں گئے۔ پوچھنے پر بھی مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملتا۔ ہم کہیں جاتے یا کوئی ہمارے ہاں آتا تو ہم پر عجیب سی نگاہیں پڑتیں۔ جن میں ہمدردی بھی ہوتی اور حقارت بھی۔ میں ان نگاہوں کا مطلب نہیں سمجھتا تھا مگر محسوس تو کرتا تھا۔ وقت کا احساس نہیں۔ ابو کتنے

دن غیر حاضر رہے، اتنا معلوم ہے کہ ساون کا مہینہ تھا۔ ان برسوں کی جو باتیں مجھے یاد ہیں وہ یہ کہ دادی اماں اور امی نمازیں بہت پڑھتی تھیں، ہر وقت دونوں کے ہاتھوں میں تسبیحیں رہتی تھیں۔ دیگیں پکتی تھیں جو غریب غربا میں تقسیم کی جاتی تھیں اور ان زیوروں کا ذکر ہوتا تھا جو ابّو کے مقدمہ کی وجہ سے بک رہے تھے۔ بڑے لوگ ابّو سے ملنے جاتے تھے مگر مجھے کبھی نہیں لے جایا گیا، باوجود میرے رونے پیٹنے کے نہیں لے جایا گیا۔ مجھ سے کہا جاتا تھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایسے ہسپتال میں ہیں جہاں بچوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر محلے کے بچے میری طرف انگلیاں اٹھا کر کہتے تھے: "اس کا باپ جیل میں ہے۔" سب سے پہلے میں نے جس بچے کا سر پھاڑا اس نے اسی قسم کا کوئی جملہ کہا تھا۔

گھر میں ایک مرتبہ یہ طے کیا گیا کہ سجاد بہت افسردہ رہتا ہے اسے کچھ عرصے کے لئے چچا کے پاس بھیج دیا جائے وہاں اپنے ہم عمر لڑکوں میں خوش رہے گا، چنانچہ مجھے چچا کے گھر بھیج دیا گیا۔ میری زندگی میں راتوں کے تجربے ہمیشہ نرالے اور عجیب رہے۔ شاید سب کے ساتھ یہی ہوتا ہو۔ رات کو ماحول کے ساتھ لوگ بھی بدل جاتے۔ میری چچی جو دن میں میرا دلار کرتیں رات کو ہم لوگوں کے بارے میں چچا سے عجیب عجیب باتیں کرتیں اور یہ سب میرے نزدیک آدھی رات کو ہوتا نئی جگہ ہونے کی وجہ سے مجھے اچھی طرح نیند نہ آتی اور میں چپ چاپ پڑا چچا چچی کی باتیں سنا کرتا جواب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ چچی کہتیں۔

"آپ دیکھ رہے ہیں آپ کی امی سارا زیور بڑے بھیا کے مقدمے میں کھپا رہی ہیں، آپ ان سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ ہمارا حصہ ہمیں دے دیں۔"

"ہمارا حصہ کیسا؟ زیور ان کا ہے وہ جو چاہیں کریں۔"

"واہ، اتنے ڈھیروں زیوروں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ آخر ان کے بعد وہ سب میں برابر تقسیم ہوگا یا نہیں۔"

"ہاں جو بچے گا وہ سب میں تقسیم ہو جائے گا، زندگی میں تو وہ اس کی مالک ہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ کلیم کی زمینیں بھی بیچ رہے ہیں، وہ بھی اس مقدمے میں کھپ گئیں تو ہمارا کیا ہوگا، آخر ہمارے بھی بچے ہیں۔"

"زمین بھی تو ان ہی کی ہے۔"

"میں پوچھتی ہوں بڑے بھیا نے جو اتنا کمایا وہ کہاں گیا جو یہ زیور اور زمینیں بک رہی ہیں۔"

"اتنے دنوں میں سب لگ گیا ہوگا۔"

"اجی گدیلے بھرے ہوئے تھے نوٹوں کے، جس گدے پر ہماری جٹھانی سوتی تھیں اس میں روئی نہیں تھی، نوٹ ہی نوٹ تھے۔"

"اچھا! پھر تو تم نے بھی کچھ ضرور نکال لیے ہوں گے!"

"ارے ایسے ہوتے تو آج یہ دن نہ ہوتے۔ میں کہتی ہوں سب چالاکی ہے۔ اپنا روپیہ چھپا دیا کہ ایسے وقت میں ماں انکار تھوڑی کرے گی اور تم جھکّا اتّو بن رہے ہو۔ بس ایک ہی بیٹا انھیں پیارا ہے، بیٹا بھی وہ جس نے سارے خاندان کی ناک کٹا دی۔ میری بات یاد رکھنا اگر زیور اور کلیم کی زمین کی طرف سے غافل ہوئے تو کوڑی بھی ہاتھ نہ آئے گی۔"

"اچھا میں امی سے بات کروں گا، اب سو جاؤ۔"

چچا چچی سو جاتے مگر میں گھنٹوں جاگتا رہتا۔ ہزار سونے کی کوشش کرتا مگر لگتا جیسے کھڑکی سے چاند میری آنکھوں میں گھسا چلا آ رہا ہے، اور صحن بھر کی چکوریں صرف میری نیند اڑانے کے لئے چلا رہی ہیں۔ اصل میں میرا ذہن اس گدیلے کو ادھیڑنے میں مصروف رہتا جس میں روئی کے بجائے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ کیا وہ گدا بہت نرم ہوگا، نہیں اسے تو سخت ہونا چاہیے۔ امی کے گدے پر تو میں اکثر بیٹھتا ہوں مجھے تو کبھی کوئی فرق محسوس نہیں

ہوا۔ کبھی اس میں سے چُرمُر کی آواز نہیں آئی۔ بچھونا تھا تو اکثر اس پر پیشاب بھی کر دیتا تھا۔ پیشاب سے تو سارے نوٹ خراب ہو گئے ہوں گے۔ یہ ابو اور امی کو کیا سوجھی۔ کبھی نوٹ گدّوں میں بھر کر رکھے جاتے ہیں۔ دو، تب ایسی ہی باتیں ان کے بچے مجھ سے کیا کرتے۔ چچا کے سارے بچے شیطان کے خالو تھے۔ وہ مجھ سے کہتے کہ میرے ابو قتل کی سازش میں شریک تھے، اور انہوں نے بے حد و حساب رشوت لی تھی۔ ان کے پاس سونے چاندی کی اینٹیں تھیں۔ بھری بوریاں نوٹوں کی تھیں۔ میری امی کے پاس سیروں کے حساب سونا تھا اور ہم سب جن پلنگوں پر سوتے تھے، جن کرسیوں پر بیٹھتے تھے، جو کپڑے پہنتے تھے جو بڑے پہنتے تھے وہ سب حرام کے پیسے کے تھے۔ لفظ "حرام" سب سے پہلے میں نے وہیں سنا اور سیکھا۔ میرے لئے یہ لفظ دنیا کا غلیظ ترین لفظ تھا اور میں ابو کا نام کسی طرح بھی اس لفظ کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں جھنجھلاتا، روتا اور ان بچوں کو حرامی کہتا۔ زندگی میں یہ پہلی گالی تھی جو میں نے سیکھی۔ اس ایک لفظ کے علاوہ بھی بہت سی گالیاں سیکھ کر میں اپنے گھر واپس آ گیا۔

اپنے ساتھ میں ڈھیروں سوالوں کی گٹھریاں لایا جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں پوچھے تھے۔ میں قتل اور رشوت کے معنی جاننا چاہتا تھا۔ میں بوریوں میں بھرے نوٹ دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے سونے چاندی کی اینٹیں دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ ہر پلنگ کی چادر اٹھا کر گدّے کو چھو چھو کر دیکھتا تھا۔ میں نے امی کے گدّے کو قینچی سے کاٹ کر بھی دیکھا مگر وہاں روئی کے سوا کچھ نہ تھا۔ سونے چاندی کی اینٹیں اور بوریاں بھرے نوٹ بھی دیکھنے کو نہ ملے بلکہ کچھ دن بعد یہ ہوا کہ سب کے کپڑے آہستہ آہستہ پھٹنے لگے۔ باجیاں روز اسکول جانے سے پہلے ہزاروں نصیحتیں کرتیں۔ جو چیز ٹوٹ جاتی وہ ویسے ہی پڑی رہتی۔ ریڈیو خراب پڑا تھا، استری بے کار پڑی تھی۔ بجلی کی کیتلی ناکارہ ہو گئی تھی۔ میری ٹرائیسکل کباڑی کی نذر ہو گئی تھی۔ ایک دن میں نے سنا امی نے اخبار والے کو اخبار لانے سے منع کر دیا۔ خواہ مخواہ کا خرچ۔ پڑھتا کون ہے یونہی لڑھکتا پھرتا ہے۔ اب میرے اسکول بھیجے جانے کا ذکر زیادہ ہوتا مگر باوجود عمر ہو جانے کے مجھے داخل نہیں کروایا جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا۔ اس کی وجہ اسکول کی بھاری فیس، کتابوں اور کپڑوں کا بوجھ تھا۔ وہ بوجھ جو پہلے پتے کی طرح ہلکا تھا یکایک اب بہت بھاری ہو گیا تھا۔ میں خوش تھا کیونکہ مجھے اسکول سے ایسی زبردست دلچسپی بھی نہیں تھی۔

ایک دن چچا اور چچی خوب تیار ہو کر آئے۔ بڑی تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔ دادی اماں رو دیں جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بڑبڑاتی رہیں انہوں نے ابو کو بھی برا بھلا کہا۔ چچا چچی کو بھی۔ چچی روئیں، امی روئیں، چچا دھاڑتے رہے اور پھر چچا چچی آئندہ کبھی نہ آنے کی دھمکی دے کر چلے گئے اس دن میں نے باجیوں کو پہلی مرتبہ بڑوں کے سامنے چپڑ چپڑ کرتے دیکھا۔ چچا چچی کو کوسا اور سارے خاندان سے ناطے توڑنے کی باتیں کرنے لگیں جن میں سے کوئی ان کا سچا ہمدرد نہیں، سب تماشا دیکھنے اور اُلٹی سیدھی نصیحتیں کرنے کو ہیں۔ ان سے تو غیر ہزار درجے اچھے ہیں جو دامے درمے سخنے ہر طرح مدد کرتے ہیں۔

گھر کا ماحول انتہائی بدحالی کو پہنچ کر پھر کچھ ٹھیک ہو چلا تھا۔ بڑی باجی نے ایک فرم میں نوکری کر لی تھی۔ مقدمہ جیتے جانے کی امید تھی۔ باجی کے باس اس سلسلے میں بہت بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ باجیاں پھر نئے ریشمی کپڑے خرید کر لانے لگی تھیں۔ ریڈیو ٹھیک ہو گیا تھا، اخبار دوبارہ آنے لگا تھا اور بالآخر مجھے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ بھی ہے کہ مجھے کپڑوں سے، کتابوں سے، فیسوں سے یا اوپر کے جیب خرچ سے کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑا

اور پھر ایک دن ابو بھی آ گئے۔ جو چیز سامنے نہ ہو اور اس کا تصور ہی باندھتے رہو تو وہ حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ شاید یہی میرے ساتھ ہوا۔ میرے تصور کے ابو گورے چٹے، لمبے چوڑے ہینڈسم آدمی تھے مگر اصل ابو ادھ کچڑی بالوں والے، سانولے اور دبے سے آدمی

تھے جن سے پیار کرنا تو ممکن تھا مگر ان پر فخر کرنا مشکل تھا۔ ان کے آنے کے دوسرے یا تیسرے دن گھر میں ایک میلاد کیا گیا جس میں میلاد کم اور خاندان بھر کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ ابو صحن میں بیٹھے تھے۔ جو آتا مٹھائی کا ڈبہ اور پھولوں کے ہار لیے۔ مجھے جو بات سب سے عجیب لگی وہ یہ کہ ابو کے گلے میں ہار ڈالنے والا انھیں دس، بیس پچاس کے نوٹ بھی دیتا جسے وہ سلام کر کے لے لیتے۔ یک بارگی ہی کیا ہوا میں بھاگا ہوا ابو کے پاس گیا اور چلّا کر کہا۔

"ابو آپ پھر رشوت لے رہے ہیں، پولیس آپ کو پکڑ کر لے جائے گی۔"

لگتے ہوئے قہقہے دفعتاً تھم گئے۔ کچھ عجیب ناگوار سی خاموشی چھا گئی۔ بڑی باجی نے ایک تھپڑ میرے لگایا اور گھسیٹتی ہوئی مجھے وہاں سے ہٹا لے گئیں۔ راستے بھر وہ مجھے چٹکیاں لیتی رہیں۔ "زبان بہت چل نکلی ہے، زمین سے اُٹھے نہیں اور لگے باتیں بنانے۔"

اس دن میلاد کے بعد مجھے مٹھائی کھانے میں ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔ ابو کے آنے کے بعد کے جو سہانے سپنے میں نے دیکھے تھے وہ پورے ہوتے نظر آ رہے تھے۔ نہ وہ سیر سپاٹے نہ وہ خرید و فروخت۔ ابو زیادہ تر گھر ہی میں رہتے اور خاموش کھوئے ہوئے سے۔ امی میرے بجائے اب ان کی تیمارداری میں لگی رہتیں۔ حلوے بنا بنا کر اور بادام پیس پیس کر کھلاتیں۔ باجیاں اب کسی کا غم نہیں کھاتی تھیں۔ بڑی باجی کے فرم کے شاید کوئی اوقات ہی نہیں تھے۔ نہ ان کے آنے کا وقت مقرر تھا نہ جانے کا۔ اُن سے چھوٹی جو بی۔ ایس۔ سی کر رہی تھیں۔ ان کے پریکٹیکل بہت دیر سے ختم ہوتے تھے اور ان کا کالج بھی دور تھا۔ وہ تھکی ہاری لوٹتیں تو گھر میں کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتیں۔ ان سے چھوٹی میٹرک میں تھیں۔ معلوم ہوتا تھا شاید انھیں بورڈ میں ٹاپ کرنا ہے جو بیس گھنٹے کتابیں لیتی تھیں اور وہ۔ ان سے چھوٹی جو مجھ سے صرف دو سال بڑی تھیں خود کو کم افلاطون نہیں سمجھتی تھیں۔ میرے ساتھ کھیلنا انھیں عار تھا۔ سارا دن محلے بھر میں کدکڑے لگاتیں، محلے کی خبریں سناتیں اور اکثر اِدھر کی اُدھر کرنے میں مار بھی کھاتیں۔ اور دادی اماں بس دن بھر نمازیں پڑھے جاتیں یا قرآن شریف۔ ان سے فارغ ہوتیں تو تسبیح ان کے پاس ہوتی۔ چاہے جمعدارنی کو نالی صاف نہ کرنے پر ڈانٹ رہی ہوں چاہے ملازم کو کتے کو کھانا کھلانے کی ہدایت کر رہی ہوں تسبیح کھٹا کھٹ چلتی رہتی۔ غرضکہ کسی کے پاس وقت نہیں تھا کہ میری بھی کچھ سنے۔ اسکول میں جو کچھ پڑھایا جاتا وہ کم ہی میری سمجھ میں آتا اور گھر کا کام ہوتا وہ میرے بس کا نہ ہوتا۔ کوئی مجھے اس کام میں مدد نہ دیتا۔ دوسرے دن اسکول میں ڈانٹ پڑتی تو میرا دل اسکول سے کچھ اور اچاٹ ہو جاتا۔

اتنی دیر میں کالام سے آنے والی کچھ اور کاریں جمع ہو گئی ہیں۔ ان کا تماشہ دیکھنے کے لئے کچھ اور مقامی لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ یہ ایک بچی کتنی پیاری ہے۔ سیب کو مات کر رہے ہیں اس کے گال۔ ننگے پاؤں، بکھرے بال، مست مولی سی۔ یہ پہاڑی لڑکیاں جو مست مولی سی ہوتی ہیں کیا اندر سے یہ بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے اور شہر کی لڑکیاں۔ شاید سب لڑکیاں ایک ہی سی ہوتی ہیں یا شاید نہیں ہوتیں۔ وہ میرے پاس کھڑے ہو کر مجھے غور سے دیکھ رہی ہے اور پھر یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی ہے۔ میں دفعتاً بھول گیا کہ میں خود کو غیر ملکی سمجھوانا چاہتا ہوں اور نہایت شستہ اردو میں اس کے پاس کھڑے لڑکے سے پوچھنے لگا "یہ ہنس کیوں رہی ہے یہ چھوکری" اور لڑکے نے میری امید سے کہیں زیادہ اچھی اردو میں جواب دیا "تم نے عورتوں کی طرح دنداسہ جو لگایا ہے" میں حیران ہو کر سوچتا ہوں میں نے تو ایسی کوئی چیز نہیں لگائی۔ میں اٹھ کر پچھا یا جھاڑ (؟) جھا کار کے شیشے میں دیکھتا ہوں۔ او وہ جو اخروٹ کا چھلکا میں نے چبایا تھا اس نے میرے ہونٹوں کو لال کر دیا تھا جو آہستہ آہستہ دنداسے کی سیاہی میں تبدیل ہو رہے تھے۔ میں خود بھی ہنس پڑا۔ میں نے اپنے آپ کو غور سے آئینے میں دیکھا۔ میرے بڑھے ہوئے سنہری بالوں کے پیچھے کسی خوبصورت

درویش کی طرح میرے کاندھوں پر پڑے رہتے۔ میری بھوری آنکھیں اور سفید جلد سوات کے خوب صورت موسم کے اثر سے چمک رہی تھی۔ میری نوزائیدہ داڑھی مکئی کے سنہری ریشوں کی طرح باریک اور نرم تھی اور رنداسے لگے میرے ہونٹ کسی سواتی دوشیزہ کے ہونٹوں کی طرح بھرے بھرے لگ رہے تھے۔ گریبان کھلا کڑھا ہوا کرتہ، رنگ اتری جینز، سنہری کمانی کا ہلکے سبز رنگ کا چشمہ۔ میں قطعی غیر ملکی سیاح لگ رہا تھا۔ اچھا ہی کیا جو میں یہاں چلا آیا۔ اتنے سیاحوں میں میں بھی ایک سیاح ہی تو تھا۔ دیکھا جائے تو دنیا کا ہر آدمی سیاح ہے جو اس دنیا کی سیاحت کے بعد جلد یا بدیر واپس لوٹ جاتا ہے۔ ہر سیاحت میں نیند سولہ آتے ہیں۔ کسی کی راہ میں کم کسی کی راہ میں زیادہ۔

ابّو پہلے سے ابّو نہ رہے تھے۔ باقی بھی سب کچھ ویسا نہیں رہا تھا پھر بھی بہت کچھ وہی تھا۔ دنوں کی شورشیں بھی وہی تھیں، راتوں کے سپنے بھی وہی تھے۔ وہی رات کو ہر بات عجب طرح سحر زدہ سی ہو جاتی تھی کہ صبح اٹھ کر سوچنا پڑتا تھا آیا جو کچھ دیکھا سچ مچ ہوا تھا یا خواب تھا محض۔ ایک رات آنکھ کھلی تو امی بڑی باجی کو اتنی دیر سے آنے پر ڈانٹ رہی تھیں اور وہ دوبدو جواب دے رہی تھیں۔

"جس گیسٹ کو لینے جانا تھا اس کا جہاز اسی وقت آیا تو میں کیا کروں۔ یا تو آپ مجھے گھر بٹھا دیجئے یا سوال جواب نہ کیا کیجئے۔"

"آہستہ بولو" امی نے کہا "میں تو سمجھتی ہوں مگر تمہارے ابو . . . . . معلوم ہے میں ان سے روز جھوٹ بول دیتی ہوں کہ تم دس بجے تک آ گئی تھیں۔"

"تو آپ ان کو بھی کہہ دیجئے۔ ان کو بھی بتا دیجئے کہ اگر وہ مجھے پردے کی بوبو بنا کر بٹھانا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں مگر وہ مردوں کی طرح باہر نکلیں اور کما کر لائیں۔ عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ روز کے طعنے پر اٹھے، یہ بھائی بہنوں کی فیسیں یہ ٹیم ٹام ایسے ہی تو نہیں بنی ہوئی۔"

"میں کہہ رہی ہوں آہستہ بولو۔ تم اپنے باس سے یہ تو کہہ سکتی ہو کہ . . . . ."

"میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی، وہ کل ہی دوسری لڑکی کا انتظام کر سکتا ہے . . . . . اور پھر آپ ڈرتی کیوں ہیں۔ میں بچی تو نہیں ہوں اور یوں بھی کراچی میں دن رات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" ساڑھی کھول کر پلنگ پر ڈالتے ہوئے وہ غسل خانے میں گھس گئیں۔ امی واپس چلی گئیں۔ میں کچھ دیر اندھیرے میں آنکھیں جھپکتا رہا اور پھر سو گیا۔

باجی نے سچ کہا تھا کراچی میں دن رات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جب تک میں نویں کلاس میں پہنچا میرے بہت سے ساتھی لڑکے مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ راتوں کو ہم سیر گشت کرتے، سیکنڈ شو کے بعد پارک چلے جاتے۔ یونہی سڑکوں پہ اسکوٹروں پر ریس کرتے پھرتے۔ ساحل سمندر پہ ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے۔ میرے ساتھ اور بھی کئی لڑکے تھے جنہیں قاعدے سے کالجوں میں ہونا چاہیے تھا مگر ہم داڑھی مونچھوں والے ہو کر ابھی تک اسکول کی چار دیواری سے ہی سر ٹکرا رہے تھے گو دنیا کے اور جھمیلوں میں ہم بہت آگے تھے۔ ہم ان لڑکوں کو منہ بھی نہ لگاتے تھے جو سفید سفید لڑکیوں کے سے گال لئے نویں دسویں کلاسوں میں چلے آتے تھے۔ ان کے منہ سے دودھ کی بو آتی تھی۔ آوازیں لڑکیوں کی طرح باریک تھیں۔ ہمیں ان کی محفوظ زندگیوں پہ رشک نہیں ہنسی آتی تھی۔ مغرب کے وقت گھر نہ پہنچیں تو بے چاروں سے بازپرس ہوتی تھی۔ ہم ایسے لڑکوں کو زنخوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ لڑکے تھے جو کبھی چھپ چھپا کر "صرف بالغوں کے لئے" کا لیبل لگی کوئی فلم دیکھ آتے تھے تو گھنٹوں کانپتے تھے۔ کراچی کے اس شبانہ ٹین ایجر کلب کی ابھی ہوا بھی نہیں لگی تھی جہاں ہر ہفتے کی رات کو ٹین ایجر

لڑکے لڑکیوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ ہاؤ ہُو کا طوفان۔ ناچ اور اس بلا کا شور کہ اگر ہماری امی لمحہ بھر کو وہاں چلی جائیں تو ان کے کانوں کے پردے پھٹ جاتے یا دماغ کی چولیں ہل جائیں۔ اگر امی وہاں چلی جائیں اور اتنی کم عمر لڑکیوں کو ایسے نیم عریاں لباسوں میں، مالائیں لٹکائے ہاتھ میں جام تھامے لڑکوں کے گلوں سے لگے ملائے لپٹے چپٹے دیکھتیں تو واقعی ان کا ذہن چکرا جاتا مگر وہاں تو کوئی کسی کا نوٹس ہی نہیں لیتا تھا۔ کتنی ہی دفعہ میں ایک ہفتے کی پہنی ہوئی بغیر استری کی گول ہوئی پتلون پہنے چلا گیا جو کسی نے نظر اٹھا کر دیکھا ہو۔ سب اپنے ہاؤ ہُو میں گم رہتے۔ سب اکٹھے تھے مگر سب الگ۔ شاید حشر میں بھی یہی کچھ ہوگا۔

مگر ایک بات کا اعتراف کرتا چلوں کہ ابھی تک زندگی کے جو سبق میں نے سنے، پڑھے یاد کیے وہ زیادہ تر تھیوری ہی میں تھے۔ جس طرح ہمارے کالجوں سے لڑکے انجینئرنگ پاس کر کے نکلتے ہیں تو مشینوں کے سامنے کھڑے رہ جاتے ہیں اسی طرح جہاں زبانی میں نے بہت کو جھے چھانے تھے، بہت سی لڑکیوں کے ساتھ بہت کچھ کیا تھا۔ اصل میں پریکٹیکل میں بھی میں اتنا ہی کورا تھا جتنا وہ لڑکے جن کے منہ سے دودھ کی بو آتی تھی۔ لڑکے مجھے کھینچتے تھے، اکساتے تھے۔ اپنے ساتھ لے جاتے تھے مگر میں ڈرتا تھا جس طرح پہلے پہل تیرنے والا پانی میں چھلانگ لگانے سے ڈرتا ہے۔ میں ان کنواری لیڈی ڈاکٹروں کی طرح تھا جنہوں نے سینکڑوں بچے جنوائے ہوں مگر خود جنس کے کسی مرحلے سے نہ گزری ہوں مگر ظاہر ہے کہ لیڈی ڈاکٹر ایک بارہ سالہ انجان لڑکی کو تو اس معاملے میں جاہل ہی گردانے گی۔

میرا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر امیر لڑکوں میں تھا۔ اس عمر میں لڑکے بدلے کی اتنی فکر نہیں کرتے۔ جن کے پاس ہوتا ہے بے دریغ لٹاتے ہیں۔ میرے پاس کار نہیں تھی مگر روپے پیسے کی طرف سے ہاتھ تنگ بھی نہیں تھا۔ چار بیٹیوں کے اوپر میں ایک بیٹا تھا۔ دادی کا، باپ کا، ماں کا اور باجیوں کا سب ہی کا لاڈلا تھا۔ میرے مانگنے پر کبھی کسی طرف سے انکار نہیں ہوا۔ بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد نمبر دو باجی کو ایک بے حد فرسٹ کلاس نوکری مل گئی تھی۔ گھر میں اچھی خاصی ریل پیل تھی۔ تنگی ترشی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ مجھے جو فرق محسوس ہوتا تھا وہ یہ کہ وہ پہلی سی گھریلو فضا نہیں رہی تھی۔ ہم سب مشکل سے ہی اکٹھے ہوتے تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو کہیں نہ کہیں جانا ہوتا تھا۔ امی کا، باجیوں کا اور میرا خیال تھا کہ کم از کم ایک کار تو ہونی ہی چاہیے مگر ابو کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ ایک گاڑی اس گھر میں کیا تیر مارے گی جہاں نہ کسی کے آنے کا وقت تھا نہ جانے کا۔ ہم سب یونہی دوستوں کی گاڑیوں پر گزارہ کر رہے تھے البتہ بڑی باجیوں کو لینے اور چھوڑنے ان کی فرموں سے کاریں آتی تھیں۔ نمبر دو باجی جو زیادہ طرار تھیں انہوں نے تو پہلے دن ہی باس کو بتا دیا تھا کہ میں ہر وقت آنے کو تیار ہوں مگر گاڑی کے بغیر ہرگز نہیں آؤں گی۔ ان کی فرم میں کاروں کی کمی تھوڑا ہی تھی۔ ایک سے ایک جدید کار اور نیا ماڈل انہیں لینے آتا مگر وہ اس درجہ کی نخریلی تھیں کہ مجال ہے کسی کو اپنے ساتھ بٹھا کر دو قدم لے جائیں۔ بنتی تھیں بڑی اصول پرست: "نہ بھائی! فرم کی گاڑی ہے میں کسی کو نہیں بٹھاؤں گی کل کلاں کو ڈرائیور نے کسی سے جڑ دیا تو میری کیا رہ جائے گی۔ بڑی آئیں وہاں سے۔ خیر مجھے کون سی ان کی پروا تھی۔ میرے پاس بھی ایک سرخ بیر بہوٹی سا اسکوٹر تو تھا ہی جس کو میں آئینہ کی طرح چمکا کر رکھتا تھا اور جو خالص میری ملکیت تھا۔

ایک رات امی نے چھوٹی باجی کو دیر سے آنے پر ٹوکا اور ابو کا ڈراوا دیا تو وہ پھنکاریں: "ذرا ابو سے بھی تو پوچھئے کہ وہ راتوں کو کون سی نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اگر وہ مجھ سے کچھ سوال جواب کرنا چاہتے ہیں تو میں دو بدو کرنے کو تیار ہوں۔" اس کے بعد امی کچھ نہ بولیں۔ باجی بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور امی پھس پھس روتی رہیں۔ میں نے سوچا واقعی اب ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں لیکن پرانی نسل ہمیں بڑا ماننے

کو تیار نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر ایک آدمی رات کو بارہ ایک بجے گھر آئے۔ کراچی میں رات دن میں ایسا فرق ہی کون سا ہے۔ دن سے زیادہ اجالا تو یہاں رات کو ہوتا ہے۔ سڑکیں جھما جھم کرتی ہیں۔ آسمان کو دیکھو تو ہر وقت روشنی کا ایسا غبار سا چھایا رہتا ہے کہ کراچی میں رہنے والے بے چارے گھپ اندھیری راتوں کا مطلب ہی نہیں سمجھتے۔ صبح تک ہوٹل اور ریستوران کھلے رہتے ہیں۔ کاریں، رکشائیں اور ٹیکسیاں چلتی رہتی ہیں۔ بسیں بھی یونہی دو ایک گھنٹے کے لئے اونگھتی ہوں گی۔ رات یہاں ہوتی ہی کب ہے اور کراچی غریب سوتی ہی کب ہے۔ یہ تو اس مجبور عورت کی طرح ہے جسے رات کو میاں نہ سونے دے اور دن کو بچے۔

ایک دن میرا ایک دوست ذاکر پوچھنے لگا "یار تمہارے والد مقدمے سے تو بری ہو گئے تھے نا؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

"اب کیا کرتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں، نوکری سے انہوں نے خود استعفا دے دیا ہے۔"

"اگر تم کہو تو میں اپنے ابا سے کہوں کہ وہ تمہارے والد کو کہیں لگا دیں۔"

"تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟"

"کمال ہے تمھیں نہیں معلوم، بھئی بہت بڑا بزنس ہے ان کا، تقریباً ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔"

"تمہیں یکایک ابو کا خیال کیسے آیا۔؟"

"کل میں نے ان سے ملتا جلتا ایک آدمی دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ عرصے سے میں نے تمہارے والد کی شکل ہی نہیں دیکھی۔ ہاں یار دیکھو تو کیسا فراڈ ہے کل میں وہاں گیا جہاں اسمگلڈ مال ملتا ہے۔ وہاں سے میں نے یہ گھڑی خریدی، الفی کے ایک دکان دار کو دکھائی تو وہ ہنس پڑا کہنے لگا یہ اس کمپنی کی گھڑی ہی نہیں ہے جس کا نام اس پر لکھا ہوا ہے۔ مشہور گھڑیوں کے خالی ڈائل اور نچلے حصے بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر ہانگ کانگ میں ہو رہا ہے جن میں یہ روسی ساخت کی معمولی مشینیں فٹ کرتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں یہ گھڑیاں اسمگل ہو کر دوسرے ملکوں میں بکتی ہیں لوگ جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں سمجھ کر دھڑا دھڑ خریدتے ہیں۔ دوکاندار نے مجھے گھڑی کھول کر دکھائی واقعی گھڑی کی مشین کیس کے سائز کی بھی نہیں تھی۔ کیس میں ایک الگ رنگ میں اسے فٹ کیا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ گھڑیاں شاک پروف تک نہیں ہوتیں اس رنگ سے ہی انہیں شاک پروف بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یار کیسا فراڈ ہے۔ بعد میں ابا نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور کہا کہ مجھ سے پوچھتے تو میں کبھی یہ گھڑی لینے کی رائے نہ دیتا۔ اسی وقت ابا نے مجھے ایک سادہ مہنگا نکال کر دی جو ابا کے کوئی دوست حج سے آتے ہوئے جدہ سے لائے تھے، یہ دیکھو۔"

اس نے کف ہٹا کر گھڑی دکھائی۔ گھڑی تھی کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ بڑی اتنی جیسے کوئی کیس، یوں جگر جگر کر رہی تھی کہ کیا کوئی ہیرے کا زیور کرے گا۔ یونہی بے خیالی میں میری نظر اپنی کلائی پر گئی۔

"تمہاری گھڑی کیا ہوئی۔؟" اس نے پوچھا۔

"مرمت کے لئے دی ہے۔"

"تم یہ لے لو۔" اس نے جیب سے گھڑی نکالی اور میری کلائی پر باندھنے لگا۔

"نہیں یار میرے پاس ہے جو۔"

"پھینک اسے جانے کب کی سڑی ہوئی ہے۔"

"نہیں بھی بات سنو۔"

"دیکھو میرے لیے یہ ویسے بھی بے کار ہے۔ سستی سی ہے۔ فراڈ ہے یہ بھی میں تمھیں بتا چکا ہوں زیادہ چلے گی نہیں بس ذرا شو سے باندھ لو جب خراب ہو جائے پھینک دینا۔"

میں نے اپنی کلائی کو دیکھا۔ فراڈ ہو یا کچھ۔ اس وقت تو وہ میرے ہاتھ پر بندھی بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔

"تھینک یو ذاکر۔" میں نے کہا۔

"ناٹ ایٹ آل اچھا شام کو ضرور آنا کلب۔" کہتا ہوا وہ چلا گیا۔

میں بہت دیر تک اپنی کلائی دیکھتا رہا۔ باجبوں بہ جور و زمجھے نئی سے نئی چیزوں سے جلاتی ہیں کچھ تو رحسب پڑے گا۔

ایک بس کی چھت پر بیٹھ کر کچھ لال پگڑی والے آ گئے ہیں چاروں طرف کے سبزے میں ان کی سرخ پگڑیاں لالے کے پھول کی طرح خوب صورت معلوم ہو رہی ہیں۔ یہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے آدمی ہیں اور بچاوڑے کدالیں لیے فی الحال باتیں کرنے میں مصروف ہیں۔ مسافر بے چینی سے ہاتھ مل رہے ہیں۔ سب کو کہیں نہ کہیں جانے کی جلدی ہے۔ مسافر مجھے کسی حادثے میں زخمی ہو جانے والے کے عزیز و اقارب لگ رہے ہیں جو مریض کو جلد از جلد ڈاکٹر کو دکھانا چاہتے ہیں اور لال پگڑی والے وہ ڈاکٹر جن کے لیے حادثے میں زخمی ہونے والا محض ایک کیس ہے۔ صبح سے شام تک آنے والوں میں سے ایک اور کیس۔ دیکھنا تو انھیں ہے ہی مگر دیکھ لیں گے اب ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ مسافروں کی ہانے پکار سے مجبور ہو کر لال پگڑی والے بے دلی سے سلائڈ کی کیچڑ اچھالنے میں مصروف ہیں۔ انھیں بھی میری طرح کچھ ایسی جلدی نہیں ہے۔ میں اخروٹ کی چھاؤں سے اٹھ کر کار میں آ بیٹھا ہوں اور یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ موسم ابھی تک اتنا ہی ہوش ربا ہے۔ مقامی لوگ ابھی تک جمع ہیں۔ کتنی بے پناہ فرصت ہے ان پہاڑی لوگوں کو۔ میں حیرت سے سوچتا ہوں۔ میری کار کا ریڈیو بہت دیر سے رم جھم قسم کے گیت گا رہا ہے جو اس موسم میں بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ میرے دل میں کسی قسم کے خوف کا کوئی شائبہ نہیں ہے جبکہ کہا جاتا ہے کہ چور کا دل پتہ کھڑکنے پر بھی دھڑکنے لگتا ہے اور میں تو ایسا پکا چور بھی نہیں ہوں۔ لیکن کچھ ایسا لگتا ہے جیسے میرا ضمیر صاف ہے۔ جیسے ہر طرح انصاف میرا منتظر ہے۔ اگر میں بچ گیا تب بھی انصاف ہو گا اور پکڑا گیا۔ تب بھی انصاف ہی ہو گا۔ میں انسانی انصاف سے زیادہ خدائی انصاف پہ یقین رکھنے والا ہوں۔ اگر خدا مجھے بے گناہ سمجھتا ہے تو وہ مجھے بچائے گا اور اگر وہ مجھے مجرم سمجھتا ہے تو پکڑوا دے گا۔ میں دونوں صورتوں میں راضی بہ رضا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں کوئی بہت خدا پرست آدمی ہوں آپ اسے محض میرا بچپنا کہہ سکتے ہیں۔ ویسے مجھ پر خدا پرستی کا دورہ بھی پڑ چکا ہے۔

——— ان دنوں مجھ پر تبلیغ کرنے آنے والے چند لڑکوں کا اثر روز بروز زیادہ ہو رہا تھا۔ لڑکپن میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ آدمی کبھی ایک طرف جھکتا ہے کبھی دوسری طرف۔ میں بڑی باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا تھا۔ جمعہ کے جمعہ مسجد میں نماز ادا کرتا تھا اور ویسے بھی جب وقت ملتا تھا مسجد میں چلا جاتا تھا جہاں قرآن کا درس لیتا تھا۔ روحانی پاکیزگی کا ایک روزہ سا تھا ان دنوں عبادت اور ریاضت کے بارے ہی میں کتابیں پڑھتا تھا۔ میں سوچتا تھا لوگ کتنے احمق ہیں خالی وقت پھر دیکھنے اور گپیں مارنے میں صرف کرتے ہیں۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ

درود پڑھنے، سورہ فاتحہ، سورہ رحمٰن اور سورہ یٰسین پڑھنے کے کیا فضائل ہیں — وضو کرنے، نماز کے لیے مسجد کی طرف قدم بڑھانے کی کل اتنی نیکیاں بنتی ہیں کہ حد و حساب سے باہر لوگوں کی جان بوجھ کر یہ غفلت میری عقل سے قطعی بالاتر تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ روز صبح انسان یہ سنے کہ "نماز نیند سے بہتر ہے" اور پڑا سوتا رہے۔ ان دنوں یہ کیسی ناقابلِ یقین بات لگتی تھی۔ پرانے دوستوں سے میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی یہ سوچ کر کہ میں نے کیسے لہو و لعب میں پڑے ہوئے لڑکوں کو دوست بنایا تھا۔ میں اللہ سے توبہ کرتا اور معافی مانگتا۔ دادی کہا کرتی تھیں "وہ اپنے بندوں پر توبہ کا دروازہ کبھی بند نہیں کرتا۔"

اس زمانے میں بھی حج پر جانے والوں کا بڑا زور شور تھا جس کو دیکھو حج پر جا رہا ہے۔ ائیر ان لنکا بھی بیل گاڑیاں سارا سال حاجیوں کو ڈھو رہی تھی۔ چھ مہینے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا، چھ مہینے آنے والوں کا۔ ان دنوں میں بڑی سنجیدگی سے سوچتا اگر ابو اجازت دیں تو کیوں نہ میں حج کر آؤں۔ روحانی جذبے کی شدت میں حج پر جانے کی سچی طلب ہی نہیں تھی بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے محرومی ایک دائمی خلش بن جائے گی۔

یہ زمانہ تھا، یہ سوچ تھی، جب ایک دن ذاکر آیا اور مجھ سے ٹین ایجر کلب چلنے کو کہا۔ بڑے عالموں کی سی دھیرج مجھ میں کہاں تھی کہ خود اپنی راہ چلتا اور اسے اپنی راہ چلنے دیتا۔ نئے نئے مذہبی جنون نے مجھے اسے راہ راست پر لانے پر اکسایا۔ پہلے تو وہ مذاق میں ٹالتا رہا۔ مگر جب میں ملا بن کے اس سے چمٹ گیا اور دوزخ کے ڈراوے دینے لگا تو وہ بولا۔

"پہلے اپنے گھر والوں کی تو خبر لو۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے یہ بھی نہیں سجھائی دیتا ہے کہ دوسروں کو ہی نصیحتیں کرتے ہو۔"

"کیا ہوا میرے گھر والوں کو؟" میں دھاڑا۔

"تم ہی جانو۔ لوگ اس گھر کو چکلہ کہتے ہیں۔ تمہاری دادی، باپ اور ماں کو دلال سمجھتے ہیں۔ کیا تم اتنے بچے ہو کہ یہ باتیں نہیں جانتے۔"

زندگی میں جس شخص کا جبڑہ سب سے پہلے میں نے توڑا وہ یہی میرا دوست ذاکر تھا۔ وہ تو منہ سے خون پونچھتا ہوا چلا گیا مگر اس کی بات جیسے کسی نے تیز دھار دار چاقو سے میرے دل پر لکیر ڈال دی ہو۔ ایسی زہر بھری لکیر جس میں ہمیشہ آگ سی سلگتی رہتی ہو۔ اس آنچ کو جب میں زیادہ برداشت نہ کر سکا تو میں نے ساری بات امّی کے سامنے اُگل دی۔ امی اطمینان سے بولیں: "کہنے دو لوگوں کو۔ جس گھر کے لوگ ذرا زیادہ ترقی یافتہ ہو جاتے ہیں اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے۔ جب تعلیم عام نہیں تھی تو جس گھر کی لڑکیاں کالجوں میں پڑھتی یا پڑھاتی تھیں وہ چکلہ ہی ہوتا تھا۔ جس گھر کی لڑکیوں نے پہلے پہل پردہ چھوڑا، ریڈیو اسٹیشن گئیں یا ڈراموں میں حصہ لیا وہ آوارہ ہی کہلائیں۔ اب لوگوں نے اس سب کو تسلیم کر لیا ہے۔ دفتروں میں سکریٹری کی جگہ کام کرنے والیاں اب بھی ان کے نزدیک خراب ہیں تھوڑے دن میں لوگ اس کے بھی عادی ہو جائیں گے۔ تم جانتے ہو تمہاری بہنوں نے یہ کام مجبور ہو کر شروع کیا تھا۔ اب ان کو اچھے پیسے ملتے ہیں، ان کی ساکھ ہے، اس لئے کچھ لوگ جلتے بھی ہیں۔ مگر تم ان کو بکنے دو۔ بکنے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے کہنے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔"

امّی کی باتوں سے مجھے تھوڑی سی تسلی ہو گئی مگر اس دن میں نے ذاکر کی شکل پھر کبھی نہ دیکھنے کی قسم کھا لی۔ اس کی دی ہوئی گھڑی بھی میں نے اتار کر ڈال دی اور وہی پرانی مرمت شدہ گھڑی دوبارہ لگا لی۔

مذہبی دورہ پڑنے سے چند دن پیشتر میں نے ابو سے کہہ کر خاصتاً اپنے لیے چھوٹی سی ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی لی تھی۔ اب وہ صرف مجھے مسجد تک لانے لے جانے کے کام آتی تھی یا شہر میں کوئی وعظ وغیرہ ہوتا تو وہاں چلا جاتا۔ اس رات احتشام الحق کی مسجد میں کوئی [illegible] تھا ایک خلقت اس کو سننے اکٹھی ہوئی تھی۔ آسمان پر چاند جگمگا رہا تھا۔ میناروں کی ٹیوب لائٹس کی روشنی بھی چاندنی کا سا تاثر پیدا [illegible]

کے سفید کپڑے اس دودھیا روشنی میں ایسے چمک رہے تھے جیسے چاندنی میں بیلے کے پھول اُٹے پڑے ہوں۔ میں اپنی کار ہی میں بیٹھا وظیفہ سن رہا تھا کہ ایک نو وارد نے دو منٹ مجھ سے بات کرنے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے اپنا تعارف حاجی کچھ دین وغیرہ کروایا جو میں اچھی طرح نہ سن سکا۔ ان کی دمکتی سفید داڑھی، چمکتی بوسکی کی قمیض اور بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے کچھ عجیب سرور سا بخشا۔ لگا جیسے پرانی حکایتوں کے کوئی بزرگ میری کوئی مشکل آسان کرنے آئے ہیں۔ بات بھی یہی تھی۔ انہوں نے کہا۔

"آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔ اس عمر میں یہ عبادت یہ استغراق کم دیکھنے میں آیا ہے، ماشاءاللہ، جزاک اللہ۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کو حج پر جانے کا شوق ہے۔"

"کس مسلمان کو نہیں ہوگا؟" میں نے بے اختیار کہا۔

"بے شک بے شک۔ اگر آپ میرا حقیر نذرانہ قبول کریں تو میں آپ کو حج پہ بھیجنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

میں بوکھلا گیا۔ یہ چاندنی رات، آدھی رات کا سماں، ایسا پاکیزہ روحانی ماحول۔ یہ بزرگ اور حج کی پیش کش۔ یا اللہ یہ کون میری دستگیری کر رہا ہے ..... مجھے اور کچھ نہ سوجھا، میں نے ان کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیا اور مجھ پہ رقت طاری ہو گئی۔

وہ بولے "میں گناہ گار بندہ ہوں، شرمندہ نہ کرو۔ تمہارے جانے کا سارا انتظام ہو جائے گا۔ جس چیز کی ضرورت ہو گی میں آدمی بھیج کر تم سے منگوا لوں گا۔ البتہ یہ بات ابھی کسی سے نہ کہنا، دوسروں کے ہاتھ کی بات ہے ہزار رکاوٹیں ہو سکتی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ تمہارا جذبۂ صادق ضرور تمہیں وہاں لے جائے گا۔ جب سارا انتظام ہو جائے گا تب دعائے خیر کے لئے میں تمہیں بلاؤں گا تم مجھے حیران ہو کر دیکھ رہے ہو شاید تم سوچ رہے ہو کہ اس کے بدلے ..... ہاں اس کے بدلے نہیں۔ میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ روضے پر جا کر میرے حق میں دعا مانگنا۔ تم جیسے پاکیزہ جوانوں کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے جوانی کی عبادت بڑھاپے کی عبادت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"

میں شکریے کے الفاظ بھی نہ کہہ سکا اور وہ فرشتہ صورت و فرشتہ سیرت لمحہ بھر میں اوجھل ہو گئے۔ میں وہاں سے ایک عجیب عالم سرخوشی میں چلا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے رنگوں کی پھوار میں میرے چاروں طرف پڑ رہی ہیں۔ لڑکے بتلاتے تھے کہ ایل۔ ایس۔ ڈی کھا کر آدمی ایک عجیب سرور کے عالم میں رہتا ہے۔ ہوا میں پرواز کرنا عین ممکن سمجھتا ہے۔ ایسے عجیب و غریب اور خوبصورت رنگ اسے نظر آتے ہیں جو ہوش میں تو کیا خواب میں بھی اس نے نہ دیکھے ہوں گے۔ بس یہی میرا عالم تھا۔ جانے کون سے راستے سے کہاں سے نکلا چلا آ رہا تھا کہ دفعتاً زمین پر آ گیا .... ایک گھر کے آگے بڑی سی ایک کار کھڑی تھی۔ اس میں امی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس میں سے نسرین باجی اتریں۔ وہ سفید بنارسی ساری میں ملبوس تھیں۔ بال بال موتی پروئے۔ امی نے ان کے کان کا جھمکا ٹھیک کیا اور وہ مسکراتی ہوئی اس گھر کے اندر چلی گئیں۔ امی نے ڈرائیور سے کچھ کہا اور کار چل دی۔

گھر پہنچا تو امی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"نسرین باجی کہاں گئی ہیں؟"

"اپنی سہیلی کی شادی میں۔"

"اس وقت اکیلی۔؟"

"نہیں میں خود چھوڑ کر آئی ہوں۔"

"مگر وہاں...... جس گھر میں آپ نے انھیں چھوڑا وہاں شادی کے تو کوئی آثار نہیں تھے۔"

"تو کیا آپ ہمارا پیچھا فرما رہے تھے؟"

"جی نہیں میں وعظ سن کر مسجد سے لوٹ رہا تھا۔"

"اچھا تو ملا جی سنیے آج اس لڑکی کی شادی نہیں مہندی ہے۔ لڑکیوں نے رات بھر گانے والے کا پروگرام بنایا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے جہاں اسے چھوڑا وہ گھر کے سامنے کا حصہ نہیں تھا۔ نسرین نے کہا کہ اس طرف سے اس کی سہیلی کا کمرہ نزدیک ہے تو میں نے اسے اُدھر اتار دیا۔ اور کوئی سوال؟"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ امی!" میں شرمندہ سا ہو کر چلا آیا۔

ان ہی حاجی صاحب نے میرا پاسپورٹ بنوایا اور سفر سے پہلے کے سارے مراحل طے کروائے۔ یہاں تک کہ احرام بھی انہوں نے ہی بنایا۔ چلنے سے چند دن پیشتر میں نے یہ راز گھر والوں پر فاش کیا۔ سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ دادی اماں کفِ افسوس ملنے لگیں۔ وہ دو دفعہ حج کر آئی تھیں، لیکن اگر انھیں معلوم ہوتا کہ پوتا حج پر جا رہا ہے تو کیا وہ یہ سنہری موقع چھوڑتیں۔ میں خوش ہوا کہ پہلے نہ بتایا ورنہ کوئی پیر تسمہ پا بڑی بی کندھے پر سوار ہوں تو حج کا لطف کیا خاک آئے گا۔

چلنے سے ایک دن پیشتر وہ حاجی صاحب پھر مجھے ملے۔ وہ اسی مسجد میں نماز پڑھنے آئے تھے جس میں میں نماز ادا کرتا تھا۔ واپسی پر وہ میری کار میں بیٹھ گئے اور گھر کے بجائے کسی بھی طرف چلنے کو کہا۔ کسی بھی طرف۔ وہ مجھ سے راستے میں چند باتیں کرنا چاہتے تھے۔ بات بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ انھیں کوئی چیز کسی کو بھیجنی تھی اور وہ میرے ساتھ بھیجنا چاہتے تھے۔

"آپ کو..." آج وہ تم سے پھر آپ پر اتر آئے تھے۔ "کوئی زحمت نہیں ہوگی۔ وہ شخص خود آکر آپ سے پیکٹ لے لے گا، آپ قطعی کوئی فکر نہ کریں۔ اور اگر وہ واپسی میں کوئی چیز آپ کو دے تو میں خود بہ نفس نفیس آپ کو ائیرپورٹ پر ملوں گا۔ کسٹمز والے میرے جاننے والے ہیں۔ کبھی جاتا ہوں تو ان ہی کے کمرے میں بیٹھتا ہوں آپ بالکل فکر نہ کریں اور وہ کوئی ایسی چیز بھیجیں گے بھی نہیں۔ بس یہی.... وہاں کا کوئی تبرک، اس کو لانے میں آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

تبرک لانے میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کا انداز اور لہجہ تبرک سے بہت زیادہ اہم کسی چیز کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے کار ایک طرف روک دی اور کہا۔

"حاجی صاحب آپ مجھے حج پر بھیج رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کا اتنا چھوٹا سا کام کرتے ہوئے ہچکچاؤں گا۔ مگر خدارا صاف بتائیے اگر اس پیکٹ میں کوئی قیمتی چیز ہو تو میں اس کی مناسب حفاظت بھی کروں۔ ایسا نہ ہو کہ انجانے میں کہیں میں مارا جاؤں۔"

حاجی صاحب ہنسے۔ بہت میٹھی نقرئی سی ہنسی۔ میرے بازو پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بولے "صاحبزادے تم میرے اندازے سے بہت زیادہ عقلمند ہو۔ ہاں تو تم سمجھ گئے۔ بس یہی ذرا سا کام ہے اور میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس میں تمہارے لئے قطعی کوئی خطرہ نہیں، نصف فیصد بھی نہیں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

میں نے کہا: "بس جی صاحب شکریہ، میں اس شرط پر حج کرنے کو تیار نہیں، آپ جا سکتے ہیں"۔ میں نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ حاجی صاحب کچھ دیر مبہوت سے بیٹھے رہے۔ پھر کار سے اتر پڑے، گھوم کر میری طرف آئے اور بولے۔ "تم میرے اندازے سے بہت زیادہ بے وقوف ہو۔ تم سے زیادہ عقلمند اور ہوشیار تو تمہاری دادی ہیں جنہوں نے مجھ سے کہا تھا۔" بھیا تو مجھے حج کروا دے باقی تیرے دین سے مجھے کوئی مطلب نہیں، اس کا عذاب ثواب تیری گردن پہ"۔

میں بھپٹ کر اترا۔ اس فرشتہ صورت کی سفید نورانی داڑھی والی ٹھوڑی پر ایک کر جمایا اور پھر اطمینان سے کار میں بیٹھ کر گھر آ گیا۔ اس دن کے بعد میں نے گھر کے ہر شخص سے بات کرنی چھوڑ دی۔ گھر کی طرف کا دروازہ کیلیں ٹھوک کر بند کر دیا اور باہر کا دروازہ کھول لیا۔ میں اس راستے کمرے میں جاتا اسی طرف سے باہر نکل جاتا۔ امی کئی مرتبہ آئیں، انہوں نے پوچھنے کی کوشش کی کہ کیوں میں اتنا تنہائی پسند ہو گیا ہوں مگر میں ان کو کچھ نہ بتا سکا۔ دادی بھی آئیں، ابو بھی آئے البتہ باجیوں میں سے کوئی نہ آیا، آتے جاتے تم RELIGIOUS FANATIC کا لفظ میرے کان میں پڑتا رہا۔ میرا کھانا کمرے میں رکھ کر چھوڑ دیا جاتا۔ جس وقت دل چاہتا میں ٹھنڈا یا گرم کھا لیتا۔ اگر نہ کھاتا تو دوسرے وقت وہ کھانا اٹھا کر تازہ کھانا رکھ دیا جاتا۔ نوکر مجھ سے قطعی کوئی بات نہ کرتے۔ شاید وہ بھی مجھے پاگل سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس طرح دونوں وقت مجھے کھانا پانی ڈال جاتے جیسے ٹائیگر کو ڈالتے تھے۔

میں بہت شدت سے یہ گھر چھوڑنے کی سوچ رہا تھا مگر میرا ٹھکانہ کہاں تھا۔ دوستوں سے میں پہلے ہی منہ موڑ چکا تھا۔ میں نے سوچا مسجد کے ملّا سے بات کرتا ہوں، خدا کا گھر ہے، اس کو بھی کرایہ دینا نہیں پڑتا جب تک کوئی اور انتظام نہ ہو وہاں پڑا رہوں گا مگر ملّا نے یہ ملا کہا کہ مسجد بھی ایک سلطنت ہے۔ جس طرح ایک سلطنت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اسی طرح ایک حجرے میں دو ملّا نہیں رہ سکتے۔ میں نے اسے شیخ سعدی کی ایک گدڑی میں کئی درویش سمانے والی حکایت سنائی مگر وہ بولا کہ یہ وہ زمانہ نہیں۔ چنانچہ میں پھر اپنے گھر کے حجرے میں واپس آیا۔ اب میں نے نماز پڑھنی بھی چھوڑ دی تھی۔ کالج جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن منہ پیٹے کمرے میں پڑا رہتا یا مجذوبوں کی طرح سڑکوں پہ آوارہ گردی کرتا رہتا۔ میں سوچتا خدا ایسی خدا پرستی سے بھی دور ہی رکھے جس میں انسان گناہوں کے طوفان میں اس لئے بہہ جائے کہ اس کا رحم و کرم بے حد و بیکراں ہے ——

پھر ایک دن بالکل ٹی وی کی انگریزی فلموں کی طرح مجھے گھسیٹ کر ایک کار میں ڈالا گیا اور ایک بالکل انجانی جگہ لے جایا گیا۔ جس وقت میں خود کو سینٹ کی طرح ہر آفت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر رہا تھا دروازے کا پردہ ہٹا کر وہاں ایک شخص آیا۔ وہ ذاکر تھا۔ میرا پرانا دوست جس کے جبڑے پر پہلے پہل میں نے مشقِ ستم کی تھی۔ اس کے تیور کچھ اچھے نہیں تھے مگر آتے ہی اس نے میری ناک پر مکہ نہیں مارا بلکہ خاصی نارمل آواز میں بولا۔

"تم نے میرے ساتھ زیادتی کی تو میں نے کچھ نہ کہا مگر جس طرح تم اپنی دادی کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے میں بھی اپنے والد کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ہم نے کہا کہ تمہارے والد اور تمہاری دادی اسمگلنگ کرتی رہی ہیں۔ اگر ہم نے کہا کہ تمہاری بہنیں پیشہ کرتی ہیں۔ اگر ہم نے کہا کہ تمہاری ماں خود بیٹیوں کو جگہ بہ جگہ لے کر جاتی ہے تو اس میں ایک لفظ بھی غلط نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تم اس بات کی تصدیق کر لو۔"

یہ کہہ کر اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے ایک کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کمرے کے پردے کھنچے ہوئے

تھے اس لیے پہلی نظر میں مجھے وہاں اندھیرا لگا لیکن فوراً ہی مجھے اندازہ ہوا کہ کونے میں رکھے ہوئے پیڈسٹل لیمپ میں کم طاقت کا ایک بلب روشن ہے۔ اس لیمپ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ پلنگ پر ایک لڑکی لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے بدن پر کچھ نہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ میں نے اس کے منہ پر سے تکیہ کھینچ لیا۔ وہ عروج باجی تھیں۔ بہنوں میں سب سے چھوٹی جو معلوم ہوتا تھا۔ بی۔ اے میں ٹاپ کرنے کی فکر میں ہیں۔ ان کے علم کی پیاس بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ انگریزی پڑھنے ایک لیکچرر کے پاس جاتی تھیں اور فلاسفی پڑھنے دوسرے کے پاس۔ وہ راتوں کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر پڑھنے پر اصرار کرتی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں اس کم بخت گھر میں کوئی ایسی ٹھکانے کی جگہ نہیں تھی جہاں آدمی دو گھڑی سکون کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ لے۔

باجیوں نے، امی، ابو اور دادی نے یہ سب بتدریج برداشت کر لیا ہو گا۔ شاید وہ سب آہستہ آہستہ اس خوفناک دلدل میں دھنستے چلے گئے ہوں گے۔ مگر ذاکر اور اس کے حاجی باپ نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میرے لئے یہ سب کچھ برداشت کر لینے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ شاک بے حد اچانک اور بے انتہا سخت شاک میں پلٹا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ اتنی دیر میں وہ پلنگ کی چادر گھسیٹ کر اوڑھ چکی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کا گلا دبا دیا۔ پھر لپک کر تکیہ اس کے منہ پہ رکھ دیا۔

جس وقت میں نے دروازہ کھولا وہ باہر سے بند نہیں تھا۔ میرے دروازہ کھولتے ہی ذاکر اندر آیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کے شیطانی ذہن میں کیا تھا مگر عروج باجی کی طرف دیکھتے ہی اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ تیزی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا وہ پھر باہر چلا گیا۔ میں سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کتنی صدیاں، کتنے زمانے، کتنے جگ بیت گئے۔ اب کے جو شخص اندر آیا وہ حاجی کچھ دین تھا جس کا صحیح نام مجھے آج تک معلوم نہیں ہوا۔ شاید وہ ذاکر کا باپ تھا۔ اس نے بے حد کاروباری انداز میں اندر قدم رکھا، کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری حالت کا اندازہ کر رہا ہو پھر نہایت سپاٹ لہجے میں بولا۔

"تم نے یہ اچھا نہیں کیا مگر خیر اس وقت یہ بحث بے کار ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں خود کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "تم ایسا نہیں کرو گے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں تمہیں بچا لوں گا۔ لو یہ پکڑو..... یہ تمہارا پاسپورٹ ہے۔ یہ دوسرے کاغذات ہیں۔ آج سے تمہارا نام وہ ہے جو اس پاسپورٹ میں درج ہے۔ تم سرحد تک پہنچتے پہنچتے اپنے بال اور داڑھی بڑھا لینا پھر اس شخص کے اور تمہارے حلیے میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ہم ایسے سینکڑوں پاسپورٹ چلاتے رہتے ہیں۔ تم اپنی گاڑی چھوڑ جاؤ، باہر ایک اور کار کھڑی ہے تم وہ لے جا سکتے ہو۔ یہ اس کی چابی ہے اور یہ بٹوہ اس میں پیسے ہیں۔ تم طورخم پہ سرحد پار کر کے افغانستان جا سکتے ہو اور پھر تمہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ افغانستان میں تمہیں جس جگہ جانا ہے اس کا پتہ بھی بٹوے میں موجود ہے۔ میں تم سے وہیں رابطہ قائم کر دوں گا۔ نعش کی تم فکر نہ کرو..... وہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں بے ہوش تو نہیں تھا مگر ہوش میں بھی نہیں تھا۔ شاید ٹرانس میں تھا۔ وہ مجھے پکڑ کر کار تک لایا، کار میں بٹھایا۔ چابی گھمائی اور کہا۔ "بس اب چلے جاؤ۔ دیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہائی وے سے چلے جاؤ وہاں گاڑی تیز چل سکتی ہے مگر ابھی کچھ دیر آہستہ چلانا، تم ہوش میں نہیں ہو۔

عامل کے حکم پر جس طرح معمول کام کرتا ہے میں نے کچھ پہ پاؤں رکھا اور کار گیئر میں ڈال دی۔

دریا کے پار میلوں کی مسجد کے مینار سے اذان کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ کالے بادلوں کے سائے میں اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چند مقامی لوگ کندھے پر چادریں ڈالے نماز کے لئے جا رہے ہیں۔ آس پاس کوئی جھونپڑا یا پل نظر نہیں آ رہا ہے مگر اس کی کیا ضرورت ہے میں اگر چاہوں تو اس نرم نرم دوب پر بھی نماز پڑھ سکتا ہوں۔ مقامی لوگوں کو تھوڑی سی حیرت ہی ہوگی کہ جسے وہ غیر ملکی سمجھ رہے تھے اور سارے غیر ملکی ان کے لیے انگریز یا امریکن ہوتے ہیں اور کافر، وہ تو مسلمان نکلا۔ نہیں یہ ان کا ڈر نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کا یہ نیا لینڈ سلائڈ میرے عقیدے کو روندتا ہوا گذر گیا ہے۔ میں ایسی نمازوں سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں جو حاجی پڑھتا ہے، جو میری دادی اور میری ماں پڑھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ خدا اب مسجود نہیں رہا، وہ حضوری باقی نہیں رہی۔ وہ اب ایک جج ہے۔ انسان جج سے انصاف کی توقع کرتا ہے اس کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتا۔ اگر وہ سچا جج ہے تو آپ سے آپ انصاف کرے گا۔ گھٹنے ٹیک کر انصاف کی بھیک مانگ کر اپنی قدر گرانے سے فائدہ ......

دوسرے دن ایک چھوٹی سی جگہ سے میں نے کراچی سے چھپنے والا ایک اُردو کا اخبار خریدا۔ اس میں میری اور عروج باجی کی تصویر تھی اور ہماری کار کی جو پیراڈائز پائنٹ پر لاوارثوں کی طرح کھڑی تھی۔ پولیس کو وہ اسی جگہ ملی تھی مگر ہم دونوں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ قیاس تھا کہ ہم دونوں پکنک کے لئے یہاں آئے، پانی میں اترے اور جیسا کہ کئی سال سے برابر ہو رہا ہے پانی کے درمیان چھپے ہوئے خطرناک گڑھوں میں خود کو سنبھال نہ سکے اور بہ گئے۔ کوشش کے باوجود ہماری لاشیں نہ مل سکیں۔ خیال ہے کہ شاید ہمارے ساتھ کچھ اور لڑکے لڑکیاں بھی ہوں۔ اخبار میں اپیل کی گئی تھی کہ اگر ایسا تھا تو ہمارے ساتھی سامنے آئیں اور اس حادثے پر روشنی ڈالیں۔ میں حاجی اور ذاکر کی چالاکی پہ حیران رہ گیا۔ ایک چھوڑ دو آدمیوں کو کتنی آسانی سے انہوں نے سمندر میں بہا دیا تھا۔ ہمارے ہاں اوّل تو ویسے ہی پولیس کون سی بڑی بھاری تفتیش کرتی ہے اگر کرنے پر تل ہی جائے تو حاجی جیسے لوگوں کے پاس انکا منہ بند کرنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ گھر والوں کو اصل بات بتا کر بھی خاموش کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں بیٹے کے ہاتھوں بیٹی کی موت پر وہ منہ نہ سئیں گے تو کیا اسے الم نشرح کریں گے۔ اوہ، ہمارے ہاں کیسے کیسے اعلیٰ دماغ اور اختراعی ذہن موجود ہیں۔ کیا دنیا میں بہت کچھ کرنے والے ان سے زیادہ ذہین ہوں گے ...... فرق صرف اتنا ہی تو ہے کہ ہمارے ہاں کے لوگوں نے جب بھی کوئی اعلیٰ بات سوچی مجرمانہ ذہنیت اس میں شامل رہی۔ ذہنیت مجرمانہ رہی۔ اگر یہی لوگ ملک کے لئے کوئی مثبت کام کرنے کھڑے ہو جاتے تو ......

تو اب سجاد عظیم مر چکا ہے۔ سمندر میں بہ کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہے۔ اب صرف ٹیلر اسمتھ باقی ہے جو انگلستان کا رہنے والا ہے اور سیاحت کے لیے پاکستان آیا ہوا ہے۔ اس کے بال بھورے، آنکھیں بھوری، رنگ سفید قد پانچ فٹ گیارہ انچ اور دائیں گال پر ایک تل ہے۔ دائیں گال پر تل یا کوئی ہلکا سا نشان میرے بھی موجود ہے جسے تل بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ تو اب میں ٹیلر اسمتھ ہوں اور چاہوں تو افغانستان کے راستے انگلینڈ تک جا سکتا ہوں۔ میں نے راستے میں بال اور داڑھی بڑھا لی ہے۔ میں خواہ مخواہ بھی بڑے شہروں سے بچ کر چلتا ہوں اور گاؤں میں اپنے پیٹ کی دوزخ بھرتا ہوں۔ لوگ مجھے غیر ملکی سیاح ہی سمجھ رہے ہیں جو میں سے اکثر ویسے بھی سنکی ہوتے ہیں، کم از کم ہمارے گاؤں والوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ مجھے انگریزی مارکہ اردو بولنے کی اچھی خاصی مشق ہو گئی ہے۔ پنڈی سے پشاور جاتے ہوئے

میں اپنا ارادہ بدل لیتا ہوں اور پشاور جانے کے بجائے سوات کی طرف مڑ جاتا ہوں۔ آخر میں ایک غیر ملکی سیاح ہوں اور سوات دیکھے بغیر پاکستان کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ سیدو شریف میں بھی کسی ایسے ہوٹل میں نہیں ٹھہرا جہاں غیر ملکی ہوں۔ میں ان کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں انگریزوں کے لہجے میں انگریزی نہیں بول سکتا اور میں انگلستان کے بارے میں سوائے روایتی باتوں کے اور کچھ نہیں جانتا۔ میں وہاں ایک ایسے معمولی ہوٹل میں ٹھہرا جس کے باہر لکھا تھا: "رہائش کا اعلیٰ انتظام" اور اس سے بھی جلی حروف میں درج تھا "فلش سسٹم"۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے ہوٹلوں میں صرف سسٹم ہوتا ہے فلش نہیں ہوتا کیونکہ پانی بالٹیوں میں بھر کر دریا سے لایا جاتا ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے میں نے غیر ملکیوں کو بڑے بڑے تھرڈ کلاس ہوٹلوں بلکہ بان کی چارپائیوں والی سراؤں میں سوتے دیکھا ہے۔ اسی لیے میرے ایسے ہوٹلوں میں ٹھہرنے سے کسی کو تشویش نہیں ہوئی۔

میں وادیٔ سوات کے آخری سرے تک ہو آیا ہوں۔ کالام سے بارہ میل آگے ایک جگہ جہاں دریا اور سڑک ایک ہی سطح پہ برابر برابر بہتے ہو تھا میرا جی چاہا میں یہیں رہ پڑوں۔ چیڑ کا سایہ سر پہ، پاؤں برف سے پانی میں، اور ایک قدم پہ سڑک۔ یہ ایسا منظر تھا جو ہر جگہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ دریا کی سطح اتنی ہموار، بھی کہ معلوم ہوتا تھا پانی گھاس کے قطعوں میں لوٹیں لگا رہا ہے اور چند قدم پہ پتھروں سے سر ٹکراتا اتنا پر شور بھی معلوم ہوتا تھا سچ مچ پاگل ہو گیا ہے، مارے غصے کے جھاگم جھاگ ہو رہا ہے۔ کیوں نہ یہیں کسی ایسے چیڑ کے سائے میں ایک جھونپڑا یا ڈال لوں جس کی جڑیں پانی میں ہوں اور شاخیں سڑک پر۔ اس سڑک پر ترقی یافتہ دنیا سے کم ہی کوئی آتا ہے مگر آج کل کہیں بھی جھونپڑی ڈال کر رہنا اتنا آسان کہاں ہے۔ مقامی لوگوں کو فکر ہو جائے گی۔ وہ طرح طرح کے سوال پوچھیں گے۔ ایک غیر ملکی سوات میں ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگا۔ اچھی کہانی ہے۔ اخبار نویس آ دھمکیں گے چلو اس بہانے اخبار کے خرچ پر سوات کی سیر ہو جائے گی۔ یہ ہفت روزے خدا ان سے بچائے۔ ان کو لوگوں سے انٹرویو لینے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ جا کر میرے اور عروج باجی کی موت پہ گھر والوں سے انٹرویو لے آئے۔ حسن ابدال کے بس اسٹینڈ کے ایک اسٹال سے میں نے یہ ہفت روزہ خریدا تھا۔ اُف کیا غلط بیانیاں تھیں اس میں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری دادی اماں میرے ابو، میری امی اور میری باجیاں اتنے زبردست جھوٹ بول سکتی ہیں اور اتنی بے داغ ایکٹنگ کر سکتی ہیں۔ میں ان کے اس ہنر پہ عش عش کر اٹھا تھا۔ مجھے خود شک ہونے لگا تھا کہ میں اور عروج باجی وہ معصوم فرشتے تھے جو راہ بھول کر اس گھر میں پیدا ہو گئے تھے، اور بظاہر ہمیں اتنی جلدی اُٹھا لینے کی کوئی وجہ نہیں تھی سوائے ہماری پاکیزگی اور فرشتہ سیرتی کے۔ میں نے وہ رسالہ اسی وقت دریا میں بہا دیا تھا مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا کروں۔ میں کہیں ٹک نہیں سکتا یہ بات طے ہے۔ میرے مقدر میں منزلیں نہیں صرف راستے ہیں۔ سیدھے سپاٹ راستے، اونچے نیچے راستے اور پر پیچ راستے۔ ابھی سے میری زندگی اتنی دشوار ہو گئی ہے تو آگے کیا ہو گا۔ کیا میں اس زندگی کو از سرِ نو شروع کرنے کی ہمت رکھتا ہوں۔ کیا نام اور شخصیت بدل جانے کے بعد میں اس ملک میں رہ سکتا ہوں؟ میں اس ملک سے باہر جانا نہیں چاہتا۔ کسی نئے ملک میں جا کر میں کیا کروں گا جہاں کوئی چڑیا کا بچہ بھی مجھے نہیں جانتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں بھی میں اپنے عزیزوں اور جاننے والوں میں سے کسی کے پاس نہیں جا سکتا مگر اب اس کا کیا ہو کہ اپنے دیکھے بھالے دیس کی ہر مٹی آشنا، ہر گلی جانی پہچانی ہر شخص دوست سا لگتا ہے۔ میں ان کے لیے بدیسی بنا ہوا تھا مگر میں انھیں خوب جانتا تھا۔ میرے دیس کے یہ محنتی بھولے بھالے لوگ غیر ملکیوں کو بھی ایک لوٹا لسی اور مٹھی بھر مکئی کے دانوں سے کبھی محروم نہیں کریں گے چاہے میں کسی گھر پہ دستک دوں۔ میں افغانستان میں، انگلستان میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں جا کر کیا کروں گا۔ مگر میں بے نام و نشان کب تک پھروں گا۔ ہر شخص ایک نام چاہتا ہے۔ اس نام سے وابستہ کوئی جگہ چاہتا ہے اگر میرے لئے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں ہے تو کہیں تو ہو گی۔ مگر میں سرحد پار

کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اگر وہاں کسی کو میرے پاسپورٹ پر شک ہو گیا تو۔ اپنے ملک سے باہر جانے کی کوشش کرنا ایسے سمندر میں چھلانگ لگانا ہے جہاں شروع سے آخیر تک خطرہ ہی خطرہ ہے۔ پھر وہ حاجی جو میرے راز کا محرم ہے کیا مجھے چھوڑے گا۔ اگر میں افغانستان نہیں پہنچا تو وہ مجھے یہاں تلاش کرے گا۔ اس سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہے۔ اور اگر میں اس کے ہتھے چڑھ گیا تو اسی پاتال تک پہنچوں گا جس سے نکلنا ناممکن ہو گا۔

پھر میں کیا کروں۔ میرے لئے کیا چارہ ہے۔ کیا اس مشکل کا کوئی حل نہیں ہے۔ ایک بہت اچھا خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ کیوں نہ اس جگہ سے کار سمیت کود پڑوں جہاں سے چند سال پیشتر ایک پوری بس دریا میں گر کر میلوں بہتی چلی گئی تھی۔ اس جگہ کو ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی کیونکہ اب وہاں حادثے میں مرنے والوں کی یاد میں ایک بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ کام سے کر کر دنے کے لئے وہ بے مثال جگہ ہے۔ سینکڑوں فٹ سے کار سیدھی پتھریلے دریا ہی میں گر سکتی ہے کیونکہ راستے میں اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اتنے اوپر سے گرنے کے بعد کار کے یا آدمی کے بچ جانے کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے۔ سجاد عظیم کے مرنے کے بعد اب ٹیلرا سمتھ کو بھی مر ہی جانا چاہیے جبکہ دنیا میں اس کے لئے کہیں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

اب میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔ میں کوئی وصیت نہیں چھوڑنا چاہتا، کوئی انکشاف نہیں کرنا چاہتا، کوئی اعتراف نہیں کرنا چاہتا ان کاغذوں پر جو کچھ میں نے لکھا ہے، میرے اور کار کے ساتھ یہ بھی جل کر راکھ ہو جائے گا یا دریا کے پانی میں مل کر نیست و نابود ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ میری زندگی کا آخری پڑاؤ ہے اور وہ حادثہ آخری لینڈ سلائڈ ہو گا۔ چھوٹی لڑکی ایک اپنے سے بھی چھوٹی لڑکی کو لے کر آ گئی ہے۔ دونوں مجھے حیرت اور خوشی سے دیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے مکئی کے بھنے ہوئے دانے میری طرف بڑھائے ہیں جو میں نے بڑے شوق سے لے لیے ہیں۔

لینڈ سلائڈ کو دبا کر، چپکا کر، موٹے پتھروں کو ہٹا کر قابل گزر بنا دیا گیا ہے۔ ایک ایک کر کے گاڑیاں چھینٹے اڑاتی اس پر سے گزر رہی ہیں۔ لوگوں کے چہرے مارے خوشی کے سرخ ہوتے جا رہے ہیں جیسے وہ جیل سے چھوٹ کر جا رہے ہوں۔ سب کو کہیں نہ کہیں پہنچنے کی جلدی ہے مگر مجھے کوئی جلدی نہیں ہے کیونکہ مجھے کہیں جانا ہی نہیں ہے۔

ساری گاڑیاں گزر گئی ہیں۔ اب دوسری طرف سے بھی بسیں اور کاریں آنا شروع ہو گئی ہیں۔ لوگ حیران ہیں یہ کون پاگل ہے جو سڑک ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی اخروٹ کی چھاؤں میں بیٹھا مکئی کے دانے چبا رہا ہے غیر ملکی خبطی سیاح۔ مگر میرا خدا جانتا ہے کہ نہ میں غیر ملکی ہوں اور نہ سیاح۔ میں خبطی بھی نہیں ہوں۔ صرف ہمت باندھ رہا ہوں ...... مرنا اتنا آسان بھی تو نہیں ہے۔

---

# میں کیا ہُوں

## وقار بن الٰہی

گھنی سردیوں کی شام تھی جب اچانک پل بھر میں کسی بیوہ کے دُکھوں کی طرح سیاہ بادل گھر آئے۔ بجلی دو چار مرتبہ تیزی سے چمکتی لپکی اور پھر گونج سنائی دیتی رہی۔ ساتھ ہی تیز ہوا چلنے لگی، در بند کھڑکیوں اور دروازوں میں سے یُوں سی سی کر کے اندر آنے لگی جیسے ایک نہیں، بہت سے ارمان ایک ساتھ سسک رہے ہوں۔ بادل ایک مرتبہ اور گرجے اور ساتھ ہی موٹی بوندیں پہلے سست اور پھر تیزی سے برسنے لگیں۔ میں دو چار لمحے یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور سب کچھ سنتا رہا اور پھر اچانک مجھے محسوس ہُوا کہ بجلی کی چمک اور ہوا کی سسکیوں نے یک لخت اداس کر دیا ہے۔ ایک ویرانی ہے جس نے میرے ذہن کو اپنی گود میں بھر لیا ہے۔ ہوا تھم جاتی ہے تو میں کمبل لپیٹ کے باہر برآمدے میں آ بیٹھتا ہوں اور چپ چاپ تیز برستی بارش کو دیکھنے لگ جاتا ہوں۔

میں سوچتا ہوں، یہ اُداسی، یہ بے چینی، یہ ویرانی کوئی نئی بات تو نہیں۔ بچپن کا نہ تو علم ہے اور نہ ہی یاد ہے لیکن جب سے ہوش سنبھالا ہے، اسے ویرانی میں جیسے سکون ملا ہے۔ آج پھر اداس ہوں کیوں؟ اس کا کوئی جواب تو میرے پاس نہیں اور ضروری بھی نہیں کہ ہر کیوں کا آپ کے پاس جواب موجود ہو۔ اس ویرانی سے میں ہراساں یا گھبراتا نہیں۔ جب کبھی سناٹا چھا جاتا ہے اور میرے سارے جسم میں ایک چپ سی تیر جاتی ہے تو پھر مَیں مَیں کا نہیں رہتا۔ رات کتنی ہی تاریک اور ڈراؤنی کیوں نہ ہو، مجھے خوف نہیں آتا لیکن جب کمرے کی روشنی میں میرا اندر تاریک ہو جاتا ہے تو پھر جانے کیوں، کس سے ڈر آنے لگتا ہے۔

سکول کے آخری درجوں کی اگر کوئی بات یاد ہے تو صرف اتنی کہ میں پڑھتا کم اور بینڈ زیادہ بجایا کرتا تھا۔ ڈرم چونکہ بھاری بہت ہوتا ہے، اس لیے کبھی اٹھا نہیں سکا۔ کرسی پہ رکھ کے گھنٹوں بجایا کرتا تھا۔ سکول میں چھٹی ہو جاتی تو ڈرل ماسٹر مجھے ڈانٹتے:

"جا میاں گھر جا — ڈرم سے تو تیرا پیٹ نہیں بھر سکتا۔" ہر روز صبح اسمبلی کے وقت حمد کے بعد میں ڈرم بجاتا، تین چار لڑکے چھوٹے سائیڈ ڈرم بجاتے، ایک معمر شخص بین — ہماری تانوں پر لڑکے گراؤنڈ کا ایک چکر لگاتے اور جماعتوں میں چلے جاتے اور ہم سب لوگ سب سے آخر حاضری لگواتے۔ ایک دن جانے ڈرل ماسٹر کو کیا ہُوا کہ مجھ پہ برس پڑا۔

"تم اس ڈرم کو کھا کے ہی بس کرو گے۔ کل سے تم نہیں، ساجد بجایا کرے گا، سمجھے —" مجھے جانے کیا ہُوا کہ ایک دم دھپ کی آواز آئی اور دیکھا تو — ڈرم کی ایک طرف زور کی ضرب پڑنے سے پھٹ چکی تھی۔ پھر ایک چپ، چپ چاپ میرے ذہن میں گھس گئی اور ایسی گھسی کہ آج تک پیچھا نہ چھوڑا —

سکول سے نکل کے کالج آیا تو یہاں کی فضا مجھے بڑی راس آئی۔ چاروں درجوں میں کوئی پوچھنے والا نہ تھا اور یہاں میری اداسی کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ میں ہمیشہ کھڑکی کے پاس نشست منتخب کرتا اور حاضری کے بعد جب استاد پڑھانا شروع کرتے تو میں جانے کہاں

غائب ہو جاتا۔ کتابیں میرے سامنے رکھی ہوتیں۔ مَیں وہیں بیٹھا ہوتا۔ جماعت کچا کچ بھری ہوتی۔ لیکن مَیں وہاں حاضر نہ ہوتا بلکہ کھڑکی سے باہر سڑک پر بھاگتے بچوں، دوڑتے تانگوں اور گرد اڑاتی لسوں اور موٹروں کو دیکھتا رہتا اور جب نگاہیں تھک جاتیں تو پھر کتاب دیکھنے لگ جاتا۔ لیکن کتاب، کتاب ہونے کے باوجود جانے کیا بن جاتی تھی کہ میرے پلّے کچھ نہیں پڑتا تھا۔

میرے ماں باپ بہت اچھے تھے کہ مجھے بہت پیار کرتے تھے اور میری ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ میرے استاد بہت پیارے تھے کہ ہر وقت میری حوصلہ افزائی کرتے تھے اور میرے دوست تو جیسے میرے ہی جسم کا ایک حصّہ تھے۔ مجھ پہ جملے کستے تھے، طنز کرتے تھے، چھیڑتے بھی تھے اور پھر پیار سے شوخی بھی کرتے تھے۔ ایک کہتا:

"قنوطی جی۔ آج کل کیا حال ہے جناب کی صورت کا ــــ" دوسرا چھیڑتا:

کیوں بھائی فلاسفر۔ ذرا یہ تو بتا، پکوڑے میں آلو کیسے آجاتا ہے۔ نہیں یہ مشکل سوال ہے تم اس کا جواب نہیں دے سکو گے۔ یہی بتا دو کہ یہ بھینسیں کس زاویے سے دیواروں میں بیٹھتی ہیں جوان کا گوبر اُپلے بن کے دیوار پہ چپک جاتا ہے۔" سب کھلکھلا کے ہنستے، میں قہقہہ لگاتا۔ پر بعد میں محسوس ہوتا، یہ قہقہہ تو بہت کھوکھلا تھا۔ کبھی کوئی لنگوٹیا اکیلا مل جاتا تو سرگوشی میں پوچھتا۔

"یار ـ سچ بتا۔ کسی کے نگاہوں کے تیر اگر چل گئے ہیں تو۔ یار! میں علاج بتاتا ہوں اس کا۔" میں اُسے کیا بتاتا اگر بتا بھی دیتا تو میری بات اُس کے پلّے کیا پڑتی۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے سنکی، پاگل یا سرپھرا ہی کہتا۔

مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ ہم بہت سے طالب علم کسی سوسائٹی کے ساتھ سیر کرتے لاہور گئے۔ سٹیشن سے اُتر کے تانگے میں بیٹھے اور پھر جو پہلے ریلوے روڈ اور پھر سرکلر روڈ پہ آئے ہیں تو جانے کیوں مجھے وحشت ہونے لگی۔ اتنا بڑا شہر، اتنے لوگ، اتنا شور تھا، میرا جی چاہا، میں تانگے سے اُتروں اور سرپٹ بھاگتا ہوا اسٹیشن پہنچوں اور فوراً گاڑی میں بیٹھ کے اپنے اُس چھوٹے سے شہر میں چلا جاؤں۔ لیکن اپنی اس حرکت کا مظاہرہ اس لیے نہیں کر سکا کہ ساتھیوں سے ڈر گیا۔ اُن کا پہلا جملہ یہی ہوتا:

"بیچارہ کنوئیں کا مینڈک، سمندر میں آگیا ہے نا۔ اسی لیے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔" میں بھاگا نہیں لیکن مجھ پہ پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ اتنے ہجوم اور اتنے بڑے شہر میں اکیلا، تنہا ہوا کس کو کہتے ہیں۔ ہم وہاں کوئی پانچ روز رہے ہوں گے۔ اس عرصے میں ہم کہاں کہاں نہیں گئے لیکن مجھے ہمیشہ ہنسنے، بولنے کے باوجود لگا، یہ مَیں نہیں ہوں، کوئی اور ہے جو ہنس رہا ہے، جو بول رہا ہے۔ یوں تو پہلی شام ہی اسمبلی بلڈنگ کے پاس کسی جھاڑی کے نیچے چھپ کے بیٹھ گیا تھا۔

تعلیم مکمل ہوئی اور مجھے نہیں معلوم کہ کیسے مکمل ہو گئی اور میں ہر سال کیسے پاس ہوتا گیا، تو نوکری کر لی۔ دو چار برس سرگرم دیکھا، ٹھوکریں کھائیں تو مجھ پہ یہ واضح ہوا کہ ایک گمنام سی خواہش، ایک مبہم سی آرزو مجھے ہر لحظہ، ہر لمحہ، اُداس کیے رکھتی ہے۔ دفتر میں پیدل جاتا تھا اور اسی عرصے میں مَیں نے یہ عادت اپنائی کہ ہمیشہ سر جھکا کے چلنے لگا۔ ہر وقت ایک سوچ میں گم رہتا۔ وہ سوچ کیا تھی اس کا تو مجھے آج بھی علم نہیں۔ سر جھکائے زمین کو دیکھتا، گھورتا رہتا جیسے میرا کچھ کھو گیا ہے۔ کھو تو واقعی کچھ گیا تھا لیکن کیا۔؟ اس کیا کا جواب کہاں سے لاؤں۔ اکثر اوقات اسی کیفیت میں دفتر سے آگے نکل جاتا اور بہت دور جا کے محسوس ہوتا کہ میں کہاں نکل آیا ہوں۔ لوگوں کے چہرے دکھائی ضرور دیتے تھے لیکن میں انہیں دیکھتا نہیں تھا، جیسے ڈرتا تھا کہ یہ لوگ اس راز سے ضرور واقف ہیں جسے مَیں

نہیں کھوج سکا۔

ایک دن گھر آیا تو چند عورتیں اپنے گھر سے نکل کے گلی میں جاتی نظر آئیں۔ وہ تو شکر کیجیے، مَیں نے سر اُٹھا رکھا تھا، ورنہ اُن سے ٹکرانا ضروری تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو امی مجھے بڑی خوش نظر آئیں۔ خوش تو وہ ہمیشہ ہی رہا کرتی تھیں لیکن اُس روز لگتا تھا، انہیں پَر لگ گئے تھے اور سارے گھر میں اڑتی پھر رہی ہیں۔ مجھے دیکھا تو پہلے ہنسیں، پھر میرے گال چومے اور مجھے سینے سے لگا کے بولیں۔

"میں تیری چپ نہ توڑ سکی لیکن اب دیکھنا تیرا کیا حلیہ بنتا ہے۔ وہ کٹورہ جیسی مسکراتی آنکھوں والی جب اس صحن میں آئے گی تو تیری باچھیں آپ ہی آپ چرجایا کریں گی۔" باچھیں تو مَیں اب بھی چیرا کرتا تھا لیکن جیسے مجبوری کے عالم میں۔ ماں کی بات سُنی تو جانے مجھے کیا ہُوا کہ میں جو دفتر سے کچھ کا پروگرام بنا کے آیا تھا، اپنے اندھیرے اور ٹھنڈے کمرے میں جا گھسا۔ بستر پہ لیٹ کے ایک پنڈلی کے اوپر دوسری اور ایک پاؤں پہ دوسرا پاؤں رکھا اور آنکھوں پہ بازو رکھ کے آنکھیں بند کریں۔ ایک سرد سا سناٹا میرے سارے جسم میں تیر گیا اور تیز روشنی کے باوجود میں نے سوچا، کس قدر تاریکی پھیل رہی ہے۔

میری بیوی بھی عجیب عورت نکلی۔ ہر بات پہ ہنسنا، ہر بات پہ کِھل کھلا جانا اور مسکراہٹ تو جیسے اُس کے قبضے میں ہی نہ تھی۔ گھر گھستا تو بڑوں کو سامنے دیکھ کے اس کے لب نہ پھیلتے۔ گال مسکرا اٹھتے۔ لبوں کے گوشوں سے مسکراہٹ کی خوشبو پھوٹ پڑتی اور نگاہیں جیسے مسکراہٹ بن کے میرے دل میں اُتر جاتیں۔ ماں کو سلام کرتا اور پہلا سوال یہی پوچھتا:

"آپ کی بہو دکھائی نہیں دے رہی امی؟" وہ ہنس دیتیں۔

"شیطان کہیں کا۔ ارے تجھے اب سب سے پہلے میری بہو کے پوچھنے ہی کی کیوں ضرورت محسوس ہوتی ہے؟" میں اُن کے پاس بیٹھ کے اُن کے گھٹنے تھام لیتا اور پھر ان کی بہو چھوٹے چھوٹے قدموں سے صحن میں نکل آتی اور مجھے یُوں محسوس ہوتا جیسے میری نگاہیں اُس کے راستے میں بچھ گئی ہیں جیسے میری دھڑکنیں اس کے قدموں سے لپٹ گئی ہیں جیسے اس کا ہر سانس خوشبو کے سارے آنگن میں بکھر گیا ہے۔ جیسے اس کی نگاہوں کے چراغوں کی لَو سے سارا گھر جگمگا اٹھا ہے۔ ہم لوگ کمرے میں جاتے تو وہ بڑے پیار سے کہتی۔

"ذرا چہرہ تو اِدھر کیجئے۔ دیکھوں، کیا وقت ہو رہا ہے؟" میں چہرہ اس کی طرف کر لیتا۔

"اوہو، آج تو سوا گیارہ بج رہے ہیں۔"

مَیں نے آپ سے پہلے کہا ہے نا کہ یہ عورت بھی عجیب نکلی کہ مَیں مسکرایا تو جیسے اُس کے چہرے پہ بہار آ گئی۔ مَیں ہنس دیا تو وہ جیسے جھُوم اٹھی۔ میرا چہرہ مُرجھایا تو اس کے چہرے کے سارے پھول جیسے تیز آندھی کا شکار ہو گئے اور میں نے افسردہ سی نگاہوں سے اُسے دیکھا تو جیسے بادلوں کی ساری سیاہی اس کے چہرے پہ اُتر آئی۔ اس نے میری راہوں کے کانٹے اپنی پلکوں سے چُنے اور میرے آبلوں کو اپنے لبوں سے سہلایا اور پھر ایک دن کمرے میں بیوی کے پاس بیٹھے، اپنے بچوں سے کھیلتے ہوئے اچانک مَیں نے سوچا:

پانچ برسوں سے یہ عورت میرے کس قدر قریب ہے لیکن آج — یہ میرے لیے اجنبی کیوں ہے، میں اپنے آپ کو اکیلا کیوں پا رہا ہوں؟" اور پھر وہی آواز اپنے پر پھڑپھڑاتی ہوئی میرے ذہن کے ویران کمروں میں گونج اٹھی۔

"سب ڈھکوسلا ہے"

دوسری صبح وہی میں تھا، وہی میری اُداسی اور ویرانی اور وہی ایک اُلجھن کے حل نہ ہونے کی خلش۔ میں سوچتا، میں کس چکر میں اُلجھ گیا تھا۔ یہ دُنیا، یہ تو سب دھوکا اور فریب ہے۔ یہ پانچ برس میں کہاں بھٹکتا رہا جو مجھے سکون نہیں مل سکا۔ آج کسی ویران کھنڈر کی طرح اُجڑا اُجڑا الگ رہا ہوں تو تنا سا مرد رل رہا ہے۔

وہ نیک بخت دو چار روز میرے چہرے کی گھڑی پہ وقت دیکھتی رہی۔ اپنے دل کو مسل کے مجھے ہنسانے کی کوشش کرتی رہی اور جب اس نے دیکھا کہ وہ تو دیوار سے سر پھوڑ رہی ہے تو اس نے اپنے آپ کو بچوں میں گم کر دیا۔ لیکن کبھی کبھار بے مقصد میری نگاہیں اس کے چہرے سے جا لگراتیں تو مجھے محسوس ہوتا کہ اس کا چہرہ تو دُکھ کی گھنی چھاؤں میں اتر گیا ہے۔ پر میں اس سے کیا کہتا: آخر کیا کہتا۔

اب جب کبھی دفتر میں بیٹھے بیٹھے میں کھو جاتا اور دفتر، لوگ، سڑکیں، شہر سب کچھ غائب ہو جاتا تو میں دو چار روز کی چھٹی لیتا اور بغیر سامان کے سفر پر نکل کھڑا ہوتا۔ بیوی لاکھ اصرار کرتی لیکن ایک کمبل بھی جیسے پہاڑ لگتا۔ پھر کسی تیز رفتار گاڑی میں آ بیٹھتا مجھے تیز رفتار گاڑیوں سے ہمیشہ عشق رہا ہے۔ نوکری کے ابتدائی دنوں میں تقریباً ہر رات ایک بجے اٹھ کے سٹیشن جایا کرتا تھا کہ اس وقت وہاں سے ایک میل گزرتا تھا اور اُسے اس تیزی سے دگا ڈگ کا ساز بجاتے دیکھ اور سن کے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ غور کرتا تو محسوس ہوتا، شاید میری زندگی میں جمود رہا ہے، اسی لیے تیز رفتار گاڑیاں مجھے پسند ہیں۔ لیکن یہ وضاحت تھوڑی دیر کے لیے تو دل کو تسکین دیتی لیکن پھر وہی بے نام سی بے چینی گھیر لیتی۔ گاڑی میں بیٹھ کے میں کسی چھوٹے سے سٹیشن پہ اُتر جاتا اور ویرانوں اور صحراؤں میں چل کے جب کسی ڈاک بنگلے پہنچتا تو تھکن سے چور چور ہوتا۔ چوکیدار زرد سی لالٹین جلاتا اور میں چارپائی پہ گرتا تو کمرے میں بند جھینگر روشنی دیکھ کے ایک دم چیخنے لگ جاتے اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے چند ایک میرے ذہن میں آ بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ کیفیت تھوڑی دیر رہتی اور مجھے ایک مدت بعد بڑا سکون ملتا اور میں لمبی تان کے سو جاتا۔

صبح اُٹھتا تو فوراً باہر نکل جاتا اور ریت میں حیرت سے اُن ننھے ننھے گڑھوں کو دیکھتا اور ڈھونڈتا، جو گذشتہ شام میرے پاؤں نے بنائے تھے اور جو اس وقت غائب ہو چکے تھے۔ یا ان ٹیلوں کو تلاش کرتا جو کل شام تو تھے لیکن صبح ہوتے ہوتے جانے کہاں چلے گئے تھے۔ یہ نشان اور یہ ٹیلے پہلے کسے ملے ہیں، جو مجھے مل جائیں گے۔ میں جلد ہی وہاں سے بھاگ آتا۔

ایک صبح اٹھا اور دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا تو بڑا بیٹا قریب آ بیٹھا۔ میری شلوار پکڑ کے اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن مارے جھجک کے کچھ کہہ نہیں پا رہا۔

"ابو —— آپ آج ہمارے سکول کے پاس سے گزریں گے نا؟"

"کیوں بیٹے! کیا بات ہے؟"

"بس آپ آج اسی راستے سے دفتر جائیے گا۔" میں نے غور سے اُسے دیکھا تو خاصی حیرت ہوئی کہ یہ اتنا بڑا ہو چکا ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔ سکول کا راستہ ذرا دُور تھا۔ لیکن بچے کی خوشی کے لیے گھر سے نکلا تو اسی راستے پہ ہو لیا۔ قریب پہنچا تو اسمبلی ہو چکی تھی اور بچے اب پیریڈ کی تیاری کر رہے تھے۔ بینڈ بجنا شروع ہوا تو سب باری باری گراؤنڈ کا چکر کاٹنے لگے اور پھر اچانک

میرے ذہن میں مجھے ٹھوکا دیا۔

"یہ ڈرم کون بجا رہا ہے —؟ یہ تو تم ہو — یہ تم ہو — یہ تم ہو — مجھے یہ گونج بڑی عجیب لگی۔ آگے بڑھ کے سیڑھیاں طے کیں اور بینڈ بجانے والوں کے پاس آ رکا۔ سامنے میرا بیٹا بینڈ بجا رہا تھا۔

"اچھا تو اسی لیے ضد کر رہا تھا یہ —" اس شام گھر پہنچا تو میرے لہجے میں خوشی سے زیادہ تعجب تھا۔

"لو بھئی! کبھی ہم ڈرم بجایا کرتے تھے۔ آج ہمارا بچہ بجا رہا ہے اُسے۔ حد ہو گئی —" اور پھر جیسے یہ جملہ گونج اٹھا۔

"کل تم — آج تمہارا بچہ — کل تم — آج تمہارا بچہ —" میں اس گونج کو سنتا رہا اور جیسے کوئی شے میرے قریب آتے آتے دور ہٹ گئی۔

اس رات میں نے لیٹے لیٹے سوچا۔ میں نے بچوں پہ بڑا ظلم کیا ہے۔ انہیں کچھ بھی تو نہیں دیا میں انہیں ہنسا نہیں سکتا تو کم از کم ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ تو رکھ سکتا ہوں۔ میں نے یہ ہاتھ رکھا۔ اُن کے لیے اپنے آپ کو بدل لیا۔ یہ سوچ کے کہ سوچوں کے سمندر سے تو میں نہیں نکل سکتا کہ یہ میرا سرمایہ ہیں لیکن بچے کیوں اس کا نشانہ ہوں۔ میں نے اُن کے لیے انتھک محنت کی۔ انہیں دنیا کی ہر شے مہیا کر کے دی انہیں باعزت زندگی گزارنا سکھایا اور جب وہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو گئے تو میں نے انہیں دُنیاوی دھندوں میں لگا دیا۔ اس سارے عرصے میں میری جیب میرے ساتھ رہی۔ شکر ہے میرے قدم نہیں لڑکھڑائے، لڑکھڑا جاتے تو میں شاید انہیں کشتی کھے لے جانے کے قابل نہ بنا سکتا۔

ایک شام کا ذکر ہے، ہم سب کمرے میں بیٹھے تھے، باہر سخت سردی پڑ رہی تھی اور کمرے میں آگ روشن تھی۔ جب بھی کوئی لکڑی جلتے ہوئے چٹختی تو جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ آواز میرے اندر سے آئی ہے۔ بیوی دُور بیٹھی کسی نواسے کا موزہ بن رہی تھی۔ بڑے بچے کھیل رہے تھے اور چھوٹا پوتا میرے سینے پہ سوار میری چھاتی کے بال کھینچ رہا تھا اور ہنس ہنس کے پاگل ہوا جا رہا تھا، ساتھ ساتھ اچھل بھی رہا تھا۔

ہے ہے دادا گھولا — ہے ہے دادا گھولا —" میں نے اُسے ڈانٹا۔

یہ کیا کرتے ہو بدتمیز —" وہ پل بھر کے لیے سہا، میرے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کے پھر اُچھلنے لگ گیا۔

"ہاہا۔ دادا ابو بہ تمیض — دادا ابو بہ تمیض —" میں نے اپنے بچوں کو مسکراتے اور باتیں کرتے دیکھا، اُن کے کھیلتے بچوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ جانے کہاں سے اور کیسے اور کون چپکے سے اندر آیا، میرے پاس آ کے سرگوشی میں بولا:

"سب ڈھکوسلا ہے —" میں نے بچے کو اتار دیا۔ منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ آنکھیں بند اور سوچا۔ اس بھرے گھر میں کس قدر تنہائی ہے۔ پھر جیسے سناٹا دبے پاؤں دل میں اُترا، خون میں گھل مل گیا اور ذہن کے نہاں خانوں میں دبک کے بیٹھ گیا۔

دوسرے روز میں نے چھٹی لی اور ایک مدت بعد بس میں بیٹھا مری جا رہا تھا۔ سارے راستے وہ ویرانی، وہ سناٹا میرے ساتھ چلتا رہا۔ وہاں پہنچا تو برف گر رہی تھی۔ ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور انتظار کرنے لگا کب تاریکی بڑھے اور میں باہر نکلوں۔ رات اس تاریکی اور تنہائی میں جب ہر شے نے سفید چادر اوڑھ لی ہو گھومنے میں عجیب لطف آتا ہے یہاں تک کہ لیمپ بھی جیسے سردی سے ٹھٹھر جاتے ہیں اور ان کی روشنی جم

جاتی ہے اور جب یہ سفید چادر دُور دُور تک پھیلی نظر آتی ہے اور ہو کا عالم ہوتا ہے تو میں سوچتا ہوں آج اتنی ویرانی، اتنا سناٹا تو نہیں ہے اور پھر اندر جیسے بہت سے لوگ چلنے پھرنے لگ جاتے ہیں۔

اور اب تو جیسے یہی برف میرے بالوں میں بھی بکھر گئی ہے کہ سب کے سب سفید ہو گئے ہیں۔ میرے اور بیوی کے چہرے پر کسی ریلوے یارڈ کا گمان ہوتا ہے کہ جہاں دُور دُور تک لمبی اور اُلجھی ہوئی پٹڑیاں نظر آتی ہیں، ہاتھوں میں قدرے رعشہ آگیا ہے۔ آنکھوں سے ذرا کم دکھائی دیتا ہے لیکن میری سوچ کی آنکھیں پہلے سے بھی تیز ہو گئی ہیں۔ کمر ذرا سا خم کھا گئی ہے۔ اتنی طویل زندگی کا بوجھ — اور اب تو نوکری بھی ختم ہو چکی۔ اب تو دھوپ تاپتا ہوں یا بیوی کے جھرّیوں بھرے چہرے پر کچھ تلاش کرتا ہوں۔ وہ بھاگوان بھی تو چپ ہو گئی ہے۔ جانے کیوں —؟

اور پھر ابھی چند روز پہلے کا ذکر ہے کہ میں سیر کرتا کرتا سکول کی طرف نکل گیا۔ اس طرف کم آتا ہوں، آنے کو جی نہیں چاہتا، آجاؤں تو پہروں ان بچوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ اس روز جو آیا تو بچے حمد گا رہے تھے۔ مجھے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اُن کی آواز کانوں میں ضرور آرہی تھی۔ حمد ختم ہوئی تو ڈرل ماسٹر نے ہدایات دیں۔ مجھے اپنے سے کچھ فاصلے پر درخت کے نیچے کوئی اور کھڑا دکھائی دیا۔ میں سمجھا میرا ہی کوئی بھائی ہوگا۔ چلتا ہوا اس کے پاس چلا گیا اور پھر پتہ چلا کہ یہ تو میرا اپنا بیٹا ہے۔ یہ کیوں یہاں کھڑا ہے۔ یہ دفتر کیوں نہیں گیا میں نے سوچا، کچھ پوچھنے کے لیے ابھی مُنہ کھولا ہی تھا کہ بچوں نے پریڈ شروع کر دی اور بینڈ کی آواز آنے لگی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا، کچھ دکھائی نہ دیا۔ کان اور کھولے تو جیسے میرے کانوں میں کوئی چلّا اٹھا۔

"یہ تم ہو — یہ تم ہو — ڈرم تم بجا رہے ہو — یہ تم ہو —" میں نے بیتاب ہو کر اپنے بیٹے سے پوچھا:

"یہ ڈرم کون بجا رہا ہے —" بیٹے کے لہجے میں خاصی خوشی تھی۔

"آپ کا پوتا ہے اباجی۔ آج ضد کرنے لگا کہ میں اُسے ڈرم بجاتا دیکھوں، اسی لیے یہاں کھڑا ہوں۔" مجھے چکر سا آگیا۔ جلدی سے بیٹے کا کندھا تھام لیا۔ اور سوچا۔

"کبھی یہ ڈرم میں بجایا کرتا تھا۔ پھر میرے بچے نے اور اب — اب —" اور یک لخت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس شور میں ویرانی نہیں سکون ہے، اُداسی نہیں خوشی ہے جیسے میں نے بھید پا لیا ہے جیسے میں نے ———

---

# جستجو

## نوید انجم

"دونوں چھاتیاں؟ — ہیں؟ ہیں؟" حیرت سے اور افسوس سے رضیہ نے پوچھا۔

"ہاں — ہاں دونوں چھاتیاں ہی" افروز نے دکھ اور اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

"وہ تو کہیں کی بھی نہ رہی ہو گی —" عذرا جو ابھی تک خاموش بیٹھی سن رہی تھی بے اختیار اپنی چھاتیوں پر ہاتھ دھر کر بولی۔ "یہ بھی کوئی زندگی سی زندگی ہے عورت کی — اُف! دونوں چھاتیوں کے بغیر وہ کوئی عورت تو نہ لگتی ہو گی؟!"

"پگلی سرطان کا روگی زندگی کہاں پاتا ہے" افروز نے کہا۔

"ہیں — ہیں؟" رضیہ کی حیرت اور بڑھی۔ "میں پوچھوں دونوں چھاتیوں کے بغیر بھی نہ بچی —؟"

"مرنا تھا تو پھر یہ اپریشن کروانا ضروری تھا کیا؟ ..." عذرا بولی۔

"زندگی تو اللہ کے ہاتھ ہے پر سچی میری تو سمجھ میں نہیں آیا — اُس نے کیسے گوارا کر لیا کہ دونوں چھاتیوں کے بغیر — آخر — آخر کچھ عرصہ تو زندہ رہی ہو گی؟"

"ہاں یہی کوئی سال ڈیڑھ سال" افروز نے سنجیدگی سے کہا۔ "سرطان اور پھر چھاتیوں کا سرطان بڑی سخت بیماری ہے مری جان!"

دونوں سننے والی لڑکیوں نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی۔ ایک دم سے جیسے افروز کی دنیا میں بند دریچے کے پٹ سے کھل گئے۔ دسمبر کی ٹھنڈی ہوا کی ایک لہر اور ساتھ کے گھر میں بجنے والے ریڈیو کی آواز یک دم لہرائی اور اماں نے محبت سے کانوں کو ہاتھ لگا دیے —

"یا الٰہی یہ کن گناہوں کی سزا ہے" دکھ کے مارے اماں کی آواز انتہائی بھاری ہو چکی تھی اور بڑے ابا دم بخود مصلے پر بیٹھے اپنی سفید داڑھی میں الٹے سیدھے ہاتھ لگائے جیسے خلا میں گھور رہے تھے —

افروز کے اپنے دل میں ٹیس سی اٹھی تھی۔ کلیجہ تھامے وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اصغر دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتا ہوا۔ لال بھبھوکا چہرہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں یہ جیسے کسی گہرے سوچ میں ڈوبا تھا۔ بار بار وہ اپنا ہونٹ کاٹتا تھا اور ہونٹ لہو کے رنگ کو نمایاں کرنے لگے تھے۔

"اکبر کو میں نے اللہ کے حوالے کیا تھا" اماں نے یوں کہا جیسے اک لحہ اور خاموش رہیں تو جان نکل جاتی۔ بڑے ابا نے بے خیالی میں سر اٹھایا اور پھر جھکا یا۔

"اماں روئیں نہیں تھیں" افروز نے بعد میں، کئی دنوں بعد جب اسلتے ہوئے لاوے جیسے احساسات ٹھنڈے ہونے لگے تھے اور موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ کالج میں رضیہ کو بتایا تھا۔ "یہ جو آفت ہم پر ٹوٹی ہے اللہ کسی کو نہ دکھائے۔ بس دعا کرو اب اکبر بھیا خیر خیریت سے آجائیں"

"نوے ہزار" رضیہ نے دھیرے سے دہرایا "اتنی بڑی تعداد کوئی منہ سے کہنے کی بات نہیں ہے"

"اور اس بچاری پر کیا گزری ہوگی" عذرا نے جلدی سے بات کی۔

"کون — منو کی بات کر رہی ہو؟" رضیہ نے کہا "وہ تو شکر کرتی ہوگی کہ ابھی بس منگنی ہی ہوئی —"

"کمال کرتی ہو" افروز نے برا مانتے ہوئے کہا "اس کی حالت دیکھ کر تو سبھی پریشان ہیں — بھئی تم بڑی سخت ہو رضیہ — کسی کے احساسات کا تمہیں بالکل خیال نہیں"

رضیہ نادم سی ہوگئی۔

"چھوڑو چھوڑو — اس قصے کو — اماں کا بتاؤ اب کیا حال ہے۔ اکبر کی خیر ملنے پر کوئی بات تو کی ہوگی" عذرا نے بات بدلنے کو کہا۔

"اماں کی کیا پوچھتی ہو — اب تو ان کی آنکھوں میں ساون کی جھڑی لگی رہتی ہے" افروز نے دکھی لہجے میں کہا اور خاموش ہوگئی۔

بات سچی تھی۔ جس نے اپنے ہاتھوں پودے کی آبیاری کی ہو اور کوئی سامنے آ کے جھٹ سے توڑ مروڑ کر دو ٹکڑے کر ڈالے تو کیا حالت نہ ہوگی اور پھر بات پودے کی تھوڑی تھی بات بیٹے کی بھی نہ تھی۔ بات تو ملک کی تھی کہ اماں کی جوانی کا ہر ہر لمحہ ملک کے قیام کی جدوجہد میں شریک لوگوں کی داستانوں کا ایک ورق تھا —

"ہاں تو افروز تمہیں وہ قصہ سناؤں جب میں ہاتھ میں سبز پرچم لیے سب سے آگے آگے نکلی۔ سامنے جو گلی پڑتی تھی ہندوؤں کے گھروں پہ مشتمل تھی، پر مجال ہے جو میرے قدم ذرا سے بھی ڈگمگائے ہوں ....."

اور اب جب دیکھو ان کی آہوں میں یہی سرگوشیاں رچ بس گئی تھیں "یہ قدم کس کے ڈگمگائے تھے — کس کے؟"

"میں بتاؤں دراصل تمہارے چھوٹے بھیا نے بھی ماں باپ کو دکھ دینے میں کمی نہیں کی" ایک دن عذرا نے کہا۔

"نہیں — نہیں ہم تم دراصل اصغر بھیا کو سمجھ نہیں پائے —" افروز نے یقین سے کہا "مجھے اپنے بھائی پر پورا پورا اعتماد ہے"

"لو سن لو" عذرا نے رضیہ کو متوجہ کیا "انہی باتوں نے گھر میں حشر برپا کر رکھا ہے — بوڑھے ماں باپ اپنی جان کو روئیں نہ تو اور کیا کریں گے۔ پھر کس منہ سے اکبر ہمیں کہتی ہو کہ اماں بڑی دکھی ہیں اور بڑے ابا تو بستر سے لگ گئے ہیں"

افروز کا چہرہ اتر گیا "تم جان بوجھ کر انجان بن جاؤ تو میں کیا کہوں۔"

"یہی کہہ دو جو تم کہتی رہتی ہو"

"کیا؟" افروز تنک کر بولی "میں کیا کہتی رہتی ہوں؟"

"یہی کہ بنگالیوں کا استحصال ہو رہا تھا، کب تک صبر کرتے؟"

"تو کیا غلط کہتی ہوں؟"

عذرا بولی "میں خوب جانتی ہوں تمہیں اصغر نے گمراہ کیا ہے"

رضیہ نے چونک کر عذرا کو دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ افروز غصے کے مارے جیسے بول نہ سکی دو ایک لمحے بڑی اذیت کی خاموشی سے گزرے پھر دفعتاً رضیہ نے ہولے سے کہا "ماں جی نے بھی ایک بار یہی کہا تھا افروز — وہ تمہارے بھیا کی باتوں سے بہت نالاں ہیں"

"سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے" افروز نے اس قدر غصے سے کہا کہ آنکھوں میں نمی جھلک اٹھی۔

"لو جی یہ تو اب رونے لگیں — بات کیا ہو گی خاک" عذرا نے منہ بنا کر کہا۔

افروز کی آنکھیں جلنے لگیں —

ادھر اماں بھی یہی کہتی تھیں ادھر رضیہ کی ماں جی کا بھی یہی خیال تھا اور رہ گئے بڑے ابا تو بستر پر پڑے پڑے اکثر وہ یہی کہا کرتے تھے کہ اکبر شہید ہو جاتا تو انھیں اتنا غم نہ ہوتا جتنا ملک کے دو ٹکڑے ہونے پر ہوا ہے — یہ ملک انھیں اپنی جان اور اپنی اولاد سے بھی زیادہ پیارا تھا — !

اور اس روز ریڈ کراس کے ذریعے آیا ہوا اکبر کا تیسرا خط جب وہ سنانے بیٹھی تو بڑے ابا نے یہی کہا تھا۔ بڑے ہولے سے پر افروز نے صاف سن لیا تھا "افروز تجھ سے بڑی شاہدہ کے مرنے پر بھی مجھے اتنا دکھ نہ ہوا تھا"

افروز نے شاہدہ نہ دیکھی تھی — وہ اس کی پیدائش سے پہلے مر گئی تھی۔ اماں کہتی تھیں اس وقت جب وہ ان کے پیٹ میں تھی ملک کی مدت میں انہوں نے کسی بات کا خیال نہ کیا تھا اور پھر دکھوں اور رنجوں اور بہتے خون کے دوران پیدا ہونے والی اس لڑکی کو پیدائشی طور پر غیر صحت مند دیکھا تو انھیں کوئی حیرت نہ ہوئی —

افروز کے وقت تو اماں نے ہر طرح سے دھیان رکھا۔ ملک بن چکا تھا پھر فکر کی کوئی بات نہ رہی تھی —

اور اصغر نے منہ پر یہی بات کہہ دی تھی "بس یہی تو بنگالیوں کے ہم سے روٹھنے کی بات ہی ہمیں کوئی فکر نہ رہی تھی !"

"میں کہوں اگلا سانس نہ نصیب ہو کلموہے کو" اماں نے دوہتڑ پیٹ ڈالے "نہ باوا کا لحاظ نہ میاں کی پروا جو منہ میں آیا بک دیا۔ میں کہوں یہ کافر کیا میرے ہی پیٹ سے جننا تھا؟"

افروز سہم کر دیوار سے لگ گئی —

"بھیا — کچھ تو خوف کرو لحاظ کرو — پہلے ہی اماں کا مارے دکھ کے برا حال ہے اور پھر تم ایسی باتیں کرتے ہو جو انھیں خون کے آنسو رلاتی ہیں —"

اصغر نے بہن کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ بے حد دبلی ہو چکی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے گرد سیاہ سے دھبے پڑ رہے تھے، سفید رنگت میلی ہو جائے تو عجیب سی نظر آتی ہے جیسے میدے میں سیاہی کی دوات انڈیل گئی ہو —

اور وہ جو تھی چھٹی سفید بقول اماں کے میدے ایسی رنگت اور تیکھے نقش و نگار والی ان کی بہو — ("اونہہ ابھی صرف منگنی ہی تو ہوئی ہے")

"نمو — نموا"

"کیا کہتی ہو افروز"

"بھیا کا خط آیا ہے —"

"اچھا —"

"چپ چپ ہو؟"

"ہاں"

"اللہ کچھ تو ہنسو۔ کچھ تم ہی سوچو، اب کیا کریں، خدا کے لیے تم ہی سمجھاؤ ——"

وہ خاموش رہی۔

"منو —— میری بھی تو سنو —— خدا کے لیے بھیا کو سمجھاؤ —— وہ ابھی باہر نہ کیا کریں ورنہ اماں جان دے دیں گی اور بڑے ابا کا دم نکل جائے گا ——"

دم کا نکلنا ہے لمحہ لمحہ قیامت ہے اور افروز کے ذہن کی ہر سوچ اسی سمت کو بڑھتی جا رہی ہے۔ کیسی عجیب بات تھی؟ پر اب عجیب بات کوئی بھی نہ رہی تھی، حیرت کا عنصر واقعات کے سیلاب میں اسی طرح بہہ گیا تھا جیسے پہاڑوں کی مٹی اور دریا کا پانی گھل مل جاتا ہے۔

"تو پھر افروز کا رکھنا کیا معنی رکھتا ہے ——" افروز نے خود اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی —— اس کے سامنے افروز تھی، نہیں منو تھی، نہیں رضیہ تھی غذرا تھی اور وہ تھی —— وہ جو مر چکی تھی اور بڑے ابا کہا کرتے تھے کہ اس کا نام شاہدہ تھا، شاہدہ اس کی پیدائش سے پہلے مر گئی تھی ——

"ہوبہو تمہاری شکل تھی!" اماں نے ایک روز کہا۔

"اور سنہرے دیس کی شکل تک نہ دیکھی اور اب رونے بیٹھے ہیں ——" اصغر نے بیچ میں جانے کہاں سے آکر کہہ دیا۔

"اصغر ارے او بدذات کہیں کے" مارے غصے کے اماں کا دم پھول گیا "مجھے ذرا یہ بتا تو رہتا کہاں ہے —— یہ سارا سارا دن کہاں گزرتا ہے"

"جلوس میں گئے تھے بھیا" افروز نے بے اختیار بتا دیا۔

"جلوس!؟" اماں نے چیخ کر کہا یا چیخ ماری۔ یہ بتانا مشکل ہے۔

"ہاں —— اماں!" اصغر نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تم بھی تو جلوس میں جایا کرتی تھیں!"

"یہ تو مجھے کہہ رہا ہے ——" اماں کی آواز میں ایک دم طاقت عود کر آئی "میں تو ملک کی خاطر جلوس میں گئی —— میں —— میں —— میری بات کیا کرتے ہو —— میں تو قائد اعظم کی آواز پر اٹھی اور میں نے —— ہاں میں نے تو عورتوں میں سب سے آگے بڑھ کر۔ اپنا سبز پرچم اٹھا کر جلوس نکالا —— اور تم —— ؟ تم —— ؟ ذرا بتاؤ تو تم کیسے جلوس میں گئے تھے؟ ؟"

"ماں —— میں بھی تو تمہارے اور بڑے ابا کے نقش قدم پر چل رہا ہوں!" اصغر کی آواز میں کرارا پن تھا اور افروز کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ نقش پا ایک نہیں۔

"مقصد تو ایک ہی ہے!"

"یہ کسی اور کو جا کر بے وقوف بنانا ——" بڑے ابا بستر پر لیٹے لیٹے بولے تھے۔ "ہم خوب جانتے ہیں تم لوگ افراتفری پھیلا رہے ہو۔ ملک کو پہلے ہی بے شمار مصیبتوں کا سامنا ہے اور تم ہو کہ قدم قدم پر ملک کی سالمیت کے خلاف ......"

اصغر برداشت نہ کر سکا —— افروز نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ وہی بن چکا تھا —— وہی حلیہ وہی انداز جو دسمبر کی ٹھنڈی رات پڑوس

کے بیڈپوسے دکھ کی ایک تیز لہر نے آکر گھر بھر میں سانس لینے والے وجودوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا—

"ماں— !" وہ زور سے چلایا—

"کاش تو پیدا ہوتے ہی مرگیا ہوتا—" آواز میں بڑھاپا اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اُمڈ آیا— "مجھے معلوم ہوتا تو میں تیرا گلا گھونٹ دیتی—"

"مجھ پر الزام ہے— یہ الزام ہے ماں— میں بھی ملک سے پیار کرتا ہوں!" اس نے کہا مگر کسی نے سنا ہی نہیں—

"ہزار بار کہا قرآن شریف کی تلاوت کیا کرو—" افروز نے اک دن کہا "پر تم تو کسی کی سنتے ہی نہیں— ہر وقت ماؤ کے گن مت گایا کرو—"

"بعض اوقات تم جان بوجھ کر نامعقول والی بات کر بیٹھتی ہو" اصغر نے جواب دیا اور پھر کہنے لگا "مجھے معلوم ہے افروز تم کیا کہنے لگی ہو— تو پھر یہ انجان بن کر بچوں کی سی بات تمھیں زیب نہیں دیتی—"

افروز خاموش رہی— وہ واقعی سمجھنے لگی تھی— اور جس روز اصغر کے کمرے کی صفائی کرتے وقت اس نے اس چھوٹی سی لال جلد والی کتاب کو دیکھا تو بڑی عقیدت سے اس نے اُسے اٹھایا اور کھول کر پڑھنے لگی— پر اماں کی آواز نے اس کے سکون کو تہ و بالا کر دیا—

"افروز ارے او افروز کدھر ہو—"

گھبرا کر اس نے کتاب اصغر کے سرہانے کے نیچے رکھ دی اور بھیگی بلی بنی اماں کے کمرے میں چلی آئی "کیوں اماں— کیا بات ہے؟"

"یہ ذرا اخبار دیکھنا— وہ بڑی سرخی والی خبر— ہاں ذرا پڑھنا تو—"

"بلوچستان کی صورت حال...." وہ خاموش ہوگئی۔

"کیا ہوا— اری جلدی سے بول" اماں نے بے قرار ہو کر کہا "میری عینک جانے کہاں ہے۔ نہیں تو میں خود نہ پڑھ لوں—"

"کچھ نہیں اماں سب بکواس لکھی ہے—" افروز نے سپٹا کر کہا۔

اماں نے غور سے بیٹی کی طرف دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ کبھی کا کہا ہوا اک جملہ پھر سے دھڑ دھڑ کرتا کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا— بنگال کی صورت حال! بنگال کی صورت حال اور پھر جیسے ریکارڈ کی سوئی ایک جگہ اٹک گئی۔ بنگال بنگال بلوچستان بلوچستان، سرحد سرحد۔ سندھ سندھ، پنجاب پنجاب اور پھر ایک ہی لفظ کی تکرار صورتِ حال— صورتِ حال صورتِ حال! اماں بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔

وہ تینوں بستر پہ لیٹی اماں کے پاس بیٹھی تھیں۔

وہ تینوں سہیلیاں تھیں بڑی گہری اور بڑی پیاری— اور اک وہ تھی جو بہو تھی۔ سفید میدے کی سی رنگت والی اور چاروں سہیلیاں— چاروں— افروز کو دفعتاً وہ چاروں کچھ اور ہی ڈھلتی محسوس ہونے لگیں۔ وہ چاروں اکٹھی ہیں وہ اماں کے پاس بیٹھی ہیں اور اماں بیمار کیوں ہیں۔ اس وقت تو انھیں بالکل صحت مند ہونا چاہیے— بالکل تندرست کہ چاروں کی سوچ ایک ہی سمت اُٹھ رہی ہے— اسی آرزو کے شکنجے میں اماں جکڑی جا چکی ہیں تو پھر بھی تو وہ وقت تھا جب انھیں بالکل صحت مند ہونا چاہیے تھا۔

وہ بیٹھے بٹھائے جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی!

اس روز وہ کسی کی کسی بات کا جواب نہ دے سکی، وہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی اُسے نہیں معلوم ——— وہ تو یہ جانتی تھی کہ اماں کی جوانی جس دھوپ میں گزری تھی وہ سنہری تھی ——— منزل صاف اور ارفع تھی سپنے سہانے تھے اور خوش کن تھے اور اب وہ جس راہ پر چل نکلنے کو تھی وہ بڑی غیر واضح اور مدہم تھی ———

پچیس چھبیس برس کی اس مدت نے دونوں کے وجود میں ایک عجیب سا تضاد پیدا کر دیا تھا - ایک کی راہ تھی جو بالکل صاف اور قریب تھی اور دوسرے کو ابھی دھند میں سے گزرنا تھا ———

تو قصور کس کا تھا ——— دھند کا راستے کا یا احساس کا ———؟

یہ کون سی قوت تھی جس نے افروز کو مجبور کر کے دکھ دیا ——— اس نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا، سب کو گہری نظر سے پہچانا اور پھر خود کو اصغر والے واسطے کے حوالے کر دیا ——— اماں کی سوچ اور اس کی سوچ میں تضاد بڑھا ——— بڑھا اور اس کے وجود کو گھن کی طرح چاٹ گیا -

"تمہارے دکھوں نے مجھے ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا ہے ——— بد ذات!" اماں نے چلا کر کہا تھا اصغر تھکا تھکا سا آیا تھا ———

افروز جانتی تھی، کالج کے لڑکوں نے جلوس نکالا تھا اور اصغر کا تن بدن تھکاوٹ کی گرفت میں تھا اور ادھر اماں صبح سے اسی کی راہ دیکھ رہی تھیں اور ذہن میں وہ وہ نوکیلے فقرے تھے جنہیں وہ اصغر کے آنے پر اس کی ذات پر برسانے کو بے قرار تھیں -

"میرا دکھ ——— کون سا میرا دکھ ماں!" اصغر ضبط نہ کر سکا -

"تم ——— تم جو گمراہ ہو گئے ہو ——— جو دن رات ملک کے خلاف لونڈوں کے جلوسوں کے سرگرم رکن ہو ——— تم جو ——— جو ———" وہ خوفزدہ ہو کر رک گئیں -

وہ واقعی خوفزدہ ہو گئی تھیں ———!

اصغر کی حالت دیکھنے کے قابل تھی! اس کی گردن کی رگیں تن گئی ہیں، آنکھوں کی پتلیاں سفید اور پھیلی ہوئی اور ہونٹوں کی رنگت پھیکی پڑ چکی تھی، ماتھے پر سلوٹیں اور سیاہ گہری اور واضح لکیروں کا جال بن رہا تھا ———

"اصغر ——— اصغر بھیا" افروز لپک کر بھائی کے پاس آئی اور شانوں سے پکڑ لیا -

"مر جاؤ ——— مر جاؤ ——— میں کہتی ہوں مر جاؤ!" اماں نے اونچی آواز میں بلک بلک کر رونا شروع کر دیا ———

"کہاں خدا کے لیے چپ ہو جاؤ ———" افروز کو اپنے سینے کے ابھاروں پر ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں اور اس نے بے قرار ہو کر سینے پر ہاتھ دھر لیے اور پھٹی پھٹی نظروں سے اصغر کو تکنے لگی جو نڈھال ہو کر یکے فرش پر یوں بیٹھ گیا تھا جیسے ڈھے گیا ہو ———

اور اس صبح اس نے رضیہ کو بتایا اس کی دونوں چھاتیوں میں درد ہونے لگا تھا اور وہ خوفزدہ تھی -

وہ خوفزدہ تھی کیونکہ وہ جانتی تھی پڑوس میں صابرہ کو چھاتیوں میں درد اٹھا تھا اور پھر ڈاکٹروں نے بتایا تھا ——— سرطان ——— سرطان!

یہ زہر پھیل جائے تو کوئی نہیں بچتا ——— اور یہ زہر پھیل جایا کرتا ہے اسے پھیلنے سے روکنے کے لیے دیر نہیں کرنی چاہیے ———!

"اللہ بچائے ———" دونوں آوازیں اٹھیں اور ہوا میں تحلیل ہو گئیں ———

"صرف دو ڈیڑھ سال زندہ رہی ——— آپریشن کے باوجود" افروز نے بڑبڑا کر جیسے دوبارہ اپنے آپ سے کہا ———

"پاگلوں کی طرح باتیں نہ کرا فروز ——" رضیہ بولی ——" اللہ نہ کرے تُو یونہی وہم کرنے لگی ہے —— اللہ سے دعا کیا کر ——"
"میں کہتی ہوں ایسی خراب بیماری کا بھولے سے بھی مت سوچو" عذرا بولی۔

وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی —— کچھ باتیں اس کے ذہن میں آ کر زبان پر مچلنے کو بے تاب تھیں مگر سامنے ہی نوجوانوں کا ایک جلوس نکل رہا تھا —— اور اس شور میں وہ جو کہنا چاہتی تھی نہیں کہہ سکتی تھی —— !

جلوس میں زور زور سے نعرے لگ رہے تھے —— ہر قسم کے نعرے تھے، بنیادی حقوق سے لے کر ملک و قوم کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کرنے کے نعروں تک سبھی کچھ تھا۔ مہنگائی سے لے کر غریبوں اور مزدوروں کی فلاح کا مطالبہ، صنعتکاروں کی بے حسی سنگدلی سے لے کر اقتدار کے مالکوں کے ضمیروں کو جھنجھوڑا گیا تھا۔ سبھی کچھ تھا اور پھر بھی افروز کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ تھا —— !

جلوس گزر گیا تو افروز کے ذہن میں مچلتے ہوئے سوالات، جوابات، فقرے، جملے، سوچ غرض کہ ہر بات کو ساتھ لے گیا ——

وہ ذہن سے بغیر ایک پتھر کا مجسمہ —— نہیں نہیں مجسمہ وہ ضرور تھی مگر گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا مجسمہ تھی وہ !

"افروز —— افروز !"

جانے کس نے کیا کہا اور کس نے کیا سنا —— وہ کچھ نہیں جانتی —— وہ کچھ نہیں جانتی —— اُسے صرف اتنا معلوم تھا کہ جس راہ پر وہ چلنے کو ہے —— وہ ابھی تک اس کے لیے بڑی غیر واضح اور مدھم تھی !

"گولی نہ چل جائے —— اللہ اللہ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔
"ہم کیوں ملک کی خاطر یہ سب کچھ چھوڑ کیوں نہیں دیتے ؟"
ملک کو بچاؤ —— ملک کو بچاؤ —— !
اب یہ کون چلا رہا ہے —— کون کس کو بچا رہا ہے۔ ملک کس کو بچا رہا ہے ؟
کون ملک کو بچا رہا ہے —— کون ہے ؟ کون کیا کہہ رہا ہے —— ؟
تو یہ ہے اس قدر ہجوم اس قدر شور —— !
کون کس کی بات سنے —— کون بات کرے گا —— ؟ بھئی کچھ کہو تو کہو تو ؟
کہنے کو تو سبھی کہہ رہے ہیں پر کوئی ہے جو سمجھے —— جو سمجھے ؟
"ضرورت ہے سمجھنے والے کی !"

افروز نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں —— مگر آنکھیں بند نہیں ہوئیں۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا —— !
بڑی مشکل سے بڑی تکلیف سے اور بڑی جدوجہد کے بعد اس نے اپنے آپ کو قابو میں کیا تھا اور تب اس کے چہرے پر ہلکا سا سکون آ گیا ——

جب وہ گھر آئی تو جیسے بدلی ہوئی تھی ——

اماں آنگن میں جامن کے پیڑ کے نیچے چارپائی پر بیٹھی ترکاری چھیل رہی تھیں۔ ابا ہاتھ میں اکبر بھیا کا خط لیے پڑھ رہے تھے اور

شاید کچھ سو بھی رہے تھے۔ سامنے دیواروں پر ڈھلتی دھوپ کے لمبے لمبے سائے تھے اور شام کا حسن بکھرنے کو تھا۔

اماں نے نظریں اٹھا کر بیٹی کو دیکھا اور پھر منہ سے کچھ کہے بغیر ترکاری چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔

افروز کو اماں پر بے انتہا ترس آیا۔۔۔ ہمدردی کے مارے اس کے بدن کا ہر مسام چور چور ہو رہا تھا۔ بوڑھے جھریوں بھرے چہرے پر سفید سفید بال اماں کو ایک عجیب سا تقدس بخش رہے تھے ــــ

افروز نے بڑے ابا کو دیکھا تو ان کے لیے بھی اس کے دل میں وہی احترام اور محبت کے جذبے محسوس ہوئے۔

خاموشی سے وہ اندر آئی اور پھر اصغر کے کمرے میں چلی گئی۔

اصغر کے کمرے میں کوئی نہ تھا۔

کمرے میں آکر کچھ دیر وہ اصغر کے پلنگ کے سرہانے خاموش کھڑی رہی۔ اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اصغر میں اور اس میں بہت سی باتیں مشترک ہونے کے باوجود کچھ فرق ضرور تھا ــــ اور وہ کیا تھا ــــ وہ نہیں جانتی تھی اور جاننے کی خواہش مند بھی تھی ــــ یہ خواہش ہر لحہ شدید ہوتی جا رہی تھی ــــ

دیوار پر لگی گھڑی ٹک ٹک کرتی جا رہی تھی ــــ

پھر مجھ ضائع کیے بغیر، اس نے بغیر کسی خوف اور ڈر کے اصغر کا سرہانہ اٹھایا اور چھوٹی سی لال کتاب احترام سے اٹھا کر پڑھنے بیٹھ گئی!!

---

# چوبیس گھنٹے

## میرزا ریاض

طاہرہ کے شوہر کا تار تھا، طاہرہ کو چوبیس گھنٹوں کے اندر سسرال نہ بھیجا گیا تو وہ اسے طلاق بھیج دے گا، طاہرہ کا عمر رسیدہ باپ جو پہلے ہی بلڈ پریشر کا مریض تھا، غم و غصے سے کانپنے لگا۔ اس کے تن بدن میں ایک آگ سی دہکنے لگی تھی اس کا جی چاہا اپنی منحوس بیٹی کو گولی مار دے جس نے اسے یہ دن دکھایا تھا، یہ ذلت آمیز اور شرمناک دن!

"تو یہ کم بخت وہاں سے لڑ کر آئی ہے۔ اُف! اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑتے ہوئے کہا۔ میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میری اولاد . . . . .

"آپ اپنے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر آرام کریں، میں اسے سمجھا لوں گی۔" اس کی دوسری بیوی نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"میں تو اب ایک ہی دفعہ آرام کروں گا، قبر میں جا کر۔" اس کے لبوں کے کناروں پہ جھاگ تھی، اور وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

"آپ کے انجکشن کا وقت ہو گیا ہے۔"

"جہنم میں جائے انجکشن اور لعنت ہے ایسی زندگی پر۔" پھر وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

"اب میں زمانے کو کیا منہ دکھاؤں گا، دنیا والے میرے بارے میں کیا سوچیں گے، کیا کیا باتیں نہ کریں گے، میری ساکھ، توقیر، عزت کو بٹہ لگ جائے گا، میرے خاندان میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا، مگر اب یہ شرافت مٹ گئی، میری ہستی، میری حیثیت، میرا وقار سب داغدار ہو گئے، میرے چہرے کا تقدس ختم ہو گیا، غلاظت مل دی میرے چہرے پہ، مسخ کر دیا میری شہرت اور مرتبے کو، اب میری دوسری بیٹیوں کو کون بیاہنے آئے گا۔"

"ہائے اللہ سے خیر مانگیں، پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں، مگر آپ غمزدہ نہ ہوں، طاہرہ بھی ایسی نہیں ہے، ماشاء اللہ اچھی خاصی تعلیم یافتہ ہے، سگھڑ اور سلیقہ شعار ہے، سمجھدار ہے۔ کوئی غلط فہمی، کوئی جذباتی سہو ہو گئی ہو گی، وہ آپ کا بے حد احترام کرتی ہے، وہ یقیناً اپنے سسرال چلی جائے گی، میں اس سے ابھی بات کرتی ہوں۔"

"تو سنو بیگم، یا تو اس کے سسرال جانے کی مجھے خبر ملنی چاہیے، یا پھر اس کی موت کی اور اگر ایسا نہ ہوا اور میرے گھر میں طلاق نامہ آیا تو سمجھ لینا کہ وہ میری موت کا پروانہ ہو گا۔"

گھر سے نکل کر وہ مسجد کی طرف چل دیا، اس کا خیال تھا بارگاہ ایزدی میں وہ اپنی چہیتی اور ناز و نعم میں پلی ہوئی بیٹی کے لئے دعا کرے گا، وہ سخت پریشان تھا، طاہرہ وہاں سے آخر کیوں چلی آئی تھی؟ تین برس اس کی شادی کو ہو گئے تھے، اس عرصے میں اس

نے وہاں کے بارے میں کبھی کوئی شکایت نہ کی تھی۔

اس کی سوتیلی ماں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اٹیچی کیس میں کپڑے رکھ رہی تھی اس کا دو سال کا بچہ پلنگ پر پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔

"میں نے سب کچھ سن لیا ہے امی" اس نے اپنی ماں کو سامنے آتے دیکھ کر کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم جانے کے لئے تیار ہو رہی ہو، اور یوں اپنے ابا کی خواہش کا احترام کر رہی ہو، یقین جانو، ان کا غصہ اور اضطراب صرف اسی لئے ہے کہ وہ تمہارے گھر کی بربادی نہیں دیکھ سکتے۔"

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

"وہ تمہیں ہمیشہ آباد اور سکھی دیکھنا چاہتے ہیں، تمہارے خط کو دیر ہو جائے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ بار بار پوچھتے ہیں۔ ڈاکیے کے آنے کے وقت پر تو بس مجسم انتظار بن جاتے ہیں۔"

"مجھے ابا جان سے کوئی شکایت نہیں رہی، وہ تو بہت ہی اچھے ہیں، اور وہ ٹھیک ہی تو سوچتے ہیں، بیٹی کے لئے طلاق معمولی سی بات نہیں ہوتی۔ ایک سنگین حادثہ ہوتا ہے، خاص طور پر ان جیسے روایت پسند اور وضعدار انسان کے لئے اور میں ان کا مان ٹوٹنے نہیں دوں گی۔"

"تم تو خود سمجھدار ہو، اور تمہارے سسرال والے اگر زیادہ پڑھے لکھے نہیں بھی تو کیا ہوا، ایسے لوگ تو بڑے مخلص اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ تم ان کی اصلاح بھی تو کر سکتی ہو۔"

"اصلاح؟ مگر امی ......"

اس کی ماں اسے سمجھاتی چلی گئی۔ "جھگڑے تو گھروں میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہر روز زخم لگتے ہیں، مگر پھر مندمل ہو جاتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم کوئی ایسا جذباتی فیصلہ کر لو جس سے زخم مندمل ہونے کی بجائے ناسور بن جائیں۔"

"میں نے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کیا، دراصل میں نے کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا، میرا تو دماغ ہی مفلوج ہو چکا ہے، میں بھلا کیا فیصلہ کروں گی۔"

تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ سوگوار اور مایوس! کیا تم مجھے کچھ نہ بتاؤ گی؟ مجھ پر بھروسہ رکھو بیٹی میں تمہاری سوتیلی ماں ضرور ہوں، مگر میرا تمہارے ساتھ ایک اور انسانی رشتہ بھی ہے، عورت ہونے کا، اور اس ناطے سے میں تمہارے کرب میں شریک ہو سکتی ہوں۔

طاہرہ کو یوں لگا جیسے برسوں بعد ان کے درمیان دردمندی کا رشتہ استوار ہوا ہے، اس نے دوسری عورت سے کہا۔

"میں نے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کیا۔ شادی کے پہلے دن سے لے کر آج کے دن تک میں یہی سوچتی رہی ہوں پہلے دو برس تک میں تنہا سوچتی رہی، اور اب میرا یہ ساتھی، میرا بچہ بھی میری سوچوں میں شریک ہو گیا ہے۔"

اس کی ماں اس کی یہ بات سن کر کانپ اٹھی، اور دکھ بھرے انداز میں کہنے لگی۔

"ایسا کون سا غم ہے تمہیں طاہرہ کہ جس میں تم نے اس معصوم ننھی سی جان کو بھی شامل کر لیا ہے، اس نے تو ابھی آنکھیں بھی

تمہیں کھولیں۔"

اور میں کسے اپنے دل کا حال سنا سکتی تھی۔ وہاں دوسرا کوئی سننے والا نہ تھا۔ یہاں سنانے آئی تھی، مگر جسے سنانے آئی تھی اس نے کانوں کے ساتھ ساتھ دل کے دروازے بھی بند کر دیئے۔ میں جانتی تھی میرے ارادے کا جان کر میرے ابا کو سخت صدمہ پہنچے گا کہ جس نسل سے ان کا تعلق ہے، وہ پوری نسل اس معاملے میں بڑی حساس اور زود رنج ہے۔ یہ وہ نسل ہے جو بیٹیوں کو زندہ جلانے کے بجائے زندہ گاڑ دیتے ہیں۔ یہ نصیحت کر کے اپنے گھروں سے رخصت کرتے ہیں کہ دیکھو تمہارا حقیقی اور آخری گھر اب سسرال کا گھر ہے، وہاں سے اب تمہارا جنازہ ہی اُٹھے گا۔" پھر وہ چپ ہو گئی اور تھوڑے توقف کے بعد بڑے مایوس لہجے میں کہنے لگی "میں پھر بھی بابل کے گھر چلی آئی۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ میں اپنے تعلیم یافتہ اور دانشمند باپ کو سب کچھ سمجھا سکوں گی، میرا خیال بلکہ مجھے یقین تھا کہ میں ان کی فکر کو بدل سکوں گی۔ مگر ان کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہر نسل کی اپنی سوچیں ہوتی ہیں۔ جو اس کے لئے ایمان کا درجہ رکھتی ہیں۔"

"مگر میں جو تیار ہوں، تمہارا دکھ سننے کے لئے مجھ سے کہو۔"

"امی، میں آپ سے نہ کہہ سکوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ غمگساری کا وہ عظیم ناطہ جو میرے اور آپ کے درمیان آج قائم ہوا ہے، آج ہی مر بھی جائے۔ میں اس اطمینان کو آج ہی ختم نہیں کر دینا چاہتی۔ آپ، میرے خیالات اور میرے ابا کے نظریات کے درمیان ایک پُل ہیں، اس پُل کی تعمیر میں میرے ابا کا ہاتھ زیادہ ہے، ان کے احسانات ہی سے آپ کی ہستی نے جنم لیا ہے۔ ایسا نہ ہو میری سوچ کا بوجھ آپ برداشت نہ کر سکیں اور یہ پُل بھی ٹوٹ جائے۔"

"مگر میری بچی تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ کاش تم مجھے کچھ بتا سکتی۔ کاش تم مجھے اپنا سمجھ سکتی۔"

اس کی ماں نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا۔ اور دفعتاً طاہرہ کو خیال آیا کہ وہ سب کچھ بتا دے۔

"امی،" اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے اس گھر میں تین سال نہیں گزارے تین صدیاں گزاری ہیں۔ ذلت اور رسوائی، شکست و ریخت کی تین صدیاں . . . . ."

اور پھر وہ خاموش ہو گئی، اور اس کے بعد وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی، اس نے سوچا وہ اپنے کرب میں اپنے باپ کو شریک نہ کرے گی۔ اس کی ماں اصرار کرتی رہی۔ مگر اس نے زبان نہ کھولی۔

"تو تم مجھے کچھ بتائے بغیر ہی یہاں سے چلی جاؤ گی؟"

"ہاں، آپ کو بتائے بغیر، ابا جان کو بتائے بغیر، اور اب جبکہ میں سسرال جا رہی ہوں تو اب بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

جانے اس وقت اس کے اندر کون بول رہا تھا، اس کی ماں خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔

گراں بار خموشی کا ایک طویل وقفہ گزر گیا۔ جسے طاہرہ نے توڑا، اس کی آواز میں اب وحشت کی بجائے ملائمت تھی۔

"امی! ابا جان کب گھر لوٹیں گے؟ کیا وہ مجھ سے اتنے ناراض ہیں کہ مجھے سٹیشن تک چھوڑنے بھی نہیں جائیں گے؟"

"وہ ضرور اپنی بیٹی کو چھوڑنے جائیں گے، نماز پڑھنے گئے تھے، اب آتے ہی ہوں گے، مگر اتنے میں تم کچھ کھا پی لو، سفر لمبا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں امی۔"

"اچھا تو میں ساتھ رکھے دیتی ہوں، راستے میں کھا لینا۔"

طاہرہ ابھی گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ انجن نے وہسل دے دی، باپ اور بیٹی کے درمیان کوئی بات نہ ہو سکی، اسٹیشن تک تانگے میں آتے آتے باپ نے وہی رسمی نصیحتیں اور وہ تمام روایتی باتیں جو ایسے موقعوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں کیں۔

شوہر مجازی خدا ہوتا ہے، سعادت مند اور نیک بیٹیوں کا اصلی گھر سسرال میں ہوتا ہے، ساس سسر کا احترام ماں باپ کی طرح کرنا چاہیئے، شوہر کے گھر میں تکلیفیں بھی ہوں تو انھیں بڑے حوصلے اور خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہئے، گھریلو زندگی کے سکھ کے لئے اگر اپنے آرام کی قربانی بھی دینا پڑے تو پیچھے نہیں ہٹنا چاہیئے۔

قربانی؟ وہ اپنے ابا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ قربانی صرف عورت ہی کو دینا چاہئے مگر وہ کسی ناخوشگوار بحث میں الجھ کر اپنے باپ کے لئے کسی تلخی کا سامان پیدا کرنا نہ چاہتی تھی۔ وہ تو چلتے وقت انہیں یہ احساس دینا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے مقدر سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ گاڑی چل دی، اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے، اس نے منہ ڈبے کے اندر چھپا لیا، معاً اسے محسوس ہوا کہ اس کے ابا کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں، اور چلتے وقت وہ اپنی بیٹی اور نواسے کے سر پر دستِ شفقت پھیرنا بھی بھول گئے تھے۔

سفر کیا تھا، گاڑی پوری رفتار سے حرکت کر رہی تھی، دفعتاً اسے محسوس ہوا جیسے سفر ختم ہو گیا ہو، ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی اس ویران سے اسٹیشن پر رکی۔ اس کے علاوہ کوئی مسافر وہاں نہ اترا۔ باہر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، اس کے سسرال میں سے کوئی شخص اسے لینے نہ آیا تھا، دوپہر کا وقت اور گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ تھی، گلیاں اور بازار دور دور تک سنسان تھے وہ تانگے میں بیٹھ گئی۔ گھر زیادہ دور نہ تھا۔

تانگے سے اتر کر اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو اسے یوں لگا۔ جیسے کسی نے پاؤں تلے دہکتے انگارے ڈال دیئے ہوں، اس کے دیور نے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"الٹی میٹم کے پورا ہونے میں ابھی تو چھ گھنٹے باقی ہیں، بہت جلدی کی آنے میں۔" اور ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ اس کے چیچک زدہ چہرے پر پھیل گئی۔

"بڑا نخرہ دکھا کر گئی تھی، باپ نے پناہ نہیں دی بیٹی کو دو دن بھی نہ رکھا پاس۔"

اس کے وجود میں بادسموم چلنے لگی۔ گھر کے تمام لوگوں کے چہروں پر نفرت تھی تضحیک تھی۔ کسی نے اس سے بات کی اور نہ ہی اس کی خبر تو جو دی، اس کا شوہر شاید گھر میں نہیں تھا۔ اپنے بچے کو سینے سے لگائے وہ اپنے نیم تاریک زنداں میں چلی گئی۔ اس کی چھوٹی نند سب سے نظریں بچا کر اس کے کمرے میں آ گئی۔ وہ بچے کو جگانے پر اصرار کر رہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ عبتیا نے سب کو آپ سے بات کرنے سے منع کر رکھا ہے، انہوں نے کہا تھا جب تک، آپ گھر کے ہر چھوٹے بڑے سے معافی نہیں مانگ لیتیں اس وقت تک آپ اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ امی کی آواز سنتے ہی اس کی نند بھاگ گئی، اس کی بات سے طاہرہ کو ایک دھکا سا لگا اتا کے زخم تو پہلے بھی اس نے کھائے تھے، اس قسم کے ذہنی اور قلبی صدمات سے تو وہ پہلے بھی کئی بار گزر رہی تھی، شکست و ریخت کا عمل تو پچھلے تین سالوں سے

اس کے اندر جاری تھا مگر یہ سزا جو اسے آج ملنے والی تھی، یہ کتنی خوفناک تھی، کتنی ذلت آمیز! آخر اس نے ایسا کون سا جرم کیا تھا؟
گھر کے لوگ کھا پی کر اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے تھے، ان کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں بند دروازوں کو چیر کر آ رہی تھیں، اس کا تھانیدار خاوند ابھی تک نہیں آیا تھا، ہولے سے وہ اپنے کمرے سے نکلی، لمحہ بھر کے لیے صحن میں رکی اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر آ گئی۔ سورج اس وقت سوا نیزے پر چمک رہا تھا۔ طاہرہ کے ابا رات کی نماز پڑھ کے گھر لوٹے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔
"آپ کا تار"۔ ڈاکیے نے تار ان کے ہاتھ میں تھمایا اور دستخط لے کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ تار لے کر وہ روشنی کی طرف لپکے۔
"بیٹی کے خیریت سے پہنچنے کا ہو گا"۔ ان کی بیگم نے اندازہ لگایا۔
طاہرہ کے ابا کا رنگ زرد پڑ گیا، کیسر کی طرح، تار ان کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گر پڑا اور بڑی نحیف اور کمزور آواز میں انہوں نے کہا۔
"طاہرہ نے خودکشی کر لی ہے"۔
"ہائے اللہ"۔ ان کی بیگم سر تھام کے بیٹھ گئی۔ "یہ ظلم میرے خدایا"۔
"لکھا ہے کوٹھے پر سے چھلانگ لگا دی"۔ بڑی دیر بعد طاہرہ کے باپ نے کہا۔
"کمینوں نے خود ہی دھکا دے دیا ہو گا، قاتل کہیں کے"۔ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔ طاہرہ کے ابا کی حالت خراب ہونے لگی تو اس نے انھیں نیند کا انجکشن دے دیا، اس وقت تو وہاں جانا ممکن نہ تھا، کیونکہ چوبیس گھنٹوں میں وہاں کے لئے صرف ایک ٹرین چھوٹتی تھی۔
رات گئے وہ نیند سے جاگے، اور کہنے لگے۔ "بیگم، طاہرہ کی میت ہم یہاں لے آئیں گے"۔
"اب میت کو لا کر کیا کریں گے؟"
وہ اپنی بیگم کی بات میں جو خوفناک طنز تھی، اسے سمجھ گیا، اور خاموش ہو گیا، اور پھر کچھ دیر بعد کہنے لگا "صبح ہونے میں ابھی کتنی دیر ہے؟"
ابھی بہت دیر ہے، آپ سو جائیں تو اچھا ہے آپ کے اعصاب پر گہرا اثر ہے"۔
"بیگم!"
"جی!"
"طاہرہ نے تمھیں کچھ بتایا تھا، اپنا غم، اپنا دکھ!"
"وہ جسے بتانے آئی تھی اس نے سننا گوارا نہ کیا، میں نے سننا چاہا تو مجھے بتانے پر وہ تیار نہ ہوئی"۔ اس نے بڑے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔
"مگر اس نے اتنا خوفناک، اتنا المناک قدم کیوں اٹھایا، وہ مجھے لکھ دیتی، اسے کیا تکلیف ہے، کیا پریشانی ہے، شاید میں اس کے لئے کچھ کر سکتا!"
"آپ اب آرام کریں، صبح سفر کرنا ہے"۔
"بیگم، کیا ہم زندگی بھر یہ نہ جان سکیں گے کہ ہماری بیٹی کو کیا غم تھا، کیا دکھ تھا اسے؟ یہ سزا اس نے ہمیں کیوں دی، مجھے کوئی بتا دے، اب بھی بتا دے، اسے کیا غم تھا؟"
وہ دونوں سر جوڑ کے سوچنے لگے اور پھر موٹے موٹے آنسو، ان کی بے نور آنکھوں سے ٹپاٹپ گرنے لگے، صبح تک گرتے چلے گئے اور جانے کتنے دن، کتنے ماہ و سال، کتنی زندگی ابھی انھیں اور رونا تھا۔

# مختار مسعود

## محمد طفیل

یہ مختار بھی ہیں۔ یہ مسعود بھی ہیں۔ لہذا میں بھی سوائے اس کے اور کیا کہوں کہ اللھم زد فزد۔ یوں اگر ان کا ذکرِ خیر چلے گا تو دونوں ہی طرح سے چلے گا۔ میں حضرت موسیٰ کی طرح صرف ایک لفظ "ارنی" کہہ کر اپنا گزارہ نہیں کر سکتا۔ میں تو گنہگار ہوں۔ اسی لئے مجھے اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے صفحوں پہ صفحے لکھنا پڑیں گے۔ اس پہ بھی میں ان کی تھوڑی سی مختاری اور تھوڑی سی ہی مسعودی کا ذکر کر سکوں گا۔ بات تھوڑی اور ادھوری کیوں؟ مجبوریاں ہیں صاحب! کیونکہ موصوف غلافوں کے اندر رہتے ہیں۔ یہ جتنے عیاں ہیں۔ اس سے زیادہ نہاں ہیں۔ پھر انہوں نے جو غلاف اوڑھ رکھے ہیں۔ ان کے شیڈ بھی مختلف ہیں اور بناوٹ بھی جُدا جُدا۔

جب مجھے مسعود نے اپنی پہلوٹھی کی تصنیف "آواز دوست" دی تو میں مارے خوشی کے انار کی طرح سرخ ہو گیا۔ جب انہوں نے مجھے مضمون لکھنے کے لئے کہا تو میرا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ چند دن گزرنے کے بعد، جب میں نے اُس سرخی اور سفیدی کو باہم پھینٹا تو پھر جو نتیجہ نکلا وہ "متعدد ہوائیوں" کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ ہر چند کہ میں مسعود کا دشمن نہیں ہوں اس کے باوجود میں اپنی باتوں کو ہوائیوں سے زیادہ درجہ دینا بھی نہیں چاہتا۔

مسعود کے سلسلے میں، میرے ذہن کے کونے کھدروں میں جو کچھ بھی دبکا اور چھپا ہوا ہے، اُسے ڈھونڈھ اور کھوج کر آپ کے سامنے لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ حافظہ کھا ہوا ہے اور شوق فراواں ہے۔ کیونکہ عہدِ عقل کو بیتے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ جوانی میں حوصلہ زیادہ ہوتا ہے۔ اچھی باتیں زیادہ یاد رہتی ہیں۔ ادھیڑ عمر میں تلخیوں کی طرف زیادہ جھکاؤ ہوتا ہے۔ سیدھی باتوں کو بھی ٹیڑھے انداز میں لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ غرض ایک ہی آدمی زندگی میں چار بار بدلتا ہے۔ انسان کا بچپنہ کچھ کہتا ہے۔ جوانی کچھ اور ڈھنگ سے نچاتی ہے۔ ادھیڑ عمر میں کچھ زیادہ ہی سود و زیاں کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ بڑھاپے میں جا کر "مجھے نہ چھیڑو" کی تصویر بن جاتا ہے۔ الحمدللہ کہ ابھی مجھ پہ وہ وقت نہیں آیا۔ ابھی تو مجھ میں دوسروں کو چھیڑنے کی ہوس باقی ہے۔

مضمون شروع کرنے سے پہلے ایک بات اور کہہ دوں تاکہ میرا مضمون گھپلے بازی سے نکل سکے۔ وہ یہ کہ بندہ ابھی سلوک کی پہلی منزل میں ہے۔ جہاں علم میں حق سے پہلے باطل کا درجہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس مضمون کے سلسلے میں میرا زیادہ تر واسطہ باطل ہی سے پڑے۔ یوں ہوا تو حق کی بات کوئی اور اللہ کا بندہ کرے گا۔ غرض میرا یہ مضمون ان کے مزاج اور میرے فکار ہی کی طرح ٹیڑھا ہو گا۔ مجھے ان کے مزاج کی نہیں۔ اپنے دماغ کی ٹیڑھ کی فکر ہے۔

میں مسعود کے ذکر سے پہلے ان کے والدِ محترم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ ماحول اور تربیت کے اثر سے بھی شخصیت کے پرت کھلتے ہیں۔ وہ جو مسعود نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہر اچھے آدمی کے گرد ایک ہالہ ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک جائیں تو دل

خود بخود معتوب ہو جاتا ہے " وہ کسی اور شخص کے بارے میں سچ ہو یا نہ ہو ان کے والد کے بارے میں ضرور سچ ہے۔ جو بھی ملا گرویدہ ہو کر اُٹھا۔ جس سے بھی واسطہ پڑا وہ فریفتہ نکلا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے میں جن کتابوں کا دلدادہ تھا۔ اُن میں علی گڑھ کے ایک استاد شیخ عطاء اللہ کی کتاب "اقبال نامہ" بھی تھی یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مسعود کے والدِ بزرگوار تھے۔ ایک دن میں مسعود سے ملنے گیا تو ان سے ملاقات ہو گئی۔ اُن کی صورت اگر شرافت کا مجسمہ تھی تو گفتگو حلم کا نقطۂ عروج، پہلی ملاقات میں متاثر ہوا۔ دوسری میں مرید ہو گیا۔ عجیب موہنی تھی اُن کی شخصیت میں!

خُو بُو کے اعتبار سے، یہ بھی اپنے والد کا عکس ہیں۔ فرق اتنا ہے وہ نیکیوں میں عمر رسیدہ تھے۔ یہ ابھی نوجوان ہیں۔ وہ سراپا عجز تھے۔ یہ ابھی اپنی طبیعت کی شعلگی سے نپٹ رہے ہیں۔ اٹھان وہی ہے۔ ویسے اخلاق کی اسی مسند پہ بیٹھنے کا چاؤ، اِن میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، وہ جملہ کسی اور پہ کسا جا سکتا ہو یا نہ کسا جا سکتا ہو۔ ان پہ ضرور کسا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ پانچویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ ان کے گھر میں ایک چینی مسلمان عالم محمد ابراہیم شاکیو چن آتے ہیں۔ انہوں نے اُن سے آٹوگراف لئے۔ آٹوگراف بک کا ایک صفحہ بھر گیا۔ جب دوسرے صفحے کے لئے انہوں نے آٹوگراف لینے کے بارے میں سوچا تو انہوں نے اپنے اُس وقت کے تأثرات کا ذکر اپنی کتاب کے صفحہ باون پر یوں کیا ہے:

"جونہی میں نے دوسرا ورق اُلٹا اور سوچنے لگا کہ اب کس کے آٹوگراف لئے جائیں تو بات ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے والدِ محترم سے رہنمائی چاہی تو ہدایت ملی کہ آٹوگراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا ورقِ سادہ، انھیں یونہی نہیں بھرنا چاہیئے۔ جاؤ، جگر، انتخاب کو کام میں لاؤ۔ بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ ان سے تعارف کے لئے کارلائل سے مدد مانگو، ان سے ملاقات کے لئے پلوٹارک کے پاس جاؤ۔ ان کو سمجھنے کے لئے سعدی سے لے کر سیموسائل تک سب کے دروازے پر دستک دو۔"

چشم بد دور یہ بات اگر صرف طرزِ انشا کی ہوتی تو بندہ ان کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتا۔ لیکن میرے ذہن میں یہ بات نہیں بیٹھ رہی کہ یہ پانچویں جماعت میں بھی کارلائل سے لے کر سیموسائل تک کو سمجھتے تھے۔ اگر واقعی سمجھتے تھے۔ تو مجھے یہ کہنے دیجئے —— کہ پھر انہوں نے چھٹی جماعت میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟ ایک یہ علم کے جویا ہیں کہ جو پانچویں جماعت میں بھی اتنے عالم تھے۔ ایک ہم علم کے عیدے ہیں کہ جنہیں آج تک اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ سب کے سب مرد تھے یا عورتیں ہیں۔

اصل میں مجھے یہ مضمون پڑھنے سے پہلے دو چار ٹھکانے کے قصیدے پڑھ لینا چاہئیں تھے۔ کیونکہ آج سے پہلے قصیدہ لکھنا ایک باقاعدہ فن تھا جس میں کئی شعراء نے نام پیدا کیا۔ وہ فردوسی ہوں کہ قاآنی، غالب ہوں کہ ذوق، سبھی نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ اب نہ ویسا دور ہے اور نہ ویسے ادیب، آج کل تو سب کا رگڑائی پہ گزارہ ہے۔ اگر کوئی بربنائے استحقاق کسی کی تعریف کر بھی دیتا

ہے تو سب ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔ بے شک دنیا میں وسیع النظری اور رواداری کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ مگر ہے وہ صرف اپنے عیبوں سے متعلق!
قصیدہ لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ البتہ پڑھ سکتا ہوں۔ وہ بھی اس دھڑکے کے ساتھ کہ کہیں ممدوح اور سامعین دونوں ہی بدمزہ نہ ہو جائیں۔ بہرحال ———

پچھلے دنوں اس کتاب کے بارے میں ایک جلسہ راولپنڈی میں ہوا۔ میں نے سنا ہے کہ اس میں بھی، اس کتاب کے بارے میں چھت پھاڑ قسم کی تعریفیں ہوئیں۔ بے شک یہ کتاب تعریف کے قابل ہے۔ جتنا چاہیں جھوٹ بول لیں۔ جتنا چاہیں سچ بول لیں۔ دونوں چکر چل جائیں گے۔ یہ گنجائش میں نے یا تو مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" میں دیکھی یا پھر مختار مسعود کی کتاب "آوازِ دوست" میں۔ کوئی کہتا ہے۔ پچھلے پچاس برس میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ کوئی کہتا ہے آئندہ سو برس میں ایسی کتاب نہیں لکھی جائے گی۔ ایسے خدشے میری صحت کے لئے بھی مفید ہیں۔ ان کا طرف دار جو ٹھہرا۔ اس پر مجھے چینی وزیر دفاع کی وہ بات یاد آگئی۔ جو انہوں نے کچھ یوں کہی تھی کہ اب اگر جنگ ہوئی تو ساری دنیا ختم ہو جائے گی اور اگر اس دنیا میں کسی متنفس کا وجود باقی رہا تو وہ کوئی چینی ہوگا۔ اس ضمن میں میری طرف سے اتنا اور اضافہ کیجیئے کہ اس چینی کے ہاتھ میں جو کتاب ہوگی وہ "آوازِ دوست" ہوگی!

جب پچھلے دنوں اس تقریب کا پروگرام بن رہا تھا تو سوال پیدا ہوا کہ موصوف کی شخصیت پر لکھے گا کون؟ اِدھر اُدھر دیکھا گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ایک بار خود مسعود نے کہا تھا کہ "ہماری شخصیت پر کوئی کیا لکھے گا۔ اس لئے کہ ہم نے تو کسی کو قریب آنے ہی نہیں دیا"۔ بات سچی تھی اور سچی ہے۔ کیونکہ ان کی شخصیت ایک ایسے طلسماتی قلعہ کی سی ہے۔ جو ہے تو عظیم مگر اس میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ میں بھی تو ان کی بارگاہ میں تھوڑے سے خلوص اور زیادہ تر ارادت بالجبر سے پہنچا ہوں۔ اپنایت کی اس ارادی حرکت پر کبھی کبھی خوش ہو لیا کرتا ہوں اور کبھی کبھی متحیر رہ جاتا ہوں۔ البتہ مغموم نہیں ہوتا۔ یہ جادو مختار مسعود کی شخصیت کا ہے۔

سہاگنیں جب بن ٹھن کے اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھتی ہیں تو وہ اپنے آپ پر واری نثاری ہونے کے بعد گال پر ایک کالی سی بندی بھی لگا لیتی ہیں تاکہ خیریت گزرے۔ چونکہ مسعود نے بھی ادب کے میدان میں الفاظ کی دھنک کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس لئے کسی نہ کسی کا بندی لگانا بھی ضروری تھا۔ سو وہ کام اِس خاکسار نے کر ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون کتاب پر کم اور صاحب کتاب پر زیادہ ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک فساد کی نہیں بلکہ فساد کی اہمیت ہے۔

مسعود دوسروں کی تعریف کم کرتے ہیں۔ اپنی تعریف سن کر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ معاملہ خست کا نہیں۔ احتیاط کا ہے۔ احتیاط ان کی زندگی پر اِس قدر حاوی ہو چکی ہے کہ وہ اب عیب کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اگر ان کے ہاں سے اس نوع کی خوشی ملے گی تو وہ بھی بالواسطہ، براہ راست نہیں۔ مثلاً اندازہ یہ ہوگا کہ طفیل کے لئے تو نہیں البتہ نقوش کے لئے پندرہ بیس منٹ نکالے جا سکتے ہیں۔ یعنی کسی وقت بھی آسمان سے زمین پر نہیں اترتے۔ انھیں اپنے جملوں کی ندرت سے غرض ہے۔ کسی کے جذبات سے نہیں۔ جو انھیں قریب سے نہیں جانتے۔ وہ ان کی جملہ بازی سے پریشان بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کے دل میں کچھ ہوتا ہے۔ زبان پر کچھ! ان کی زبان سے شکایت ہو سکتی ہے۔ ان کے دل سے نہیں۔ کیونکہ وہ بہت تربیت یافتہ ہے۔ ویسے آج کل یہ خودنمائی کے بعد خود شناسی کی منزل میں ہیں لیکن خود فراموشی کی منزل آئے گی ضرور!

یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اس لیے کہ افسروں کو افسر نہیں سمجھتے اور ادیبوں کو ادیب نہیں سمجھتے۔ انا کے اس بادشاہ کی یہ ادا دیکھئے کہ رشید احمد صدیقی ایسا ادیب، ابھی پاکستان کے مقدر میں نہیں ہوا۔ انہوں نے موصوف کے مضمون "مینارِ پاکستان" پر جو رائے لکھی وہ ان کی کتاب کے فلیپ پر موجود ہے۔ انہوں نے رشید احمد صدیقی کی رائے تو درج کر دی مگر نام نہ لکھا۔ جیسے وہ کوئی اہمیت والی بات نہ ہو۔ دیکھا آپ نے ان کا کروفر، جب نشہ طلوع ہوتا ہے تو یونہی ہوتا ہے۔ یہ راز کی بات مجھے اس لئے معلوم ہے کہ وہ خط جس میں یہ رائے درج تھی۔ میرے پاس آیا تھا۔ یا یہ کہ میرے نام آیا تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے اب تک جتنی باتیں کی ہیں۔ وہ بلا دلیل کیں یا یہ کہ اپنی ذات کے حوالے سے کیں۔ لیجئے صاحب! دلیل بھی حاضر ہے۔ وہ بھی ایک معتبر حوالے سے۔ جن دنوں یہ بہاولپور میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ اُن دنوں وہاں جو کمشنر تھے وہ بھی اپنے مہربان تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا "مسعود صاحب! ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں؟ آپ کو کوئی شکایت تو نہیں؟" انہوں نے جواب میں مسکرانا اور صرف اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا۔ "یہ تو آپ کے بھی علم میں ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ کسی کو عقلمند نہیں سمجھتے۔ باقی سب خیریت ہے۔"

میری ان سے دوستی کیوں ہے؟ جب اپنے ضمیر کو ٹٹولا تو معلوم ہوا برائیاں مشترک ہیں۔ ابتدائی داستان تو مختلف ہے موجودہ یہ ہے کہ اُوپر خدا کو خدا اور نیچے اپنے آپ کو خدا سمجھنا۔ دھوپ چھاؤں کی کیفیت یوں بھی کہ کبھی اپنے آپ کو اتنا عاجز ظاہر کرنا کہ اصلی خدا نے بھی ہمیں شک کی نظر سے دیکھنا۔

مجھے ایک بار مسعود نے کہا تھا کہ کسی نے مشتاق یوسفی کے بارے میں ایک خوبصورت فقرہ لکھا ہے کہ "ہم مزاح کے عہدِ یوسفی میں جی رہے ہیں۔" بے شک فقرہ خوبصورت ہے مگر میرا دھیان ایک اور طرف نکل گیا۔ اس لئے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ بڑے ادب کا تعلق عہد سے نہیں ہوتا بلکہ ہر عہد سے ہوتا ہے۔ کیونکہ بڑا ادب ماضی وحال کے ادب کی کاٹ ہوتا ہے۔ یہ سوچتا تھا کہ اُردو کے بڑے بڑے نثر نویسوں کے نام ذہن میں گھوم گئے۔ میر امن جنہوں نے ترجمے میں نام پیدا کیا۔ رتن ناتھ سرشار جنہوں نے قصہ گوئی میں مقام حاصل کیا۔ مولوی نذیر احمد جنہوں نے مذہب میں دخل دیا۔ ابوالکلام آزاد جنہوں نے عربی نثر میں اُردو کے الفاظ سجائے۔ محمد حسین آزاد جنہوں نے جو چاہا لکھ دیا اور جیسا چاہا لکھ لیا۔

اگر آپ اس کو بڑا بول نہ سمجھیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ ان سب کا عکس مختار مسعود کی تحریر میں ہے۔ بات صاف کر دوں کہ میں انہیں، ان ادیبوں کا مثیل قرار نہیں دے رہا بلکہ یہ عرض کر رہا ہوں کہ ان کی تحریر میں میر امن کا علم مستعار بھی ہے۔ سرشار کی قصہ گوئی بھی ہے۔ مولوی نذیر احمد کا مذہبی رُخ بھی ہے۔ ابوالکلام آزاد کا شکوہ بھی ہے۔ محمد حسین آزاد کی لفاظی بھی ہے۔ پھر احساس یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے فقروں کو جتنی بار انہوں نے خراد پر چڑھایا ہے۔ اتنی بار کسی بھی نثر نگار نے نہیں چڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں جو بندھ گیا سو موتی والا معاملہ نہیں بلکہ جو بندھے وہ موتی ہو والا قصہ ہے۔

چونکہ یہ تقریب مختار مسعود کی کتاب "آوازِ دوست" کی رُونمائی کے سلسلے میں ہے۔ اس لئے صاحبِ کتاب کی نقاب کشائی کے ساتھ ساتھ اگر اس کتاب کو بھی اُلٹ پلٹ کے دیکھ لیا جائے تو کچھ زیادہ نقضِ امن کا خطرہ پیدا نہ ہوگا۔ حالانکہ میں یہ بھی سمجھتا ہوں

کہ کسی دوست کے بارے میں باتیں کرنا (خواہ وہ مفرح قسم کی کیوں نہ ہوں) کسی طرح سے بھی جرم خفیفہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے وحشی کے دربار میں جرم اتنا بڑا دھبہ کا نہیں ہوتا جتنا کہ اقبال جرم، بہرحال میں جملہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ اس کتاب کا پہلا مضمون "مینارِ پاکستان" ہے۔ جو ہے تو اپنے مینار کے بارے میں، مگر انہوں نے توڑ دیا ہے دنیا جہان کے میناروں کو، جیسے جیسے یا دھر اُدھر پھیلے ویسے ویسے انہوں نے ہمارے ذہنوں کو بھی گھما ڈالا یعنی علم کے بوجھ سے ایسا چکرایا کہ بے سدھ کر دیا۔ جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ یہ مضمون صرف مینارِ پاکستان پر نہیں بلکہ تاریخ پاکستان پر بھی ہے۔ سالمیہ یہ ہے کہ جنہوں نے پاکستان کی تاریخ کو بنایا تھا۔ یا جو حالات کی چکی میں پسے تھے۔ اُن کی تو زبانیں گنگ اور چہرے فق ہیں۔ جنہوں نے نہ مشاہدہ کیا تھا اور نہ مجاہدہ وہ گفتار کے غازی، خدا بن بیٹھے ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے صرف ہمیں ہی نہیں تڑپایا بلکہ خود بھی تڑپے ہیں۔ اسلاف کے کارناموں کو یاد ہی نہیں دلایا بلکہ کچھ کرنے پر بھی اکسایا ہے۔

مجھ میں کئی برائیاں ہیں (الحمدللہ) جن میں کئی اچھائیاں ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ پریشان ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی پہچان رکھتے ہیں اور خود احتسابی ضمیر کے لئے اتنی بڑی سزا ہے۔ جیسے زندگی کی پل صراط سے ہر دم گزرنا، پھر جہاں بات علم کی ہو وہاں کے متعلقات میں ہیں۔ طلبِ حق، استدلال اور ایمان مجھے "مینارِ پاکستان" میں تینوں ہی حقیقتوں کا سراغ ملا۔ قبل اس کے کہ میں اس مضمون کے بارے میں مزید کچھ کہوں آپ کو اس کتاب کے چوبیسویں صفحے کی چند سطریں پڑھوانا چاہتا ہوں :-

> "اس برصغیر میں عالمگیری میناروں کے بعد جو پہلا اور اہم مینار مکمل ہوا ہے وہ مینارِ پاکستان ہے۔
> یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں مگر ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت جن میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا اُن گمشدہ صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں۔ جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے۔ ملک کی بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یوں ہی گم ہو جاتی ہیں۔"

یہ کیفیت اور یہ انداز ہے ان کے پہلے مضمون "مینارِ پاکستان" کا۔ اس مضمون میں دردمند لہجے کی ایک عجیب سی مہک ہے۔ جو صفحہ بہ صفحہ نہیں بلکہ سطر بہ سطر محسوس ہوتی ہے۔

اب آئیے ان کے مضمون "قحط الرجال" پر، یہ مضمون دراصل میرے خلاف لکھا گیا ہے۔ میرے خلاف اس طرح کہ میں جو شخصیتوں پر مضمون لکھا کرتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ایک مضمون اسے بھی لکھ کر دکھایا جائے تاکہ عبرت پکڑے اور قلم رکھے۔ چونکہ اہلِ قلم اس قسم کے تاؤ میں نہیں آتے۔ اس لئے ان کا بھی وار خالی گیا۔ اگر ہم اس قسم کے قلمی غصے میں آنے والے ہوتے تو غالب کی موجودگی میں ذوق کو شعر کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ حالی کے زمانے میں نوح ناروی کو شعر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس مضمون کے سلسلے میں الحمدللہ والی بات ایک یہ بھی ہے کہ یہ ایک تاثراتی مضمون ہے جس کا شخصیت نگاری سے

کوئی واسطہ نہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے دوسروں کو اُجاگر کرنے کی بجائے اپنے علم کو زیادہ اذن عمل دیا ہے۔ انہوں نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا اُسے تو رکھا پس منظر میں، لیکن بہلنے بہلنے سے، اپنی تصویر کو شوخ رنگوں میں اُبھار دیا۔ اس مضمون میں خودنمائی کا ایک ایسا چکر ہے۔ جس کی زد میں راجہ محمود آباد بھی آئے۔ غریب پُورا ین لائی بھی، حتیٰ کہ ڈاکٹر اقبال بھی، جہاں تک اس مضمون سے موصوف کی تصویر اُبھرتی ہے وہ بے شک بے تو شوخ و شنگ مگر ہے اپنی جگہ حد درجہ دلآویز، خدا کرے کہ یہ اسی نوع کے اور مضامین بھی لکھیں تاکہ اُن سے اِن کا سراغ تو ملے۔ اس مضمون میں بڑی شخصیتوں سے مسعود کا برتاؤ ویسا ہی ہے۔ جیسا کہ قائداعظم کا سر سکندر حیات سے تھا۔ ویسے اس مضمون کا ابتدائی حصہ بڑا خوبصورت ہے۔ جسے بھلا دینا آسان نہ ہوگا۔ پرواز تخیل کے ساتھ کلمات کی کھنک اور لہجے کی لچک سے مرعوب ہونا ہی پڑتا ہے۔ اس پہ ان کے وسعتِ مطالعہ کا چھڑکاؤ، واہ وا اور سبحان اللہ والا قصہ ہے۔

آئیے اب پھر ناک کی سیدھ میں چلیں۔ یعنی ان کی شخصیت پر باتیں کریں کیونکہ اپنے قلمرو کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

یہ زاہد خشک نہیں بلکہ طبیعت مفرح پائی ہے۔ فقرے کستے ہیں۔ فقرے سنتے ہیں۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خود ایک فقرہ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ایسا نہیں ہے۔ اگر میرا بھی ایسا ہی خیال ہوتا تو میں کبھی ان پہ مضمون نہ لکھتا۔ کیوں مُوری مول لیتا؟ جب یہ خود دوسروں کو رگیدتے ہوں تو پھر اپنے بارے میں میٹھے بول کیوں نہیں سُن سکتے؟

ایک دن یہ ہمیشہ کی طرح ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھے۔ کہہ رہے تھے۔ مجھ پہ فلاں ادیب نے مضمون لکھا ہے۔ فلاں شاعر نے مضمون لکھا ہے اور فلاں صاحب لکھنے والے تھے کہ انھیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اس پر میں نے چپکے سے سوال کر دیا: "ہارٹ اٹیک آپ کی کتاب پڑھنے سے پہلے ہوا تھا کہ کتاب پڑھ کر ہوا؟"

زاہد خشک سے یاد آیا کہ میں گذشتہ سال رمضان المبارک میں، ان کے ہاں تھا۔ میں لاہور سے چل دیا تو مجھے راستے میں معلوم ہوا کہ رمضان کا چاند نکل آیا ہے۔ جب میں ان کے گھر پہنچا تو معلوم کہ مسعود تراویح پڑھنے گئے ہیں۔ اُس وقت میں نے سوچا کہ بُرے وقت گھر سے نکلا اور بُرے شخص کے ہاں پھنسا!

چنانچہ جب مسعود تراویح پڑھ کر واپس آئے تو انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا۔ "روزہ رکھنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے جواب میں کہا: "جو لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔"

انہوں نے وضاحت چاہی: "آپ کا شمار اچھے لوگوں میں ہے کہ نہیں؟"

میں نے عرض کیا: "میرا شمار بھی اچھے لوگوں میں ہوتا۔ لیکن ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہے کہ اچھا آدمی بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

"پھر؟"

"مجھے اچھا آدمی نہ بنائیے گا۔"

مسعود نے کہا: "تم ڈاکٹر کی بات تو سنتے ہو مگر میری بات سننے کے لئے تیار نہیں ہو۔"

"فرمائیے؟"

"میں سحری کے وقت دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ لہٰذا ——"

چنانچہ صاحب! میں جتنے دن اِن کے ہاں رہا۔ اُتنے ہی روزے رکھنا پڑے۔ چنانچہ اِس عید پر جب بھابی اور مسعود ملنے لئے آئے تو بھابی نے کہا: "اب کے رمضان میں آپ کو بہت یاد کیا"

"کیوں روزے رکھواتے تھے؟"

ان کی دیانت داری اور اصول پرستی کا بھی شہرہ ہے۔ کہتے ہیں کہ نیکی اور سچائی کو جاننا بھی اچھا ہے لیکن اس کو پسند کرنا زیادہ ا ہے اور اس پر عمل کرنا سب سے اچھا، یہ ہمہ وقت "سب سے اچھا" کے چکر میں رہتے ہیں۔ ایک بار ان کی اصول پرستی کی زد میں ا ایک رشتہ دار آیا، دوسری مرتبہ اِس خاکسار کا ایک رشتہ دار! باقیوں کا حال اللہ جانے!

میں ان کے رشتے دار کا قصہ تو بیان نہ کروں گا تاکہ یہ کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھادی۔ البتہ دوسرا بیان کرتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا: "میرا ایک عزیز ہے۔ جو بیکار ہے۔ آپ کا محکمہ نمک کے پرمٹ بانٹتا ہے۔ اگر ایک پر میرے عزیز کو بھی مل جائے تو اس کی دال روٹی کا بندوبست ہوجائے گا۔"

میری عرضداشت کے جواب میں انہوں نے کہا بلکہ فرمایا: "میں آپ کو اِس بات کا جواب پندرہ بیس روز کے بعد دوں گا۔" چنانچہ "عدت" کے دن گذر جانے کے بعد یہ بتایا کہ اب نمک کے پرمٹ نہیں ملا کریں گے۔ بلکہ نمک نیلام ہوا کرے اِس پر میں نے کہا: "اتنے سے جواب کے لئے اتنی مہلت کیوں مانگی تھی؟"

کہنے لگے: "جب آپ نے مجھ سے بات کی تھی۔ اُن دنوں پرمٹ سسٹم ہی تھا۔ میں آپ کو پرمٹ دلوا سکتا تھا۔ اِس لئے نہیں بھری تھی کہ میں ذاتی طور پر پرمٹ سسٹم کے خلاف تھا"

یہ بڑے با اصول آدمی ہیں۔ لیکن اصول ان کے کچھ اپنے ہی ہیں اور زیادہ تر اپنے ہی زد میں آتے ہیں۔ جو شخص اور عدمِ جواز کی اخلاقی حیثیت کو اپنے دلائل سے ثابت کر سکتا ہو وہ بڑا چالاک شخص ہے۔ ایسے مفہوم میں یہ بھی ایسے "سیدھے چالاک" ہیں۔

ان کا حافظہ بڑا اچھا ہے۔ جو چیز ایک بار پڑھ لیتے ہیں۔ وہ یاد رہتی ہے۔ پھر اپنے مطالعہ کا استعمال بھی بروقت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہمہ وقت رعب ڈالنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں گفتگو بھی دل نشین، لہجہ بھی طلسم و حیرت کا سماں باندھنے وا لہٰذا مخاطب مار کیوں نہ کھائے؟

ایک دفعہ انہوں نے ایک ادبی نشست میں تقریر کی، وہ تقریر ایسی نپی تلی اور جامع تھی کہ کیا کوئی لکھ کر کرے سبھی متحیر ہوئے، خوب داد ملی۔ مارے خوشی کے ہم بھی اُچھلے، اُس تقریر کے بعد ان کے ایک بے تکلف دوست نے کہا: "خوب رہی تقریر، کوئی لفظ آگے پیچھے نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ فل اسٹاپ اور کوما تک کا لحاظ رکھا۔ میری ایک بات مانو۔"

"وہ کیا؟"

"اِس تقریر کے حفظ کرنے سے بہتر یہ تھا کہ تم قرآن کا ایک آدھ پارہ حفظ کر لیتے تاکہ ثواب تو ملتا۔"

انھیں ایک ملک ہے اور وہ ملک یہ ہے کہ کچھ کرنا چاہیے۔ بہت کچھ کیا بھی ہے اور بہت کچھ کرنے کے ارادے ہیں۔ جیسے ان کا خیال یہ ہو کہ مجھے دوسرے افسروں کی طرح قزوینی نہیں بننا چاہیے۔ قزوینی کا قصہ کیا ہے؟ جیسے میں نے سُنا، ویسے آپ کو سنائے دیتا ہوں۔

قزوین میں عام رواج ہے کہ لوگ اپنے جسموں پر طرح طرح کی تصویریں سوئی سے گدواتے ہیں اور اس میں کبودی رنگ بھر دیتے ہیں۔ یہ نقش پھر عمر بھر جلد سے نہیں مٹتا۔ ایک قزوینی حجام کے پاس گیا اور کہا کہ میرا ستارہ طالع اسد ہے۔ اس لئے میرے جسم پر شیر کی تصویر بنا دو۔ مجھے خدا نے شیر کی سی شجاعت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ شیر کی تصویر میری باطنی شجاعت کی ظاہری علامت ہوگی اور میں اس کی بدولت رزم و بزم میں قوی پشت رہوں گا ـــــ اور یہ نقش میرے کندھے پر بنا دو۔"

جونہی حجام نے سوئی چبھو کر تصویر کشی شروع کی تو قزوینی چیخنے لگا کہ "مار ڈالا۔ تھم جاؤ۔ بتاؤ کہ شیر کے کس حصّے کی تصویر شروع کی ہے؟" اس نے کہا: "دُم سے آغاز کیا ہے!" قزوینی نے کہا: "اس دُم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔ بھائی دُم کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ کوئی اور حصہ بناؤ۔"

حجام نے پھر کسی اور جگہ سے شروع کیا۔ پھر سوئی چبھنے سے قزوینی چلایا کہ اب کیا بنانے لگے ہو۔ اُس نے کہا: "شیر کا کان!" بھئی چھوڑو اس کا کان! اس سے تو جان نکل گئی۔

پھر اس نے شکم بنانا شروع کیا۔ قزوینی کے لئے پھر درد ناقابلِ برداشت تھا۔ کہنے لگا۔ چھوڑو اس پیٹ کو بھی۔

اس پر حجام حیران و انگشت بدنداں سوئی چھوڑ کر بیٹھ گیا اور کہا: "بے دُم و بے گوش و شکم شیر تو خدا بھی نہ بنا سکا۔ میں بھلا کیا بناؤں گا؟"

یہی حال افسران کا ہے۔ کبھی وہ ایک انقلابی قدم اٹھاتے ہیں۔ کبھی دوسرا۔ یوں قوم کی نہ دُم بنتی ہے۔ نہ کان کھڑے ہوتے ہیں اور نہ ہی شکم سیر ہوتا ہے۔ میں آپ کو یہ قصہ نہ سناتا۔ لیکن میں کیا کروں۔ مسعود کو قصہ گوئی سے رغبت ہے۔ بہرحال مسعود ایسے لوگ غنیمت ہیں کہ جو ابھی انگارہ ہیں۔ اگر ان میں سے بھی دہکنے کی کیفیت ختم ہوگئی تو پھر کیا ہوگا؟

بعض اوقات ان کی کسی حرکت سے جو اندازہ ہوتا ہے وہ کچھ غلط ہی بیٹھتا ہے۔ ہم سوچیں گے کہ ان کے دل میں جو بات آئی ہے۔ وہ کچھ یوں ہوگی یعنی ہم جو سوچیں گے وہ کچھ زیادہ مائل بہ اچھائی نہ ہوگا۔ مگر جب یہ خود کچھ دنوں کے بعد اسی بات پر روشنی ڈالیں گے تو وہ بات بڑی خوب صورت ہوگی۔ یہ شخص اپنی اچھائیوں کا بھی علم نہیں ہونے دیتا۔ انہوں نے اپنی ذات پر اتنے خول لا دے رکھے ہیں کہ اصل آدمی چھپ گیا ہے۔ جو کہ بہت پیارا ہے۔

سنا ہے کہ انھیں غصہ کم آتا ہے مگر یہ بات اتنی کٹیلے انداز میں کر سکتے ہیں کہ پھر چیخنے چلانے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ آپ کے ان سے مراسم ہوں اور یہ اچانک چپ ہو جائیں تو سمجھ لیں۔ انھیں آپ سے کوئی شکایت پیدا ہوگئی ہے۔ غرض یہ دوسروں کو بدگمانیوں میں مبتلا کرنے میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

انہوں نے اپنے والد کی درویشی کو نہ اپنایا بلکہ اس سے "سبق" حاصل کیا۔ کیونکہ وہ دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ

قصداً گوشہ نشین تھے۔ یہ عمداً محفلوں کی جان بنے۔ وہ کم گو تھے۔ انہوں نے برملا کہا۔ میری باتیں سنو۔ وہ میلے کپڑوں میں بھی اپنے آپ میں مست تھے۔ انہوں نے خوش لباسی کو اپنا شعار بنایا۔

انہوں نے نہ صرف اپنی سیرت کو سنوارا بلکہ اپنی صورت کو بھی بنایا۔ یوں یوسف ثانی تو نہ بن سکے۔ جوانِ رعنا ضرور کہلایا۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ گھڑ سواری کی اور میلوں ہی زمین کو روند ڈالا۔ تیراکی کی تو پانی کو ہرایا۔ بیڈمنٹن کھیل تو حریفوں کو نیچا دکھایا۔ غرض ہر طرح سے اپنے آپ کو سنوارا۔

نوک دار مونچھیں بنانے میں بھی حد درجہ احتیاط برتی۔ ورنہ ذرا سی مونچھوں کا اُڑ جانا کونسی بڑی بات تھی۔ دراصل مونچھوں کا اونچا رکھنا ہی ان کی زندگی کا اصل چلن ہے۔ جو کام بھی کریں گے اُسے انتہا تک پہنچانے کی سعی کریں گے تاکہ مونچھ اونچی رہے۔ وہ ڈھلمل یقین لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ اِن کا ایمان یقین کی استواری پہ ہے۔ پھر ان کے خیالات و جذبات میں ایک عجیب قسم کی طہارت ہے۔ باتوں میں پھولوں کی خوشبو ہے۔ مختصر یہ کہ انسانوں کا خدا، انسانوں ہی کے ذریعے انسانیت کی سرپرستی کرتا ہے۔ خواہ روپ مختار مسعود کا ہو یا کسی اور کا!

میں اپنی بات پھر دہرا دوں کہ یہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اگر کسی کو کچھ سمجھتے ہیں تو وہ بندے کی ذات نہیں خدا کی ذات ہے۔ اتنا منہ زور شخص اللہ کے حضور اتنا موم بھی ہوگا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ ایک بار سجدے میں گرے تو سر نہ اُٹھے۔ سر اُٹھے تو دل پھر سجدے پہ مجبور کرے۔ دیکھئے کہ مسجدِ شہدا، ان کی پیشانی پر اُسی سجدے کا نشانِ منور ہے اور مینارِ پاکستان اُسی سجدے کی گواہی اور اب "آوازِ دوست" انہی سجدوں کا ثمر!

بیشتر لوگ بے وقوف نہیں ہوتے لیکن بے وقوفی کا لبادہ اوڑھنا پڑتا ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ اس مضمون کے سلسلے میں، لبادہ اوڑھا بھی ہے اور بے وقوف بنا بھی ہوں۔ جس کے گواہ آپ سب ہیں۔ جس شخص کی گواہی میرے خلاف ہوگی۔ وہ مختار مسعود ہوں گے۔ اکیلے مختار مسعود!

آخری کلمہ یہ کہ یہ اُن لوگوں میں سے نہیں جو خدا سے مرادیں مانگتے ہیں بلکہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو صرف عمل کی توفیق مانگتے ہیں کیونکہ مرادیں عمل سے مربوط ہیں۔

---

# ۳

## فن اور فنکار

# نئے زاویے کا پُرانا غزل گو

## مظفر علی سیّد

حفیظ ہوشیار پوری کو جب بھی کسی نے جانا، غزل کے حوالے سے جانا اگرچہ ان کی غزلوں کا کوئی مجموعہ ان کی تقریباً چالیس سالہ ادبی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

پھر بھی، جہاں کہیں بیسویں صدی کی اردو غزل کا ذکر ہوگا تو برصغیر جنوبی ایشیا کے ایک آدھ کروڑ غزل کہنے والوں میں سے جن پانچ سات لوگوں کا نام سب سے پہلے جاننے والوں کی زبان پر آئے گا ان میں حفیظ ہوشیار پوری کا نام ضرور شامل ہوگا۔

شرط صرف اتنی ہے کہ ذکر بیسویں صدی کی اُردو غزل کا ہو یعنی اُس غزل کی بات نہ ہو جو یوں تو ہمارے ہی دَور میں لکھی جاتی ہے مگر جس کا لب و لہجہ اور فکر و احساس کا انداز ہم سے یا ہمارے زمانے سے دَور کی مناسبت بھی نہیں رکھتے، اُس غزل کا تذکرہ ہو جو محض دیکھنے اور سُننے میں غزل سے مشابہ نہ ہو بلکہ غزل کے ساتھ ساتھ سوچنے سمجھنے کی چیز بھی ہو، جس میں سامعین کے ڈھلے ڈھلائے ذہنی رویّوں کو سہلانے کی بجائے کچھ اپنی کچھ اپنے زمانے کی بات کہنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہو۔

مربوط اور برمحل شاعری کسی دَور میں آسان نہیں ہوتی مگر آج کہ غزل گوئی کے سیلاب میں خس و خاشاک کی فراوانی ہے۔ حفیظ ہوشیارپوری کی اہمیت کو دریافت کرنا اور بھی لازم ہو چکا ہے۔

پہلے حفیظ کی ایک پوری غزل دیکھیے تاکہ اندازہ ہو کہ اِس صنفِ سخن سے وہ کیا کام لینا چاہتا تھا۔

خوفِ تقلید راہبر ہی رہا — اِک قدم اُس سے پیشتر ہی رہا

یُوں ستارے شریکِ درد رہے — دِل کو اندیشۂ سحر ہی رہا

کام آیا نہ خونِ صد منصور — دار کا نخل بے ثمر ہی رہا

دِل میں اِک شور سا اُٹھا تھا کبھی — پھر یہ ہنگامہ عمر بھر ہی رہا

جلوہ در جلوہ حُسن تھا مستُور — ماتمِ خفتِ نظر ہی رہا

آنسوؤں کو مِلی نہ راہِ خرام — دامنِ چشم تھا کہ تر ہی رہا

کوئی بارِ وفا اُٹھا نہ سکا — یہ بھی اِلزام میرے سر ہی رہا

غمِ آفاق کا بیاں تھا حفیظ
گرچہ رُوئے سخن اُدھر ہی رہا

جس کسی کو لفظوں کی قدر و قیمت سے تھوڑی بہت آگہی میسر ہو، بہت جلد محسوس کرے گا کہ یہ غزل محض قافیہ ردیف کا کھیل نہیں بلکہ اپنی جگہ

محکم اور مربوط کلام کا نمونہ ہے جس میں کسی ایک لفظ کو بھی اِدھر سے اُدھر کرنا بیحد مشکل ہے۔ یہ وہ اوپری سطح کا رائج الوقت کلام نہیں جس کو مقبول عام قسم کے گانے والے آسانی کے ساتھ کسی چلتی ہوئی دُھن میں سنا کر تالیاں پٹوا سکیں۔ اس میں ایک ایسی خود مختار قسم کی موسیقی ہے جس کو لفظوں کی اپنی اور اصلی آواز کے سوا کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔

پھر بھی اس غزل کا اندرونی استحکام محض لفظوں اور آوازوں کے بل پر بھی قائم نہیں۔ اس میں سوچ بچار، مشاہدے اور اُس چیز کو پورا دخل ہے جسے تنقیدِ حیات کا نام دیا گیا ہے۔ اگر ہم جانتے ہوں کہ یہ غزل قیامِ پاکستان کے چند برس کے بعد لکھی گئی تو ہم اس کی عصری معنویت سے بیگانہ نہیں رہ سکتے مگر کیا یہ غزل اب بھی رُک رُک کر ہم سے کچھ کہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی؟ راہبر کی تقلید کا خوف اہلِ کارواں کا میرِ کارواں سے ایک قدم آگے چلنا، اُن دیکھی صبح کا دھڑکا اور قربانیوں کے رائیگاں جانے کی اذیت۔ شاید یہ باتیں صرف اس وقت کی باتیں نہیں جب یہ حفیظ کے قلم سے نکلی تھیں۔ اچھی شاعری ہمیشہ اپنے وقت کی کوکھ سے نکلتی ہے مگر اس میں ہر اک قدم پیشتر جانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے کسی باشعور لکھنے والے کے ہاتھوں آنے والے وقتوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ سکتی ہے۔

ممکن ہے دار کے نخل سے فیض کی خشک ٹہنی یاد آئے یا وہ نظم: کہیں نہیں ہے، کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ مگر حفیظ کا لہجہ دار سے جانے کا لہجہ نہیں:

کام آیا نہ خونِ صد منصور — دار کا نخل بے ثمر ہی رہا

اوّل تو اس میں صد منصور کی بات ہے، وہ بہت سے لوگ جو تاریخ کے ہر موڑ پر حق بات کہنے کی پاداش میں لٹکائے گئے تاریخ کے اس تسلسل میں حفیظ کے لیے حیرانی کی کوئی بات نہیں نہ اِس رومانیت کی ضرورت کہ اپنے آپ کو ہیرو بنا کے پیش کیا جائے یا ایک فرد کے خصوصی کمال اور اس کے ذاتی ایثار پر اصرار کیا جائے۔ اجتماعی نظریے کا پرچار کرنا تو آسان ہے مگر اپنے جذبات میں اجتماعی فکر و احساس کے تہذیبی انکسار کو سمو لینے کا نام شاعری ہے۔ جہاں تک اپنا تعلق ہے تو حفیظ یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار ہے:

رائیگاں جذبۂ منصور رہا — نہ رہی جرأتِ منصور ہمیں

جذبۂ منصور کی توضیح شاید ایک سوانحی تفصیل سے ممکن ہو۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ حفیظ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز باغیانہ نظموں سے کیا تھا اور نوجوانوں کے سیاسی جلسوں میں دہشت پسندانہ قسم کی چیزیں پڑھنے کی بدولت ایک بار جیل جانے کا امکان بھی پیدا ہو چلا تھا۔ پھر اس کی ایسی نظمیں جن میں حفیظ (بقول احمد ندیم قاسمی) کھُل کھیلتا تھا 'انقلاب' کے اوّلین دَور میں چھپتی بھی رہیں مگر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ پڑھنے کے دوران یا پطرس اور تاثیر کے فیضِ صحبت سے ہیجانی سیاست کا شعلہ اس کے دماغ میں جلد ہی ٹھنڈا ہو گیا اور بعد میں ریڈیو کی ملازمت کے دوران تو اِس جذبۂ منصور کے بروئے کار آنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا پھر بھی رمزوں اور کنایوں میں لپٹی لپٹائی ایسی بہت سی باتیں اس کے یہاں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شعلہ صرف ظاہری طور پر ٹھنڈا ہوا تھا اس کی شدت اور حدت رگ و پے میں سمانے اور ایک نستعلیق اور شائستہ طرزِ تحریر اختیار کرنے کے باوجود اپنی جھلک دکھاتے رہتی تھی۔ اکثر اوقات یہ باطنی خصوصیت ایک دبی دبی صدا کی صورت میں مصرعوں کے بین السطور ادا ہو جاتی تھی۔ اسی ادا کی طرف توجہ دلانے کی خاطر اُس نے ادبِ لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۴ء میں اپنے مجوزہ مجموعہ کلام کا اعلان "زیرِ لب" کے عنوان سے کیا ہوگا۔ ممکن ہے اسی وجہ سے حفیظ نظم کی بجائے غزل کی طرف آیا ہو کہ غزلیہ شاعری کے مدھم لہجے پر قانون کی گرفت بھی کسی حد تک کمزور ہو جاتی ہے۔ مگر نہیں، یہ لہجہ صرف

غزل سے مخصوص نہیں ادب اور تہذیب کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے جبکہ بلند بانگ قسم کا جذبہ نفسیاتی کچے پن کی دلیل ہوتا ہے۔

پھر بھی پنڈی سازش کیس کے سلسلے میں فیض کی گرفتاری کے بعد گورنمنٹ کالج کی سالانہ نشست میں جب اُس نے وہ غزل پڑھی:

| | |
|---|---|
| نہیں پیام، رہِ نامہ و پیام تو ہے | ابھی صبا سے کہو اُن کے دل کو بہلائے |
| خدا دراز کرے عمرِ نالہ ہائے فراق | جو بارہا درِ زنداں سے جا کے ٹکرائے |
| غرورِ جادہ شناسی بجا سہی لیکن | سُراغِ منزلِ مقصود بھی کوئی پائے |
| گزر گیا کوئی درماندہ راہ یہ کہتا | اب اس فضا میں کوئی قافلہ نہ ٹھہرائے |
| نجانے اُن کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی | وہ ہمنوا جو سحر کو قریب تر لائے |

تو مجھے یاد ہے کہ سارے ہال میں ایک ایسا سناٹا چھا گیا تھا جس میں نوجوان سامعین کے سہم جانے کی آواز صاف سُنی جا سکتی تھی۔ سب لوگ دم بخود اور ہراساں تھے کہ فیض صاحب کا کچھ بگڑے نہ بگڑے، اس غریب کی نوکری اور بچوں کا مستقبل تو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بات کو دل میں رکھ کر نشتر بنانے والا یہ شاعر جو اپنے الفاظ میں اذنِ کلام سے محروم تھا، اس طرح پھٹ پڑنے کے باوجود محفوظ رہ گیا اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ نوکری میں پالیسی کی سطح کو جو اس سے دُور رکھا گیا یا بہت سے نروس بریک ڈاؤن جو اس نے جھیلے اور طویل عالمِ نزع میں کوتاہی نفس کے جس عذاب کا اس نے مقابلہ کیا، ان کے لئے کس کس کا شکریہ ادا کیا جائے؟

شاید اسی قسم کے اشتراکِ نظر کے باعث سردار جعفری صاحب نے حفیظ ہوشیارپوری کا نام ترقی پسند شاعروں کی فہرست میں لکھ رکھا ہے اور اس سے پہلے کچھ ایسے ہی اسباب کی بنا پر کرشن چندر نے ترقی پسند غزل گوئی کے نمائندہ شاعروں میں فراق، ندیم اور جذبی کے ساتھ نئے زاویے کی دوسری جلد میں حفیظ کی بھی ایک غزل شامل کی تھی مگر یہ سوال کرنا بے محل نہ ہوگا کہ فیض کی گرفتاری پر منفجر (EXPLODE) ہونے کا مفہوم کیا ہے؟ کیا واقعی حفیظ ہوشیارپوری فیض کی پارٹی لائن میں اپنے "ہمنوا" سے متفق تھا؟ کوئی بھی آدمی جو حفیظ یا اس کے کلام سے آشنا ہو اس کے ترقی پسندانہ خیالات و جذبات کے باوجود بلکہ انہی کی گہرائی کی وجہ سے یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اجتماعی نقطہ اس کا مسئلہ نہیں تھا مگر آج ہم پنڈی سازش کیس میں شرکت کے ملزمین کی مطبوعہ شہادت کی روشنی میں جو کچھ کہہ سکتے ہیں اُس وقت یہ بات اتنی صاف نہیں تھی۔ آج تو سید سبطِ حسن بھی اس کو بائیں بازو کے دانشوروں کی مہم جوئی قرار دیتے ہیں مگر اُس وقت حفیظ کے سامنے فقط فیض کی دوستی تھی جو بہرحال انسانی اقدار میں سے ایک ایسی قدر ہے جو مضبوط کردار رکھنے والوں کے لئے خصوصی کشش کا باعث بن سکتی ہے۔ اجتماعی صورتِ حال غیر یقینی ہو جائے تو ذاتی وفاداریوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور وہ بھی گومگو کا شکار ہو کر بروئے کار آنے سے کتراتی نظر آتی ہیں۔ اسی لئے فیض صاحب کے زندانی خطوط دوستوں کے تغافل کی شکایتوں سے بھرے ہیں اور اسی پس منظر میں جب فیض صاحب کو حفیظ کی غزل کا پتہ چلتا ہے تو ان کو ایک ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے جس کا انھیں انتظار تھا۔

پھر بھی اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ جس وقت پنڈی کیس کے ہدفِ خاص قائدِ ملت لیاقت علی خان پیچ مچ مارے جاتے ہیں تو حفیظ ہوشیارپوری اقبال کے اس مصرع سے "تاریخ نکالتا ہے":

صلۂ شہید کیا ہے، تب و تابِ جاودانہ

وہ غزل ایک بے ساختہ تنقید حیات تھی تو اس مصرعے کا استعمال بھی پارٹی لائن پر سوچی سمجھی تنقید سے کم نہیں ہے۔

حفیظ کے طالب علمی کے زمانے کا لکھا ہوا ایک مقالہ جوش ملیح آبادی کے بارے میں ہے اور چونکہ یہ پطرس کی بزم سخن میں پڑھے جانے کے بعد "مجلس" کے زیرِ عنوان چھپے ہوئے مجموعہ مقالات میں مل سکتا ہے، اس کا مطالعہ ممکن بھی ہے اور کم سے کم حفیظ کو سمجھنے کے لئے ضروری بھی۔ اسی موضوع پر فیض کے مشہور مقالے کے برعکس یہ تحریر جوش صاحب کی شان میں ایک قصیدہ ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ حفیظ سے مراسم کے باوجود صہبا لکھنوی نے اپنے مدحیہ جوش نمبر میں اسے کیوں شامل نہیں کیا؟ ممکن ہے اس لئے کہ "مجلس" ایک مقامی قسم کا مجموعہ تھا جو اپنے زمانے میں شاید ہی لاہور سے باہر نکلا ہو اور بعد میں خود حفیظ نے اپنے لڑکپن کی تحریر کو پھر سے چھاپنا پسند نہ کیا ہو کیونکہ ایسی غیر مشروط اور غیر ناقدانہ مداحی جس قدر کم لوگوں تک پہنچے اتنا ہی بہتر ہے۔ بہر حال یہاں سے نوجوان حفیظ کے رجحانِ طبیعت کا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اس زمانے کے شاعرِ شباب و انقلاب اپنے موجودہ علمِ لغات اور وفورِ سخن سے زیادہ اپنے باغیانہ اور دہشت پسندانہ جذبات کی وجہ سے نوجوانوں کے لئے خاص کشش کا باعث تھے۔ حفیظ کو پڑھتے ہوئے ان کی ابتدائی جوش پسندی نظر میں رہے تو ان کی غزلوں کے بعض اشعار پر حیرت نہ ہوگی۔

مجھ گنہگار کو یہ دن نہ دکھانا یا رب<br>
داغِ دل داغِ رہبان کے جبیں تک پہنچے

---

کوئی زمیں سے بھی پہنچائے آسماں کو پیام — پیامِ اہلِ زمیں کو تو آسماں سے ملے

---

لب پہ آجاتی ہے جو دل پہ گذرتی ہے حفیظ — کوئی بھی نغمہ پسِ پردۂ الہام نہیں

---

کوئی محروم ہے، کوئی مجبور ہے — پارسائی ہے، نارسائی ہے

مداحی کے باوجود اس طالب علمانہ مقالے میں تنقید کا ایک پہلو ضرور موجود ہے اور وہ ہے جوش کی غزل کے سلسلے میں حفیظ کے خیال میں "غزل اُردو شاعری کی جان ہے کیونکہ اس کی بنا اسی صنفِ سخن پر رکھی گئی ہے۔" حالانکہ یہ بات اتنی ہی درست ہوگی کہ انگریزی شاعری کی جان قصہ گوئی میں ہے کیونکہ چاسر نے پہلے پہل اس سے یہی کام لیا تھا۔ بہر حال حفیظ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ غزل کے باب میں ہمارے اکثر شعراء لکیر کے فقیر کہلانے کے مستحق ہیں اور یہ بھی کہ جوش کو اس سے مستثنےٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

خود جوش نے اُردو غزل پر جو تنقید کر رکھی ہے یعنی یہ کہ اس میں بے ربط خیالات و جذبات پائے جاتے ہیں اور کسی ایک جذبے یا خیال کا تسلسل روا نہیں رکھا جاتا یا اس میں ہجر و وصال کے پیش پا افتادہ مضامین کی بار بار تکرار کی جاتی ہے تو حفیظ اس تنقید سے نہ صرف آشنا تھا بلکہ عملی طور پر اس نے جوش کے نقطۂ نظر کو کسی حد تک اپنی غزلوں میں سمویا بھی ہے اور پھر جوش کے ایک تنقیدی نکتے کی ایک ایسی تاویل بھی ہے جو اسے کسی حد تک قابلِ قبول بنا دیتی ہے۔ جوش نے جگر کے مشہور مصرع پر جو مشہور گرہ لگائی ہے:

کچھ نہیں جوش بجز اس کے حریفوں کا کلام<br>
"[illegible]"

یہی بات حفیظ کے لہجے میں کچھ ایسی بن جاتی ہے :

بیانِ راحتِ وصل و حدیثِ دردِ جدائی
یہ راہ و رسمِ محبت مجھے پسند نہ آئی

یعنی جوش کی جارحیت کو خارج کر کے بات کو مہذب بنا دیا ہے۔

جوش کی طرح حفیظ نے بھی متعدد غزلیں پوری کی پوری ایک ہی موضوع پر لکھی ہیں جیسے :

ع جنوں میں شیخ و برہمن ہیں کس قدر کامل

ع غمِ دوراں کی ارزانی کے دن ہیں

ع ایسی بھی کیا جلدی کا پیارے ، جانے ملیں پھر یا نہ ملیں ہم

بہت سی ایسی غزلیں کہی ہیں جن میں پانچ سات شعر قطعہ بند کی صورت میں آتے ہیں جیسے :

ع دل کا درد سے معمور ہمیں

ع آدمی کائنات میں تنہا

اور ان کے علاوہ ماتمی غزلیں جن میں کسی ہمنوا کے انتقال پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے ۔ جگر کے بارے میں :

بساطِ محفلِ دوشیں کی یادگار تھی جو
وہ مشتِ خاک بھی بادِ سحر کے ساتھ گئی
فضا میں گونج رہی ہے سنی ہوئی آواز
اگرچہ نغمہ گری نغمہ گر کے ساتھ گئی

اور حسرت موہانی کی یاد میں :

حدِ قفس میں رہ نہ سکا شعلۂ نوا — اک آگ سی لگی ہوئی سارے چمن میں تھی
وہ جرأتِ خیال، وہ بے باکیِ فغاں — تھی تیغِ بے نیام زباں کیا دہن میں تھی
تیرے خلوصِ غم کو ہوئی وہ خلش عطا — جو قلبِ شیخ میں نہ دلِ برہمن میں تھی
خود آگہی کا راز تری بیخودی میں تھا — فرزانگی نہاں ترے دیوانہ پن میں تھی

اُس بوئے فقر سے ہے معطر مشامِ جاں
وہ بوئے فقر جو کہ ترے پیرہن میں تھی

چراغ حسن حسرت کے بارے میں :

حسنِ اندازِ بیاں کے ساتھ ساتھ — جرأتِ اظہار کی باتیں کریں
بات کرنے کا سلیقہ تھا جسے — آج اس فنکار کی باتیں کریں

چھڑ گیا ذکرِ خلوص بے ریا　　　حسرتِ بیزار کی باتیں کریں

شاید اس سلسلے کی خاص الخاص چیز وہ ہے جو سعادت حسن منٹو کی موت پر لکھی گئی ہے:-

جس کا طریق تھا وہ رسمِ جہاں سے دُور

ان غزلوں میں ربطِ کلام کے علاوہ اور پہلو بھی اہم ہیں۔ ایک تو یہی کہ ہمارے دور میں ایسا وسیع القلب اور وسیع النظر بزرگ شاعر حفیظ کے سوا کون تھا یا اب بھی ہے؟ غالب نے آتش جیسے بزرگ کے بارے میں جو کہا تھا کہ غزل اچھی کہتے تھے مگر یک فنی تھی تو حفیظ اس اعتراض کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ آج کے بزرگ غزل اچھی کہیں نہ کہیں، یک فنی ہونے پر بہت اصرار کرتے ہیں حالانکہ انگریزی کہاوت کے مطابق جو لوگ صرف انگلستان کو جانتے ہیں وہ انگلستان کے بارے میں کیا جان سکتے ہیں؟ حفیظ کو اپنے علاوہ معاصرین کے کلام سے گہری دلچسپی تھی جبکہ آج اپنی شہرت کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی خال خال ہی ملے گی۔ پھر ان غزلوں میں حفیظ نے کردار نگاری اور تنقیدی اشاروں سے بھی کام لیا ہے اور مرنے والے شاعروں کی اپنی زمینوں میں اچھے شعر نکال کر ان کو پوری فراخدلی اور ذمہ داری کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ہمارے دور میں کسی زندہ مُردہ لکھنے والے کی ذمہ دار تحسین کا رواج نہیں، تعزیتی بیانوں اور اسی قسم کے مضمونوں کی بات دوسری ہے بلکہ ہم تو کسی کی کوئی چیز بھی توجہ سے پڑھتے ہوئے ڈرتے ہیں، کہیں دوسرے کا جادو ہم پر نہ چل جائے یا اپنی قلعی نہ کھل جائے۔ چنانچہ اکثر اوقات ہم جن لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں اُنہی کی مخالفت کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں تاکہ ہم پر کسی سے متاثر ہونے کا الزام نہ لگ سکے۔ اُدھر الزام لگانے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں کہ جہاں اُنھیں دو شاعروں کے کلام میں کوئی سرسری مشابہت نظر آئی فوراً ایک کو دوسرے کا خوشہ چیں بنا کے رکھ دیا اور دونوں میں جو جو اہم امتیازات پائے جاتے ہیں ان کو یک قلم فراموش کر دیا۔ چنانچہ حفیظ کو بھی اپنی وسیع النظری کی قیمت ادا کرنا پڑی۔

میرے محترم جناب مجتبیٰ حسین نے حفیظ کی موت کے فوراً بعد شاید جلدی میں لکھ دیا ہے کہ،

"حفیظ کا لہجہ معتدل ہے، اس میں حزن اور ملال ہے مگر شائستہ انداز میں۔ یہ سوچتے ہوئے لہجے کی شاعری ہے جو ہمیں فراق صاحب سے ملی تھی۔ اس لہجے میں ہجر و وصال دونوں کا ایک امتزاج پایا جاتا ہے اور اسی امتزاج سے وہ عالم بنتا ہے۔ جہاں نہ غم ہے نہ نشاط بلکہ ایک تیسری کیفیت ہے جس کا ایک نام وقت ہے اور گذرانِ وقت۔"

گذرانِ وقت حفیظ کا مسئلہ کبھی نہ تھی اور فراق سے متاثر ہونے کا الزام بھی کم سے کم اتنا پرانا ضرور ہے جتنا کہ فنون کا جدید غزل نمبر جس میں حفیظ کی غزلیں پیش کرتے ہوئے مجتبیٰ صاحب کے اس نیاز مند نے لکھا تھا کہ بعض لوگ حفیظ کو اپنے ممتاز اور کسی قدر سینیئر ہمعصر فراق گورکھپوری کا مقلد وغیرہ بھی سمجھتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ حفیظ کے یہاں دو چار ترکیبیں، چند ایک اشعار اور ایک آدھ غزل ایسی مل جائے گی جو فراق کی یاد دلاتی ہو مگر یہ بھی عرضِ خدمت کیا تھا کہ حفیظ کے بعد کے کلام سے جو شخص واقف ہے دیکھ سکتا ہے کہ اس کی غزل فراق کی غزل سے اتنے ہی فاصلے پر واقع ہے جتنا کہ (مثلاً) ایک مسلمان ایک کائستھ سے۔

جناب رگھوپتی سہائے فراق پر کائستھ پن کی پھبتی میرے ایک مہربان کو بے حد چبھی ہے اور میں اسے فاصلے کی مثال دینے کے لئے بھی معذرت خواہ ہوں مگر اس کا کیا کروں کہ فراق صاحب اپنے جملہ کمالات کے ساتھ ایک وہ پہلو بھی رکھتے ہیں جو رتن ناتھ سرشار کے "سیر کوہسار" کے خوجی نما دیوان جی مہراج بلی کی یاد دلاتا ہے۔ میں تو ویسے بھی ایک متعصب آدمی سہی، کم سے کم حفیظ کی بے لاگ حساسیت کو اس بات کی داد

دیا لازم ہے کہ لاہور شہر میں انہوں نے شعلۂ ساز کی اشاعت سے بہت پہلے بہت سے لوگوں کو اس کے منتخب اشعار سنا کر اس اپنے وقت کے ایک ایسے شاعر کی طرف توجہ دلائی جو الٰہ آباد کے آس پاس بھی شعلۂ ساز کے بعد ہی معروف ہوا۔ اس وقت حفیظ کے قریبی دوستوں میں شاید ہی کوئی فراق سے آشنا ہو سوا فیض صاحب کے جن کی فراق سے گہری ناپسندیدگی کی خبر مجنوں صاحب کو بھی ہوگی۔ بہرحال فراق نے جس وجہ سے حفیظ کو اپیل کیا ہوگا وہ "ہجر و وصال کے امتزاج" کی بنا پر نہیں ہو سکتا کیونکہ جو آدمی ایک بار جوش کی منزل سے گزر چکا ہو اور شاد، یگانہ اور شاد عظیم آبادی کے یہاں بھی اس چیز کو دیکھ چکا ہو اس کے لئے یہ بات کوئی اتنے بڑے اچنبھے کی بات نہیں ہو سکتی۔ البتہ فراق نے جس لطافتِ انداز نظر کے ساتھ جدید شاعری کے دور میں جدید غزل کا چراغ روشن کیا اور اس سلسلے میں شاد و یگانہ کے علاوہ بالِ جبریل، آیاتِ وجدانی، باقیاتِ فانی اور انتخابِ حسرت سے جو کام لیا حفیظ کو اس میں ضرور اپنے مزاج سے کوئی مناسبت محسوس ہوئی ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فراق کے اپنے واقعاتی "لہجے کی تھرتھراہٹیں" حفیظ کے یہاں مل جاتی ہیں۔ ساتھ ہی دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ چراغ سے چراغ جلنے پر روشنی کم تو نہیں ہوتی:

اس ہجومِ زندگی میں عشق ہی تنہا نہیں — حسن کو بھی تو کوئی صاحبِ نظر ملتا نہیں

———

آؤ انجامِ وفا کی تلخیوں کو بھول جائیں — ذکرِ آغازِ وفا کچھ تم کرو کچھ ہم کریں
چھا گئی ہے یمِ وفا سے روح پر افسردگی — جی میں آتا ہے مزاجِ دوست کو برہم کریں

———

کہیں نصیبِ نظر، اضطراب ہی نہ رہے — تمام عمر بحالِ خراب ہی نہ رہے
نگاہ خیرہ، زباں تشنہ ہی رہے نہ کہیں — سرابِ وحشتِ تمنا سراب ہی نہ رہے
ملائیں چاکِ سحر سے جو دامنِ شب کو — وہ گردشیں نہ رہیں انقلاب ہی نہ رہے
ترس گئے ہیں بدلتی ہوئی نگاہ کو بھی — تری نگاہ کے وہ انقلاب ہی نہ رہے

یہ بھی درست کہ بعض جگہ فراق سے مشابہت اتنی زیادہ ہے کہ حفیظ کے چند ایک شعر شعلۂ ساز یا غبنستان کے نئے ایڈیشن میں شامل کر دیئے جائیں تو پہچان مشکل ہو۔ پھر بھی ان کا شمار فراق کے اچھے شعروں ہی میں ہوگا:

روا نہیں ہے غمِ عشق اس قدر بھی غرور
ترے بغیر بھی دنیا کے کام چلتے ہیں

———

تُو نے اسے تعبیر کیا عشق سے ورنہ
کس کے لئے اے دوست پریشاں ہوئے ہم

———

کون ہے اب جو سنبھالے گا نظامِ عالم       اک محبت ہی محبت نظر آتی ہے مجھے

مجتبیٰ صاحب سے اتنا گلہ اس وجہ سے ہوا کہ نقاد کا کام صرف مشابہت تلاش کرنا نہیں امتیازات پر غور کرنا بھی ہے مگر اُن کے جواب میں یا ویسے ہی اپنے شوق سے جناب ضیاؔ جالندھری نے عجیب دھاندلی مچائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "وہ بات جو فراقؔ کی شاعری کی تیسری خصوصیت ہے اس کی ابتدا حفیظؔ نے کی"۔ حالانکہ یہ تو اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب تاریخِ ادب کو سیاسی جماعتوں کی تاریخ بنا کے رکھ دیا جائے مگر جناب ضیاؔ نے محض اتنی روشنی پر قناعت نہیں کی یہ بھی لکھ دیا کہ "وہ شاعری جو ناصر کاظمی نے ہمیں دی وہ حفیظؔ ہی کا پَرتو ہے لیکن حفیظؔ کی بے نیازی نے اپنا حق بھی دوسروں کو دے دیا۔" اس کا مطلب شاید یہی نکلے گا کہ حفیظؔ تو اپنا مجموعۂ کلام مرتب کرنے کے سلسلے میں آس پاس کے لوگوں کا انتظار کرتے رہے البتہ ناصر کاظمی نے تقریباً یہی کام اپنے نام سے سرانجام دے دیا تو حفیظؔ اپنا دیوان چھاپنے سے منحرف ہو گئے۔ اندازہ کیجیے کہ جب کوئی آدمی تنقید لکھنے بیٹھے اور تاریخی صداقتوں کے ساتھ امتیازاتِ سخن کی بھی کوئی پرواہ نہ کرے تو بات کہاں تک جا سکتی ہے۔

اس مضمون میں حفیظؔ اور ناصرؔ کے تقابل کا کوئی موقع نہیں نہ اس کی ضرورت خصوصاً جبکہ محترم ظہیر کاشمیری نے پہلے سے ایک معقول بات لکھ رکھی ہے۔

"حفیظؔ کو ناصر کاظمی جیسا ہونہار شاگرد ملا اور ناصر کاظمی کو حفیظؔ جیسا منجھا ہوا اُستاد۔ یہ سب مقدر کی بات ہے۔"

ہاں مقدر سے اگر یہ مراد ہو کہ دونوں کے لئے جو راستہ مناسب تھا وہ انہوں نے اپنے لئے منتخب کر لیا تو مقدر کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی تحسین اُن کی بھی لازم ہوگی اور ظہیر صاحب یہ بات مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

یوں اپنے طور پر حفیظؔ نے ناصر کاظمی کی منزل "مجموعی طور سے پسند" کی ہے اور بسترِ مرگ پر جن دو مرنے والے ہمنواؤں کو یاد کیا ہے ان میں ایک ناصرؔ بھی ہے:۔

کوئی ناصرؔ کی غزل، کوئی ظفرؔ کی مے تیز رنگ       چاہیے کچھ تو مری شامِ عیادت کے لئے

جیسا کہ "مے تیز رنگ" سے بھی ظاہر ہو سکتا ہے یہ ظفرؔ، یوسف ظفرؔ نہیں، سراج الدین ظفرؔ ہیں جن کی خمریات میں شاید حفیظؔ کی زاہدانہ زندگی کو نفسیاتی تلافی کا کوئی سامان نظر آیا ہو اور جو نوجوانی میں حفیظؔ کے ساتھ لاہور کے طرحی مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

آج جب طرحی مشاعروں کا رواج بہت کم ہو چلا ہے حفیظؔ کی غزلوں پر اس کی گہری چھاپ دیکھ کر اس کو ناپسند کیا جائے گا۔ ایسا ہوا تو یہ کوئی غلط رویہ بھی نہیں ہوگا کیونکہ ظہیر کاشمیری کے الفاظ میں شاعر کو مانجھنے کے علاوہ مشاعرے کا ادارہ ایک ڈھلے ڈھلائے مذاقِ سخن اور معاشرتی رویّے کو شاعر پر مسلط کرنے کے لئے معاشرتی دباؤ کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ ورکم سے کم ہمارے دور میں جس شاعر نے بھی کسی وقت مشاعرے کی مشارویلیو کو اپنے کمال کی دلیل سمجھنا شروع کیا اس نے اپنے اوپر تازہ روشنی اور ہوا کے تمام رستے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر لئے۔ پھر بھی حفیظؔ نے اپنے تربیتی دور کے بعد کسی بھی قسم کے مشاعرے میں کم ہی شرکت کی۔ نوجوانی میں اس نے بہت سی رائج الوقت طرحوں پر غزلیں کہیں اور اچھی خاصی مشقِ سخن بہم پہنچائی مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی اس نے ان سکّہ بند زمینوں میں اچھے خاصے وارداتی شعر بھی نکالے ہیں:

زمین ہے:    قرار ہم نے کیا، اختیار ہم نے کیا۔ حفیظؔ کا مطلع ہے:۔

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا       اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا۔

نظر کے لئے، سحر کے لئے :

خدا دراز کرے عمرِ اہلِ شوقِ حفیظ ۔۔۔ کہ جی رہے ہیں کسی دورِ منتظر کے لیے

گلستاں کر رہا ہوں یں بیاباں کر رہا ہوں میں :

وہ آنے بھی نہیں پائے وہ آئیں گے تو جائیں گے
ابھی سے انتظارِ شامِ ہجراں کر رہا ہوں میں

محبت کی حقیقت اے حفیظ اس کے سوا کیا ہے
بہت مشکل تھا جینا اس کو آساں کر رہا ہوں میں

یہاں بھی نہیں، وہاں بھی نہیں :

قفس بھی توڑ چکے ہیں ستم نصیب حفیظ
چمن میں شاخ کوئی بہرِ آشیاں بھی نہیں

پریشاں کیوں نہیں ہوتی، بہاراں کیوں نہیں ہوتی :

ازل سے آج تک گردش میں لاکھوں آفتاب آئے
محبت کی شبِ غم صبحِ خنداں کیوں نہیں ہوتی

مگر یہ کیفیت ہر جگہ بلکہ اکثر جگہ برقرار نہیں رہ سکتی - زیادہ تر شعر بلکہ غزلوں کی غزلیں یوں لگتا ہے جیسے کمپیوٹر پروگرامنگ کے بعد کمپیوٹر سے نکالی گئی ہوں - صرف ایک مثال کافی ہے :

کچھ دوست مل گئے ہیں یہاں اتفاق سے
ملتے ہیں ورنہ دوست کہاں اتفاق سے

ایک زمین ہے : کہی ہم نے، سنی ہم نے - اس میں جہاں ایک ایسا شعر نکل گیا ہے :

کوئی دیکھے ہمارے احترامِ عہدِ رفتہ کو
وفا پر اب بھی قائم ہیں محبت چھوڑ دی ہم نے

وہاں ایک ایسا شعر بھی ہے جس کا جذباتی کچا پن صرف آج کل کی نئی سے نئی نظموں میں ملے گا :

وفا قائم بھی کر دیں ہم بھی کریں، انجام جو بھی ہو
کسی کے سامنے رکھ دی یہ شرطِ آخری ہم نے

بہر حال اچھا ہوا کہ حفیظ نے آزادی کے بعد مشاعروں میں شرکت کم کر دی ورنہ استادی کا یہ انداز تھوڑے سے، بہت تھوڑے سے بیت الغزل عطا کرنے کے علاوہ اور کیا دے سکتا تھا۔ ہاں تربیت کے دور میں حاصل کی ہوئی فنی مہارت کو تحت الشعور میں دھکیل کر جب بھی اس نے کسی واقعے، واردات یا کیفیت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے تو مکمل غزلیں وجود میں آئی ہیں :

دشوار کس قدر ہے وفا کا مقام بھی
دنیا کا بھی خیال، ترا احترام بھی
رو کے رہیں گے شورِ قیامت کو تابہ کے
دُکھتے ہوئے دلوں کو ذرا آئے تھام بھی
فکرِ سخن اب ان کو مبارک ہو اے حفیظ
فرصت کے ساتھ جن کو ہے اذنِ کلام بھی

پوری غزل میں ذاتی واردات عصری معنویت اور فنی مہارت ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں۔

حفیظ کی فنی مہارت سے تفصیلی بحث اس لئے بھی ضروری ہے کہ اکثر اوقات اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ سن چالیس کے قریب ندیم نے منٹو کے نام اپنے کسی خط میں حفیظ ہوشیار پوری کا ذکر کیا ہوگا۔ منٹو نے کسی رو رعایت کے بغیر لکھ دیا کہ ان کا چرچا تو بہت سنا ہے مگر ان کی کسی چیز نے متاثر نہیں کیا۔ یوں منٹو شعر کے سلسلے میں خاصا منکسر طبیعت کا مالک تھا اس کو خود تسلیم ہے کہ وہ شعر یاد نہیں رکھ سکتا بلکہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتا پھر بھی وہ اپنے طور پر شاعری سے لطف اندوز ہو سکتا تھا یہ الگ بات کہ اس وقت تک اس کو حفیظ کے یہاں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی اور اس میں منٹو کا قصور بھی نہیں۔ جناب عبدالحمید عدم نے کئی برس گذرنے کے بعد بھی حفیظ پر غزلباف کی پھبتی کسی ہے جو چھبتی ہوئی اس لئے لگتی ہے کہ جزوی طور پر کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔ بعض اوقات حفیظ لفظوں کے الٹ پھیر سے ایک سرسری قسم کی لذت یا تفریح بھی لینے لگ جاتا ہے۔

آشنا ہو کے ہے بیگانہ حفیظ — تیری محفل میں، تری محفل سے
جلووں سے کم نہیں ترے جلووں کی یاد بھی — حیرت میں ہے نظر کبھی حیرت نظر میں ہے
میں اپنے حال کو ماضی سے کیوں کہوں بہتر — اگر وہ حاصلِ غم تھا تو یہ غمِ حاصل
کونسی، کس کی ادا کیوں مجھے آئی ہے پسند — کہیں آسودہ مرا ذوقِ نظر ہو تو کہوں
کیوں ملاقات سرِ راہگذر ہوتی ہے — اب ملاقات سرِ راہگذر ہو تو کہوں
رقص کرتے رہو کرتے رہو اے دیوانو — اپنے ہی گرد کئے جاؤ، کئے جاؤ سفر
عشق فرصت طلب و لمحۂ فرصت نایاب — تو جسے یاد نہ کر، تو جسے اب یاد نہ کر

مگر بعض جگہ لفظوں کے الٹ پھیر کسی باطنی ضرورت کو پورا کرنے یا کسی اور وجہ سے ایک ایسا کرشمہ سا دکھاتے ہیں کہ شاعری کے بے حد قریب پہنچ جاتا ہے:-

حفیظ کب انھیں دیکھا نہیں برنگِ دگر — حفیظ کب وہ برنگِ دگر نہیں آتے
دل کی خلش مٹی ہے ترے نام سے کبھی — دل کی خلش بڑھی ہے کبھی تیرے نام سے
دل کی دنیا اس قدر آباد ہے — جس قدر ویراں ہیں چشم و گوش و لب
جس قدر ہے ہجومِ غم خواراں — اُس قدر غم کی ہے فراوانی

ایک رستے کی سبھی انتہا منزلیں ایک منزل کے بے انتہا راستے
حفیظؔ اُن سے میں جتنا بدگماں ہوں وہ مجھ سے اُس قدر برہم نہ ہوں گے
کس طرح میں نے گزاری ہے شبِ ہجر حفیظؔ کہیں میری شبِ ہجراں کی سحر ہو تو کہوں
سراغِ عمرِ گذشتہ ملے کہیں سے حفیظؔ سراغِ عمرِ گذشتہ مگر کہاں سے ملے

اس آخری شعر میں نوحؔ ناروی کی طرح ایک دو لفظ بدل کر دوسرا مصرع پیدا کیا ہے مگر اس میں ایک وارداتی کیفیت بھی آگئی ہے۔

یہ بحث دیکھ کر ہمارے زمانے کے بہت سے لوگ یہ سوال کرنے پر مجبور ہوں گے کہ حفیظؔ ماہرِ فن تھا یا شاعر بھی تھا؟ شاید ان کو ایسی چیز کی تلاش ہو جن میں ہنرمندی ہو بھی تو غیر محسوس طریقے پر ہو، شعر کی گہرائی میں ہو، سطح پر نہ ہو۔ حفیظؔ کے یہاں ان کو ایسے اشعار بھی مل جائیں گے جو ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی شہادت دیں گے اگرچہ مولوی حالی کی طرح حفیظؔ نے بھی ایک آدھ جگہ اس چوٹ کے وجود یا شاعری کے لئے اس کی ضرورت سے انکار کیا ہے۔ پھر بھی اس کا صرف ایک شعر اس کی دردمندی کے ثبوت کے لئے کافی ہوگا۔

دل میں اک شور سا تھا اٹھا تھا کبھی پھر یہ ہنگامہ عمر بھر ہی رہا

مگر سادہ، وارداتی اور دل میں گڑ جانے والے شعر اس کے یہاں تقریباً ہر دور میں ملتے ہیں :-

وہ ایک جلوۂ صد رنگ اک ہجومِ بہار نجانے کون تھا، جانے کدھر گیا، کوئی
نگاہِ شوق کی محرمیوں سے ناواقف نگاہِ شوق پہ الزام دھر گیا، کوئی
یہ کہہ کے یاد کریں گے حفیظؔ دوست مجھے وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا، کوئی

---

اک عمر سے ہم تم آشنا ہیں ہم سے مہر و انجم آشنا ہیں
دل ڈوبتا جا رہا ہے پیہم لب ہیں کہ تبسم آشنا ہیں

---

یہ مرحلہ بھی قیامت کا مجھ پہ گزرا ہے نہ عرضِ حال کا یارا نہ خامشی کا محل
شبِ سیاہ جہاں سے گزر گئے اہلِ وفا چراغ داغِ جگر لے کے اے حفیظؔ نکل

---

اگر ہے جرم محبت میں سانس لینا بھی تو دیکھ لو کہ مرے لب پہ آہ بھی تو نہیں
وفا کا ذکر کریں تو کسے یقین آئے ترے سوا کوئی اس کا گواہ بھی تو نہیں

---

وہ کیا کریں گے گر نہ ملا مجھ سا بے وفا دل کانپتا ہے ترکِ محبت کے نام سے

---

نہ چھیڑو قصۂ ترکِ محبت — کہ یہ میری پشیمانی کے دن ہیں
کوئی خود بیں نہیں ملتا جہاں میں — یہ آئینوں کی ویرانی کے دن ہیں

---

لب پہ آتی ہے دل سے بات حفیظ — بات دل میں کہاں سے آتی ہے

---

نہ پوچھ کیوں مری آنکھوں میں آ گئے آنسو — جو تیرے دل میں ہے اس بات پر نہیں آئے

---

چلے گئے جو حریفانِ دلنواز حفیظ — اب ان کا ذکر ہے اور یادِ گرمیِ محفل

---

محبت کو دعائیں دے رہا ہوں — کہاں میں اور کہاں یہ دولتِ غم

---

تمہیں یہ فکر پریشاں ہے میرا حال بہت — مجھے یہ غم کہ تمہاری نظر سے گذرا ہے

---

اس نے تو خیر تم کو بھلایا ہی تھا حفیظ — یہ کیا کیا کہ تم نے بھی اس کو بھلا دیا

---

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے — تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

---

قیامت خیز نکلی وادیِ ترکِ محبت بھی — بھلایا تھا جسے منزل بہ منزل یاد آتا ہے

یہ بھی حفیظ محض منتخب اشعار کا شاعر نہیں ۔ راشد اور میراجی کے دور سے اپنے آپ کو تھوڑے سے چیدہ چیدہ ابیات کی مدد سے نکالا نہیں جا سکتا تھا اگرچہ آج پھر ہمارے دور میں وہ کیفیت پیدا ہو چلی ہے کہ کوئی ایک مصرع بھی روشن کہہ دے تو غنیمت معلوم ہوتا ہے مگر حفیظ نے اس قسم کے ایک ہزار مصرعے بھی کہے ہوتے تو ایسا شاعر نہ بن سکتا جیسے لوگ فراق سے بڑا مانتے یا ناصر کا کمال اس کے کھاتے میں ڈالتے۔ ایک لحاظ سے اس کی شاعری محض کسی غزل گو کی معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے موضوعات اور اجتماعی اندازِ نظر کے لحاظ سے اپنے ترقی پسند ساتھیوں کے پاؤں ملا کے چلتا ہوا نظر آتا ہے اور تاریخ کے ایک موڑ پر ان سے ایک دو قدم آگے بھی اُس کی غزل کا غالب رجحان کیا ہے! شاید کوئی ایک نہیں یا اس نے بنانا نہیں چاہا۔ اس نے غزل کو ایک بالکل نیا اور اچھوتا اندازِ بیاں نہیں بخشا مگر اس نے اردو زبان کو چند ایک بہت اچھی غزلیں اور بہت سے عمدہ شعر ضرور دیئے ہیں۔ خود اس کو کسی اَن دیکھی انوکھی طرز [illegible] ہونے کا دعویٰ نہیں تھا نہ اس نے کوئی ایسی انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ہر شعر پر اس کی اپنی چھاپ ہو۔ شاید اس کو خود اپنی حدود و قیود کا اندازہ تھا کہ اردو غزل میں ایک نیا غالب یا ایک نیا اقبال پیدا ہونے کا وقت نہیں آیا اور اس کی طبیعت کے جذبِ انکسار اور اخلاقی رچاؤ نے اسے جعلی انفرادیت کا علم اُٹھانے سے بچا لیا اور یوں جدید اردو نظم کے دورِ عروج میں بھی ہمیں ایک ایسا غزل گو شاعر نصیب ہو سکا جسے آج بھی پڑھا جا سکتا ہے ۔

# شہاب کے افسانے

## ڈاکٹر حنیف فوق

اردو افسانہ نگاری میں قدرت اللہ شہاب کے افسانے ایک نئی سمت کا اضافہ ہیں۔ شہاب نے زندگی کو ایک راہب کی نظر سے دیکھا اور ایک فن کار کی چھا جانے والی قوتِ اظہار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ زیرِ نظر افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی سے گہری وابستگی کے باوجود، جو اعلیٰ تخلیق کے لئے ضروری ہے، افسانہ نگار کی شخصیت کا مرکزی گوشہ بیان کردہ احوال و کوائف سے ایک حد تک غیر متعلق رہتا ہے۔ اس تعلق اور لاتعلقی ہی میں شہاب کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں کے محسوساتی پیکر ہیں، جہاں کئی سمتوں کا احساس ہوتا ہے، وہاں یہ سمتیں ٹوٹ کر ایک نئی سمت کا اشارہ بن جاتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں معلوم جہتوں کے علاوہ لامعلوم جہت کی نشان دہی بھی ملتی ہے۔ بعض اوقات یہ اشارہ اتنا نازک اور لطیف ہوتا ہے کہ اگر نظر حساس نہیں ہے تو اس کی معنویت و پرکاری کا نقش پوری طرح مرتسم نہیں ہو پاتا۔ البتہ بعض افسانوں میں قاری کے لئے یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ وہ افسانہ کی دروبست پر توجہ کرے یا اس کے مجموعی نقش کی لطافت کا جائزہ لے۔ یہاں شہاب کے افسانے کی جزئیات پر مہارت کے ساتھ ساتھ زندگی کے نئے نظارہ کی صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ایسے افسانوں میں ذات کی بصیرت مجموعی زندگی کی بصیرت میں ڈھل جاتی ہے۔ شہاب کے افسانوں میں اکثر اس نظر کے عرفان کا کرشمہ نظر آتا ہے، جس سے موجودہ تہذیب نے بڑی حد تک ہمیں محروم کر دیا ہے۔ لیکن یہ نظر حقائق سے گریز کرنے کے بجائے ان کا ایک نئے انداز میں تجزیہ کرنا سکھاتی ہے۔ شہاب کے افسانے زندگی کی بے رنگی پر طنز کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی رنگا رنگیوں سے مالا مال ہیں اور یہی شہاب کے فن کا کمال ہے۔

شہاب کے افسانوں میں ماحول کی بڑی اچھی پرکھ ملتی ہے اور حساس مشاہدہ نے تفصیلات کو جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے ہارڈی کے بارے میں لکھتے ہوئے فطرت اور زندگی کی ناقابلِ فہم، وسیع اور غیر معلوم اخلاقیات کا جو ماورائے شعور ہے، تذکرہ کیا ہے۔ اگر ایسی کوئی قوت ہے تو شہاب نے اسے شعور کی تربیت اور زندگی کے مسائل و مراحل کے انکشاف میں صرف کیا ہے۔ حقیقتاً جسے ماورائے شعور کہا جاتا ہے وہ اپنے ماحول کی جانب خطرناک و وسیع ترین ایمانداری اور ذاتی بے نفسی کا رویّہ ہے۔ یہ رویّہ، جس کے خطرات عام زندگی میں کسی سے پوشیدہ نہیں، اظہارِ فن کے لئے بھی پھولوں کی سیج سے زیادہ کانٹوں کا بستر ہے کہ اس میں خونِ جگر سے رنگینی آتی ہے۔ شہاب کے افسانوں میں ماحول کے خاکے اسی خونِ جگر سے کھینچے گئے ہیں اور ماحول ایک پُراسرار قوت کی طرح بار بار ان کی شخصیت کو مسحور کر لیتا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت کا مرکزی گوشہ برابر اس سحر سے بچ نکلنے کی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔ شہاب کے افسانوں میں اخلاقیات کی خلاقانہ صورت سازی اور فنکارانہ نظر کی اپنے گردوپیش سے لاتعلق وابستگی بہت کچھ اسی تصادم و آویزش کا نتیجہ ہیں۔

میتھو آرنلڈ کا خیال تھا کہ موجودہ دور میں شاعری (یا عمومی طور پر ادب) مذہب کی جانشینی میں سرگرم و مصروف ہے۔ یہ خیال

بنیادی طور پر صحیح ہو یا نہ ہو، اتنی بات بہرحال یقینی ہے کہ اس دور میں جب اقدار کی شکست و ریخت کا عمل جاری ہے، حساس لکھنے والے اس شکست و ریخت سے متاثر ہو کر جہاں اقدار کی پامالی کا ماتم کرتے ہیں، وہاں ایک نئے نظامِ اقدار کی تلاش سے باز نہیں رہ سکتے شہاب نے ماحول کی کثافتوں کے اثر سے عقائد و تصورات کی قلبِ ماہیت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کے تمثالِ حسن کو سامنے رکھا ہے اور یوں ان کے افسانوں میں ایک نئی اخلاقی تہہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تہہ داری اپنا جواز آپ ہے۔ آرنلڈ کے مفروضہ کے مطابق اسے مذہب کے سکے میں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ شہاب نے اسے خالص فنی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس پر تبلیغ اور وعظ کا ٹھپہ نہیں لگایا اور یہی ان کے فن کی بڑائی ہے۔ ان کے افسانے اخلاقیات کے عمیق احساس کے باوجود محض اصولوں کا بیان نہیں ہیں۔ بلکہ زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر ماحول و کردار کے مختلف گوشوں کی، جو ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہیں، نشان دہی کرتے ہیں۔ ماحول و کردار کی مطابقت، وابستگی اور اثر اندازی سے شہاب نے بڑے کام لئے ہیں۔ ان کے افسانے جغرافیہ کے ایسے نقشے کے مطابق ہوتے ہوئے بھی، جس میں زمین اور زمین کی تہوں کے سارے خزائن و خصوصیات کو پیش کر دیا گیا ہو، اس زمین پر بسنے والوں کے خصائل و اعمال سے سب سے زیادہ سروکار رکھتے ہیں۔ یہ افسانے اکثر زندگی کے جس گوشہ کو مرکزِ توجہ بناتے ہیں، وہی گوشہ پھیل کر ایک عالم پر محیط ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان افسانوں میں جو وسعت و گہرائی آتی ہے وہ اپنے حدود کی تعبیر کرتے ہوئے زندگی کی لامحدود قوت، خیر و شر کے پیہم تصادم اور انسان کی گمراہی و تمنائے نجات کے مختلف و متنوع جلووں کی پیدا کردہ ہے۔ اس سلسلہ میں شہاب نے ذاتی مشاہدہ سے بھی کام لیا ہے اور افسانہ تراشی میں ادبی تخیل کو بھی راہ دی ہے لیکن حقیقت اور افسانہ کا یہ امتزاج اتنا لطیف ہے کہ بیدلؔ کے الفاظ میں اسے "عرضِ جوہرِ اسرار" کہا جا سکتا ہے۔

اچھے افسانہ نگاروں نے اہم و غیر اہم تفصیلات کے انتخاب و بیان میں اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے لیکن قدرت اللہ شہاب کے بعض افسانوں میں غیر اہم تفصیلات بھی بعض اوقات ایسی غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں کہ اہم و غیر اہم کی یہ تفریق ہی بیکار معلوم ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ ان کی فنکارانہ نظر اس بظاہر غیر اہم تفصیل میں وہ کچھ ڈھونڈھ نکالتی ہے جس کی روشنی میں پورا افسانہ ایک نئی دریافت کی شان حاصل کر لیتا ہے اور یوں بظاہر غیر اہم نظر آنے والی تفصیل کی چول پورے افسانے سے اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ اسے نکال دیا جائے تو پھر فن کا دروازہ کسی سم سم کے جادو سے کھلنے کا امکان نہیں رہتا۔ جب بظاہر غیر اہم نظر آنے والی تفصیل اتنی اہمیت اختیار کر لیتی ہے تو اسے غیر اہم کہنا ہی بیکار ہے۔ لیکن یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اسے قدرت اللہ شہاب کے فنی تصور کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کی معمولی سے معمولی تفصیل افسانہ نگار کی نظر میں مقدس حیثیت رکھتی ہے۔ اس دائرہ میں قدرت اللہ نے اپنے طور پر اشیاء کے تناسب کو مدنظر رکھا ہے لیکن ان کے تناسب و ترتیب کا معیار دوسرے افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔ اسی لئے ان کے افسانے میں بعض جگہ ان مقامات پر "جہانِ دیگر" کا احساس ہوتا ہے، جہاں سے دوسرے افسانہ نگار سرسری گذر جاتے ہیں۔ یہ مقاماتِ تامل ان کے فن کی نازک پرکاری کا اظہار بھی ہیں اور زندگی کی حرمت کے متعلق ان کے تصورات کی وضاحت بھی کرتے ہیں ان کے افسانوں میں ذاتی مشاہدہ کا عنصر ذات کی سطح سے ابھر کر عام انسانی سطح کی بلندیوں اور پستیوں کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ سوزِ آرزو مندی کی مشعلیں سی جل اٹھتی ہیں۔ اگرچہ محض افسانوں یا مجموعی طور پر ادب میں یہ طاقت نہیں کہ زندگی زشت صورتوں کو

بغیر انقلابی عمل کے بدل سکے لیکن یہ سوز آرزو مندی اس انقلابی عمل کے لئے مشعلِ راہ ضرور ہے۔ اس لحاظ سے شہاب کے افسانے وہ آئینے ہیں، جن میں زندگی کے بعض خوابوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ذریعہ ہماری روزمرہ کی زندگی پر سرمایہ، سیاست اور بین الاقوامی سازشوں کے بچھتے ہوئے مناظر کی گرفت کا احساس ہونے کے ساتھ ساتھ آرزوئے بیکراں کی کھڑکی بھی کھل جاتی ہے اور اس دریچے سے آبادیوں نئی تانوں کی موسیقی گونج اٹھتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے اس مجموعہ میں تین رپورتاژ شامل ہیں "تو ابھی رہگذر میں ہے"، "ایس ایس اینو تریا" اور "اے بنی اسرائیل" بے خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے رپورتاژوں میں یہ رپورتاژ ایک اہم حیثیت کے مالک ہیں۔ ان رپورتاژوں میں ایک مخصوص فضا اور ایک خاص رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ ان تینوں رپورتاژوں میں بیان کی شگفتگی، گہری طنز، ذکاوت اور ایک ایسے حساس شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو کہیں کہیں شاعرانہ احساس کی لطافت میں ڈھل جاتا ہے۔ نیپلز کی بندرگاہ سے لنگر اٹھانے والے ایس ایس اینو تریا نامی جہاز میں ایک دنیا آباد ہے۔ پاکستانی رؤسا اور ان کے ملازمین، فرانسیسی نرسیں، اطالوی بیرے، رومن کیتھولک پادری اور امریکی پروفیسر اس رپورتاژ کے کردار بھی ہیں اور زندگی کے مخصوص رویوں کے آئینہ دار بھی۔ شہاب کے انداز بیان کا یہ حسن بھی قابلِ داد ہے کہ حقیقی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات میں بھی ان کی نظر ایسے پہلوؤں کا انتخاب کر لیتی ہے کہ جامعیت اور نمائندگی کا نقش نہ صرف افسانوی تاثر حاصل کر لیتا ہے بلکہ قائم و دائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ "ایس ایس اینو تریا" محض ایک سفر کی سرگذشت نہیں رہتا، بلکہ وہ طلسماتی سفینہ بن جاتا ہے جس میں فن کی لوحِ طلسمی سے انفرادی اور قومی مزاج کی پوشیدہ تہیں سی کھلتی جاتی ہیں۔ اس کا آخری جملہ جو بظاہر اس تمام سرگذشت سے غیر متعلق نظر آتا ہے، درحقیقت اس سرگذشت کو ایک کائناتی پسِ منظر عطا کرتا ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں اور انفرادی یا اجتماعی گمراہیاں اس پھیلی ہوئی کائنات کے پسِ منظر میں حقیر تر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس جملہ کی سادہ شعریت اور لطافت میں ایک اہم اشارہ مضمر ہے۔ "صبح کے وقت جب وہ ڈرائنگ روم میں ناشتہ کرتی نظر آتی تو مجھے ایک گونا مایوسی کا احساس ہوتا کیونکہ مجھے کئی بار یہ خیال آتا تھا کہ شاید کل رات اس نے چاندنی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہو۔" حقیقت، معصومیت اور خواب آفرینی کا یہ امتزاج اردو افسانہ نگاری میں قدرت اللہ شہاب کا قیمتی کارنامہ ہے۔

"تو ابھی رہگذر میں ہے" میں طنز کی دھار زیادہ شدید ہے اور اسی مناسبت سے اس کا اختتام بھی زیادہ پُرسوز اور دلگداز ہے۔ اس رپورتاژ کی نوعیت ہی الگ ہے۔ اس میں روح کے زخموں کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن اس طرح کہ قوتِ شفا خود ان زخموں پر رشک کرتی نظر آتی ہے۔ امریکن ایکسپریس کا ڈچ منیجر جو کیپری جانے کا مشورہ دیتا ہے، مصطفیٰ العزی جس کی توجہ کا مرکز بیروت ہے اور رشیدہ مومن جو مسلم ممالک میں پروان چڑھنے والی نئی مغرب زدہ نسل کی نمائندگی کرتا ہے، سب الگ الگ صورتوں میں ملمع شدہ زندگی کی تحریصات و ترغیبات کو پیش کرتے ہیں اور ایسٹ کے ڈرامہ "کرجا میں قتل" کے شیطانوں کی طرح یکے بعد دیگرے خواہش کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ لیکن تمام پسِ منظر میں اسی پسِ منظر کا جزو ہونے کے باوجود نرسیہ کا دل آویز کردار اپنی معصوم معصیت کے باعث ایک الگ دل آویزی رکھتا ہے، دل پر باقی رہ جانے والا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

"اے بنی اسرائیل" میں اساطیری ماضی اور سرمایہ زدہ حال ایک ہی رشتہ میں گندھے نظر آتے ہیں۔ حقیقتاً یہ رپورتاژ اردو ادب میں

ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں ذات کی سطح سے گذر کر بات قومیت اور بین الاقوامیت کی منزلوں کو طے کرتی ہوئی آفاقیت کی سطح تک پہنچ جاتی ہے۔ اس میں تاریخی اسباب کی تفتیش و جستجو سے زیادہ ایک شعوری تاثر کو تاریخ بنا دیا گیا ہے۔ لیکن اس تاثر کی بنیاد تاریخی حقائق پہ ہے اور اس میں مشرق وسطیٰ کی سیاست کا بڑا صحیح تجزیہ کیا گیا ہے۔ سفارت خانوں سے گرجاؤں اور تیل کے چشموں تک جو سلسلہ پھیلا ہوا ہے اس کے اثر سے فلسطین کے مہاجروں کے جھونپڑوں پر کثافت اور چہروں پہ فلاکت برستی ہے۔ یہ چہرہ صرف فلسطین کے عرب مہاجر کا چہرہ نہیں، کراچی کے بے خانماں مہاجر کا چہرہ بھی ہے۔ شہاب نے زندگی کے مختلف جلوؤں کو اس طرح سمیٹا ہے کہ اس رپورتاژ میں جذباتی لہر کے ساتھ ساتھ انسانیت کے احترام کے ذہنی آدرش کی جھلک بھی آگئی ہے۔ "اے بنی اسرائیل" میں طنز کی تلخی ضرور ملتی ہے لیکن یہ تلخی کلبیت ( CYNICISM ) میں تبدیل نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس رپورتاژ کا آخری جملہ بنی اسرائیل کے متعلق اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ انہیں عذاب کے چکر سے نجات نہیں مل سکتی لیکن یہ خیال پیشین گوئی کم اور حالات کا مطالعہ زیادہ ہے۔ مغربی سامراج نے بنی اسرائیل کی ریاست قائم کر کے جہاں عرب دنیا کے سینہ میں خنجر گھونپا وہاں یہودیوں کو بھی ایک جنت ارضی کا خواب دکھا کر پیہم عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ صنعت و سرمایہ کے وسیع ذرائع، سرمایہ دارانہ ملکوں کی حمایت اور فوجی فتحمندی کے باوجود آج بھی بنی اسرائیل کل کا اعتبار نہیں کر سکتے اور ایک مسلسل دہشت کے کرب میں مبتلا ہیں۔ شہاب نے بڑے موثر انداز میں تاریخی کش مکش کی مختلف تصویروں سے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے اور فلسطین کے عربوں کی مظلومیت کے بیان میں ان کے قلم نے خون ٹپکایا ہے۔ لیکن اس رپورتاژ میں طنز کی زہرناکی کے ساتھ ساتھ شگفتگی کی لہر بھی مل جاتی ہے۔ یہ جملہ ملاحظہ ہو "بوسے مقدس ہستیوں کے ہوں یا گنہگاروں کے عورتوں کے پاؤڈر اور لپ اسٹک پر ان کا اثر ایک ہی سا ہوتا ہے۔" اس پورے رپورتاژ میں جس کی مجموعی فضا اندوہ کی فضا ہے، جگہ جگہ طنزیہ جملے اور حسن مزاح سے چمکتے ہوئے فقرے روشنی سی بکھیر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان جملوں کی معنویت ایک گہری انسانی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔

شہاب کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے جو بات متاثر کرتی ہے وہ یہ کہ ان میں حال کے فوری، ذات سے قریب اور جانے پہچانے رنگوں کے ذریعہ خیالات و افکار کے وہ صناعانہ مرقعے تیار کئے گئے ہیں جو بلند خیالات و افکار کے حامل ہیں۔ اسی طرح ان کے افسانوں میں خون اور دماغ دونوں کے ہیجانات کی تصویرکشی ایک تہذیبی سکون کے سلسلہ کی پابند ہو گئی ہے اور تصویر کے خطوط پہ ان کی مرکوز توجہ نے ایک دور تہذیب کے ساتھ ساتھ ان عناصر کو ابھارا ہے جو ہر تہذیب میں انسانی کردار اور انسانی زندگی کا جزو اعظم رہے ہیں۔ جوزف وڈ کرچ ( JOSEPH WOOD KRUTCH ) نے اپنی کتاب تجربہ اور فن ( EXPERIENCE AND ART ) میں اعلیٰ فن کی پہچان ایک قسم کی طمانیت و تسکین قرار دی ہے جو المیہ جذبہ کی تہہ میں پنہاں اور فرحت انگیز فن کے مرکز میں جاری و ساری ہے۔ قدرت اللہ شہاب کا شاہکار افسانہ یا خاکہ "ماں جی" اس طمانیت و تسکین کی بہترین مثال ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ شعوری طور پر ایک عظیم کردار کی انسانیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ خود زندگی کے متعلق بصیرت میں قابل قدر اضافہ کرتا ہے۔ اس کا مطالعہ قاری کو روزمرہ کے کوائف کو ایک نئے ڈھنگ سے دیکھنا سکھاتا ہے معمولی باتوں میں غیر معمولی کیفیات کی آمیزش کرتا اور عام سطح سے بلند کر کے اسی عام سطح کو خاص معنی عطا کرتا ہے۔ اس افسانے یا خاکے پہ مقامی رنگ کافی گہرا ہے۔ جس نے اسے موثر طور پر یقین آفرین بنا دیا ہے۔ لیکن اس کا مجموعی اثر علاقائیت سے زیادہ بے قید مقام انسانیت

کے نقوش سنوارتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے علاقائی تہذیب کی تصویر کشی کرتے ہوئے اردو کے کئی افسانہ نگاروں نے فراموش کر دیا ہے۔ شہاب کی اس گراں مایہ تخلیق کو اخلاقیات سے وابستہ کرنے کے بجائے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود اس تخلیق سے ایک نظامِ اخلاق وضع کیا جا سکتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے ان افسانوں میں ایک افسانہ ایسا بھی ہے جو بھوتوں کی کہانی پر مشتمل ہے۔ لیکن ہنری جیمس (HENRY JAMES) آرتھر ٹی کلر کوچ (ARTHER. T. QUILLER COUCH) یا ایڈگر ایلن پو (EDGAR ALLAN POE) وغیرہ کے دہشت انگیز افسانوں سے اس کا مقابلہ کیجیے تو اس میں بجائے دہشت کے اطمینان کی فضا ملتی ہے۔ پھر بھی یہ افسانہ بھوت کی کہانی (GHOST STORY) ہی رہتا ہے۔ ۱۸ سول لائن میں ایک طرحدار آیا اور اس کی بچی کا قتل کے بعد کوٹھی کو آسیبی تسلط میں لے لینا ایسا قصہ نہیں جو دورِ حاضر کے مزاجِ افسانہ نگاری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو۔ لیکن بات یہ ہے کہ قدرت اللہ شہاب نے اس افسانے کو جس طور پر بیان کیا ہے اس میں اس آسیبی تسلط کے پردے میں کرداروں کی نفسیات کے بہت سے گوشے بے نقاب کئے ہیں۔ کشمیری ملازم رمضان کے دل میں ہندوؤں کی چال کا نقش اتنا گہرا ہے کہ مافوق الفطرت حادثات بھی اسے ہلکا نہیں کر سکتے۔ افسانہ نگار نے اس کی انفرادی نفسیات کو اس خوبصورتی سے ابھارا ہے کہ وہ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات بن گئی ہے۔ لیکن خود مصنف اس نفسیات کو بیان کرتے ہوئے بھی ہندو مسلم تعصب سے بالاتر رہتا ہے اور زیادہ وسیع اجتماعی پس منظر میں یہ افسانہ برطانوی سامراج کی انسانیت کشی کی داستان بن جاتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے مخصوص تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے بناوٹ سے پاک زندگی کے پس منظر میں انسان کی فطری سادگی اور اس کی اکتسابی ریاکاری کا بیان بھی کیا ہے اور اردو افسانے کو نئے گوشے بھی عطا کئے ہیں۔ "چکور صاحب" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں تاریخ اور قصہ مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس افسانے میں تکنیک کی بعض خوبیاں بھی نظر آتی ہیں۔ چودھری مہتاب دین جو بابا صاحبا (جن کے نام پر چکور صاحب کی اکلوتی خانقاہ تھی) کے وارث ہیں، جب طمعِ دنیا کا شکار ہو کر چار پشتوں سے قائم شدہ روایت کے خلاف خود چکور صاحب جب سور کٹواتے ہیں تو افسانے کا پڑھنے والا ہر لمحہ کسی عذاب کے نازل ہونے کا منتظر رہتا ہے۔ یہ عذاب ضرور نازل ہوتا ہے لیکن کسی غیبی مار کے بجائے گاؤں کے بھولے بھالے لوگوں کی نفرت کی شکل میں اور افسانہ کی یہ صورت افسانہ نگار کے فنی شعور کا پتہ دیتی ہے۔ جب اس نفرت کی تاب نہ لا کر چودھری مہتاب دین گاؤں چھوڑ کر کلکتہ کا رخ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے "گویا طاعون کا چوہا گاؤں سے نکل گیا۔" اس طور پر لوگوں کے ذہنوں میں جڑیں پکڑی ہوئی پشتوں سے قائم شدہ آپس کی محبت کی چمک اور بڑھ جاتی ہے۔ ایک منفی کردار کے اخراج سے مثبت معاشرتی قوتیں مسکرانے لگتی ہیں۔ یہ افسانہ یہیں ختم ہو جاتا تو شاید نفسِ واقعہ کے لحاظ سے کافی ہوتا۔ لیکن قدرت اللہ شہاب نے بابا شہاب الدین کے دوہے، جو نوخیز کنواریوں، نئی دلہنوں اور منتظر سہاگنوں کے دلوں میں ولولے پیدا کرتے ہیں، آخر میں شامل کر کے نہ صرف افسانے کے حدود کو وسیع کر دیا ہے بلکہ پورے افسانے کو ایک مخصوص فضا عطا کر دی ہے۔ چنانچہ بظاہر یہ غیر متعلق اور غیر ضروری معلوم ہونے والے دوہے افسانے کی معنویت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور پورے افسانے کو صبح کی اجلی کرنوں کی روشنی بخشتے ہیں۔

"ایک پیگر" میں بھی تاریخ اور قصہ کا امتزاج ملتا ہے اور ماضی کی سرحدیں حال کو چھونے لگتی ہیں، لیکن اوّل تو اس افسانے پر حال

کی گرفت مضبوط ہے اور دوسرے بعض جگہ خوبصورت عبارت آرائی اور کامیاب کردار کشائی کے باوجود تاریخ و افسانہ یا ماضی و حال کی وحدت کا نقش گہرا نہیں ہو پاتا۔ البتہ اس افسانے کو یادوں کے دھندلکے سے نکال کر دو زمانوں، ایک وہ زمانہ جب رانو نے سہسرام میں قدم رکھا تھا اور ایک وہ زمانہ جب بی او اے سی کا طیارہ گنگا اور جمنا کے مرغزاروں کے پیچھے چھوڑ کر دریائے سندھ کے پاس پرواز کر رہا تھا، میں جو تعلق قائم کیا گیا ہے، وہ خوبصورت ضرور ہے۔

زیرِ نظر افسانوں میں "اور عائشہ آ گئی" ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس میں انسان کی معصومیت و معصیت کے پیچیدہ مرکب کو محض انفرادی ہی نہیں تقسیم ملک کے اجتماعی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانہ میں شہاب کے طنز کی سفاکی اور بے رحمی نئی سطحیں قائم کرتا ہے نئے ملک میں پہنچ کر عبدالکریم کا ایمان جس طرح تازہ ہوتا ہے اور وہ جس جس انداز میں مذہب کی نئی تاویلات کرتا ہے، اسے شہاب نے بڑی شگفتہ زہرناکی سے پیش کر دیا ہے۔ یہ افسانہ منٹو کے افسانوں کی یاد بھی دلاتا ہے اور ان سے بڑی حد تک مختلف بھی ہے۔ عبدالکریم کا کردار منٹو کے زیریں دنیا کے کرداروں سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اگرچہ اس افسانہ کے بیان کی سطح منٹو کے افسانوں کی پیچیدہ تراش اور فنکارانہ پیچ و خم کے مقابلہ میں زیادہ ہموار ہے۔ عبدالکریم کا مذہب اور نئی مملکت سے جذباتی لگاؤ محض ظاہری منافقت پر مبنی نہیں بلکہ اس کی جڑیں باطن تک پہنچ گئی ہیں۔ اس کے کردار میں اس دہرے اخلاق کی جھلک ملتی ہے جس میں ایک اخلاقی اصول اپنے گھر والوں کے لئے اور دوسرا باہر کی دنیا کے لئے روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس منافقت کے باوجود عبدالکریم کی فطرت میں پاکیزگی کا کوئی جوہر دیا جوہر نہ سہی، "تصوّر" ضرور موجود ہے اور یہی تصور اسے دوسرے اخلاق کی جانب مائل کرتا رہتا ہے۔ اس کے اثر سے وہ کئی بار اس منافقت کو ترک کر کے اپنے اعمال پہ پشیمان ہوتا ہے اور عائشہ اس فطری پاکیزگی کا اشارہ بن جاتی ہے۔ یہ فطری پاکیزگی بھی آلودہ ہو چکی ہے کیونکہ شروع ہی میں کھوکھرا کے مقام پر سرحد عبور کرتے وقت ہندوستانی کسٹم چوکی والے اسے ہتھیا چکے ہیں۔ لیکن اس بے بسی کی آلودگی کے باوجود، جو ایک حد تک انسانیت کا مقدر ہے (اگر عائشہ کو انسان کی فطری پاکیزگی کا استعارہ مان لیں)، عبدالکریم کے ذہن میں وہ تقدیس کا ایک ایسا سنگِ میل ہے، جو مذہبی رفعت کا حامل ہے۔ یہ جملے ملاحظہ ہوں، "مؤذن صبح کی اذان دے رہا تھا۔ نیند کے خمار میں عبدالکریم کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ اذان کی آواز نہیں بلکہ دور کہیں بہت دور کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ اب عائشہ آ رہی ہے۔ اب عائشہ آ رہی ہے۔" اس افسانہ میں قدرت اللہ شہاب نے اچھائی کی فطری تمنا کو ناقص ماحول کے تصادم میں جس طرح بے نقاب کیا ہے، اس سے کردار نگاری کی نئی تشکیل عمل میں آتی ہے

"سب کا مالک" اور "غریب خانہ" انسان کی مظلومیت کے افسانے ہیں۔ انسان جو بے رحم حالات کے جبر کا شکار ہے۔ لیکن جس کی انسانیت جبر یہ آلودگی کے باوجود درخشاں جوہر کی طرح چمکتی رہتی ہے۔ لیکن شہاب نے ظالم کو انسان بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان افسانوں میں ظالم و مظلوم کی امتیازی لکیریں وضاحت سے کھینچی گئی ہیں۔ شہاب نے ظالموں کو معاف کرنا نہیں سیکھا ہے اور یہ سماجی حقیقت نگاری کے عین مطابق ہے۔ اس لحاظ سے انسانیت کے دشمنوں کی نفرت اور انسانیت سے محبت کے تانے بانے سے یہ افسانے بنے گئے ہیں۔ "سب کا مالک" میں ہمیں سماج کے مختلف طبقاتی کرداروں کی جھلک ملتی ہے۔ سائیں بابا کے لئے سب کا مالک اللہ ہے لیکن مولوی صاحب کا درس کچھ اور ہے۔ رضیہ کے دائیں گال پر سائیں بابا اور بائیں گال پر مولوی صاحب کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ قحطِ بنگال کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ افسانہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اہم حیثیت رکھتا ہے۔ زمیندار اور

سیٹھ بھائیوں بالا بخش، بجرنگ لال کے استحصال نے قحط لانے اور اسے زیادہ ہولناک بنانے میں پورا پورا حصّہ لیا ہے۔ اس خوانِ استحصال کے ریزہ چینیوں میں گماشتے، پیروی کار، مصاحب، گاؤں کے مکھیا، مولوی صاحب، پاٹھ شالہ کے پجاری اور اسکول کے ماسٹر صاحب ہیں۔ یہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماج میں جہاں ابھی تک جاگیرداری کی گرفت مضبوط ہو، طبقاتی محاذ کی اچھی تقسیم ہے۔ قحط کی شدت سے نندی گرام کے لوگ ہڈیوں کے ڈھانچے بن جاتے اور موت کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ لیکن جب قحط کے ستائے ہوئے لوگ کلکتہ کا رُخ کرتے ہیں تو اس عظیم الشان اور وسیع شہر کی بے رحم سڑکوں پر انہیں زندگی، بھوک اور موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی حالت میں رتیا بوس، جو اسی گاؤں کی بیٹی ہے اور جیتے رہنے کے لئے اپنی عزت کا سودا کرتی ہے، ان کے آڑے آتی ہے کہ اسے دوسروں کی عزت کا پاس ہے۔ یہ گویا کہانی کا نقطۂ عروج ہے اور اسے افسانہ نگار نے بڑے خوبصورت، موثر اور چبھتے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے۔ رتیا کے گھر میں پناہ لینے والوں میں نندی گرام کے دوسرے لوگوں کے ساتھ خود سائیں بابا بھی ہے۔ اس طرح قدرت اللہ شہاب نے واضح کر دیا ہے کہ زندگی کے اثبات کے لئے مجرد عقیدہ سے زیادہ مثبت عمل کی ضرورت ہے اور مروجہ اخلاقیات کے قائم کردہ پیمانے انسان کی مخفی انسانیت کے دریافت سے قاصر ہیں۔ اس افسانہ کو قحط بنگال پر لکھے ہوئے چند خوبصورت اور مؤثر افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ "غریب خانہ" اپنے موضوع کے اعتبار سے محض غریب خانہ کا قصّہ نہیں بلکہ جابر مرد کی ازلی درندگی کو پیش کرتا ہے جو چاولوں کے کال میں اور عریاں ہو جاتی ہے اور "سہارے کی مہر ڈوری کے دوسرے سرے پر ایک ننگا سا وحشی حیوان کھڑا ہوتا ہے"۔ "غریب خانہ" میں کامنی کا استحصال فرد کے استحصال اور طبقہ کے استحصال ہی کا مظہر نہیں بلکہ بہیمانہ معیشت کے ذریعہ فطرت کی کنواری طاقتوں کے گناہ آلود استحصال کا اشارہ بن جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس استحصال کے بعد بھی فطرت کا ازلی اچھوتا پن اور پاکیزگی اور چمک اٹھتی ہے۔ اگرچہ کامنی کو خود "فطرت کی وسیع فضا، سورج کی اوّلین ناپاک کرنوں سے، اپنے بدن کی دکھتی ہوئی رگ رگ سے" گھن آنے لگتی ہے۔ لیکن خواہ اسے ملک و قوم کے استحصال کا استعارہ سمجھیں یا فطرت کی ازلی نیکی پر بدی کے تسلط سے مراد لیں، یہ بات یقینی ہے کہ اس کی مظلوم نسائیت رحم و ہمدردی کے ان تاروں کو چھیڑتی ہے جن کی صدائے درد کی گونج دیرپا ہے۔

"سٹینو گرافر" اور "نمبر پلیٹ" میں جن نازک خطوط سے کھینچے ہوئے نسائی کرداروں کی جھلک ملتی ہے ان سے ترجنیف کے بعض افسانوں کی ہیروئنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ "نمبر پلیٹ" کی روبی معصومیت کا مجسمہ ہے اور جب "صورِ اسرافیل" کی شکل میں رحمت ایزدی روبی پر اپنا نور کامل کر دیتی ہے (کہ یہ بیان شہاب کے طنزیہ اظہار کی ایک اچھی مثال ہے) تو اس سپردگی کا المیہ دیر تک ذہنوں پر چھایا رہتا ہے۔ ترجنیف اور شہاب کی ہیروئنوں میں ایک فرق ضرور ہے کہ شہاب کے ان دونوں افسانوں کی ہیروئنیں بجائے جاگیردارانہ معاشرہ کے صنعتی نظام کی پروردہ بے روح انسانیت کش چیرہ دستی کا سامنا کرتی ہیں۔ لیکن حالات کی سنگینی دونوں کے وجود میں زہر بھر دیتی ہے۔ یہ چیرہ دستی "اسٹینو گرافر" میں زیادہ کامیابی سے پیش کی گئی ہے، جبکہ "نمبر پلیٹ" کے ابتدائی حصّہ میں قصّہ کی تشکیل سے پہلے کچھ انشائے لطیف کے انداز میں لکھے ہوئے ٹکڑوں نے جو بذات خود دلچسپ سہی، ضرورت سے زیادہ توجہ حاصل کر لی ہے۔ اس کے برخلاف "اسٹینو گرافر" میں گریسی کے پہلے شعر سے اختتام تک جب مصنّف کہتا ہے کہ "اس کے شبنم کے موتی بھی لٹ گئے، وہ جیتے جی مر بھی گئی، لیکن اس کے دو غیر فانی موتیوں کو کون چھیڑ سکتا ہے جو میرے دائیں ہاتھ کی رگ رگ میں پیوستہ ہیں" ایک نازک نسائی کردار کے وجود

کی معصومانہ تابناکی کا احساس ہوتا ہے، جسے افسانہ نگار نے کمال چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ "اسٹینوگرافر" میں جس خوبصورتی سے گریسی کے وجود کے کرب کو پیش کیا گیا ہے، اس کی مثال اردو افسانے میں ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ جس نفاست اور ہنرمندی سے شہاب نے گریسی کے ابتدائی تاثر سے وسکی کے چھپاتے ہوئے پیگوں تک اس کے زوال کی رہنمائی کی ہے، وہ فن افسانہ نگاری پر ان کی مضبوط گرفت کی اچھی مثال ہے۔ گریسی، جس کی زندگی اب اپنے بھائی جارج کے گرد گھومتی ہے اور جو بھیانک اندیشوں میں گھری ہوئی ہے، اردو افسانہ کا ایک لازوال کردار ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ "مبر پلیٹر" اور "اسٹینوگرافر" میں خود افسانوں کے عنوان صنعتی زندگی کی علامتیں بن جاتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کے ان افسانوں میں جگہ جگہ مشاہدہ کی شوخی اور بیان کی دھار دار تیزی ملتی ہے۔ لیکن "آپ بیتی" کو اس اعتبار سے ان کا نمایاں ترین کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ آپ بیتی جو دراصل کردار بیتی ہے بڑی خوش اسلوبی سے ایک مؤثر افسانے کے قالب میں ڈھل گئی ہے۔ امراؤ جان اور لیلیٰ "لیلیٰ کے خطوط" کی ہیروئن، کو اگر ہجرت کے تجربہ سے گذرنا پڑتا تو کیا ان کے کرداروں میں بھی انفعالی تہذیب یافتگی (امراؤ جان) اور احتجاجی تلخی (لیلیٰ) کی جگہ یہ پُرخلوص ریاکاری آجاتی جس نے اس افسانہ کی عصمت فروش "حور" کے دین کی سلامتی کے ذکر کو بلیغ طنز کا حامل بنا دیا ہے؟ صرف اس موڑ پر ہی نہیں اس پورے افسانہ کا ہر پیچ و خم جس طنزیہ بیان سے مملو ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شہاب نے ریاکاری و منافقت کا پردہ چاک کرتے ہوئے بطور خاص زبان پر سان رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ اور انشا کی ملی جلی خلاقانہ وحدت نے اسے نثر نگاری اور قصّہ گوئی دونوں لحاظ سے قابلِ ذکر حیثیت بخش دی ہے۔ اس کے مقابلہ میں "سرخ فیتہ" میں طنزِ لطیف اور مکالموں میں مزاح کی چاشنی لطف انگیز ہے۔ "دو رنگا" میں بھی طنز کا وار سماجی کمزوریوں کی رگوں کو کاٹ دینے والا ہے۔ مذکورہ بالا افسانے قدرت اللہ شہاب کے شگفتہ اور ذکاوت سے پُر اندازِ نگارش کی اچھی مثالیں ہیں۔

ان تمام افسانوں میں "جگ جگ" سب سے الگ اور نفسیاتی و سماجی مطالعہ کے اعتبار سے قابلِ قدر تخلیق ہے۔ یوں تو کلکتہ کے پسِ منظر میں شہاب نے اور افسانے بھی لکھے ہیں لیکن جگ جگ ایک بڑے صنعتی شہر کی جنسی زندگی کا وہ کلیدی اشارہ ہے جس سے سارے چور دروازے کھل جاتے ہیں۔ لیکن یہ افسانہ صرف اس اشارہ تک محدود نہیں۔ افضل کے کردار کو جس ہنرمندی سے ابھارا گیا ہے اور اس کے ذہنی ہیجانات کا جس ماہرانہ صداقت سے جائزہ لے کر آخری نقش تک مکمل کیا گیا ہے، وہ سماجی طنز کی بڑی گہری صورت ہے۔ وہ سماج جہاں عورت ماں، بہن اور بیوی نہ رہ کر وقتی آسودگی کا بظاہر مہذب لباس بن جاتی ہے، آخر اپنی ترغیبات سے کمزور ضمیر کے دامن کو تار تار کر دیتا ہے۔ یہ افسانہ شہاب کی پستیوں کی تہہ تک پہنچنے والی نظر اور ان کے بلندیوں کی خبر لانے والے اخلاقی رجحان دونوں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

شہاب کے ان افسانوں میں شخصی استحصال کی طبقاتی بنیادیں بھی مل جاتی ہیں۔ اگرچہ ابھی ان کے طبقاتی کشمکش کے بیان میں کسی بڑی سماجی جدوجہد کا عکس کم جھلکتا ہے لیکن انہوں نے بہتر سماجی زندگی کے لئے نشاناتِ راہ ضرور فراہم کئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ادبی خصوصیت اور عام دلچسپی دونوں کا سامان ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ افسانے خون کی کمی کا شکار نہیں ہیں بلکہ ان میں جگہ جگہ دھڑکتی ہوئی زندگی کے نقوش ملتے ہیں۔ ان میں کہانی کی دلچسپی اور انشاء کا حسن ایک ہو گئے ہیں۔ ان کے کردار جیتے جاگتے ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی خاص خاص صورتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور واقعات کے بیان میں ابتدا، وسط اور اختتام ایک مرکزی وحدت

کی پابندی کرتے ہیں ۔ ان افسانوں کا نفسِ موضوع تصوراتی رنگ آفرینی اور جزئیاتی مصوری دونوں کے امتزاج سے ترتیب پاتا ہے اور اس ترتیب میں حسنِ ترتیب کا وصف ملتا ہے ۔ یہ ترتیب ادھر ادھر بھٹکانے کے بجائے ایک واضح نقش پڑھنے والوں کے ذہن پر ثبت کر دیتی ہے اور اس میں خود افسانہ نگار کے اپنے قائم کردہ تناسب و توازن کی جھلک ملتی ہے ۔ قدرت اللہ شہاب کے افسانوی مشاہدات عام زندگی سے لیے گئے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی انسان دوستی کے بے رنگ تصور کے بجائے طبقات میں بٹی ہوئی انسانیت کے خط و خال ابھارتے ہیں ۔ لیکن یہ طبقات میں بٹی ہوئی انسانی زندگی کا شعور ان کی انسانیت کو نہ صرف زیادہ حقیقی بنا دیتا ہے ، بلکہ اسے زیادہ پاکیزگی اور رفعت بھی بخشتا ہے ۔ اس لحاظ سے انہیں ادب کے اس ترقی پذیر دھارے کا ایک حصّہ کہا جا سکتا ہے جو حقیقت کی نئی بنیادوں پر تشکیل کرنا چاہتا ہے ۔

اُردو میں یہ افسانے شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں ۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب نعیم البصیر جیسے منجھے ہوئے مترجم انہیں بنگالی کا جامہ پہنا رہے ہیں ۔ ان افسانوں میں زندگی کے جن غموں اور خوشیوں کو پیش کیا گیا ہے وہ انسان کی عمومی زندگی کا بیان ہوتے ہوئے بھی اس دَورِ تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں ، جس سے ہم گزر رہے ہیں ۔ بنگال بھی اس تاریخ کا ایک لازمی حصّہ ہے ۔ اس کے علاوہ ان افسانوں میں نازک مصوری ، بصیرت اور دردمندی کے جو اوصاف ملتے ہیں ، ان ہی سے بنگلہ ادب کی قندیلیں بھی روشن ہوئی ہیں ۔ امید ہے کہ اردو کی طرح بنگلہ کے قارئین میں بھی یہ افسانے مقبول ہوں گے ۔

---

# جمیلہ ہاشمی

عذرا مسعود

اکابرین کی یاد منانا ہمارے ہاں ایک روایت ہے - اور اب دیکھتے ہی دیکھتے تصنیف کی تقریبِ رونمائی ہماری عادت بنتی جا رہی ہے مجھے نہ روایت سے شکایت ہے کہ اس کے بہانے یادِ رفتگاں سے نسبت رہتی ہے - اور نہ عادت سے شکوہ ہے کہ اس کی غلامی میں ادب سے مناسبت رہتی ہے اور اب تو جدیدیّت کا وہ دور ہے جس نے تصنیف اور مصنف کو آمنے سامنے لا بٹھایا ہے اور مضمون نگار کو تختہ دار پر چڑھا دیا ہے یعنی کس کی کہے اور کس کی نہ کہے - یہی وجہ ہے کہ تنقید و توصیف کی قدریں کچھ بدلنے لگی ہیں - مجھے اگر خدشہ ہے تو صرف یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو آنے والے دنوں میں وہ فن جو روایت بھی ہے اور عادت بھی - اب گریز اختیار کر کے تجارت کی طرف نکل جائے - یعنی تصنیف سے زیادہ تقریب اور مصنف سے زیادہ جنس قابلِ ترجیح بن کر رہ جائے -

ممکن ہے آپ لوگ اب اس بات کے شاکی ہو جائیں کہ میری تحریر تو تقریب سے زیادہ تاریخ تقریب سے متعلق ہوتی جا رہی ہے لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ گاہے گاہے سخن ہائے گفتنی کے حوالے سے ناگفتنی کا اظہار کر لینا بھی عوام و خواص کی صحت کے لئے سود مند ہوتا ہے -

البتہ حقیقت یہی ہے کہ اس تقریب کے انعقاد کی تاریخ کم از کم میرے لئے تو تاریخی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ یوں کہ گزشتہ چند ماہ سے یہ طے ہوتی اور پھر ملتوی ہوتی رہی - التوا میں کس کا ہاتھ تھا؟ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ انتظامیہ کا عمل دخل آڑے آتا رہا یا پھر

اپنے اپنے مقام پہ کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں

یعنی انتظامیہ حاضر تو مہمان غائب - مصنف موجود تو تصنیف غیر موجود، کار مکمل تو کارکردگی نامکمل - یہ مشکلات حل ہوئیں تو صورتِ حال سیلاب کی زد میں آگئی - بعد از خرابیٔ بسیار اس پر قابو پایا تو صدارت کا مسئلہ باریابی کی اجازت چاہنے لگا - وزیر عاقل (جناب حنیف رامے صاحب) امورِ مملکت سے فارغ نہ ہو سکے اور دفعتاً جمیلہ پر یہ راز منکشف ہوا کہ عظمت کا ازلی نشان بلند ضرور ہے البتہ ان کی پہنچ سے دور ہے اور نہ باہر۔ اور یوں یہ سوال بھی اپنے جواب تک پہنچا - یعنی رعایتِ لفظی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے جہنم کے بالمقابل اپنی جنت کا در وا کر لیا - جنت جس کا تصور ان کے ادب کا سرچشمہ بھی ہے اور فن کا محور بھی - وہ فن جو دھرتی کی مٹی سے جنم لے کر آکاش کی بلندیوں کو چھوتا ہے - اور وہی جنت جو ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے جس کی بشارت ہم اور آپ کو بھی ملی ہے! الغرض اس دوران وہ کون سی افتاد تھی جو درپیش نہ آئی - آج جب ہم یہ سب کچھ برداشت کر چکے ہیں تو اب کچھ آپ بھی تو برداشت کیجیے - دراصل میں یہ حفظِ ماتقدم کے طور پہ کہہ رہی ہوں -

بات کچھ یوں چلی تھی کہ میں نے بہار کے اوائل میں ان کے ایک رنگین ارادے کا ذکر سنا تو موسم کا اثر کہہ لیجیے یا جمیلہ بی کی صحبت کہ میں بھی اس کی ہمرہی میں بہاروں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی کہتے ہیں ڈھونڈے سے خدا بھی مل جاتا ہے، میں تو اس کی عطا کی ہوئی بے شمار نعمتوں میں سے صرف ایک کی تلاش میں ہی نکلی تھی اس لئے دل کو بڑی تقویت تھی اور کامیابی کی کامل امید - لیکن اب اس کو کیا کہیں کہ ربِ ذوالجلال

کی تلاش میں تو صرف کعبۂ دل میں جھانکنا پڑتا ہے مگر اُس کے عطیات کو ڈھونڈنے کے لیے مجھے اس جہانِ رنگ بو میں بکھرے ہوئے رنگوں کی مختلف دنیاؤں میں سفر کرنا پڑا۔ راہ کٹھن تھی اور نشانِ منزل غیر واضح۔ انجام کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سچ پوچھیے تو ابھی تک آدم کا ہی خلد سے نکالا ستایا آتے تھے۔ ہم اس کوچے سے کب بے آبرو ہو کر نکلے یہ تو پتہ ہی نہ چلا کہ داستان تمام ہو گئی۔ جہنم آباد ہوا۔ جنت کی ہواؤں نے رخ بدلا اور میں جہنمی شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ نجات کی راہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی تو تمام راستے مسدود تھے اور کیوں نہ ہوتے جب کہ وہ اپنا ہی جہنم نکلا جہاں سرخ سرخ آگ تھی۔ مخملیں سبزے کا احساس تھا اور نہ نشان کہ خضرِ راہ ہی مل جاتا۔ انجانے میں نہ جانے میں کون سی آہٹ کا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آن پہنچی کہ بڑھا ہوا قدم اب رک نہ سکتا تھا۔ یوں بھی میں نے یہ سفر بہار کے سائے میں ان کے ہمراہ شروع کیا۔ بہار سوختہ ہوئی تو شعلہ بار گرما سے گزرتی ہوئی برشگال برکھا کی جاد ہوں کے انتظار میں یہاں تک پہنچی کہ شاید یہ پلِ صراط کا کام دیں اور برسنے والے موتیوں کی لڑیوں کے سہارے میں اُس پار اپنی جنت کو پا لوں لیکن گزشتہ دنوں ایسے ایسے جہنمی نظاروں نے قلب و نظر کو مجروح کیا کہ توبہ کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ اگر کانپتے ہیں تو دعا کرتے ہوئے دل کی دھڑکنیں بھی لرزہ اٹھتی ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ہمارا عرقِ انفعال ہی ایک ایسا سیلاب لاتا جس میں شر کی تمام قوتیں بہہ جاتیں اور مینارۂ خیر کا نور تاحدِ نگاہ پھیل جاتا۔ بدی کو موت آ جاتی اور نیکی کی صبح طلوع ہوتی۔ لیکن ابھی شاید نجات کی وہ ساعت اور عفو کا وہ لمحہ نہیں آیا جب خیر کا شر پر مکمل غلبہ ہو گا۔ اسی لئے اب سوچتی ہوں اور الجھتی کیا کم نہیں کہ جنت کی تلاش میں اس جہنم کا دروازہ بھی کھٹکھٹانے چل پڑی۔ لیکن یہ بھی شاید ایک فطری امر ہے کہ رازہائے ہست و بود کو فاش کرنے کے لئے "کھل جا سم سم" کی طرح اسمِ اعظم کی تلاش بھی غالباً ہر ذی ہوش انسان کو ازل سے ہے اور ابد تک یونہی رہے گی۔ خواہ وہ صوفی ہو یا ملحد و مرتد مقصد و منتہا دونوں کا ایک ہی ہے۔ ایک کا شعوری اور ایک کا غیر شعوری۔

اب دیکھیے پھر بار بار بھٹک رہی ہوں لیکن راہ پر واپس آن پہنچوں گی اس کا مجھے یقین ہے۔ ہاں تو بہاولپور کے بارے میں میری شنید ہے کہ جب بھی شہزادگانِ ریاست میں سے کسی کو ریاست ملی تو نواب یا والی کہلائے اور ولایت کی دُھن سمائی۔ "صاحب السیر" کے جانشینوں کو سجادہ نشینی ملی تو پیر کہلائے اور ساہیوال جا نکلے۔ وہاں ہاشمیوں سے ناطہ جوڑ بیٹھے۔ یوں علم کا سہاگ بنے اور ادب کی سرپرستی حصے آئی جو اوڑھنا بچھونا تو نہ بنی البتہ لباس کا شرعی مسئلہ ضرور حل ہو گیا یعنی جمیلہ ہاشمی بیگم سردار احمد بن کر "ال۔سیر" میں داخلِ حرم ہوئیں۔

اُنہی دنوں کا ذکر ہے کہ نواب کے ڈیرے اور سجادہ نشین کی خانقاہ کے قرب و جوار میں ایک سرکاری کرسی میرے میاں کو بھی ملی اور یوں ہم نے بہاولپور کی ریاست میں جا ڈیرہ جمایا۔ یہ بھی حسنِ اتفاق کہیے کہ بیگم سردار احمد سے ملاقات ہوئی تو وہ جمیلہ ہاشمی نکلیں اور دل نے پہچانا کہ یہ تو ایک جانی پہچانی صورت ہے اور ہم تو پہلے بھی مل چکیں ہیں، اُس سنگم پر جہاں علم و جہل کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں۔ یعنی جب ہم دونوں امرتسر کے ایک ہی سکول میں زیرِ تعلیم اور ہاسٹل میں مقیم تھیں۔ اُن دنوں کے فاصلے برسوں بعد بہاولپور کے قیام میں یوں سمٹ آئے گویا ہم ازل سے آشنا ہیں کچھ ہمدم و ہمراز بھی۔

پہلی ملاقات کچھ یوں ہوئی کہ بہاولپور لیڈیز کلب میں کچھ ترمیمات کے بعد سب ممبران نے اپنے مہمانوں کو بھی قرب و جوار سے مدعو کیا۔ میرا بیٹا سہیل جو اُن دنوں ابھی بہت کم سن تھا اور اکلوتا بھی، نہایت اہتمام سے کلب کے داخلی دروازے پر براجمان مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ ان کی آمد پر جانے کب، کیوں اور کیسے اُسے یہ محسوس ہوا کہ داخلے کا وقت ختم ہو چکا ہے اور جب کوئی کرسی خالی نہ نظر آئے

تو مہمانوں کی آمد پر ٹریفک پولیس کی طرح ہاتھوں کے اشارے بدل دیئے جاتے ہیں۔ مجھے علم ہوا تو بہ وقت تمام اُسے سمجھایا، دوستی کروائی۔ یوں میری ملاوٹ کے باعث یہ بلا منتے مانتے ہاتھ کھنچتے کھنچتے رہ گئیں۔ اور اب یہ عالم ہے کہ وہ لاہور میں ہی زیرِ تعلیم ہے اور محبت و شفقت سے لے کر دعائیں اور تعویذ بھی اپنی پیلا آنٹی اور انکل سردار احمد سے لیتا ہے۔

کہانیوں کے پردے میں چھپی ہوئی حقیقتیں سچی بھی ہوتی ہیں اور زندہ بھی۔ اس لئے ایک نہ ایک دن آشکار ہو کر ہی رہتی ہیں۔ یوں قصّے کہانیوں میں سوتی جاگتی، حال کے دروازے پر دستک دے کر ماضی کی طرف لوٹتی رہنے والی یادیں مجھے اپنی کہانیوں کے ایک کردار ہی کی طرح ملی۔ سرابوں میں گھری ہوئی۔ ٹھنڈے میٹھے پانیوں کی تلاش میں۔ اجنبی ہوتے ہوئے بھی جانی پہچانی!

اُسی زمانے میں مَیں انفلوئنزا میں ایسے ناوقت مبتلا ہوئی، جب مسعود دورہ پر تھے اور میں تنہا۔ اتفاق سے شیخ منظور الٰہی صاحب اُس زمانے میں وہاں کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے اور وہاں کی مروجہ روایت کے برخلاف تیز گام کو بھی روکے ہوئے تھے۔ تیز گام کا قصہ یوں ہے کہ ساکنانِ بہاولپور کا کہنا تھا کہ جس طرح یہاں تیز گام نہیں رکتی، ویسے ہی کمشنر نہیں ٹھہر پاتے خیر میرا مقصد پٹڑی بدلنا نہیں ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ فلو کا حملہ ہوا تو زاہرہ بہن (بیگم منظور الٰہی) چند بار کمالِ محبت سے میری مزاج پرسی کو آئیں اور کچھ دن کے بہلاوے اور کچھ وقت کاٹنے کا انتظام یوں کر گئیں کہ لائبریری سے چند اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو منگوا دیں۔ ان کتابوں میں "تلاشِ بہاراں" بھی تھی اور اس کی تعریف ایسی بے ساختہ کی کہ یہی بے ساختگی میری جمیلہ سے گہری وابستگی کی اساس بنی۔ یہ اور بات ہے کہ "تلاشِ بہاراں" کو یکسوئی سے پڑھنے کے لئے بیمار ہونا لازم تھا۔ یہ احساس مجھے اُس کے مطالعے کے بعد ہوا کیونکہ اُن کی تحریریں رواروی میں پڑھنے کی چیز نہیں ہیں۔ ویسے مجھے اگر صرف ان کے فن سے دلچسپی ہوتی تو میں پہلے کچھ افسانے کے بارے میں پڑھتی، ناول نگاری کی تاریخ اور ادب کا جغرافیہ معلوم کرتی لیکن میری بیشتر دل بستگی تو ان کی ذات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلم کبھی ان کا نام لے کر بہکتا ہے تو کبھی دوسری جانب جھک کر بہکتا بھی ہے۔

تجدیدِ ملاقات کے بعد میں نے یہ راز بھی جانا کہ عورت دراصل نام ہے بے نام جذبوں، در پردہ حقیقتوں اور دھرتی پر بکھرے ہوئے سنہرے سپنوں کا۔ سپنے جنھیں تعبیر مل جائے تو خالقوں کو جنم دیتے ہیں۔ ہر عورت زندگی بھر اتنے جذبوں سے دوچار ہوتی اور سرشار رہتی ہے کہ اُس کے اندر ایک فنکارہ کا ہونا غیر ممکن نہیں بلکہ لازم ہے۔ اظہارِ وجود کے لئے البتہ ایک کسک، ایک چوٹ (کسی قہقہے کی کھنک) یا تلخی کے احساس کی ضرورت رہتی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی فن کی تخلیق کے لئے ماحول کی سازگاری بھی اُسی قدر لازم ہے جس قدر اُس تخلیقی لمحے کی۔ ہو سکتا ہے عمر بھر وہ گھڑی، وہ لمحہ نہ آنے پائے۔ یا آئے بھی تو گرفت سے نکل جائے اور فن کا متلاشی تمام عمر یونہی شیشے کے اُس گھر میں محبوس ہو کر گزار دے جہاں زندگی ایک سوال کی طرح اُس کا تعاقب کرتی رہے۔ راہیں مسدود، اشارے مبہم، عرصہ مختصر مسافت طویل! اور جو کبھی کوئی اس کے طلسم سے آزاد ہو جائے تو اُس کے لئے وہ لمحات امر ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسے ہی لمحے کی داستان ہے جو جمیلہ کے روپ میں امر ہو گیا۔ ملاقات بڑھی تو میں نے دیکھا کہ "روہی" کی یہ خاتون چولستان کے میلوں پھیلے ہوئے ریگ زاروں کے قریب ہی ایک بستی میں بستی ہے اور وہاں کے رہنے والوں کی طرح مسلسل سفر میں رہتی ہے۔ کبھی خانقاہ کے سائے تلے تو کبھی لاہور کے آسمانوں پر۔ میں اسے بہاروں کی تلاش میں بھٹکنے والی روح کہوں یا احساس کی آتشِ رفتہ میں سلگنے والی ہستی، جو ایک اپنی ہی دنیا اور اپنا ماحول بنا لیتی ہے جس کا سحر ٹوٹتا ہے تو خبر ہوتی ہے کہ ہم تو کسی اور ہی عالم کی خبر سے آئے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی عالم تھا جس سے گزرے گزرتے خزاں کی رت بدلی اور بہار آن پہنچی تو فسانوں کی جگہ انسانوں نے لے لی اور ریگ زاروں کے بدلے انھیں لالہ زار

مل گئے۔ یعنی زن سے تو میاں سردار احمد فیضیاب ہوئے، زمین ان کے حق مہر میں درج ہوئی۔ رہا زر کا حساب تو البتہ وہ تاحال زیر غور ہے۔

ان کے عادات و اطوار کی ایک خاص خصوصیت جو مجھے یاد آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ مہمانوں کی خاطرداری کے مواقع پر اپنی سہیلیوں اور عزیزوں سے انتظامات میں امداد کا خاص ملکہ انھیں حاصل ہے۔ اوّل اوّل تو میں یہ سمجھی کہ شاید ہانڈی چولہے کی نزاکتوں (باریکیوں) سے میری طرح ناواقف ہیں۔ لیکن پھر ایک بار ان کے ایسے ہاتھ دیکھے کہ بس منہ دیکھتے اور انگلیاں چاٹتے رہ گئے یعنی یہ کہ امشتاق حسن یوسفی صاحب نے تو آلو کے بارے میں کچھ بیان پر ہی اکتفا کی تھی اِمکان کا پیشہ غالباً اسی کا کشتی اور متحمل ہو سکتا تھا۔ انہوں نے آلو کی تمام ہشتیں الماڑیں اور ہر نسل سے مختلف پکوان تیار کئے۔ حسب عادت حال کو ماضی میں لے گئیں اور من و سلویٰ کے کئی خوان سجا دیئے۔ میں نے بہت کہا کہ تم ادب کا چکر ثانوی رکھو کیونکہ ان کمالات کے بعد تم شوہر کے دل میں اُترنے کے ہی نہیں دوستوں کے معدے بھی مسخر کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ لیکن وہ بھی صحیح کہتی ہیں کہ پھر آخر سردار احمد ہمارے ذریعے سے اپنی خاطر نوازِ طبع کی تواضع کرنے میں اُس کا کیا ہوگا اور اس لئے ہم نے بھی تقسیم کار کا کچھ یہی انتظام کر رکھا ہے اور خوش و خرم ہیں۔ پھر آخر تمہیں کیا تکلیف ہے۔ یہ سب کچھ کہنے سے بلّلہ آپ یہ ہرگز نہ سمجھ لیجیے گا کہ اپنے ہاں آنے والوں کے ساتھ یا ایسا سلوک کرتی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تو ان کے خلوص، ان کی چاہت اور بے تکلفی کا اظہار ہے کہ ہر آنے والا اسے اپنا گھر سمجھتا ہے اور خود ہی اپنے لئے کوئی نہ کوئی ذمہ داری مخصوص کر لیتا ہے۔ یوں آجکل یہ پھلوں کی چاٹ بنانے کا نسخہ غالباً بانو یازار سے سیکھ آئی ہیں اور اب اپنی مہارت دکھا رہی ہیں، جبکہ مشروبات کو آبِ حیات میں ڈھالنا ان کے شوہر کے ذمے ہے۔ زیادہ خوش اسلوبی سے کون کام لے رہا ہے، یہ آپ ان سے دعوت نامہ وصول کرکے آزمائیے! تازہ ترین خبر یہ بھی ہے کہ بات چلتے چلتے اور چولہا جلتے جلتے قیمہ بھرے پراٹھے اور آم کے اچار تک آن پہنچی ہے۔ دیکھئے یہ ہانڈی کس چورا ہے میں کس کے سر پہ پھوٹے گی؟ کہیں وہ میرا ہی سر نہ ہو!

میری یادوں میں وہ زمانہ بھی محفوظ ہے جب ہم لاہور کے پارک لگژری ہوٹل میں چند ماہ کے لئے مقیم ہوئے۔ جہاں پارک تو تھا، کچھ کچھ ہوٹل کے آثار بھی پائے جاتے تھے۔ البتہ لگژری کا اُن دنوں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں اُس لگژری سے البتہ واقف نہیں جس کی جھلکیاں نصف شب کے قریب وہیں کسی ہال میں دکھائی جاتیں۔ اُن دنوں بیماری کے باعث میری طبیعت موج پر نہ تھی اس لئے ہماری دوستی اوج پر تھی۔ میاں بہلے اہلِ سرکار کی مزید تعلیم و تربیت کے بندوبست میں مصروف رہنے کے بعد خود بھی سٹاف کالج میں نظر بند کر دیئے گئے تاکہ ان کا ترتیب کردہ نصاب کچھ ان پر بھی آزمایا جائے۔ چنانچہ میری تنہائی کا مداوا یوں کرتیں کہ نان ہمارے ذمہ رہتا اور نفقہ میاں سردار احمد صاحب کے ذمہ۔ جس اپنائیت سے یہ ریفریجریٹر کھول کر باسی چاول یہ دال یا اپنی پسندیدہ کڑھی کا ڈونگہ خالی کرتیں وہ مجھے بے حد پسند آتا۔ اور جب کبھی میرا ننھا بیٹا سلمان ان سے "یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے" سنتے ہوئے ان کے لاکٹ سے کھیلتا کھیلتا سو جاتا تو ان کے چہرے پر بکھرے ہوئے ممتا کے بیکراں جذبے کو دیکھ کر میرا دل اور میرے ہاتھ، دونوں دعا کے لیے بیقرار ہو جاتے۔ آخر دعائیں رنگ لائیں اور ننھی عائشہ کو ان کی ممتا نے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔

دوسری بڑی خوبی جو مجھے ان میں نظر آئی وہ یہ ہے کہ خانقاہ شریف پہنچ کر یہ بالکل وہاں کے رنگ میں رنگی جاتی ہیں۔ ریاستی اس قدر عمدہ لب و لہجہ میں بولتی ہیں کہ ؎

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم!

جملۂ معترضہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک بار انہوں نے عینی کا ایک خط مجھے دکھایا جس میں اُس نے چند پرخلوص، پیاری پیاری گالیوں کے ساتھ

خوب تاڑا تھا کہ آخر کب تک اسی طرح لنگر کے لئے اناج لاتی رہوں گی اور اپنے پیرومرشد کی مریدنیوں سے قدم بوسی کرواؤں گی۔ کچھ لکھنے پڑھنے کی سعی شروع کردیا یونہی رہگزر پہ نشانِ منزل کا سنگِ میل نصب کئے بنا جہان سے گزر جانے کا ارادہ رکھتی ہو اور جب میں نے ان کے ہمراہ خانقاہ میں کچھ ایسے دن گزارے جو مجھے شدتِ گرما سے پگھلتے دیکھ کر ٹھنڈی ہواؤں کے منتظر تھے کہ کوئی جھونکا تو آئے جو مجھے اس جہنم زار سے نجات دلائے۔ تو میں نے دیکھا کہ یہ کس پیارے اور معتبر انداز میں پڑوس میں رہنے والی ریاستنوں سے اُنہی کی زبان میں گفتگو کرتی ہیں۔ ساس بہو کے جھگڑے سنتی ہیں، بھائی بہنوں کے تعزیتے چکاتی ہیں۔ شوخی پہ اتر آئیں تو ٹھٹھے دیتی جاتی ہیں۔ نائن آتی ہے تاکہ سر میں تیل ڈالتے ہوئے اڑوس پڑوس کی سیاست پر روشنی ڈالے۔ کپڑے کے تھانوں پر مشتمل گٹھا گٹھڑیوں کو ٹھوکروں سے اُڑاتی ہوئی پٹھان مریدنیاں ہنگیوں میں ملبوس مہرباں آتی ہیں۔ پیغام لاتی ہیں۔ لے جاتی ہیں اور یونہی دن گزرتے رہتے ہیں۔ باغ کے وسیع مخملیں تختوں سے لیکر جھیل کے کناروں تک پردہ کروایا جاتا ہے اور پھر سب مل کر ٹیوب ویل میں نہاتے ہیں۔ اپنے ہی آموں کے دام چکاتے ہیں اور گٹھلیاں پھر بو دیتے ہیں۔ کبھی کبھار عاشی بیٹی اپنی مہمان سہیلیوں کی آمد کی خوشی میں ایک خوب صورت خیمہ لگواتی ہے۔ جھیل میں تیرنے والی کشتی کو رنگ و روغن کرواتی ہے۔ خیمہ میں ٹارزن کے رشتہ دار رہنے لگتے ہیں اور کشتی کا تازہ روغن کپڑوں سے چھڑانے کے لئے مٹی کے تیل کی بوتلیں ڈھونڈی جاتی ہیں۔ یعنی وقت گزرتا رہتا ہے اور بہت ہی عمدگی کے ساتھ گزرتا ہے۔ موسم کی تمام تر شدتوں کے باوجود عمدہ۔ بچوں سے پیار کرتی ہیں لیکن انھیں بگاڑنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہر سرد و گرم کا مقابلہ کرنے کے لئے مکمل تربیت دینا چاہتی ہیں۔ لپٹا لپٹا یا فیشن بھی کرتی اور پھر سبھیں اُس کا احساس دلا کر اعتراف بھی کروانا چاہتی ہیں۔ ہنستے ہنستے ہی سہی!۔

ممکن ہے آپ لوگوں کو اس بات کا بھی یقین نہ آئے کہ یہ بھجن اس قدر عمدہ گاتی ہیں کہ اگر آج بھی آپ سن پائیں تو ان کے عقائد پہ شک گزرنے لگے۔ حالانکہ ان کی یہ پسند محض اس وجہ سے ہے کہ جو ترنم اور موسیقیت انھیں اُن میں محسوس ہوتی ہے وہ دوسرے گانوں میں میسر نہیں آتی۔ یہ اس بات کا بھی بین ثبوت ہے کہ تندیٔ بادِ مخالف سے نہیں گھبراتیں۔ یوں میری رائے میں تو میلادالنبی کے موقع پر ان کی حمد و نعت میں وہی رس، وہی عقیدت اور وہی گہری وارفتگی پائی جاتی ہے جس کے آگے سب بھجن ہیچ ہیں۔

آج یادیں دہرانے بیٹھی ہوں تو ایک اور واقعہ بھی یاد آ رہا ہے۔ سنا گیا کہ گرد و گرما کے جس خطہ میں یہ اپنے میاں کے ہاں رہتی ہیں اُس کے مشرقی کنارے پہ ایک دیہات میں ایک بار آندھی آئی، جو گہری بھی تھی اور سرخ بھی۔ اس آندھی کی لالی جب ایک مٹیار کے ہونٹوں پر رچی تو انہوں نے بھی دیکھ لیا اور کچھ آپ بیتی ملا کر جگ بیتی لکھ ڈالی اور مجموعے کا نام بھی "آپ بیتی جگ بیتی" رکھ لیا۔ جس پہ سکرپٹ رائیٹر و پروفیسر جمیلہ شاہین صاحبہ کی نگاہ پڑی اور کچھ ایسے غلط انداز میں پڑی کہ یہ ٹی۔ وی سٹار ہوتے ہوتے رہ گئیں۔ میں نے ایک بار پھر دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے انھیں یہ کہہ کر باز رکھنے کی کوشش کی کہ جنابہ اس میدان میں جب تک تم عالی جی کی آپ بیتی نہ لکھو گی تمہاری 'ہیروئن' درشپ نہ ہوگی۔ یا تو تم اپنے میاں کے "ہاں" رہنے پہ اکتفا کرو یا انھیں لاہور میں اپنے ہاں کے سرسبز چمن زاروں میں اُلجھائے رکھو۔ ٹی۔ وی سکرین مہر و وفا کی حکایتیں نہ سمجھ پائے گی انھوں نے 'ہیروئن' سے نہ جانے کیا مراد لیا کہ مجھے ناخواندہ ناصح اور ناواقف مصلح کے خطابات سے نواز کر اپنا دل ٹھنڈا کرتی رہیں۔ میرا کہا درست نکلا اور باہمی اعتراف و اعتقاد کے باوجود ان کی اور جمیلہ شاہین کی رائے ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ لال آندھی تو گزر گئی البتہ آتشِ رفتہ پھر نہ بھڑکائی جا سکی۔ وہ دن بھی بڑے عجیب گزرے۔ میں ان کے درمیان قدرِ مشترک تھی۔ کبھی ایک دھمکاتی تو کبھی دوسری بہکاتی لیکن علیحدہ علیحدہ۔ جہاں آمنا سامنا ہوا وہیں ٹی۔ وی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ آج سوچتی ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اگر یہ سلسلہ زیادہ دیر چلتا تو میں کب کی بک جاتی

بن چکی ہوتی ۔ یوں بھی جمیلہ ہاشمی اور جمیلہ شاہین اپنے ناموں کی مماثلت کے ساتھ ساتھ جلال میں بھی ایک ہی سا رنگ رکھتی ہیں ۔ فرق صرف یہ نظر آیا کہ جمیلہ شاہین انہیں آتا دیکھ کر جلال میں آ گئیں اور یہ انہیں جاتا دیکھ کر ۔ مجھے افسوس ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے علم کی معترف ہوتے ہوئے بھی یکجا نہ رہ سکیں اور چھ دنوں ان کے نام ہم آہنگی کے باعث غلطاں و پیچاں ہو کر غلط افواہیں پھیلاتے رہے ۔ اور یوں ایک کا یار دوسری کے کاز میں حارج بنتا رہا ۔

خیر، یہ تو قصہ چہار درویش بنتا جا رہا ہے حالانکہ ذکر آج کی تقریب کا یوں ہے کہ چند روز قبل جب ان کی کتاب "اپنا اپنا جہنم" مجھے ملی تو میں نے دیکھا کہ جس جہنم کی یہ تصویر ہے "اپنا" کی تکرار کر کے ہمیں بھی اس کا ایندھن بنانے کی جارحانہ کوشش کی گئی ہے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ جہنم میں دھکیلنا اگر کانٹوں میں گھسیٹنے کے مترادف ہو تو کسے کس پر ترجیح دوں !

دوسری بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ جب ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتی تو پھر قلم ہی اٹھاؤں ۔ لیکن کس پر جمیلہ ہاشمی پر یا اُن کے جہنم پر ۔ فیصلہ آسان نہ تھا اس لئے کچھ ملی جلی کیفیت رہی یعنی تصویر کے لئے رنگ تو خاطر خواہ مل گئے البتہ اُن کی ہم آہنگی میں یک رنگی کا تاثر پیدا ہو سکے گا یا نہیں، کہہ نہیں سکتی !

یوں تو جمیلہ بی سے مجھے شکوہ تھا کہ تمہاری صحبت وہم نشینی نے میرے دل کے تاروں کو چھیڑا تو ضرور مگر نغمہ بار نہ کیا ۔ آج چراغ تلے بیٹھے ہوئے اس اندھیرے کی برسوں پرانی شکایت جب اُمید کی ننھی سی کرن سے دور ہوتی نظر آتی ہے تو سوچتی ہوں کس کا ذکر کروں ! سوچتی ہوں کسے پکاروں ! اُس جمیلہ کو جو صرف میری دوست ہے یا جمیلہ ہاشمی کو جسے زندگی ثریٰ سے تا بہ ثریا ، سمک سے تا بہ سماک لئے لئے پھرتی ہے ۔ اور اسی لئے میں آپ کے توسط سے اب جمیلہ بی سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں کہ سہیلی بوجھ پہیلی بتا تیرے ساتھ کیا سلوک کروں ! چھوٹی چھوٹی چٹکیاں یا بڑی بڑی مبالغہ آرائیاں کہ ایک سے تم خوش اور دوسرے سے دشمن شاد ۔ میں نہ اتنے الزام دینا چاہتی ہوں کہ تمہارے سر سے موتی پہ ہی ڈھلک جائے اور نہ تمہیں اتنی خوبیوں کا برقع پہنا سکتی ہوں کہ تمہاری شخصیت ہی پردے میں چھپ جائے ۔ رہی مصلحت کی کار فرمائیاں اور کامیابیاں تو اُن سے بھی واقف ہوں لیکن یہ میرا شعار نہیں بلکہ میرا ایمان تو یہ ہے کہ جہنم کا راستہ مصلحت کوشوں ہی سے پٹا ہوا ہوگا ۔

اعتراف کی منزل کا کچھ قرض میری سماعت پر تھا جو "آوازِ دوست" سن کر ادا کیا تھا ۔ آج کچھ تو رنگ و بو کی تازگی، کچھ جہنم کی حرارت اور زیادہ دوستی کا تقاضا ہے جس کی راہوں کا حق ادا کرنے آئی ہوں ۔ کیونکہ دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست اور زمانِ دار و گیر میں اس سے نازک وقت بھلا اور کون سا ہوگا ۔ خوب ہیں یہ نئے رسم و رواج بھی جن کی وجہ سے کبھی دوست کی رسوائی کا فکر دامن گیر ہوتا ہے تو کبھی شوہر کی پذیرائی کا شوق اپنی رسوائی کرواتا ہے ۔

ڈرتی بھی ہوں کہ آج کہیں دوست کی دوستی نہ آڑے آئے اور میں کہ نبھانے کی قائل ہوں خود اپنے ہی خیالات سے منافقت برتاؤں اور یوں رسمِ انصاف کا خونِ ناحق ہو جائے ۔ پھر آخراب اور کیا کیا کہوں ! اچھا تو سب کے ساتھ مل کر کچھ آپ بیتی ، کچھ جگ بیتی تم بھی سنو !

کہتے ہیں باغِ بہشت سے جب حضرتِ انسان کو، حکم سفر ملا تو عفو و نجات کی راہیں تلاش کرنے کے لیے عازم سفر ہوا اور راستے کے پتھروں کو جہاں نما سمجھ کر یہ کہہ بیٹھا ؎

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

آپ جانیں میں بھی اپنے تئیں انسان سمجھتے ہوئے اسی فرصتِ انتظار میں اپنی جنت کی تلاش کو نکلی تو تمام تر مختاری کے باوجود کچھ ایسی مجبور ہوئی

کہ اس جہنم تک آنا ہی پڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ راندہ درگاہ ازل سے اپنی جنت کی تلاش میں جہنم کے دروازے کھولتا بند کرتا آ رہا ہے۔ کیونکہ ظاہر کی آنکھ سے جب بھی دیکھیں، ہر جہنمی شے حسین اور ہر عمل خوب صورت نظر آتا ہے اور دل جو کعبہ ہے بیشتر صنم کدہ ہی بنا رہتا ہے جس میں ہوس و نفس کے رنگا رنگ بت چھپے بیٹھے ہیں۔ یہ بھی کیسا عجیب عالم ہے کہ سیکڑوں آرزوئیں جلتی ہیں تو جہنم کا الاؤ روشن ہوتا ہے اور یہ بھی کیسی دنیا ہے کہ کئی دل اُجڑتے ہیں تو ایک بستی آباد ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی کیسی دیوانگی ہے کہ جنت کی تلاش میں جہنم کی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے اور روح کے بدلے جسم کی تجارت کی جاتی ہے۔ وہ کون ہے جسے جنت کی آرزو نہ ہو۔ ہم جہنم میں جلتے ہیں، جل جل کر زندہ رہتے ہیں اور پھر جنت کی آرزو میں مرتے ہیں بس اتنی سی حقیقت ہے جسے جو چاہے فسانہ سمجھ لے یہ سب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ جب ہر شخص کی ایک اپنی جنت ہوتی ہے اور اپنا ہی جہنم بھی، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ میرا اپنا ہی جہنم ہو اور جمیلہ اس ضمن میں بے قصور ہوں؟ خیر جہنم اپنا ہو یا پرایا اور رنگ اندھیرے ہوں یا زہریلے، ہو رنگ یا شبِ تار کی مانند، ہر حال میں رنگین داستانیں ہی سناتے ہیں۔

"اپنا اپنا جہنم" بھی ایسی ہی رنگین داستانوں کا مجموعہ ہے جس میں پکتے لرزتے شعلوں کی تپش بھی ہے اور حسن بھی۔ مایا۔ تارا اور مارجری کی ذات کے اندھیروں میں چھپی ہوئی سیکڑوں حقیقتیں عیاں ہو کر سوسائٹی کے مسئلے حل کرتی ہیں۔ سرورق صادقین کے جہنم کا جیتا جاگتا عکس ہے جسے کافر کا الہام کہئے یا مومن کا امتحان! سنتے تھے کہ وہ کبھی فرہاد ہی کے حصّے نہیں آئی بلکہ صادقین سے سرورق بنوانا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ ہر کسی کے جذبہ کی پرکھ اور صدق و صبر کا امتحان ہے۔ مگر جمیلہ بی کے مجموعے کا نام سن کر ہی اتنا متاثر ہوئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ پہاڑ سر ہو گیا۔ ممکن ہے اس عنوان میں انھیں بوئے وطن آئی ہو!۔ یہ خاکی نوری ہوں یا ناری انھیں بسانا انہی دو بستیوں میں سے کسی ایک کو ہے۔ رہی زندگی تو وہ گردشِ عمل کے محور پہ کون جانے کب تک گھومتی رہے گی!

میں نے انھیں ہمیشہ ایک ہی نشست اور ایک تسلسل میں لکھتے دیکھا ہے۔ ذہن میں پلاٹ کی تشکیل اور اُس پر عمل درآمد کے درمیان ایک سوچا سمجھا اور جانا بوجھا فاصلہ ہوتا ہے جسے وہ متعلقہ مطالعے اور مشاہدے کی مدد سے عبور کرتی ہیں اور پھر بسا اوقات خیالات کی یورش سے مجبور ہو کر صبح سویرے لکھنے بیٹھ جاتی ہیں۔ یوں تو ہر لکھنے والے کی طرح ان کی بھی یہی خواہش ہوتی ہو گی کہ لوگ باگ ان کی کتاب منہ دھو کر پڑھیں لیکن جب یہ خود لکھنا شروع کرتی ہیں تو ہاتھ منہ دھونا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ پھر نہ رکتی ہیں اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں۔ سوچ کی لہروں کا بہاؤ اس درجہ رواں اور مربوط ہوتا ہے کہ گھریلو ذمہ داریوں کی دخل اندازی کے باوجود کہیں سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ دمِ تحریر چائے میں ڈبو ڈبو کر لکھتی ہیں البتہ اناج سے پرہیز کرتی ہیں۔ میں تو ایک ہی تجربے کے بعد حوصلہ ہار بیٹھی۔ البتہ ان کے میاں کی داد دیتی ہوں جو ایسے مواقع پر کمال محبت سے ان کی چائے نوشی کا اہتمام پبلک لائبریری تک میں کرتے ہیں۔ یوں بھی تحریر کے لیے جتنی اور جیسی سہولت انھیں مہیا ہے اُس کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ خانقاہ شریف میں اپنی آبائی قیام گاہ کو میاں صاحب نے حسنِ ذوق کے گل ہائے رنگا رنگ سے یوں سجا رکھا ہے کہ خلد بریں بہ روئے زمیں کا گماں گزرتا ہے۔ میں نے غور کیا تو یہ راز بھی کھلا کہ بیگم کے فن کی آبیاری میں بھی درپردہ اُن کے عالمِ شوق کی وہی شدت کار فرما ہے۔ بیگم البتہ روایتی انداز میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں، حالانکہ ہر طرح کا آرام، ہر قسم کی آسائش، وقت کی فراوانی اور سیکڑوں کہانیوں کے کردار انھیں گھیرے رہتے ہیں۔ رہی ننھی عاشی ان کی بیٹی، تو وہ بھی اسی ورثے کی امین ہے اور حالات سے مانوس ہو کر اسی سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ اکثر کاغذ قلم لئے "مشرق کے پھولوں" اور "رنگ برنگی اجالوں" پہ مضمون لکھتی رہتی ہے۔ اور اب ان کی ذاتِ شریف، تو سچ پوچھئے یہ اپنے لفظوں

بنیادی دیہاتی ہیں، پڑھی لکھی دیہاتن۔ دیہات بھی پنجاب کے اور زمانے وہ جب شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیا کرتے تھے۔ اب زمانے بدل گئے تو کیا ہوا۔ نہ مٹی کی تاثیر بدل سکتی ہے اور نہ خمیر کی ترکیب۔ آج بھی یہ فقیر کے مشورے پر عمل کر جہانگیری کے خواب دیکھتی ہیں اور یوں شاہجہانی تاج محل تعمیر کروانا چاہتی ہیں۔ حتیٰ مہر میں مل ہوئی سجادہ نشینی کی سرداری پرسش کرنا ان کے اختیار ہی میں نہیں آسکا۔ ورنہ ایک ہستی جسے ہمیں کہتے ہیں جل جل کر بھی بھی کر خاک ہونے سے بچ جاتی۔ ہاں البتہ ہمارے حق میں تو یہ بہتر ہوا ورنہ ہم ان کے فن سے محروم رہ جاتے اور یہ ہمارے مضمون سے! (اس کے باوجود فقیروں کے بھیس میں تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہوئے یہ بے پرواہی سے کہتی ہیں کہ ۔ ای سے تیری میں ہوں میں امیر ——)

ان سے جب بھی کوئی عمدہ شے لکھوانی ہو تو دیہاتن ہونے کے ناتے کسی نہ کسی کو ٹھوسنے انھیں ہانکتے رہنا پڑتا ہے۔ یہ کچھ تنقید اور کچھ دید پر مبنی ہے۔ تنقید یوں کہ محترم اشفاق احمد صاحب نے ڈانٹ ڈپٹ کر پانچ دن میں آتشِ رفتہ لکھوائی جو تا حال بہترین شمار ہوتی ہے۔ اور ممتاز مسعود نے بے تکلفی سے نوٹس دیا اور انہوں نے کسی ریسرچ سکالر کی طرح کتاب کے حاشیے سیاہ کئے، پھر وہی سیاہی اپنے مقالہ میں استعمال کی، عمدگی اور مہارت سے۔ عبدالعزیز خالد صاحب نے شاعرانہ تعلی کی بجائے انکساری سے کام لیا۔ پھر بھی میر کارواں ٹھہرائے گئے اور ایک اصلاحی پرچم اُن کے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ ان کی شخصیت کے کئی رنگ ڈھنگ ہیں۔ رنگ یہ کہ سادہ لوح ہیں مگر ایسی سادہ بھی نہیں۔ سوجھ بوجھ رکھتی ہیں مگر ایسی زیادہ بھی نہیں۔ ڈھنگ ایسے کہ کہیں دو ٹوک گفتگو تو کہیں سراپا خلوص و نیاز۔

ایک اور عادت جو میرے مشاہدہ میں اب تک آئی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ جب انھیں کوئی خیال کوئی جذبہ یا احساس کسی کا مقولہ یا کوئی بات بہت پسند آئے تو یہ بالکل مہر بلب ہو جاتی ہیں۔ ان کی چشمِ نگراں عالمِ خیال میں مستغرق ہو کر ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے میں اب یہ جان چکی ہوں کہ جب بول پڑیں تو سمجھ لیجئے کہیں گڑبڑ ہے۔ خواہ وہ تعریف ہی کیوں نہ ہو لیکن یاد رہے نوآموزوں کے ساتھ ان کا یہ رویہ کچھ یوں ہوتا ہے گویا کہہ رہی ہوں —— کئے جاؤ کوشش میرے دوستو! اس سے آگے نہ ہوں۔ میں نے اپنے پہلے مضمون پر صاد کہلانے کی سرتوڑ کوشش کر ڈالی لیکن انہوں نے پلٹ کر نہ دیا۔ بلکہ میری ہر بات کا جواب اپنے چہرے پر بکھرے ہوئے احساسات کی دھوپ چھاؤں سے ہی دیا۔ اس عادت کے اثرات میری رائے میں دوگونہ ہیں۔ کچھ لوگ اس طرح حوصلہ افزائی محسوس کرتے ہیں اور کچھ دل چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ایک تیسری قسم اُن لوگوں کی بھی ہے جو ان کے ایسے رویئے سے اپنے حوصلے کی شکستگی دور کر کے چیلنج قبول کر لیتے ہیں۔ میں شاید ان تمام کیفیات سے گزر کر ہی آج نقاب کشائی کی ان غیر سرکاری رسومات میں شریک ہو رہی ہوں۔

یوں کتاب تو ان کی چھپ ہی چکی ہے۔ اور اب پیش لفظ کے طور پر محترمہ سخنے چند محض اس لئے جمع کر رہی ہیں کہ دامے درمے کی استطاعت یہ صورتِ سلام و طعام رکھتی ہیں۔ ہم جیسی صورتیں تو اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے اک ذرا سا سایہ دیوار ہی میسر آجائے تو گویا سوکھے دھانوں پانی پڑ جاتا ہے اور دل وہیں بسیرا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

بات سے بات نکلتی چلی آتی ہے اور اب جو بات میری سمجھ میں نہیں آرہی وہ یہ ہے کہ جس دور کی کہانیاں یہ ایسی مہارت سے لکھتی ہیں اس وقت ان کی کم سنی میں ایسا گہرا مشاہدہ کیسوں کر داخل ہوا؟ اسے ان کے شعور کی پختگی کہوں یا صلاحیتِ خداداد، کیونکہ ان کے ہاں حافظہ و مشاہدہ کا گہرا ربط ہے اور وہ ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ تیسری صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ یہ بھی اندرونِ خانہ (نہ صرف دیہاتن ہیں بلکہ) خالصتاً و فطرتاً عورت ہیں جو اپنی سوجھ بوجھ سے عمر کے وقت کو قید کئے ہوئے ہے۔ ویسے یہی فنی انفرادیت ان کی پُرفن شخصیت میں بھی اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے۔ تعریف دل میں رکھتی ہیں

اور تعریف منہ پر کرتی ہیں۔ یوں ان کی شخصیت کے کئی پرت ہیں جو بظاہر دکھائی نہیں دیتے بہت غور کریں تو پتہ چلتا ہے۔ نہ ہوئے یوسفی صاحب کہ زبانی کاٹ تو کر ہی لیتے۔ رہی میں تو حسابِ دوستاں در دل رکھنے کے بارے میں یہ عرض ہے کہ اتنا کچھ کہہ لینے کے باوجود بھی کہوں گی کہ ۔

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ادھر کچھ عرصہ سے میں نے ادب کے آدابِ محفل پر غور کرنا شروع کیا تو جمیلہ بی کو بھی اس کی زد میں پایا۔ یعنی میں نے دیکھا کہ وہ بھی چھوٹے بڑے ادیب اور ادنیٰ و اعلیٰ ادب کے ٹی ہاؤس میں پائی جاتی ہیں اور "تاریخ کے چکروں میں گھومتی رہنے والی" روح کمیت اپنی ——— ماڈل کی (MAZDA) کار میں بیشتر رشتۂ ادب کی تسبیح میں ادیبوں کے موتی پرونے میں مصروف رہتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے ہاں کی محفلوں میں خلوص کا تقدس بھی ہوتا ہے اور زبان کی لذت بھی۔ پہلے کا تعلق ان سے اور دوسرے کا ان کے میاں سے ہے۔ دراصل کھانے کے بھی دو فلسفے ہوتے ہیں۔ یعنی کھانا اور کھلانا و کھانا۔ تقسیمِ کار میں دوسرا خانہ ان کے حصے آیا!

میں نے ایک بار اپنے میاں سے شکایت کی کہ آخر ہم اپنی دوستی کو آپ کی نظرِ بد سے نہ بچا سکے۔ بولے "بھلا وہ کیوں کر؟"

میں نے کہا "نہ آپ 'آوازِ دوست' کے حوالے سے دوستی کی صدا لگاتے، اور نہ وہ بات جسے انگریزی میں ACKNOWLEDGEMENT اور APPRECIATION کہتے ہیں مجھے اس حرکت پر مجبور کرتی کہ میں صرف "تحسینِ سخن شناس" ہی پڑھ کر آپ کے لئے مضمون لکھتی، دوستی تو نہیں البتہ آواز کا ذکر کرتی اور یوں آج جمیلہ کے آوازوں کا شکار ہوتی" وہ تو اب بات بے بات مجھے میرے پورے پانچ مضامین کا طعنہ دے کر جلاتی ہے۔ کم فعال اور زیادہ فعال ادیبوں کا فرق جتاتی ہے، جو یوں بھی فی زمانہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔"

میں نے مسعود سے یہ بھی کہا کہ "میاں آج کل آپ تو ادبی پہاڑ بنے ہوئے ہیں جس کی پگڈنڈیاں بھی ہم سے ابھی ہموار نہیں ہو سکیں۔ کہیں ایسا نہ ہو رشتۂ سلوک کی جو چند تاریں مجھے اپنی دوست سے تاحال منسلک رکھے ہوئے ہیں، ان میں بھی بال بال آپ ہی کے موتی پرو دئے جائیں۔"

جانتے ہیں وہ کیا بولے، کہنے لگے "تم بھی کیسی لاعلمی اور کم فہمی کی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے تو ثابت قدمی سے صرف دو رشتے ہی قائم کر رکھے ہیں ——— سرکاری وازدواجی! جس تیسرے رشتے کی تمہیں فکر ہو رہی ہے وہ خالصتاً ذاتی و انفرادی ہے۔"

اب آپ ہی کہیے اس کے بعد میں کیا کہتی اور کیونکر کہتی، جبکہ ثابت قدمی میں اصول اور سلوک کم و بیش ایک ہی مسند پر مسند نشین ہوں!

اور اب کہ تنقید میرا کام نہیں اور محسوس کرنے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں اپنے چند احساسات جو ان کی تحریریں پڑھ کر میرے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں آپ تک پہنچانا چاہتی ہوں۔

کردار نگاری سے جو نقطۂ نظر میرے سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کی سوچوں کا تعلق براہِ راست زندگی کی جذباتی قدروں کی گہرائیوں سے ہے۔ احساس کا انمول خزانہ جس جہاں میں اور جیسی زندگی میں ملتا ہے اسے ذرا سمیٹ لیتی ہیں۔ فطرتِ انسانی کے بعض جذباتی عناصر کی ترکیب کا مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا راز ہائے درونِ دل کی پایاب گہرائیوں میں ڈوب کر ایسی بلندیوں کو چھونا، اور ایسی ہستیوں میں اتر نا کیوں کر ممکن ہے۔ سوچوں کو الفاظ میں اور احساسات کو عبارت میں یوں ڈھالتی ہیں کہ جذبات کا سونا کندن ہو کر اس بھٹی سے نکلتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے کردار اپنے ماحول میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ اسلوب میں البتہ ایک انفرادی یکسانیت ہے اور بسا اوقات کسی خاص نظریے یا مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے جوشِ تحریر و تصور میں ان کے کردار جو مختلف طبقات و اذہان سے تعلق رکھتے ہیں، انجانے میں ایک سی زبان میں گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ خواہ وہ فلسفہ و نفسیات کا ایم۔ اے ہو، یا جادو کے

ڈبے سے تصویری سینما دکھانے والا - یوں بھی ان کا اسلوبِ بیان جذبات و نفسیات کی ہم آہنگ عکاسی کی بنا پر زم رو ہے جب کہ عام قاری کے لئے رک کر غور کرنا یا آہستہ آہستہ گہرائیوں میں ڈوب کر محسوس کرنے کے لئے نہ وقت ہے، نہ جذبہ اور نہ حوصلہ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ ابھی تک ان سے نامانوس ہیں اور یہ اُن کے لئے بعید از فہم اور یہ بھی زمانے کی کج ادائی ہے کہ خواتین سے بیشتر بچھلے تفریحی ادب کی توقع رکھتا ہے - ایسے میں اگر کہیں حرف و حکایت کی گہری سنجیدگی نظر آ جائے تو یہ باور کرنا نہیں چاہتے کہ اس ادب میں کسی بالغ نظر خاتون کا ہاتھ ہو سکتا ہے - کچھ عرصے سے انہوں نے ادب سے سلوک میں گرمجوشی کی بجائے جس سرد مہری کو اپنا رکھا ہے - ممکن ہے اُس کی یہی وجہ ہو - تاہم میرا انہیں یہی مشورہ ہے کہ رشتہ کی نزاکت کے لحاظ سے یہ کوئی اچھی صورتِ حال نہیں -

ہاں کچھ لوگوں کو یہ اعتراض بھی ہے کہ دورِ حاضر میں جب کہ پرانے ساتھیوں کے مابین نفرتوں کی خلیجیں بڑھ کر بحرِ بیکراں اور جذبات کا تلاطم طوفانِ تند و تیز کا روپ دھار چکا ہے، ہماری نئی نسل دشمنی کی دیواروں تلے پل کر جوان ہوئی ہے - ایسے میں اپنے ماحول اور معاشرے کی مصوری کی بجائے دشمن کی تصویر کشی کیسی ہی باکمال کیوں نہ ہو - نہ تو ذہن اس کی تعریف پر تیار ہوتا ہے اور نہ قلب اُسے قبول کرنا چاہتا ہے - وفا شعار بیوی اور پتی ورتا استری کا تصور ایک سہی، روپ جدا جدا ہیں - بھگوان کے قدموں میں بھی گلتے ہوئے اور ربِ ذوالجلال کی حمد و ثنا کرتے ہوئے دلوں کا جذبہ مشترک سہی، اندازِ اظہار جدا گانہ ہے جو ہمارے دلوں میں وہ سوز و گداز پیدا نہیں کر سکتا جو ہماری روح کی پکار ہے - اس میں تو شک نہیں کہ یہ اندازِ بیان ان کے لیے اظہارِ رائے میں آزادی کی راہیں استوار کر دیتا ہے - اور یوں بھی ایک فنکار کے مشاہدے کی آنکھ تو وسعتوں میں پہنائیاں تلاش کرنے کی عادی ہوتی ہے، زمان و مکان کی قید سے آزاد، رنگ و نسل اور مذہب و ملت سے ماورا - تاہم کیا ہی اچھا ہو اگر یہ اپنے قارئین کے جذبات کا لحاظ کر سکیں اور عشقِ رسول میں گھلنے والے اس دل کی پکار بھی اپنی روح کی طرح مسلمان ہو اور یوں ہمیں رمزِ مسلمانی سمجھائے کہ ان کے کمالِ فن کے باوجود جو اک تشنگی کا احساس رہ جاتا ہے وہ نہ رہے اور لوگ اس کی گہرائیوں میں دل و جان سے ڈوب سکیں - میں جانتی ہوں اپنی سوچوں کو بچپن کی یادوں سے جدا کرنا سہل نہیں - اُس ماحول کو بھولنا بھی بہت مشکل ہے جہاں ان کے فن نے جنم لیا، پھر بھی اپنی کہانیوں کی سرحدیں بدل کر حدِ فاصل کی دیوار گرانا تو ان کے اختیار میں ہے - مجھے اس کا علم ہے کہ وہ فن کی بلندیوں کو چھو لینے کے باوجود ابھی تک رہ نوردِ شوق ہیں - سراغِ زندگی پانے کی جستجو بھی ہے اور لگن بھی - ان کی بعض کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے حجاب امتیاز علی کا خیال آیا - حجاب جن کی کہانیوں کی دنیا پہ خوابوں کے انوکھے اور انجانے جزیروں کا گماں گزرتا ہے - جب کہ جمیلہ کی حکایتوں پر حقائق کے شعور کا قبضہ رہتا ہے - وہ لاشعور کی وادیوں میں بھٹکتی ہوئی روحوں کو سنبھالتی ہیں تو یہ شعور کی الجھنوں کو سلجھاتی ہیں - شاید ایسے ہی تفرقے ایک کے فن کو دوسرے کے فن سے جدا کرتے ہیں - اور یوں ایک کے واسطے سے دوسرے کی یاد دلاتے ہیں -

آداب کا تو یہ تقاضا ہے کہ ان کے ادب کی بات نہ کروں - کیونکہ ان کی تحریر کا ہر لفظ میرے لئے ایک زندہ احساس، بولتا ہوا جذبہ اور ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے - یوں بھی میرے لئے ان کی کہانیوں میں کہانی پن کم ہوتا ہے - میں انھیں جذبہ و احساس کا عکس، اور مشاہدہ و شعور کی صداقتِ ہر شکل کی تصویریں سمجھ کر دیکھتی ہوں، پڑھتی ہوں، لطف اندوز ہو کر حظ اُٹھاتی اور پھر ان کے فن کا اعتراف کرتے ہوئے اُس میں ڈوب جاتی ہوں - کہانی کس کی تھی اور قصہ کیا تھا، یہ میرے تحت الشعور میں چلا جاتا ہے - میرے شعور کی آنکھ میں صرف مناظر کی دلکشی، بیان کی سادگی و رعنائی، تشبیہات کا اثر کہیں دیکھا رہ جاتی ہے - ان کے قلم کا نشتر جن عمیق جذبوں کو چھیڑتا ہے اُن میں مجھ جیسے قاری کو اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے - جرأت و جاں بازی کے کارنامے

ضبط و احساس کی تلخیاں گہری محبتیں، طویل رفاقتیں، جان لیوا رقابتیں ان کی کہانیوں میں عام روش سے ہٹ کر انوکھے انداز میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ جن میں دکھ، خوشی، محبت کی شوخی اور ایثار کی گرمی بھی ہے اور شکست و طلب و طلوع و غروب کا سوز بھی ہے۔ جذبہ و احساس سے بھرپور، حسین نظر اور رنگین مناظر سے معمور۔ ذہن کے لئے ایک کیف انگیز سرشاری اور قلب و نظر کے لئے مسحور کن سحر کاری!

یقین جانیئے اگر میں مختلف کہانیوں سے اپنے پسندیدہ اقتباسات پیش کرنا چاہوں تو شاید اک دفتر نا تمام کھل جائے۔ اس لئے چند سطور ہی پہ اکتفا کرتی ہوں۔ سنیئے کہتی ہیں!

"جب آسمان پہ چاند نہیں ہوتا اُن راتوں میں تارے ٹوٹتے ہیں تو روشن چمکدار لکیر سی کھنچ جاتی ہے۔ اندھیرے کے پس منظر میں وہ زیادہ تابناک لگتی ہے۔ اور پھر —— فضا کو یاد ہی نہیں رہتا۔ خلا کو احساس ہی نہیں ہوتا۔ اُن تاروں کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا!!

—— پتہ نہیں تارے کیوں ٹوٹتے ہیں؟"

اور اب اس مجموعہ کی کہانیوں کو لیجئے۔ ان میں جن دنیاؤں کی شعوری سیر انہوں نے کروائی ہے وہ موضوع کے باوجود شائستگی و سنجیدگی کی حدود سے باہر نہیں۔ "میں نے" اپنا اپنا جہنم " میں ان کے جہنم کو سورج کے تین رنگوں میں اُبھرتے دیکھا ہے" اور رنگ" ایک ایسی چاہنے والی عورت کی پکار ہے جو عمر کے وقت اور اپنے آپ کے جادو میں قید تھی۔ اُس کی چاہت ایک ایسا گہرا سمندر تھی جو صحرا کی طرح خموش اور اپنے اندر طوفانوں کو دبائے پھیلا ہوا تھا۔ اسی لیے وہ دل ہی دل میں پکارتی رہ گئی" کیا تم نے مجھے پکارا؟ لیکن اُس کی پکار محبوب تک پہنچے بغیر ہی ناچیز ذرے کی طرح ہواؤں، آوازوں اور شور مچاتی لہروں میں مل گئی" سماں یونہی بیت گیا۔

—— "دہر کے رنگ" کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ "جسم کے صحرا میں گھومنے والے جانتے ہیں کہ آدمی صدیوں اس میں پھرتا رہے، اُس کا دامن پھر بھی خالی رہتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ راہیں ہیں جہاں نہ خوشبو ہے اور نہ ہی کوئی حقیقی خوشی۔ رگوں میں سرایت کر جانے والے جذبوں سے خالی جسم صرف وقتی رنگینیوں سے عبارت ہیں۔ یہ محبتیں نہ کسی کی پرستش کروا سکتی ہیں اور نہ ہی کسی کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ وہ رنگ ہیں جو کسی طور بھی زہرِ ہلاہل سے کم نہیں۔"

—— "شب تار" کی سیاہی دوسرے رنگوں سے قدرے مختلف اور گہری ہے۔ ہند و پاک کی ثقافت اس کا پس منظر ہے۔ حقائق کی سادگی اور تجربوں کی سچائی ہے۔ سیاست کی گہرائی بھی ہے اور نظریوں کا تجزیہ بھی۔ محاذِ جنگ کا ذکر بھی ہے اور ہزار رنگوں میں لپٹی پٹائی رومانیت کا لمس بھی۔ یہ اُن شعلوں کی کہانیاں ہیں جن کی ارغوانی لپٹیں ہمیں اپنی اپنی آگ میں جلاتی ہیں۔ اور جو نامرادِ ازل ہوں کہاں سنبھلتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے جہنم میں وہ تو جلتے ہیں!

ایک جگہ کہتی ہیں:" ہرن اپنے اندر نافے سے پھوٹتی خوشبو سے پریشان ہوتا اور اپنے گرد چکر کاٹتا ہے، صحرا میں بھاگتا ہے کہ شاید اسے پتہ چل جائے یہ خوشبو جو اسے گھیرے ہوئے ہے، کہاں سے آتی ہے، کیوں آتی ہے اور اُس کا پیچھا کیوں کرتی ہے؟"

یا پھر —" ہماری زندگی رامائن ہے۔ جس میں بن باس ہیں، دکھ ہیں، لڑائیاں ہیں، سمندر ہیں اور راون ہیں۔ ہماری مذہبی کتابیں ایسی تمثیلیں ہیں جو حیات کی تفسیریں ہیں — ہر جاندار اپنے آپ کو دنیا کا محور سمجھتا ہے۔ کرن چاہتا ہے کہ وہ زندہ ہو اور پھر فنا ہو جائے۔ اس کی ہستی کہیں نہ ہو ——"!

سر را ہے ایک راز کی بات اور یاد آگئی ہے وہ بھی بتاتی چلوں کہ ان کی عظمت و بزرگی بھی بڑی پہلو دار ہے۔ بھائی بہنوں کی وارد فر۔

میدانِ ادب میں اپنے اُسی فن کی امام جس پہ یہ ہنگامہ بپا ہے "اور کتاب حوا پہ آدم جی کی انعام یافتہ۔ جرأتِ اظہار میں اکھڑپن کی حد تک پہنچی ہوئی درویشانہ بے نیازی ہی ان کی محبوب ادا ہے۔ جس کے باعث کھوٹے اور کھرے کی پہچان ان کے لئے کافی آسان ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تاڑنے والے اپنی قیامت نظروں سے جال ہی لیتے ہیں کہ طبعی سادہ لوحی کے باعث عموماً دھوکا کھا رہی ہیں۔

اب رہا معاملہ دوستی کا تو مان لیجئے کہ یہ دوستی کو رشتہ داری پر ترجیح دیتی ہیں، کیونکہ رشتہ دار تو ورثے میں مل ہی جاتے ہیں لیکن دوست قوتِ خلوص سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس راہ میں خلوص کے خزانے لٹانے والی یہ جابر حکمران دوستوں کے معاملے میں خود غرضی کی حد تک (POSSESSIVE) ہے۔ وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ ان راہوں میں برسوں کی ریاضت کے بعد قربت کی جس منزل پر وہ پہنچے، دوسرے وقت کی قید سے نکل کر اپنی جستجو میں اُس کی یہ ریاضت بھی اپنے حصے میں شمار کر کے قدم آگے بڑھائیں۔ اور یوں برسوں کو لمحوں میں عبور کر لیں۔ لیکن اپنی تمام تر نازک مزاجی کے باوجود جو کسی کی بات کا ادھار نہ رکھنے کے باعث بسا اوقات تنک مزاجی کی حد تک جا پہنچتی ہے، ان کی سادگی میں خلوص کی چاشنی، محبت کا رنگ اور بے نیازی کا ایک ایسا انوکھا انداز ہے جو دوستی کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حلقۂ یاراں وسعتِ خلوصِ قلب میں سمایا ہوا ہے۔ کیونکہ جذبۂ رشک و محبت اگر حسد کے جذبات کی جانب نہ جھک جائے تو دوستی میں خلوص کے غیر فانی جذبات کا علمبردار بن سکتا ہے۔

بات نہ لگاوٹ کی ہے اور نہ بناوٹ کی۔ لیکن محسوس کچھ یوں ہو رہا ہے کہ نہ حق ہی ادا کر پا رہی ہوں اور نہ انصاف ہی ہوتا نظر آ رہا ہے بس یونہی رسمِ دوستی نبھائے چلی جا رہی ہوں۔ دراصل یہ کام 'جناب' و 'محترم' یعنی کرمی محمد نقوش صاحب کے کرنے کا تھا کیونکہ اُن کی آنکھ کا کیمرہ جس طرح شخصیت کی عکاسی کرتا ہے اُس میں کئی اقسام کے لینز اور فلٹر ہیں۔ اسی لئے اپنا حقیقی عکس دیکھ کر بہت سے خفا ہو جاتے ہیں اور کئی ایک ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ یادوں کے جھروکے سے ایک ہی صورت کیسے کیسے انداز میں جلوہ نمائی کرتی ہے۔ اور ایک ہی شبیہ کے کتنے رُخ ہوتے ہیں، کچھ مکمل، کچھ نامکمل۔ چند صاف و شفاف اور چند دھندلے دھندلے ـــ ایک فقرہ جو ہمیشہ نوکِ زبان رہتا ہے کہ "میں تو سدا سے ایسی ہی تھی، ایسی ہی ہوں اور ایسی ہی رہوں گی" ـــ کیسی؟ سچ پوچھیے تو نہ انھیں معلوم ہے اور نہ ہمیں معلوم ہو سکا۔ اس تمام ماضی کو دہرانے کے باوجود بھی!

بات تو صرف اتنی سی تھی جو زلفِ دراز کی طرح طول پکڑتی گئی کہ آپ تنگ آ چکے ہیں اور میں تھک چکی ہوں۔ حالانکہ صرف یہی تو کہنا تھا کہ بہاولپور کے شب و روز یوں گزرتے رہے۔ میری ان سے پہلی ملاقات لیڈیز کلب میں ہوئی، دوسری اپنے ہاں اور تیسری ان کی دیہاتی قیام گاہ پہ۔ ملاقاتوں کی ریت جب چل نکلی تو میں نے ڈرائیونگ سیکھنی شروع کی اور مشق کے لیے اُسی سیدھی اور ہموار سڑک کا سہارا لیا جو خانقاہ شریف کو بہاولپور سے ملاتی تھی۔ اتنی ذرا سی بات یہاں تک آن پہنچے گی اس کا مجھے علم ہی نہ ہو سکا ورنہ زباں بندی و قلم گستری کو ہمرکاب رکھتی۔ اب یہاں تک پہنچ ہی گئی تو ان کا شخصی تجزیہ کرنے کے لئے لازم تھا کہ میں بھی انہی کی طرح ماضی کی حکایتوں اور گزری ہوئی وارداتوں کا سہارا لیتی چلی جاؤں اور جہاں قدم تھک جائیں وہاں لغزشِ پا کر بہانہ بنا کر میں بھی رک جاؤں۔ یوں ان کی گنی چنی عادات کو انگلیوں پر میں نے شمار کر دیا ہے، حساب آپ خود لگا لیں۔

U.S.I.S کے اُس مرکزی طور پہ ایئر کنڈیشنڈ ہال میں جو نہ اتنا گرم کہ جہنم زار ہو اور نہ ایسا خنک کہ جنت نشاں کہلا سکے اور جس کا خوبصورت ہریا فرشِ زیرِ پا ہو، ایسی پل صراط پر پہنچ کر ایک مضمون کے بعد میں ان کی نظر میں جور و جفا کی ترکیب ٹھہرتی ہوں یا عہدِ وفا کی پاسدار۔ یا پھر محض ان کے اپنے اور ہم سب کے جہنم کی رسمِ افتتاح میں شرکت کی گنہ گار؟

کوئی تبلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

# صفدر محمود

## صادق حسین

[صفدر محمود نے اول اُردو ادب میں افسانہ نویس اور مزاح نگار کی حیثیت سے قدم رکھا۔ لیکن جلد ہی دشت کی پہنائی کو اپنے جنون کے لئے تنگ پا کر وہ تاریخ اور سیاسیات کی وادی میں نکل گئے۔ دنیا اب انھیں ایک مورخ کی حیثیت سے جانتی ہے۔]

○

کتاب کے بارے میں، محترم شخصیتیں اپنے خیالات کا اظہار کریں گی۔ میں صرف ایک پہچان کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔
صفدر محمود فرشتہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے ندامت ہوتی۔
انسان کا ظرف سمندر بھی ہو سکتا ہے اور قطرہ بھی۔ صفدر محمود کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں خلوص کا لشکر لے کر نئے ملاقاتی کے ظرف پر اچانک حملہ کر دیتے ہیں۔ معرکہ پڑتا ہے۔ فتح بھی ہوتی ہے اور شکست بھی۔ اکثر جیتنے والا ہار جاتا ہے۔ اس لئے کہ نیا ملاقاتی بے تکلفی کی شہ پا کر قبل از وقت پرانا ہو جاتا ہے اور دفعتہً کود کر صفدر محمود کے کاندھے پر چڑھ کر مگن ہو جاتا ہے۔ تب، صفدر محمود، دبی دبی آواز میں پکار اُٹھتے ہیں "یہ دُنیا عجیب ہے۔" مجھے عرض کرنا پڑتا ہے "دُنیا نہیں، اولادِ آدم عجیب ہے۔ اولادِ آدم میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو مر کر زندہ رہتے ہیں۔ ایسے بھی جو جیتے جی مر جاتے ہیں۔ میری گزارشات سُن کر صفدر محمود سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یوں جیسے دُنیا کی تمام احتیاطیں اُن کے پھرتیلے بدن میں سمٹ آئی ہوں۔ دو چار ہی دن عافیت سے گزرتے ہیں کہ انھیں پھر لشکر کشی کا بخار چڑھ جاتا ہے۔

صفدر محمود مختلف اقسام کے بخاروں میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب ہمارے بچانوے ہزار فوجی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے تو انھیں میعادی بخار نے آگھیرا۔ دلائل کی CHLOROMYEITIN بے اثر ثابت ہوئی۔ وہ بچوں کی طرح روئے۔ سیلاب آیا تو انھیں ملیریا نے جکڑ لیا۔ لرزتے تھے، اس تصور سے کہ پانی میں گھرے لوگ تھر تھر کانپ رہے ہوں گے۔ مگر انہوں نے یہ کسی کو نہ بتایا کہ ڈِنگا میں اُن کے موروثی کھیتوں کی فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ اُن کا جدی مکان سیلاب کی زد میں آ چکا ہے۔
میں نے صفدر محمود کا آبائی مکان دیکھا ہے۔ وہ محل نہیں تھا۔ اُس کے دروازوں اور کھڑکیوں میں ریشمی پردے نہیں پڑے تھے۔ بس ایک گھر تھا۔ وہ گھر، جو، جاگتا شعور مستقبل میں تعمیر کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔
پہلے پہل جب میں نے ڈِنگا کا نام سُنا تو خیال آیا کہ وہاں کے باشندے بھی ڈِنگے ہوں گے۔ مگر صفدر محمود کو قریب سے دیکھ کر اِس خیال میں ترمیم کرنا پڑی۔

صفدر محمود تینتیس سال پہلے ڈِنگا میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں گجرات سے تیئس ۲۳ میل دور جنوب میں واقع ہے۔ مغلوں کے دور میں یہ گاؤں علم کا گہوارہ تھا۔ اِس نسبت سے اِس گاؤں کا نام "دین گاہ" تھا۔ سکھوں کے زمانے تک یہ نام قائم رہا۔ مگر انگریزوں نے جب "دین گاہ" کو انگریزی میں لکھا تو DIN GA ہؤا۔ رفتہ رفتہ تلفظ کے گھمنڈ نے اُسے ڈِنگا بنا دیا۔

جہلم اور چناب کے درمیان پھیلے ہوئے اِس خطے سے سوہنی مہینوال کا رومان وابستہ ہے۔ چنانچہ ہم سوچا کرتے تھے کہ یہاں کے لوگ رومان پسند ہوں گے۔ مگر صفدر محمود اس میدان میں نااہل ثابت ہوئے۔ اگر کوئی شخص رومانی نقصہ چھیڑے تو اپنی بے ذوقی کا پورا ثبوت دیتے ہیں۔

ڈِنگا میں چوہدریوں کا خاندان جاگیرداری نظام کے خمیر سے اُٹھا۔ صفدر محمود اِسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ جب میں پہلی مرتبہ ڈِنگا گیا تو اُن کے ماموں چوہدری محمد اقبال کی پُر وقار شخصیت اور اُن کے رکھ رکھاؤ میں درباروں کی بُو پائی۔ صفدر محمود اپنے خاندان کی اِس لرزتی ہوئی بُو سے بغاوت کر چکے ہیں۔ غالباً اِس لئے کہ اِس دَور میں اُن کی اولاد کو پہلی مرتبہ دیکھنے پر دوسرے گاؤں کا چوہدری ایک گھوڑا بطورِ تحفہ نہیں دے سکتا۔ بات میں بات نکلتی ہے۔ ہوا یوں کہ اُس زمانے میں بڑے چوہدری صاحب (صفدر محمود کے والد مرحوم) ننھے صفدر محمود کو لے کر دوسرے گاؤں گئے۔ ننھے کی پہلی آمد پہ بازار میں ہل چل مچ گئی۔ اُس گاؤں کے چوہدری نے ایک گھوڑا بطورِ تحفہ دیا۔ ایک شخص نے سونے کے کڑے۔ نہ وہ تحفہ دینے والے رہے۔ نہ صفدر محمود کے ابّا جان۔ ایک بات رہ گئی اور جب ایک بات رہ جاتی ہے تو آنے والی نسلیں اُسے یاد رکھتی ہیں۔

صفدر محمود اِس مقام پر نہ پہنچ سکتے اگر انھیں اپنی شریکِ حیات کی محبت، ایثار اور تحمل کی رفاقت حاصل نہ ہوتی، جب صفدر محمود کو لکھنے کا بخار چڑھتا ہے تو انھیں اپنی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ سوائے لکھنے کے وہ ہر دوسرے رشتے سے کٹ جاتے ہیں۔ اپنی شریکِ حیات کو بھول جاتے ہیں۔ اپنی دونوں بچیوں، عافیہ اور یاسرا کو بھی۔ اِس عمل میں کوئی آواز، برتن کھنکنے کی یا قدموں کی آہٹ، ناگوار گزرتی ہے۔ کوئی عورت، خاص کر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت جیسی کہ بھابی ہیں ایسی اچانک تبدیلی پر اختلاف کر سکتی ہیں۔ مگر بھابی، ایک زیرِلب تبسم کے ساتھ، چائے کی سپلائی جاری رکھتی ہیں۔ آوازوں کو دبانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور ہم داد دیتے ہیں کہ وہ صفدر محمود کے ہر دوست سے خندہ پیشانی سے پیش آتی ہیں اور کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دیتیں کہ وہ اپنے دل میں کیا سوچ رہی ہیں۔

صفدر محمود کا پہلوٹھی کا بیٹا اور اُس کے اوپر کی بیٹی اللہ کو پیارے ہوئے۔ بھابی روتی ہیں اور شکوہ کرتی ہیں کہ صفدر محمود اپنے اِن بچوں کو یاد کر کے آنسو نہیں بہاتے۔ اور صفدر محمود کہتے ہیں ـــ "موت اتنی ہی خوب صورت ہے جتنی کہ زندگی۔"

میں نے صفدر محمود کو جلال کی حالت میں بھی دیکھا ہے لیکن ان کے چہرے سے پتا نہیں چلتا کہ اُن پر جلالی کیفیت طاری ہے۔ صرف اُن کے بدلے ہوئے اندازِ تکلم سے چبھن ٹپکتی ہے۔ یوں جیسے برسات میں چھت۔ یہ مدِّمقابل کی وُسعتِ ادراک پر مبنی ہوتا ہے کہ وہ اُس لمحاتی واردات کو جلال سے تعبیر کرے یا جمال سے۔

مجھے صفدر محمود میں برق رفتاری کا عنصر نظر آتا ہے۔ وہ پیدل چلتے، کار ڈرائیو کرتے، لکھتے پڑھتے، گفتگو کرتے، ہمہ وقت تیزی کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک بے چین رُوح اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

صفدر محمود کو تینتیس سال کی عمر میں اپنے آپ کو بوڑھا کہلانے کا بہت شوق ہے۔ شاید اِس لئے کہ وہ اپنے ذہن کی بزرگی میں آئندہ

زندگی کی بزرگی پیشگی شامل کر کے ہم پر مکمل فتح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

صفدر محمود کے خیال میں اُن کی صحت اچھی نہیں۔ دراصل معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ اپنے کاندھوں پر ایک وزنی بوری اُٹھائے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ اُس بوری میں اُن کے دوستوں کے حل طلب مسائل۔ دکھ درد ہوتے ہیں۔ دوست اُنھیں یہ سوغاتیں دے کر بھول جاتے ہیں مگر صفدر محمود اُن سوغاتوں کی عملی نگہداشت کرتے ہیں۔ دکھ کی آنچ محسوس کرتے ہیں۔ غم میں شریک ہوتے ہیں۔ محبت یوں بانٹتے ہیں جیسے ہوا گلوں کی خوشبو لے کر جدھر چاہتی ہے نکل جاتی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی محفل سے نکل کر صفدر محمود مجھ سے دریافت کرتے ہیں "آج میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی"۔ یہ سن کر میں اپنے گریبان میں منہ ڈالتا ہوں اور سوچتا رہ جاتا ہوں۔

صفدر محمود ایک زمانے میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں سیاسیات کے لیکچرار تھے۔ بے چین روح نے اُس ماحول کو خدا حافظ کہا۔ اب وہ ایک اور سرکاری محکمے میں کاروباری اداروں کی بیلنس شیٹیں کھنگالتے ہیں۔ جب دفتری کام کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جنّات کی فوج اُن کے وجود میں در آئی ہو۔ بے چین روح اعداد و شمار کے اِس دائرے کو خوشگوار نہیں سمجھتی۔ اِس کے باوجود انگریزی میں چار اور اُردو میں بھی چار ہی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی سیاست اور تاریخ پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ اِس کے باوصف فرماتے ہیں "ابھی کوئی کام نہیں ہوا"۔

بعض اوقات شدّتِ احساس سے پکار اُٹھتے ہیں:۔

"میں تو کچھ بھی نہیں جانتا"۔

یہ سُن کر میرے دل میں خیال آتا ہے کہ صدیوں پہلے یونان کے عظیم فلسفی نے کہا تھا ــــ "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا"۔

---

# اختر جمال کے افسانے

## نذیر احمد

کچھ عرصے سے اردو افسانہ ایک ایسے دور سے گذر رہا ہے۔ جس میں روایت کا تسلسل بھی ملتا ہے۔ اور اس کی شکست و ریخت بھی شکست و ریخت ہی سے دراصل موضوع اور ہئیت کے تجربات کا راستہ نکلتا ہے اور نئی روایت کی بنا پڑتی ہے روایت کی شکست و ریخت روایت کے گہرے شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ نئی روایت یا تجربے کی بنیاد، ظاہر ہے کہ روایت کے ٹوٹے پھوٹے عناصر اور ان کی ترتیب نو پر ہی رکھی جا سکتی ہے۔ ماضی قریب میں افسانے کی دنیا میں شکست و ریخت کا عمل اتنا بھرپور رہا ہے کہ استحکام اور اثبات بھی تغیر ہی کا روپ معلوم ہوتے ہیں۔ افسانے کی زبان، الفاظ کے دروبست، فقروں کی ساخت، ہئیت کی تشکیل، کردار نگاری کی نوعیت، پلاٹ کی ترتیب ——غرضیکہ افسانے کے تمام عناصر ترکیبی میں زبردست انقلاب آچکا ہے۔ علامت اور تجرید کو جدید تر تکنیک میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جدید تکنیک کے جلو میں جدید طرزِ احساس بھی در آیا ہے۔ جس میں ایک گونہ تازگی اور ندرت ہے۔ چونکہ جدید تکنیک کا براہِ راست بین الاقوامی فنی صورتِ حال سے تعلق ہے۔ اس لئے اس میں معصریت کا عنصر نمایاں ہے۔ اور یہ قومی صورتِ حال سے ہم آہنگ ہے۔ اس وجہ سے یہ تنقیدی توجہ کے لئے بھی نسبتاً زیادہ باعثِ کشش ہے۔ گو آج بھی اردو میں پرانے پیرایۂ اظہار سے نمو پانے والے افسانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ تاہم ادبی منظر پر نمایاں مقام جدت اور تجربے کو حاصل ہے۔ اختر جمال بیانیہ روایت کی اچھی مثال ہے۔ اس کے اندازِ نگارش اور اندازِ فکر دونوں میں روایت کا تسلسل ملتا ہے موضوعات کے انتخاب میں بھی انفرادیت کا عنصر بڑی حد تک مفقود ہے۔ مگر کسی مستحکم روایت کو اپنانا اور نبھانا غالباً اتنا ہی اہم اور مشکل ہے۔ جتنا علم بغاوت کو لہرانے، اور نئی روایت کی تشکیل میں شریک ہونا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اختر جمال کے افسانے ہماری تنقیدی توجہ کے مستحق ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اختر جمال نے جس روایت میں لکھا ہے اس میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ اور جن موضوعات کا ابلاغ کرنا چاہا ہے۔ ان سے کس حد تک انصاف کر سکتی ہے۔ اس سوال کے جواب کی تلاش میں میں نے مختلف افسانوں سے بحث کی ہے۔

معاشرتی زندگی میں فرد یا اجتماع کے تمام جذباتی تقاضوں کی تسکین غالباً ممکن نہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا نظام زندگی وضع نہیں کیا جا سکا۔ جو بالخصوص انفرادی محرومی کے احساس کو مکمل طور پر ختم کر سکے۔ ہماری ذات کے ناآسودہ پہلوؤں سے منسلک رومان کے کسی نہ کسی تصور کا وجود ایک حقیقت ہے۔ ہمارے جیسے ملک جہاں ماضی و حال پر انفرادی اور اجتماعی محرومیوں کے گہرے سائے محیط ہوں۔ ان میں رومان حقیقت سے کہیں زیادہ پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں لکھنے والے کا طرزِ احساس بالعموم رومانی ہالہ میں لپٹا ہوتا ہے۔ اختر جمال کے بعض افسانے بھی رومانی طرزِ احساس کے آئینہ دار ہیں۔ محبت کے ساتھ ازلی و ابدی ناکامی وابستہ ہے کبھی سماجی رسم و رواج، معاشرتی تعصبات اور طبقاتی امتیازات اس ناکامی کا باعث بنتے ہیں اور پورا سماج ایک ایسی دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ جس کے پیچھے رومانی جذبہ

گھٹا جاتا ہے۔ کبھی انسانوں کے اندر مضمر جذبۂ شیطنت کی کارفرمائی سے محبت تشنہ کام رہ جاتی ہے۔ یا حادثات کا کوئی پیچیدہ سلسلہ اس کی تکمیل کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ بعض مرتبہ خود فرد کی ذات میں جذبات کا ایسا معرکہ ہوتا ہے کہ محبت کی خواہش آسودہ نہیں ہو پاتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اختر جمال کے افسانوں میں محبت کی ناکامی کے سماجی اسباب کا ذکر نہیں ہے۔ آخر رؤفہ کا شوہر اپنی محبوبہ سے صرف اس لئے شادی نہیں کر پایا کہ ان دونوں کے درمیان مذہب کی دیوار تھی۔ وہ اپنی ترقی پسندی، روشن خیالی اور بغاوت کے باوجود اپنے اندر اس دیوار کو پھلانگنے کی ہمت پیدا نہ کر سکا۔ مگر "سجدۂ سنگ" میں اختر جمال اپنے موضوع کو اس پس منظر سے نہیں ابھارتی۔ اس ضمن میں اس کی توجہ کا مرکز وہ غلط فہمی یا نامکمل مفاہمت ہے۔ جو دو انسانوں کو ہمیشہ کے لئے ایسے متوازی راستوں پر گامزن کر دیتی ہے۔ جو کبھی آپس میں نہیں ملتے اور جن کے درمیان ٹوٹے پھوٹے خوابوں کی ایک دنیا آباد رہتی ہے۔ رؤفہ کی ملاقات عمر کے ایک اثر پذیر مرحلے پر ایک مشہور ادیب اور مزدور رہنما سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے تمام پہلوؤں کے پیش نظر اپنے جذبۂ محبت کا جائزہ نہیں لیتی۔ بلکہ عقلی معاملات میں ایک برتر شخصیت سے متاثر ہو کر وہ جذباتی فیصلہ کر ڈالتی ہے اور جب اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کا یہ فیصلہ خاندان میں ناپسند کیا جا رہا ہے۔ تو اسے صورت حال میں چیلنج نظر آتی ہے۔ وہ اپنی پوری شخصیت کے زور سے اس چیلنج کو قبول کر لیتی ہے۔ اور اسی بہاؤ میں قائم کا اعتراف محبت بھی اسے یکگانہ جذباتیت پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ رؤفہ جذباتی رو میں اپنے ہیرو کے خیالی خدوخال، اس کی تحریروں کی روشنی میں، ترتیب دینا شروع کر دیتی ہے۔

"جوں جوں ملن کے دن قریب آ رہے ہیں۔ میری عجیب حالت ہوتی جاتی ہے۔ ساحل سامنے ہے۔ ننھی سی ناؤ ہے ——— ملاح کو دور سے ہی دیکھا ہے ——— اور راہ طویل اور دشوار ہے ——— لیکن ملاح بڑا بھلا مانس دکھائی دیتا ہے اور اب اگر راہ میں طوفان آ جائے تو مجھے پرواہ نہیں ہے۔ یا میں اس کے ساتھ مر جاؤں گی یا ہم اکٹھے کنارے پر جائیں گے۔ جس طرح ہوائیں ساکت ہو جاتی ہیں اور روئی کے دھنکے ہوئے گالوں کی طرح برف دھیرے دھیرے پہاڑوں اور وادی کو چھوتی ہے۔ ایسے ہی دل میں چپکے چپکے ——— دھیرے دھیرے ——— تمہاری یاد آتی ہے۔ اب وہ دن بہت قریب آ گیا ہے۔ جب میں تم سے بھی یہ سنوں گی کہ تم نے کس کس طرح میرا انتظار کیا ہے۔ کیا تم بھی میرے بارے میں اسی طرح سوچا کرتے ہو۔"

رؤفہ کے جذبات میں شدید تناؤ آ جاتا ہے۔ وہ ان کی تسکین کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیتی ہے۔ مگر سہاگ رات اسے ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے۔ اس کے جذبات ڈھیلے اور سرد پڑ جاتے ہیں۔ حقیقت کا سامنا ہوتے ہی اس کے دل میں ہیرو کا خیالی تصور پاش پاش ہو جاتا ہے۔

"اوہ یہ تصویر ——— ان کے چہرے پر عجیب سا رنگ آیا، وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے تصویر کو الٹا کر کے رکھ دیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے اور سگریٹ پینے لگے۔ پھر آہستہ سے بولے۔" تم نے اس تصویر کی طرف اشارہ کر کے اچھا نہیں کیا۔

وہ ہمت کر کے بولی"۔ یہ ——— یہ کس کی تصویر ہے؟"

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے ـ بڑی شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولے"۔ رؤفہ تم تو اتنی اچھی لڑکی ہو ——— میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتا ——— میں نے اس لڑکی سے محبت کی ہے ——— اور وہ چپ ہو گئے۔

"آپ نے ——— آپ نے اس سے شادی کیوں نہیں کی ———" اس نے ایسی لرزتی ہوئی آواز نکالی، جیسے وہ ڈوبتے ڈوبتے پاتال میں

چلی گئی ہے — جہاں نہ سانس لیا جاتا ہے۔ نہ بولا جاتا ہے۔!

"ہمارے درمیان مذہب کی دیواریں حائل ہو گئی تھیں ... وہ ہندو تھی۔!"

"تو کیا آپ ان دیواروں کو پھلانگ نہیں سکتے تھے — آپ کی کتابیں پڑھ کر تو لوگوں میں اتنی جرأت پیدا ہو جاتی ہے — کیا صاف اور سیدھا راستہ دکھائی دیتا ہے۔"

"اور آپ — آپ خود کچھ نہ کر سکے۔"

"میں کیا کرتا — میں مجبور تھا۔"

اس المناک انکشاف کی روشنی میں یادوں کی ڈوری گزشتہ زندگی اور ماضی کے واقعات کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ رُوفہ کا دل چاہتا ہے کہ وہ قاسم قاسم پکارے۔ مگر اب تو قاسم اس کے لئے جیتا جاگتا انسان نہیں جسے وہ پا سکے۔ وہ اس کے ذہنی افق پر گھنایا ہوا چاند ہے — ٹوٹا ہوا خواب، یا کملایا ہوا پھول۔ اسی طرح قاسم کے لئے رُوفہ اب ایسا امکان نہیں جسے وہ پا سکے اور جذباتی و نظریاتی ہم آہنگی حاصل کر سکے اب قاسم اور رُوفہ یکساں جذباتی تعطل اور خلا کا شکار ہیں۔ وحشت امکان جو کبھی وسیع تھا۔ اب ایک نقطے میں سمٹ آیا ہے۔ خوشیاں جو کبھی ان کی ہو سکتی تھیں۔ زندگی کے عمل سے پامال ہو گئی ہیں اور اب غم اور شکست ہی حقیقت ہیں۔

اختر جمال کے رومانی کرداروں کے ہاں بالعموم پچھتاوے کا تجربہ ملتا ہے "تحفہ" کے مرکزی کردار کو دیکھیے۔ وہ بیاہتا عورت ہے۔ اس کا شوہر ڈاکٹر ہے۔ اس کے پیارے پیارے بچے ہیں۔ چھوٹا سا، صاف ستھرا معقول گھر ہے۔ وہ تیس برس کی ہو چکی ہے۔ آج اس کی سالگرہ کا دن ہے۔

"مگر شادی کے شروع سالوں میں بھی اسے کبھی اپنی بیوی کی سالگرہ سے دلچسپی نہ ہوئی تھی۔ اور اس نے اپنے شوہر کے لئے تو اسی دن جنم لیا تھا جس دن وہ اس کے گھر میں بیاہ کر آئی تھی۔ اس روز وہ اسے عام دنوں کی بہ نسبت ذرا زیادہ محبت سے پیار کرتا تھا۔ اس نے سوچا یہ اچھا ہی ہے کہ اس کے میاں کو یہ بات قطعی یاد نہیں کہ وہ آج ایک دم تیس برس کی ہو گئی ہے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی اپنی ساری خوبصورتی۔ تازگی اور مدھرتا لئے اس کے سامنے بھاگ رہی ہے۔ وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے کسی گہرے غار میں جا پڑے گی۔ جہاں بھیانک اندھیرا اسے ڈس لے گا۔ ایسی خزاں جہاں ہر چیز سوکھی ہوئی اور پژمردہ ہوتی ہوگی وہ بھی قدموں کی دھول بن کر رہ جائے گی۔ آج تیس سال کل چالیس سال اور پھر شاید کسی دن ساٹھ سال کی بوڑھی کھوسٹ — توبہ ہے۔ وہ گھبرا گئی۔ میں اتنا زندہ رہنا نہیں چاہتی کہ ساری دنیا نفرت کرے یا پھر ترس کھائے۔"

ان خوفناک تصورات میں ایک دم ماضی کے ایک واقعہ کی روشنی پھیلتی ہے۔ اور اسے سالگرہ کا وہ دن یاد آتا ہے۔ جب اوائل عمری تھی۔ وہ بچی ہی تھی۔ سہیلیاں اس کے لئے تحفے لائیں تھیں۔ کچھ تحفے ان کے بھائیوں کے بھی تھے۔ خالد اس کے لئے پھولوں کا ہار لایا تھا۔ ان دونوں کے جذبات کا اتصال ہوا۔ مگر وہ خالد کے جذبۂ محبت کو آزمانے اور چمکانے کی خاطر اوروں کے تحفوں کی تعریف کرتی رہی۔ اور اسی تعریف کے درمیان خالد دل برداشتہ ہو گیا اور پھر زندگی کا رُخ بدل گیا۔ مگر پھولوں کے تحفے سے اس کا ایک ایسا جذبہ منسلک ہے۔ جو آج بھی تابندہ ہے۔ اور جب بھی یادوں کی بارات آتی ہے۔ پھول مہک اٹھتے ہیں اور ان کی خوشبو کے سامنے، باقی سب کچھ پھیکا پڑ جاتا ہے۔

پچھتاوے، حسرت، غم ــــ رومانی طرزِ احساس کے ان عناصر میں ایک دلکشی ہے۔ گداز ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے۔ ان کے بوجھ
ت میں جمود کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو انسان کو آگے بڑھنے اور زندگی کو قبول کرنے سے روکتی ہے ماضی کی زنجیر، حال اور مستقبل کی
، بڑھنے دیتی۔ زندگی ایک مسلسل اور متواتر مفاہمت کے عمل سے عبارت ہے۔ رومانیت کی دلدل میں پھنسے ہوئے کردار، زندگی کے میدان
ں ہوتے ہوئے لڑکھڑاتے ہیں۔

البتہ ان کی داخلی دنیا میں تجربے کی گہرائی ملتی ہے۔ اختر جمال رومانی طرز کے کرداروں کی داخلی کیفیات پر دھیان کا ارتکاز یوں نہیں
ارجی دنیا کے نقوش محو ہو جائیں۔ اس نے معاشرتی زندگی، اور گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی تصویریں بڑی محنت سے بناتی ہیں۔ جس وجہ سے
ے پلاٹ میں وسعت آگئی ہے۔ 'سجدۂ سنگ' میں مثلاً جہاں، روفہ کی حاکمیت بنیادی موضوع ہے۔ وہاں بہت سی ایسی واقعاتی تفصیل اور
، کرداروں کے مختصر سے خاکے بھی موجود ہیں۔ جن سے اجتماعی معاشرتی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں مثلاً:

"جب وہ کسی کی شادی میں جاتی تو بڑے چاؤ سے دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتی اور اپنی نظریں دلہن کے چہرے پر سے پل بھر کو نہ ہٹاتی۔
ں چاہتا کہ دلہن کو دیکھتے ہی جائے۔ خوب صورتی سے اسے ازلی پیار تھا۔ سرخ کپڑے، گوٹے اور چمپا کا کام۔ بڑا سا جھمل کرتا گھیردار
۔ بڑی بڑی جھمکیاں ــــ گلے میں چمپا اور تھسی ــــ اور بہت سے ہار ــــ ہاتھوں میں چوڑیاں اور کنگن ــــ ماتھے پر ٹیکا اور
بھر کا لمبا گھونگھٹ جس میں سے صرف جڑاؤ نتھ نظر آتی تھی اتنے ڈھیر سارے زیوروں کے اسے نام بھی پورے نہ آتے تھے۔ دلہن
ی ہوتی، جیسے چودھویں کا چاند۔ حیا اس کے گالوں پر شفق بن کر نظر آتی۔ کبھی وہ سانولی سلونی ہوتی نمکین چہرہ بھیگی بھیگی پلکیں۔
پیلی اور زرد جیسے سرسوں بہار پہ ہو اور کبھی کبھی ایسی دلہن بھی دکھائی دیتی جیسے کالا توا ــــ اور پیلا سونا اس پر ایسا لگتا جیسے رات کے اندھیرے
ں! اسے ہر رنگ اور ہر روپ میں دلہن اچھی لگتی تھی۔"

"ایک دن جب استانی جی نے کلاس میں لڑکیوں سے پوچھا کہ وہ بڑی ہو کر کیا بنیں گی تو روفہ بلا سوچے سمجھے زور سے چیخی دلہن۔"
استانی جی کو ہنسی آگئی اور پھر ان کے چہرے پر اداسی کھیل گئی۔ وہ شاید ایسے ہی خواب دیکھتی رہی ہوں گی۔ ان کے بال کھچڑی تھے۔
ن نہ بن سکیں۔"

---

"ایک دن تو ایک لڑکی نے بڑی عجیب حرکت کی۔ گھر سے اسکول کا کہہ کر آئی اور پھر کہیں اور چلی گئی۔ اس کی امی کی شادی میں جانا تھا۔ وہ
، آئیں تو نکہت اسکول میں نہیں تھی۔ وہ بیچاری سخت پریشان ہو گئیں۔ فوراً اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں چھٹی کے بعد جب روفہ گھر لوٹ رہی
سے نکہت راستے میں مل گئی۔ اس کے ہاتھ میں بستہ تھا۔ نکہت کا قد ٹھگنا تھا۔ مگر شکل بڑی پیاری تھی اور آواز کی تو سارے اسکول میں شہرت
ے نکہت تم آج اسکول نہیں آئیں۔ پھر یہ بستہ لئے کدھر جا رہی ہو۔ ہاں تمہاری امی تمہیں لینے آئی تھیں۔
"ہیں ــــ" نکہت کے ہاتھ سے بستہ چھوٹ گیا، وہ پریشان ہو گئی۔ "روفہ تم میرے ساتھ چلو ــــ تم میری امی سے کہہ دینا کہ میں تمہارے گھر تھی۔"
"مگر وہ میں تو ابھی اسکول سے آ رہی ہوں۔"
"روفہ میری جان بچالو، ورنہ میں زہر کھا لوں گی۔"

---

" فرزانہ ایک بے حد رومان پسند لڑکی تھی، وہ گہرا پردہ کرتی تھی۔ کلائی بھر بھر کے چوڑیاں پہنتی تھی اور جب وہ برقعہ میں سے اپنا مہندی لگا ہاتھ جس میں رنگ برنگی چوڑیاں جھل مل کرتیں، نکالتی تو ایک لمحے کو ساری کلاس کے لڑکے لڑکیاں بھی اس کا ہاتھ دیکھنے لگتے اور پروفیسر صاحب بھی اپنا لیکچر بھول جایا کرتے تھے۔"

---

" فارسی کے پروفیسر صاحب لڑکیوں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ گورے چٹے آدمی تھے۔ چمکتی ہوئی بڑی بڑی کالی آنکھیں ـــــ اور پھر پیچ دار باتیں ـــــ اور شعر و شاعری ـــــ وہ سرمہ بھی لگاتے تھے اور خوشبو بھی استعمال کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرزانہ ان کی سب سے زیادہ سعادت مند طالبہ تھی۔ وہ ہر وقت اس کے کام اور ذہانت کے گن گاتے تھے اور نقاب کے موضوع پر شعر پڑھا کرتے تھے۔"

---

'تحفہ' سے یہ اقتباس دیکھیے۔ اختر جمال کردار کے خارجی خدوخال پر بھی برابر کی توجہ دیتی ہے۔

" اس نے گلابی کپڑے پہنے اور سفید موتیوں کا زیور۔ سونے چاندی کے زیور اسے نہ بھاتے تھے۔ امی نے اپنے سونے کے بندے نکال کر دیئے کہ یہ کانوں میں ڈال لو۔ مگر جب اس نے زرد زرد بے جان سونے کو دیکھا اور پھر اپنے چمکدار موتیوں کو، تو موتیوں کی بالیاں ہی پہننا پسند کیں۔ گوری رنگت۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں، گھونگھریالے بال، موتیوں جیسے چمکدار دانت، چھریرا جسم اس پر گلابی غرارہ، کرتا اور دوپٹہ بہت ہی بھلا لگ رہا تھا۔ اس کی سہیلیاں جی بھر کے تعریفیں کر رہی تھیں۔ اور وہ پھولی نہ سماتی تھی۔ اسے گوٹے کے کپڑے پہن کر بڑی شرم آتی تھی۔ مگر امی کے کہنے پر اس نے آج گوٹا لگے کپڑے پہن لئے تھے۔ وہ کبھی ایک جگہ بیٹھتی کبھی دوسری جگہ۔ ذرا بھی اسے قرار نہ تھا، استانیاں اس کی اس کیفیت سے اکثر کہا کرتی تھیں معلوم ہوتا ہے، یہ لڑکی مٹی کی نہیں پارے سے بنی ہے۔"

اختر جمال کی بعض کہانیوں کو کرداری کہانیاں کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی قوت مشاہدہ اور جزئیات نگاری میں چابکدستی کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس ذیل میں آنے والی چند کہانیوں کا ذکر کرتا ہوں تاکہ افسانہ نگار کے رویے، اس کی تکنیک اور کردار نگاری کی نوعیت کے بارے میں بات کی جاسکے۔

"زرد پھول" سے جو جذبہ چھلکے پڑتا ہے۔ وہ اساسی طور پر رومانی ہے۔ 'خالہ بی' اور 'چچا' ـــــ ان دو حدوں کے درمیان شدید جذبہ موجزن ہے۔ جو لہر ایک ساحل سے اٹھتی ہے۔ وہ دوسرے ساحل پہ جا ٹکراتی ہے، مگر ان ساحلوں کا ملاپ ممکن نہیں۔ خالہ بی کا بیاہ ایک ایسے زمیندار سے ہو جاتا ہے۔ جو مجلسی زندگی کا شوقین ہے۔ شمع محفل سے اجالا حاصل کرتا ہے۔ چراغ خانہ کی روشنی سے بے نیاز ہے۔ خوش باش مجلسی تتلیوں سے دل بہلاتا ہے۔ گھر کے اندر دولت حسن سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔ چھوٹے چچا، عمر بھر کنوارے رہتے ہیں اور خالہ بی کے لئے شدید جذبۂ محبت سینے میں دفن کئے بظاہر اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ "زرد پھول" کے رومانی تانے بانے سے جو چیز زیادہ نمایاں طور پر ابھرتی ہے۔ وہ ہے خالہ بی کا کردار اس کردار کے داخل اور خارج دونوں کو اختر جمال نے نہایت کامیابی سے ترتیب دیا ہے۔

افسانے کی ابتدا ہی میں خالہ بی کے کردار کو ایک تصویر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تصویر میں حقیقت کا انعکاس

بھی ہے۔ اور اس سے ماورا، استعاراتی معنویت کا بھی!

سرسوں کے کھیت، آپ نے میدانی علاقے میں تو دیکھے ہوں گے۔ لیکن اگر سرسوں کے کھیتوں کا حسن دیکھنا ہو تو کبھی کسی پہاڑی کے دامن میں انھیں دیکھئے ——!

میرے سامنے جو سیاہ اور سرمئی سخت اور کھردری جھریوں والے پہاڑ کھڑے ہیں، ان کے نشیب میں ان کی ڈھلانوں پر اونچے نیچے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں سرسوں کے کھیت ہیں بعض جگہ تو، بالکل نیچی نیچی چوڑی چوڑی سیڑھیوں کی شکل میں بنائے گئے ہیں وہ پتھریلی زمین جو قابل کاشت نہیں ہوتی چھوڑ دی جاتی ہے۔ بھوری بھوری پتھریلی زمین —— برف باری کے ناز اٹھاتے ہوئے یہ سوکھے ٹھٹھرے ہوئے درخت —— جو اس سیم تن کے پگھلنے کے بعد اجڑ سے گئے ہیں۔ اور اس پس منظر میں جگہ جگہ کھیتوں میں پھیلا ہوا سونا ۔۔ اس سونے میں اتنی جھلملاہٹ اور زندگی کہاں، جو دور سے ہی بھائے۔ میں ایک عجیب فراموشی کے عالم میں ان زرد کھیتوں کو دیکھا کرتی ہوں۔ نہ جانے کیوں یہ پیلا پن ہمیشہ سے میرے لئے بڑا پر کشش رہا ہے۔ زرد پھول مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں ....
... مجھے نرگس بھی بہت بھاتی ہے۔ اس کی سپیدی میں پیلاہٹ سے ہی جان پڑتی ہے۔ پاکیزگی کے ساتھ زردی مل جاتا ہے۔ اور اس طرح نرگس کا پھول گویا ایک دل بن جاتا ہے۔ مجھے نرگس دیکھ کر کسی آنکھ کا تصور نہیں ہوتا۔ اس کی نرمی اس کی لطیف خوشبو۔ اس کا لمس اس کی زردی، اور ایک آسودہ کرنے والی ٹھنڈک۔ یہ سب چیزیں مل کر دل معلوم ہوتی ہیں۔ انسان کا خوب صورت دل! میر کے اشعار پڑھتے ہوئے زرد پھولوں کی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ اور زرد پھول دیکھ کر میر کے اشعار یاد آجاتے ہیں نہ جانے کیا کیا یاد آجاتا ہے! خالہ بی یاد آجاتی ہیں ......

پہاڑ کی سی سخت اور کھردری زندگی جس میں غم کی سیاہی بھی تھی اور ان کا زرد چہرہ —— جو کبھی سرسوں سے مشابہ تھا۔"

جوں جوں اندر کا الاؤ بھڑکتا ہے۔ حسین چہرے کی تابناکی مدھم پڑتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ زرد پھول خالہ بی کے ظاہر اور باطن کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ افسانے میں شامل، واقعاتی تفصیل، مکالمے، واقعاتی الجھاؤ، سبھی اس استعارے کا زمانی اور مکانی پھیلاؤ ہیں۔ روح کو جسم دینے اور تجرید کو تجسیم کرنے کی کوشش!

'خالہ بی' کے داخلی کرب وضبط اور جسمانی حسن کی تصویر اختر جمال نے نہایت فنکارانہ خلوص کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس میں ٹھہراؤ ہے۔ اعتدال ہے۔ غیر جانبداری ہے۔ واقعات کی الجھن اور ضمنی کرداروں کے کلمات وحرکات کے سیاق وسباق میں خالہ بی کی تصویر یوں ساکن کر دی گئی ہے۔ تاکہ قاری اس کے تمام پہلوؤں سے حظ اٹھا سکے۔ چلتی پھرتی دنیا کے مرکز میں حسن کی ساکن کائنات جس کا عمق اردگرد کی تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ فوکس کس قدر صحیح ہے۔ اختر جمال کے ہاتھ کس قدر پُر اعتماد ہیں۔ داد اس لئے دیتا ہوں کہ رومانی کردار کے سلسلے میں اکثر لوگوں کے ہاتھ بل جاتے ہیں۔ جذباتیت غالب آجاتی ہے۔

خالہ بی کی داخلی کیفیت تو شاید ابدی وازلی ہے، اگر وہ اقدار جن کی بدولت خالہ بی میں ایک گونہ ضبط اور اطمینان ہے۔ اب ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ کیونکہ ان کو جنم دینے والی تہذیبی زندگی اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ ہندوستان کی پرانی معاشرت، جس میں زنان خانے اور مردان خانے تھے، مردوں کی حکمرانی تھی۔ عورتوں کے جذباتی اظہار پر سینکڑوں روایتی قدغن تھے، وہ اب ختم ہو چکی ہے۔ مشرقی عورت

نئی فضا میں سانس لے رہی ہے، وہ اب خالہ بی جیسی صابر و شاکر نہیں۔ نہ اس کا رویہ تسلیم و رضا سے عبارت ہے۔

'مل دانی' اور 'برج کا بادشاہ' بھی کردار کی کہانیاں ہیں۔ مگر ان میں کردار نگاری میں مبالغے کا عنصر موجود ہے۔ مبالغہ جو طنز و مزاح سے عاری ہے۔ 'برج کا بادشاہ' کا مرکزی کردار ایک عجیب الخلقت ڈاکٹر ہے۔ حلیہ ملاحظہ ہو۔

" ڈاکٹر پدے کی شخصیت بڑی مختصر سی تھی بمشکل سے چار فٹ کا قد، سوکھا ہوا دبلا پتلا جسم، چھوٹا سا چہرہ اور گدھ کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں انانی بھوک چھپی ہوئی تھی۔ ان کے سارے دانت ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن دو دانت اس طرح نکلے رہتے تھے کہ ان کا منہ آگے کو نکلا ہوا معلوم ہوتا تھا اور جب وہ ہنستے تو یہ دانت ان کی شخصیت کا کچھ ایسا تاثر پیدا کرتے کہ خود بخود نفرت پیدا ہوتی۔ اس عجیب و غریب شخصیت کے باوجود ان کے اندر کچھ ایسی مقناطیسی طاقت تھی کہ وہ ہر سوسائٹی کی جان بن جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان سے نفرت رکھنے والے بھی ان سے پیچھا نہ چھڑا سکتے تھے۔"

ڈاکٹر پدے اسی مقناطیسی قوت کو بروئے کار لا کر سوسائٹی میں اپنا دائرہ پھیلاتا ہے۔ اور ترقی کے زینے پر یوں سلامت روی سے چڑھتا ہے۔ کہ ناکامی کا ہر نشان مٹ جاتا ہے۔ خوشامد اور سرفت اس کے ہتھیار ہیں۔ ریاستی سیاست میں ان کے ذریعے وہ ہر مدمقابل کو گراتا ہے اور خود اتنا آگے نکل جاتا ہے کہ نواب اسے وزیر اعظم مقرر کر دیتا ہے۔

واقعات کے اس ناز پڑھاؤ سے ڈاکٹر پدے کی بے ڈھنگی شخصیت خاصی اجاگر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ افسانہ نگار کا مقصد کیا ہے۔ کیا وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ سیاست میں صرف شیطانی فطرت کا انسان ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ یا اکثر یوں ہوتا ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ مگر اختر جمال نے قاری کو پلاٹ کی بھول بھلیوں میں اس قدر گم کر دیا ہے کہ وہ صحیح طور پر ڈاکٹر پدے کی شخصیت کے اس پہلو پر توجہ نہیں دے سکتا اور اگر توجہ دے بھی تو اسے خود افسانہ نگار بے راہ رو دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر پدے کی طرح 'مل دانی' کا کردار بھی خاصا BIZARRE معلوم ہوتا ہے۔ BIZARRE ہونے پر اعتراض نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ قاری کے اندر کوئی ردعمل پیدا نہیں کرتا ہے واقعات کا ایک سلسلہ ہے۔ جس سے گذرنا پڑتا ہے، مگر پھر بھی مل دانی کسی طور متاثر نہیں کرتی۔ کہانی مل دانی کی غیر دلچسپ جہات کی رپورٹ بن کر رہ گئی ہے یہ رپورٹ نہ تو کسی طور بصیرت افروز ہے۔ نہ اس سے کلاسیکی دلکشی یا کراہت سامنے آتی ہے۔ اتنے سارے واقعات قاری کے جذبات کو چھوئے بغیر گذر جاتے ہیں 'میجر ڈسوزا' اور 'صوبے خاں' ایک اعتبار سے قابل لحاظ کہانیاں ہیں، ان کہانیوں میں کرداروں کو ایک وسیع پس منظر سے اجاگر کیا گیا ہے۔ کردار نگاری اور پس منظر دونوں ہی ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔

صوبے خاں ایک وسیع تاریخی دور کو محیط ہے، صوبے خاں کا باپ صمد خاں پہلی جنگ عظیم میں لڑ چکا تھا۔ فوج سے نکل کر اس نے اپنا آبائی پیشہ کاشتکاری شروع کر دیا۔ وہ سخت محنت کرتا۔ مگر پھر بھی غربت کی زندگی بسر کرتا۔ محنت کا ثمر مہاجن اور زمیندار کی جھولی میں پڑتا۔ جب صوبے خاں چھوٹا سا تھا۔ ان دنوں پنجاب میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ بھگت سنگھ کا نام ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں ایک دیوتا کی طرح مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اور جلیانوالہ باغ کی خاک سب کے لئے مقدس تھی، صمد خاں سوچتا کہ صوبے خاں اب دوسروں کی لڑائی نہیں لڑے گا۔ وہ جنگ آزادی کا سپاہی ہوگا۔ مگر صوبے خاں کو بھی سامراجیوں کی جنگ لڑنا پڑی۔ وہ جوان ہوا تو

دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی، وہ بھی بھرتی ہو گیا۔

ادھر اندرون ملک جدوجہد آزادی تیز ہوتی گئی۔ ادھر صوبے خاں وہاں جا کر ایک انگریز کرنل کا اردلی بن گیا۔

"جن ہاتھوں میں تلواروں اور بندوقوں کو تھامنے کی عادت تھی صوبے خاں نے ان ہاتھوں میں دو برش اٹھا لیے۔ لال اور کالے برش اور لال اور کالی پالش کی ڈبیاں کھول کر وہ سارا دن جوتے چمکایا کرتا۔ صاحب کی بیلٹ پالش کرتا، وردی ٹھیک کرتا —— ٹمن جھکاتا۔"

اس کے صاحب اور میم، گاندھی، نہرو اور جناح کے ناموں پر قہقہے لگاتے۔ بنگال کے قحط، گرانی، غلہ کی کمی پر تبصرے ہوتے اور وہ اپنی بیوی، فاطمہ اور بیٹے اکبر خاں کو یاد کرتا اور آزادی کے خواب دیکھتا۔

"تلوار جیسے جوتوں کے آئینہ میں صوبے خاں کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ ایام کی گرد ہر بار انھیں میلا کر دیتی۔ ہر دفعہ وہ زور سے برش کرتا تو آئینہ کے سامنے نیا منظر ہوتا۔ اس نے آزادی کا سورج دیکھا۔ پھر نفرت کا گھور اندھیرا —— خون کے سیلاب، مہاجروں کے قافلے —— لیکن اب ان سب باتوں کے باوجود خوش تھا کہ فضلو نے پاکستان بنوا لیا —— اس نے اپنے لال اور کالے برش دور پھینک دیئے وہ اپنے گاؤں چلا آیا جو اب پاکستان کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔"

صوبے خاں فوج سے نکلا تو اس نے آبائی پیشہ اختیار کر لیا اور اس کا بیٹا اکبر خاں پاکستان کی فوج کا سپاہی بن گیا اور پھر وہ وقت آیا جب ہندوستان اور پاکستان کے لوگ، جو انگریزوں کے خلاف شانہ بشانہ جنگ آزادی میں شریک تھے، باہم جنگ پر اتر آئے۔ پاکستان کے عوام ہندوستان کی جارحیت کے خلاف حب الوطنی سے سرشار سینہ سپر ہو گئے۔ اکبر خاں نے وطن کے دفاع میں شہادت پائی اور اور بوڑھا صوبے خاں پھر فوجیوں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ اور اتحاد و یگانگت کی وہ لہر آئی جس نے پوری قوم کو اپنی شناخت پر مجبور کر دیا ہر ایک نے اپنے آپ کو پہچانا اور اپنے شعور کو صحیح بنیادوں پر استوار کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد سے لے کر پاک و ہند جنگ ۱۹۶۵ء تک کے طویل دور کے سیاق و سباق میں صوبے خاں کی نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ اس کی متنوع کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ سامراجی سپاہی کے احساسات، غریب کاشتکار کی بے بسی جنگ آزادی سے پیدا ہونے والا ذہنی تحرک، ملی شعور، حب الوطنی، اگرچہ کہانی کا مرکزی کردار صوبے خاں ہے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی کئی جاذب نظر کردار اس کہانی میں سامنے آتے ہیں۔ فضلو صوبے خاں کا بچپن کا دوست ہے۔ مگر شروع ہی سے اس نے اپنے آپ کو عوامی جدوجہد کے لئے وقف کر لیا ہے۔ قومی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ مسلم لیگ اور کسان سبھا کے کاموں میں الجھا رہتا۔

ایک طرح سے صوبے خاں اور فضلو زیر نظر طویل تاریخی دور کے دو مختلف مگر متعلق، پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے پیش کیے گئے ہیں اور ان دونوں کے توسط سے عوامی جدوجہد، محرومیوں، امنگوں اور کامرانیوں کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ بلکہ اس تصویر کا ایک تیسرا رخ بھی ہے۔ جس کی نمائندگی صوبے خاں کی بیوی فاطمہ کرتی ہے۔ ایثار، محنت، وفاداری، طویل انتظار، امید، استقلال، اس کے کردار کے نمایاں خصائص ہیں۔ وہ ان تمام جذبات کا سہارا ہے۔ جو عوامی اور قومی جدوجہد کی اساس ہیں۔

میجر ڈسوزا، کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ افسانے کا آغاز فطرت کے ایک خوبصورت منظر سے ہوتا ہے۔

"پانی ابھی ابھی برس کر کھلا تھا۔ پہاڑوں پر سے سرمئی بادل ہٹ چکے تھے۔ سفید بادلوں کے نرم نرم گالے سورج کے انتظار میں

کپکپاتے پھر رہے تھے ۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ فضا میں یہ سردسی رَو دب جائے گی ۔ دھواں دھواں سے یہ بادل چاندی کی مینیں ٹوٹ لگائیں گے ۔ ہرے بھرے درختوں میں ٹھٹھرتے ہوئے سبز پتے بھی چمکنے لگیں گے ۔ چڑیاں پھدک پھدک کر اپنے پر سکھائیں گی ۔ سب چیزیں کتنی خوبصورت معلوم ہوں گی ۔"

بوڑھی ڈسوزا پر استغراق کی کیفیت طاری ہوتی ہے ۔ اور یادوں کی ایک طویل فلم اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگتی ہے ۔ اس فلم کی ابتدا اس کی جوانی سے ہوتی ہے ، جب زندگی حسین تھی ۔ خواہشات توانا تھیں ۔ مگر پھر گردشِ ایام میں زندگی دھندلا جاتی ہے ۔ آس اور خوشی کے بجائے دکھ اور مایوسی راہ پاتے ہیں ۔ وفا شعار ڈسوزا جنگ سے ایک ٹانگ لے کر آنے والے منگیتر جوزف سے شادی کر کے خوش ہے ۔ اب وہ اپنی محنت کا ثمر اپنے بچے ہنری کو سمجھتی ہے ۔ مگر ہنری بھی جوان ہو کر جنگ کا ایندھن بن جاتا ہے ۔ اور وہ ہنری کے غم کے ہر مریض یا زخمی کی خدمت کر اپنا زندگی کرنے کا طریقہ بنا لیتی ہے ۔ مگر یوں بھی اسے خوشی نصیب نہیں ہوتی ۔ لوگ اس کی خدمت کو غلط رنگ میں دیکھتے ہیں اور جب یہ بات اسے معلوم ہوتی ہے ۔ تو اس کا آدرش کانچ کی طرح ٹوٹ جاتا ہے ۔ افسانے کے آخر میں ڈسوزا کا کردار خاصا جذباتی اور یاس انگیز معلوم ہوتا ہے ۔ اختر جمال نے ڈسوزا کے کردار کے ذریعے اس المیہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جو جنگ اپنے جلو میں لاتی ہے اور اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہے ۔ جوانوں کی موت تخلیقی عمل کی تباہی ، اجتماعی اور نجی نقصان ، دلوں کا آشوب ، روحوں کا اجاڑ ، حسن و رعنائی کے امکانات کا خاتمہ —— یہ سب ایسے موضوعات ہیں ۔ جن پر بیسویں صدی کے صف اول کے ادیبوں اور فلم سازوں نے توجہ دی ہے اس ضمن میں کی جانے والی فنی کاوشوں کے سیاق و سباق میں "میری ڈسوزا" خاصا پھیکا افسانہ معلوم ہوتا ہے ۔ جذباتی لب و لہجہ اور تفصیلات کی بھرمار کی وجہ سے یہ افسانہ مجھے بڑا کمزور لگا ہے ۔

کردار کی ان چند کہانیوں کے جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختر جمال نے کردار نگاری کی بنیاد نفسیاتی موشگافیوں پر نہیں رکھی ، اس کے ہاں کردار اور واقعہ دونوں کا ایک ہی مصرف ہے ۔ یعنی معاشرت کی ترجمانی ، اجتماعی صورت حال کے کسی پہلو کی عکاسی اور اس کی تکنیک میں یاد اور ماضی کو بہت دخل ہے ۔

ایک طرح سے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ اختر جمال یادوں کے ایک خاص سلسلہ سے اور ماضی کے ایک خاص پہلو سے اس قدر وابستہ ہے کہ یہی اس کی سوچ و فکر کا منبع معلوم ہوتے ہیں ۔ ان یادوں کا تعلق جدوجہد آزادی اور متحدہ ہندوستان کی تقسیم سے ہے ۔

سامراجی دور کے خاتمہ پر جب آزاد بھارت اور پاکستان معرضِ وجود میں آئے تو تنگ نظر سیاسی مفادات نے فرقہ وارانہ فسادات کو جنم دیا ۔ جس کے نتیجہ میں وحشیانہ واقعات رونما ہوئے ظلم و ستم سے بھرپور ان انسانیت سوز واقعات کو اردو افسانے میں نہایت نمایاں طریقے سے پیش کیا گیا ۔ جب ان فسادات کی آگ ٹھنڈی پڑی تو بھارت اور پاکستان کے لوگوں کو مشترک تہذیبی جڑوں کا احساس ہوا ۔ چنانچہ ان تہذیبی جڑوں پر تعصب کی چادر بچھانے والے عوامل کا تجزیہ افسانے کا ایک مستقل موضوع ٹھہرا ۔

اگرچہ پاکستان اور بھارت کے مابین اتنے زیادہ مشترک روابط تھے کہ ان کو اجاگر کر کے ہم ایک دوسرے کی آزادی کے استحکام کا باعث بن سکتے تھے ۔ تاہم بدقسمتی سے بھارت نے روزِ اول ہی سے پاکستان کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کیا ۔ انگریز حکمرانوں سے ساز باز کر کے پاکستان کا ایسا نقشہ تیار کیا گیا کہ دفاعی اور اقتصادی اعتبار سے اس کا وجود زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہو سکے ۔ مسلم آبادی کے بعض علاقوں

میں حق خود ارادیت کو تسلیم نہ کیا گیا۔ بھارتی سیاسی اور فکری حلقوں نے پاکستان کے الگ وجود کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اپنی وسیع پراپیگنڈہ مشینری سے کام لیتے ہوئے، بھارت نے دنیا بھر میں پاکستان کا ایک ایسا تصور پیش کیا۔ جو جدید دنیا میں خاصا قدیم اور غیر سائنسی معلوم ہوتا۔ بھارتی علمی اور فکری حلقوں نے اس پاکستان دشمن پراپیگنڈہ کے لئے نظریاتی مواد فراہم کیا اور طرح طرح کے شوشے چھوڑے تاکہ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو غیر علمی، غیر دانشمندانہ اور ناقابلِ عمل ثابت کیا جا سکے، نہ صرف یہ بلکہ جارحیت کا جواز تلاش کیا گیا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان اسی طویل سازش کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ مگر اس معاندانہ اور مہلک سیاسی فضا کے پیچھے دل کی ایک دنیا آباد ہے۔ بھارتی لوگوں کے دلی جذبات اور ہمدردیوں کا رخ بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ہزاروں ایسے انسان بستے ہیں، جن کا بچپن پاکستانی علاقوں میں گذرا۔ جن کے ابتدائی جذبات کو اسی سرزمین نے متشکل کیا۔ بعضوں کی اوّلیں محبت کی یادیں پاکستان سے وابستہ ہیں۔ ان کی رگوں میں جن لوگوں کا خون رواں ہے۔ وہ یہاں مدفون ہیں۔ ان کی عبادت گاہیں اور متبرک مقامات یہاں ہیں، ان کی بولی بولنے والے لوگ ادھر بستے ہیں۔ مثلاً بھوپال میں آباد ایک سندھی بوڑھے کا ذکر سنیں" واہ بیٹی سندھ نہیں دیکھا تو پھر کیا دیکھا۔ میں نے کہا "ہم لوگ پنجاب اور ہزارے میں رہتے ہیں۔ ایبٹ آباد تو بہت خوب صورت جگہ ہے۔ سندھ میں تو سنا ہے بس ریت ہی ریت ہے۔"

بڑے میاں کو میری بات بہت بری لگی" بیٹی، ریت میں ہی تو حسن ہوتا ہے، یہاں تمہارے بھوپال میں پہاڑ ہیں۔ تال تلیاں اور آبشاریں ہیں جنگل ہیں، مگر ریت نہیں ہے۔ ریت کا حسن! ریت کے ٹیلوں کی خوب صورتی! ریت میں جب چاند اترتا ہے تو ریت چاندی کی ہو جاتی ہے۔ اور جب سورج ڈوبتا ہے۔ تو سنہری اور سرخ . . . . . ."

پھر بولے " بیٹی سندھ ضرور جانا اور بابا شہباز قلندر کے مزار پہ ضرور حاضری دینا۔ تمہیں زندگی کی بہت بڑی سعادت مل جائے گی۔" پھر ریگستان کے خشک گڑھوں میں کہیں سے اچانک سیلاب کا پانی آ گیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے:

" شہباز قلندر کی درگاہ میں جاؤ تو میرا سلام ضرور کہنا بیٹی!"

" جی، جی اچھا۔ ضرور" میرے ہونٹوں پر الفاظ اٹکنے لگے۔ میں نے سوچا مذہب کے رشتہ کی طرح ایک رشتہ اور بھی ہوتا ہے۔ مٹی کا رشتہ۔ یہ رشتہ بھی مقدس ہوتا ہے۔

اس رشتہ کے ناتے بھی لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا حق ملنا چاہیئے۔ لیکن آثار قدیمہ دیکھنے کی اور بات ہے۔ جیتے جی اپنے ماضی کے کھنڈر دیکھنا بہت مشکل کام ہے۔"

اسی طرح بھارت میں پاکستان کا عظیم تہذیبی ورثہ موجود ہے۔ مسلم تہذیب کے بہت سے مظہر وہاں ہیں، ہمارے ادب کے زعماء کے آثار وہاں ہیں، یادیں، داستانیں اور منہ بولتی کہانیاں وہاں ہیں، سب سے بڑھ کر ہم مذہبوں کی کثیر تعداد وہاں ہے۔ دلوں کی اس دنیا کو بھارتی حکمرانوں کی پالیسیوں کی تشکیل و ترتیب میں کوئی دخل نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ بھارت اسلحہ جمع کرتا ہے۔ پھر اسے استعمال کرنے کا موقع پیدا کرتا ہے اور ان لوگوں کو جنگ کی آگ میں جھونکتا ہے۔ پاکستان کی تباہی پر اکساتا ہے۔ جن کے دل اس سرزمین کو ترستے ہیں۔ اسے حسین دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب صورتِ حال ہے۔ اردو افسانے میں اسے کئی لکھنے والوں نے پیش کیا ہے ان میں سے اختر جمال بھی ایک ہے۔ اس سلسلے میں اس کے افسانے "پرانی جڑوں" کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

*

" اس کہانی کا مرکزی کردار کندن سنگھ گو بظاہر خارجی جنگ کا سپاہی ہے۔ مگر اس کے اندر جذبات کی ایک خانہ جنگی بھی جاری ہے۔ ایک طرف تو اس کا دامن بچوں اور بیوی کی محبت سے کھچتا ہے۔ دوسری طرف اسے فرض کی پکار آگے بڑھنے کو مجبور کرتی ہے۔ مگر یہاں اس کی کشاکش ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ یہ کیا فرض ہے؟ جس کی بجا آوری میں اسے اس سرزمین کی بربادی کا آلۂ کار بننا پڑتا ہے۔ جس نے اسے جنم دیا۔ جہاں اس نے پیار کیا۔ جس کی ہواؤں سے اس نے سرگوشیاں سیکھیں:

" اور آج :- آج تو یکایک اس کے لئے انتہائی بھیانک بن گیا ہے؟ اس کا دل چاہا کہ وہ بلدیپ کو رخصت ہوتے وقت سب کچھ بتا دے کہ وہ کیسے خطرناک کام پر اور کس جگہ جا رہا ہے۔ مگر وہ کچھ نہ بول سکا......

میں آج وہاں جا رہا ہوں۔ جہاں میرے باپ کی زمینیں ہیں۔ کیسی سوندھی سوندھی خوشبو ہوتی تھی۔ وہاں کی مٹی کے بھٹوں میں —— مگر بھٹے تو یہاں بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہاں کے بھٹوں میں وہ خوشبو مجھے نہیں آئی۔ وہ سوندھی خوشبو شاید اس زمین کی خوشبو تھی ——!....

وہ کتنے شہروں میں گھوم چکا ہے۔ مگر کسی شہر میں اس کے باپ اور دادا کا نام لے کر پوچھنے والے لوگ نہیں ہیں، وہ تو صرف وہیں ہیں جہاں وہ جا بھی نہیں سکتا ——

" وہ شہر —— ! جو آج بھی اسے اتنا قریب لگتا ہے —— اس کی سڑکیں بازار —— گلیاں اور کوچے کس طرح جانے پہچانے ہیں....

میں اپنے شہر جا رہا ہوں، مجھے اپنے شہر جانے کا حکم ملا ہے —— !! میرا شہر بلا رہا ہے —— مگر یہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں! کیا سے کر جا رہا ہوں! اپنے شہر کے لئے موت کا تحفہ سے کر نہیں —— نہیں میں یہ نہیں کر سکتا!"

جلاوطنی کا احساس جو اس اقتباس میں موجود ہے۔ اس پر قرۃ العین نے بہت توجہ دی ہے۔ اس میں جس المیہ کا اشارہ ملتا ہے اس پر انتظار حسین نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ مگر کندن سنگھ کے داخلی کرب کو جس زاویۂ نگاہ سے یہاں پیش کیا گیا ہے۔ وہ جداگانہ ہے۔ اختر جمال نے داخلی کرب کے بیان کو محض جمالیاتی موضوع نہیں سمجھا۔ بلکہ اسے جنگ و امن کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اور ایک مثبت اندازِ فکر کا ثبوت پیش کیا ہے۔ غم سب کچھ نہیں، غم کا مداوا کبھی تو ہونا چاہیئے۔ تعمیر اور امن کی طرف دھیان مڑنا چاہیئے۔

پاکستان کے بارے میں بھارت کا رویہ، آزادی کے بعد برصغیر میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کا ایک پہلو ہے۔ اس سے بھی اندوہناک ایک اور پہلو ہے۔ اندرونِ ملک بھی مسلمانوں کے متعلق بھارتی پالیسی کا مقصود یہ ہے۔ کہ ان کی مسلم شناخت ختم ہو جائے اور وہ آہستہ آہستہ ہندو تہذیب میں ضم ہو جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے معدودے چند مسلمانوں کو عہدے اور رشوت دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ یہ تاثر قائم کیا جا سکے کہ بھارت میں مذہبی امتیاز کو بالائے طاق رکھ کر جمہوری اصولوں کی پیروی کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کو ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انہیں اقتصادی اور سماجی طور پر دانستہ پس ماندہ رکھا جاتا ہے۔ تاکہ ان میں آہستہ آہستہ احساس کم مائیگی اتنا بڑھے کہ خود ان کا ایمان اپنی اقدار سے اٹھ جائے۔ اور وہ ہندوؤں کو اپنے سے برتر سمجھیں، ہر لحاظ سے قابلِ تقلید برتر!

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس ضمن میں امریکہ اور بھارت میں ایک بات مشترک دکھائی دیتی ہے۔ امریکی بھی سیاہ فام لوگوں کی تہذیبی شناخت ختم کرنا چاہتے ہیں ان کو سفید فام امریکی تہذیب کے دائرے میں لانا چاہتے ہیں۔ اور بھارتی طریقوں سے ملتے جلتے حربوں کو بروئے کار لاتے ہیں، مگر وہاں سیاہ فام لوگوں نے اپنی تہذیبی اکائی کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے امریکی

اوروں کے خلاف برسرِ جہاد کر رہے ہیں - اس بنا پر پورا امریکی نظام ایک خلفشار سے دوچار ہے - بھارت میں مسلمان بالکل دب گیا ہے - ہمارے افسانے میں اس حقیقت کا انعکاس ملتا ہے - چنانچہ اختر جمال نے چند افسانے خاص طور پر بھارت میں مسلمانوں کی بدحالی پر لکھے ہیں - جہاں تک تقسیم کی وجہ سے خاندانوں کے بٹ جانے سے جذباتی ناآسودگی اور کرب کا تعلق ہے - قرۃ العین نے بہت افسانے لکھے ہیں، مگر مسلمانوں کی ابتری اس کا خاص موضوع نہیں ہے - اختر جمال نے مسلمانوں کی اقتصادی پستی پر توجہ دی ہے - مثلاً 'شہابیں' اور 'انگلیاں فگار اپنی' دیکھئے -

"انگلیاں فگار اپنی" میں بھارت میں رہنے والے ایک مسلمان خاندان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں - جن حالات میں خالہ بی اور ان کی لڑکیاں رہتی ہیں وہی سب مسائل مسلمانوں کے ہیں - فسادات کا خوف، عدم تحفظ کا شدید احساس،

"اور اسی لئے بھاگتے ہوئے لمحہ کو پکڑنے کی کوشش میں مجھے خالہ بی یاد آئیں مگر جب ان کے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو سب نے کہا حالات بہت خراب ہیں، فساد کا اندیشہ ہے - باہر مت نکلنا - احمد آباد گجرات میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں ان فسادات کی وجہ سے سارے ملک میں تناؤ کی فضا تھی - ہر گھر اور کنبے میں لڑکیاں زرد زرد سہمے ہوئے چہرے لئے کوٹھوں پر کھڑی خدا سے دعا کر رہی تھیں -"

"یہاں بھی خطرہ ہے - سارے دروازے، کھڑکیاں بند کر لیں - دروازوں کے آگے لوہے کے بکس رکھ دیجئے - پڑوس میں سب یہی کر رہے ہیں - یہ سنتے ہی سب چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں - اور خالہ بی ہلدی کی طرح پیلی پڑ گئیں ان کے ہاتھ پیر لرزنے لگے - آسیہ چپ چاپ بُت بنی کھڑی تھی"۔

خالہ بی کا بڑا لڑکا پاکستان میں بڑے عہدے پر فائز ہے - آسودہ حال ہے - کوٹھیوں کا مالک ہے - مگر اس کی بہنیں بھارت میں خوشیوں سے محروم ہیں - خزاں زدہ پتوں کی طرح اُداس ہیں -

"آسیہ کی منگنی پندرہ سال کی عمر میں اپنے ایک رشتہ کے بھائی سے ہوتی تھی صغیر بھائی نے پاکستان جانے کے کچھ عرصہ بعد اسے بھی وہاں بلایا تھا. خیال تھا کہ دونوں ملازم ہو جائیں گے تو حالات بہتر ہوتے ہی کنبے کو بلا لیں گے - مگر پھر آسیہ نے یہ خبر سنی کہ اس کے منگیتر کی بھی شادی وہیں صغیر بھائی کی چھوٹی سالی سے ہوئی انگوٹھی پچیس سال کی عمر میں انگلی سے یوں کاٹی گئی جیسے سہاگن کے بیوہ ہونے پر اس کی چوڑیاں اتاری جاتی ہیں۔ انگوٹھی گوشت میں پھنس گئی تھی - تب سے اس کی انگلی میں کاٹی ہوئی انگوٹھی کا اتنا بڑا سا نشان ہے کہ معلوم ہوتا ہے - انگلی دو حصوں میں کسی نے کاٹ کر الگ الگ کر دی ہے - انگلی کا نشان تو نظر آتا ہے - مگر وہ نشان نظر نہیں آتا جو آسیہ کے دل میں ہے - آج بھی اس کے بند بند ہونٹ مجھے سوال کرتے نظر آئے - زندگی کتنی عجیب ہے!"

خالہ بی کا مکان اس سے چھن گیا ہے - ہر طرف زوال کے آثار ہیں -

"پھر ان کے گھر کا جائزہ لیا - کسی زمانے میں ان کا مکان محلے کے اچھے مکانوں میں شمار ہوتا تھا مگر اب ہر طرف اونچی اونچی دیواروں اور محرابوں پر کاہی جمی نظر آتی ہے - جگہ جگہ درزیں ہیں - کوٹھے کی منڈیریں بھی کاہی سے سیاہ پڑ گئی ہیں اور جگہ جگہ سے مٹی گر رہی ہے - سفیدی ہوئے سالہا سال گزر چکے ہیں - دوران گفتگو یہ معلوم ہوا کہ وہ باہر کے چھوٹے حصہ میں خود رہنے لگی تھیں اور اندر کا بڑا مکان ایک سندھی شرنارتھی خاندان کو کرائے پر دے دیا تھا - انہوں نے کچھ ہی عرصہ بعد یہ ثابت کر کے کہ صغیر پاکستان چلے گئے مکان کلیم میں حاصل کر لیا - چھوٹا مکان جو کسی زمانے میں صغیر بھائی کے دادا کی بیٹھک تھا اور جہاں لمبے لمبے دسترخوان بچھا کرتے تھے - خالہ بی اور لڑکیوں کو مل گیا -

سندھی خاندان تجارت پیشہ اور خوشحال تھا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے بڑے مکان کو جدید وضع کی ایک محل نما کوٹھی میں تبدیل کر دیا جو بہت خوب صورت اور شاندار ہے۔ یہ سارا مکان جو کسی زمانے میں ایک تھا۔ اب دو مکانوں کی صورت میں ایک امیر اور ایک غریب کا مکان نظر آتا ہے؛
خالہ بی اب ماضی کی یادوں کی اسیر ہے۔

"پھر وہ اداس ہو کر ماضی میں چلی گئیں۔ جیسے پناہ ماضی کی یادوں میں ہی رہ گئی ہے۔ نواب صاحب کے زمانے کی باتیں۔ پھر اس سے آگے سرکار عالیہ کا عہد جس میں عالموں اور فاضلوں کی اتنی قدر تھی کہ دور دراز جگہوں سے کھینچ کر سب بھوپال میں جمع ہو گئے تھے۔ انہی کے عہد میں منیر بھائی کے پردادا یوپی سے بھوپال آئے تھے۔ وہ سنہرا دور اعلیٰ ملازمتیں۔ وظیفے۔ جاگیریں اور پھر ٹھنڈا سانس بھر کر پولیس اب سب کچھ خراب لگتا ہے۔ ہم کیا چیز ہیں بڑے بڑے محل سائیں سائیں کر رہے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔"

'مشابیل' کا موضوع 'انگلیاں فگار اپنی' سے ملتا جلتا ہے۔ گو بیان طریق کار کسی حد تک مختلف ہے۔ ایک ایسے کردار کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو بھارت میں مسلمانوں کی ابتری اور اقتصادی بدحالی کی منہ بولتی تصویر ہے رشیدہ باجی پاکستان سے بھارت پہنچ کر کیا دیکھتی ہے۔

"رشیدہ باجی بڑے تکلف سے میلی چکٹ دری پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کہاں ان کی قیمتی ساڑی کہاں یہ دری۔ عجیب و غریب تضاد! وہ آنکھیں پھاڑ کر اس طرح اپنے اردگرد کے میلے اور کثیف ماحول کو دیکھ رہی تھیں۔ اور پھر انھیں اپنے چاروں طرف ابوالہول کے چہرے کی وحشت پھیلتی نظر آتی اور ان کی آنکھیں یہ بات چھپا نہ سکیں۔ وہ ترس کھاتی ہوئی آنکھیں! رشیدہ باجی کی آنکھیں بڑی خوب صورت ہیں۔ بڑی صاف گو! ان آنکھوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ رشیدہ باجی کو زبان نہیں کھولنے دیتیں۔ رشیدہ باجی کو اماں سے، ہمارے گھر سے واقعی بڑی انسیت ہے۔ اور ایک زمانے میں تو بڑی محبت تھی۔ کبھی تو وہ اکیلی ہی تانگے کر آ جاتی تھیں۔ لیکن انہوں نے ماں کی اس حالت کا شاید تصور بھی نہ کیا ہو۔ انھیں وہ اپنی پھوپھی اماں یاد ہوں جو اچھے خاصے رنگے چنے کپڑے اور سفید لٹھے کے پاجامے پہنتی تھیں۔ بالوں میں تیل بھی ہر چوتھے روز ڈال لیا کرتی تھیں۔ مگر یہ اماں جن کے پیر میں ثابت جوتی ہے۔ نہ سر پر ثابت اوڑھنی۔ پاجامے میں رنگ برنگی کترنوں کے پیوند۔ سفید ریشم کے گچھوں جیسے بال۔ ان کے چہرے کی ہر جھری کی ایک پوری کہانی ہے اور اس لئے رشیدہ آپا کی آنکھیں ترس کھا رہی تھیں۔"

میں یہ بھی نہیں کر سکتا کم از کم ایک آنے میں ذرا سا دودھ ہی آ جاتا۔ رشیدہ باجی کو ایک پیالی چائے ہی مل جاتی۔ میں نے یاد کیا اور کہاں کہاں سے اماں دھار منگوایا کرتی ہیں، شیخ صاحب کے گھر سے پرسوں میں پانچ روپے لایا ہوں۔ آج واپسی کا وعدہ تھا۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ جواب دے گیا۔ ہر ایک کا کچھ نہ کچھ دینا ہے۔ بال بال قرض میں بندھا ہوا ہے۔ شاید ابا جان گھر آ گئے ہوں۔ وہ بے چارے کیا کریں۔......
بیکاری ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ چالیس برس سے صبح پانچ بجے اٹھنے کے عادی تھے۔ شام کو جب دفتر سے لوٹتے تو موٹی موٹی فائلیں ساتھ لاتے اور لالٹین کے سامنے بڑی رات گئے تک کام کیا کرتے۔ اور اب صبح سے شام تک سوچنا۔ کڑھنا۔ افسوس کرنا۔ مہینے میں ایک دن برائے نام سی پنشن لینے دو میل چل کر جاتے ہیں اور تھکنے کے بجائے کچھ تازہ دم سے نظر آتے ہیں۔ بچارے ایسے ہو گئے ہیں۔ جیسے کسی نے نچوڑ دیا ہو۔ چہرے پر اس قدر کرب آمیز جھریاں پڑ گئی ہیں۔"

بٹے خاندانوں کی جذباتی پریشانیاں، خاندانی مسائل اور بھارت میں مسلمانوں کی بپتا — اختر جمال نے ان موضوعات پر گویا خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھا ہے۔ کرب کی ایک لہر ہے۔ جو ہر حساس دل کو متاثر کرتی ہے۔ چند برس قبل میں نے قرۃ العین کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے

لکھا تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کا مخدوش وجود پاکستان کے لئے ایک مسلسل ایثار ہے۔ اختر جمال کے افسانوں کے حوالے سے اضافہ کرتا ہوں کہ مضبوط پاکستان ہی ان کی حفاظت کی ضمانت ہے۔ اور پاکستان میں مسلم ثقافت کی ترقی و ترویج ہی سے بھارتی مسلمانوں کی ملی شناخت برقرار رہ سکتی ہے۔ اس مسئلہ کو صحیح پس منظر میں دیکھا جائے تو لامحالہ دھیان خود پاکستان کے اندرونی حالات پہ بھی مرکوز ہوگا۔ یہ بجا ہے کہ پاکستان کو بیرونی سازشوں سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ مگر یہ بھی امر واقعہ ہے۔ کہ ہم نے خود پاکستان کو ضرر پہنچایا ہے۔ ہم نے ایسے عوامل اور عناصر کی حوصلہ افزائی کی ہے جن کے باعث پاکستان کی سالمیت میں رخنے پڑے ہیں اور ملک دونیم ہوگیا ہے۔ ہم نے قومی زندگی میں عظیم غفلت کو راہ پانے دیا ہے۔ جس کی وجہ سے عوامی امنگوں اور آدرشوں کے مطابق ملک میں سیاسی، معاشی اور ثقافتی، ڈھانچہ کھڑا نہ کیا جا سکا۔ خود غرضی اور عصبیت کے طوفانی سمندر میں اجتماعی نوعیت کے سارے جذباتی اور عقلی محرکات ڈوب گئے۔ وہ محرکات جو پاکستان کی تخلیق میں کار فرما تھے۔ چنانچہ ارتکاز زر ہوا۔ صنعت کے فروغ کو نظر انداز کرکے صرف درآمدات پر زور دیا گیا۔ جاگیرداری اور زمینداری نظام کو پنپنے دیا گیا۔ نتیجتاً عوام کے سامنے کوئی اجتماعی مقصد نہ رہا۔ ہر نوع کے امتیازات نے سر اٹھایا۔ بیروزگاری، افلاس اور بیماری روز بروز بڑھتی گئیں اور ملک کی سیاسی قیادت محلاتی سازشوں سے فراغت نہ پاسکی، ملک کی معیشت تباہ ہوگئی۔ غیر ملکی قرضہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ عوام میں قومی خودداری اور عزت نفس مفقود ہوگئے۔ اور ملک ایک نئی نوآبادیاتی صورتِ حال میں گرفتار ہوگیا۔ غلامی کی بدترین شکل نے ہمیں آلیا۔

اختر جمال نے اس عظیم طویل قومی بحران کا احساس کیا ہے۔ اور اس کے بعض افسانے اسی احساس اور آگہی کے آئینہ دار ہیں۔

مسٹر پاکستان، کا محمد خاں بیماری، غربت اور بیروزگاری کا شکار ہے۔ کبھی اس نے پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ بڑی بڑی امیدیں باندھی تھیں۔ وہ ایک عام آدمی ہے۔ باہمت ہے پُر امید ہے۔ ہر طرح سے محنت مزدوری کر سکتا ہے۔ مل مزدور ہے مگر پاکستان میں مل لگیں تو اسے مزدوری ملے۔ صنعتی ترقی ہو تو کام کے مواقع نکلیں۔ مشکل سے مشکل حالات سے گذرتے ہوئے بھی وہ پُرامید رہتا ہے۔ مگر حوصلہ شکن حالات بیماری اور بیروزگاری اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔ میرے خیال میں محمد خاں افسانے میں ایک علامت کے طور پہ متشکل ہوا ہے۔ پاکستان کے عوام کی علامت! اس کا کردار تمام عوامی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اور اس کی مشکلات تمام عوام کی مشکلات ہیں۔ وہ پاکستان کے غریب کسانوں اور مزدوروں کا نمائندہ ہے۔ اسی طرح اس کا صحافی دوست متوسط طبقہ کے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو دن رات تگ و دو کرتے ہیں۔ مگر ہر روز ان کا پاؤں پھسلتا ہے اور وہ سماجی درجوں کے زینے پہ اُوپر چڑھنے کی کوشش میں تھوڑے اور نیچے آگرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی ایک کثیر مقدار بھی بے سہارا غریب عوام کا حصہ بن جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ جاگیردارانہ نظام کا یہ منطقی نتیجہ ہے۔

اگرچہ مسٹر پاکستان، کے بعض حصوں میں جذباتیت اور ہیجانیت کا شائبہ ہوتا ہے۔ تاہم میرے خیال میں اس افسانے کی اساس پختہ شعور پہ ہے۔ اس کے پیچھے فہم کا ایک پس منظر ہے۔ جو اس کی جذباتیت کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ مرکزی کردار کی انفرادی حیثیت اور اجتماعی معنویت بڑے ہنر سے پیش کی گئی ہیں اور اس وجہ سے مجھے یہ افسانہ بہت کامیاب معلوم ہوا ہے۔ جن حالات کا نقشہ 'مسٹر پاکستان' میں کھینچا گیا ہے۔ آمریت انہیں سے جنم لیتی ہے۔ چنانچہ پاکستان ایک طویل مدت تک آمریت کے عفریت سے نبرد آزما رہا۔ اختر جمال نے اپنے کامیاب ترین افسانے 'نیا کپڑا' میں اسی دور کی عکاسی کی ہے۔

"نیا کپڑا" کا پیرایہ ( ALLEGORICAL ) تمثیلی ہے اور اس کی تلمیحی نسبت ہینز اینڈرسن کی کہانی 'بغیر کپڑوں کا بادشاہ' سے ہے اور ایک حقیقت اور فنی تخلیق ـــــ ان دو چیزوں نے اس افسانے کو منفرد اور خوبصورت افسانہ بنا دیا ہے۔ اینڈرسن کی کہانی کے ساتھ تلمیحی تال میل شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری تاریخ کے ایک نہایت افسوسناک ورق کا تمثیلی بیان پُرشگفتہ اور طنزیہ ایمائیت کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

یہ کہانی ہے۔ ایک بادشاہ کی جس نے ملک میں دم توڑتے ہوئے جمہوری نظام کو ختم کیا اور ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ کھڑا کیا۔ جس کا واحد مقصد ملک کو ذاتی جاگیر بنانا تھا۔

"ملک حریستان دنیا کا وہ پہلا اور آخری ملک ہے۔ جہاں عوام خود بادشاہ کو منتخب کرتے ہیں۔ لیکن یہاں سروں کو گننے کی بجائے تولا جاتا ہے بادشاہ اپنے پسندیدہ افراد کی مجلس منعقد کرتا ہے۔ اور وہ مجلس بادشاہ کو چن لیتی ہے اور ظاہر ہے کہ بادشاہ انہی لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ جو ملک میں سب سے اچھے اور سب سے لائق اور وفادار ہوتے ہیں۔"

ایک زمانہ تھا کہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام سے ہر سوچنے سمجھنے والا مسحور لگتا تھا سابق صدر مملکت محمد ایوب خان سب لوگوں کی عقل خرید کر اپنے مصرف میں لے آیا اور جمہوری اداروں کو جڑوں سے اکھاڑنے کے لئے محمد ایوب خاں نے سولبادوں میں اوڑھا کر بنیادی جمہوریتوں کا تصور پیش کیا اور تصور کو عام کرنے کے لئے قومی سرمایہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ آزادیٔ تقریر و اظہار کو کچل ڈالا گیا۔

کہانی کی اگلی کڑی ملاحظہ ہو۔

"ہر مالدار آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی کپڑے کا کارخانہ لگائے۔ اس طرح کارخانہ لگا کر وہ مالدار آدمی لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے۔ اور اس طرح ملک کے لوگ امیر ہونے لگے۔ ملک کی دولت بڑھی۔ بادشاہ نے ایک عقلمندی یہ بھی کی اور بادشاہوں کی طرح شہزادوں کو صرف شہسواری اور فن حرب کی تربیت نہیں دی بلکہ اس نے انہیں سیاست اور تجارت کے اسرار و رموز بھی سکھائے۔ اس لئے اور بادشاہ تو خزانہ کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، اس بادشاہ کی دولت اتنی بڑھ گئی کہ خزانے سے بھی زیادہ روپیہ اس کے ذاتی بینک میں جمع ہو گیا اور وہ دنیا کا امیر ترین بادشاہ بن گیا۔ بادشاہ پرانے زمانے کے بادشاہوں کی طرح بیوقوف نہ تھا کہ اپنے خزانے پر خود ہی سانپ بن کر بیٹھتا اس نے دوسرے ملکوں کے بینکوں میں اپنا روپیہ جمع کرایا اور دوسرے ملکوں سے تجارتی کاروبار میں روپیہ لگایا۔"

روپیہ جمع کرنے اور سرمایہ کو باہر منتقل کرنے کی رسم اتنی بڑھی کہ ملک کی معیشت ڈھینے لگی۔ گرتی ہوئی اس عمارت کو بیرونی امداد اور قرضہ سے سہلا دیا جاتا۔

"اس دولت سے نئے نئے کپڑے کے کارخانے کھولے جاتے۔ ان کارخانوں میں ایک حصہ بادشاہ کے بیٹوں کا ہوتا۔ ایک حصہ امیروں و وزیروں کا اور تیسرا حصہ حکومت کا ہوتا تھا، چوتھے حصے میں سارے ملک کے عوام حصہ دار بن سکتے تھے مگر سارے ملک کے عوام بھلا چوتھائی حصے کیسے بانٹ لیتے نہ ہی سب کے پاس حصے خریدنے کو روپیہ ہوتا تھا۔ اس لئے یہ حصے عوام میں سے ان لوگوں کو مل جاتے تھے جو بادشاہ کی مجلس میں ہوتے تھے اور بادشاہ کو چنتے تھے۔ دراصل تیسرا حصہ حکومت کا حصہ تھا وہی عوام کا حصہ تھا کیونکہ حکومت بھی تو عوام ہی کی تھی۔"

اور پھر عوام سے کٹی ہوئی نوکر شاہی کے بھی تیور بدل جاتے ہیں۔ نوکر شاہی کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ وہ عوام کے مفاد کو بالائے طاق رکھ

کہ سامراجی طاقت کے ایجنٹ کے طور پر کام کرے۔ اب اس نے اپنے آپ کو نئے روپ میں ظاہر کیا۔ اور ایک مضبوط آمر کو مزید مضبوط بنانے پر کمربستہ ہو گئی۔ اس لئے کہ اس کی اپنی فلاح بھی اسی میں تھی۔

"حکومت کے عصہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ حکومت کے تمام چھوٹے بڑے سرکاری افسر سرکاری کاموں کو چھوڑ کر کارخانوں کی ترقی میں کوشاں ہو گئے۔ کیونکہ یہ سرکاری کام بن گیا تھا۔ اس لئے چاہے حکومت کے سیکڑوں کام اٹکے رہتے۔ کارخانوں کی ہر مشکل فوراً دور کر دی جاتی تھی۔"

نوکر شاہی نے نئے مفادات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لیا۔ معاشرتی زندگی کا رنگ بدلتا ہے، اور افسروں کے ساتھ ساتھ ان کی بیگمات بھی عوام کے مفادات کے خلاف برسرِ عمل ہو جاتی ہیں۔ ان کے تقاضے ملکی تقاضوں پر فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔

"جب امرا اور شرفا کی بیگمات قسم قسم کے نہانے کے لوشن اور رنگ برنگی کریمیں اور غازے، بھانت بھانت کی لپ سٹکیں استعمال کرتیں اور طرح طرح کی خوشبوئیں لگاتیں تو حوریں اور پریاں بھی ان سے جلتیں۔۔۔۔ غرض سدا بہار بنی یہ بیگمات ہنستی مسکراتی صبح کو کافی پارٹیاں کرتیں، شام کو ٹی پارٹیاں اور رات کو دعوتیں۔ سینما، کلب، غرض ہزار تفریحیں تھیں اور یہ بیگمات بہت مصروف اور کارآمد زندگی گذارتی تھیں جو باقی وقت بچتا اس میں اپنا بناؤ سنگار اور گیسوؤں کی آرائشیں کرتیں، اپنا گھر سجاتیں اور جو وقت پھر بھی بچ رہتا اس میں سوشل ورک کرتی تھیں۔۔۔۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ مردوں میں آمدنی بڑھانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ مرد خواہ قرض لیتے یا رشوت لیتے مگر عورتوں کو اچھا کپڑا ضرور پہناتے۔"

اور پھر بادشاہ کو ایک نئے شہر کی ضرورت پیش آئی۔

"بادشاہ نے ایک شہر بھی نیا آباد کیا جس کا نام فیشن آباد رکھا۔ یہ شہر اپنی خوب صورتی میں بے نظیر تھا جتنے نئے نئے فیشن اور لباس کے شوقین امیر امرا تھے سب نے یہاں آکر بود و باش اختیار کر لی۔ اور اتنی بڑی بڑی عالی شان اور خوب صورت کوٹھیاں بنائیں کہ لوگ حریرستان کی ترقی پر عش عش کرنے لگے۔ بیرونِ ملک سے جو لوگ آتے وہ فیشن آباد سے خاص طور پر متاثر ہوتے اور ملک حریرستان کی ترقی کے گن گاتے۔"

خوشامد، لالچ، حرص میں گرفتار امیر طبقہ، اور نوکر شاہی طبقہ مل کر عوام کی خواہشات کا خون کرتے ہیں، ان کا اعتماد اس حد تک گر جاتا ہے کہ انہیں خود اپنی بدنصیبی کا احساس تک نہیں رہتا۔ کہیں کہیں سے کوئی نحیف سی آواز اٹھتی ہے۔ جو وقت پرستوں کی لہروں سے ٹکرا کر دب جاتی ہے۔

تب جشنِ دس سالہ کا دور آتا ہے۔ جب مولوی، مفکر، وکیل، استاد، ادیب، شاعر، صحافی سبھی بادشاہ کی تعریف کے گن گاتے ہیں،

"جلوس میں بادشاہ کے حفاظتی دستے تھے، دائیں بائیں اور پیچھے بہ سپاہی چل رہے تھے۔ اور ان کے جلو میں وزیر اعظم، وزرا، امرا، اور شہر کے معزز لوگ تھے جن میں ادیب، فن کار، شعرا، دانشور، علما، صوفیا، سب ہی شریک تھے۔ یہ لوگ بڑے بڑے کتبے اٹھائے تھے جن پر لکھا تھا جو بادشاہ پہنے تم بھی وہی پہنو۔۔۔ جو بادشاہ سوچے تم بھی وہی سوچو۔۔۔۔ جو بادشاہ بولے تم بھی وہی بولو۔۔۔۔"

جب بادشاہ ننگا جلوس میں چلتا ہے۔ تو کسی کو ہوش نہیں، یا یارا نہیں، کہ وہ سمجھے یا کہے کہ بادشاہ ننگا ہے، مگر

"اس وقت فیشن آباد کی خوب صورت اور کشادہ سڑک پر موٹر کار کے قریب ہی حفاظتی دستے کے پیچھے سے ایک ننھے سے بچے نے تالیاں بجاتے بجاتے ہنسنا شروع کر دیا۔ بادشاہ بغیر کپڑوں کے پھر رہا ہے۔۔۔۔۔ بادشاہ ننگا ہے۔۔۔۔۔"

بچے کی بات سن کر جلوس میں کھڑے ہوئے اور بچے بھی قریب آ گئے اب تو سب نے بادشاہ کو گھیر کر ہنسنا شروع کر دیا اور فضا میں وہی جملہ ہر طرف سنائی دینے لگا۔ "بادشاہ نے کپڑے نہیں پہنے۔ بادشاہ ننگا ہے۔"

" بادشاہ کو جلال آ گیا، اس نے حکم دیا کہ ان خبیث اور شر پھیلانے والوں کو سزا دو یہ سنتے ہی بادشاہی پولیس کا عملہ گولیاں برسانے لگا ":

اب ہم ایسے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں جب آمریت کا طلسم ٹوٹتا ہے۔ طلبا اس نئی آگاہی کا ہراول دستہ بنتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری قوم بت شکنی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

جس کے نتیجے میں آج ہم اپنے ملک کو از سر نو جمہوری بنیادوں پر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور ایسا معاشرہ زیر تشکیل ہے جس کی بنیاد اقتصادی جمہوریت پر رکھی جا رہی ہے۔

'نیا کپڑا' ایک دلپذیر تمثیل ہے۔ اختر جمال نے نہایت چابکدستی سے ایسی تفصیلات جمع کی ہیں جو ایوب راج کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔ تاریکی کے راج کی بھرپور تصویر ـــ اور پھر سب سے بڑھ کر تاریکی سے جنم لینے والے اجالے کا اشارہ جس پر افسانہ تمام ہوتا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختر جمال ایک گہری سوچ رکھنے والی افسانہ نگار ہے اس کی سوچ محور وطن اور قوم ہے۔ مگر بعض مرتبہ یہ سوچ آفاقی نوعیت اختیار کر لیتی ہے اور افسانہ نگار سب انسانوں کے لئے ایک حساس دل کے ساتھ سوچتی ہے۔ جیسے 'امن کی تختی' میں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے افسانوں میں عالمگیر جنگ کا جو پس منظر ملتا ہے۔ اس میں پوری انسانیت اس کا موضوع ہے۔ اور اس کی اپنی ہمدردیاں تعمیر، تخلیق اور امن کی طاقتوں کے ساتھ ہیں۔ مگر زیادہ تر اختر جمال کی سوچ ایک ایسے تاریخی شعور سے روشنی حاصل کرتی ہے۔ جس کا تعلق برصغیر میں مسلمانوں اور ان کی ثقافت کے ساتھ ہے۔ اس کے نقطۂ نظر میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کی آنچ ہے۔ وہ عوام دشمن طاقتوں کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور حق و انصاف کا ساتھ دیتی ہے۔ جہاں اس نے مٹتی معاشرت کی تصویر کھینچی ہے۔ وہاں اس نے زیر تشکیل نئی معاشرت کے خدوخال بھی واضح کئے ہیں۔ مرد اور عورت کے باہمی رشتہ کی بدلتی ہوئی نوعیت کے پیش نظر بدلتے ہوئے خاندانی نظام زندگی کا نقشہ بھی اس کے افسانوں میں جا بجا ملتا ہے۔ اس کے ہاں نئی عورت کا تصور ہم عصر تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ وہ روایتی اقدار سے لگاؤ کا اظہار ضرور کرتی ہے۔ مگر نئی اقدار کے جنم کا خیر مقدم بھی کرتی ہے۔

اس کے لہجے میں رجائیت ہے مستقبل پر بھروسے کا اظہار ملتا ہے۔ آمریت، غربت، افلاس، بیماری اور تاریکی کے پس منظر میں اسے روشنی کی کرن بھی نظر آتی ہے۔

( باقی )

# ۴

## انتظاریہ

# اُجالوں کی گود میں

## میرزا ادیب

کردار

بابا جانی ــــــــــ

رانی ــــــــ بابا جانی کی جواں سال بیٹی

شادو ــــــــ بابا جانی کا بیٹا۔ رانی سے دو سال بڑا

ابراہیم ــــــــ رانی کا منگیتر

سردار علی نواز ــــــــ ایک مل کا مالک

حق نواز ــــــــ سردار صاحب کا بیٹا

شوکت ــــــــ ایک مکار آدمی

اور

ہوٹل کے کچھ لوگ

دن کا تیسرا پہر

بستی "سدّو یار" کا وہ حصہ جو بیشتر غیر آباد ہے دُور دُور تک کوئی مکان نہیں۔ ایک کچّے راستے پر بابا جانی، اپنے گدھے کے ساتھ گھر کی طرف لوٹ رہا ہے۔ بابا جانی کی عمر ستّر سے متجاوز کر چکی ہے۔ کمر کسی حد تک جھکی ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی تہمد اور لمبے کرتے میں ملبوس۔

○

شام کے دھندلکے میں آبادی قریب نظر آتی ہے۔ گدھا چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ بابا جانی پیار سے اس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرتا ہے
جانی:- پیاس لگی ہے یار! بس اب گھر میں پہنچ گئے۔ چل میرے ساتھی۔ شاباش۔ گھر جاتے ہی کنوئیں کا ٹھنڈا پانی ملے گا۔ چل میرے یار

○

بابا جانی کا چھوٹا سا کچا گھر

بابا جانی گدھے کی گردن تھپتھپاتا ہے۔

جانی:- بس آ گیا گھر۔ ابھی ٹھنڈا پانی ملے گا۔ پھر چارہ ملے گا۔ پھر تو آرام کرے گا۔ مجے سے سوئے گا۔ ساری رات۔

ٹھیک ہے نا میرے یار پیارے ٹھیک ہے نا ـــ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔

(بابا جانی گدھے کو درخت کے نیچے لاتا ہے۔ درخت کے تنے سے جو رسی بندھی ہے۔
اس کا دوسرا سرا گدھے کی گردن میں ڈال دیتا ہے۔

جانی:۔ اے سب باکھیر (شب بخیر) ہی ہی ہی۔ اللہ نے چاہا تو سویرے ملیں گے۔ آتی وہیکے لیے آرام۔

○

گھر کا اندرونی حصہ۔ دالان ـــ درمیان میں ایک کھاٹ۔ کچھ دور چولھا۔ چولھے کے پاس چمٹا،
توا، سوکھے ہوئے اپلے۔ چند برتن، کچھ دور ایک پرانی بالٹی، لوٹا اور پیالہ، بابا جانی کی جوان
بیٹی رانی، سر سے مٹی کا گھڑا اتار کر نیچے زمین پر رکھتی ہے۔ باہر سے جانی کی آواز آتی ہے۔
"رانی بیٹی!"

رانی:۔ جی بابا۔

رانی جلدی سے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتی ہے جس پر گھڑے کا پانی کہیں کہیں نظر آرہا ہے
بھاگ کر چولھے میں ایک اور اپلا ڈال دیتی ہے۔ دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ جانی آتا ہے۔

رانی:۔ آگئے بابا!

جانی:۔ آگیا بیٹی! آگیا۔ جیون کا ایک اور دن بیت گیا۔

رانی:۔ بابا ایسا نہ کہا کر۔

جانی:۔ میں کوئی گلط کہتا ہوں۔ جیون کا ایک اور دن بیتا نہیں۔ رب کا سکر ہے۔ دن اچھا بیتا محنت کی۔ پھل
پایا، اور کیا چاہیئے!

(جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالتا ہے)

لے۔ پھل محنت کا۔ سکر اس نیلی چھت والے کا۔ جو دم گجرے سو واہ وا ـــ لے نا پکڑ بیٹی

رانی:۔ پانی لے آؤں؟

رانی گھڑے کے پاس رکھا مٹی کا پیالہ اٹھاتی ہے)

جانی:۔ پہلے لے لے

رانی:۔ اچھا بابا!

(رانی پیالہ ہاتھ میں لیے بابا کی طرف آتی ہے۔ بابا دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ میں لپٹی ہوئی
کوئی چیز نکالتا ہے)

جانی:۔ یہ بھی لے۔

رانی:- یہ کیا ہے بابا!

جانی:- بتا تو کیا ہے ۔

رانی:- کیا جانوں ؟

جانی:- پگلی! بھول گئی ہے ۔ صبح تو نے سادو سے کہا نہیں تھا ۔ جلیبیاں لانا ۔

رانی:- جلیبیاں ۔ اچھا ۔ پر بابا! میں نے تو سادو سے کہا تھا ۔

جانی:- باپ جندہ ہو تو جانی بہن کی پروا نہیں کرتے ۔ پوچھنا کہہ دے گا ۔ اوہ بھول گیا ۔ کل لاؤں گا ۔ یہ جمانے کا دستور ہے بیٹی ۔ یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا!

(رانی بابا سے پیسے لے کر کرتے کی جیب میں ڈال لیتی ہے)

کھا لے ۔ ٹھنڈی ہو گئی ہیں ۔

رانی:- ابھی نہیں ـــ رات کو روٹی کھا کر ۔ سادو بھی تو آ لے ۔

جانی:- تیری مرجی ۔

(بابا چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے ۔ رانی کوٹھری کے اندر جاتی ہے اور جلیبیاں رکھ کر جلدی سے باہر آجاتی ہے)

رانی:- پانی پیئے گا نا بابا!

جانی:- روج بھول جاتی ہے میری پگلی بیٹی! پہلے وہ پہر میں میری بات تیرے کانوں میں رہتی ہے ۔ دل میں نہیں اترتی ۔

رانی:- بابا! تجھے تو ہر وکت اپنے گدھے ہی کی پڑی رہتی ہے ۔

جانی:- تو بھی گدھا کہتی ہے ـــ یہ تو بیٹی میرا سوہنا یار ہے ۔ ہمدرد ہے ۔ کتنا لمبا ساتھ دیا ہے اس نے ۔ یہ بھی میری طرح انسان ہے ۔

رانی:- انسان! بابا

(رانی زور سے ہنستی ہے)

جانی:- تو یہ بات کیا سمجھے ۔ اسی لیے تو کہتا ہوں ابھی میری باتیں تیرے کانوں میں رہتی ہیں ۔ دل تک نہیں پہنچتیں ۔ تو نے ابھی دنیا کا کچھ دیکھا نہیں ۔ جا پلا پانی اسے ۔ انتجار کر رہا ہوگا ۔

(رانی گھڑے سے لوٹے میں پانی انڈیلتی ہے ۔)

ذرا اس کا برتن صاف کر لینا

رانی:- گدھا نہ ہوا ـــ (ہنس پڑتی ہے)

جانی:- رانی!

رانی:- جاتی ہوں بابا! جاتی ہوں ـــ جا رہی ہوں ۔

(رانی لوٹا لے کر دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔
شادو آتا ہے، رانی سے ایک دو سال بڑا۔ لباس وہی جو باپ کا ہے۔
ہاتھوں پر سیاہی بھی ہوئی ہے)

جانی:۔ آ گئے سادو

شادو:۔ جی بابا۔

جانی:۔ دیر سے کیوں آئے ہو!

شادو:۔ بابا کیا کروں۔ چھٹی کے وکت کوئی نہ کوئی سیکل لے کر آ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں چلو چار پیسے مل جائیں گے۔

جانی:۔ اللہ تیری ہمت میں برکت دے۔

شادو:۔ لوٹا کہاں ہے بابا!

جانی:۔ رانی لے گئی ہے۔ ابھی آ جاتی ہے۔

(رانی خالی لوٹا لے کر آتی ہے)

جانی:۔ برتن صاف کر دیا تھا نا؟

(رانی اثبات میں سر ہلاتی ہے)

رانی:۔ سادو۔ دے لایا ہے جلیبیاں۔

شادو:۔ اوہ ——— یاد ہی نہیں رہا۔ کل لاؤں گا جرو جرو لاؤں گا۔

رانی:۔ بابا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

شادو:۔ کیا کہا تھا بابا نے

جانی:۔ (جلدی سے ہاتھ بلند کر کے) کچھ نہیں۔ کچھ نہیں سادو بیٹا! آج بھول گئے ہو کل لے آنا۔ کام کاج میں آدمی بھول جاتا ہے۔

(رانی نفی میں سر ہلاتی رہتی ہے)

شادو:۔ لے آؤں گا۔ اب سر پہ نہ چڑھو۔

رانی:۔ نہ لاؤ۔ میرا بابا لے آیا ہے۔ احسان نہ کرو مجھ پہ۔ ہاں!

جانی:۔ نہ نہ رانی! تمہارا بھائی تو تم سے اتنا پیار کرتا ہے کہ کوئی کیا کرے گا۔

رانی:۔ بڑا پیار کرتا ہے۔ ہونہہ

شادو:۔ کرتا نہیں ہوں۔ جیادہ کام کیوں کرتا ہوں۔ جانتی ہو ——— تاکہ تمہارا بیاہ دھوم دھام ———

رانی:۔ چل ہٹ۔ کام کرنے دے۔ بابا تو ابھی تک یہاں بیٹھا ہے۔ بڑی باتیں بنانی آتی ہیں اسے

شادو:۔ کیوں بابا! سچ کہا ہے نا۔

جانی :۔ میرا سادو جھوٹ تھوڑی بولے گا۔

(رانی گھڑے میں سے پیالہ بھرتی ہے اور باپ کی طرف لاتی ہے)

رانی :۔ لے بابا! پی ——— آگ تیار ہے چلم بھر کر حقہ لے آتی ہوں۔

جانی :۔ (پیالہ ہاتھ میں لے کر، پیٹے کا سادو ؟

شادو :۔ یہ تو پی بابا! مجھے یہ پلائے گی ——— بلا کہیں کی۔

رانی :۔ خود نہیں پی سکتا، ہاتھ ———

شادو :۔ ٹوٹ گئے ہیں۔

(رانی اس فقرے پہ شرمندہ ہوگئی ہے)

رانی :۔ تو میری۔ تیرے کیوں ہاتھ ٹوٹیں ——— تیرے دشمنوں کے ٹوٹیں۔

(جانی نے پانی پی لیا ہے)

(لے بابا! سادو کو دوں

شادو :۔ چھوڑ اب ——— میں خود پی لوں گا۔

رانی :۔ ناراج کیوں ہوتے ہو ——— پلاتی ہوں۔ سارا گھڑا پی لو بے شک۔

شادو :۔ کبھی کہہ رہی تھیں۔ خود پی لو! تیرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں۔

رانی :۔ (رونے کے سے انداز میں) دیکھا بابا! میں نے کہا تھا تیرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں۔ الجام لگا تا ہے۔

جانی :۔ سادو۔ یہ بہن کا پیار ہے۔

شادو :۔ بہن کا پیار ایسا ہوتا ہے۔

رانی :۔ اللہ میرے باجو ٹوٹ جائیں ۔ ہاتھ ٹوٹ جائیں ۔

شادو :۔ بس بس۔ پتر دوں گا الٹے ہاتھ سے۔

(شادو اس کی طرف بڑھتا ہے)

رانی :۔ اور میرے ویر کو کچھ نہ ہو۔

جانی :۔ اللہ یہ پیار سدا سلامت رہے۔

(رانی چولہے کے پاس پڑے ہوئے حقے کی چلم اتارتی ہے۔ اور چولہے سے اس میں اپلے ڈالنے لگتی ہے)

جانی :۔ سادو! ابھی تو نہیں سمجھتا بہن کا پیار۔ جب یہ آنگن سونا کر کے دوسرے کا گھر بسائے گی اس وقت تجھے پتا چلے گا کہ سارا گھر کتنا اجاڑ ہو گیا ہے۔

شادو :۔ بابا! جائے گی کہاں ——— روج روج آ جایا کرے گی سہاگ کر۔

رانی :۔ سنا بابا! مجھے بی کہتا ہے۔

شادو :۔ بلی ۔۔۔ بلی ۔۔۔ میاؤں ۔۔۔ میاؤں

جانی :۔ ہی ہی ہی ہی ۔۔۔ سرارتی کہیں کا

(رانی چلم میں اپلے ڈال رہی ہے کہ ایک اپلے سے اس کی انگلی لگ جاتی ہے)

رانی :۔ اوئی

شادو :۔ بھاگ کر جاتے ہوئے، کیا ہوا؟

رانی :۔ جرا جل گئی۔

شادو :۔ چھوڑ میں چلم بھرتا ہوں ۔۔۔ بس اب میں چلم بھرا کروں گا۔ دکھا انگلی۔

(رانی چلم نہیں دیتی)

رانی :۔ کچھ نہیں ہوا۔

جانی :۔ کیوں رانی۔

رانی :۔ بالکل ٹھیک ہوں بابا۔ بالکل ٹھیک ہوں۔

شادو :۔ دکھا تو سہی انگلی۔

رانی :۔ ٹھیک ہے۔ دکھاؤں کیا؟

شادو :۔ میں تجھے چلم نہیں بھرنے دوں گا۔

رانی :۔ یہ کام تیرا نہیں میرا ہے۔ تو کما کر لاتا ہے۔ بس تیرا یہ کام ہے۔

شادو :۔ بابا اس کی انگلی جلی ہو گئی ہے۔

رانی :۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں

شادو :۔ پھر چیختی کیوں تھی!

رانی :۔ وہ تو ویسے ہی مسکرا کر ابس ۔۔۔ ویسے ہی۔

(رانی چلم بھر کر حقے کی طرف لاتی ہے اور اسے چلم کے اوپر رکھ دیتی ہے۔)

شادو :۔ رانی ادھر آ۔

(شادو کرتے کی جیب سے پیسے نکالتا ہے)

رانی :۔ کیا ہے۔

شادو :۔ آج پیسے نہیں لوگی۔

رانی :۔ کیوں نہیں لوں گی۔ چھوڑوں گی بھلا۔ لاؤ۔

شادو :۔ایک سو پیہ جیادہ لایا ہوں آج ۔ ساڑھے تین رو پے ہیں۔ روز اتنے پیسے ملتے رہیں تو مجا آ جائے۔ اپنی بہن کا بیاہ ———

رانی :۔ ہا۔ ہا

(شادو جلدی سے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیتا ہے)

شادو :۔ چپ

(باہر سے سردار علی نواز کی آواز آتی ہے "کوئی ہے ؟"
کٹ کر کے کیمرہ باہر آتا ہے۔
سردار علی نواز اور ان کا صاحب زادہ حق نواز کھڑے ہیں
جانی باہر آتا ہے۔ اس کے ساتھ شادو بھی ہے)

جانی :۔ جی۔

سردار صاحب :۔ یہاں آپ رہتے ہیں!

جانی :۔ جی

سردار صاحب :۔ مجھے ذرا پانی چاہیئے اپنی کار کیلئے۔

جانی :۔ پانی جتنا بھی چاہے لیجیئے۔

سردار صاحب :۔ وہ سامنے کار رکی پڑی ہے۔ اس کے لیے چاہیئے۔

جانی :۔ کتنا چاہیئے۔

حق نواز : تھوڑا سا۔

جانی :۔ شادو بیٹا! گھڑا لے آ

سردار صاحب :۔ گھڑا نہیں آدھی بالٹی کافی ہے۔ بالٹی نہ سہی لوٹا سہی۔

جانی :۔ بالٹی بھی ہے اور ـــــ لوٹا ـــــ

سردار صاحب :۔ ٹھیک ہے۔

(شادو تیزی سے اندر جاتا ہے۔ کیمرہ اس کے ساتھ آتا ہے۔)

رانی :۔ کون ہے۔

شادو :۔ کوئی بڑا امیر آدمی ہے۔

رانی :۔ کہتا کیا ہے۔

شادو :۔ موٹر کے لیے پانی مانگتا ہے۔

رانی: موٹر بھی پانی پیتی ہے۔

شادو: ہاں ہاں۔ روٹی بھی کھاتی ہے۔ پانی بھی پیتی ہے حقہ بھی پیتی ہے

(شادو لوٹا بھر کرنے جاتا ہے۔ کیمرہ اس کے ساتھ چلتا ہے)

حق نواز: دونوں بچے

جانی: نہیں نہیں —— ہم موٹر تک چلیں گے۔

سردار: تکلیف نہ کریں۔

جانی: تکلیف کیسی؟ آپ ہمارے مہمان ہیں جی!

(جانی، شادو، سردار علی نواز اور حق نواز موٹر کی طرف جاتے ہیں۔)

سردار صاحب: بابا! تم لوگ کیا کرتے ہو۔

جانی: کرنا کیا ہے جناب! میں گدھے پر مٹی لاد کر شہر میں بیچ آتا ہوں۔ یہ میرا بیٹا ہے سیکلوں کا کام کرتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے گزارہ ہو جاتا ہے۔

سردار صاحب: تم نے ساری عمر یہی کام کیا ہے۔

جانی: میرے پاس پانچ گدھے تھے۔ چار مر گئے جی۔ ایک ہے۔ بڑا وفادار جانور ہے میں تو اسے اپنا ساتھی سمجھتا ہوں بڑا اچھا ساتھی ہے۔

سردار صاحب: بابا! بڑے ظلم کی بات ہے۔ اس عمر میں کام کرتے ہو۔

جانی: ظلم کی بات کوئی نہیں جی۔ ابھی میری بوڑھی ہڈیوں میں ہمت ہے۔ کام کر کے خوش ہوتا ہوں کسی کی محتاجی نہیں ہے جی۔ مزے سے گزرتی ہے۔ بس ایک فکر ہے۔ میری رانی کی شادی ہو جائے۔ اپنے گھر میں آرام سے چلی جائے۔ بس اور کچھ نہیں چاہیے۔ اگلے چاند شادی ہو جائے گی۔ میں بھی جمع کر رہا ہوں۔ اور یہ میرا بیٹا بھی جو کچھ کما کے لاتا ہے بہن کے حوالے کر دیتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے جی۔

سردار صاحب: (حق نواز سے) دنیا میں بعض لوگ زندگی گزارنے کے لیے نہیں، زندگی کی سزا پانے کے لیے آتے ہیں۔

حق نواز: ڈیڈی! ان کے لیے یہی زندگی مناسب ہے۔ یہ محنت کی زندگی ہے۔ لائف کے لیے یہی چاہیے۔

سردار صاحب: تم اپنے عیش و آرام میں ان بدنصیب لوگوں کی المناک حالت نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ آبادیوں سے دور کیسے کیسے لوگ زندہ ہیں WHTAT A WRETCHED LIFE بڑا دکھ ہوا ہے مجھے۔

حق نواز: ڈیڈی! EXCUSE ME

سردار صاحب: کیا مطلب!

حق نواز: بڑے جذباتی ہو رہے ہیں آج!

ابراہیم آتا ہے

جانی :- یہ ہے جی میرا داماد۔

ابراہیم کے کپڑے گندے ہیں۔ جن پر سفیدی کے جابجا نشان پڑے ہیں۔ چہرے پر بھی یہ نشان نظر آرہے ہیں۔

(ابراہیم چلتے چلتے رک جاتا ہے)

ابراہیم سلاما لیکم۔

(سردار صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہیں)

جانی :- بچپن میں یتیم ہوگیا تھا۔

سردار صاحب :- یہ کیا کام کرتا ہے

جانی :- سفیدی کرتا ہے مکانوں کی۔ اپنے کام میں بڑا طاق ہے جی۔ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔

سردار صاحب :- کیا کما لیتا ہوگا۔

جانی :- کبھی کچھ نہیں لاتا — کبھی دو تین روپے لے آتا ہے۔

سردار صاحب :- دو تین روپے اور وہ بھی کبھی کبھی۔

جانی :- کبھی جیادہ بھی لے آتا ہے۔

سردار صاحب: کیا لے آتا ہے خاک۔ MISERABLE

جانی :- جی

سردار صاحب :- WHAT A PITY

جانی :- جی آپ ملوم نہی کیا جبان بولتے ہیں

ابراہیم :- یہ انگریجی ہے بابا! یہ جبان پڑھے لکھے بڑے آدمی بولتے ہیں۔ گنوار نہیں

جانی :- ہم گنوار کیوں ہیں —

(سب موٹر کے قریب آجاتے ہیں۔ ابراہیم کھسک جاتا ہے

ڈزالو کر کے دکھاتے ہیں کہ وہ جانی کے گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ رانی چولھے میں نئے اپلے ڈال رہی ہے اور پھونکنی سے پھونک مار رہی ہے۔)

ابراہیم: رانی۔

(رانی مڑ کر دیکھتی ہے۔ ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھوں کا پانی پونچھتی ہے)

رانی :- آ گئے۔ بڑی دیر کر کے آتے ہو۔

ابراہیم :۔ دکان دکان پھرا —— پھر ملی وہ چیز !
رانی :۔ کیا چیز !

(ابراہیم تہمد کی ڈب میں سے بندے نکالتا ہے)

ابراہیم :۔ یہ —— اچھے ہیں نا۔ پسند ہیں ؟
رانی :۔ ہاتھ میں لے کر، ہائے کتنے پیارے ہیں۔
ابراہیم :۔ کانوں میں پہنو۔ بڑی پیاری لگو گی۔
رانی :۔ نہ
ابراہیم :۔ کیوں ؟
رانی :۔ کیوں دیتے ہو مجھے۔ لو۔ واپس

(رانی واپس کرتی ہے)

ابراہیم :۔ واپس کر رہی ہو!
رانی :۔ ہاں کیوں نہ واپس کروں۔ کیا لگتے ہو میرے ؟
ابراہیم :۔ (بندے لے کر) کیا کہا۔ کیا لگتا ہوں تمہارا ! اچھا یہ بات ہے۔ میں تمہارا کچھ لگتا ہی نہیں۔
رانی :۔ ابھی تو —— تم —— ابھی تو وہ نہیں ہو نہ —— ہے —— یاہ نہیں ہوا ہمارا بیاہ ہو جائے گا پھر اور بات ہوگی۔
ابراہیم :۔ رانی !
رانی :۔ ہوں
ابراہیم :۔ کبھی اپنے دل سے بھی پوچھا ہے میں کیا لگتا ہوں تمہارا !؟
رانی :۔ پوچھا ہے۔
ابراہیم کیا کہتا ہے دل۔
رانی :۔ کہتا کچھ نہیں۔ بس جور جور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ (ہوا میں انگلیاں نچا کر) یوں —۔ یوں۔ پگلا کہیں کا۔
ابراہیم :۔ پر میں نے اپنے دل سے کبھی یہ سوال نہیں کیا۔ کیوں کروں ؟ تم تو ہو ہی میری۔
رانی :۔ تمہاری اور بات ہے۔ تم مرد —— میں —— عورت۔ مرد تو سب کچھ کہہ دیتا ہے پر عورت ایسی بات اپنے آپ سے کہتے ہوئے بھی سرما جاتی ہے۔
ابراہیم :۔ کونسی بات۔
رانی :۔ یہی
ابراہیم :۔ یہی کونسی۔

رانی :۔ جس سے دل جور جور سے دھڑکنے لگتا ہے اور کون سی ؟

ابراہیم :۔ پیار کی بات نا

(رانی اثبات میں سر ہلا کر، شرما کر جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے)

رانی !

رانی :۔ میں نے کہا۔ بندے رکھ لو چھپا لو۔ اپنی ماں کو دے دو ۔ سنبھال کر رکھے۔

ابراہیم :۔ تم ہی رکھ لو۔

رانی :۔ نہ نہ ۔ بابا کی نظر پڑ جائے گی تو پوچھے گا رانی ! یہ بندے کہاں سے آئے۔ میں کیا جواب دوں گی ؟

ابراہیم :۔ کہنا ابراہیم نے دیئے ہیں۔

رانی :۔ توبہ میں اپنے بابا سے یہ بات کہہ سکتی ہوں بھلا۔ شرم کے مارے ڈوب نہیں جاؤں گی۔

(ابراہیم بندے ڈبے میں ڈالنے لگتا ہے۔

جانی اور شادو آتے ہیں۔ ابراہیم کے ہاتھوں میں تیزی آجاتی ہے۔ بڑی جلدی اس کام سے فارغ ہو جاتا ہے)

جانی :۔ کتنا نیک آدمی ہے۔

شادو :۔ فرشتہ ہے فرشتہ

رانی :۔ کون بابا !

جانی :۔ وہ جو یہاں آیا تھا اپنی موٹر کے لیے پانی لینے۔

شادو :۔ کہہ گیا ہے میرے بنگلے میں آنا۔

رانی :۔ جائیں گے۔

جانی :۔ کیوں نہیں۔ پتا بتا گیا ہے۔ رانی بیٹی ! وہ جلیبیاں لانا۔ ہمارا ابراہیم بھی کھائے گا (فیڈ آؤٹ)

(فیڈ ان)

سردار علی نواز کے بنگلے کا لان۔

سردار صاحب کوچ میں بیٹھے ہیں آگے ٹرالی۔ اس پر چائے کا سامان۔

حق نواز کرسی میں بیٹھ کر چائے بنا رہا ہے۔

(سردار صاحب اپنے بیٹے کی طرف اس انداز سے دیکھ رہے ہیں جیسے اپنے کسی سوال کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں)

سردار صاحب :۔ جواب کیوں نہیں دیتے ؟

حق نواز :۔ جواب کیا دوں ڈیڈی !

ہاتھ محنت کے لیے بنائے ہیں کشکول لے کر امیروں کے دروازے پر خیرات مانگنے کے لیے نہیں۔ میں جانتا ہوں آپ کہیں گے نئی نسل پرانی نسل کے راستے پر چلنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے۔ چلیے آپ یہی بات سمجھ لیں مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نئی نسل کے اپنے کچھ تجربات ہیں اور انہیں تجربات سے اس نے کچھ سیکھنے کی کوشش کی ہے۔

سردار صاحب:۔ تجربات ——— کون سے تجربات۔

حق نواز:۔ وہ تجربات جو آپ کے نہیں۔ ہمارے ہیں۔

سردار صاحب:۔ تم اپنے تجربات کے قیمتی اثاثے کو اپنے پاس رکھو۔ میرے معاملات میں دخل نہ دو۔

حق نواز:۔ ڈیڈی! وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آپ جو چاہیں کریں۔ میں کون ہوتا ہوں بدلنے والا۔ آپ نے میرا نظریہ پوچھا تھا وہ میں نے بتا دیا۔

(حق نواز جانے لگتا ہے)

سردار صاحب:۔ کہاں جا رہے ہو!

حق نواز:۔ ڈاک آگئی ہوگی ——— جواب لکھوانے ہیں۔

سردار صاحب:۔ جانی ابھی تک نہیں آیا۔

حق نواز:۔ دیکھتا ہوں ——— اگر آگیا ہے تو ادھر بھیج دوں گا آپ کے پاس

(جانی آرہا ہے)

لیجیے وہ آگیا ہے۔ آپ جانیں آپ کا کام۔

حق نواز چلا جاتا ہے۔

جانی:۔ سلام حجور!

سردار صاحب:۔ آؤ بابا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ آگے آؤ۔

(جانی آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے)

بیٹھ جاؤ۔

جانی:۔ جی

سردار صاحب:۔ بیٹھ جاؤ (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) ادھر۔

جانی:۔ جی مہربانی

(جانی کرسی کے بازو پر بیٹھ جاتا ہے)

سردار صاحب:۔ ارے ٹھیک طرح بیٹھو۔ خدا کی یہ مخلوق کتنی بدنصیب ہے۔

جانی :- (کرسی میں بیٹھ کر) بدنصیب — کون جی !

سردار صاحب :- بابا ! تمہاری عمر کتنی ہے ؟

جانی :- دو کم ستر سال

سردار صاحب :- ارسٹھ سال کی اس طویل عمر میں کبھی آرام بھی کیا ہے۔

جانی :- آرام — جی آرام ہی آرام ہے ۔

سردار صاحب :- کبھی پکنک منائی ہے ۔

جانی :- کیا جی !

سردار صاحب :- کبھی نہر کے کنارے بیٹھ کر اچھی اچھی چیزیں کھائی ہیں ؟

جانی :- اللہ میاں سوکھی روٹی دیتا ہے ، گھر میں بیٹھ کر مجے سے کھاتے ہیں ۔ نہر کے کنارے کیوں کھائیں ۔ کھانے پینے کے لیے تو گھر ہوتا ہے نا جی نہر کا کنارہ نہیں ۔

سردار صاحب :- تمہارا جی نہیں چاہتا کہ کام نہ کرو ۔ چند روز کے لیے کچھ آرام کرو ۔

جانی :- ایسا جی نہیں چاہتا ۔ ایک بار بیمار ہو گیا تھا جی تین دن کام نہ کر سکا ۔ آرام آیا تو میں نے صبح منہ اندھیرے اٹھ کر کام کیا اور رات تک کیا ساری کسر پوری ہو گئی ۔ کام تو ہماری ہڈیوں میں رس بس گیا ہے جی ۔ میری اولاد بھی کام کرتی ہے میری طرح ۔

سردار صاحب :- بابا ! انسان دنیا میں صرف کام کرنے کے لیے نہیں آرام کرنے کے لیے بھی آیا ہے ۔

جانی :- اچھا جی !

سردار صاحب :- مشین رات دن چلتی رہے تو خراب ہو جاتی ہے نا ۔

جانی :- ہو جاتی ہے ۔

سردار صاحب :- یہی حال انسان کا ہے ۔

جانی : آدمی کھراب ہو جاتا ہے ۔ پر میں تو ٹھیک ہوں جی ! کام میں مجا ملتا ہے جی ۔

سردار صاحب :- آرام کر کے دیکھو اس میں کیا مزا ملتا ہے ۔

جانی :- اچھا جی ۔ پر — گھر کا خرچ — میری رانی کی سادی — یہ سب کچھ کیسے ہوگا ۔

سردار صاحب :- سب کچھ ہو جائے گا اور بہت اچھی طرح ہوگا ۔ میں کروں گا ۔ ہر طرح تمہاری مدد کروں گا ۔ تمہیں آرام ملے گا ۔ راحت ملے گی ۔ زندگی کی نعمتیں ملیں گی ۔

ٹرالی پر ایک طرف کتاب پڑی ہے ۔ سردار صاحب کتاب الگ کر کے نیچے سے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہیں اور جانی کی طرف بڑھاتے ہیں ۔

یہ لو

جانی :۔ حیران ہوکر ، یہ کیا جی۔

سردار صاحب : تم لوگوں کے آرام کے لیے۔ مزے کرو۔

جانی :۔ آرام ——— مجھے ——— حضور ! میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔

سردار صاحب :۔ بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ پیلے کو دودھ دیا جاتا ہے اور وہ حیران ہو جاتا ہے۔

جانی :۔ دودھ ——— حضور ! یہ تو ——— نوٹ ہیں۔

سردار صاحب :۔ ہا ہا ! تم نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ ساری عمر آنکھوں پر محنت کی پٹی باندھ کر ایک ہی جگہ گھومتے رہے ہو۔ یہ ظلم ہے۔ قدرت کی نعمتوں میں تمہارا بھی حصہ ہے ——— تمہیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ پلنگ پر لیٹ کر آرام کرو۔ اچھا کھاؤ پیو۔ پیدل چلنے کی بجائے گاڑی میں بیٹھو۔ زمین پر بیٹھنے کی بجائے صوفے پر بیٹھو ——— آرام کرو۔ مزے کرو۔ اب محنت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ لے لو ——— تمہارے لیے ہیں۔ لے لو۔ دیکھتے کیا ہو۔ سوچتے کیا ہو۔ جب جی چاہے میرے پاس آؤ ——— میں ہر وقت تمہاری مدد کروں گا۔ میرے بنگلہ (BANGLOW) کا دروازہ تم پہ ہر وقت کھلا ہے۔ کھلا رہے گا۔ لے لو دیکھتے کیا ہو سوچتے کیا ہو۔

ڈزالو

جانی بابا کا گھر۔ جانی کھاٹ پر لیٹا ہے۔ اس کا ہاتھ آگے بڑھا ہوا ہے اور سردار صاحب نوٹوں کی گڈی اس کے حوالے کر رہے ہیں۔

سردار صاحب کی آواز آتی ہے۔

"یہ لے لو۔ لے لو۔ تمہارے لیے ہے۔ لے لو۔ دیکھتے کیا ہو۔ سوچتے کیا ہو" ——— رانی کی آواز آتی ہے۔

رانی :۔ بابا !

جانی خواب سے بیدار ہو کر آنکھیں ملتا ہوا انگڑائی لیتا ہے،

بابا ! کیا ہے آج

جانی :۔ کیا ہے۔

رانی :۔ ہائے سورج سر پر آگیا۔ تو تو منہ اندھیرے جاگا کرتا تھا۔ آج کیا ہو گیا ہے تجھے۔

جانی :۔ جاگا کرتا تھا۔

رانی :۔ تمہارا ساتھی تمہیں بار بار بلا رہا ہے۔

(کس قدر زور سے ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز آتی ہے)

یہ لو۔ کیا کر رہا ہے تو بابا!

بابا:۔ زخود کو چار پائی پر گرا کر آرام۔ بہت کام کیا اب جرا ——

رانی:۔ آرام کرو گے۔

بابا:۔ بڑا مزا آیا ہے۔ سردار صاحب ٹھیک ہی کہتا تھا۔ آرام میں بڑا مزا ملتا ہے

(ڈھینچوں، ڈھینچوں کی آواز)

رانی:۔ تو آرام کر رہا ہے —— اور یہ کیا کرے۔

جانی:۔ یہ بھی آرام کرے۔

رانی:۔ مرضی تمہاری

جانی:۔ سادو کہاں ہے؟

رانی:۔ دیکھتی ہوں۔

(رانی ایک طرف جاتی ہے۔ شادو شیشے کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں تھامے کنگھی سے بال سنوار رہا ہے
اور ساتھ ہی گاتا جا رہا ہے۔

وے منڈیا سیالکوٹیا —— وے منڈیا سیالکوٹیا)

رانی:۔ وے منڈیا سیالکوٹیا! جرا ادھر بھی دیکھ۔

شادو:۔ کیا ہے

رانی:۔ مستری کا آدمی آیا ہے کہتا ہے ابھی تک کام پہ نہیں آئے۔

شادو:۔ اسے کہہ دو

ہاتھ کو یوں جنبش دیتا ہے جیسے کہہ رہا ہو "بھاگ جائے"

رانی:۔ اچھا۔ تو بھی بابا کی طرح ——

شادو:۔ بابا آرام کرے گا اور میں ——

رانی:۔ تو کیا کرے گا؟

شادو:۔ میں کیا کروں گا —— اچھا یہ بتا۔ میں کیسا لگتا ہوں۔

رانی:۔ تو کیسا لگتا ہے —— تو لگتا ہے —— سچ بتا دوں تو لگتا ہے وہ —— جس کے سر پہ کلغی ہوتی ہے اور سینہ پھلا کر
کرتا ہے۔

(رانی مرغے کی طرح ککڑوں کوں "کہتی ہے)

شادو:۔ اے رانی کی بچی جانتی ہے مجھے —— تمہاری گردن سیکل کے ہینڈل کی طرح گھما دوں گا پھر تو رہ جائے گی

رانی :۔ اچھا اب میں ٹھیک بتاتی ہوں کہ تو کیسا لگتا ہے ——— وہ جو فلم میں یوں یوں کر کے
(رانی ہنس کر ہاتھ لہرا کر، سر جھکا کر، کمر لچکا کر کہتی ہے)
گاتا ہے نا۔ کیا کہتے ہیں اسے ——— بس بالکل ویسے لگتے ہو
شادو :۔ ساری جندگی میں تم نے ایک بار فلم دیکھی تھی ——— اب ہم تجھے دکھائیں گے
(ابراہیم آتا ہے)
اے تو بھی کام پر نہیں گیا۔
ابراہیم :۔ تو نہیں گیا۔
شادو :۔ میں گھر کی چیجیں لاؤں گا۔ بابا نے کہا ہے پہلے گا میرے ساتھ۔
ابراہیم :۔ تو چیجیں لانے کے لیے بال بھی سنوارنے پڑتے ہیں؟
رانی :۔ سیسے کے سامنے گا گا کر بال سنوارتا تھا۔
ابراہیم :۔ گا گا کر۔
رانی :۔ گاتا تھا۔ دے منڈیا سیالکوٹیا۔
(تینوں ہنس پڑتے ہیں۔ زور زور سے جانی کی آواز آتی ہے
"سادو")
(شادو چلا جاتا ہے)
شادو :۔ بابا بلا رہا ہے۔
رانی :۔ تو کام پر کیوں نہیں گیا
ابراہیم :۔ بابا نہیں گیا، سادو نہیں گیا۔ میں کیوں جاتا۔ کوئی فالتو ہوں۔
رانی :۔ کام پر نہیں جائے گا تو گجارہ کیسے ہو گا؟
ابراہیم :۔ اسے میرے گھر آئی نہیں اور بیویوں والے رعب جمانے لگی ہے۔
رانی :۔ میں نہیں رعب جماتی ——— اچھا یہ بتا بندے دے دیئے تھے ماسی کو
ابراہیم :۔ دے دیئے تھے۔
رانی :۔ اچھا کیا تھا۔ آج کام پر نہیں گیا۔ تو کرے گا کیا؟
ابراہیم :۔ کچھ نہ کچھ تو کروں گا نا۔ میں نے کہا رانی! یہ سردار صاحب تو بڑا ہی اچھا آدمی نکلا۔ پر بڑی دیر سے
آیا ہے۔ دو چار سال پہلے اس کی موٹر نے پانی کیوں نہیں مانگا تھا!
رانی :۔ سکر کرو آج مانگ لیا ہے۔
ابراہیم :۔ سکر تو بھی کر۔ اب ہمارا بیاہ دھوم دھام سے ہو گا۔ پر اس گھر سے تیری ڈولی نہیں جائے گی۔

رانی :۔ ہائے میرے اللہ۔ ڈولی نہیں جائے گی ۔
ابراہیم :۔ موٹر جائے گی اور موٹر کے اندر رہوگی ـــــ میری رانی ۔
رانی :۔ تو ۔ میرا تو دل دھک دھک کرنے لگ گیا ۔
ابراہیم :۔ تیرا دل تو یوں ہی دھک دھک کرنے لگتا ہے ۔

(شادو آتا ہے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی)

شادو :۔ چلو
رانی :۔ شہر جاؤ گے ۔ میرے لیے کیا لاؤ گے ۔
شادو :۔ لے آئیں گے جسے تو بہت پسند کرتی ہے ۔

(شادو اور ابراہیم قدم اٹھا رہے ہیں)

رانی :۔ کیا بھلا ۔
شادو :۔ دو پیسے کی میٹھی میٹھی جلیبیاں ۔

(شادو اور ابراہیم ہنستے ہیں)

ڈزالو

(شادو اور ابراہیم ایک بازار میں سے گزر رہے ہیں۔ شادو نے نوٹ ہاتھ میں پکڑ رکھے ہیں۔ شوکت نوٹ دیکھ لیتا ہے۔ آگے آتا ہے)

شوکت :۔ سلام علیکم چودھری صاحب !
شادو :۔ تو ـــــ آپ ـــــ
شوکت :۔ میں ہوں ایم شوکت علی بھول گئے ۔ پرسوں تم نے میری سائیکل ٹھیک کی تھی۔ کیا کمال کے کاریگر ہو پرانی سائیکل کو نئی سائیکل بنا دینا تمہاری کاریگری ہے ۔ واہ وا ـــــ سبحان اللہ کاریگر ہو تو ایسا ہی ہو۔
شادو :۔ سیکل ٹھیک کرنا تو ہمارا کام ہے شوکت صاحب جی ۔
شوکت : ٹھیک کرنے اور بالکل ٹھیک کرنے میں بڑا فرق ہے ۔ واللہ تم نے تو جان ڈال دی ہے۔ میری پرانی سیکل ہے ـــــ میں کوئی خدمت کر سکتا ہوں۔
شادو :۔ مہربانی
شوکت :۔ نرمی مہربانی نہیں چلے گی۔ کوئی خدمت بتاؤ۔ ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں ۔
ابراہیم :۔ ہم جرا چیجیں کھریدیں گے ۔
شوکت :۔ کیا چیزیں !

ابراہیم:۔یہی کچھ برتن۔چائے پینے والی چیزیں،کرسیاں میزیں اور وہ کیا ہوتا ہے۔صوفہ
شوکت:۔صوفہ نہیں صوفہ
شادو:۔اور بھی کچھ۔
ابراہیم:۔ہاں اور بھی کچھ۔
شوکت:۔آج یہ ٹھاٹ باٹ!
شادو:۔سردار صاحب نے روپے دیئے ہیں۔جرا اچھی جندگی گجارنے کے لیے۔
شوکت:۔سردار صاحب کون!
شادو:۔وہ جی ——جنہوں نے اپنی موٹر کے لیے ہم سے پانی مانگا تھا۔بابا کہتا ہے سہر میں ان کی بڑی شاندار کوٹھی ہے کارکھانہ ہے۔بڑے ہی امیر آدمی ہیں۔
ابراہیم:۔ہماری حالت دیکھی تو رحم آگیا۔بولے جب جرورت ہو روپے لے جاؤ آکر۔
شوکت:۔تو اب تم اچھی زندگی گذارنے کا بندوبست کر رہے ہو۔
ابراہیم:۔جی ہاں۔
شوکت:۔دیکھو تمہاری حجامت بن جائے گی۔
شادو:۔حجامت! جی ہم نائی کی دکان پہ تو نہیں جا رہے۔گھر کا سامان خریدنے جا رہے ہیں۔
شوکت:۔بڑے بھولے بھالے ہو۔حجامت کا مطلب ہے دکاندار تمہیں بھولے بھالے پاکر ایک دم لوٹ لیں گے
شادو:۔کیا دکانوں میں ڈاکو بیٹھے ہوتے ہیں۔
شوکت:۔ڈاکو تو نہیں ہوتے مگر گاہک جب خود کہے مجھے لوٹ لو تو پھر انہیں لوٹ لینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیتے ہیں۔
ابراہیم:۔ہم کوئی بچے تھوڑے ہیں۔
شوکت:۔ایسی بات نہیں۔تم لوگوں کو خرید و فروخت کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔
شادو:۔ابراہیم! یہ ٹھیک کہتا ہے۔
ابراہیم:۔پھر کیا کریں۔
شوکت:۔مجھے آج بہت ضروری کام ہے ورنہ میں چلتا تمہارے ساتھ۔کیا مجال جو کوئی دکاندار تم سے ایک پیسہ بھی زیادہ وصول کرتا۔سستی چیزیں خریدنے میں مجھے بڑا تجربہ ہے۔لیکن مصیبت یہ ہے کہ آج ایک نہیں کئی کام ہیں اور بیحد ضروری ——
ابراہیم:۔مہربانی کیجئے۔

شوکت:۔ کیا کیا جائے۔ کام بھی بہت ضروری ہے اور ادھر تمہارا معاملہ بھی بڑا ضروری ہے ——
(سوچ کے عالم میں ماتھے پر انگلیاں مارتے ہوئے)
اچھا آج اپنا نقصان ہی سہی مگر یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ تم لُٹتے جاؤ اور دکاندار دو آنے کی چیز دو روپے میں بیچ دے۔

شادو:۔ دو آنے کی چیز دو روپے میں

شوکت:۔ کچھ اس سے بھی زیادہ ہی سمجھو۔ چلو بھائی انسان کو شریف آدمی کے لیے قربانی کرنی ہی چاہیئے۔ چلو آج میرا کوئی کام نہیں ہوگا۔

○

ایک ہوٹل۔ ہنگامہ۔ شوکت۔ شادو اور ابراہیم ایک میز کے سامنے بیٹھے ہیں۔
میز پر خالی گلاس بوتلیں۔ شادو اور ابراہیم لٹتے ہیں۔

شادو:۔ ابراہیم!

ابراہیم:۔ میری سرکار!

شادو:۔ وہ سردار کیا کہتا تھا۔

ابراہیم:۔ کہتا تھا مجے کرو۔

شادو:۔ مجے کرو

ابراہیم:۔ مجے کرو —— اور ہم ——

شادو:۔ مجے کر رہے ہیں۔ آ ہا ہا۔ وے منڈیا سیالکوٹیا —— وے منڈیا سیالکوٹیا
ایک شخص شوکت کی طرف جھک کر۔

وہ شخص:۔ یہ سیالکوٹی منڈے کہاں سے لے آئے ہو!

شوکت:۔ اللہ رازق ہے۔ اسے رزق دیتے دیر نہیں لگتی۔ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔

وہ شخص:۔ یار! میری جھونپڑی کی چھت بھی تو کچھ مضبوط نہیں ہے۔

شوکت:۔ تماشا دیکھو۔ (شادو سے) چودھری صاحب۔

شادو:۔ کیا ہے۔

شوکت:۔ اس شخص کی طرف اشارہ کر کے یہ بھی اپنا سیالکوٹی منڈا ہے۔ وہ —— وے منڈیا سیالکوٹیا۔

شادو:۔ ہنس کر ہماری طرح۔

وہ شخص:۔ جی ہاں۔

شوکت :۔ ذرا اس پر بھی کرم کی نظر ہو جائے۔

شادو :۔ جرور ہوگی۔ جرور ہوگی۔

وہ شخص :۔ سخی داتا ہو تو ایسا ہو۔ کمال ہے بھئی۔

○

بابا جانی کا گھر صحن میں ایک طرف رانی اور ابراہیم کی ماں۔
بابا جانی دروازے میں سے اندر آ رہا ہے۔

ماں :۔ کچھ پتہ چلا۔

جانی :۔ نہیں۔

ماں :۔ کہاں گئے اتنی رات ہو گئی ہے

رانی :۔ پچھیں گھر دینے کا تجربہ نہیں ہے۔ دیر ہو گئی۔

ماں :۔ کیا بات کرتی ہے رانی۔ تجربہ نہیں ہے تو اس کے لیے پورا دن چاہیئے۔ میرا ابراہیم تو صبح ہی صبح نکلا تھا سارا دن بیت گیا اب رات بیت رہی ہے۔

رانی :۔ سادو کے ساتھ ہی گیا تھا۔

ماں :۔ ڈر لگتا ہے۔ زمانہ بڑا ناجک ہے۔ کسی نے پھانس نہ لیا ہو۔

رانی :۔ واہ ماسی! انہیں بھلا کون پھانس سکتا ہے۔

ماں :۔ تو نہیں جانتی رانی! گھر میں بیٹھنے والی لڑکی ہے باہر جانے کا رنگ اور ہے۔

جانی :۔ جمانے کا رنگ اور ہے تو ہوتا پھرتے۔ سادو اور تیرے بیٹے کا رنگ بھی کوئی کچا نہیں ہے کہ اتر جائے گا کیوں بابا۔

جانی :۔ اتنی دیر لگنی نہیں چاہیئے۔

ماں :۔ رانی تیرا بابا بھی ساتھ چلا جاتا تو اچھا تھا۔

رانی :۔ ماسی کمال کرتی ہو۔ جیسے وہ بچے ہیں اور بابا ان کی انگلی پکڑ کرے جاتا۔

باہر سے شادو کی آواز آتی ہے۔ وے منڈیا سالکوٹیا، تینوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ جانی باہر جانے لگتا ہے وہ دونوں ہی اس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھاتی ہے۔

○

(گھر سے باہر، شادو، ابراہیم اور شوکت کھڑے ہیں۔ دور ٹیکسی جا رہی ہے۔)

شوکت :۔ اب جاؤ گھر میں۔

شادو :۔ گھر ہیں۔ کیوں!

ابراہیم :۔ ہاں — کیوں!

شوکت :۔ آج کا کھیل ختم۔ کل نیا کھیل شروع ہوگا۔ ایک ٹکٹ میں کئی مزے ہوں گے! آج اتنے مزے ہی کافی ہیں۔

شادو :۔ ایک ٹکٹ میں کئی مزے۔

ابراہیم :۔ چل سادو۔

سادو : چل رے ابراہیم۔

(دونوں کے قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ جانی آتا ہے)

جانی :۔ سادو!

شوکت :۔ (جلدی سے) سلام علیکم چاچا! طبیعت ٹھیک ہے نا۔ آپ کی اولاد آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

(شوکت تیزی سے جانے لگتا ہے)

جانی :۔ ٹھہرو کون ہو تم۔

شوکت :۔ شوکت

جانی :۔ انہیں کہاں سے لائے ہو۔

شوکت :۔ یہ خود بتائیں گے — میں چلا۔

جانی :۔ (شوکت کا ہاتھ پکڑ کر) ٹھہر جا کمینے! سمجھتا ہے میں بوڑھا ہوں۔ پر میرے ہاتھوں میں اتنا جور ہے کہ تیری ہڈیاں توڑ ڈالوں گا۔ میرے بچوں کو تباہی کے رستے پہ لگا رہا ہے۔

شوکت :۔ بابا! میری ہڈیاں کیا توڑے گا۔ کئی بار ٹوٹی اور کئی بار جڑی ہیں۔ سے تو بھی توڑے ویسے میری بات ذرا غور سے سن لو۔ ان کی اپنی آنکھیں ہیں۔ راستہ دیکھ سکتے ہیں۔

جانی :۔ تو انہیں لے کر گیا ہے

شوکت :۔ بابا! مجھ پر شہد نہیں لگی کہ انہیں اپنے ساتھ چپکا لیتا اور نہ یہ دودھ پیتے بچے ہیں کہ انہیں گود میں اٹھا لیتا —

(جانی شوکت کا گریبان پکڑ لیتا ہے)

جانی :۔ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ تو انہیں کھراب کر رہا ہے۔ تجھے جندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کمینے۔ پاجی۔ جلیل آدمی۔

(رانی اور ماں بھاگ کر آتی ہے)

رانی :۔ بابا!

ماں :۔ جانی!

(رانی اور ماں جانی کا ہاتھ کھینچتی ہے)

رانی :- بابا! چھوڑ دو۔ مرجاؤں گا تو ۔۔ خدا کے لیے بابا! چھوڑ دو

(بابا شوکت کا گریبان چھوڑ دیتا ہے۔ شوکت بھاگنے لگتا ہے)

شادو :- (ہنس کر) کھیل ختم۔

ابراہیم :- ختم! مجا نہیں آیا۔

شادو :- (لڑکھڑاتے) ہوئے) مجا نہیں آیا۔

جانی :- دیتا ہوں تجھے مجا۔

(جانی بیٹے کے گال پر کس کر تھپڑ مارتا ہے۔)

شادو :- بابا آج اتنے جور سے پیار کرتے ہو۔

جانی :- یہ پیار کیا ہے میں نے

شادو :- بابا! تو مجھے پیار ہی کیا کرتا ہے۔

جانی :- یہی ہونا تھا ۔۔ گُسّے کو پیار کہتا ہے۔

رانی :- بابا! اندر چلو۔ (شادو سے) چل سادو آنے جانے والے کیا کہیں گے۔

جانی :- کسی جنگل سے تو نہیں سہر سے آئے ہیں۔ لوگوں نے دیکھا نہیں ہوگا انہیں۔

ماں :- چل ابراہیم! چل! تو لڑکھڑا رہا ہے۔ میں دکھ سے گر ہی نہ پڑوں۔

ہیڈ آؤٹ ۔۔

فیڈ ان خاموش مناظر۔ شادو اور ابراہیم ہوٹل میں۔ شوکت ان کی جیبوں سے پیسے نکالتا ہوا ہوٹل سے لڑکھڑا کر نکلتے ہوئے۔ گھر کے دروازے پر۔

پھر جانی کے گھر کے صحن میں شادو اور رانی )

شادو :- میں کیا کہہ رہا ہوں تجھ سے۔

رانی :- کیا کروں سادو! میں کیا کروں؟

شادو :- لاؤ ۔۔

رانی :- کہاں سے لاؤں۔ بابا سردار صاحب کے پاس گیا ہوا ہے۔

شادو :- میں کب تک اس کے آنے کا انتجار کرتا پھروں۔ مجھے جانا ہے

رانی :- سادو تو تو میرے لیے پیسے جوڑتا رہتا تھا۔ کپڑوں کے لیے جیور کے لیے آج مجھ سے مانگتا ہے۔

شادو :- اور کس سے مانگوں تیرے پاس ہیں۔

رانی :۔ سادو تو کہتا تھا تیری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگی۔ میری انگلی جو جل گئی تھی تو تو بڑا گھبرا گیا تھا۔
بھول گیا یہ باتیں۔ سادو بھیا! میں تیری رانی۔ تیری ماں جائی تجھ سے پوچھ رہی ہے —— تو بھول گیا پچھلی باتیں
تیرا بھائی کا پیار کدھر گیا۔ تو کہاں جا رہا ہے سادو۔ تو کہاں چلا گیا ہے سادو۔ میرے ویرا!

شادو :۔ رانی! مجھے دھوکا نہ دے مجھے پیسوں کی جروررت ہے۔ پیسے دو۔ دو پیسے۔

رانی :۔ سادو!

شادو : میں کیا کہہ رہا ہوں رانی! جلدی کر۔

(رانی دوپٹے کی گرہ کھولتی ہے۔)

رانی :۔ آج ہانڈی کے لیے بابا یہ پیسے دے گیا ہے۔

شادو :۔ دو

(شادو رانی سے پیسے چھین لیتا ہے اور جلدی سے نکل جاتا ہے۔)

○

ابراہیم کا گھر۔ ماں سامنے

ابراہیم :۔ ماں! مجھے جلدی جانا ہے

ماں :۔ کہاں جانا ہے۔

ابراہیم :۔ تجھے یہ پوچھنے کیا جرورت ہے۔ جو کچھ ہے دے دے۔

ماں :۔ کیا دوں۔ کہاں سے دوں! جو کچھ مجھے دیا تھا تو لے چکا ہے۔

ابراہیم :۔ تیرے پاس کچھ نہیں۔

ماں :۔ کچھ نہیں۔

(ابراہیم کچھ سوچنے لگتا ہے)

ابراہیم :۔ ماں وہ دے دے۔

ماں :۔ کیا!

ابراہیم :۔ وہ بندے!

ماں :۔ ابراہیم!

ابراہیم :۔ دے ماں!

ماں :۔ وہ تو امانت ہے رانی کی، اس کا تو دشمن نہ بن۔ ابراہیم کتنے سوق سے کھرید کر لایا تھا اور آج مانگ رہا ہے
سراب پینے کے لیے سرم کر ابراہیم، میں نہیں دوں گی۔

ابراہیم :۔ اور آجائیں گے۔

ماں :۔ ابراہیم ! کتنا نیچ ہو گیا ہے تو۔

ابراہیم :۔ مجھے کیا ہوا ہے اور کیا نہیں ہوا۔ مت سوچ۔ بندے حوالے کر۔ ماں میرا وقت نہ ضائع کر۔ میں بندے کر جاؤں گا۔ میں ٹرنک کا تالہ توڑ ڈالوں گا۔

ماں :۔ ٹرنک کا تالہ توڑ دو گے۔

ابراہیم :۔ توڑ ڈالوں گا۔ ابھی توڑتا ہوں ــــ تو مانتی نہیں۔

ابراہیم ایک طرف جانے لگتا ہے ماں وہیں کھڑی رہتی ہے۔ ٹھک ٹھک کی آواز آنے لگتی ہے۔
ماں کی آنکھیں پر نم ہو جاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہے ــــ

ماں :۔ ابراہیم ! خدا کے لیے۔ ابراہیم !

( ماں آگے بڑھ کر دیکھتی ہے ابراہیم ٹرنک کا تالا توڑ چکا ہے۔
اس میں سے بندے نکال لیتا ہے۔ بندے اس کے ہاتھ میں ہیں۔
کیمرہ ہاتھ کا کلوز اپ لیتا ہے
ماں کی آواز آتی ہے۔

ہوتی ہے۔ ابراہیم خدا کے لیے ــــ ابراہیم ــــ ابراہیم "۔ آواز ختم ہو جاتی ہے۔ ہاتھ کا کلوز اپ بدستور رہتا ہے۔ ایک اور ہاتھ بڑھتا ہے بندے لے کر نوٹ رکھ دیتا ہے۔
کیمرہ اسی طرح ہاتھ کا کلوز اپ دکھا رہا ہے۔ اب پس منظر میں ہوٹل کا شور و غوغا ابھر رہا ہے۔
ایک اور ہاتھ بڑھتا ہے نوٹ لے کر ان کی بجائے بوتل تھما دیتا ہے۔

○

ہوٹل ــــ ابراہیم بوتل میں سے گلاس میں شراب انڈیل رہا ہے۔ شادو اپنا گلاس لے کر اس کی طرف آتا ہے۔
شادو کے چہرے پر لجاجت، مسکینی، التماس ہے۔
ابراہیم اثبات میں سر ہلاتا ہے
شادو کا چہرہ کھل اٹھتا ہے

○

جانی بابا کا گھر۔

رانی کے سامنے شادو کھڑا ہے اور بڑے غصے سے دیکھ رہا ہے۔

رانی :۔ میں کہاں سے لاکر دوں
شادو :۔ بابا سے لاؤ۔
رانی :۔ بابا کہاں سے لائے !
شادو :۔ بابا لایا ہے۔
رانی :۔ کہاں سے لایا ہے۔ میں نے تجھے بتایا نہیں۔ سردار صاحب مر گیا ہے اور اس کے بیٹے نے کہا ہے۔ جاؤ میں ایک دمڑی نہیں دوں گا۔ اب وہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ صاف جواب مل گیا ہے۔

(ابراہیم آتا ہے)

ابراہیم :۔ شادو ! کیا ہوا ہے۔ آیا کیوں نہیں۔ میں تیرا انتجار کرتا رہا ہوں۔
شادو :۔ کیسے آتا !
ابراہیم :۔ کیوں۔
شادو :۔ پیسے نہیں ہیں۔
ابراہیم :۔ پیسے نہیں ہیں۔ کل میرے پلے سے پی۔ آج اپنی باری ہے تو کہتا ہے پیسے نہیں ہیں۔
شادو :۔ رانی ! تیرے پاس ہے کچھ ؟
ابراہیم :۔ رانی سے کیا پوچھتا ہے سیدھی طرح چل۔
شادو :۔ پیسے مل جائیں تو چلتا ہوں۔
ابراہیم :۔ میں اس کا حصے دار نہیں ہوں۔ کل مجھ سے پی۔ آج مجھے پلا۔
شادو :۔ پلاؤں گا۔
ابراہیم :۔ چل پھر دیکھتا کیا ہے۔
شادو :۔ رانی !
رانی :۔ میرے پاس کیا ہے جو دوں۔
ابراہیم :۔ اس سے کیا مانگتا ہے۔ پلا نہیں سکتا تھا تو پی کیوں تھی۔ دھوکہ دے رہا ہے۔ دھوکے باج
شادو :۔ دھوکے باج تو ہے۔ خبردار جبان سنبھال کر بات کر۔ میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔
ابراہیم :۔ میں تو کہوں گا دھوکا باج ——— دھوکا باج۔ اول نمبر کا دھوکا باج
شادو :۔ دھوکا باج تو ہے۔
ابراہیم :۔ تو ہے۔

شادو :۔ تو ہے!

(شادو اور ابراہیم غصے میں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں۔
رانی پکارتی ہے، بابا۔۔ بابا! خدا کے لیے آؤ
بابا جانی بھاگ کر آتا ہے۔ اور دونوں کے درمیان آکر کھڑا ہو جاتا ہے)

جانی :۔ مارو مجھے ۔۔ اک دوجے کو مارو گے وہ مار بھی مجھ پر پڑے گی تو سیدھی طرح مارو۔ مارو
(دونوں کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔)

کیوں اب مارتے کیوں نہیں۔

رانی :۔ بابا! یہ کیا ہو رہا ہے

(رانی سر پکڑ کر کھاٹ پر گر پڑتی ہے۔ بابا، رانی کہکر اس کی طرف بڑھتا ہے۔۔ ابراہیم اور شادو قدم اٹھانے لگتے ہیں)

O

ہوٹل کا دروازہ ۔۔ جو بند ہے

ابراہیم اس پر زور زور سے دستک دے رہا ہے۔ شادو مکے مار رہا ہے۔

شادو :۔ درواجہ کھولو۔

ابراہیم :۔ کھولو

شادو :۔ کھولتے کیوں نہیں ۔۔

(شوکت آتا ہے۔)

شوکت :۔ اب یہ نہیں کھلے گا۔

شادو :۔ کیوں نہیں کھلے گا۔

شوکت :۔ نہیں کھل سکتا ۔۔ تمہارا اَن داتا مر گیا۔ اب کون دے گا گھر میں بٹھا کر، جاؤ بھاگو۔ یہ دروازہ ان کے لیے کھلتا ہے جن کی جیبیں بھری ہوتی ہیں ۔۔ خالی جیبوں کے لیے کوئی جگہ نہیں!۔ کوئی جگہ۔

شادو اور ابراہیم قدم اٹھانے لگتے ہیں۔

O

(بابا جانی کے گھر کے دروازے کے باہر
گدھا درخت سے بندھا ہے۔ جانی اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہے)

جانی :۔ معاف کر دے میرے ساتھی! میں نے تجھے چھوڑ دیا اور کھراب ہوا۔ اب پھر ہم اک دوجے کا ساتھ دیں گے

کیمرہ ابراہیم اور شادو کو فوکس میں لیتا ہے۔ جو ایک طرف کھڑے ہیں۔

جانی کی آواز آتی ہے

جانی:۔ اب میں تیرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ ہم دونوں کام کریں گے جس طرح پہلے کیا کرتے تھے۔

شادو اور ابراہیم قدم اٹھانے لگتے ہیں۔

کٹ

گھر کے اندر۔ صحن میں رانی اور ابراہیم کی ماں دونوں چکی پیس رہی ہیں۔

ماں گندم ڈال رہی ہے اور رانی چکی چلا رہی ہے۔ رانی اور ماں کے ہاتھ یکایک رک جاتے ہیں۔ دونوں ایک طرف دیکھتی ہیں۔

شادو اور ابراہیم کھڑے ہیں۔ اور یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ رانی اور ماں دوسرے لمحے پھر کام میں مشغول ہو جاتی ہیں۔

کیمرہ شادو اور ابراہیم کے چہروں پہ جاتا ہے دونوں ٹکٹکی باندھ کر رانی اور ماں کو دیکھ رہے ہیں ۔۔۔ چہروں پر پچھتاوے کا تاثر۔

○

# جھیل کے اندر جھیل کے باہر

## اعجاز حسین بٹالوی

اکرم کو کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وطن سے ہزاروں میل دور وہ کسی پاکستانی لڑکی پر بھی عاشق ہو سکتا ہے۔ امریکی لڑکی کی دوستی تو اداسی کی کڑی دھوپ میں جادوؤں کی بدلی کی طرح ہوتی کہ دیکھتے دیکھتے آئی اور برس کر چلی گئی یا تنہائی کے چولہے میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور گزر گیا لیکن اس عشق کا جادو تو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

اسے اٹھتے بیٹھتے نزہت کا خیال رہنے لگا۔ کالج کی لائبریری میں کام کرتے ہوئے کھیل کے میدان میں سونے سے پہلے یا صبح سو کر اٹھتے ہی اسے نزہت کا خیال آ جاتا کہ اس وقت بھلا کیا کر رہی ہوگی۔ جی چاہنے لگتا کہ اسے ٹیلیفون کرے اس کا حال پوچھے مگر پھر وہ سوچتا ابھی تو کل رات اس سے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔

آج سے چند ماہ پہلے جب اکرم نے مردہ خانے کی پارٹ ٹائم نوکری کی تھی تو رات کو مردہ خانے کی خاموشی اور تنہائی میں کبھی کبھی ایک بے نام سے خوف کی سنسناتی ہوئی لہر اس کے سارے جسم سے گزر جاتی کبھی کبھی اس سنسنی کے ساتھ اس کا جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگ جاتا مگر پھر اس نے آہستہ آہستہ اس خوف پر قابو پا لیا۔ اب مردہ خانے کی ملازمت اس کی زندگی کا اسی طرح معمول بن گئی تھی جس طرح کالج کی لائبریری، کامن روم یا کیفے ٹیریا وہ دن بھر جیسے ان جگہوں میں گھومتا رات کو مردہ خانے کی ملازمت کرتا تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے آج تک کئی ملازمتیں کی تھیں مگر اس سے بہتر ملازمت کہاں مل سکتی تھی۔ اول تو ہفتے میں صرف چار دن کام کرنا پڑتا اور تنخواہ عام ملازمتوں سے دو تین گنا زیادہ ملتی تھی اور رات کو کام ہی بھلا کیا ہوتا۔ مردہ خانے کے استقبالیہ کمرے میں ٹیلی فون والی میز کے قریب اس کی کرسی پڑی ہوتی۔ ساتھ ہی چند کرسیاں اور صوفے رکھے رہتے تھے۔ رات کو نو بجے سے صبح آٹھ بجے تک اس کی ڈیوٹی ہوتی، اور شروع شروع میں تو نزہت کے ٹیلی فون کی توقع بھی نہ ہوتی تھی کہ دل ہی بہلا رہے۔

شام کو نو بجنے تو بجے جب وہ مردہ خانے میں اپنی ڈیوٹی پر آتا تو مردہ خانے کا اکثر کام ختم ہو چکا ہوتا۔ کبھی کبھار اگر کوئی ایمرجنسی کا کیس آ جاتا تو مردوں کی تزئین اور آرائش کا اسٹاف اپنے کمرے میں مصروف ہوتا۔ ڈائرکٹر کی سارے علاقے میں شہرت تھی کہ مردے کو سنوارنے، چہرے پر ہلکی پرسکون مسکراہٹ لانے اور رالوہیت کی معصومیت پیدا کرنے میں جیسا ید طولےٰ اسے حاصل ہے اس کا ثانی اس علاقے میں کوئی نہیں۔ اسی لیے فیس اس کی بہت زیادہ تھی۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ کسی موٹر یا ٹریفک کے حادثے میں مر جانے والے کے لواحقین کسی بری طرح کچلے ہوئے مردے یا خودکشی کے بعد مسخ شدہ چہرے والی لاش کو اس کے حوالے کرتے تو وہ اسے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے لیے سچ مچ کا چیلنج سمجھ کر اس پر جت جاتا اور چند دنوں کے اندر اندر مردے کو اس طرح بنا سنوار دیتا کہ تدفین سے پہلے اس کے لواحقین جب اسے دیکھتے تو سینکڑوں ڈالر کے

بل کو اس کی محنت کا جائز معاوضہ سمجھ کر ادا کرنے میں کوئی پس پیش نہ کرتے۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کے ثبوت کے لیے اس نے بعض ایسے مردوں کی تصویریں آرائش اور درستگی سے پہلے اور آرائش اور درستگی کے بعد رنگ دار فلم سے اتار کر مردے خانے کی البم میں لگا رکھی تھیں۔ مس مارجری جانسن جو ڈائرکٹر کے زیر تربیت تھیں اور مردے سنوارنے کا کام سیکھ رہی تھیں اس کی غیر موجودگی میں ڈائرکٹر کی اس قدر تعریف کرتیں اور کہتیں کہ اس فن میں خدا نے انہیں وہ صلاحیت عطا کی ہے جو محض مشق سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ اپنی انگلیوں کو دیکھتیں اور کہتیں خدا ہر ایک کو تو ڈائرکٹر جیسی آرٹسٹک انگلیاں نہیں دیتا۔

مردہ خانے کا مستقل سٹاف زیادہ نہیں تھا۔ ڈائرکٹر کے ساتھ کام کرنے والے تین اسسٹنٹ تھے مس مارجری جانسن ان کے علاوہ تھیں۔ ایک اکاؤنٹنٹ تھا۔ دو صفائی کرنے والے تھے جو جز وقتی ملازم تھے۔ تابوت بنانے والے اور گل فروش سے باندھ لگی ہوئی تھی۔ تابوت بنانے والے ٹیلی فون پر ہدایات لے کر ایک آدھ روز میں تابوت تیار کر دیتے ویسے مردہ خانے کے صاف ستھرے گودام میں ہر قیمت کے چند ایک تابوت تیار شدہ حالت میں ہر وقت رکھے رہتے جو لواحقین کو دکھا دیئے جاتے البتہ اگر کوئی خاص آرڈر ہوتا یا کوئی بیش قیمت تابوت تیار کروانا پڑتا یا اس میں کوئی خاص ریشم یا مخمل لگوانا پڑتا تو ٹیلی فون پر آرڈر دے دیا جاتا۔

شہر کی سب سے بڑی گل فروش فرم سے حساب چلتا تھا ضرورت کے مطابق علی الصباح یا سر شام انہیں فون کر دیا جاتا کہ فلاں رنگ اور فلاں قسم کے اتنے پھول وقت پر پہنچا دیئے جائیں اور گلفروش کی وین گاڑی عین اسی طرح کے پھول پہنچا دیتی اور بعض اوقات تو امیر مردے کے لواحقین تابوت کو آرکیڈ کے پھولوں سے لاد دیتے جن کی ایک ایک پھول کی قیمت تین تین چار چار ڈالر سے کم نہ ہوتی تھی۔

دو تین پادری صاحبان سے بھی مردہ خانے کا ٹھیکہ تھا۔ مردے یا اس کے لواحقین کے مذہب کے مطابق سروس کا انتظام کیا جاتا۔ اسی فرقے کے پادری کو پہلے سے اطلاع کر کے سروس کا وقت مقرر کیا جاتا اور پھر سروس والے روز مردے کو بنا سنوار کے تابوت کو پھولوں سے سجا کر اس کمرے میں پہنچا دیا جاتا جو عبادت گاہ کہلاتا تھا۔ وقت مقررہ پر مرحوم کے لواحقین اور دوست احباب مرحوم کی آخری زیارت کے لیے آنا شروع ہو جاتے۔ مردہ خانے کے باہر کاروں کی قطار لمبی سے لمبی ہوتی چلی جاتی۔ مردے لمبے کالے فراک کوٹ اور دھاری دار پتلونیں پہنے عورتیں کالے خوبصورت ڈریس زیب تن کئے اور چہرے پر سیاہ جالی دار نقاب ڈالے آنی شروع ہو جاتیں۔ مس مارجری جس کے پاس موسیقی کے مقامی کالج کا ڈپلوما بھی تھا بیوپل ہوم کی ایک اور خدمت بھی بجا لاتی تھیں۔ لواحقین کی ہدایت اور پسند کے مطابق مطلوبہ موسیقی کا انتظام بھی انہیں کے ذمے تھا۔ عبادت گاہ کے ایک نیم تاریک کونے میں ایک بیش قیمت آرگن رکھا تھا اور جتنے عرصے کے مطلوبہ موسیقی درکار ہوتی اس کا معاوضہ الگ سے بل میں جمع کر دیا جاتا۔ مس مارجری اس روز ایک خوبصورت سیاہ لباس پہنتیں اور چہرے پر ایک اداس اور حزن آمیز سنجیدگی لیے آرگن کے سامنے سٹول پر بیٹھ کر ایک دل گداز موسیقی فضا میں بکھیر دیتیں۔

پادری صاحب عین وقت پر اپنے مخصوص لباس میں نمودار ہوتے اور مرحوم اور لواحقین کے فرقے کے مطابق آخری رسومات ادا کرتے۔ ان کی خدمات کا حقِ خدمت بھی بل میں شامل ہوتا اور مہینے کے ختم ہونے پر ہر ایک کا چیک شکریے کے رسمی خط کے ساتھ انہیں بھیج دیا جاتا۔ یہ سب کام اکاؤنٹنٹ کے ذمے تھا۔

امریکہ کی اس عجیب و غریب کائنات میں اکرم کا داخلہ محض اتفاق تھا اس نے پچھلی چھٹیوں میں جیب خرچ اور یونیورسٹی کا خرچ نکالنے کے لیے دو نوکریاں کی تھیں۔ پہلی ملازمت ڈاک خانے کی تھی اور دوسری ایک سٹور میں لیکن دونوں میں وقت اتنا لگتا تھا کہ پڑھائی کے لیے زیادہ وقت نہ بچتا چھٹیوں کے بعد جب یونیورسٹی کھلی تو مقامی اخبار میں ایک اشتہار اس کی نظر سے گزرا جس میں لکھا تھا کہ بیریل ہوم میں ایک نوجوان کی ضرورت ہے جس کی ملازمت صرف رات بھر کی ہوگی اور کام بھی ہفتے میں صرف چار روز کا ہوگا۔ باقی تین راتوں کے لیے دوسرا ملازم پہلے سے موجود ہے۔ اکرم کی نظر جب تنخواہ پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ یہاں ہفتے بھر کی تنخواہ دوسری ملازمتوں کی مہینے بھر کی تنخواہ کے لگ بھگ تھی۔ اکرم یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی وہاں پہنچ گیا۔ ڈائریکٹر نے اپنے کمرے میں ملاقات کے لیے طلب کیا اور یہ جان کر کہ وہ یونیورسٹی میں ریسرچ کا طالب علم ہے اور یوں بھی چہرے مہرے سے ذمہ دار اور خوش وضع لگتا ہے اسے ملازم رکھ لیا۔

ملازمت میں کام ہی کیا تھا۔ رات بھر مردہ خانے کی حفاظت، ریسپشن روم میں موجودگی۔ ٹیلی فون سننا مطلوبہ اطلاعات بہم پہنچانا یا ہدایات موصول کرنا اور ڈائریکٹر کے لیے ضروری پیغامات ایک خاص کتاب میں درج کرتے جانا اکرم نے پہلے ہی انٹرویو میں ڈائریکٹر سے پوچھا کہ اگر میں رات کو اپنی کتابیں پڑھتا رہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ وہ بولا بالکل نہیں بشرطیکہ آپ کا کتاب پڑھنا ہمارے کام میں حارج نہ ہو۔ اکرم نے فوراً ملازمت قبول کر لی۔

شروع کی چند راتیں تو عذاب میں گزریں۔ پہلی شب تو قیامت تھی۔ ڈائریکٹر نے ہدایت کر رکھی تھی کہ ٹیلی فون پر کسی کو غلط اطلاع نہ دی جائے اور چونکہ اکثر ٹیلی فون لواحقین کے ہوتے ہیں اس لیے لہجے میں خاص طور سے نرمی خلوص اور شائستگی اختیار کی جائے۔ نو بجے کے بعد اکرم نے مردہ خانے کی وسیع و عریض عمارت میں اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا اس عمارت کو باہر سے دیکھئے تو اعلیٰ درجے کا ڈانس ہال معلوم ہوتی تھی مگر اندر وسیع و عریض کمرے تھے لمبی لمبی غلام گردشیں اور خاموشی میں لپٹے ہوئے ہال کمرے۔ ساری کی ساری عمارت ایئر کنڈیشنڈ آدھی رات کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"جی ہاں، درست فرمایا آپ نے۔ میں بیریل ہوم سے بول رہا ہوں"

"میں مسز ویک فیلڈ بول رہی ہوں۔ میرے مرحوم شوہر آپ کے ہاں ہیں۔ ذرا مجھے بتلائیے کہ وہ کیسے ہیں میرا مطلب ہے انہیں ذرا ایک نظر دیکھ آئیے" اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز بھر آگئی۔ اکرم کو ڈائریکٹر کی ہدایات یاد آگئیں اور اس نے نہایت نرم لہجے میں کہا "آپ توقف فرمائیے میں ابھی عرض کرتا ہوں" اس نے اپنے سامنے میز پر رکھی

ہوئی مردوں کی فہرست پر ایک نظر ڈالی۔ معلوم ہوا ٹیلی فون کرنے والی خاتون کے مرحوم شوہر کی نعش آج ہی مردہ خانے میں آئی تھی۔ تزئین و آرائش سے قبل پہلے روز مُردوں کو جس کمرے میں رکھا جاتا تھا اسے مردہ خانے کی اصطلاح میں آرام گاہ کہا جاتا تھا۔ فہرست میں درج تھا کہ مردہ خانے کے بستر نمبر پانچ پر یان کے مرحوم شوہر کو لٹا دیا گیا ہے اکرم اپنی کرسی سے اٹھا اور آرام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔

چند قدم کا فاصلہ اسے پل صراط معلوم ہوا۔ مردہ خانے کی خاموشی میں اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اسے پہلی دفعہ رگوں میں دوڑتی ہوئی تیز تیز سنسنی کا احساس ہوا اس نے آہستہ سے آرام گاہ کا دروازہ کھولا۔ اب تک اس کے ماتھے پر پسینے کے ٹھنڈے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ آرام گاہ میں دیواروں کی پوشیدہ درزوں میں سے ایئرکنڈیشن کی ٹھنڈی یخ بستہ ہوا وقفے وقفے سے برآمد ہو کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ مُردوں کے پاس سے گزر کر پانچ نمبر کے پلنگ کے پائنتی جا کر رکا اور مردے پر ایک نظر ڈال کر واپس آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس سفر میں ایک صدی گزر گئی۔ واپسی پر اس نے دیکھا کہ ٹیلی فون کا چونگا اسی طرح میز پر رکھا ہے۔ اس نے چونگا اٹھایا "یس میڈیم" اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز ایک اندھے کنوئیں سے نکل رہی ہے۔

"معاف کیجیے کیا آپ ابھی تک انتظار کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں معافی چاہتی ہوں۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکی۔ میں نے سوچا میں ٹیلیفون کر کے جارج کے بارے میں پوچھ لوں تو شاید دل کو کچھ اطمینان ہو جائے۔ میں اپنے فلیٹ میں بالکل اکیلی ہوں اور کھل کر رو بھی نہیں سکتی کہ ہمسایوں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔"

"مسز وینکفیلڈ میں ابھی آپ کے شوہر کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہ آرام گاہ میں نہایت اطمینان سے سو رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک نہایت خوبصورت اور معصوم مسکراہٹ ہے۔ ان کی پیشانی پر آسمانی سکون اور اطمینان ہے وہ ابد کی گہری نیند میں اطمینان سے سو رہے ہیں۔"

"شکریہ" شکریہ، میں معافی چاہتی ہوں کہ اس بے وقت آپ کو تکلیف دی مگر یقین جانئے کہ لاتعداد خواب آور گولیوں کے باوجود میں لمحہ بھر سو نہیں سکی آپ سے گفتگو کر لینے کے بعد اب مجھے کچھ سکون آنے لگا ہے۔"

"خدا آپ کو سکونِ قلب کی نعمت عطا کرے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

شکریے شکریے کی مسلسل آوازوں کے ساتھ ٹیلیفون ختم ہو گیا۔

ٹیلی فون پر گفتگو ختم ہوتے ہی یوں لگا جیسے مردہ خانے کی گہری خاموشی میں ایک لاکھ گنا اضافہ ہو گیا اور اکرم کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی گہرے سکوت کے اتھاہ سمندر میں اترتا چلا جا رہا ہے ہر لمحہ نیچے ہی نیچے ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ کاش کوئی اور ٹیلی فون آ جائے یا کاش مسز وینکفیلڈ کو نیند نہ آئے اور وہ اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں پھر ٹیلی فون کریں۔ لیکن پھر صبح تک ٹیلیفون کی گھنٹی نہ بجی اور صبح جب صفائی کرنے والی خاتون ڈیوٹی

پہ آئیں تو اکرم کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔

آہستہ آہستہ اکرم اس ماحول کا عادی ہوتا چلا گیا۔ وہ رات کو اپنی ریسرچ کی کتابیں پڑھتا رہتا۔ نیند آتی تو پڑھتے پڑھتے سو جاتا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو مردہ خانے کا سکوت ٹوٹ جاتا۔ کوئی اپنے عزیز کے انتقال کی خبر دیتا اور پوچھتا کہ ہیرل ہوم کی گاڑی صبح کس وقت نعش کو لینے آسکتی ہے۔ کوئی آرام گاہ میں رکھے ہوئے کسی مرحوم کے بارے میں پوچھتا اور ڈائرکٹر کی ہدایت کے مطابق اکرم کو ہر بار مردہ خانے کی آرام گاہ میں جاکر اس مردے کو دیکھنا پڑتا اور پھر ٹیلی فون پر اس کے لواحقین کو تسلی دینی پڑتی۔ ایک بار اس نے ڈائرکٹر سے پوچھ ہی لیا کہ آخر لواحقین کو تسلی دینے کے لیے مردے کو دیکھنا کیوں ضروری ہے۔ ڈائرکٹر نے کہا "یہ ہماری پیشہ ورانہ دیانت داری کا اصول ہے۔ اس وقت ہم مردے کو اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ اس شخص کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں جو میلوں دور ٹیلیفون پر مرحوم کے بارے میں پوچھ رہا ہوتا ہے یہ ایک گراں نفسیاتی اور پیشہ ورانہ مسئلہ ہے۔ ایسے سوالات کا جواب دینے کے لیے مرحوم کو ایک نظر دیکھ لینا ضروری ہوتا ہے۔"

مگر ایک رات تو حد ہو گئی۔ اکرم ٹیلی فون کے پاس بیٹھا پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اکرم نے ہڑبڑا کر چونگا اٹھایا۔ آواز آئی۔

"معاف کیجئے میں مسٹر پیٹر واٹسن کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ میں مسز واٹسن بول رہی ہوں۔ اس وقت آپ کو پریشان کرنے پر معافی چاہتی ہوں مگر پلیز انہیں دیکھ کر بتایئے کہ کیا وہ اطمینان سے سو رہے ہیں"

اکرم نے کہا "مسز واٹسن آپ توقف فرمایئے۔ میں ابھی آرام گاہ سے واپس آکر عرض کرتا ہوں۔" اکرم نے اب رات کو چمڑے کے جوتے پہننا چھوڑ دیا تھا ورنہ آدھی رات کے سکوت میں مردہ خانے کی غلام گردش میں اس کے پاؤں کی چاپ اس طرح سنائی دیتی کہ اسے معلوم ہوتا کہ اس کے پیچھے پیچھے کوئی اور بھی آرہا ہے۔ کئی مرتبہ یہ چاپ ایسی ہیبت ناک ہو گئی کہ اسے بے ساختہ پلٹ کر پیچھے دیکھنا پڑا۔ اسی لیے اب وہ رات کو ربڑ کے جوتے پہن کر آیا کرتا۔

اکرم آرام گاہ کے بستر پہ لیٹے ہوئے مسٹر پیٹر واٹسن کو ایک نظر دیکھ کر واپس آیا اور ٹیلی فون خاتون کو تسلی دینے لگا۔ وہی گھڑے گھڑائے خوبصورت فقرے وہی دھیما ہمدردانہ لہجہ۔

"یس مسز واٹسن، آپکے شوہر فرشتوں کی نیلگوں دنیا میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔" دوسری طرف سے آواز آئی "میں بے حد ممنون ہوں۔ آپ نے یہ بتا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ دراصل گزشتہ ایک گھنٹے سے پنکی بھونکتا ہی جا رہا تھا۔ بلکہ اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے رو رہا ہو۔ میں کیا بتاؤں آپ کو کہ پنکی انہیں کس قدر عزیز تھا مسٹر واٹسن نے اسے بچے کی طرح پالا تھا۔" اب خاتون کی آواز بھر آگئی اور اس نے کہا "مجھ سے تو پنکی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ اسی لیے میں نے آپ کو تکلیف دی۔ میرا خیال تھا کہ کہیں مسٹر واٹسن پنکی کے بارے میں پریشان نہ ہوں"

اکرم نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا "پنکی کو پیار دیجئے۔ مسٹر واٹسن جنت کے دروازے پر پنکی کا انتظار کریں گے۔"

مد شکریہ شکریہ اور ٹیلی پر گفتگو ختم ہو گئی۔

اکرم یوں بھی زبان کا میٹھا تھا۔ ادب کا طالب علم تھا۔ اسے ایسی گفتگو کرنے میں کسی طرح کی دقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ جب سے اسے یہ نوکری ملی تھی وہ غمِ زمانہ سے بے نیاز ہو کر پوری توجہ اپنی تعلیم پر دے رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سال ٹک پٹ کر اپنا ریسرچ تھیسس مکمل کرے گا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر وطن واپس جانے کی فکر کرے گا۔

یونیورسٹی میں کرسمس کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ ہارڈورڈ میں کرسمس کا موسم پارٹیوں کا موسم ہوتا ہے نومبر کے آخر میں برف باری شروع ہو گئی تھی اور دسمبر کے اوائل ہی میں پارٹیوں کا دور شروع ہو گیا تھا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا اور یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے پارٹیوں کا دور ختم کرنا چاہتے تھے۔ ایک کے ہاں پارٹی ہوتی اور باقی لوگ جیسے شادی میں نیوتا ڈالا جاتا ہے اپنی اپنی وہسکی، وائین یا شیری کی بوتل ساتھ لے کر جاتے لیکن یہ رواج عائد نہ ہوتا تھا نہ ان سے توقع کی جاتی تھی۔ پارٹی کی ابتدا نفاست اور ادب آداب سے ہوتی لیکن شب کے آتے آتے حجابات اٹھ جاتے۔ موسیقی تیز اور روشنی مدھم ہو جاتی اور آخر شب تو اکثر قرب اور وصال ہو جاتی۔ رقص، ہم آغوشی، بوسہ اور بستر ایک ہی راستے کی منزلیں تھیں۔

اکرم نے جب پہلے پہل اسے پارٹی میں دیکھا تو لوگ ایسے لگا جیسے وہ مڈل ایسٹ کی ہے۔ اس کے بال سرخی مائل تھا، آنکھیں البتہ سیاہ تھیں اور وہ رقص کی زیادہ شوقین معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کسی نے ان دونوں کا تعارف بھی کرایا مگر وہ ہیلو ہیلو اور ایک دوسرے کا نام جاننے سے آگے نہ بڑھا۔ اکرم کو صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ حسن کی بیوٹی سیلون میں کام کرتی ہے لیکن ایک مرتبہ تعارف ہو جائے تو امکانات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پارٹی کے رنگ پر آتے آتے ہر ایک دوسرے سے بے تکلف ہو چکا تھا۔

کچھ لوگ رقص کر رہے تھے۔ کچھ گفتگو کی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اکرم ایک کونے سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ اس کا ایک جرمن نژاد دوست جو ہارورڈ میں سوشیالوجی میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اب استاد ہو گیا تھا، کچھ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اردگرد بٹھائے رقص کی نفسیات پر تقریر کر رہا تھا۔ "دراصل بات یہ ہے" اس نے نہایت عالمانہ لہجے میں کہا۔ وکٹورین زمانے میں، آپ نے فلموں میں دیکھا ہو گا کہ ڈانس پارٹنرز کیسے ایک دوسرے کو بھینچ بھینچ کر سینے سے سینہ لگا کر کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کیا کرتے تھے اور اب آپ نے دیکھا کہ ڈانس پارٹنر ایک دوسرے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ بس ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور ایک دوسرے کو چھوئے بغیر اپنی اپنی جگہ رقص کرتے رہتے ہیں مطلب اس کا یہ ہے کہ وکٹورین ایڈورڈین اور جارجین رقص کو ہم آغوشی کا بہانہ بناتے تھے لیکن آج کل کا نوجوان رقص کو بہانہ بنا کر عورت کی کمر میں باہیں نہیں ڈالنا چاہتا۔ وہ ڈانس کے نئے انداز سے اپنے آباؤ اجداد کو جھوٹا اور منافق ثابت کرنا چاہتا ہے۔ دراصل ڈانس کا نیا پوز ایک ہی اصول ثابت کرتا ہے ڈانس کے وقت ڈانس، بستر کے

وقت بستر۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ایک ہاتھ پاس بیٹھی ہوئی لمبے بالوں والی لڑکی کی کمر میں ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا گلاس اٹھا کر لمبے لمبے گھونٹ پینے لگا۔

اکرم نے یہ گفتگو سن کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ایک اعلیٰ درجے کی بورژوا سوسائٹی کی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا یہ گروہ کیا واقعی سوشیالوجی کا کوئی نیا نکتہ ثابت کر رہا تھا یا کاک ٹیل کی لہروں پر بہتا ہوا کسی ایسی منزل کی طرف جا رہا تھا جسے چھو کر اور چکھ کر یہ لوگ کئی مرتبہ واپس کر چکے تھے۔ پھر اکرم نے دوسرے اپنے دوست جرمن پروفیسر سے کہا "ہرشا ہمارے بچے ہماری دریافت کی ہوئی حقیقتوں کی اسی طرح تکذیب کریں گے جیسے ہم اپنے آباؤ اجداد کی حقیقتوں کو جھٹلا رہے ہیں۔" ہرشا نے کاک ٹیل کا گلاس ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو مشرق کے فلسفی، بشرطیکہ ہمارے بچے ہوئے۔"

اکرم نے دل میں سوچا کہ ہرشا اس وقت ترنگ میں ہے اور اسی لیے اس نے اکرم کو مشرق کے فلسفی کے لقب سے مخاطب کیا ورنہ غصے میں ہوتا کوئی اور دلچسپ گالی دیتا۔

رقص، موسیقی اور کاک ٹیل کے اس بھرے میلے میں جب اکرم اور نزہت کی ملاقات ہوئی تو نزہت ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی تھی اور کچھ لڑکے لڑکیاں صوفوں سے ٹیک لگائے کچھ نیم دراز کشن گود میں رکھے غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔ اکرم بھی سامعین کے اس گروہ میں شامل ہو گیا۔ ایک لڑکی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "مگر نزہت پوری بات سناؤ کیا واقعی تمہیں مردہ عورت سے ڈر نہیں لگا۔"

"ڈر کیوں نہیں لگا، ضرور لگا مگر میں کرتی بھی کیا۔ صبح ہی صبح جب میں بیوٹی پارلر میں گئی تو ہمارے بیوٹی سیلون کا مینیجر جم گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور بولا ابھی ابھی ٹیلیفون آیا ہے کہ مس وِکی بلر کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے افسوس ہوا کیونکہ مس بلر گزشتہ کئی سال سے جب بھی سیلون میں آتیں تو مجھ ہی سے بال بنواتیں۔ عمر ان کی ستر سے زیادہ تھی۔ عمر بھر شادی نہ کی اس لیے بیوہ ہونے کا موقع ہی نہیں ملا۔ امیر تھیں، خوش مذاق اور خوش گفتار تھیں۔ بال بنوانے کے بعد ٹپ فراخ دلی سے کرتی تھیں اور مجھ سے ایسی محبت سے ملتی تھیں کہ بیوٹی پارلر کی باقی لڑکیاں حسد کرنے لگی تھیں۔"

پھر ایک لڑکے نے نزہت سے کہا "اور شاید اسی لیے ان کی موت کی اطلاع تمہیں دی گئی۔"

"نہیں یہ وجہ نہیں تھی۔" نزہت نے ہنستے ہوئے کہا "وجہ اس کی اور تھی۔ جم نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی گاڑی لیں۔ بال بنانے کا ساز و سامان ساتھ رکھیں اور ان کے گھر چلی جائیں جو شہر کے مضافات میں کوئی پندرہ بیس میل دور تھا۔ جب میں نے جم سے وجہ پوچھی تو جم نے کہا کہ مس بلر نے جو وصیت چھوڑی ہے اس میں تجہیز و تکفین کے انتظامات کے سلسلے میں خاص طور سے یہ لکھا ہے کہ دفن کرنے سے پہلے میرے بال نزہت سے بنوائے جائیں جو گزشتہ کئی سال سے میرے بال بنا رہی ہے۔ پھر جم نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر رازداری کے لہجے میں کہا اور نزہت مجھے یوں لگتا ہے کہ مرحومہ نے اپنی وصیت میں کچھ رقم بھی تمہارے لیے

مخصوص کی ہے۔ اب تم جلدی سے سامان گاڑی میں رکھو اور رخصت ہو جاؤ ——— چنانچہ میں مرحوم کا پتا دریافت کرتی ہوئی ان کے گھر پہنچ گئی ان کی ایک ہمشیرہ جو عمر میں ان سے دو چار سال بڑی تھیں اپنے ایک عمر رسیدہ عزیز کے ساتھ گھر پر موجود تھیں۔ جب میں نے اپنا نام بتایا تو بڑھیا نے اپنے چہرے پر بغیر کسی تاثر کے کہا "پلیز کم ان۔ میری بہن آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" میں بڑھیا کے پیچھے پیچھے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے کا فرنیچر، تصویریں، آرائش غرضیکہ ہر چیز انطیق کا نمونہ معلوم ہوتی تھی اور اس ماحول میں ایک پرانی وضع کے پلنگ پر مس بلر کی نعش پڑی تھی۔ بڑھیا نے میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے پوچھا "آپ ہیئر ڈریسنگ میں کتنا وقت لیں گی؟" "کم از کم ایک گھنٹہ" میں نے کہا اور بڑھیا "پلیز سٹارٹ" کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اب میں نے مس بلر کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور مجھے یوں معلوم ہوا جیسے وہ ٹک ٹک میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ میں نے گھبرا کر ان کی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر جونہی میں نے پپوٹوں سے انگلیوں کو ہٹایا مس بلر کی آنکھیں پھر کھل گئیں اور وہ پھر ٹک ٹک مجھے دیکھنے لگیں۔ ڈر کے مارے میری ٹانگیں کانپنے لگیں اور میرا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میں جو اتنی بہادر معلوم ہوتی ہوں مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میں ایک مردہ بڑھیا سے ڈر جاؤں گی۔ بس ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ قریب ہی ایک کرسی پڑی تھی۔ میں وہیں گر پڑی۔ تھوڑی دیر بعد مس بلر کی بڑھیا بہن کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر میں لپک کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے اوزار سنبھال لیے مجھے یوں معلوم ہوا کہ میرا سارا پروفیشنلزم خطرے میں ہے۔ میں نے اسپرٹ کی بوتل کھولی اور مس بلر کے بالوں میں رولر لگانے شروع کر دیئے

کہانی ختم ہوئی۔ "ہرّا" (HURRA) ایک جاپانی طالب علم نے جو بڑے غور سے کہانی سن رہا تھا۔ کاک ٹیل کے دو گھونٹ پی کر نعرہ لگایا۔ "لانگ لیو پروفیشنلزم" اور لڑکے لڑکیوں کا یہ سارا گروہ ہنستے ہوئے گفتگو کے اس مقام سے آگے نکل گیا۔ اب یہ مجمع مس بلر کی بعد از مرگ ہیئر ڈریسنگ سے ہٹ کر کسی اور موضوع کی طرف نکل گیا تھا مگر اکرم کا دماغ تو وہیں اٹک کر رہ گیا۔ اس نے بار بار آنکھ بچا کر نزہت کی طرف دیکھا اور پھر یک بارگی اس سے کہنے لگا۔

"آپ مجھ سے کہیں زیادہ بہادر ہیں۔"

"مگر کیوں آپ کو ایسا خیال کیوں آیا؟"

"اس لیے کہ مردوں کے بال بنانا تو ایک طرف میں تو ابھی تک مُردوں سے ڈرتا ہوں اور میرا پروفیشنلزم بہت نالپختہ ہے۔"

اور جب نزہت کو یہ معلوم ہوا کہ اکرم مردہ خانے میں محافظ کی پارٹ ٹائم ملازمت کر رہا ہے تو اس نے بھی اس کی باتوں میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور جب وہ دونوں گھل مل کر باتیں کرنے لگے تو اکرم کو یوں محسوس ہوا جیسے مس بلر کی لاش ان دونوں کے درمیان بیچ بچولی نائن کا کام کر گئی ہے اور جب اکرم کو معلوم ہوا کہ نزہت پاکستانی لڑکی ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور اس نے کہا "میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ مڈل ایسٹ کے

کسی ملک کی رہنے والی ہیں"، پارٹی کا باقی وقت اکٹھے گزارنے کے بعد جب رخصت کا وقت آیا تو نزہت نے ہنستے ہوئے کہا اپنا نمبر دیجیے، میں کل آدھی رات کو مردہ خانے میں آپ کو ٹیلیفون کروں گی"۔

اگلی رات واقعی نصف شب کے قریب جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور اکرم نے چونگا اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے نزہت کی مترنم آواز سنائی دی "کہیے اکرم صاحب آپ کو ڈر تو نہیں آ رہا آپ کے مردوں کا کیا حال ہے"

اور اس ٹیلی فون کے بعد اکرم اور نزہت کے درمیان جو محبت کا بیج پھوٹا تو عشق پیچاں کی بیل کی طرح بڑھنے لگا۔ رات کے کسی حصے میں نزہت کا ٹیلی فون آجاتا اور نہ آتا تو اکرم اس کا انتظار کرتا رہتا۔ ایک رات جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اکرم نے یہ سوچ کر اٹھایا کہ شاید نزہت کا ٹیلی ہو مگر دوسری طرف سے پھر وہی فرمائش ہوئی کہ آرام گاہ میں ایک مردے کے بارے میں بتائیے۔ اکرم حسب معمول شائستہ باتیں کر کے آرام گاہ کی نیلگوں فضا میں داخل ہوا اور جب وہ واپس آ رہا تھا تو یک لخت اس کی نظر ایک مردہ خاتون پر پڑی "او گاڈ" اکرم کے منہ سے بے ساختہ نکلا ایک خوبصورت لڑکی کی لاش کامل سکون کی حالت میں محو خواب تھی۔ بے داغ چہرہ، سنولائے ہوئے چاند کی طرح تھا۔ اس کے ہونٹ سرخ تھے اور بے حد خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ ہلکے سے کھلے ہوئے جیسے ابھی کوئی بات کریں گے۔ آنکھیں بند تھیں جن پر لمبی لمبی پلکوں کا سایہ تھا۔ اکرم اس کی پائنتی کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے دیکھتے دیکھتے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی پھر سمٹ جاتی اسے شک ہونے لگا کہ یہ لڑکی مری نہیں زندہ ہے۔ پھر اس نے کہا "او خدایا کیا ایسی لڑکی کو بھی موت آسکتی ہے"۔ ——— پھر یک لخت اسے ٹیلیفون کا خیال آیا اور اس نے واپس آ کر ٹیلی فون اٹھایا اور کہا "جی ہاں میں نے اسے دیکھا ہے وہ ابدی خواب کی فردوسی مسکراہٹیں اپنے چہرے پر لیے سو رہی ہے"۔

دوسری طرف سے آواز آئی:- "کیا کہا آپ نے سو رہی ہے"؟

"جی نہیں سو رہے ہیں، ابدیت کی گہری نیند سو رہے ہیں"؟

اور پھر حسب معمول شکریے کے ساتھ گفتگو ختم ہو گئی۔ ٹیلی فون ختم کر کے اکرم کا دل چاہا کہ ایک دفعہ پھر آرام گاہ میں جا کر اسے ایک نظر دیکھ آئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے کسی لاش کو دیکھ کر ڈر نہیں آیا تھا اور اس کے دل پر کسی طرح کی ہیبت طاری نہیں ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نزہت کا ٹیلیفون آیا تو اکرم نے یہ ساری کہانی اسے سنا دی اور اسے حیرت ہوئی جب دوسری طرف سے نزہت نے جھوٹ موٹ ناراض ہوتے ہوئے کہا اکرم یہ تو بڑی خطرناک بات ہے میرا تو خیال تھا کہ تم ایسی جگہ ملازمت کر رہے ہو جہاں مجھے جلاپے کا کبھی موقع نہیں ملے گا۔ مگر تم نے تو یہ کہانی سنا کر مجھے جلا کر دیا"۔

——— پھر برف پگھلی، سردیوں کا کڑا اکا گزر گیا۔ بہار آئی، گرمی آئی اور اب خزاں کی آمد آمد

تھی۔ امریکہ کے اس علاقے میں خزاں کی رُت بے حد خوبصورت ہوئی ہے۔ درختوں کے پتے اس طرح رنگ بدلتے ہیں جیسے کسی رنگریز نے سارے جنگل کو رنگ دیا ہو پتا ور رنگوں کے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں اور ہوا جسم کو چھو کر گزرتی ہے تو لہو میں نشہ سا ہونے لگتا ہے۔

دوستوں نے اکرم کو دیکھ کر اینڈ پک نک پر بلایا تھا اور ہر شخص اپنی لڑکی کو ساتھ لا رہا تھا اکرم اور نزہت بھی دیکھ کر اینڈ کا سامان لے کر شامل ہو گئے۔ بڑے بڑے درختوں والا رنگ دار جنگل تھا جس میں ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس کے شفاف پانی میں آسمان کا عکس پڑتا تھا۔ ہفتے کی سہ پہر کو سورج چمک رہا تھا اور سب لوگ جھیل کے کنارے سے بابلے کیو کے انتظار میں بیئر پی رہے تھے۔ اتنے میں ہرشل نے کہا میں تو ڈبکی لگانا چاہتا ہوں۔ وہ اٹھا، اس نے پہلے قمیض اور پھر پتلون اتاری اور بغیر کسی لباس کے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ اب تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی لڑکی یا لڑکا اٹھتا، کپڑے اتارتا اور مکمل برہنگی کی حالت میں دھب سے جھیل میں چھلانگ لگا دیتا۔ خوبصورت نوجوان جسم کپڑوں کی قید سے آزاد جھیل کے شفاف پانی میں مچھلیوں کی طرح تیر رہے تھے۔ اکرم نے سوچا کہ برہنگی کا یہ روپ نائٹ کلب کی برہنگی سے کتنا مختلف اور کتنا خوبصورت ہے اور پھر اس نے نزہت کے کپڑوں کی طرف دیکھا جو کھلے پائنچے کی فلیپر پتلون اور بغیر آستین کے بلاؤز پہنے بیٹھی تھی۔

نزہت نے اکرم کی نگاہ کا اندازہ کرتے ہوئے اس سے کہا: "کیا چاہتے ہو، میں بھی کپڑے اتار دوں؟"

اکرم نے آہستہ سے کہا: "اگر تم چاہو تو، روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔"

"اچھا تو پھر تم بھی اتارو" نزہت بولی۔

اکرم نے قمیض اتار کر نزہت کی طرف دیکھا وہ اس کے سامنے نہانے کا دو ٹکڑوں والا خوش رنگ لباس پہنے کھڑی تھی "بس اس سے زیادہ نہیں جیسے ہی تم نے بتایا تھا کہ پک نک گراؤنڈ پر جھیل بھی ہے مجھے معلوم تھا یہاں کیا ہونے والا ہے اسی لیے میں اپنے لباس کے نیچے بیدنگ کوسٹیوم پہن آئی تھی۔"

اکرم نزہت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جھیل میں غدر مچا ہوا تھا۔ ہنسنے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی کسی کو پکڑتا اور کوئی مچھلی کی طرح پھسل کر گرفت سے آزاد ہو رہا تھا۔

اکرم نے نزہت کے حسین اور متناسب جسم کو بیدنگ کوسٹیوم کی گرفت میں دیکھ کر کہا: "ٹھیک ہے تو پھر میں بھی پتلون نہیں اتاروں گا۔"

نزہت نے کہا: "تو تمہیں مجبور کون کر رہا ہے۔ جسم انسان کی اصل ہے اور لباس ان ہزاروں خدشات کا نام ہے جن کے نیچے یہ اصل چھپی ہوئی ہے۔ برہنگی کا مطلب تو یہ ہے کہ انسان اپنی مدافعت سے ہاتھ اٹھا رہا ہے انسان ہر کسی کے سامنے تو کپڑے نہیں اتار سکتا۔"

اب اکرم کو یک لخت باقی ساتھیوں کا خیال آ گیا اور اس نے کہا: "مگر یہ سب لوگ کیا کہیں گے۔"

"کیا کہیں گے؟ کچھ بھی نہیں وہ تو اپنی جگہ خوش ہیں مزے میں ہیں اور اگر ایسی ہی بات ہے تو آؤ ہم بچپن کا ایک کھیل کھیلیں۔ میں بھاگتی ہوں، تم مجھے پکڑو" یہ کہہ کر نزہت نے چھوٹ لگا دی اور بھاگتے بھاگتے بولی "آؤ پکڑو" نزہت آگے آگے تھی اور اکرم پیچھے پیچھے۔

جنگل کے راستے رنگ دار درختوں سے پٹے پڑے تھے۔ نزہت اور اکرم آگے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے۔ پتے ان کے پاؤں کے نیچے دبتے تو تڑ تڑ کرتی ہوئی ایک کراری سی آواز سنائی دیتی اور وہ بھاگتے جا رہے تھے۔

اب بھاگتے بھاگتے اکرم کی سانس پھول گئی۔ سامنے میدان میں پتوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ نزہت بھاگتے بھاگتے اس پر جا گری اور پھر اکرم بھی اس پر جا گرا تیا ور پر اکرم نے نزہت کو آخر پکڑ ہی لیا اور اسے محسوس ہوا کہ پتوں کی خوشبو اور نزہت کی مہک دنیا کی سب سے بڑی خوشبو ہے۔

نزہت نے کہا "چلو میں ہار گئی مجھے چھوڑ دو" اکرم نے کہا "نہیں میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ "اب تو" ———

نزہت نے پوچھا "کیا اب تو؟"

اکرم نے کہا "مجھ سے شادی کر لو"

پھر وہ دونوں بھاگتے ہوئے جھیل پر واپس آئے۔ جھیل کے اندر سے سب لوگ بیک وقت چیخے "ارے کپڑے اتارو، چھلانگ لگاؤ"

مگر اکرم نے جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر زور سے کہا "نہیں بالکل نہیں۔ ہم شادی کر رہے ہیں"

"کیا کہا شادی؟" اور جھیل والے یہ سن کر اس طرح ہنسنے لگے جیسے اکرم نے کوئی بہت بڑا لطیفہ انہیں سنا دیا ہو۔

---

# کرشیس کورس

## الطاف فاطمہ

پیاز دو روپے سیر ہوئی اور پھر چار روپے دن رات کا دکھڑا بڑھتا گیا.... اپنے اپنے گھر میں غلغلہ اٹھتا اور اتنی زندگی گزار کر اب یہ احساس ہوا کہ پیاز بھی ایک چیز ہوتی ہے۔

ایسا لگتا تھا سلمیٰ کے ذہن سے ہر وہ ذکر اور ہر وہ حقیقت محو ہوتی جاتی ہے۔ جس کا تعلق پیاز سے نہ ہو۔

پیاز...... پیاز۔

یہی تو وہ حقیقت ہے جس میں ساری حقیقتیں اور خبریں مدغم ہو جاتی ہیں۔

تاہم گھر میں کھانا پکتا رہا اور سالن، دال غرض ہر چیز میں پیاز پڑتی رہی۔ البتہ اس کے چڑھتے ہوئے بھاؤ پر گفتگو ہوتی رہی۔ تب ایک دن بی جان نے یہ شگوفہ چھوڑا کہ ہم نے تو بھئی ایک ترکیب سوچی ہے۔ کھانے میں پیاز نہ ڈالی جائے۔ بی جان نے اسی پر بس نہیں کی تھی انہوں نے یہ بھی انکشاف کر ڈالا کہ بھئی ہم نے تو سالن میں پیاز ڈالنا چھوڑ دی ہے

مارے غصے کے سلمیٰ کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا۔ تمام دن اس پر اضطراب کا عالم طاری رہا۔

"حد ہے نہ غداری کی"

ویسے اس نے بی جان سے اس مسئلے پر بحث بھی کافی کی تھی مگر وہ تو عجب انقلابی مزاج لے کر دنیا میں آئی تھیں ہر نئی بات سے سمجھوتہ کرنے پر تلی بیٹھی رہتی تھیں۔ برابر مصر رہی تھیں کہ ہاں ہاں پیاز کی ضرورت ہی کیا ہے۔

لو بھئی حد ہو گئی غیر سبزیاں تو خیر بے میں بھگیر سکتی ہیں۔ لیکن گوشت! گوشت کے سالن کیسے پک سکتے ہیں!

تمام دن اس کا موڈ آف رہا...... اور بڑبڑ کرتی رہی۔ اور شام کو جونہی اسلوب احمد نے گھر میں قدم رکھا۔ تو جو بات اس نے سب سے پہلے ان کو سنائی تھی وہ یہی تھی۔ اے کچھ اور سنا آپ نے بی جان کی بات۔

کیا ہوا؟

اسلوب احمد بہت تھکے ہوئے تھے افسر سے جھڑپ ہو گئی تھی دفتر میں۔

وہ تیوری پر بل ڈالے بیٹھے جوتوں کے تسمے کھولتے رہے۔

سلمیٰ کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ ان کے تیوروں پر آئے ہوئے بلوں کا سبب دریافت کرے۔

بی جان کہتی ہیں کہ سالن میں پیاز نہ ڈالو۔

ہاں تو کیا جھوٹ کہتی ہیں۔ تم تو اتنی SCANDALISED ہو رہی ہو جیسے انہوں نے زندگی کی کسی بڑی قدر کو جھٹلا دیا ہو۔

ہاں تو بس زندگی کی بڑی قدروں کو بھی یوں ہی جھٹلایا جا سکتا ہے۔ جس طرح ..... اسلوب احمد اٹھ کر غسل خانے میں چلے گئے۔ کمال کرتی ہیں بی جان بھی .... کہہ دیا پیاز نہ ڈالو۔ اے لو حد ہے .... ہر کھانے کا بنیادی جز .... وہ غسل خانے سے آئے تو سلمی کو بڑبڑاتے پایا۔ بنیادی دنیاوی کچھ نہیں تمہارا کیا ہے تم تو ہر چیز کو بنیادی بنا لیتی ہو .... منہ پھلا کر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ جتنی دیر تک کیتلی کے پانی کو کھولنے میں لگتی وہ سبزی بنا لیا کرتی تھی اتنی دیر میں، چائے کی کشتی میں پیالیاں لگا چکی تو اس نے سبزی کی ٹوکری ٹٹولنا شروع کر دی اس کے ہاتھ میں پیاز کی دو ننھی ننھی پھپوند لگی پیاز کی گٹھیاں آ گئیں۔

بس کل یہی اثاثہ تھا جو پیاز کی مد میں باقی رہ گیا تھا۔ چھلکے کی سفیدی پر جا بجا پھپوند کی کاجل سی سیاہی چمک رہی تھی۔

وہ بڑے تاسف سے چار روپئے سیر کے حساب سے لی ہوئی پیاز کی اس باقیات کو دیکھتی رہی جس کے سرے پر دھانی رنگ کے آدھے آدھے انچ کے انکوے پھوٹ کر جیسے مسکرا سے رہے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ مصالحہ، بگھار، ٹماٹر کی چٹنی اور پیاز کی یہ دو بے مایہ گٹھیاں؟

عجب الجبرے کا سا مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔ خیر کسی نہ کسی طرح آج تو کام چلانا ہی پڑے گا۔

اسلوب احمد اخبار پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے۔ منہ پر اخبار کا صفحہ ہاتھ کے نیچے اخبار کا صفحہ اور تکیہ پر پھیلا ہوا اخبار کا صفحہ۔

وہ لیٹنے لگی تو ہر جانب سے اخبار کے صفحے کھینچ کھینچ نکالنا پڑے۔

ہوں! کیا ہے! اخبار کے صفحوں کی کھڑکھڑ سے چونک کر انہوں نے کروٹ لی۔

اے ذرا ادھر کھسکئے .... لیٹنے دیجئے۔ توبہ ہے اخبار کا کیا حال کیا ہے .... سنئے! جیسے لیٹے لیٹے اسے یاد آ گیا۔

ہوں کیا ہے۔ اب سو جاؤ۔ ان کی آواز نیند میں ڈوبی اور بھاری ہو رہی تھی۔

میں سوچتی ہوں کل یہ آپ کے اخبار کا پلندہ بیچ ڈالوں۔

اسے ایسا غضب نہ کرنا! وہ ایک دم چونک پڑے۔ واہ صبح میں تو ضرور بیچوں گی دو دن سے چھان بورے والا پھیرے لگا رہا ہے۔ میں تو پیاز لوں گی اس کے بدلے میں ....

پھر وہی پیاز! پیاز .... میں کہہ رہا ہوں میرا ایک اخبار نہیں بکے گا تم جانتی ہو مجھے کام دیتا ہے۔

واہ ـــــ واہ۔ اخبار نہ بیچوں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر پیسے چار روپئے کی پیاز منگاؤں .... ارے ہاں بہت سسک کر ڈالوں گی تب ہفتہ بھر چلے گی۔

کوئی ضرورت نہیں وہ ایک دم چیخ کر بولے۔ میری حرام کی کمائی تو نہیں جو تم پیاز خرید خرید کر اڑاؤ۔ تو پھر سالن میں کیا ڈالوں۔ آپ بتا دیجئے۔

میرا سر ....

یہ نوکری جواب نہ ہوا۔
فضول باتیں کر کے میری نیند نہ اڑاؤ۔
یہ فضول بات ہے پتہ ہے کہ اماں جانی کیا کرتی تھیں کہ یورپ کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ایک سیب اور ایک پیاز ......
دیکھو تم ایک کام کرو۔ اسلوب احمد کا لہجہ مدسنجیدہ تھا۔
جی کیا کام کروں۔
یہ کہ فی الحال پیاز پر سے ایکسلنٹ اڑا کر پیاز مجھے دے دو" وہ ہنس پڑی۔
موضوع بحث بدل گیا۔

دوسری صبح جب ایک اور سورج طلوع ہوا تو پیاز کا چرچا پھر بحال ہو چکا تھا۔
اب بس بھی کرو۔ انہوں نے چائے کی پیالی پٹک دی۔ پیاز پیاز کم بخت مجھے لگ رہا ہے چائے کے نہیں پیاز کے گھونٹ حلق سے اتار رہا ہوں۔
اسلوب احمد خاصے جھلّے تھے۔ بڑبڑ کرنے اٹھ گئے۔ کم بخت یہ جو مشی اسرائیل ہیں نا۔ اسی سے تو ان کو میں تسلیم نہیں کرتا۔ ان کو کچھ اور نہیں سوجھا تھا سوائے پیاز مانگنے کے۔ ارے مانگنا تھی تو ڈھنگ کی چیز مانگی ہوتی۔ اور تمہارا بھی سلسلہ شاید بنی اسرائیل ......
اے واہ ۹ میں کیوں ہوتی .... واہ بھئی .... خاصی جھڑپ ہو گئی ان کی اور سلمی کی اس دن دفتر جاتے جاتے۔
تو پھر اس شام وہ اپنے حسابوں سلمی کے لیے ایک مژدہ لائے۔ ایک ڈنڈ مچا دیا گھر میں گھستے ہی۔
ارے سلمی۔ بھئی ہو کدھر۔ ادھر تو سنو۔ پیاز پیاز ـــ
کہاں ــــ کہاں ہڑبڑا کر غسل خانے سے نکلی تولیے سے بال پونچھتی۔
بھئی سنو تو یہ کارڈ پکڑو۔ یہ کوئی اسفندریار صاحب ہیں جو امریکہ سے گھریلو طور پر سبزیوں کی کاشت پر ریسرچ کر کے آئے ہیں۔ وہ خانہ دار عورتوں کے لئے ایک کریش کورس کا انتظام کر رہے ہیں۔
کیا مطلب سلمی کے تیور ٹیڑھے تھے۔
ارے بھئی کہ گھر کی کیاریوں میں .....
اسلوب احمد کو خبر نہ تھی سلمی اس سے بہت قبل بی جان کو اس تحریک پر دبلا کر چکی تھی۔
اے تو کیا کیاریاں اجاڑ دیں پھول نہ بوئیں ۹
تمہیں پھولوں کی پڑی ہے اور یہاں پیاز کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔
ہر پڑوسن اور نیک بی بی نے اس کی تمام دلیلوں کا یہی جواب دیا۔
باتوں اور جوابوں کا کیا ہے وہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کریش کورس کا آغاز ہو گیا۔
اور یوں ہی تفریح طبع کے طور پر سلمی نے بھی کلاس میں شرکت کر لی۔

مسٹر اسفندیار بڑے مخلص اور معلم تھے۔

سبزیوں کی افادیت ایک طرف ان کی پرداخت، ان کی نمو، ان کے جمال اور رنگوں پر کچھ ایسے انداز میں روشنی ڈالی کہ اور تو اور سلمی کی بھی برین واشنگ ہو گئی۔

ہرے بھرے پتوں کے جلو میں مسکراتی سبزیوں کے رنگ نورتن گہنوں کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھائے جا رہے تھے۔ تب ایک دن اس نے اپنے آنگن پہ ناقدانہ نظر ڈالی اور اس آنگن کی اوقات ہی کیا تھی۔ مختصر سی چوکور زمین کا ٹکڑا اور صحن کی دیواروں کے ساتھ بنی ہوئی پھولوں کی کیاریاں۔

مسٹر اسفندیار کے مجوزہ نقشوں کی روشنی میں اس نے سارا آنگن پلٹوا کر رکھ دیا بجز ایک تپلی سی راہ گزر کے۔ اور اب ان کیاریوں کی باری تھی۔ جن میں موتیا کے مستقل پودوں کے چھوٹے چھوٹے جھاڑ کھڑے تھے۔ جوں ہی اس کی کھرپی موتیا کی جڑ سے ٹکرائی اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

وہ لپک کر کمرے میں جا کر چارپائی پر جا گری۔

اتوار کا دن تھا اسلوب احمد شیو کرتے جا رہے تھے اور منو کو اسنو وائٹ کی کہانی پڑھنے میں مدد بھی دیتے جا رہے ہیں۔

"کیوں کیا ہوا؟" وہ اس کو یوں بے حال ہو کر چارپائی پر گرتے دیکھ کر بولے۔

میں سوچتی ہوں لوگ زندہ جسموں پر گولی کس طرح چلا دیتے ہیں۔ لہلہاتی جوانیوں کو ساگ موتی کی طرح کس طرح کاٹ کر ڈال دیتے ہیں۔

اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔

ہوا کیا۔ کہانیوں میں سنسنی خیز خبریں نہ پڑھا کرو۔ اور ان اخبار والوں کو بھی خدا پوچھے۔ اس بھیانک انداز میں رپورٹنگ کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ کانچ کے برتن تو سارباں کی حدی کی تیز لے سے بھی درک جاتے ہیں۔ نہیں میں نے ایسی کوئی خبر نہیں پڑھی۔

پھر؟ تیزی سے وہ صابن کے جھاگوں سے بھرا ہوا برش چلاتے رہے۔ تو کیا اب موتیا کے پودے بھی کٹ جائیں گے؟ آواز اس کے گلے میں گھٹ رہی تھی۔

اب یہی تو ہے: اونہہ تمہارا تو دماغ خراب ہے مگر سوچئے تو.... کیا اب کے گرمی میں ہمارے آنگن میں موتیا نہیں مہکے گا۔ میں کیا جانوں.... موتیا مہکے گا تو پیاز کا دکھڑا برقرار رہے گا۔

لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ موتیے کی یہ تین چار جھاڑیاں یوں ہی کھڑی رہیں۔

تم جانو یہ موتیے اور پیاز کا مسئلہ تمہارا ہے۔ انہوں نے اٹھ کر برش جھٹکا تو گملائے ہوئے صابن کے جھاگ کپاس کے اجلے اجلے پھولوں کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے۔

یہ تو نہ کہیئے مسئلہ تو یہ ہر کسی کا ہے۔

تو خیر طے یہ ہوا کہ موتیے کے یہ چند پودے اپنی جگہ برقرار رہیں۔

پلٹی اور توڑی ہوئی زمین کی سنہری مٹی میں کالی کالی بھل ملائی گئی تو جیسے اس نے ایک اور ہی سونا روپ دھار لیا۔

ایک عجیب سی بھری پری سی مہک نے سلمیٰ کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا جیسے اس کے آنگن کی جھولی اس کے گھر بھر کی بنیادی ضرورتوں سے بھر گئی ہو۔ اور اب وہ پوری طرح سے بی جان کی سبزی اگاؤ مہم اور مسٹر اسفندیار کے کریش کورس میں شامل ہونے کو تیار تھی۔

اس نے اپنا بیجوں والا صندوقچہ کھول لیا۔ سبزی کے ان نئے لفافوں کے ہمراہ جو کریش کورس کے دوران اس نے خریدے تھے چند پرانے لفافے بھی تھے جن میں اس نے گزشتہ سال کے پھولوں کے بیج محفوظ کر رکھے تھے اور جن کے پیلے کاغذ پر خود اس کے ہاتھ کی تحریر میں پھولوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ جریتیم، ڈیلیا، گل غلطی، مسری گولڈ، سویٹ پیر اور بے شمار پھولوں کے نام جن سے اس کے چھوٹے سے آنگن کے اردگرد بنی کیاریاں گلدستوں کی طرح مہکا اور مسکرایا کرتی تھیں۔

اور اب تم کبھی نہیں مسکراؤ گے اس نے لفافوں کو الوداعی الفت سے چھوا۔

بیجوں کو زمین کی سپردگی میں دینے کا وقت آیا تو اس نے اپنی مخصوص محویت اور خود فراموشی کے عالم میں وہ سارے لفافے اپنی جھولی میں ڈال لئے۔ جب بیج ڈال چکنے کے بعد وہ باقی ماندہ لفافے اپنے صندوقچے میں لوٹانے لگی تو اس پر عجیب انکشاف ہوا۔

غلطی اور خود فراموشی کے عالم میں اس سے ایک بہت بڑا گھپلا ہو گیا تھا۔ اور اس گھپلے کو اس نے اسلوب احمد پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پھر ان کو ان معاملات سے زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی۔

بی جان سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ اپنی لہلہاتی کھیتی کی بات کرتیں۔ سوشٹ پی کو ٹرڈوں پر چڑھایا گیا تو یہ خبر عام ہو گئی کہ سلمیٰ پر کریش کورس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس کی کیاریاں اس دفعہ پھر پھولوں سے بھر گئی تھیں۔ نئے طریقوں اور تازہ کھاد کی آمیزش نے مٹی کو ہر دفعہ سے زیادہ توانا کر دیا تھا۔ اس لئے ہر مرتبہ سے زیادہ لوٹے کر توانا اور خوش رنگ پھول اس کی کیاریوں میں مسکراتے نظر آ رہے تھے۔ چنانچہ جب کچھ دن بعد بی جان اور دوسروں کے باغوں میں رنگ برنگی سبزیاں نو دن گھیوں کی طرح دمک رہی تھیں انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن جبکہ سلمیٰ سبز لڑیوں کے چڑھے بہاؤ پر تلملا تلملا کر پھٹکار بھیج رہی تھی تو اسلوب احمد نے بڑے سکون سے یوں کہا جیسے وہ اس کو قطعی ملامت کر رہے ہوں۔

جب کوئی اپنا پڑھا ہوا سبق بھول جاتا ہے تو اس کو یوں ہی تلملانا پڑتا ہے۔ تم نے بھی تو مسٹر اسفندیار کے کریش کورس کو یوں حرفِ غلط کی طرح اپنے ذہن کی سلیٹ سے مٹا کر ......

باقی کی بات سلمیٰ نے ان کے منہ سے نکلنے ہی نہ دی وہ منہ پھلائے اندر کمرے میں جا کر بڑبڑ کرنے لگی۔ وہ تو ایک اتفاق تھا، ایک بھول تھی۔ میں نے کوئی جان بوجھ کر تو...... غصے اور پچھتاوے کے مارے اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

تب ایک دن بی جان بڑے ٹھسے سے اپنی پیاز کی کاشت کا ایک حصہ سینی میں سجا کر اس کے گھر میں گردن اٹھائے یوں داخل ہوئیں جیسے انہوں نے اپنی سونے کی ڈلیوں میں اس کی شرکت گوارا کر لی ہو۔ تو پھر اس کو پرزور الفاظ میں سونے کی ان ڈلیوں کا قصیدہ بھی کہنا پڑا۔

اسلوب احمد رشک سے ان تندرست اور گلابی پیاز کی گٹھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

بی جان آپ نے تو اپنے کریش کورس کا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ تب اسی وقت دھیرے سے پون کا ایک ہلکورا سا آیا۔ سوئٹ پیز کی بھینی بھینی سی خوشبو جیسے حواسوں پر طاری ہو گئی۔ اسلوب احمد نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کو یوں لگا جیسے سوئٹ پیز کے پھولوں نے مسکرا کر شرارت سے آنکھ ماری ہو۔ چلو زندگی کی یہ بھی تو ایک ضرورت ہے۔ انہوں نے مجبوراً کہا اور اخبار دیکھنے لگے۔

# اپنی اپنی سچائیاں

مسعود اشعر

"بے بی۔ یہ تمہاری انگلی پر خون کیسا لگا ہے چوٹ لگ گئی ہے؟"

"نہیں سر۔ اس کی انگلی پر ویسے ہی خون لگا ہے۔ چوٹ نہیں لگی سر۔۔۔؟"

"اوہو۔۔۔۔۔ اچھا بیٹی تم اسے واش کرالو۔"

"نہیں۔ میں اسے واش نہیں کراؤں گی۔ یہ میری امی کا خون ہے۔"

میں اپنے آس پاس دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ مجھے اب کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے؟ وہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ احساس سے عاری چہرے اور جذبات سے خالی سینے لیے وہ سب پرانی دیواریں کھرچ کھرچ کر صاف کرنے میں منہمک ہیں مجھے غصہ نہیں کرنا چاہیئے اپنے اوپر قابو رکھنا چاہیئے۔ غصہ تو اس وقت آتا ہے جب سب دلیلیں ختم ہو جاتی ہیں اور کہنے کو کچھ نہیں رہتا میرے پاس تو کہنے کو بہت کچھ ہے۔ میرے پاس ابھی بے شمار دلیلیں اور لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔

اب کی بار میں نے زیادہ بلند آواز میں نئے الفاظ، نئی دلیلوں اور نئی مثالوں کے ساتھ اپنی بات ان کے کانوں میں انڈیلنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ میں نے ان کے کانوں کے ساتھ ان کی نظروں کو بھی اپنی آنکھوں کی گرفت میں لے لیا تاکہ وہ میری بات اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی سکیں۔ مشاہدہ کر سکیں ان سب چیزوں کا جنہیں دیکھنے کا گناہ میری آنکھیں کر چکی ہیں اور وہ باتیں سن سکیں، جو برسوں میرے کانوں پر داغی جاتی رہی ہیں۔ مجھے خوش فہمی تھی کہ وہ توجہ سے میری بات سن رہے ہیں۔ اور اس خوشی میں بولے جا رہی تھی۔ الفاظ تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ چہروں اور انسانوں کی شکلیں، واقعات اور حادثات لامتناہی سلسلہ میرے منہ سے نکل کر فرش پر ادھر اُدھر پھیلتا جا رہا تھا۔ لیکن اچانک میری نگاہ ان آنکھوں کی طرف اٹھی جنہیں میں نے اپنی دانست میں مسحور کر رکھا تھا تو یک لخت الفاظ کا سارا طوفان تھم گیا۔ وہ آنکھیں میرے دل کی طرح ویران تھیں۔ جانکاری کا ایک ہلکا سا سایہ تک نہیں تھا۔ ان سنسان اور کھنڈر آنکھوں میں۔ مجھے صدمہ ہوا۔ پہلے پہل صدمہ ہوا۔ ان سنسان آنکھوں پر اور اس بات پر کہ مجھے اپنے دل کی ویرانی کا خیال اس وقت کیوں آیا؟ اس وقت جبکہ دیواریں کھرچ کھرچ کر صاف کی جا رہی ہیں اور پرانے گھر نئے مکینوں سے آباد کیے جا رہے ہیں۔ مجھے اپنے دل کے کھنڈر ہونے کا خیال کیوں آیا؟۔

پھر میں نے دعا مانگی

——— اے خدا۔ مجھے ان چیزوں کو قبول کرنے میں استقامت بخش جنہیں میں تبدیل نہیں کر سکتی۔

——— ان چیزوں کو تبدیل کرنے کی جرأت عطا فرما جنہیں تبدیل کرنے کی میرے اندر طاقت ہے۔

اور۔ اچھائی و برائی میں تمیز کرنے کے لیے حکمت و دانائی عطا کر۔
وہ سب ہنس پڑے۔
"خالص سیاسی دعا ہے!"
"بالکل مصلحت پسندانہ دعا!"
"سیاست اور کسے کہتے ہیں؟"
"اب خدا کے ساتھ بھی سیاست شروع ہو گئی!؟"
میں بھی حیران ہوئی۔ یہ اجنبی دعا میرے لبوں پر کیسے آ گئی؟ پہلے تو کبھی میں نے ایسی دعا نہیں مانگی۔ یہ دعا مجھے کس نے سکھائی؟ وقت نے؟! تو کیا وقت نے ہی ان سب کی آنکھوں سے جانکاری اور دماغوں سے سمجھ بوجھ چھین لی ہے؟
۲۴ اور ۲۵ کی درمیانی رات کو میں ہوٹل "مس کھا" میں تھی۔ اس ہوٹل میں جس کا نام بالکل بے معنی تھا اور جس کی لفٹ ہمیشہ خراب رہتی تھی اور لفٹ بوائے جو دراصل بوڑھا آدمی تھا اس کی مرمت کے لیے ہر وقت اوزار اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ہم جب بھی اس ہوٹل میں جاتے بچے اس بوڑھے کا مذاق اڑاتے اور وہ بوڑھا اپنے اوزاروں سے بچوں کو ڈراتا "یہ لفٹ ہم سب کو لے کر چاند تک جا سکتی ہے سمجھے۔ ہم سب چاند پہ چلے جائیں گے اور تمہیں دیواروں کے ساتھ ٹھونک جائیں گے۔"
بچے ہنستے اور میں "مس کھا" کے بے معنی نام پر حیران ہوتی۔ یہ کیا نام ہوا؟ "مس کھا" یا "مس خا"؟!
ہوٹل کے سامنے ریلوے کا ریسٹ ہاؤس تھا اور پیچھے ریلوے کالونی۔ سرسبز و شاداب پہاڑیوں میں گھری ریلوے کالونی ہم شاید ریلوے کالونی میں رہتے تھے یا شاید کسی پہاڑی پہ چھوٹے سے بنگلے میں: بوہا رکیٹ کے پیچھے بہر حال نہیں رہتے تھے۔ ۲۴-۲۵ کی رات کو جب آس پاس کی پہاڑیوں پر گھن گرج شروع ہوئی تو ہمیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ایک پھر ہم مس کھا کی طرف بھاگے؟ ادھر کیوں بھاگے اس کا کسی کو پتہ نہیں تھا البتہ اس وقت ایسا لگا جیسے اب صرف مس کھا کے بے معنی نام میں ہی معنی رہ گئے ہیں۔ باقی تمام چیزیں بے معنی ہو گئی ہیں۔ وہ ساری چیزیں اور سب باتیں بے معنی ہو گئی ہیں جن کے لیے ہم نے اتنی بھاگ دوڑ کی تھی۔ اتنے دکھ جھیلے تھے۔
رات کو توپوں کی گھن گرج میں وہ آئے اور کہنے لگے اپنے مرد ہمارے حوالے کر دو۔ سارے مرد ہمارے ساتھ آ جائیں۔ میں نے کہا یہ میرا بیٹا تو مرد نہیں ہے۔ بچہ ہے مگر انہوں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ میری بات نہیں سمجھے جیسے میری آواز ان کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔
"تم بھی یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی؟"
"میں یہاں سے کہاں جا سکتی ہوں! مگر تم لوگ یہ تو دیکھو۔۔!!"
"ہم سب کچھ دیکھ لیں گے!" انہوں نے ایک قہقہہ لگایا "تم سامنے سے ہٹ جاؤ!"
میں سامنے سے ہٹنے کا مطلب نہیں سمجھتی تھی مگر جب وہ میری بیٹی کی طرف بڑھے تو ان کا مطلب سمجھ گئی۔ اور

آگے بڑھی "یہ تو میری بیٹی ہے یہ تمہاری بیٹی ہے۔ یہ تو مرد نہیں ہے"
"بیٹی؟ کس کی بیٹی!!" ان کی آنکھیں سادہ کاغذ کی طرح بالکل سفید تھیں۔
اور پھر زمین کی کوکھ ننگی ہو گئی۔ میری بیٹی اپنے باپ اور بھائیوں کے سامنے ننگی ہو گئی۔ انہوں نے اس کی ساڑھی پکڑ کر کھینچی اور وہ ساڑھی لمبی ہونے کی بجائے ان کے ہاتھوں میں لپٹ گئی۔ ساڑھی ختم ہو گئی کہ میری بیٹی دروپدی نہیں تھی۔
مگر میری بیٹی دروپدی کیوں نہیں تھی؟ امیرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں ان سب کا منہ تکتی ہوں کہ شاید وہی میری رہنمائی کریں۔ مگر وہ میرے اوپر ہنستے ہیں اور میری بیٹی کی عریانی میری آنکھوں کو تاریک کر دیتی ہے۔
"جب دو ہاتھی لڑتے ہیں تو سب سے زیادہ نقصان کون اٹھاتا ہے۔؟ گھاس"
"ہا ہا ہا۔ واہ واہ واہ . . ."
اور جب ہاتھی پیار میں چہلیں کرتے ہیں تو ان کے پیروں تلے کون کچلا جاتا ہے؟!"
"گھاس..... ہاں گھاس ہی تو کچلی جاتی ہے"
جناح روڈ پر چلتے چلتے میں ٹھہر جاتی ہوں اور دائیں بائیں دیکھتی ہوں جس تیزی سے یہاں نئی عمارتیں بنتی ہیں اسی تیزی سے وہ پرانی ہو جاتی ہیں۔ بارش اور سیلن انہیں ایک موسم میں ہی پرانا کر دیتی ہے۔ ہر نئے موسم کے ساتھ انہیں پھر نیا کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ دریاؤں کا پانی کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ ہر لمحے نیا ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے نئے دارالحکومت کی ساری عمارتیں اس طرح ڈیزائن کی گئی ہیں کہ ان میں پلوں کے نیچے والے ستونوں کی طرح دائرے اور نیم دائرے بن گئے ہیں ان میں سے ہر چیز بہتی ہوئی نکل جائے گی۔ کوئی چیز رک نہیں سکے گی۔ وقت کو کس نے گرفتار کیا۔؟
"میری صلاحیتوں کو دیمک لگ رہی ہے۔ مجھے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے مکمل آزادی چاہیے" میرے بائیں کان میں کسی نے سرگوشی کی۔ میں نے اس جانب رُخ کیا تو وہ سرگوشی چیخ بن گئی۔
میں نے کہا "ہر بامعنی چیز کا ایک بے معنی اور لغو پہلو بھی ہوتا ہے" اور رو پڑی۔
جب بندرگاہ پر انہوں نے جہازوں سے سامان اتارنے سے انکار کیا تھا اور جہازوں کے سارے عملے کو جہازوں کے اندر ہی بند کر دیا تھا۔ تو میں نے اپنی زبان اپنے منہ میں بند کر لی تھی اور جب وہ سارے مردوں کو اپنے ساتھ لے گئے تو میں نے آنکھیں بھی بند کر لیں۔ میرے لیے اس بات کے کیا معنی رہ گئے تھے کہ کس اسکول کے کون سے ہال کا فرش اور دیواریں ننھے منے پھول سے بچوں کے تازہ خون سے نہائی گئیں۔ کس کارخانے کے کون سے ریسٹ ہاؤس کے سارے بستر کنواریوں کے خون سے رنگے گئے۔ یا کس شہر کے کس علاقے سے کتنی جوان عورتیں اس طرح نکالی گئیں کہ وہ چمکتے سورج کو منہ دکھانے کے قابل نہیں تھیں! میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ جب وہ میرے بیٹوں اور بیٹیوں کو کوٹتے آئے تو میں نے ہوٹل کے کمرے کے اندر بستروں پر لگی مچھر دانیوں میں انہیں چھپا رکھا تھا۔ مضحکہ خیز تصور ہے۔ مچھر دانیوں میں چھپا رکھا تھا!!

مجھے بار بار کٹھ پتلی کا وہ تماشہ یاد آتا ہے جو جرمن بازی گروں نے چھوٹی سی پہاڑی پر خوبصورت سے کلب میں کیا تھا۔ ایک کٹھ پتلی کو پروفیسر بنایا گیا تھا۔ وہ کٹھ پتلی پروفیسر بے معنی اور بے ہنگم آوازیں نکال کر کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنی سنجیدگی کے ساتھ اس نے کوئی بات سمجھانے کی کوشش کی کہ سارا ہال قہقہوں سے بھر گیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش ہوا اور پھر اس کی بے ہنگم آوازوں کی جھنکار شروع ہو گئی جب لوگ قہقہے لگاتے تو وہ میز پر زور زور سے مکے مار کر "ہا ہا" کا نعرہ لگاتا اور پھر اسی سنجیدگی اور اسی گمبھیرتا کے ساتھ لایعنی زبان میں اپنی بے معنی بات سمجھانے لگتا۔ لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔ میرے اپنے بچے ہنسی کے مارے دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ مگر مجھے اس کٹھ پتلی پر رحم آ رہا تھا۔ ترس آ رہا تھا۔ اس لکڑی کے انسان پر اور میں نے اس پاس بیٹھے لوگوں سے پوچھا "آپ لوگ اس کٹھ پتلی پر ہنس رہے ہیں یا کٹھ پتلی نچانے والے پر؟" اور وہ سب اور بھی زور سے ہنس پڑے اور میں نے سوچا شاید میری بات ہی بے معنی ہے۔

"پہلا خان زندہ باد۔"

"دوسرا خان زندہ باد۔"

"تیسرا خان زندہ باد۔"

"سارے خان زندہ باد۔"

میں سرحد کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی کہ یہ نعرے سرحد پار لوگوں کو سنانے کے لیے لگائے جا رہے تھے اور اس لیے لگائے جا رہے تھے کہ توپوں کی گھن گرج اب پہاڑیوں سے نہیں بندرگاہ کی طرف سے آ رہی تھی۔ اور جہازوں سے مال اتار کر گلی کوچوں میں پہنچا دیا گیا تھا۔

ہوٹل "مس کھا" کے ڈائننگ ہال میں چہرے بدل گئے تھے البتہ کمروں کے اندر بستروں پر لگی مچھر دانیاں پہلے کی طرح اب بھی غیر محفوظ تھیں۔

"ہیلو۔ نمبر ون کہاں ہے؟"

"بک ہے۔"

"نمبر ٹو کہاں ہے؟"

"وہ بھی بک ہے۔"

"تم کون ہو؟؟"

"میں نمبر تھری ہوں مگر (سویلینز) کو پسند نہیں کرتی۔"

اب دوسری توپوں کی گھن گرج میں وہ آتے ہیں اور کہتے ہیں اپنے مرد ہمارے حوالے کر دو۔ میں کہتی ہوں گھروں میں اب کوئی مرد نہیں ہے۔ سارے مرد چاول کے دانوں کی طرح کھیتوں میں بکھر گئے ہیں اور ان دانوں نے جڑیں پکڑ لی ہیں وہ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور وہ ساری مچھر دانیاں پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں جو انہوں نے

خود بنائی تھیں ـ صدمہ سے میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اب کون کس کی حفاظت کرے گا ـ اور کون کہاں جائے گا؟!

لفٹ کا بڑھا مستری پہلے ہی اپنی لفٹ کے ساتھ چاند پر پہنچ چکا ہے اور سیڑھیاں ہمیشہ سے بوسیدہ اور ناکارہ ہیں

میں دعا مانگنے کی کوشش کرتی ہوں مگر تمام دعائیں ختم ہو چکی ہیں ـ کیا دعا مانگوں ـ کس سے دعا مانگوں اور کس کے لیے دعا مانگوں ـ ! ـ میں اپنے آپ کو ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں تحلیل ہوتا دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ اب میری آنکھیں کبھی نہیں کھلیں گی اب مزید میں کچھ نہیں دیکھ سکوں گی ـ آخر کہاں تک دیکھا جا سکتا ہے ـ کیا کچھ دیکھا جا سکتا ہے!؟؟

ـــ مگر یکسانت میری آنکھیں کھل جاتی ہیں اور میں پتھر بن جاتی ہوں میری بیٹی کی ساڑھی اب پھر لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور میری بیٹی جو دو دو پدی نہیں ہے بالکل ننگی ہے ـ میری آنکھیں بند ہونے سے انکار کر دیتی ہیں کہ اب کوئی بیٹی اور کسی کی بھابی دروپدی نہیں رہی ـ

میں اس وقت کو یاد کرتی ہوں جب بیٹیاں اور بھابیاں دروپدی ہوتی تھیں اور ہم سرحد پار سنا لے کے لیے نعرے نہیں لگایا کرتے تھے ـ اور تازہ ہوا ہم سب کا مشترکہ سرمایہ تھی ـ مگر پھر اچانک میرے اندر شک کا سنپولیا سر اٹھاتا ہے کیا کبھی ایسا وقت تھا؟ کیا کبھی کوئی ایک لمحہ بھی ایسا آیا تھا؟!! اب مجھے اپنی یادوں پر بھی اعتبار نہیں رہا ـ اس یاد پہ جواب تک میرا واحد اثاثہ تھی ـ

دانتوں میں گوشت پھنس جائے تو کتنی الجھن ہوتی ہے عجیب الکسی سی لگتی ہے ـ بار بار زبان اس گوشت کی طرف جاتی ہے اور اسے آگے پیچھے کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے میں نے انہیں بار بار یاد دلانے کی کوشش کی تھی پرانی کہانیاں سنا سنا کر کتنی مرتبہ انہیں جھنجھوڑا تھا ـ

ـــ "اے ابن آدم ـ میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا"

ـــ "اے خداوند قدوس تو سارے جہانوں کو رزق دینے والا ہے میں تجھے کس طرح کھانا کھلاتا؟"

ـــ کیا تجھے علم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا ـ؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے قریب پاتا"

مجھے ایک جھرجھری آتی ہے اور میرا سارا جسم اکڑ جاتا ہے ـ سارے سوال بے کار ہو چکے ہیں ـ میں اپنے آپ سے سوال کر کر کے تھک چکی ہوں مجھے کسی ایک سوال کا جواب بھی معلوم نہیں ہے ـ

پھر مجھے اپنی بے بسی پر افسوس ہوا اور ہنسی بھی آئی کہ مجھے اب تک یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ کون کیا چاہتا ہے؟ اس لیے کہ میری کوئی نہیں سنتا ـ میں انہیں کتنا سنانے کی کوشش کرتی کہ سنو ـ یہ کون کہہ رہا ہے؟ یہ کون کہے گا؟ ـ بات اشاروں سے ہی سمجھائی جاتی ہے ـ استعاروں میں ہی بات سمجھ لو یہ علامتیں ہیں ـ یہ نشانیاں ہیں ـ

اے ابن آدم میں پیاسا تھا ـ

اے ابن آدم میں لباس کے بغیر تھا

چوٹ لگنے کے بعد فوری طور پر جسم سُن ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔ جسم بے حس ہو جاتا ہے درد بعد میں شروع ہوتا ہے۔

"نہیں سر، یہ زخم نہیں ہے ویسے ہی خون لگا ہے۔"

"اوہو۔۔۔ اچھا بیٹی تم اسے واش کرا لو۔"

"نہیں میں واش نہیں کراؤں گی۔ یہ میری امی کا خون ہے۔"

کیا میرے لیے اس بات میں کوئی معنے رہ گئے ہیں کہ یہ واقعہ ۲۵ رت پہلے کا ہے یا بعد کا؟ میں تنگ و تاریک قبر میں ان زخموں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتی ہوں، جن پر خون جم گیا ہے مگر اس قبر میں تلے اوپر لاشوں کا ایسا انبار ہے کہ میں اپنے آپ کو مزید زخمی کئے بغیر ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی۔ میں منہ اوپر اٹھا کر سانس لینے کی کوشش کرتی ہوں لیکن بے شمار مردہ سانسیں میرے اندر گھس جاتی ہیں اور میں دوسروں کی سانسوں کے سہارے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کرتی ہوں۔

پھر ساری عورتوں نے اپنے لمبے ادر کالے بال کاٹ کر اپنے مردوں کو دے دیئے کہ وہ ان سے اپنی کمانیں بنا لیں اور چلّے پر تیر چڑھا لیں۔ انہوں نے سارے مردوں کو باہر نکال کر گھروں کے دروازے بند کر لیے کہ وہ لڑتے لڑتے مر جائیں۔ اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ اپنے بال کاٹ کر مردوں کے حوالے کرنے والی عورتوں میں خود بھی شامل ہوں۔۔۔ میرے رہتے بال بھی ان کمانوں میں لگے تھے ـــــــ وہ بال جو میں نے اپنے ہاتھ سے کاٹ کر دیئے تھے۔ افسوس اس بات کا نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اصل المیہ یہ تھا کہ غم اور خوشی کے درمیان فرق ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ موقع ماتم کرنے کا ہے یا جشن منانے کا؟

میرے سر پر کالے بادلوں سے گھرا آسمان ہے اور نیچے بارود اور خون میں ملی کیچڑ۔ میں ٹخنوں ٹخنوں اس کیچڑ میں دھنسی کھڑی ہوں۔ عورتوں اور بچوں کی چیخوں سے ہوا بوجھل ہو گئی ہے۔ سانس لینا دشوار ہے۔ رات اور بھی تاریک ہوتی ہے تو دور کسی مکان سے بچوں کے چیخنے کی آواز زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ صرف بچے چیخ رہے ہیں۔ مگر یہ چیخیں عجیب ہیں کہ بھاری جوتوں کی دھمک اور جیپوں اور ٹرکوں کی گڑگڑاہٹ سے پیدا ہونے والے گھور سناٹے کو چیرتی اچانک ان کی آواز ابھرتی ہے اور دفعتاً بند ہو جاتی ہے۔ بچے ایک دم گلا پھاڑ کر چیختے ہیں اور جیسے ہی ان کی آواز نکلتی ہے ان کے پیچھے چھپے ہاتھ ان کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ میں یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کتنے ہیں اور کون ہیں۔ میں ان سے کہتی ہوں اس تاریکی سے باہر نکلو ورنہ گھٹ کر مر جاؤ گے۔ یہی بات ان ہاتھوں سے بھی کہتی ہوں جو بچوں کے پیچھے چھپے ہیں اس پر وہ سارے ہاتھ باہر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور میں دیکھتی ہوں کہ باہر اندر سے بھی زیادہ تاریکی ہے۔ اور میں پھر اپنی قبر میں دبک جاتی ہوں۔

یہ مائیں بھی عجیب مخلوق ہوتی ہیں۔ ہر ماں سوچتی ہے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے اس کے بچے دوسرے بچوں سے الگ ہیں۔ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی اس کے بچے کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتے۔ کبھی غلط نہیں ہو سکتے اور وہ کتنا غلط سوچتی ہے

یہ کس نے کہا تھا کہ مستقبل ماضی کے چاند کا پشت والا حصہ ہے؟ تاریک حصہ؟ کسی کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ کیا ہوگا؟ مگر جب علم ہو جاتا ہے تب!! ———

دس سال پیار کرتے گزرے اور دس سال پیار کی یادوں کی بازگشت سنتے اور باقی.....؟ کیا اس سے زیادہ سوچنے کی ضرورت رہ گئی ہے؟ کیا اتنا سمجھ لینا کافی نہیں ہے کہ سارا ماضی اور ماضی کی ساری یادیں وہ زمین نگل گئی۔ اور کیا ہم یہ نہیں جانتے کہ کوئی زمین بھی موسمی شدائد زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی!!!

میں نئی عمارتوں کی بلند ہوتی دیواروں اور ان میں کھلتے بند ہوتے دروازوں کو دیکھتی ہوں اور ان سے کہتی ہوں تم نے پہلے میری بات نہیں سنی اب تو سن لو۔

دیکھو ہر ایک کی اپنی سچائی ہوتی ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک کی سچائی دوسرے کی سچائی کا تضاد ہوتی ہے نفی ہوتی ہے۔ دوسرے کی سچائی کی۔ اور جب سچائیوں کے بہت سے VERSION باہم ٹکراتے ہیں تو پھر کسی بات کے کوئی معنے نہیں رہ جاتے ہر بات اور ہر چیز بے معنی ہو جاتی ہے۔

میں کہتی ہوں دیواروں کو کھرچ کھرچ کر ضرور صاف کرو کہ صحت مند زندگی کے لیے تمام پرانے داغ دھبے مٹانا لازمی ہیں۔ لیکن ماضی اور مستقبل کی حقیقتوں کو ضرور سامنے رکھو۔

مگر کونسی حقیقتیں!؟ اسے میرے اندر سنپولیا پھر کلبلاتا ہے اور اپنا پھن اٹھا کر میری نظریں اپنی آنکھوں کی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اور میں اپنی بے بسی پہ ہنستی ہوں۔ ہاں۔ یہ مائیں بھی عجیب مخلوق ہوتی ہیں۔

———

# گنبد کی آواز

ساجدہ ہاشمی

ارغوانی پردوں سے پار رات کا سیاہ اندھیرا ہے اور تاروں کی جوت بڑی مدھم اور مٹیالی سی لگ رہی ہے۔ درخت ساکن ہیں جیسے دہشت زدہ کھڑے ہوں۔ میرا بھاری سر پروں کے نرم تکیے پر دھرا ہے اور فوم کے نرم گدے پر لیٹی میں کچھ بھی سوچنے سے ڈر رہی ہوں۔ اندر زیرو بلب کی روشنی ٹیبل لیمپ کے شیڈ سے چھن کر سرخ قالین پر پڑ رہی ہے۔

یہ لہو رنگ فضا۔۔ یہ رنگ جو ہزاروں معصومیتوں کی قربانیوں سے بنا لگتا ہے۔

معصومیت۔۔۔ عورت۔۔۔ کنواریاں۔۔۔ میں اس طرح کیوں سوچ رہی ہوں۔۔۔ میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ہے۔۔۔۔ ایسی سوچیں آکر مجھے تنہا اور ویران کر جاتی ہیں۔

میرا سر گھوم رہا ہے۔۔۔ اس خواب ناک کمرے کی ساری چیزیں تیز تیز ہلکوروں میں آگے پیچھے ہل رہی ہیں۔

اس ڈبل بیڈ پر میں لیٹی ہوں۔۔۔ اس بیڈ پر میں لیٹی ہوں جو میرے اپنے گھر میں نہیں ہے۔ اور جو مرد تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر گیا ہے وہ میرا شوہر نہیں ہے۔۔۔ پھر بھی ہم دونوں کتنے ہی گھنٹے اکٹھے رہے ہیں۔۔۔۔

بیوی شوہر۔۔۔ شوہر بیوی۔۔۔۔ زندگی کا یہ کھیل تو بہت پرانا اور فرسودہ ہو چکا ہے"۔۔۔ جمال نے ہی تو مجھ سے کہا تھا۔

اور ان ارغوانی پردوں کی قید میں میں اکیلی سوچنے سے ڈر رہی ہوں۔۔۔ اور ساتھ ہی دوسرے کمرے کی بے ترتیبی کا حصہ بنا میرا شوہر مدہوش پڑا ہے۔۔۔۔ اس کا ہاتھ اب بھی خالی گلاس تھامے ہوگا اور وہ شاید سو رہا ہے شراب کی بوتل کے بدلے میں میں ان ارغوانی پردوں والے کمرے میں چلی آئی اور وہ مدھم روشنیوں کے نیچے ناچتے جسم کو ہوس ناک نگاہوں سے گھورتا وہاں بیٹھا رہا تھا اس نے مجھے اندر آتے دیکھا تھا لیکن دوسرے لمحے وہ پھر اس نیم عریاں جسم کی تھرتھراہٹ میں کھو گیا تھا۔ اور اس نے اپنی نظریں مجھ سے ہٹا لی تھیں میں تھی ہی کہاں میں تو کوئی بھی نہیں ہوں۔۔۔ میرا اصلی وجود مٹ چکا ہے فیصل نے مجھے بازو سے پکڑ کر اس کمرے کے اندر لے جاتے ہوئے کہا تھا۔

میری جان تمہارے چہرے پر بڑی تھکاوٹ ہے۔ کچھ دیر آرام کر لو یہ محفل تو ابھی پوری طرح شباب پر بھی نہیں آئی"۔۔ اور اس سے اندر آکر پردے برابر کر دیئے تھے اور پھر اس نرم بستر پر مجھے لاکر بٹھا دیا تھا۔ اور پھر۔۔۔ یہ

زیبدہ نمبر کا مطلب شائد جلتا رہتا یا اندھیرا تھا... میری رگوں میں شراب کی تیزی تھی اور اس کے قدم بھی سیدھے نہیں تھے.... اور پھر پیسے بھی تو برابر تھے... میں نے اندر کے اندھیرے سے گھبرا کر کہا تھا... یہ روشنی کر دو فیصل... مجھے اتنا اندھیرا اچھا نہیں لگتا... یہ ایسے لگتا ہے جیسے کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہو۔

اور اس نے کہا تھا۔ میری جان اندھیروں کے کھیل اندھیروں میں ہی اچھے لگتے ہیں... جب روشنی ہوتی ہے تو ہم اپنے ظاہر کے ساتھ باطن میں بھی ننگے ہو جاتے ہیں... اور پھر اتنا زیادہ ننگا پن دیکھ کر مجھے متلی ہونے لگتی ہے... شائد نیکی کی کوئی کرن اس کے اندر باقی تھی... کیسی فرسودہ باتیں کرتے ہو۔ رشوت لیتے ہو ———— شراب پیتے ہو... اور عورت سے کھیلنا جانتے ہو۔ پھر بھی ظاہر باطن کے فرق کو سمجھ سکتے ہو... اٹھو مجھے ایک گلاس اور دو... میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے مجھے سوائے اپنے وجود کے اور کچھ یاد نہیں تھا اور میں نے اپنے اندر سے اٹھتے اندھیرے کی کاٹ کو کم کرنے کے لیے ایک قہقہہ لگایا تھا... اور ارغوانی پردوں سے پار اندھیرے کا تصور ہی مجھے بڑا ڈراونا لگ رہا تھا۔ ساتھ کے کمرے سے مئے ناب سے بوجھل قہقہوں کی گونج تھی اور ناچتے قدموں کی دھمک زمین کے انگ انگ میں پھیل رہی تھی۔ بڑھ رہی تھی اور بڑھ کر میرے دل کو ہلا رہی تھی۔

اور اب سب کچھ تھم سا گیا تھا وہاں پر میرا شوہر سو رہا ہو گا بے ترتیب کرسیاں اوندھی بوتلیں اور شکن شکن چاندنی سگریٹوں کے ٹکڑے......

میں ابھی ان سب لوگوں کے درمیان بیٹھی تھی اور پھر مدھم روشنیوں کے نیچے بیٹھے ہوئے میں نے رقاصہ کو دیکھا تھا جس کا جوان اور رکا سا جسم بل کھا کھا کر مردوں کو دعوت نظارہ دے رہا تھا میں نے اُبال کھاتے سوڈے کو گلاس میں ڈالا تھا اور میری نظر رقاصہ کی طرف اٹھ گئی تھی...... وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے آنکھ میچ کر مجھے مسکرا کر دیکھا تھا .... میں بھی مسکرا دی تھی..... اس کی آنکھوں میں پہچان تھی.... کون سے رشتے کی پہچان؟ گلاس میرے ہاتھوں میں ساکن ہو گیا تھا۔ اور گناہوں کا بوجھ دل پر بھاری پتھر کی طرح لگنے لگا تھا۔ ایسے گناہ جو قسمت کے لکھے کی طرح میری زندگی کی راہ میں آتے گئے تھے۔ ہم دونوں عورتیں تھیں پر اس کی میچی ہوئی آنکھ میں ایک اشارہ تھا ننگا اور عریاں سا۔ اور میں نے جلدی سے گلاس کو اپنے اندر انڈیل لیا تھا۔ اور اپنی ساڑھی کو اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اور اس کی طرف سے منہ پھیر کر دوسری طرف کر لیا تھا۔

وہ تو ایک رقاصہ تھی اور میں حکومت کی ایک ذمہ دار افسر جو اس رنگین محفل میں اپنے شوہر کے ساتھ بلائی گئی تھی..... میرا درجہ تو اس سے کہیں بلند تھا.. میرا ایک مقام تھا۔ میری کرسی اس دنیا کے سٹیج کے اوپر دوسروں کے برابر دھری تھی اور وہ اس سٹیج کے نیچے کھڑی ایک ناچنے والی تھی۔ اور اس نے اپنا رشتہ مجھ کو اس ایک ثانیے کے لیے میچی آنکھ سے سنبھالنے کی کوشش کی تھی.....

مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں بھی بھری محفل میں اس کے ساتھ مل کر ناچ رہی ہوں . . . . میرا جسم بھی سو بل کھا کھا کر دوراں کو بھگانے کی کوشش کر رہا ہو . . . . وہ وہاں سب کے درمیان اپنے آپ پر یقین رکھتے ہوئے ناچتی رہی تھی اور میں اسکو دیکھ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے اور میرے درمیان برابری کا رشتہ ڈھونڈھ نکالا تھا . . . میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ تلخ حقیقت کی طرف سے۔

اور میں نے اس کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا تھا اور تھکاوٹ کی ساری اینٹھن میرے جسم کو بہت بے چین کر گئی تھی اور میں نے ایک اور گلاس کو خالی کر کے اپنا سر کرسی کی پشت پہ ٹیک دیا تھا۔

پچھلے روز رؤف خان نے لکھا تھا "آج کی رات بڑی رنگین ہوگی۔ صرف وہ لوگ ہوں گے جو ہمارے قریبی دوست ہیں۔ فیصل چند مہینوں کے لیے وطن سے باہر جا رہا ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس کے ساتھ مل کر آج کی رات منائی جائے اور اس نے بھی تاکیداً لکھا ہے کہ تمہیں ضرور بلاؤں مسٹر جمال کو بھی لے کر آنا اس کے لیے ڈھیروں شراب ہوگی . . . . اور . . . . باقی آکر دیکھ لینا" اس دعوت نامہ کو دیکھ کر میں نے اپنی بہترین ساڑھی نکالی تھی اور جب جمال دفتر سے آیا تو میں نے اسے چلنے کے لیے کہا تھا وہ دفتر سے تھکا ہوا آیا تھا . . . اور ڈرائینگ روم کے صوفہ پر جوتوں سمیت لیٹا سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمارے دونوں بیٹے قالین پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔ جمال نے میری طرف غصے سے دیکھا تھا اور پھر سگریٹ کی راکھ کو قالین پر جھاڑتے ہوئے کہا تھا . . . .

یہ تمہارا یار فیصل۔ اس قدر کمینہ انسان ہے۔ کتے کے بچے نے ابھی تک میرے کیس کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تم اسے کہتی کیوں نہیں ہو۔ اگر اگلی بار بھی اس نے ٹال مٹول کی تو۔ یاد رکھنا میں اسے اٹھا کر گلی میں نہ پھینک دوں تو میرا نام جمال نہیں . . . . ماں کا یار روز چلا آتا ہے اور اس نے اپنے گندے جوتوں سمیت صوفہ کو زور سے ٹھوکر ماری تھی میرے بڑے بیٹے سلمان نے ایک تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

امی جان۔ دیکھا آپ نے۔ آپ تو مجھے کچھ نہیں بتاتی ہیں۔ لیکن مجھے بہت کچھ معلوم ہے یہ ایک بڑا سا پیٹ ہے جس سے بچے نکل رہے ہیں۔ دیکھیں یہ ہوئے چار بچے اور یہ سب سے پیچھے بھی ایک بچہ ہے جو ابھی بڑا نہیں ہوا۔

اور میں اُس تصویر کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ ہم اپنے بچوں کو اس کے علاوہ اور کیا سکھا سکتے ہیں ہم انسان جو نئی اقدار کی چندھیا دینے والی روشنی میں اندھوں کی طرح آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں نہ آگے کچھ دکھائی دیتا ہے اور نہ پیچھے کی روشنی ہم تک پہنچی ہے۔ ہم بھی وقت کی کوکھ سے نکلتے کیڑے ہیں جو کلبلا رہے ہیں۔ ضرورتوں کے تنگ گڑھے میں گھرے ہوئے اور قید۔ اس قید سے مفر نہیں اور میں نے بچوں کی میوزیکل چیئر پہ بیٹھ کر سوئچ کو آن کر دیا تھا۔ اور جلترنگ کی لہروں کے ساتھ ہلکورے لیتی خالی ذہن اپنے بچوں اور شوہر کو دیکھنے لگی تھی . . . . جمال کے چہرے پہ مایوسی تھی . . . . وہ بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا اور میں ڈر رہی تھی کہ اب وہ کسی بھی موقعہ کی آڑ لے کر مجھے بے تحاشا گالیاں دے گا اور پھر کسی نہ کسی الماری سے چھپائی ہوئی شراب کی بوتل نکالے گا

اور بچوں کی موجودگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پینے لگ جائے گا اور پھر بڑی ہوس ناک نگاہوں سے مجھے دیکھے گا۔ جیسے میں اس کی بیوی نہیں ہوں بلکہ کوئی دوسری عورت ہوں . . . کوئی بازاری عورت . . . .

میں صرف ایک عورت ہوں۔ بغیر کسی مقدس رشتے کے۔ میں اپنے دونوں بیٹوں کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہوں۔

رافیل کہتا ہے "امو جان ابو یہ دوائی سی کیوں پیتے رہتے ہیں۔ کیا یہ ہمیشہ بیمار رہتے ہیں؟" اور میں اسے کہنا چاہتی ہوں۔

میرے بیٹے ہمارے ذہن بیمار ہیں۔ ہمارے جسم بیمار ہیں ہماری تہذیب بیمار ہے میں تمہیں کس کس بیماری کا بتاؤں . . . ہم تو ایک ناسور ہیں جو ماڈرن وقت کے اندر پل رہے ہیں۔ بڑھ رہے ہیں لیکن میں یہ تمام باتیں اس سے کیسے کہہ سکتی تھی۔ اور وہ جمال کو عجیب پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا . . . اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور نفرت تھی۔ "آج اس کمرے کے پنکھے سے بات کرنا پاس بنا پھرتا ہے" اور جمال نے خوبصورت گدی کو مروڑ کر سر کے نیچے رکھ کر دوسری طرف کروٹ بدل لی تھی . . . اس لیے مجھے جمال کا خیال نہیں آیا تھا۔ مجھے جمال کے پاس فیصل کا خیال نہیں تھا۔ میں تو صرف اس خوبصورت گدی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو جمال نے مروڑ کر سر کے نیچے رکھ لی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر جمال سے کہنا چاہا تھا۔ جمال کُشن کو سیدھا رکھو۔ اس ڈرائینگ روم کی تمام چیزوں کی قیمت میں نے جس انداز سے چکائی ہے وہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی . . . ہمیں ان چیزوں کی قدر کرنی چاہیئے زندگی کی آسائشیں بڑی مشکل سے ملتی ہیں۔

لیکن میں میوزیکل چیئر پر بیٹھی ہلکورے لیتی رہی تھی اور میرے بچے اپنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ جمال میری طرف پشت کئے سوتا رہا تھا . . . اور میں ان کی تمام خوبصورت چیزوں کو دیکھتی جا رہی تھی جو میرے اردگرد سجی ہوئی تھیں۔

زندگی کا دھارا کتنا تیز بہتا جا رہا ہے۔ اور میں یادوں کے سنگین اور نوکیلے پتھروں کو پھلانگتی زخمی پاؤں لیے بہت پیچھے کو چلی پڑی ہوں . . . . . . . وقت میرے پاس سے شاں شاں کی تیز و تند آوازوں کے ساتھ گذرتا جا رہا ہے۔

میرے پاؤں زخمی ہیں . . . میرا دل درماندہ اور اداس ہے۔ ارغوانی پردوں سے پار ایک رات ہے۔ اکیلی اور نمکین۔ میری طرح . . . . .

اندھیروں اندھیروں میں کتنا فرق ہوتا ہے . . . میں نے اپنے بھاری سر کو دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے سوچا ہے۔

نرگس کے پھولوں کی تیز خوشبو میرے چاروں طرف منڈلا رہی ہے لیکن میں تو اس آنگن میں کھڑی ہوں جہاں چنبیلی کی اکیلی اداس جھاڑی تھی۔ اور جس کے پاس میری ماں کا مونڈھا بچھا رہتا تھا۔ میں نے وہاں ایک لڑکی کو کھڑے دیکھا ہے جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ سکول جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ اس کا ململی دوپٹہ اس کے آنسوؤں کو

جذب کتنا جا رہا ہے۔

کیا وہ میں ہوں۔ . . کیا وہ میں ہوں . . . میرا دل تیز تیز میرے پہلو میں دھڑک رہا ہے۔ گذرے وقت کی دھول سے اس ہیولے کو مدھم سا کر دیا ہے۔ لیکن میں اس کی پہچان سے انکار نہیں کر سکتی . . . ہاں وہ میں ہی تو ہوں . . .

ماں ہماری استانی فیس مانگ رہی تھیں۔ اگر آج بھی فیس نہ ملی تو اسکول سے میرا نام کٹ جائے گا۔ میرے چہرے پر شرمندگی اور دکھ کی سیاہی مل کر بدصورتی پیدا کر رہی ہے۔

ماں نے سروتہ چلاتے ہوئے تیزی سے کہا تھا میں کیا جانوں تمہارا نام کٹ جائے یا سے ہے۔ میرے نصیب تو پھوٹ ہی چکے ہیں۔ تمہارے جلے نصیبوں کو روؤں یا اپنی بدنصیبی کو بہت جاؤ اسکول۔ گھر بیٹھ کر میرے سینے پر مونگ دلو۔" ماں کے چہرے پر انتہائی بے زاری تھی۔

ماں میں کیا کروں . . . میں ماں سے پیار اور دلاسے کے دو لفظ سننا چاہتی تھی۔ لیکن ماں نے میری طرف ایک لحظہ کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ دنیا بالکل اجاڑ لگ رہی تھی۔ اپنے گھر کے آنگن کی طرح جو ہمیشہ اڑتی دھول سے اٹا رہتا تھا آپا جو باورچی خانے کے دروازے سے لگی کھڑی تھی کہنے لگی سلو آج تو سکول جاؤ۔ ناحق اماں کو پریشان کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ آپا کی آواز کی تلخی میں محبت کی نرمی اور گرمی تھی۔

میں نے اپنے دوپٹے سے منہ کو اچھی طرح پونچھ لیا تھا اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔ میرے دل میں حیات کی تلخی اور ویرانی تھی اوپر آسمان خزاں زدہ اجاڑ لگ رہا تھا۔

اس روز جب میں سکول سے واپس آئی تو آپا نے چپکے سے میرے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھماتے ہوئے کہا تھا۔

سلو۔ اماں سے مت کہنا۔

پر بڑی آپا تم نے اتنے سارے روپے کہاں سے لیے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔ اور آپا نے جلدی سے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا تھا۔

سلو۔ ہر بات کا جواب نہیں ہوتا۔ اور وہ باورچی خانہ کی چوکھٹ سے لگ کر رونے لگ گئی تھی۔

بڑی آپا بتاؤ نا اتنے روپے کہاں سے آئے ہیں۔ میں کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے دوبارہ بولی . . .

سلو جان . . . انسان کبھی کبھی کوئی چیز نہ بیچنا چاہتے ہوئے بھی بیچ دیتا ہے۔ تمہیں اس سے کیا تمہیں فیس چاہیئے تھی۔ پر اماں سے کچھ مت کہنا۔ اس نے پلو سے آنسو صاف کر لیے۔ اپنے بالوں کو ہاتھ سے سنوارا اور جانماز بچھا کر نماز پڑھنے لگ گئی تھیں۔ اور جب میں نے ان روپوں کو مٹھی میں دبایا تو مجھے لگا تھا جیسے میری مٹھی دہک رہی ہو آسمان اور بھی مٹیالا لگ رہا تھا صحن میں چنبیلی کی جھاڑی پر کوئی بھی پھول نہیں۔ میں نے اپنے گرد آلود پاؤں کو چپلوں سے آزاد کر

لیا اور وہ بے قدموں سوتی ہوئی اماں کے پہلو میں لیٹ گئی تھی۔

میں نے جب آخری بار آپا کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور میرا دل چاہا تھا کہ میں اپنی مٹھی میں دبے روپوں کو پرزہ پرزہ کر کے بڑی آپا کے سامنے پھینک کر کہوں ۔

مت رو بڑی آپا۔ تمہارے آنسوؤں کی قیمت تو کہیں زیادہ ہونا چاہیے۔ لیکن میں نے اپنی مندی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا تھا کل مجھے ساری کلاس کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ . . کل میں سب سے پہلے اپنی استانی کو فیس دے دوں گی۔ . . . کل . . . کل . . . . اور میری آنکھ تب کھلی تھی جب اماں روپوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑے غصے سے بول رہی تھیں۔

ارے سلطنت۔ کہاں سے لیے ہیں تم نے یہ روپے . . . . اور میں بڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔ آپا دوسرے کمرے کے سامنے کھڑی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ . . . . ان کے چہرے پر زردی تھی۔ سردیوں کی دھوپ ایسی زردی جس میں غنودگی سے پوری طرح آزاد ہو گئی تھی۔

کہاں سے لیے ہیں یہ روپے . . . . کہاں سے لیے ہیں یہ روپے . . . اماں نے پوری قوت سے میرے بال پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

بڑی آپا نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔ بتا کیوں نہیں دیتی مجھ سے تو کہا تھا حشمت سے ادھار لیے ہیں . . . .

ارے بولتی کیوں نہیں ہو . . . . اماں کی نظروں میں بے یقینی تھی۔

اماں بڑی آپا نے تو کہا ہے کہ حشمت سے ادھار لیے ہیں اور میں اس گرمیوں کی لو میں کھڑی ٹھنڈی ہو گئی تھی ادھار . . . ادھار میں کہاں سے اتنا ادھار واپس کروں گی . . . . اماں بڑبڑاتی ہوئی صحن میں وضو کے لیے چلی گئی تھیں۔

میں نے بڑی آپا کو دیکھا۔ وہ دوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھ رہی تھیں۔

چنبیلی کی جھاڑی پر چند کلیاں کھلی تھیں۔ کمرے کے اندر دیے کی مدھم لو صحن میں مدقوق سی روشنی پھیلا رہی تھی اوپر ہمارے صحن پر تنے آسمان کے چھوٹے سے ٹکڑے پر ان گنت ستاروں کا جال بچھا تھا۔ آپا نے ایک کلی کو توڑا اور دھیرے دھیرے اسے سونگھتے ہوئے گھڑے کے پاس بیٹھ کر اپنے ہاتھ دھونے لگی جیسے وہ کریم کے ہاتھ کے لمس کو مٹانا چاہتی ہو۔

اس رات چھت پر چلنگا سی چارپائی پر لیٹی میں ساری رات جاگتی رہی تھی۔ اور زندگی کے اس تاریک راہ کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ جو ہمارے گھر کے اندر سے شروع ہو کر سارے جہان میں پھیل گیا تھا۔

اُس رات اور آج کی رات میں ایک زمانے کا جان لیوا فاصلہ ہے۔ میں اس رات بھی جاگتی رہی تھی یہ سوچتے ہوئے کہ کب تک آپا ڈیوڑھی کے اندھیرے میں کھڑی کریم کی بدصورتی سے پہلو بچاتی رہے گی۔ اور آخر اپنے ہاتھوں کو دھوتی رہے

گی۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔۔۔ میں نے ایک ٹوٹتے تارے کو فضا کی وسعتوں میں گم ہوتے دیکھ کر سوچا تھا۔۔۔۔ اور اس سفر کا آغاز کیا تھا جو آج کی رات مجھے ان ارغوانی پردوں میں مقید کر گیا ہے جسم کا یہ جہنم زار بڑا خوفناک تھا۔ اور میں کتابوں کو سینے سے لگائے بغیر کسی کو بتائے اس دوزخ کی آگ میں جلتی رہی تھی۔ بھسم ہوتی رہی تھی۔ مجھ پر سارے راز عیاں ہو گئے تھے۔

بڑی آپا نے ایک روز پوچھا تھا۔ سلو تم اب فیس کے لیے اماں سے بھی کچھ نہیں کہتی ہو۔ رشید بھیا سے بھی نہیں پوچھتی ہو۔۔۔

اس وقت بڑی آپا بستر پر لیٹی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی اور میں نے بغیر کسی جھجک کے کہا تھا۔

"بڑی آپا میں بھی تو عورت ہوں"۔ آپا کے ہاتھوں سے رسالہ گر گیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئی تھیں۔

سلو۔۔۔ آپا نے زیرِ لب میرے نام کو دہرایا تھا۔ میرے ہونٹوں پر طنزیہ ہنسی پھیل گئی تھی۔ اور میرا چھوٹا سا وجود میرے اندر پھیل گیا تھا۔ لیکن اس تمام پھیلاؤ کے اندر میرا دل سِمٹ رہا تھا۔ مٹ رہا تھا۔

ہاں آپا۔۔۔۔ میں تمہیں ناحق تکلیف کیوں دوں۔۔۔۔ جب بھی رات کے اندھیرے میں تمہیں ہاتھ دھوتے دیکھتی ہوں تو خود کو مجرم سمجھنے لگتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے لیے کیوں مجبور کروں۔

سلو یہ راہ بڑا خطرناک ہے۔ تم ٹھوکر کھا گئی تو۔۔۔۔

تو پھر کیا ہوگا۔۔۔۔ اس کی آواز خوف سے بھاری تھی۔۔۔۔ اماں تمہیں جان سے مار دیں گی۔

ہوں۔۔۔ اماں مار دیں گی۔ ہٹو بڑی آپا کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم ہی بتاؤ کتنے مہینوں سے اماں نے کبھی پوچھا بھی ہے کہ میں فیس کہاں سے دیتی ہوں۔

اور بڑی آپا یہ راستہ میرے دل سے تو نہیں گزرتا۔ عورت دل سے مجبور ہو کر گرتی ہے۔ میرے پاس دل نہیں صرف مجبوری ہے۔ اس تمام تپتی ہوئی اور خاردار راہ کے پار ایک سویرا ہے۔ ایسا سویرا جو میری کتابوں میں چھپا ہے میں صرف اس کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔ اور میں اسے ڈھونڈ کر ہی دم لوں گی۔۔۔۔

میں کیوں ڈروں اور کس سے ڈروں۔ بھائی سے اماں سے یا تم سے کون میری مدد کرے گا کون میری مدد کرتا ہے۔ میں نے اپنے اندر امڈتے آنسوؤں کو زبردستی روکا تھا۔۔ کیونکہ آنسو کسی مشکل کا حل نہیں ہوتے۔

بڑی آپا نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔ میں کس طرح تمہیں ان ویران راہوں سے بچاؤں۔۔۔ بڑی آپا کا جسم ٹھنڈا تھا۔

تم فکر نہ کرو بڑی آپا۔۔۔ میں اب بچی نہیں ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اس سے چھپانے کی کوشش کی۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکتا تھا۔ گلی کا فرش دھول سے اٹا پڑا تھا۔ نالیوں کی بدبو کے تیز جھونکوں کے ساتھ

مل کر میرا سانس گھونٹ رہی تھی اور اپنے بڑے ہونے کا احساس مجھے مجروح کر رہا تھا۔

سامنے اپنی بیٹھک کے دروازے پر کھڑا احسان ایک بہت ہی عریاں گیت گا رہا تھا۔۔۔ میں نے اسے دیکھ کر ایک مصنوعی ہنسی اپنے لبوں پر لانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے جلدی سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے اور ان کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔۔۔ میری ہمت کا حصار اس لمحہ بڑی آپا کی رفاقت میں ڈھے گیا تھا۔ اور میں نے سوچا میں کیوں دوسروں کی طرح زندگی کے دھارے میں بہنا نہیں چاہتی۔ میں کیوں اس منزل کی تلاش میں ہوں جس کا مبہم سا خاکہ میرے ذہن کے پوشیدہ کونوں میں ابھرنے کی کوشش کرتا ہے اور میں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھ کر اسے اپنی گرفت میں کر لینا چاہتی ہوں میں کیوں زندگی کے سیدھے سادھے راہ پر نہیں چلتی۔۔۔ اور روتے ہوئے بھی میں جانتی تھی کہ اپنے اس خواب کو ادھورا چھوڑنا میرے بس کی بات نہیں۔۔۔ اپنے ناتواں قدموں پر اکیلے ہی چل کر مجھے اس راہ کو طے کرنا ہے۔

آج کی رنگین رات کا سودا کوئی سودا نہ تھا۔ جمال نے آئینے میں اپنے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے ایک گیت گایا تھا اور اپنے بھاری پپوٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

سلی آج فیصل کو ضرور کہنا کہ میرے کیس کا جلدی فیصلہ کر دے۔ اتنے سے غبن سے محکمہ میں کون سا زبردست گھاٹا پڑ جائے گا۔ اور وہ خود کیا کرتا ہے سب سے بڑا ایٹرا۔۔۔ بہترین ہوٹلوں میں ٹھہرتا ہے۔ بہترین شراب پیتا اور بہترین سوسائٹی میں گھومتا ہے۔ اور پھر ہمارا سوشل سٹیٹس اس سے کم تو نہیں۔

فیصل نے پچھلی دفعہ وعدہ تو کیا تھا کہ وہ اس مقدمے کو جلد ہی فائل کر دے گا۔ مصروف رہا ہوگا۔ میں نے اپنے بچے کو بستر پر لٹا کر اس پر کمبل اڑھاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ مجھے دوسروں سے کام کروانے کے تمام طریقے آتے تھے۔ میرے اپنے محکمے کے افسر جمال کے محکمے کے لوگ۔ وہ سب لوگ ان گنت بار میرے گھر سے مدہوش ہو کر گئے تھے۔ وہ سب آنکھوں آنکھوں میں مجھے بڑے ہی الوکھے اور عجیب پیغام دیتے ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ ایک ہی صوفے میں دھنسی ان کے عریاں لطیفوں سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ کیونکہ میرے اندر کی شرمیلی عورت آزماتے ہوئے مر چکی ہے۔ وہ تو اس روز ہی مر گئی تھی۔ جب اماں نے ایک روز چیخ کر پوچھا تھا۔

بتا ری حرافہ۔ رات کہاں رہی ہو۔ رات کون سے کوٹھے پر گزار کر آئی ہو۔ اور میں نے ایک بار پھر سچ بولنے کا سوچ لیا تھا۔ میں جھوٹ کیوں بولوں اور پھر اماں کے سامنے۔ اماں جس نے زندگی کی لمبائی کو سروتے کی گھٹ گھٹ سے ماپا ہو اور پان کی گلوری سمجھ کر منہ میں ڈال لیا ہو۔

زندگی تو میری تھی جو جہنم سے ہو کر گزر رہی تھی۔ اور ہر امتحان میں پاس ہو کر میں نے ساری ساری رات آنسو بہائے تھے اور پھر اپنی منزل کی طرف ایک نئے عزم سے چل پڑی تھی۔ اپنے آپ کو سہارا دیتے ہوئے میں نے سیدھا اماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اماں تم ایک رات کا حساب اس قدر چیخ کر کیوں پوچھ رہی ہو۔ تم ان دنوں کا حساب کیوں نہیں پوچھتی ہو جو میں نے اس رات کی طرح گزارے ہیں۔ اماں تم ان

زخموں کا حساب کیوں نہیں جانتی ہو جو میرے جسم سے گزر کر میری روح کو گھائل کر گئے ہیں۔ اماں تم ان آنسوؤں کو کس پیمانے سے ماپو گی جو میں نے اکیلے ہی بہا دیئے ہیں اماں میں تمہیں کس کس بات کا حساب دوں گی آج تم نے مجھے اس بات پہ ٹوکا ہے جب سے رنگ کی اصلی پہچان کو میں بھولتی جا رہی ہوں۔ اور اب تو منزل بس ایک ہی قدم پہ تو ہے۔ کیا ان تمام برسوں کے پیپے تمہیں یاد نہیں اور اماں کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ تم نے مجھے کبھی بھی فیس کے پیسے نہیں دیئے۔ اماں تم جان بوجھ کر بھولتی ہو اور بھول کر بھی جانتی ہو۔

اور اماں نے بید کی پتلی سی چھڑی کو میرے جسم پہ توڑ دیا تھا اور کہا تھا تو تو ہمیشہ سے ہی غنڈی تھی . . . حرافہ! اماں کو میں بتانا چاہتی تھی کہ کل کی رات میں نے کہاں گذاری تھی تا کہ اماں جو جان بوجھ کر اندھیرا اپنے گرد تانے رہتی تھیں، وہ چھٹ جاتا اور پھر انہیں میرا اور اپنا وجود صحیح رنگ میں نظر آتا . . . اور وہ پہچان جاتیں کہ ہم دونوں میں سے غنڈہ کون ہے اور کتنا بڑا۔

آپا ہمیشہ کی طرح میرے سامنے کھڑی ہو کر اماں کے بیدوں سے مجھے بچاتی رہی تھی . . . اور میں نے پہلی دفعہ اس کی بیماری کی شدت کا اندازہ کیا تھا۔ وہ کسی بھوت کی مانند ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں . . . لیکن پھر بھی اطمینان اور سکھ کا سایہ ان کے چہرے پہ گہرا ہوتا جا رہا تھا . . . میں جو اپنے سارے بوجھوں اور دکھوں تلے دبی اکیلی ہی تڑپتی رہتی تھی۔ اس کی موجودگی میں اپنے آپ کو اتنا لاچار اور بے بس نہیں سمجھتی تھی۔ اور میرا یہ سہارا ابھی چھوٹنے والا تھا . . . پھر میں کیا کروں گی۔ میں نے خوفزدہ ہو کر سوچا تھا۔ اس رات میں نے آپا کو بتایا تھا کہ کل کی رات میں نے کہاں گذاری تھی۔ کل کی رات میں نے ایک سودا چکانے کے لیے عارف کے سٹوڈیو میں گزاری تھی۔ عارف کے سٹوڈیو کے پچھلے اندھیرے کمرے میں جہاں عارف نے اپنے روپوں کی قیمت وصول کرنی چاہی تھی تو میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔

عارف تم تو جمال کے دوست ہو . . .

"رکو میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔ اور پھر تم میرے اشاروں پہ ناچو گی" اس نے ایک ٹیپ ریکارڈ لا کر میرے سامنے میز پہ رکھ کر آن کر دیا۔ اور میں سن سی ردی کینوس کے ڈھیروں، بے کار برشوں۔ رنگوں کی خالی ڈبیوں کے درمیان بیٹھی رہ گئی تھی۔

اور مجھے وہ دن یاد آ رہا تھا جب اپنے ایم اے فائینل کے داخلے کی آخری تاریخ پر بھی پورے روپے اکٹھے نہیں کر سکی تھی اور عارف کے پاس اس کے سٹوڈیو گئی تھی۔ میں جمال کے سامنے اپنا بھرم گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ جمال جو مجھے سب لوگوں سے الگ لگتا تھا۔ زیادہ اپنا سا۔ یونیورسٹی کے برآمدوں میں اکثر کہیں نہ کہیں سے آ کر مجھ سے ٹکرا جاتا اور پھر ہم دونوں مسکرا دیتے۔ میں عارف کے پاس گئی تھی۔ جمال کے پاس نہیں۔ کیونکہ جمال تو میرے دل کا مرد تھا جس کا میرے جسم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں اسے اپنے دل کے نہاں خانہ میں چھپا کر رکھنا چاہتی تھی عارف نے برش کو رنگ میں ڈبوتے ہوئے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔

میں روپے دینے کو تیار ہوں۔ جتنے مانگو۔ اور واپس کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔
وہ لاپرواہی سے بڑے سے کینوس پہ رنگ بکھیرتا جا رہا تھا۔ رنگ جس سے کائنات کی خوبصورتی ہے اور
میں وقت کے گزرنے پہ دل ہی دل میں گھبرا رہی تھی۔ گزرے سال کے دن اور راتیں جو رینگ رینگ گزر رہے تھے
میں روپے جلدی ہی لوٹا دوں گی۔۔۔ میں نے اس اندھیرے کمرے میں گھٹن سی محسوس کرتے ہوئے پہنچا
سے کہا۔ روپوں کی فکر کیوں کرتی ہو اور میرے پاس بیٹھ گیا تھا۔۔ اس نے اپنا بازو میری کمر میں ڈال لیا تھا۔۔۔ ہاں
اس دنیا میں ہر چیز بکتی ہے۔۔۔ یہ عارف تو جمال کا دوست تھا۔۔ اور میں تو ادھار لینے آئی تھی۔

میں نے اس وقت اس سے جمال کی باتیں کرنا چاہی تھیں۔ لیکن اس نے کہا تھا "گولی مارو جمال کے ذکر کو۔ کچھ میرا بھی ذکر کرو میری جان۔ اور میں نے ہنس کر اسے ٹالنا چاہا تھا۔۔۔۔۔

میں نے کہا عارف اس وقت میں جانا چاہتی ہوں۔ پھر کسی روز آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔۔۔۔ اور اس نے مجھے جانے دیا تھا۔ صرف ایک طویل بوسے کے بعد جو ایک عجیب آواز میں ختم ہوا تھا۔ میں تو قیمت چکا آئی تھی۔۔۔۔ اب کی بار بھی سہی میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا۔

اور پھر کل اس نے یونیورسٹی میں آکر کہا تھا۔۔ "آج میرے سٹوڈیو ضرور آنا۔۔۔ بہت ضروری بات ہے۔
"میں نے کہا تھا۔ میں پڑھائی میں مصروف ہوں۔ آنہ سکوں گی" اور اس نے کہا تھا "اگر نہ آئی تو پچھتاؤ گی۔ جمال کو پا نہ سکو گی" اس کی آواز میں خوفناک دھمکی تھی اور میں اس کو سمجھانے گئی تھی۔۔۔ اس کی منت کرنے گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا میں اماں کی بالیاں چرا کر بیچ دوں گی۔۔۔۔ کچھ بھی کروں لیکن عارف کے روپے لوٹا دوں گی۔

اس نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا تھا اور میرے سامنے کھڑا پوری شیطانیت اور اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔۔۔
"تم۔۔۔ تم غنڈے بدمعاش"۔۔ اور میں نے آگے بڑھ کر ٹیپ ریکارڈ کو توڑ دینا چاہا تھا۔
اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا تھا۔ تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔ تمہیں شاید نہیں معلوم کہ ساری یونیورسٹی تمہیں کیا سمجھ رہی ہے۔ میری جان۔ سب لڑکے تمہیں بنتہ الف کی بدمعاش سمجھتے ہیں۔ اور وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا تھا۔ اور اتنے روپوں میں صرف آج کی رات۔ سودا مہنگا نہیں"۔۔ اور میں اس کی گرفت میں پھڑپھڑائی بھی نہیں تھی۔۔۔ بس شدت سے روتی رہی تھی۔۔۔۔ اس نے مجھے صوفے پہ بٹھا دیا تھا۔۔۔ اور سگریٹ کے کش لیتا میری طرف دیکھتا رہا تھا۔

اور پھر اس تمام بگاڑ کے درمیان میں نے اس ٹیپ ریکارڈ کی ریل کے بدلے ایک سودا چکایا تھا۔۔۔ میں جمال کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جمال تو میرے سفر کی آخری منزل تھی۔ اس کے بعد مجھے کہیں نہیں جانا تھا۔ میں تھک چکی تھی۔۔۔۔ اور نیچے بازار میں ان گنت آوازوں کا شور تھا۔ میری آواز کون سنتا۔ کتنے ہی دنوں بعد جب میں یونیورسٹی گئی تو جمال نے کہا تھا۔

میں تو تمہارا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گیا تھا۔ کیا ہوا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ جمال آؤ چلیں۔۔۔ کہیں سیر کو چلیں۔۔۔ میں اتنے دن گھر میں رو کر سخت بور ہو چکی ہوں۔ اس نے جواب دیا تھا۔۔۔ میں ذرا عارف کو مل لوں۔ اس سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ آؤ میرے ساتھ "

میں وہاں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میں جمال کو کیا بتاتی۔ اور جب ہم اس کے سٹوڈیو پہنچے تو بارش پھوار کی صورت گرنے لگی تھی سڑک پر گاڑیاں فراٹے بھرتی گزر رہی تھیں اور جمال بات بات پر ہنس رہا تھا۔۔۔

" بہت خوش ہو گیا؟ میں نے پوچھا تھا۔۔۔ ہاں میں خوش ہوں۔ اتنے دنوں بعد مل کر بھی خوش نہ ہوتا۔۔۔ سچ بتاؤ کیا تم بھی اداس ہوئی تھیں۔۔۔

اور میں نے لوگوں کے ہجوم سے گزرتی اپنی خوشی کے بارے میں سوچنا چاہا تھا۔ یہی خوشی کیا چیز ہوتی ہے۔ ایسی خوشی جو کنواریاں کسی کو اپنی طرف دیکھ کر محسوس کرتی ہیں۔ میری خوشی تو میرے گھر کی ڈیوڑھی نے نگل لی تھی۔ میری خوشی تو حشمت بھائی نے چرا لی تھی۔۔۔۔ میری خوشی تو رحمان نے چھین لی تھی۔۔۔ میں نے تو ایسی خوشی کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں تو مجبوریوں کی زنجیر سے بندھی ایک ہی جگہ کھڑی تھی۔ اور وہاں لوگوں کے ہجوم کے درمیان سے گزرتے میں نے اس خوشی کے بارے میں پوچھا تھا جو میرے دل کی پہچان سے بہت دور تھی۔ میں تو بس جمال کی ٹھنڈی چھاؤں تلے سو جانا چاہتی تھی۔ اور جب ہم عارف کے سٹوڈیو میں داخل ہوئے تو اس نے جمال سے چھپ کر مجھے آنکھ ماری تھی۔۔۔ اور میں گھبرا کر اس اکیلی کھڑکی پہ جھک گئی تھی۔ جو گندے اور تنگ مکانوں کی پشت پر کھلتی تھی۔۔۔ جہاں کرسیاں بنانے والے اور فلمی بورڈ پینٹ کرنے والے گندے کپڑوں کے ساتھ کاموں میں مصروف تھے اور ایک جوان لڑکی بغیر دوپٹے کے کھڑی بڑی بے باکی سے آتے جاتے مردوں کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ اسے دیکھ کر میرا دل اداس ہو گیا تھا۔۔۔

اور جمال نے میرے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا کیا سوچ رہی ہو سلی۔ باہر ہم سے بھی زیادہ دلچسپ نظارہ ہے؟ اور میں نے اپنے اکیلے پن کے بوجھ سے گھبرا کر اس کے کندھے سے سر ٹکا دیا تھا اور انوکھی سی خوشی میرے انگ انگ میں سرائیت کرتی جا رہی تھی۔ اور کرسیاں بنتے مرد؟ اور بڑے بڑے پوسٹر رنگتے ہوئے گرد آلود چہرے مجھے ایک دم سے اچھے لگنے لگے تھے۔ اور عارف کا تنگ سا سٹوڈیو۔۔۔۔ مجھے عارف کا خیال ایک دم ڈس گیا تھا۔

عارف کو میں نے دیکھنا چاہا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ اور جمال ہنس دیا تھا اور پھر ہم وہاں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ جمال کی باتیں سن کر میرے تمام گناہ ایک ایک کر کے میرے ذہن پہ ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ میں اس گناہ آلود جسم کے ساتھ جمال کو کس طرح دھوکا دے سکتی تھی۔۔۔۔

اور پھر جمال بھی ایک مرد بن گیا۔ میں نے روتے ہوئے کہا تھا۔ جمال تم نے یہ کیا کیا؟ اور جمال نے کہا تھا۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ کہو تو ابھی کسی مولوی کو بلا لوں۔۔۔ میں نے یہ لفظ بارہا سنے تھے۔ لیکن میں نے ان کی سچائی کو کبھی آزمانا نہیں چاہا تھا۔ میں جو سودا خرید تی تھی۔۔۔۔ اس میں دل کو دخل نہیں تھا اور پھر مری منزل تو دور

تھی۔ اور اس روز جب میں نے دل کی تمام سچائی کے ساتھ جمال کی باتیں سنیں اور انہیں یقین کر لیا تھا تو جمال بھی ایک مرد بن گیا تھا محض ایک مرد اور میں وہ عورت تھی جو مجبوریوں کے ہاتھ بکتی رہی تھی اور بکتی رہے گی۔ میں رونے لگی تھی اور جمال نے کہا تھا۔۔۔۔ "سلی مجھ پر یقین کرو"

"کیسے یقین کروں۔۔ کس بھروسے پر" تو جمال دروازہ کھول کر جاتے ہوئے کہنے لگا تھا "ایک گھنٹہ بس ایک ایک گھنٹہ" اور اس زندگی کے ظلمات میں گھری میں یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکتی اس ایک گھنٹے کے پل صراط کو پار کر گئی تھی۔۔۔۔ جمال اپنے دو دوستوں اور ایک سفید ریش مولوی کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔ اور پھر جب میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تو پچھلی زندگی کی تاریکیاں مجھے اپنے جسم سے الگ ہوتی لگی تھیں۔۔۔۔۔ روشنی کی ایک نئی اور انوکھی سی کرن دھیرے دھیرے میرے اندر اتر گئی اور میں ان بڑے بڑے آویزاں کینوسوں کے درمیان جمال کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑی رہی تھی۔ میں سچی خوشی سے مسکراتی تھی لیکن پھر آنسو میرے مسکراتے ہونٹوں کو تر کر کے گرنے لگے میں نے اس کھڑکی سے باہر جھانکا تھا باہر اندھیرا تھا۔ لیکن جمال نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ حیات کی خار دار راہوں پر چلتے چلتے مجھے یہ وقت عجیب اور انوکھا لگا تھا۔ اور اس وقت کی خوشی نے میرے ذہن سے ماضی کو مٹا ڈالا تھا۔ میرے جسم کی تمام گندگی اس لمحے کی پاکیزگی سے دھل کر مٹ چکی تھی۔ اور میرے اندر کی شرمیلی لڑکی میرے دل کے ساتھ لگی مجھے جھانکنے لگی تھی لیکن یہ لڑکی ہمیشہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ اور جمال کے دوستوں کی باتوں اور قہقہوں نے میری زندگی کو ایسے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ جو بہت ہی لذت آمیز اور دلکش تھا۔ جمال کی شخصیت کے تمام پردے اتر چکے تھے۔۔۔۔ احتجاج کس بھروسے پر کرتی۔۔۔۔

جمال نے ایک روز دفتر سے آکر کہا تھا۔ آج شام کی چائے میرا باس میرے ساتھ پیئے گا۔ اچھی سی چائے تیار کرنا۔ گھر کو بھی خوب سجانا۔۔۔۔۔ اور اپنے آپ کو بھی۔۔۔۔ جمال کی آوازیں اپنائیت کی رو میں تھی۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ میری آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

اپنے آپ کو کیوں۔ میرا سجنا کیا ضروری ہے میرا دل انجانے خدشے سے دھڑک اٹھا۔۔۔ زیادہ نہ بنو۔۔۔۔ میں سب جانتا ہوں" جمال نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔۔۔

کیا جانتے ہو۔ میری آواز سے ساری زندگی نچڑ چکی تھی وہی جو تم آج تک مجھ سے چھپاتی رہی ہو وہ میری طرف دیکھ کر طنز سے ہنس دیا تھا۔ اور مجھے لگا جیسے میں تاریکی کی دل دل میں گم ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔ میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا۔۔۔۔ میں تم سے کیا چھپاتی میں نے اپنی آواز میں یقین پیدا کرنا چاہا تھا۔ لیکن میرے اندر کی بے یقینی نے میری آواز کو بے جان بنا دیا تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے تو کوئی ٹھوس زمین نہیں تھی۔۔۔۔ عارف نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں کہتا۔ آج رات میں نے اپنے افسر کی دعوت کی ہے۔ سب چیزوں کا خیال رکھنا۔ میں نے اس پر اپنی مجبوری اور بے گناہی جتانی چاہی تھی۔ لیکن مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرے خواب صرف میرے تھے۔ جمال ان میں کوئی حصہ نہیں بٹائے گا۔ میں نے ان تمام چیزوں کو دیکھا جو اس لمحے سے پہلے تک گھر کو ایک

نقطہ بنائے ہوئے تھیں لیکن اب یہ نقطہ مٹ گیا تھا۔ میرے آگے اندھیرا تھا میرے پیچھے اندھیرا تھا اور میرا سارا وجود ٹوٹا ہوا اور کرچی کرچی اس بے کنار اندھیرے کے درمیان بکھر گیا تھا۔ یہ وہ منزل تو نہ تھی جس کی کھوج میں نے کی تھی یہ وہ گھر تو نہ تھا جس میں جمال مجھے لے کر آیا تھا۔ ... وہ گھر کون سا تھا ... وہ گھر کونسا تھا جس کے خواب میں نے زندگی کی ظلمتوں میں بھی دیکھے تھے میری پناہ کا حصار مسمار ہو گیا تھا۔ اور میں بے یار و ... مددگار اکیلی کھڑی رہ گئی تھی جمال کو پاس ہونے پر نوکری مل گئی تھی۔ لیکن مجھے وہ وقت یاد آرہا تھا جب وہ خوش نہیں تھا کیونکہ اتنے برسوں کی محنت کا معاوضہ اس کی توقعات سے بہت کم تھا۔ جمال کی خواہش بے انداز تھیں، اتنی زیادہ کہ اس کی اپنی ذات بھی ان کے مقابلے میں چھوٹی تھی اس روز وہ میرے گھر مجھے ملنے آیا تھا۔ اور میں بے دھڑک بیٹھک میں اس کے پاس چلی گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر اماں زخمی شیرنی کی طرح پھر رہی ہوں گی۔ پھر اماں نے ایک دم زور سے دروازہ کھولا اور اندر آگئیں ... میں ہنس دی تھی۔

یہ لڑکا کون ہے۔ اماں نے تحکم سے پوچھا ... تم کو تو محلہ داری کا بھی خیال نہیں جو یوں دوستوں کو گھر بھی بلانے لگی ہو ... "اماں یہ میرا دوست نہیں میرا شوہر ہے" اور میں دل ہی دل میں اماں کی شرافت کے معیار پر ہنس پڑی تھی۔ اور مجھے وہ تمام لمحے یاد آگئے جو میں نے اپنے لیے تنہا ہی برداشت کیے تھے۔ میں تو خود ہی اپنی خالق تھی ... مجھ سے بڑا کون تھا۔ کوئی نہیں تھا ... میں نے اپنی کائنات کو اپنی طاقت کے "کن" سے وجود دیا تھا ...

اری فاحشہ ... اماں نے اپنی حیرانگی میں گھرے ہونے کے باوجود مجھے کوسنے دینے کے لیے منہ کھولا تو میں زور سے چلا کر بولی تھی۔

اماں تمہیں یہ سب کچھ کہنے کا کوئی حق نہیں۔ میں بڑی آپا نہیں ہوں جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر مرجاؤں گی ... اور تم میرے مرنے پر شکر کرو گی کہ تمہارے سینے کا ایک بوجھ کم ہوا۔ یہ پل ہوں۔ میں جو ظلمتوں کو پار کر چکی ہوں مجھے تمہاری کوئی پروا، نہیں مجھے دنیا کی کوئی پروا نہیں" میں نے اپنے کپڑے صندوق میں رکھے اور آکر جمال کے پاس کھڑی ہو گئی۔

چلو جمال چلیں ... چلو جمال تمہارے گھر چلیں میں نے جمال کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

لیکن سنو میرے ماں باپ نے بھی مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ جمال شرمندہ ہو رہا تھا ...

تو پھر کیا ہوا۔ ہم دونوں اپنا ایک الگ گھر بنائیں گے میں اپنے گھر کو خوب سجاؤں گی ... میں نے چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ میرے کانوں میں باجوں کی گونج نہیں تھی۔ بابل کے گیت نہیں تھے۔ میں نے اپنے بے رنگ ہاتھوں کو نہیں دیکھا ... میں نے آنسو نہیں بہائے تھے۔ میں نے اپنے سامنے کھڑی اماں کو خدا حافظ بھی نہیں کہا تھا۔ میں تو زمانوں سے اکیلی تھی۔ کائنات کے خالق کی مانند اور اب جمال کا مضبوط ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا ... میں ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے ایک لمحہ کو کھڑی ہو گئی مجھے بڑی آپا یاد آگئی تھی۔ بڑی آپا جب گلے کے کینسر سے سوکھ کر مری ہیں تو لوگ ان کو دیکھ کر ڈرتے تھے۔ لیکن میں نے ان کے ڈھانچہ ہاتھوں کو چوما تھا۔ ان کے سرد بے جان ہونٹوں کو پیار

کیا تھا اداس وقت میں نے جاتے ہوئے دل میں کہا تھا۔ آپا زندگی میں سدا ڈیوڑھی کا اندھیرا نہیں ہوتا۔ کبھی نہ کبھی تو روشنی کی کرن اندھیرے کے بھرم کو توڑ دیتی ہے۔ اور اب یہ روشنی کی کرن میری گرفت میں ہے۔ میں ہر لے سے ہنسی . . . .

میں نے جمال کے پیچھے چلتے ہوئے گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر ایک نظر اپنے گھر کو دیکھا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے بڑی آپا ڈیوڑھی کا دروازہ کھولے کھڑی مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہو۔ اور اس گھر کی طرف راہنمائی کر رہی ہو۔ جہاں سکھ کے فرشتوں کے نرم پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہوگی۔ اس رات جمال کے افسر نے میرے گھر کی تعریف کی تھی۔ اور میں نے پہلی بار جمال کو بے تحاشا شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ایک کے بعد دوسرا پیگ چڑھا رہا تھا۔ اور میں اس کے افسر کے پاس صوفہ پر بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میری پشت پر ایک چٹکی بھری تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دینا چاہا تھا۔ میں نے جمال کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حسی تھی اور وہ خمار آلودہ آنکھوں کے ساتھ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اپنے گلاس کے تیزاب کو اپنے اندر ڈال رہا تھا۔

مسز جمال یو آر ونڈر فل۔ یو آر بیوٹی فل۔ یو آر اے ڈارلنگ . . . . بیبی۔ اور اس نے ایک ہچکی لے کر اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا دیا۔ اس کے سر کے بوجھ کے نیچے میرا جسم پتھر کا ہو گیا تھا اور جمال باہر چلا گیا تھا . . . اور پھر میں نے اپنے اندر کی آگ کو کم کرنے کے لیے ایک پیگ میں تھوڑی سی شراب ڈالی اور جب اس آگ کا گھونٹ میرے اندر گیا تو میں نے گھبرا کر جلدی سے سارا گلاس خالی کر دیا۔ میں اس تلخ حقیقت سے مفر چاہتی تھی۔

جمال کے باس نے میرے گلاس میں اور شراب ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ مائی سویٹ ڈارلنگ شراب بڑی اچھی چیز ہے۔ اس نے میری گردن میں اپنے بازو ڈال دیئے تھے۔ اسی لمحے جمال اندر آ گیا تھا۔ میں نے جمال کو نہیں دیکھا تھا۔ میں اسے دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں ایک بار پھر زندگی کے اندھیروں میں بھٹک گئی تھی۔ جمال کے باس نے اپنے بازو علیحدہ کرنے چاہے تو میں نے مضبوطی سے ان کو پکڑ لیا۔ مجھے لگا تھا جیسے یہ بازو بڑی آپا کے ہوں اور میں ایک گہری کھائی کے کنارے کھڑی ہوں اگر یہ بازو مجھ سے الگ ہو گئے تو پھر میں ابد تا ابد تک اس پاتال میں گرتی ہی جاؤں گی۔ گرتی ہی جاؤں گی۔

چند دنوں بعد جمال کی ترقی ہو گئی اور تھوڑے عرصے بعد ہی ہم نے بہترین فرنیچر خرید لیا۔

جمال اپنا سٹیٹس بلند سے بلند تر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اور جمال نے ایک خاموش سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اپنے کردار کی ٹوٹی کرچیوں کو جوڑنا بے کار تھا . . . . اور پھر میں بھی نڈر ہو گئی۔ ترقی کی راہ بہت کٹھن نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے اپنی اصلی روپ میں آ گئے تھے اور پھر بے فائدہ شرمانے سے کیا حاصل۔ اور جب میں راتوں کو دن بھر کی تھکن اور رات کے کاموں کی تھکاوٹ سے تھک کر لیٹتی تو بڑی آپا ڈیوڑھی کا اندھیرا چنبیلی کی اکیلی جھاڑی اور گرد آلود صحن میری نظروں کے سامنے رقصاں ہو جاتا۔ اور مجھے لگتا کہ میں اب بھی وہاں کھڑی ہوں۔ کتابوں کو سینے سے لگائے روتی آنکھیں لیے۔ میلے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی ایک بے بضاعت اور کمزور سی لڑکی۔

میں خوبصورت شاموں شراب کی بوتلوں . . . . زندگی کی مصروفیتوں اور نشے سے بوجھل قہقہوں کے درمیان گھری سوچتی۔ میں نے تو ایک نیا جنم لیا ہے میرے گزرتے زمانے سے الگ اور مختلف ہیں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ زندگی کا تیز بہاؤ ہمیں اتنی فرصت ہی کب دیتا تھا کہ میں گناہ و ثواب کے چکروں میں پڑوں۔ اور کنارے تو کہیں تھے ہی نہیں . . . .

جمال غرور سے تنی گردن کے ساتھ بوتل سے کارک اڑاتا اور پھر سب مسکراہٹوں میں ڈوبے پینے لگتے۔ اور میں اپنے اندر کی گرمی سے گھبرا کر اپنے بیڈ روم میں چلی آتی . . . .

ایک روز رؤف خاں نے بیڈ روم میں آکر کہا تھا سلطنت خانم تمہارا سارا گھر اس قدر ترغیب آمیز سا کیوں لگتا ہے۔ یہاں آکر انسان کا دل خواہ مخواہ کچھ کرنے کو چاہنے لگتا ہے۔ جیسے بہت سی شراب پی جائے۔ اور پھر . . . اور پھر . . . خیر چھوڑو اور وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے کہا تھا رؤف خاں۔ دفتر میں تمہارے اور میرے دفتر الگ الگ ہیں۔ تم میرے پاس ہو۔ فاصلہ اچھی چیز ہے۔ اس سے کشش باقی رہتی ہے۔

لیکن رؤف خاں نے کہا تھا نصیحت سے ان لمحوں کو ضائع نہ کرو۔ میں تو شائد صدیوں سے تمہارا منتظر تھا میری روح تمہاری تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہی ہے۔ صدیوں سے . . . صدیوں سے ''ہم سب ہی کسی نہ کسی چیز کی تلاش میں ہیں رؤف خاں میں نے کہا تھا . . . جیسا کہا ہے۔ زندگی اتنی تنگ اور محدود کیوں ہے۔ رؤف خاں کے چہرے کی سرخی اس قدر اشتعال انگیز کیوں ہے اور پھر جمال کا باس رؤف خاں کا بہت قریبی دوست ہے۔ اور جمال ایک تابناک مستقبل کا خواب دیکھتا ہے۔ یہ مستقبل شراب کے نشے سے گزر کر ہی مل سکتا ہے۔ میں نے اپنے سر کے بھاری پن کو جھٹک کر سوچنے کی کوشش کی۔ میری نظروں کے سامنے کوئی گھر نہیں تھا۔ بس ایک خلا تھا . . . . اور میں اس میں تیر رہی تھی . . . . اپنے کمرے میں رافیل اور سلمان کہانیاں پڑھ رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے رافیل نے ایک روز تصویر بنا کر مجھے دکھائی تھی جس میں ایک شراب کی بڑی سی بوتل تھی اور سر کے اندر سے شعلے نکل رہے تھے اور پاس پڑے ایک مدہوش آدمی کی رگوں کو چاٹتے جا رہے تھے۔

میں چپ چاپ اس تصویر کو دیکھتی رہی تھی۔ مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ اپنے بچے کی آنکھوں میں دیکھ سکوں۔

کیا سوچ رہی ہیں آپ۔ رؤف خاں نے پوچھا تھا اور میں نے اس بات کو بھلانے کے لیے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا اور قوم کے گدے پر زور زور سے اچھلنے لگی تھی۔ رؤف خاں نے ایک لحظہ کو میری طرف دیکھا اور وہ بھی اچھلنے لگا۔ مجھے بچے یاد نہیں رہے تھے۔ مجھے یہ گھر یاد نہیں رہا تھا جس کی آبیاری کے لیے میں نے برسوں محنت کی تھی۔ روح اور جسم کے زخم برداشت کیے تھے۔ میں قہقہوں کی دلدل میں پھنسی پاتال میں اتر جانا چاہتی تھی۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ یہ تو ایک دیوار قہقہہ تھی جس کا ٹھوس وجود نہیں تھا۔

میرے منہ میں تلخ سا مزہ رچا ہوا تھا۔ میں نے پردوں کے پار سے دو تجسس بھری خرگوش کی آنکھیں دیکھی تھیں

میں نے ان کو پاس بلانا چاہا تھا۔ لیکن وہ غائب ہو گئیں تھیں۔ اور رؤف خان کہہ رہا تھا۔ تم تو ایک غنڈی ہو۔ میں بھی ایک غنڈہ ہوں۔ ہم سب غنڈے ہیں۔ اور ہم دونوں اپنی پوری طاقت سے ہنسنے لگے تھے۔ اور میں نے کہا تھا رؤف خان جب انسان شریف نہ بن سکے تو اسے غنڈہ ضرور بننا چاہیے۔ اس طرح اپنی ذات بالکل مٹ نہیں جاتی۔ غنڈہ ہونا اچھی بات ہے۔ بے نیا ۔ . . . ہوا سا کن تھی۔ ہو سکتا ہے میرے بچے سو گئے ہوں۔ وہ خرگوش کی آنکھیں کہاں چلی گئی ہیں۔ اور جب میں جاگی تو پردوں کے پار سے صبح کی روشنی اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور پھر آنسو چپکے چپکے میری گالوں سے بہتے ہوئے میرے ہاتھوں کو بھگونے لگے۔ میں کیوں رو رہی تھی۔ میں تو خود بھی نہیں جانتی تھی۔ میرا دل تو ویرانے کی مانند بھیانک سناٹے سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میرے اندر تو بس خلا ہی خلا تھا۔ اور کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ہم سب غنڈے ہیں۔ ہم تو اس جادو نگری میں رہتے ہیں جس کی دیواریں شیشے کی ہیں۔ ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتے ہمارا کوئی ماضی ہم صرف حال کے لمحوں میں جاگتے اور سوچتے ہیں۔

ایک روز عارف نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا تھا . . . . اس نے اپنے بوسیدہ سے کوٹ کی آستین سے اپنے منہ سے بہتی شراب کو پونچھتے ہوئے کہا تھا . . . .

سلطنت خانم میں کب سے تمہارا منتظر ہوں۔ آؤ ہم دونوں کہیں اور چلے جائیں . . . . لیکن میں صوفے کے کونے پر بیٹھی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی . . . . اس کی باتوں نے میرے اندر سوئے ہوئے کسی انوکھے سے جذبے کو بیدار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی پچھلے کئی ماہ سے میرا پیچھا کر رہی تھی۔ اور وہ اکثر ان شاموں کو جب سب لوگ اپنی اپنی لائی ہوئی شراب سے جمال کی تواضع کرتے اور بے ہودہ مذاق کرتے ہنستے رہتے تو عارف خاموش آنکھیں جھکائے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر انگلی سے کچھ لکھنے کی کوشش کرتا۔ جمال نے اسے کبھی ایسی پارٹیوں میں نہیں بلایا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے حصے کی بوتل کوٹ کے اندر کی جیب سے نکالتا اور ایک طرف بیٹھ کر پینے لگتا۔ اگر کوئی اس کے سامنے گلاس رکھ دیتا تو وہ بغیر سر اٹھائے باقی بوتل اس کے گلاس میں انڈیل دیتا۔

میں نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بے ایمانی کی تھی۔ اور اس کی بھی بات میری زندگی میں ایک موڑ بن کر داخل ہو کر مجھے میرے خوابوں سے جدا کر گئی تھی۔

اس روز اس نے ضرورت سے زیادہ پی لی تھی۔ اور اپنی مخصوص جگہ بیٹھ کر مجھے گھور رہا تھا . . .
اور میں پچھلے کئی ماہ سے اس سے انتقام لینے کا سوچ رہی تھی۔ میں جانتی تھی۔ میری کشش اسے یہاں لے کر آتی ہے لیکن میں اس کو کانٹے میں پھنسی مچھلی کی مانند ڈھیل دے کر کھینچتی اور کھینچ کر ڈھیل دے رہی تھی . . .

میں نے دل میں کہا تھا۔ عارف فلک راہوں کا یقین انسان کے اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ لیکن انتقام تو میرے بس میں ہے اور اس سے تم بچ کر نہیں جا سکتے۔

اور ایک روز جمال نے زوردار مکہ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا تھا۔ عارف ملک یہ میرا گھر ہے۔ یہاں دوبارہ نہ آنا۔ نہیں تو میں تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔ جمال کو خلافِ معمول غصہ آگیا تھا۔ . . .

کیوں نکلوں یہ تمہاری بیوی تھوڑی ہے۔ یہ تو میری بیوی ہے۔ یہ تو میری دلہن ہے۔ میں نے زمانے گزرے اپنے اندھیرے کمرے میں اسے قبول کیا تھا۔

جمال کے دوسرے مکے نے اس کے جبڑوں سے خون نکال دیا تھا۔ اس نے اپنے کرتے کی پھٹی آستین سے خون کو صاف کیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے زور زور سے ہنس کر اس بات کا مذاق اڑانا چاہا تھا۔ لیکن ہنسی میرے اندر ہی مر چکی تھی۔ . . . میں کیوں ہنس نہیں سکتی . . . میں کیوں اس مرد کا مذاق نہیں اڑا سکتی جو میرا سب سے بڑا دشمن ہے . . . آج میں خوش تھی . . . پھر بھی میں ہنس نہیں رہی تھی ۔

میری دلہن مجھے دے دو۔ اس کے بغیر میں مر جاؤں گا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں . . . مجھے زندگی سے پیار ہے۔ مجھے اپنی دلہن سے پیار ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ تم نے اسے قید کر رکھا ہے۔ اسے آزاد کر دو . . . . . اسے آزاد کر دو . . . . . میں نے بڑی مشکل سے آنسو روکے تھے اور میرا دل نہ جانے کیوں اچھل کر میرے گلے میں اٹک گیا تھا اور مجھے اس کا ستا ہوا غمگین چہرہ نہ جانے ایک دم اچھا اور خوبصورت کیوں لگنے لگا تھا۔ شاید اس کی آواز میں میرے ٹوٹے خوابوں کی بازگشت تھی۔ لیکن اس وقت وہاں پر، ان سارے لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے میں کسی خواب کو نہیں پہچان سکتی تھی۔ میرے ماضی کے دھندلے سائے کب کے مٹ چکے تھے۔

عارف نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس کو زور سے زمین پر دے مارا اور دھڑ سے دروازہ کھول کر چلا گیا ——— جمال نے گلاس کے ٹوٹے ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور میں نہ جانے وہاں کتنا عرصہ بیٹھی رہی تھی۔

میں کس کی دلہن ہوں؟ میں کس کی دلہن ہوں؟ ——— "میری دلہن مجھے دے دو" یہ سوال اور یہ صدا بڑھ کر پھیلتی جا رہی تھی۔ فطرت کی طرح گھمبیرانہ انداز میں، کائنات کی طرح وسیع تر انداز میں،

آج رات ان ارغوانی پھولوں کے درمیان کھڑے ہیں ہمیشہ کی طرح خالی الذہن تھی۔ چنبیلی کی جھاڑی۔ ڈیوڑھی کا اندھیرا اور بڑی آپا کا وجود، کچھ بھی تو میرے لیے زندہ نہ تھا۔

---

# پھیر

## ابوالفضل صدیقی

(۱)

خورد سال مولا علی اپنے پچھتر سالہ باپ کی آٹھویں نکاحی نجیب بیوی کا بیٹا تھا۔ خالص سادات النسل، مگر نہایت غریب گھر کی نوخیز خوب صورت لڑکی۔ جس کو پیرانہ سالی بڑے میر صاحب سید سردار علی شاہ نے سنتے ہیں کہ شادی سے تین چار برس قبل نظر پڑتے ہی اس کے باپ کے افلاس کو معاف کرتے ہوئے بچپن ہی میں تاک لیا تھا اور تین چار سال سے منتظر بیٹھے تھے اور بیٹی میں شباب کی پہلی سرخی نمودار ہوتے ہی اس کے باپ سید ولایت علی عرائض نویس کے روبرو اپنی فرزندی میں لینے کی درخواست پیش کردی۔ ظاہر بات ہے کہ کم و بیش پچیس سال عمر میں بڑے داماد کو منشی سید ولایت علی نے کبرسنی معاف کرتے ہوئے ان کے بجائے ان کی املاک اور دولت کو فرزندی میں لیا اور بڑے میر صاحب تو غالباً رجعت الاعلی النصل کے مطابق بچپن کی جانب جا رہے تھے، بچپن کی گڑیا کھیلنے کے لئے مگر اللہ کی دین، خالقِ مطلق کو کوئی ادا پسند آگئی ورنہ برسوں سے ناامید ہو کر انہوں نے عورت کے اس پہلو پر سوچنا ہی بند کردیا تھا، نوخیز بیوی نے سال اندر چاند سا بیٹا جنا، اور اس غریب سید کی بیٹی نے بڑے میر صاحب کی وہ بگڑی بنادی جو اس سے پہلے سات اور سیدانیاں رئیس زادیاں نہ بنا سکی تھیں۔ مگر اگلے سال بیچاری خود دق میں مبتلا ہو کر مرگئی گویا مرتے مرتے میرِ صاحب کا دامنِ اُمید بیٹے کی نعمت سے بھر گئی۔ میر صاحب اسّی کی لپیٹ میں تھے برسوں سے اس باب کو بند کرچکے تھے اب شوق کے ساتھ پھر گودِ کھول، اپنے امر و نواحی اور حالی موالیوں کا خوب اندازہ تھا، اور توریث کے دھارے کی رفتار کا بے تکاپن بھی خوب نگاہ میں تھا۔ اپنی تمام آبائی املاک نومولود مولا علی کے نام نہایت مضبوط قانونی ذرائع سے جیتی زندگی منتقل کردی اور خود اپنی حیثیت نومولود کی بلوغت تک صرف ولی سرپرست جیسی رکھی، لیکن ابھی مولا علی پورے چار سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بڑے میر صاحب خود بھی چل بسے ـــ اور خورد سال بھائی کا قانونی اور قدرتی ولی و سرپرست بڑا بھائی بندہ علی ہوا جس کو خاندان اور طبقہ کی پنچائت اور ساتھ ہی مال کے متعلقہ سرکاری اہلکاروں نے بھی تسلیم کرکے قانونی شکل دے دی اور اب چودہ سال کے لیے جب تک نابالغ سنِ بلوغت کو پہنچے بندہ علی اس کا مختار عام کارکن بن گیا اس شرط کے ساتھ کہ کل آمدنی کا جمع خرچ سول جج کے روبرو ششماہی پیش کرتا ہے اور بچت نابالغ کے نام بنک میں جمع کرتا ہے۔ بندہ علی اپنے باپ نہیں بڑے میر صاحب سردار علی شاہ کی اس متلون شکاری اندھادھند شکار کرنے والی جبلت کا تیجا اور رہتا گھٹا زندہ سلامت نقش تھا جس کی زد میں تیتر، بٹیر، مرغ زریں کے ساتھ ساتھ گل گیاں، کٹھ ولیاں، گھوریاں کتے اور چیلیں سبھی آتی ہیں۔۔۔۔۔۔ بندہ علی کی نانی کے ساتھ اس کی ماں رحم کلیا چاری بچپن سے حویلی میں جھاڑو بہارو ادونکا کام کرتی تھی، حویلی کی جو بھٹن چاٹ چاٹ کر نہ معلوم کب ماں بننے کے قابل ہوگئی کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ ایک روز

بیاکہ جیٹھ کی دوپہری میں اس کی (بندہ علی) نانی جھاڑو بُہارو کرتے کرتے تھک گئی اور خاص بڑے میر صاحب کی دوپہری خواب گاہ کی صفائی کا کام بیٹی کے سپرد کرکے چلی گئی۔ رم کلیا نے بڑے میر صاحب کی خواب گاہ کا کواڑ اک ذرا کھول کر اور پردہ ہٹا کر جھانکا تو تاریک نم ٹھنڈی خواب گاہ میں وہ تو کچھ نہ دیکھ سکی لیکن میر صاحب نے جو ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر دوپہر کی دوسری نیند لینے کے لیے بستر پر لیٹے ہی تھے جیسے سب کچھ بھانپ لیا کواڑ کے کھٹکے اور پردہ کی سرسراہٹ پر۔ بڑے میر صاحب تو باوضو سو گئے اور شیطان جاگ پڑا اور بڑے میر صاحب کے بستر میں سے نکل کر رم کلیا کے پیٹ میں گھس پڑا۔ بلا شان گمان ــــ جیسے کہتے ہیں "چھوٹے کا ماتا" لگ گیا۔ اور ابرنیساں کے اتنے قطرے جو گنتی کے مقررہ پیمانوں سے باہر ہیں آسمان سے ٹپک ٹپک کر مٹی میں ضائع ہو جاتے ہیں جس کو سیپی کے پیٹ کی آب میسر آتی ہے وہی گوہر بنتا ہے، اور اگر کوئی سیپی ہی ایسی ہو جس میں اندھیرا ہو تو بھلا ابرنیساں کا قطرہ موتی کیسے بن سکتا ہے۔ اور بندہ علی کا وجود بے آب سیپی کے پیٹ میں پروان چڑھا تھا۔ لہٰذا کنکری ہی بن کر رہا۔ اور بڑے میر صاحب نے بہ تمہ سرٹیفکیٹ کے طور پر اسم بامسمیٰ بندہ علی نام بھی تجویز کیا، تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے اور آئندہ نسلوں کی منڈی میں پہچانا جا سکے۔ ویسے بڑے میر صاحب مرحوم نے اپنے طبقہ کی جبلت کے مطابق نجیب اولاد کے لیے کیا کیا جتن نہ کئے پیر فقیر مجذوب اور کلا سیانے پوجے قبروں پہ سر رگڑا، ماہر حکیم نوکر رکھے، ساری جوانی اسی میں بتا دی اور گوہرِ اُمید ہاتھ آیا تو بلا شان گمان! جب لب گور آ گئے بہر حال وہ قبر میں اطمینان کے ساتھ گئے کہ توریث سادات کے راستہ سے نہیں بھٹکی۔ لیکن آج گور میں وہ بے کل ہو گئے ہوں گے سنتے ہیں کہ جب ایسے حادثے وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں تو بزرگوں کی ہزار سالہ قبریں پھٹتے دیکھی گئی ہیں۔ سادتی تمدن کا اٹھایا ہوا ہزارہا سالہ سالہ قدیم روڑا شرعی قانونِ وراثت کے ریلے میں بہ گیا تھا۔

حالانکہ میر صاحب کی وفات کے بعد بندہ علی کی پوزیشن ایک مختار عام جیسے کارندہ سے زیادہ نہ تھی حتیٰ کہ وہ نگران کمیٹی اور ڈسٹرکٹ جج کی مقرر کردہ تنخواہ سے زیادہ کا حق دار نہ تھا جس کو اپنی زبان میں گذارا کہتے تھے۔ یہ اتنا ہوتا ہے کہ بمشکل شکم پروری اور تن پوشی کی کفالت کرتا ہے لیکن اس کام کے ساتھ جو حکومت کا پہلو لگا ہوا تھا وہ سینکڑوں آمدنی کے راستے کھول دیتا ہے اور سیاہ و سپید کا مالک سرپرست تو وہی تھا اور مالک تو ابھی دو ہی سال کا تھا اور بلوغت میں تو پورے سولہ سال کا عرصہ باقی تھا اور سولہ سال تک تو اس کو ہٹانے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ اور کہتے ہیں کہ بارہ سال میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے اندر ریاست کی بو پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی قصبہ کے طول و عرض کے موضع میں جہاں سکونت تھی اسی نوعیت کی شاخ کے جیسا بندہ علی تھا ڈھائی تین سو نفوس پر مشتمل پندرہ بیس گھر آباد تھے جو پچھلی سادات اور دوسرے نولوں کے آمیزے تھے۔ سب کے سب کاشتکار لیکن اک ذرا قدیم مراعات کے حامل، ان کی کاشتہ آراضیاں بہت ہی کم اور ناقابلِ اضافہ شرح لگان پر موروثی حقوق کے ساتھ اور ناقابل بے دخلی شرائط پر ان کے قبضہ میں چلی آتی تھیں۔ یہ مراعات سید بزرگوں نے اپنی حرکتوں کی پاداش میں اپنی خالص نسل کے تھوڑے سے حقوق کاٹ کر تفویض کی تھیں، بقیہ ان میں اور عام کسانوں میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ معاشی اور معاشرتی رہن سہن سماجی سطح کے اعتبار سے یہ ادنیٰ کسانوں سے ممتاز تھے، حتیٰ کہ اسلامی ناموں کے ساتھ سید، شاہ اور میر بھی نہ لگا سکتے تھے البتہ کاغذاتِ سرکاری میں قومیت مولازادہ

بھری جاتی تھی۔ بندہ علی بھی چماری کا بیٹا تو ضرور تھا، لیکن پرورش چار کسان کے جھونپڑے میں نہ ہوئی تھی اور پل کر حویلی اور دیوان خانہ ہی کے اندر رئیس سید باپ کی دوسرے تیسرے درجہ کی اولاد کے ضمن میں جو ان ہوا تھا اور ایسوں کی اپنی ایک مخصوص سطح ہوا کرتی ہے اور جس میں ایاز قدر خود بشناس کے حدود نہایت راسخ رہتے ہیں۔ بڑے میر صاحب کے مرتے ہی تمام مزارعین کی نظریں شیر خوار مولا علی پر جم گئی تھیں اور مونچھوں کے کونڈے کی گھڑیوں کا حساب انگلیوں پر لگایا کرتے تھے کہ کب لونڈی بچہ کارکن کی غلامی سے گلو خلاصی ہو۔ خاص طور پر یہ احساس ان مذکورہ مولا زادہ گھرانوں میں نیش کی طرح متحرک تھا جو بندہ علی ہی جیسے تھے، اور عام کاشتکاروں اور دوسری قومیتوں کے بڑے حلقہ میں بھی بہت کچھ انہیں گھرانوں سے اکتساب خلش کیا تھا۔ غرض پورا علاقہ اس احساس کا شکار تھا۔

اور لونڈی بچہ اس کے بالکل الٹ تھا۔ اپنے داغ پر ہوتے جاگے ہمہ وقت بہت چوکنا۔ نابالغ آقا کے بدلے دولت، حکومت ہاتھ میں لے کر اپنی اصل نسل سے ٹکرا رہا تھا۔ قدم قدم پھونک پھونک کر دھر رہا تھا مبادا کہیں لونڈی بچہ، چماری زادہ کا تعفن پر نہ اچھل آئے اور آس پاس کے سارے کھرے سید پٹھان زمینداروں سے زیادہ نجیب و شریف سید بنا ہوا تھا۔ اس نے ریاست کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی عام کاشتکاروں میں نمایاں ——— مراعات رائج کیں اور ان مخصوص مولا زادہ ربیب گھرانوں پر تو اکرام کی بارشیں کر دیں کیونکہ اسی جیسی خاندان کے یک جدی نبی محام تھے۔ پہلے تو بندہ علی ذرا ذی اختیار ایک کارکن تھا تنخواہ دار ملازم سے کچھ ہی بہتر اور اک ذرا سی اچھی مختلف جیسی پوزیشن کا آدمی یہ نئی نئی ریتیں ڈالتے ان مولا زادوں کو خاص طور پر مراعات دیتے دیکھ کر نگران پنچایت نے محاسبہ کیا تاہم انہیں اس نے مطمئن کر دیا کہ یہ لوگ اس کے اہل اور حق دار ہیں، پھر نیک کام تھا، ظلم تو نہ تھا لیکن غریب ان مستفیض ہونے والوں کو مطمئن نہ کر سکا۔ ان کا منہ جتنا بھرا اتنا ہی زیادہ پھیلا۔ اور پتہ نہیں کہ یہ تحت الشعور میں ہی تھا کہ شعور میں بھی کہ یہ لوگ اپنے ہی ربیب زادہ کے ہاتھوں یہ مراعات پاکر ذہنی ناآسودگی کا شکار ہو جاتے تھے۔ جس کے ردعمل میں مطالبات فزوں تر اور پھر پورا ہونے پر ناآسودگی بھی فزوں تر ہو جاتی تھی، اور احسان کا میدان میزان محسوس ہوتا تھا۔ کتے کی بھی فطرت کے خلاف یہ بندہ علی کا ہر نیا پھینکا ہوا لقمہ غیب سے منہ میں لے کر اٹھتے اور غراتے، انہیں یہ مراعات بڑے میر صاحب مرحوم کے رواتی اور کبھی کبھی بٹ سنتے استحصالوں سے زیادہ کھلتیں۔ اور اس ٹھنڈی جنگ کے درمیان یہ عجیب حادثہ پیش آیا جس کا دور دور گمان نہ تھا۔ سبھی توریث کی اس الٹی گنگا کے دھارے کے موڑ پر جز بز ہوئے لیکن جیسے ان مولا زادوں کے محسوسات کے بیچوں بیچ شبیل آ پڑا۔ یوں تو خورد سال مولا علی کا غم سبھی نے منایا مگر اس پہلو سے کہ یہ موت مستقل طور پر ان کی گردن انہیں جیسے ایک ارذل بلادر کے ہاتھ میں پکڑا گئی مولا زادوں کے گھر گھر اکلوتے بیٹے جیسا قلبی ماتم ہوا۔ ادھر بندہ علی کی رگ رگ میں نیکی کر کر کے کنوئیں میں ڈال ڈال کر تلخ زہر بیچ گیا تھا۔ دونوں ہی جانب برابر کی آگ دبی ہوئی تھی۔ ویسے اس موت سے بندہ علی کے قانونی حقوق پیدا ہوئے تھے، وہ "بندہ" سے "مولا" ہوا تھا، پھر موت کی روئداد بھی مختصر اور حویلی کے اندر کا معاملہ تھی، حتیٰ کہ اتنی عجلت کہ کسی معالج کے یہاں تصدیق کا بھی دخل نہ تھا۔ حرف اوّل اور حرف آخر حرف بندہ علی کا بیان تھا اور پھر "جتنے منہ اور ایک ہی بات" کے لئے یہ بڑی مضبوط بنیاد تھی، اور بڑی ہستی کی موت یوں بھی تھوڑے سے بہت مسائل مستقل نہیں تو وقتی طور پر ہی کھڑے کرتی ہے اور یہاں تو قانون نے روایت ہی کا دھارے کا رخ موڑ دیا تھا۔ اور چھوٹے سے لے کر بڑوں تک المیہ ہی المیہ تھی۔

چلتے منہ اتنی باتیں۔ یہ بات بھی نہیں، بلکہ سارے منہ اور ایک ہی بات، زبانِ خلق نقارۂ خدا! پھر مجال کا ناپھوسی کی بھی نہیں! میں علی الصبح سے موت کی خبر مشتہر ہونے ہی اشاروں ہی اشاروں چل پڑی تھی، بلکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہی چرچا تھا جیسے ہر ایک دوسرے کو بھی نگاہ دیکھتے ہی سب کچھ کہہ دیتا تھا اور نظروں ہی نظروں میں ساری روداد سن لیتا تھا......" بندہ علی نے خورد سال سوتیلے بھائی مولا علی کو زہر دے دیا ———"

بندہ علی نے اپنے حق میں وراثت کا شرعی راستہ صاف کر دیا۔ اور تاریخ شاہد ہے سامنتی روایت میں توریث کے لیے نجات راسخ شرط چلی آئی ہے۔ اس کے بعد کوئی اور پہلو دیکھا جاتا ہے، حتیٰ کہ اہلیت اور کردار بھی نہیں۔ فقہ اور عاقل غیر کفء کے مقابلہ پر فاسق و فاجر مجبوط الحواس مجنون نجیب کا حق تسلیم کیا جاتا ہے ——— اور مولا علی کی موت اس طبقہ کا اپنی نوعیت کا المیہ در توریث سامنتی تمدن کا کچھ جوہر تھی۔ یوں تو اقتصادی طور پر کوئی بھی فرد متاثر ہونے کی شکایت کر سکتا تھا کیونکہ دور دور بجز بندہ علی کے کوئی دعویدار تو تھا ہی نہیں مگر شرفا نجیب الطرفین سب کے سب دہل کر رہ گئے تھے۔ زرعی آراضی کی ملکیت کی توریث جو سلطنتِ برطانیہ کا ایک جز تھی، اور مالک تحتِ برطانیہ کا ایک پایہ نجابت کے راستوں سے جڑی تھی اور یہ طبقہ ساز روایت وہ تھی جس کے تحفظ میں یارانِ روائت پناہ اور زمیندارانِ خون پروستے ادھر ڈیڑھ صدی سے اینگلو محمڈن لاء اور ضابطۂ دیوانی کی مضبوط فصیلوں تک کو منوجی کے ایجاد کئے ہوئے ہتھکنڈوں سے زمین بوس کر رکھا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ترہیتی ماحول پر مفید مطلب مذہبیت کا ملمع بھی چڑھا رکھا تھا۔ اور "لونڈی بچہ" "انجب" "ریب زادہ" تو کس شمار قطار میں حسب نسب والی خاندانی ماں کی جھولی میں سے خالص خون والی نجیب الطرفین بدنصیب بیٹیاں بھی زرعی اراضی کی توریث کے سلسلہ میں عدم وجود برابر رہتیں، اور پھر یہاں تک کہ بڑھ چکے تھے کہ محمدی قانونِ وراثت کی قینچی کو بالکل ہی کند کرنے کے لیے صرف فرزندِ اکبر ہی سب کچھ ہوا کرتا تھا اور اس طرح معمولی سے زرعی اراضی کے رقبہ کا مالک ولیم اور وکٹوریہ سے بھی بڑھ کر اپنا روائتی رشتہ قیصر و کسریٰ سے ملایا کرتا ——— چہ جائیکہ ارزل تو لید جسے ٹھیک سے لونڈی بچہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس ترکیب کے ساتھ بھی نزالت ہی کی روایت اور ضابطہ کا تصور رہتا ہے، ویسے معاشرہ کے کسی شعبہ میں کوئی مقام نہیں ہوا کرتا۔ حظِ نفس کی خاطر کم و بیش پولی گیمس پرندوں کی طرح طرفین نہیں بلکہ اکثر یک طرفہ سی مرضی کے تحت کسی ایسی ویسی کو ہتھیا لیا جس کو محاورہ میں "رستہ چلتی" بھی کہتے ہیں بسا اوقات اتفاقیہ اور حتیٰ کہ کبھی کبھی حادثاتی طور پر ہی دو جسم جمع ہو جاتے۔ بجیلی، نجیب الطرفین بیچوں کی ہاتھ سمائی تامنی کی کندھوں دھری، بیگم سے کہیں زیادہ رجولیت کے ساتھ، وقت کے وقت من تو شدم تو من شدی کے انداز میں حلول ہو کر پسند کرتے لیکن اس کے عطا کردہ پھل سے منتقل کی طرح منہ بگاڑے، یہ میوہ شیریں فرزند تو فرزند سواری کی گھوڑی کے ڈالے ہوئے بچھیڑے کی تعریف میں بھی نہ آتا اور بسا اوقات باپ کو میٹھا، پیٹھ کا اڈھیٹ محسوس ہوتا، اور مجسم انفعال۔ تاہم یہ اڈھیٹ اور انفعال اپنے وجود کے توحال ہوتے اور بندہ علی تو ان سے بھی ارزل سطح کی مخلوق تھا۔ سچ پوچھئے تو نہ ماں کا ہی بیٹا نہ باپ ہی کا پوت ———

بلا شان گمان علی الصبح حویلی سے مولا علی کی موت کا بلیٹن جاری ہوا کہ رات کو کھانا کھا کر اچھا خاصہ سویا۔ آدھی رات ایک تے ہوئی، صبح ہوتے ہوتے چٹ پٹ ہو گیا۔ اور بستی میں تمام دن حیرت، رنج اور مصروفیت کا دور دورہ رہا، سہ پہر تک رونا دھونا، کفن دفن سب کچھ ہو گیا اور قانونِ وراثت کے صاف شفاف کوثر و تسنیم سے نکلے ہوئے دھارے نے چپکے راستہ بدل کر گندے پانی کی

نالی کی جانب رُخ کر لیا، اور ہم چشم برابر کے تعزیت کنندگان کو جو بیرونِ بستی دور و قریب سے تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے جمع ہوئے تھے اپنی شفاف جھیل کی سطح سے ہٹ کر نابدان میں کود جاتا ہے اس دھارے کا راستہ فوراً ہی نظر آ گیا، لیکن تھرِ زردیشں بجان درویش بجز اس کے اور کوئی مفر بھی نہ تھا کہ پسماندگان میں صرف بندہ علی ہی کو تعزیت کریں ـــــ اور ایسی مثالیں سنے میں تو آئی تھیں لیکن اس نواح میں اس نظام کے قیام کے بعد یہ پہلی تھی اور محمدی قانونِ وراثت کا سارنتی روائت کو زبردست چیلنج اور بے زینہار وار تھا۔ تمام شرفا کے کان کھڑے ہو گئے۔ تلوار کے زور سے پیدا کی ہوئی روایت اور ملکیت اک ذرا بائیں ہاتھ کا کھیل جیسی معمول کی حرکت کے سبب گڑھے میں گر رہی تھی۔ پچھلی صدی ہوتی تو لام بندی اور فوج کشی ہو جاتی، اور بزرگوں کی قبریں پھٹتے اور ناکیں کٹنے سے بچا لی جاتیں، اگر کمینہ پرور انگریزی دور کا بُرا ہو، اور مرحوم مولا علی تو طبقہ کی ناک ہی جیسے جدّ امجد کا بیٹا تھا۔ حسن کی تاریخی روایت کے تحت دوست دشمن سب دل ورنہ زبان سے بیٹا تو تسلیم کرتے چلے آتے تھے اور اس طرح اس مقتدر خاندان کی وراثت یوں یکایک غیر کُف، بلکہ ارزل ہاتھوں میں پہنچ جانے پر تمام طبقہ میں ایک نوعیت کی ذہنی بے چینی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مرگِ بے ہنگام اور قضائے مبرم یوں بھی چونکا دیتی ہے، اور فوری انقلاب لانے والی باتیں یوں بھی ذہنِ انسانی کو شُبہ کی آماجگاہ بنا لیتی ہیں جب امور نہایت ہی تکلیف دہ ہوں ایسی صورتوں میں تو شبہ بدگمانی کے ہی راستہ پر پڑتا ہے۔ اس حادثہ سے معاشی نوعیت کا تو خیر کسی کے سامنے کوئی مسئلہ نہ تھا مگر سماجی مسائل گھر گھر کھڑے ہو گئے تھے۔ خورد سال مولا علی کی موت، اُس سے عمر میں ۲۵ سال بڑے سوتیلے بھائی بندہ علی کے گرد شبہ کی دھول اور بدگمانی کا کہر پھیلا دی تھی اور قوی وجوہ تھے جن میں سب سے بڑی وجہ تنہا اور قطعی اس کا وارث ہونا تھا جبکہ اپنی مادر زاد پیتی کی بنا پر وہ اس توریث کی ملکیت تو درکنار اس سے کسی قسم کے استفادہ کا بھی حق دار نہ تھا۔ خورد سال مولا علی کا سگا اور حقیقی اور حیران سال مولا علی کا اتفاقی اور حادثاتی باپ سردار علی اپنے مرنے سے قبل ہی کل املاک کا قانونی طور پر مولا علی کو مالکِ قطعی بنا گیا تھا اور بندہ علی کی موجودہ پوزیشن چھوٹے بھائی کے قدرتی ولی جیسی تھی جس کو ڈسٹرکٹ جج نے نابالغ کی بلوغت تک کے لئے مقرر کیا تھا اور اس خدمت کے عوض ایک کارندہ جیسے گریڈ کی ماہانہ تنخواہ بھی پانے کا حق دار تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ چہ جائیکہ اس ادنیٰ سے کارکن پر پوری ملکیت جیسے چھپر پھاڑ کر پھٹ پڑی۔ دفن کے وقت ہی مجمع میں زیرِ لب شروع ہو گئے تھے اور رات ہوتے ہوتے گلی گلی چرچہ ہو گیا، اور زمیندار اور برادری والوں کے سامنے تو محض ذرا سا سماجی مسئلہ ہی تھا لیکن مزارعین، رعایا اور ملازموں میں تو اس غیر متوقع آقا کی یکایک تبدیلی سے شدید نفسیاتی الجھنیں آ کھڑی ہوئیں جن کے ڈانڈے مستقبلِ قریب میں معاشی مسائل کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور انہیں اصلی و نسلی اور کُف و غیر کُف آقا کا فرق ان کو خواہ مخواہ خلش میں مبتلا کر رہا تھا۔

مسلمان دولت مند طبقہ میں سوئم کا دن مخصوص اہمیت کا حامل ہوتا ہے، چنانچہ اس فاتحہ میں چھوٹے بڑے سبھی متعلقین شرکت کرتے ہیں سب سے اہم چیز وراثت اور وارث کا تعین ہوتا ہے اور محمڈن لاء میں یہ نہایت سیدھے سادے طریقہ سے لفظ بہ لفظ قرآن اور فقہ کے مطابق درج کر دیا گیا ہے۔ زمینداروں میں اس فاتحہ میں محکمہ مال کے اہلکار ضرور شرکت کرتے ہیں اور عمائدین کے بڑے مجمع میں متوفی کے ورثا کا تعین ہوتا ہے اسی کے مطابق اندراج نام کر دیتے ہیں، بالعموم اس میں کوئی ہیچ نہیں ہوا کرتی لیکن جب کوئی معاملہ الجھ جاتا ہے اور وراثت میں کوئی عذر دار دعوے دار اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو یہ پٹواری اور گرداور قانون کے قلم سے طے ہونے والے معاملے لائی

سے جلسے بڑے مقدموں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن کے طے ہونے میں نسلوں کی عمریں لاتعداد رقمیں درکار ہوتی ہیں اور عدالت عالیہ ہائی کورٹ اور پرائیوی کونسل ہی سے یکسو ہوتے ہیں اور پھر بھی انصاف کی گارنٹی نہیں ہوتی۔

اور آج مولا علی کا سوئم تھا بستی میں میلہ لگا ہوا تھا۔ شہر، قصبات اور دیہات کے سبھی چھوٹے بڑے جمع تھے، چوبیس گھنٹہ پہلے تمام متعلقہ کاشتکاروں موت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جس میں اتنے بڑے رئیس کو ایک ڈاکٹر بھی نصیب نہ ہو سکا تھا۔ خواہ مخواہ اپنے کو گنہگار سا محسوس کر رہا تھا۔ سب سے بڑا کانٹا متعلقہ کاشتکاروں کو خاص طور پر بندہ علی کے ننھیالی قرابت دار مولانہ لودوں اور ننھیالی چماروں کے دل میں کھٹک رہا تھا کہ یہ انھیں جیسا اب تک تو خیر حاکم تھا اب کم بخت مالک بھی ہو گیا، اور دوسرا چور تو خیر سایہ تھا اور اس پر چھائیں میں یہ پچھو پناہ ڈھونڈھ رہا تھا کہ چماری نیچے نے یہ مرتبہ سیدانی زادہ کو زہر دے کر حاصل کیا ہے۔ اور اسی سایہ میں بندہ علی کے برابر والے رئیس بھی پناہ لئے ہوئے تھے۔ ویسے منہ سے اس حادثہ کو ہر پہلو سے قضا و قدر کے سر تھوپ رہے تھے اور دل بھی یہی گواہی دیتا تھا کہ ایسا ہی ہے بھی، اور زبان بھی یہی بولتی تھی، حالانکہ اس میں کسی وقت ذو معنویت کی جھلک پیدا ہو جاتی، کیونکہ دماغ کا جی یہی چاہتا تھا کہ بات زہر دے کر قتل کر دینے والی رہے تاکہ ہماری نسل کو اس حرامی چماری بچے کے سامنے کسی پہلو سے تو سربلندی رہے۔ لیکن قاضی کا دھرا کندھوں پر تلخ گھونٹ اتار اتار کر تعزیت فاتحہ اور تعین وراثت کے تمام روایتی معمولات برت رہے تھے، زبان تک تو آنے کا سوال ہی نہ تھا، دماغ کی بات آنکھ یا چہرہ کی ہلکی سی حرکت تک بھی نہ آسکتی تھی۔ تاہم ہر کھوپڑی کے اندر کھچڑی یہی پک رہی تھی۔

سوئم کی فاتحہ خوانی ہوئی، جگہ جگہ کارندوں نے اپنے متعلقہ کاشتکاروں سے روپیہ روپیہ دو دو روپیہ والی روایتی نذر وصول کرنے کے لئے بستر اور بوریئے بچھائے۔ ایک بوڑھا حجام ایک طشت لئے ڈیوڑھی کی جانب سے خاص مجمع کی جانب بڑھتا نظر آیا۔ یہ حویلی میں سے بندہ علی کی چماری بیگم بوڑھی بیوہ ماں نے سجا کر بھیجا تھا۔ اوپر زرکار مخملیں جزدان میں لپٹا ہوا قرآن پاک اس کے نیچے غلاف کعبہ کے ٹکڑے میں لپٹی ہوئی نادر، انتہائی نوعیت کی دستار، جو مورثوں اور وارثوں کے سروں سروں مکہ مدینہ سے یہاں تک سجتی چلی آ رہی تھی۔ حلقہ کئے ہوئے ہم چشموں کے درمیان حجام نے ضلع کے سب سے اونچی حیثیت کے زمیندار کے سامنے طشت پیش کیا جنھیں نجیب الطرفین سادات کے علاوہ سات مرتبہ حج بیت اللہ اور انچاس دفعہ سنگ اسود چومنے کی سعادت بھی حاصل تھی، اور تمام برادری میں "حاجی میاں" کے لقب سے پکارے جاتے تھے، اور سب رئیسوں میں مقتدر خیال کئے جاتے تھے۔ روایتی انداز میں انہوں نے پہلے کلام پاک کو بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا، پھر کچھ دعائیں زیر لب پڑھ کر بندہ علی پر دم کیں اور پیشانی پر تین مرتبہ انگلیاں پھیریں، قرآن پاک سر سے اونچا اٹھا کر ہوا دی، گویا چماری کا داغ اڑا کر حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور پھر بسم اللہ کر کے ٹھیٹ عربی بندشوں والی دستار باندھی، بندہ علی نے کھڑے ہو کر اک ذرا جھک کے پہلے حاجی میاں کو پھر تمام مجمع کو عاجزی کے ساتھ سلام کیا۔ عام مجمع میں لڈو اور چنے بٹنا شروع ہوئے۔ پٹواری گرداور اور قانون گو رات ہی سے جمع تھے وراثت کی بنا پر اندراج نام اور داخل خارج کے لیے رپورٹوں کے فارم بھر کر تیار کر چکے تھے، سلام کر کے بیٹھتے ہی بندہ علی کے سامنے دستخطوں اور آن سربرآوردہ پنچوں کی گواہیوں اور تصدیقوں کے لیے بڑھائے ہی تھے کہ سب کے سب ہکا بکا رہ گئے۔ تھانہ کا انچارج پولیس افسر معقول تعداد سپاہیوں کے ساتھ جیسے کہیں نہیں سے

آس پاس کی زمین نے اُگل دیا۔ حلقہ بھر کے ہی باون گزرے جمع تھے اور ان کے بیچوں بیچ بندہ علی دس گزی پگڑی سجائے سربلند بیٹھا تھا، لیکن تھانہ دار قطعاً نہ جھینپا اور درانہ وہ رؤسا عظام کے مجمع میں قانون اور ضابطہ کا متحرک اُبھرتا اس طرح داخل ہُوا جیسے بھیڑوں کے گلہ میں تیندوا آپڑے، اور پیشتر اس کے کہ کوئی بڑا کلغی دار ہمت کرکے تھانے دار سے کچھ استفسار کرے اس نے بندہ علی کے ہاتھ میں وارنٹ گرفتاری تھماتے ہوئے ضابطہ کے چند مخصوص قانونی الفاظ ادا کئے "آپ کو مولا علی کے زہر خورانی و قتل کے شبہ میں گرفتار کیا جاتا ہے"۔ اور جب تک ان باون گزروں میں سے کوئی اس قانون اور ضابطہ کے روبوٹ سے ایک دو آواز نکال کر مخاطب ہو، ہواس نے ہتھنی انداز میں کھٹ سے ہتھکڑیاں چڑھادیں۔ روئداد مختصر تھی۔ ویسی ہی جیسی مولا علی کی موت کی، سب سے بڑا مجرم اور قانون کا نفاذ کرنے والا سب سے چھوٹا اہلکار معمولی سا سب انسپکٹر ہوتا ہے۔ اور بات تو اس کی قطار کے سب سے اونچے عہدہ دار کے بس سے باہر تھی اور جو کرنے کی زمی غالباً سپرنٹنڈنٹ پولیس کا نمائندہ ہوتا ہے، کیس تو مجسٹریٹ ضلع کے ہی اختیار سماعت سے باہر تھا، عدالت العالیہ کی پوری بنچ ہی دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر سکتی تھی۔

پولیس کے اس ڈرامائی اقدام پر مال کے اہلکار تو پیچھے سے کاغذ سمیٹ کر سرک گئے اور دستار بندی میں پیش پیش چھوٹے بڑے سبھی لوگ غلام، لونڈی بچے، ربیب اور کا کا کے متعلق پرانے بزرگوں کے مقولے اور ضرب الامثال زیر لب بڑبڑاتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عوام الناس لڈو اور پتنے چھوڑ کر شکرے کی جھپٹی ہوئی چڑیوں کے غول کی طرح پھُر سے اڑ گئے، خواص نے جلدی جلدی اپنی سواریاں سنبھالیں اور کنارہ کر گئے۔ پہلے تو قتل کے جرم کی ہیبت ہی کیا کم ہوتی ہے، پھر اس کی ہوا کی اِک ذرا سی رمق بھی زہریلی گیس کے جھکڑ کی مانند اثر انداز ہوتی ہے۔ اعانت، سازش، علم، منصوبہ، امداد اور قتل سب ایک ہی حکم اور صرف میں آتے ہیں اور ایک ہی قلم سے ہانکے جاتے ہیں۔ پرسوں ان میں سے اکثر مقتول کے دفن میں پیش پیش ممد و معاون تھے، ورنہ اور کچھ نہیں تو کسی پہلو سے گواہی شاہدی میں ہی کسی بھی جانب سے مفت میں کھنچے کھنچے پھریں۔۔۔۔ جس کی داد نہ فریاد اور جو اپنی جگہ پر سزا سے کم نہیں ہوتی اور خیر پولیس یا فریق ثانی کی مفت کی دشمنی نکلتی ہے۔ اور اب بات دو دھاری تلوار تھی بندہ علی پر اگر جرم ثابت ہو جاتا تھا تو سیدھی سادی سزا پھانسی تھی اور مقام دنیائے آب و گل سے سیدھا ملک عدم اور مسکن شاید غار جہنم تھا۔ اور اگر سزا میں نرمی برتی جاتی تو کم از کم سزا چودہ سال قید بامشقت تھی۔ جس کو کاٹنے میں جوانی سے پیر فانی کی حد تک ویسے ہی پہنچ جاتا تھا اور اس کے بعد رہا سہا بڑھاپا خوار تھا کیونکہ مورث کا قاتل قانوناً محروم الارث ہوتا ہے چنانچہ چودہ سال کاٹنے کے بعد بھی سے بھیک کا ٹھیکرا ہی ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا اور جو اس مختصر سی دو دن کی مدت میں آئندہ زندگی کے فردوسِ خواب دیکھے تھے وہ سب کے سب چکنا چور تھے۔

تھانیدار نے قانونی ہمت کرکے شیروں کی کچھار پر چھاپہ مارا تھا علاقہ بھر کے پشتہا پشت کے والی اور مالک جمع تھے۔ سمجھ رہا تھا کہ بڑے زور سے ڈیفینس ہوگا، اور جانتا تھا کہ ہائی کورٹ کے بیرسٹر اور جج ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر سکیں گے۔ لہٰذا ضابطہ کی کارروائی میں بہت باضابطہ اور چاق چوبند تھا۔ چنانچہ ملزم کو تھانے لے جا کر حوالات میں بند کرنے کے بجائے سیدھا مجسٹریٹ کی ضلع کچہری شہر لے گیا اور سرشتہ کورٹ کے ذریعہ حاکم ضلع کے یہاں زہر خورانی سے قتل کے شبہ کی درخواست گذار کر استدعا کی کہ متوفی کی لاش قبر سے اکھیڑ کر پوسٹمارٹم کا حکم صادر کیا جائے۔ ادھر بندہ علی کے وکیل نے اس درخواست کی مخالفت کی ساتھ ہی ساتھ دوران مقدمہ ملزم کو ضمانت پر رہا کرنے کی

درخواست کی جس کی پولیس نے اس عذر کے ساتھ مخالفت کی کہ ملزم بااثر یافتہ اور بااثر شخصیت ہے اگر رہا کر دیا گیا تو ثبوت کے گواہوں کو
توڑ کر کے ثبوت خرد برد کرے گا۔ درخواست اور یہ عذر ضمانت دونوں ہی چیزیں مجسٹریٹ ضلع نے نامنظور کیں البتہ بندہ علی کو پولیس کی حراست
سے جیل کی حوالات میں منتقل کر دینے کا حکم دیا جو نسبتاً بہتر تھا۔ شام تک چھیانوے گھنٹے کا متعفن مردہ قبر میں سے اکھیڑ کر ایک فرسٹ کلاس
مجسٹریٹ کی نگرانی میں سول سرجن کے سامنے پوسٹ مارٹم کے لئے موچری پہنچ گیا جس کے ابتدائی معائنہ کے بعد ضابطے کے مطابق سول سرجن نے
مزید تحقیق و تفتیش کے لئے معدہ، آنتیں اور آلائش سربمہر پارسل بنا کر چیف کیمیکل اگزامینر کی رپورٹ اور رائے کے لئے بھیج دیں۔
بندہ علی کو اس افواہ کی چرانڈ تو سوئم سے ایک روز قبل دفن کے دوسرے ہی روز سنائی پڑ گئی تھی اور وہ سوئم کا مرحلہ طے ہو
جانے کے بعد سدباب اور ازالے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا، لیکن یادھر پولیس کے کان تک بھی پہنچ گئی۔ جیل کی حوالات میں اس کے پیروکار
اور وکیل اس سے اطمینان کے ساتھ باضابطہ اور ضرورت پڑے تو جیل کے اہل کاروں کے زر خرید تعاون کے ذریعے بے ضابطہ طور پر
بھی رابطہ قائم کئے رہے، بندہ علی کو ان کے ذریعہ حالات کا علم ہوتا رہا اور جیل کے اندر سے وہ ہدایتیں اور رہنمائی کرتا رہا۔ اور اس کو بڑی
حیرت اس بات پر ہوئی کہ اس نانہیالی قرابت دار چمار اس کیس کے سب سے اہم گواہ بنے ہوئے ہیں اور پولیس انھیں کے ذریعہ وہ زہر فراہم
ہونے کا ثبوت تراش رہی ہے جس سے مولا علی کا قتل ہوا اور یہی ثبوت مقدمہ کی سب سے زیادہ اہم اور مضبوط شق تھی بقیہ مولا نادستے ادمیاں
بنی سہام تو زیادہ سے زیادہ قیاسی گواہ ہو سکتے تھے۔ اب پولیس، بندہ علی اور اس کے پیروکاروں وکیل وغیرہ سب کی نگاہیں کیمیکل اگزامنر کی رپورٹ
بے چینی سے منتظر تھیں جس پر بہت کچھ دارومدار تھا۔ اس نوعیت کے کیس دھول کے پھندے ہوتے ہیں اور پہلا فلوک جو پولیس لگاتی ہے وہ شبہ
میں گرفتاری ہوتی ہے قانون اس سے زیادہ کر بھی نہ سکتا تھا کہ سرمحفل بندہ علی کو ہتھکڑی چڑھا کر پولیس لے گئی اور حوالات میں بند کر دیا۔
اور دوسرا اقدام مولا علی کی سڑی لاش اکھڑوا دینا تھا۔ مگر شروع سے آخر تک پانچ ہفتہ کی مدت میں سب کچھ مفت کی چرانڈ اور سڑانڈ ثابت
ہوا۔ پہلے تو سبب موت زہر خورانی ثابت کرنا تھا پھر قیاسی شہادت کی چولیں جوڑ کر عدالت میں اس کا مرتکب بندہ علی کو ثابت کرنا تھا۔
حاجی میاں کی رہنمائی میں بندہ علی کے قانونی مشیروں اور نجی پیروکاروں نے پولیس کے فلوک کے جواب میں فلوک لگایا اور کیمیکل اگزامنر
کی رپورٹ پر کیس کا انحصار کر دیا اور یہ فلوک تیر بہدف پڑا کیمیکل اگزامنر نے سبب موت ہیضہ قرار دیا جس کے جراثیم متوفی کے پیٹ کے
مواد میں پائے گئے اور اک مہینہ سوا مہینہ کے اندر ہی بندہ علی یہاں سے لے کر وہاں تک تھانہ سے عدالت العالیہ اور تراہم خسروانہ کی
تمام منازل ایک جست میں طے کر کے مونچھیں اینٹھتا بے لاگ اور بے داغ چھوٹ کر گھر آ گیا۔
اور یہ چھوٹے بھائی مرحوم کی چہلم کی فاتحہ کا ہفتہ تھا۔ جو ایسے خاندانوں میں بڑی اور روایتی تقریب ہوتی ہے، اونچے لوگوں میں
باقاعدہ دعوتی کارڈ تقسیم ہوتے ہیں۔ بڑے پیمانہ پر نادار وں اور محتاجوں کو اعلیٰ قسم کا کھانا اور کپڑا تقسیم ہوتا ہے۔ اور یہ تو دو چند سہ چند تقریب
تھی، جشن اندر جشن بپا تھا، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا، ورنہ کہاں بندہ علی اور کہاں اتنی بڑی ملکیت کی توریت، اگر مولا علی بڑھاپے میں
پیدا نہ ہو جاتا تو بڑے میر صاحب کل املاک وقف خیراتی کر کے کسی زیارت، مسجد، خانقاہ کو لکھ جاتے مگر باندی بچہ کو ملکیت دے کر
اپنے باپ دادا کے نام کو بٹہ لگا کر دنیا سے نہ جاتے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ قتل کے مقدمہ سے رہائی اور وہ آتنی جلدی، ورنہ ایک
معمولی بات تھی کہ ہائی کورٹ سے کیس چھوٹتا بھی تو ڈیڑھ دو سال حوالات میں بیت جانے اور اس عرصہ میں تمام املاک پر گورنمنٹ کا محکمہ کورٹ

آٹ وارڈ میں قبضہ کرلیتا، اور بندہ علی چھوٹ کر گھر آبھی جاتا تو ہاتھی کے منہ سے گنا تو کیا ملتا چوسی ہوئی کھوئی کا پھوکس ہتھ آتا ——

خوشی کا ٹھکانا نہ تھا، چھوٹے بھائی کا ماتم بڑھانے میں بڑے بھائی نے بہت ہی جھوم جھوم کر اہتمام کیا۔ ایسی خیراتیں، ایسی دعوتیں مختلف نوعیت کے مہمانوں اور دوستوں کے میلے۔ بس ناچ گانے اور شہنائی کے علاوہ بڑی سے بڑی تقریب میں جو کچھ ہوا کرتا ہے وہ سب ہوا۔ اور ان کی جگہ بھی بڑی بڑی خوش الحان نہ آتیں گو نچا گیس معمولی حیثیت کے لوگوں میں بھی چہلم کی فاتحہ میں دو روز لگ جاتے ہیں اور بندہ علی نے تو پورے دس روز منایا، اور مولا علی کی موت سے ٹھیک چالیسویں دن وہی کڑی بندش والی اپنے بزرگوں کی پگڑی سجا کر اور وہی عبا چغا پہن کر ٹل بیٹھا جو سویم کے روز حاجی میاں پہنا گئے تھے۔ مگر سادات کے اتنے بڑے اجتماع میں فسادات ناگزیر تھے اور پھر فسادِ خوردن گندم" کے ساتھ قورمہ، بریانی، متجن شیرمال، باقرخانی، مرغ مسلم کا فتور۔ بہرحال ان تمام کے ثقل کے ازالہ کے لئے کچھ نہ کچھ بندوبھی ضروری تھا۔ چنانچہ آنکھوں ہی آنکھوں سے چل کر کانوں کانوں سرگوشیوں میں چلیں اور مرا قر مہمانوں کی چہ میگوئیوں کا اندازہ معزز مہمان کو بھی ہوا بلکہ تڑ مڑ کر کانوں میں پڑیں تک "بندہ علی نے پولیس کو روپیہ بھر دیا"۔ "کیمیکل اگزامنر کو بھاری رقم بھر دی اور رپورٹ میں سبب موت ہیضہ لکھوادی"۔ "ڈاکخانہ اور ریل والوں سے مل کر راستہ میں معدہ اور انتڑیوں کا پارسل کھلوایا اور مولا علی کے بجائے بکرے کی آلائش بھروادی"۔ وغیرہ وغیرہ قورمہ بریانی، شیرمال متجن کے ہاضمہ اور سرور میں تخفیف ہوتی گئیں اور سب کی سب بندہ علی کی رعایا کے مولازادوں یہاں سے چلی ہوئی منسوب ہوتی ہیں، کیونکہ پولیس کو مخبری درحقیقت انہیں کے ذریعہ ہوئی تھی لہٰذا یار لوگوں کے مجمع کو ان کے سر تھوپ تھوپ کر حسرتیں نکالنے کا خوب خوب موقع ملا۔ اور ان لوگوں کی جانب سے تو نمک حرامی اور محسن کشی کے مظاہرے بندہ علی باپ کی زندگی ہی سے دیکھتا چلا آ رہا تھا اور یہ اب توریث کے ساتھ اس کو پہنچے تھے۔ باپ کی طرح اس کو برداشت کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا، البتہ چمار دن کی جانب سے یہ بالکل خلاف اُمید تھا۔ اس کے اپنے ننھیالی خون کے براہِ راست شریک اور ابھی تو اس کی بوڑھی ماں بیگم بنی محلسرا میں بیٹھی تھی۔ بلاشک اس پتھر کی لکیر جیسے قرابت کے احساس کو ادھر یہ اور اُدھر وہ روزِ اوّل سے آج تک سلیٹ کی تحریر سمجھ کر تھوک کی بنی سے مٹانے کے طفلانہ سی خود فریبی کے عمل میں گرفتار رہے تھے، وہ شاید یوں کہ ادھر چمار کے سامنے پنچائتی برادری کا سوال اور حال متقاضی تھا کہ روزِ روشن کی طرح جانتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر کے بھول جاؤ، ورنہ پھر برادری سے خارج ہو کر "کوڑھ میں خارش" چمار، چمار بھی نہ رہتا تھا، ادھر ریاست کی سیاست اس خود فریبی کو قائم رکھنے کی متقاضی تھی اپنی اسی حرکت کے بندہ علی کے وجود میں چلتی پھرتی لغزش بن جانے کے بعد بڑے میر صاحب پچیس سال زندہ رہے اور چمار اور سید دونوں ہی اپنی جگہ پر مضبوط خود فریبی کا کامیاب ڈرامہ کھیلتے رہے اور باپ کی زندگی بھر اور پھر آٹھ نو سال چھوٹے بھائی کے مرنے تک اسی ڈیوڑھی پر ناجائز بیٹا دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا پیدا ہو کر سن شعور کو پہنچتا رہا اور رم کلیا چماری بجلی بیگم کے لقب سے آج بھی بقید حیات تھی۔ اگرچہ اس نے بھی میر صاحب کی گرفت سے پہلی مرتبہ چھٹنے کے بعد سے آج تک خود کو ضیغہ ہی محسوس کیا تھا یہ اور بات ہے کہ کہلائی بجلی بیگم تھی۔

منوجی کا لگایا ہوا یہ داغ کسی چیز سے آج تک تھوڑا بہت پھیکا پڑتے دیکھا گیا ہے تو روپیہ کی رگڑ سے اور سادات کے ساتھ "رم کلیا" تو چماری نے بجلی بیگم بھی بن گئی تھی اور بندہ علی مولا علی ہو گیا تھا۔ مگر چمار بدنصیب جل کے توں موچی کے موچی ہی رہے۔ اور گنتی تو جتنی اچھی طرح بڑوں کو یاد ہے اس سے کم چھوٹوں کو بھی نہیں۔ آدمی خواہ کتنا ہی مردہ کیوں نہ ہو اس پر ٹھنڈے دل سے تو کل نہیں کر سکتا

کہ بھانجہ گھوڑے کو تا پھرے اور بیٹیا سائیسی کرے۔ ویسے تو مچھلی کا بچہ شناوری کی تمام تر تربیت ماں کے پیٹ سے لے کر نکلتا ہے لیکن باپ کی زندگی میں اور باپ کے مرنے کے بعد خورد سال بھتیجے بھائی کی ولایت اور سرپرستی انجام دیتے ہوئے بندہ علی نے ساری عمر ذہنی طور پر احساس کا سہ گری اور کارکنی میں گذاری تھی، ملکیت کا احساس اور اس کا ردعمل ذرا سنبھلتے سنبھلتے ہو پاتا یہ سر منڈاتے ہی یہ اولے پڑے مرگ ناگہانی کے تیسرے ہی دن اپنی موت آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوتی اور خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے، یہ تو ازلی اور ابدی لازوال ملکیت تھی، حکومت کی بچہ سقہ جیسی چند روزہ کرسی ہی ملوکیت کے سب آداب سکھا دیتی ہے اور ملکیت کے ساتھ حکومت کا نشہ تو ٹھیک ٹھیک دو آتشہ شراب ہوتا ہے۔

حاجی میاں جو علاقہ کے ان درمیانی حیثیت کے سید زمینداروں میں زمینداری کے رقبہ اور اپنے زہد واتقا کی وجہ سے سب میں ممتاز تھے اور چھوٹے بڑے سادات کے سب جتھے ان کا لحاظ واد پاس کرتے تھے اور پٹھان، رؤسا آل رسولؐ اور نسل فاطمہؓ ہونے کے گہرے احساس عقیدت کے زیر اثر بہت ہی جھک کر سامنے آتے تھے اور غلام کے فخر محسوس کرتے تھے پھر سونے پر سہاگہ برابر کی سادات میں بھی حاجی میاں چمکتے تھے یاں کی خداداد عقل و دانش تھی، تمام طبقہ کے پرخلوص مشیر خیال کئے جاتے تھے اور بندہ علی ان کا بڑا اکرام محسوس کر رہا تھا کہ باوجود خالص سید النسل ہونے کے مجھ چماری زادہ ننگ سادات کے سربراہوں کے خاندانی توریث کی کی پگڑی اپنے ہاتھ سے سجا کر وارث ہونے کا اعلان کیا اور پیشانی پر مخصوص آیت قرآنی دم کرکے چمار کا دھبہ مٹایا اور اپنے ہاتھ سے سادات کی مہر ثبت کی۔ چہلم کے دعوت نامہ پر سبھی ہم چشموں نے شرکت کی۔ حاجی میاں سب سے پہلے تشریف لائے اور مجمع چھٹ جانے کے دو تین روز بعد تک قیام فرما رہے، اور اسی دوران میں ملوکیت کے تمام کامیاب راستوں کی نشاندہی کر گئے جو ازلی ملعدزاد غلام رئیس زادہ کے دماغ میں پہلے سے تھے ہی، صرف اک ذرا جرأت رندانہ کے ساتھ قدم اٹھانے کا مسئلہ تھا اور راستہ اتنا ہموار و یکتا اور سیدھا تھا کہ ہر منزل جس کی بھی جانب رخ کرکے اِک ذرا پاگ اٹھا دو زیر قدم تھی"۔ حاجی میاں نے بتایا کہ ظلم کے پیٹ سے احسان کھینچا جاتا ہے ــ "دنیا ایک مٹھا ہے، ایک گنا ہے، جتنا دباؤ گے اتنا ہی میٹھا میٹھا رس نکلے گا۔" اور یہ طوطا تو وہ اپنے باپ دادا کے وقت سے سنتا دیکھتا چلا آیا تھا کہ "ہمارے یہاں آؤ گے تو کیا لاؤ گے؟ ہمیں اپنے بلاؤ گے تو کیا کھلاؤ گے؟" "عورت مرد کی قدل ہے" وغیرہ وغیرہ منو سمرتیوں کا اختراع کیا ہوا، برہمنو راجپوتی سبق کا پورا آموختہ یاد کرا دیا۔ جو اس کے ماحول میں کوئی چیز نہ تھا مگر اس کے اندر والا محض اس ڈر سے کہ کہیں میری چھاپ عریاں نہ ہو جائے اس کو اس کے عملی مظاہرے سے روکے ہوئے تھا۔ لیکن کل جگ کی نشانیوں میں کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شودر کے گدے متعفن نابدان کو جوش آتا ہے تو گنگا جمنا اور برہمپتر کے سب سیلاب اور سے اونچا نکل جاتا ہے اور جل پتری کا سماں دنیا کے سامنے آجاتا ہے۔ حاجی میاں اور ان کی قطار کے چند اور نہ رگوں نے کوئی نئی تو بتائی نہیں، معلوم تھیں کہیں ادھ سنی ہوئی سنائیں اور کچھ بھالی بنائیں، مگر جیسے اس کا دماغ بھق سے ہو گیا، چودھوں طبق روشن ہو گئے۔ اندر والے چمار نے کسی کونے کھدرے سے انگڑائی لی اور سید پر بھی چڑھ بیٹھا۔

(۲)

ایسی ہو کتیں جیسی میر صاحب جیٹھ بیساکھ کی جلتی ہوئی دوپہری میں اپنی خنک و نم خواب گاہ کے اندر کر بیٹھے میر و امیر صاحبان

کا چڑیا چڑونے کی آپ بیتی والا ڈرامہ ہوا کرتی ہیں اور دن داتے ہوتی رہتی ہیں، لیکن کبھی کبھی درمیان میں دستِ قدرت داخل ہو کر چلتے چلتے شوخی بھی دکھلا جاتا ہے۔ رم کلیا شودر کی لونڈیا تھی جس کو خالق محرومیاں ہی محرومیاں عطا کر کے دنیا میں بھیجتا ہے۔ رنگ روپ، چال ڈھال کچھ بھی تو نہ تھا۔ حتیٰ کہ ابھی ڈھنگ کے ساتھ پوری طرح جوانی بھی نہ چڑھ پائی تھی اور بچی دلڑکی کے بین بین ہی تھی، البتہ اٹھان بتا رہا تھا کہ عورت کی دلکشی قسم میں سرچڑھے گی۔ بڑے میر صاحب تو بڑے میر صاحب، کوئی چمار کا لڑکا بھی ڈرج کے ساتھ مشکل ہی سے اپنی چماری بنانے پر تیار ہوتا۔ ملامت کا سوال ہی نہیں۔ البتہ چھ سات ماہ بعد ایک مرتبہ کو میر صاحب سوچ میں پڑ گئے جب مخبرین خاص کی زبانی چماروں کی پنچایت کا علم ہوا اور یہ کہ رم کلیا نے بڑے میر صاحب کا نام لیا ہے۔ بہرحال ایسی بلندی اور پستی کے اتصال کی زندہ مثالیں بھی اپنی برادری میں کوئی نئی چیز نہ تھیں، البتہ یہ سید اور شودر کے ٹکراؤ میں چنگاری سی پھینچ جاتی تھی۔ عیاں کہ، نایاں ہوتے ہی اٹھائیس گاؤں کے چماروں کا اکٹھ ہوا۔ لیکن پنچ بڑے میر صاحب کا نام نامی سنتے ہی دم نہ مار سکے اور بالآخر فیصلہ رم کلیا کے باپ ہی کے سر رہا۔ چمار نے ہمت کر کے اور خاص کارندہ کو اپنی حیثیت سے زیادہ نذر گزار کر باقاعدہ عرضی دی۔ اگر چاہتے تو ڈانٹ پھٹکار کر بھگا بھی سکتے تھے مگر میر صاحب جہاندیدہ بزرگ تھے، تولید و تناسل کے دور رس اثرات اور قانونِ وراثت کی لامٹی کے بڑے اچھے محرم تھے، سمجھ سکتے تھے کہ اگر چماری چمار کے گھر میں سید بچہ جنے گی تو آئندہ نسلاً بعد نسلٍ کیا کیا اندیشے اور مسائل ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ چمار کو رقم دے کر راضی کیا اور لڑکی کو خوش خرید لونڈی بنا کر حرم خانہ میں داخل کر کے ضابطہ کی خانہ پری کر لی اور اس طرح شرعی مسئلہ بھی پہلے نہ سہی بعد کو سلجھا لیا اور حویلی کے ایک ویران و افتادہ گوشہ محل جیسے حصہ میں ایک شب چماری بیگم نے لڑکا جنا۔ پیدائش کی خبر سن کر مادر زاد عوام غلام کا نام سرکار نے خود ہی بندہ علی تجویز فرمایا۔ اسم بامسمّیٰ تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے اور بندہ علی اسی حویلی سے دیوان خانہ تک اپنی مخصوص "ربیب" اور "النجب" والی سطح پر پل کر جوان ہوا۔ اس سے بھی کم اہم جتنے گئو خانہ میں گایوں کے بچھڑے اور اصطبل اور گھوڑیوں کے بچھیرے پیدا ہو کر پروان چڑھتے تھے۔ اس دوپہری کی مخصوص ساعت کے بعد میر صاحب سے پھر کبھی رم کلیا کے قریب پایا تو در کنار پیچھے مڑ کر دور سے دیکھا بھی نہیں، بس صرف کئی کے ساتھ وہ بھی ضابطہ کے مطابق سرکار کا جنازہ پر چوڑیاں ٹھنڈی کرنے اور رنڈ سالہ پہنانے کے لئے لائی گئی۔

کہتے ہیں کہ بارہ برس بعد گھورے کے بھی بھاگ جاگتے ہیں۔ مگر شودر تو منوجی کتاب میں کوڑے کرکٹ سے بھی ارذل لکھا ہوا ہے لہٰذا اس کا مقدر کہیں چوبیس برس بعد جاگا۔ سال خوردہ جب بڑے سرکار اور ان کے بعد خوردسال سیدانی زادہ مولا علی دونوں اللہ کو پیارے ہوئے اور ابرنیساں کا اعاق بھرتی دبا ہوا قطرہ بندہ علی آب و تاب کے ساتھ نکل کر دُرِ یتیم کی صورت منصۂ شہود پر آیا۔ اور پورے ۲۴ سال بعد اس پر جوانی چڑھی۔

اس پوری طویل مدت میں بندہ علی کے ننھیال عزیز اپنی بیٹی رم کلیا اور اس کے بیٹے بندہ علی کو ذہنوں سے محو کئے رہے اور یہی صورت ان دونوں ماں بیٹے کی رہی کیونکہ ایک دوسرے کو کسی بھی پہلو تسلیم کرنے سے سادتی سیاست بری طرح مجروح ہوتی تھی۔ شودروں کی بستیاں بالعموم خاص قصبہ یا بڑے گاؤں سے باہر چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کی صورت ملحقہ بسی ہوتی ہیں، اسی طرح خاص بڑی بستی جو میر صاحب کی مسکن تھی اس کے چاروں طرف مضافات میں آدھے آدھے پونے پونے میل پر شودر آباد تھے۔ خاص قصبہ میں بیگار میں پکڑے ہوئے آتے

تھے یا فصل کے فصل خریف ربیع وجوب ادا کرتے، ان میں بہت کم خاندان موروثی کاشتکار تھے اور جن کے قبضہ میں موروثی اراضیات چلی آتی تھیں وہ بہت گھٹیا قسم کی تھیں جن پر بہت زیادہ محنت کرنے کے بعد بہت تھوڑی پیداوار ہوتی تھی۔ باقی زیادہ تر کمیت مزدور اور مردہ ڈھور اٹھانے والے موچی تھے، بیلوں کے مالک ہونے کے باوجود انھیں صرف ہل میں جوت سکتے تھے یا کھیتی کا اور کام لے سکتے تھے، ان پر سوار نہیں ہو سکتے تھے نہ بیل گاڑی رکھنے کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ علاقہ کے اندر شودروں کی جنس کا بھاؤ اونچی جاتی والوں کے مقابلہ میں کم تعین ہوتا تھا اور اس کی تشخیص زمینداروں کے مختار عام کا ذمے کیا کرتے تھے۔ تمام علاقے کو چمڑا پکا پکا کر جوتا پہنانے والے خود جوتا نہ پہن سکتے تھے اور جاڑوں کی یخ بستہ اور گرمیوں میں جلتا تو اسی زمین پر ننگے پاؤں چلنے پر مجبور تھے۔ قصبہ سادات گڑھ کے رعایا چمار باپ عالی سے نسبتی قرابت کے باوجود جہاں کے تہاں تھے۔ بلکہ مدتوں رم کلیا کے باپ بھائی بڑی بے ڈھب صورتِ حال سے دوچار رہے۔

مولازادوں میں تو خیر یہ چینی پھیلی ہی، حیرت تو یہ ہے کہ یہ سوکھے پتے بھی ہلا دیتے لگے۔ حوالات میں ہی وکیل کے ذریعہ پتہ چل گیا تھا کہ زہر خورانی و قتل کا کیس طیار کرنے کے لئے پولیس نے جو اسٹوری طیار کی تھی اس میں بندہ علی کو زہر فراہم کرنے کی شہادت اس کے ننھیالی قرابت داروں میں سے تراشی تھی جو علاقہ بھر کے مرے ہوئے ڈھور گھسیٹتے تھے اور وہ باعث کے لئے ایک مخصوص قسم کے زہر کا استعمال کرتے تھے جو بالعموم خود ہی جنگلی زہریلے پودوں سے تیار کرتے تھے اور جو چمڑا ایک جانے کے بعد ناندوں میں نہایت تیز ہو کر رنگین ہو جایا کرتا تھا، کبھی کبھی بدمعاش چمار کھال کے لالچ میں یہ زہر چراگاہوں میں جگہ جگہ گھاس پر بھی چھڑک دیا کرتے تھے جس کو چر کر تندرست جانور آن واحد میں مر جاتے تھے، بھولے بھالے سادہ دل کسان اس کو "قضا آ گئی تھی" سمجھ کر رو پیٹ کر بیٹھ رہتے تھے اور چماروں کے ہاتھ کھال آ جاتی تھی اور کچھ ایسے ہی حالات و علامات میں خوردسال مولا علی کی بھی موت واقع ہوئی تھی۔ ویسے منوجی ہر دور کی کوڑی لا لا کر شودر کے گرد بڑے سنگین بند باندھ گئے ہیں لیکن اس کل جگ کے تقاضہ کے تحت جب کبھی چمر ٹیلیکے ٹھہرے ہوئے گدلے متعفن پانی میں ابھار آتا ہے تو بند ساگر کے سیلاب سہم کر رہ جاتے ہیں۔ شاید ۳۴ سال بعد بڑے میر صاحب کی چیرہ دستی کا انتقام لینے کے جذبہ کے تحت یا نہ معلوم کیوں پولیس کا اک ذرا سا سہارا ملنے پر موقع ہاتھ آتے ہی سانپ کا سا پھن پھیلا کر اپنے دودھ شریک ہمشیرزادے سید کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کیمیاوی رپورٹ آنے کے، وران میں بنیادی اور سب سے زیادہ مضبوط شہادت حصولِ زہر کی پولیس نے ان ہی چماروں میں سے تراشی تھی بقیہ واقعاتی دوسرے درجہ کی گواہیاں بندہ علی کے ہی عام مولازادوں میں سے گڑھ کر تیار کی تھیں۔ مگر وہ تو جڑ ہی کٹ گئی۔ ورنہ اگر کیمیاوی رپورٹ میں ذرا بھی سراغ کسی سمیت کا مل جاتا تو پولیس اپنی اصطلاح میں بڑا اعلیٰ مقدمہ ٹھانستی جو، اگر چھوٹتا بھی تو کہیں جا کر ہائی کورٹ سے اور وہ بھی کہیں دو ڈیڑھ سال بعد حوالات میں بند رہنے اور لاکھوں روپیہ بہانے کے بعد۔ لیکن فلک کی چال کے مقابلہ میں فلسفہ اور سائنس دونوں ہی بات کھا جاتے ہیں، اللہ جانے کہ سچ مچ ہیضہ کے جراثیم ہی نکلے۔ ویسے سول سرجن سے لے کر اوپر کیمیکل اگزامنر تک روپیہ بھرونے کی جھوٹی سچی افواہیں بھی ایسے کیسوں میں عام سننے میں آتی رہتی ہیں۔ بہر حال مقامی پولیس کے ہاتھ کہتے ہیں کہ حبہ بھی نہ آیا۔

قتل کے الزام کے شعلوں میں سے صحیح سالم نکلنے کے بعد بندہ علی نے چمار کے صبر و برداشت اور سید کی دانش و جلال کو ملا کر جائزہ لیا تو بجز اس کے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا کہ چمار کو خبر مطلع ہو جائیں گے، پولیس کے اثر اور اس کے سامنے ہٹ کر جیل چلے جانے کے سبب میدان

خالی سمجھ کر مخالفت پر تیار ہوگئے تھے، اور پھر ان سے بعد کو سمجھوں گا پہلے ان مولاناؤں سے نبٹ لوں حالانکہ یہ بڑا کام تھا۔ دونوں ہی چھٹے تھے، جن میں سے ایک کے ساتھ باپ کی جانب سے دوسرے کے ساتھ ماں کی طرف سے خون شامل تھا۔ اور ایک جمعہ کے جمعہ مسجد اور کلمہ گوئی کا شریک بھی تھا حالانکہ جائداد کی ملکیت ہاتھ میں آنے کے بعد بندہ علی ڈیڑھ سید بن گیا تھا۔ جیل سے واپس آنے کے بعد چشمۂ شیریں کے گرد چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک پھر جمع ہوگئے اور جھوٹی سچی کہانیاں گڑھ گڑھ کر اپنی اپنی عداوتیں اور بغض نکالنے کے لیے ساتھ ہی ساتھ اظہار ہمدردی اور وفاداری کا مظاہرہ کر کے اس کے مقربین میں پہنچنے کے خیال سے بندہ علی کو استعمال کرنا شروع کیا۔ بندہ علی نے اس سلسلہ میں کیسے ہی اقدام سے قبل بہت سوچا اور پھر خوب سوچ سمجھ کر حاجی میاں کی خدمت میں حاضر ہو ہو کر خاص رہنمائی حاصل کی جو چھوٹی ساونتی سیاست میں اپنی نظیر آپ تھے ساتھ ہی ساتھ اس علاقہ میں سب سے بڑے سے زرخیز اور بلا انقطاع رقبہ کے قابو یافتہ زمیندار تھے۔ پکے دین دار، پھر ہر نوعیت کی دولت کے ساتھ ساتھ سادات کی سیادت سے بھی مالا مال تھے اور اس سب پہ سونے پہ سہاگہ کم سنی کی زندگی ایک سے ایک بڑھ کر سعادتیں، اپنے طبقہ میں ان کا درجہ محترم تھا، چھپتر کے پیٹے میں بھی بھاری بھرکم بلند و بالا، سرخ سپید، انار دانہ سا رنگ، دودھ برف میں دھلی ہوئی پوری چھاتی پر محیط بال بال تری داڑھی۔ سر پر مکہ شریف اور مدینہ منورہ کے ہر حج کے بعد بدلے گئے سات رومال نیم عربی نیم ایرانی لباس عبا و جبہ، ہاتھ میں ہمہ وقت کھٹکتی ہوئی زمرد کی بیش قیمت تسبیح جس وقت اپنے نامی گرامی علاقہ بھر کے سب سے اونچے ہاتھی کے گنگا ہرولے میں بیٹھتے تو ہودا بھر جاتا اور ہاتھی سج جاتا۔

کراچی اور لاہور کے کاروں کے دولت مند شوقینوں کی طرح ازدواجی کاروبار میں حاجی میاں حرام کو حلال کرنے کی شرعی ترکیبوں کے راستے پندرہ سولہ سال کی عمر سے ستر چھپتر تک پہنچتے پہنچتے ہر دوسرے تیسرے برس ایک نیا ٹاپ ٹپا ماڈل بدلتے رہے تھے اور سال لفز ٹیکسیوں کی سواری کے نمبر ہی شمار میں نہ آسکے تھے حتیٰ کہ اچھی طرح صورتیں بھی یاد نہ رہ سکتی تھیں۔ لیکن اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ اور یہ نعمت ہاتھ آتی بھی تو قدرت کی ستم ظریفی سرے لگے درخت پر ہی سے کیڑوں لگے پھل کی صورت جس کو ہاتھ میں لے کر دور پھینک دیتے ہیں۔ ایک ذرا جوان سی دکھائی پڑتی بیوہ زنانخانہ کے باورچی خانہ میں نئی نئی کام پر آئی یہ باورچی خانہ صرف اسی کے چارج میں چلتا تھا۔ کھانا تو باہر مطبخ سے پکا ہوا مردانے زنانہ میں تقسیم ہوتا تھا اور حویلیوں میں بھی آتا تھا لیکن بیگموں نے یہ باورچی خانہ بالعموم کھانا گرم کرنے کے لئے یا کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے کوئی خاص کھانا بالخصوص پوری کچوان وغیرہ تیار کرنے کے لیے ورنہ گرم گرم چپاتیاں پکوانے کے لیے قائم کر رکھا تھا۔ اتفاق سے چاروں بیگموں کو کسی ایک بڑی شادی کی تقریبوں میں شرکت کرنے کے لئے سفر پر جانا پڑا، ادھر حاجی میاں کو نزلہ و زکام اور ہلکی حرارت ہوگئی حویلی سے باہر نہ نکل سکے اور یہ اس خادمہ کی تقریبِ ملاقات کا موقع ہوا۔ نزلہ و زکام کی بیماری میں پرہیز تو چلتا نہیں ہے تاہم خادمہ نے گرم گرم پھلکے دوڑ دوڑ کر پہنچائے، بڑے اہتمام کے ساتھ شوربہ بنایا۔ اور میاں کو نجو کی چپاتیوں میں وہ مزہ آیا کہ بیگموں کی پوریاں کچوریاں گلگلوں تک کو بھول گئے۔ "خدمت" اور "خلوت" ——— دور دور تک میدان خالی گرم گرم چپاتیوں کے بڑھتے ہوئے پلنگ دوسرے تیسرے ہی دن گرم گرم بستر تک جا پہنچے اور پندرہ ہی دن کے اندر میاں سنانہ دین کا چراغ رگڑ کر نئی حرم سرا تعمیر کر لی، خادمہ مخدومہ بنتی دکھائی دی۔ بہرحال بیگموں کو یہاں تک قابلِ برداشت تھا۔ گندم ہضم ہوتا رہے روٹی کی گرمی بستر کی نرمی تک ہی ہے لیکن جب بات روٹی کے تعارے نکل کر ڈبل روٹی بنتی نظر آئی تو بہت چیں بہ جبیں ہوئیں۔ وہ آرزو جس میں حاجی میاں کے والد مرتے دم تک رہے اور آج تک حاجی میاں مر رہے تھے قدرت اپنی اسی ہشیاری کے بیٹے

کی اندھیری کوٹھری میں سے نکال رہی تھی۔ اور بیگموں کی جنگ زرگری کی سازشوں کے درمیان نجو نے بتایا تھا جس کو سرکار کی نگاہ میں چاروں ملازموں نے سازش کر کے یاد دلاؤ والی بیل منڈھے نہ چڑھنے دی اور چرب زبانی سے اتنا گرا دیا کہ سرکار اس کو اپنی داشتہ کے پیٹ کی نکمی رسولی سے زیادہ مختلف تصور نہ کر پائے اور قدرت کی شوخی! بہرحال اتنا دوسرا بچہ بنا کر بھی کچھ ایسا ہی بیمار تھا، صورت شکل کے اعتبار سے چھپا نہ تھی، آدمی بونا لنگڑ وغیرہ کسی جنگلی مخلوق اور آدمی کا کراس نظر آتا۔ جوں جوں بڑھا پتہ چلا کہ دماغی صلاحیتوں سے بھی بالکل ہی ناکارہ ہے۔ ادھر بیگموں کی سازش بار آور ہوتی ہوئی پکائے فرال کا بیٹا باورچی خانہ کے برتن مانجھنے کی صلاحیت سے آگے تربیت پذیر نہ ہو سکا اندر سے لے کر باہر تک سب کی تفریح کا ذریعہ بن گیا۔ بڑے منشی نے بدّا نام رکھ دیا، بوڑھی ماں کے ساتھ باورچی خانہ میں رکابیاں چاٹنا اور ہانڈیاں مانجھنا اس سے زیادہ صلاحیت نہ تھی بڑی بیگم دبے اس سازش کے معاملے میں اپنی تینوں ادھیڑ، جوان اور نوجوان سوتنوں میں کسی سے پیچھے نہ تھیں لیکن خود تو بیدو ناس کی عمر سے کبھی کی متجاوز کر گئی تھیں اور ناامید تو پھر ابھر جوانی ہی ہوگئی تھیں دو امید سے ہونا تو ان تینوں میں سے بھی کسی کو نصیب نہ ہوا تھا لیکن بڑی بیگم تو تارک الدنیا بھی ہو گئی تھیں عبادت کا ہمیشہ سے شوق تھا ادھر کار خیر کے مشغلہ کے طور پر اپنی حویلی کے ایک حصہ کو یتیم خانہ سا بنا لیا تھا، خوردسال یتیم یسیر بچوں کو تلاش کرا کرا کر لاتیں، لاوارث غریب نادار بچوں کی نوکرانیوں کے ذریعہ اپنی نگرانی میں پرورش کراتیں کئی لڑکیوں کی انہیں بھلے گھروں میں شادیاں کرا چکی تھیں کتنے ہی لڑکے پال پال کر اور پڑھا لکھا کر اپنے اثر سے روزگار سے لگائے تھے بھوتا باندی کسی دیہاتی حجام کی خوردسال بیٹی تھی طاعون جو پڑا تو بھرا گھر خالی ہو گیا اور یہ بدنصیب بچ رہی جیسا ہوتی تو بیگم کو پتہ چلا کہ گلی کی کتیا کی طرح بستی میں پھرتی ہے دور دور تک کوئی عزیز نہیں اور حجاموں کی برادری تو بہت ہی مختصر اور محدود ہوا کرتی ہے، خبر سنتے ہی پکڑ بلایا اور پلنے لگی۔ صورت شکل جیسی دیہاتی حجاموں کی ہوا کرتی ہے ویسی ہی کالی کلوٹی لیکن مقدر نے طاعون کی وبا سے نائی کے جھونپڑے میں تو پناہ دے دی تھی نواب کی محلسرا میں قضا و قدر کے چنگل نے آ دبوچا، چیچک نے چہرہ پر سے سارا گوشت نوچ لیا اور چلتے چلتے ایک آنکھ بھی پھوڑ دی، جوان ہو کر خوب رو نہیں تو آدمی کا بچہ ضرور بن جاتی مگر وہ تو چڑیل بن گئی، ویسے تو بڑی بیگم اب تک پہلی ماہواری پر ان بے سہارا لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر دیتی تھیں لیکن اس کی کھپت تو حجاموں ہی میں ہو سکتی تھی اور بستی کے نائیوں کے لونڈوں کے اب پَر لگ گئے تھے۔ چھٹے مہینے بھاگ کر شہر جاتے اور ہیر ڈریسنگ سیلونوں میں نوکری کرتے دن میں ایک آدھ لڑکی کے بھی بال ڈریس کرنے کے موقع بہم پہنچتے جب بڑی بیگم نے اس میں سلسلہ جنبانی کرائی تو پتہ چلا کہ یہ تو دیہات کی حجامنیوں میں بیس ٹوٹنے میں پیار تہی کر گئے۔ اور بھوتا پہاڑ کی پہاڑ ہو گئی، یہاں تک کہ نظر آنے لگا کہ اب بھوتا اسی گھر میں باندی بن کر رہے گی چنانچہ بھوتا کے ساتھ باندی کا لفظ بھی شامل کر دیا۔ بڑی بیگم کے پاؤں دباتی جس میں اس کو بڑا ملکہ تھا کبھی کبھی اور بیگمیں بھی ہاتھ پاؤں دبوانے کے لئے بھی بلا لیا کرتیں، دسترخوان کی جھوٹن کھاتی یہاں لوگوں کی جوانی کا طول شب ہجر اور زلف معشوق سے زیادہ طویل ہوتا ہے اور ساری عمر شب وصل میں کٹتی ہے اور تادم مرگ بلا استثنا کالی گوری ہر جوانی کو صدائے لبیک بلند رہتی ہے۔

حاجی میاں کو شکار کا بہت شوق تھا، تمام جاڑوں معذانہ کا معمول تھا کہ مغرب کے وقت بستی کے قریب چاروں طرف چھوٹے بڑے تالابوں پر دبک کر بیٹھ جاتے۔ یہ وقت قازوں کی چکائی تھا، مغرب کے وقت سے چھوٹے بڑے تنگ قیں قیں کرتے ہوئے آنا شروع ہو جاتے اور ساری رات آتے رہتے اور تالابوں پر منڈلاتے وقت حاجی میاں فلائنگ شاٹ کرتے اور بالعموم رات کے گیارہ بجے کے ارد گرد پلٹتے اور آج چھوٹی بیگم کی خوابگاہ میں داخل ہوئے تو بیگم سو چکی تھیں اور بھوتا باندی آہستہ آہستہ سہم دیا رہی تھی، کمرہ کے اندر اگر کے دھوئیں اور جاڑے کے بستروں کی خوشبوؤں میں بسا ہوا ماحول جذبات انگیز بلکہ ہیجان زا تھا جس کا اعین تالاب کے کنارے نم اور سرد فضاؤں میں ہی تصور ہو چکا تھا پہلی نظر کے بلکے سے

جائزہ میں بیگم کے حسنِ خوابیدہ سے آنکھیں خیرہ سی ہو گئیں، دل مچل پڑا، مرمریں باہنوں اور پنجوں کے درمیان گلابی شہابی چہرہ خواب کے مخصوص اثرات میں کچھ اور ہی پھبن، بند غلافی آنکھیں کھلی ہوئی نرگسِ نشیلی ڈک دار آنکھوں سے بھی زیادہ مسحور کن ہمارا چہرہ، ایک جانب کو ریشم کے لچھے بے پروائی سے کنگھی و شانہ سے بے نیاز نرم و ملائم کے تکیوں اور رضائیوں پر چھوٹی بیگم کا سونا اور سیندور بکھرا ہوا تھا اور دیوارگیری اور سبز مائل گلاب کی شمعیں اس رب پر سہاگ پڑھا رہی تھیں۔ تمام ماحول انتہائی متواضع تھا۔ اور ایک سانس لیتے ہی جیسے میاں کے رگ و پے میں ہر طرف دوڑ گیا، کمرے کے اندر۔ داخل ہوتے ہی بھوٹا باندی چھوٹی بیگم کا بدن چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دبے پاؤں چل پڑی۔ دوسرے تیسرے قدم پر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دالان میں کہیں دور سے پڑتی ہوئی مری مری پٹوں دار روشنی میں حیرت اور تجسس کے ساتھ اپنا اولاپٹے ہوئے میلے اُپلے جیسا چہرہ موڑا اور اپنی واحد آنکھ سے استفسار بہ اور یک گونہ حیرت کے انداز میں تعاقب کرتے ہوئے آقا کی جانب دیکھا اور کچھ ٹھٹکی تھی کہ کیا حکم دیتے ہیں۔ اس ادا پر میاں کے اندر تو بجلی سی لپک گئی۔ نجیب الطرفین سید کے اندر سے نہ معلوم کس کونے کھدرے میں سے جیسے ان حجام لونڈوں میں سے کسی نے جست لگائی جن کو بھوٹا کو پسند کرنے اور جوڑا ملانے کے لئے آمادہ کرنے میں بڑی بیگم کتنی برس سے ریاض کر رہی تھیں اور یہ غفتہ حجام بھی گھر کے اندر ہی پل رہا تھا، میاں کے اندر سے ٹینی مرغے کی طرح پھرکی سا لیتا بھوٹا پر جا پڑا۔ اور بھوٹا باندی کی وارڈن بڑی بیگم سے لے کر میاں کی مقربِ خاص اور منظورِ نظر چھوٹی بیگم تک ساری بیگمیں پڑی سوتی رہیں، اور بھوٹا ایک ذقند میں باندی سے بیگم بن گئی، اور سڑے ہوئے گندم کا نابدان تو ہر آدم زاد میں ہوتا ہے، اور پیٹ میں بج بجاتا ہے بھوٹا تو کافی تمیز تھی اور اس خمیر کے کیڑے تو اندھی لولی لنگڑی اپاہج میں بھی یکساں متحرک رہتے ہیں۔ حویلی والوں کی نگاہ میں بھوٹا ایک گنڈا تھی، جو صبح سے شام تک کھاتا ہے اور لوٹ صبح کو کھا کر فضلہ خارج کر دیتا ہے۔ ویسے حاجی میاں کی اس بدذوقی پر بھی کسی کو تعجب نہ ہوا، ربڑی بالائی سے منہ موڑ کر گوبر کے چھینٹے پہ منہ ڈال دیا یہ وقت کی بات ہوتی ہے۔ چھوٹی بیگم کا کندن انہیں مٹی نظر آیا اور بھوٹا کا گوبر سونا دکھلائی دیا، اٹھوارے ہی اندر مختلف قیاس آرائیاں تھیں، باہر تک بات پہنچی تو میاں نے اپنے بے تکلف ندیموں میں پہلے تو بریانی تنجن، قورمہ باقر خانی کھاتے کھاتے اوب کر مسی کی روٹی اور مرچ پودینہ کی چٹنی کو جی چاہ اٹھنے والی بات کہی، پھر محققانہ انداز میں بھوٹا کے اندر ایک مخصوص جنسی کشش کے سراغ کی نشاندہی کی اور پھر بعض ہم ندیموں نے کہا کہ میاں کانی آنکھ، کھترا چہرہ، لکڑ ساقد، کرخت ہاتھ پاؤں سب ایک پلے میں اور اکیلا کرانڈا ایک پلے میں۔ اور میاں کے انتخاب کی داد دی اور ان حجام لونڈوں اُلو کے پٹھوں کو گالیاں دیں جنہیں شہر کی ہوا لگ گئی تھی، جن پہ بڑی بیگم بھوٹا کو قبول کرنے کے لئے مدتوں سے ریاض کر رہی تھیں۔

اور بڑی بیگم کو اب تو برسوں کی گنتی بھی یاد نہیں رہی تھی کہ کب سے وہ میاں بیوی نہیں ہوئے ہیں، ان کے بعد تو تین چار اور خارج ہو چکی تھیں اور اب تو چھوٹی بیگم ہی سہاگن تھیں اور چڑھی ہوئی تھیں بقیہ اور ان کے بیچ والی وہ بیگمیں وہ بھی اتر چکی تھیں اور بڑی بیگم تو بھول بھی گئی تھیں کہ وہ بھی کبھی بیوی تھیں یا ہمیشہ سے محرمات جیسی کوئی رشتہ دار بیچاری مدتوں سے بقیہ عمر یادِ الٰہی اور خدمتِ خلق میں بسر کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں اور بڑی باعمل زندگی بسر کر رہی تھیں۔ رات بھر عبادتِ خدا اور تمام دن خدمتِ خلق یتیم بچوں پر متعین خادماؤں کی نگرانی، اور انھیں قرآن پڑھانا، لیکن اکثر شب کی عبادتوں میں خلل واقع ہوتا۔ اور کبھی کبھی تو تہجد حقیقت سے پھسل کر مجاز میں جا پہنچتی۔ جب میاں اور چھوٹی بیگم کی خوابگاہ کی سمت سے بت تاہٹ اور پھر کواڑوں کی کھٹ پٹ اور پھر چاپ سنائی پڑتی، وہ اپنے کمرے سے نکل کر اور دالانوں سے گزرتے ہوئے صحن پار کرتے اور

پیشاب کرنے کے لئے بیت الخلاء جاتے تو رفع حاجت سے بھی زیادہ کوئی بات بڑی بوڑھی بیگم کے ٹھنڈے رگ و پے میں محسوس ہوتی جس کی نمایاں علامت گرم گرم گیند جیسی کوئی چیز ناف کے نیچے سے اوٹھتی ہوئی اوپر چڑھتی اور پھر نیچے اترتی بوڑھی عابدہ زاہدہ بیگم استغفار اور لاحول پڑھنے لگتیں، کچھ نعمان جیسی کیفیت طاری کرنا چاہتیں اور پھر تازہ وضو کر کے نیت باندھ لیتیں، وصل سے دست برداری کے بعد بیتے دنوں کی یادیں بھی معدوم ہو کر حال کی حسرتوں میں ضم ہو گئی تھیں اور اب حسرتوں ہی میں زندگی کے مزے لیتیں۔ اور چھوٹی بیگم کو تو ان شب بیدار کی عبادت گاہ اور اعتکاف خانہ اپنے حصہ رہائش اور خالص خلوت گاہ کے اتنے قرب میں کھٹکتا تھا لیکن بڑی بیگم نے نہ معلوم کیوں یہی حصہ پسند کیا تھا۔

..... اور اس کا پتہ انھیں چھوٹی بیگم کی خلوت اکثر جانے کے بعد چلا جب ادھر کا حصہ ویران اور خاموش ہو گیا کہ دوسرے تیسرے روز دو ایک نوکرانیوں نے بھوٹا پر جملہ چست کیا اور خوشبو تو صبح ہی کو نہ معلوم کیسے حویلی بھر میں سویرے ہی پھیل گئی تھی اور مہینہ اندر حجاب نو عروساں بھی رخصت ہو گیا اور میاں کھلم کھلا چالو ہو گئے۔ چند روز بڑی بیگم کے کانوں میں بجائے بیت الخلاء کی جانب جانے کی چاپ کے چھوٹی بیگم کی خلوت سے تو تو میں میں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، بڑی بیگم بیچاری کے شیخ بیٹھا بیٹھا دیکھ کیوں میاں بیوی کے درمیان پھٹے میں پاؤں اڑانے جاتیں، البتہ اپنی وارڈ اور خاص الخاص اصیل بھوٹا باندی سے کبھی کوئی تعرض نہ کیا اور میاں بچارے یہ ہوتی بیزار مستقل طور پر کیسے برداشت کر سکتے تھے مجبوراً وہ کمرہ ہی چھوڑ دیا بلکہ حویلی کے اس حصہ ہی سے کنارہ کر گئے اور ڈیڑھ ایکڑ پر تو حویلی پھیلی ہوئی تھی ایک دور افتادہ سے ویران حصہ میں ایک بڑے دالان در دالان کی بغلی کوٹھی خواب گاہ کے لئے انتخاب کر لی اور رات کو بڑی بیگم شوہر کی خدمت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے بھوٹا کو حقہ لے کر بھیج دیا کرتیں۔ جس روز زین سواری زیادہ کی ہوتی یا شکار میں پانی کے اندر گھسے ہوتے تو ذرا اک پاؤں بھی دبا دیا کرتی۔ کچھ دنوں بعد شب بیدار بڑی بیگم کی عشاء سے فجر تک عبادت میں خلل واقع ہو گیا، ان کی شب بیداری میں چھوٹی بیگم کے کھٹکے اور چاپ کو بڑا دخل تھا۔ سچ پوچھیے تو عبادت کا سچا لطف اور خضوع و خشوع سب رخصت ہو گیا، اور پتہ چلا کر حقیقت و مجاز ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم تھے۔ چھوٹی بیگم کی کھٹ پٹ ہی سے ان کی رات کی نماز میں اور تلاوت عبارت تھی اور انھیں کی سرگرمیوں سے کسب حرارت کر کے وہ پیٹ کا گولہ متحرک ہو کر ذکر جبر کی صورت ٹھنڈی سانس بھر کر ہونٹوں سے نکلتا تھا اور چھوٹی بیگم کے کمرے کا سکون ان کے اندر ایک عجیب نوعیت کا ہلکا ہلکا کرب سا بن گیا، جیسے بیک وقت دل میں میٹھی میٹھی جلن اور کانوں میں رس گھلنے والی بات نہ رہی، لیکن ادھر منجھلی سنجھلی اور بچلی تینوں بیگموں کی ویران خلوتوں میں ٹھنڈک پڑ گئی، اور سب کی سب پاؤں پھیلا کر سکھ کی نیند سونے لگیں، ماضی اور مستقبل سے تو سمجھوتہ کر ہی چکی تھیں اب حال سے بھی مطمئن ہو گئیں اور کوئی خلش باقی نہ رہی۔ اور انھیں بچاریوں کے سکھ چین کے خیال سے بھی بڑی بیگم نے کوئی تعرض نہ کیا ورنہ بھوٹا باندی میاں کی آبائی جاگیر کا حصہ نہ تھی، وہ خالصتاً بڑی بیگم کے اپنے ہاتھ کی ساختہ پرداختہ پروردہ پروان چڑھائی ان کامل جیسی کوئی چیز تھی اور وہ جس گھڑی چاہتیں روک دیتیں بلکہ سرے سے بھوٹا کو ہی نکال باہر کرتیں، البتہ چھوٹی بیگم کی چڑھی کمان اترجانے کا انھیں قلق بھی تھا لیکن یہ تو میاں کے اور ان کے درمیان کا معاملہ تھا اس میں ان کا کیا بس تھا۔

لیکن ان کی چین کی بنسی چند ہی روز بجی تھی اور بڑی بیگم کا خضوع و خشوع سال اندر ہی حیرت و استعجاب اور انتشار و اندیشہ میں لپٹ گیا۔ بھوٹا باندی نے عملی طور پر چھوٹی بیگم کی جگہ تو سنبھال ہی لی تھی۔ خیر وہ کوئی بات نہ تھی ایسا تار چڑھاؤ ازدواجی زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں، پھر یہ بات نہیں، ان کے کمرہ میں قد آدم آئینے لگے تھے اور وہ اپنی پھبن پر مغرور اس رات کے انتظار میں تھیں جب میاں کو بھوٹا

باندی کی اصل شکل و شبیہ نظر آجائے اور کسی شب قطامہ ناک چوٹی کاٹ کر نکال جائے اور میاں خود ہی کچے دھاگے میں بندھے دھرے آئیں یا خود ہی جا کر کسی بھی دن منا کر کپڑ لائیں کہ گذشتہ را صلوٰۃ، کہ ایک دن حویلی کے اندر ان چین کی بنسی بجانے والیوں کے بھی سکون میں دھول پڑ گئی سرگوشیوں میں یُوں اُڑی کہ جیسے بھوڑا باندی کے اندر ٹائم بم دھر گیا ہے اور چھ مہینہ اندر پھٹنے والا ہے۔ یہ میاں کی عمر بھر کی ناکام کوششوں کی نادر ترین کامیابی تھی۔ سب نجومی بھرلے ہو گئے جو ہتھیلی پر غور و خوص کے بعد چپ ہو جایا کرتے تھے کہ میاں کے ہاتھ پر سب کچھ ہے مگر اولاد کی لکیر نہیں ہے اور وہ تو اور ایک عمر سر پٹخ کر اور بھانت بھانت کے علاج کر کے وہ حکیم بھی نالائق ہو گئے جو اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ "میاں ہی کہ اولاد نہیں ہے۔" میاں کو امید بندھی اور بھوڑا بیگم کی امید سے ہے، سب بیگموں کی چاہ میں چرکین پڑ گئی اور سرکار کے سوکھے دھانوں میں پانی۔ اور نو مہینے بعد جب بھوڑا کے بطن سے لڑکی کی ولادت ہوئی تو پھر سب کو اطمینان کا سانس آیا کہ چلو کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ بیگمیں بچاریاں اتنا حساب کتاب نہ جانتی تھیں کہ اولادِ ذکور نہ ہونے پر کل وراثت لڑکی ہی کو مل جاتی ہے۔ ان سب کے بیٹے نہ سہی بھائی بھتیجے بھانجے تو تھے اور حاجی میاں کی تو وارث بھی بیگمات تھیں اور میاں تو جیتی زندگی کے تھے، کھاؤ پیو چلے جاؤ۔

ویسے میاں کو یہ تانے نہ تو روٹی پکانے والی خادمہ ہی آتی کہ بڈا ڈیوڑھی کے بوڑھے دربان نتھو خاں مرحوم کی کوشش کا نتیجہ تھا اور بھوڑا باندی کے آثار کی بنیاد یہی مشعلچی لونڈا تھا ہے، اور دونوں ہی مرتبہ میں میاں بیچارے کا تو صرف ہاتھ منہ دھو کر اور رکھی مُسل کر کے سفید تولیہ سے پونچھ لینے سے زیادہ دخل نہیں ہے۔ اب جو بھوڑا باندی نے بیٹی جنی تو میاں کا شبہ یقین راسخ سے ہم آغوش ہو گیا کہ سولہ سترہ سال قبل بڈا بھی اطبیں کی ضرب تقسیم کا میزان تھا اور آج نوزائدہ چاندنی بی بھی انھیں کا حاصل ضرب ہے، بہر حال چاندنی بی اپنے باپ اور ماں کی عقل اور شکل کا ہی امتزاج ہو سکتی تھیں، حویلیوں میں آنکھیں پھوٹیں چلیں اور بڈا کی جانب توجہ مبذول ہوئی لیکن میاں کو بیٹی کی پیدائش کی خوشی اتنی تھی کہ اور کس شمار قطار میں تھے چاروں بیگموں میں سے بھی کسی کی مجال کنکری پھینکنے کی نہ ہوئی اور بھوڑا باندی کے ایسے بھاگ جاگے کہ باندی سے بڑھ کر بیگم کے زمرہ میں داخل ہو گئی۔ اور ساونتی سلطنت میں تو نجابت افاغنہ کی پیروی کرتی ہے اور افاغنہ صرف تخم میں یقین رکھتے ہیں ان کے یہاں زمین کی کوئی اہمیت نہیں۔ بہر حال حاجی میاں کو اللہ نے چاندسی بیٹی عطا کی اور چاندسی بیٹی پر عکس نام نہاد لی زنگی کا فوری تھی۔ سرخ سپید، بلند و بالا، نجیب سید باپ کی بجائے کسی ریچھ کی اولاد نظر آتی تھی اور اٹھارہیں سال میں بڈا نے بھی مشعلچی کی طرح رکابیاں دیگچیاں چاٹ چاٹ کر ریچھ کی طرح کریل ہاتھ پاؤں نکالے تھے، مخبوط الحواس سہی لیکن گیہوں کے نابدان کے کیڑے تو پیٹ میں بج بجاتے تھے اور یہ کیڑے تو جھٹی حس اور ہاتھی کا پانچواں پاؤں بن کر سارے ٹھے ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں میاں کی بیٹی ہاتھ پاؤں نکالے بڈا سے مشابہت نمایاں تر ہوئی حویلی والیوں نے تو انداز دیکھ کر ہی بھانپا تھا اور چاندنی بی تو آفتاب آمد دلیل آفتاب روز روشن میں ان کے شبیہ کی زندہ تشکیل ابھر کر سامنے آئیں۔ حاجی میاں بھی اندھے تو تھے نہیں اور اندھے کو بھی تاریکی کا تو ادراک ہوتا ہی ہے۔ بہر حال حساب دوستاں در دل، آنکہ پدر نتواند پسر تمام کند، ان کی نہیں تو ان کے سیٹے بڈا کی کوشش کا نتیجہ سہی وراثت کی گتھی تو سلجھ ہی گئی اور حق بحق دار رسید، بیٹی نہیں تو پوتی میں کلام کس مسخرہ کو ہو سکتا تھا۔ اور میاں بی بی راضی تو کیا کرے گا قاضی جب حاجی میاں ہی کو مجسمہ زشت روئی بیٹی نجیب الطرفین ذی النورین چمکتی دمکتی نظر آئی اور اس کے سیاہ تاب چہرہ میں آئینہ کی طرح اپنا عکس نظر آیا تو مجبور ہو کر ساری دنیا کو ایسی ہی دکھائی دی۔ اور چاندنی بی پر پُرنے نکھل کر سیدھی ہوئیں تو ماں باپ کی داخلی و خارجی زشت رومیوں کا نہایت ہی بے تماشا امتزاج نہیں۔ مگر حاجی میاں نے آنکھیں موند لیں ساری

دنیا کیسے اٹھتی ہو جاتی برابر والے گھروں میں مشاطاؤں کے ذریعہ بات چلانی چاہی تو چودھویں صدی کا اندازہ ہوا کسی نوجوانوں نے باوجود اتنی بڑی توریث کی امید کے بھی انکار کیا اور جن برابر والے گھروں کے پیام آئے ان میں صاحبزادے نہایت ہی دور کی کوڑی لانے عجیب قسم کے واقع ہوتے تھے اور حاجی میاں کی بیٹی سے نہیں ان کی توریث نے شادی کر کے اس کے سہارے بقیہ عمر گل چھرے اڑانے کا منصوبہ بنائے ہوتے تھے حاجی میاں ویسے تو ان صاحب لوگوں سے کہیں زیادہ پہنچے ہوئے بزرگ تھے اس اکھاڑے کے پرانے کھلاڑی تھے انہوں نے اپنی آبائی مالیت ہی بڑی اچھی بنائی تھی پھر چھیر پھاڑ کر ایک بہت بڑی ملکیت بلا شان گمان مرحومہ پھوپھی کی وراثت سے بھی پہنچتی تھی لیکن بیوی کی توریث ایسے صاحبزادوں کے ہاتھ میں نہ دے سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مولا علی کی موت نے بندہ علی کی شکل میں ان کی بیٹی کے بئے عرش سے دولہا اتارا، اور ہر پہلو پہ غور کر کے انہوں نے اس کو چاند بی بی کے لئے موزوں ترین شوہر سمجھا، ادھر بندہ علی کا مقدر کھلا تو کھلتا ہی چلا گیا۔ موت اور شادی دونوں ہی راستوں سے۔ حاجی میاں نے بہت ہی خاموشی کے ساتھ اور اپنے طبقہ کی روایات کے بالکل ہی خلاف چہ میگوئیاں بچانے کے لیے سیدھے سادے طریقہ پہ نکاح کر دیا ساتھ ہی ساتھ بندہ علی کے سماجی اور اقتصادی معاملات درست کرنے کے لیے اپنے اسٹاف کے مرد آہن کو بندہ علی کے یہاں بھیج دیا۔ اور یہ مرد آہن علاقہ بھر کا مانی ہوئی شخصیت تھا۔

( ۳ )

"بڑے منشی جی"۔ "موٹے منشی"۔ "موٹا منشیا"۔ "کانا منشی"۔ "کھترا منشی"۔ "کالی بلا"۔ "دیو سیاہ"۔ "منشی جی شیر افگن خاں"۔ "ملکھان سنگھ" اور کیا کیا منشی کمال شیر خاں کے کتنے ہی اسم صفت اور القاب تھے جو ان کے مخالفین کے حلقوں میں زبان زد تھے۔ اپنے ضلع کی مانی ہوئی واحد مرد آہن کی علامت اور آس پاس کے اضلاع کی جانی پہچانی شخصیت ۔۔۔ اور یہ لوہا خان صاحب نے اپنی بے پناہ جسمانی طاقتوں اور مخصوص بے پایاں دماغی صلاحیتوں کے بل پہ منوایا تھا۔ وہ خود ساختہ لوگ تھے جنھیں ایک آدمی نہیں بلکہ خیر کا نہیں تو شر کا ایک ادارہ کہنے ہی ویسے ایک گروہ ان کے مداحوں کا بھی تھا۔ وہ جگہ جگہ مثبت منفی تجربوں سے پہنچائے جاتے، کہیں ظلم و دہشت، بربریت، استحصال بالجبر عیاری، بے ایمانی، دھوکا دہی، بعض مختصر حلقوں میں بہادری، تدبر، حکمت عملی، نمک حلالی، یک رنگی، وضع داری اور خوش اخلاقی کے اوصاف سے مالا مال خیال کئے جاتے حالانکہ ان تمام کے باوجود دنیا میں ان کے سچے دوست مفقود کی حد تک کم اور دشمن زیادہ تھے۔ خداداد بے پایاں ذہانت اور بے باک جبلت دونوں ہی صفتیں لے کر دنیا میں آئے تھے۔ بچپن ہی سے اپنے وقت کی بہترین لاٹھی اور بنوٹ کے فن کی تربیت نصیب ہوئی تھی جس میں ان کی خداداد جسمانی طاقت اور چستی پھرتی نے چاند لگا دیئے تھے، اس کے ساتھ ساتھ دشمن کی پہچان اور موقع شناسی کی مخصوص ذہانت رزم میں شکست نا آشنا تھے، پھر عقل مند رؤسا کی صحبت، ماہر وکیلوں اور چلتے ہوئے تھا: داروں سے کسب فیض نے ان کی خداداد ذہنی صلاحیتوں میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ تاریخی مقدر دو حملوں میں یہ کہ جس رزم میں اترے مرد میدان ہی ثابت ہوئے، جس بزم میں بیٹھے سرپنچ بن کر چھائے رہے اور بڑی بڑی اہم اور پیچیدہ گتھیاں سلجھا کر ہی اٹھے اور دونوں ہی میدانوں میں ایک دفعہ کو تو واہ واہ ہو گئی حالانکہ صوری اعتبار سے آخر الذکر میں مشتنیات نظر آتے جیسے خالق نے انھیں اپنے جذبۂ برہمی کی تشکیل بنا کر دنیا میں بھیجا تھا، اور تخلیق کا یہ غصہ پیدائش کے بعد ان کی موت تک داخلی اور خارجی دونوں ہی صورتوں میں کارفرما رہا بچپن کی چیچک سے لے کر نوجوانی اور جوانی کی گوناگوں چوٹوں تک تمام بدن چہرہ اور سر پہ قدرت جیسے اظہار برہمی کی تجدید کرتی چلی

آ رہی تھی، اور معرکہ معرکہ میں نت نیا میک اپ کرتی رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ صانع قدرت نے اس خارجی کریہہ المنظری کے ساتھ ساتھ داخلی طمع نہایت چمک دار چڑھایا تھا، اپنے مطلب کی بات کہنے اور دل میں خود اترنے کی حد تک آتارنے کے فن سے آراستہ کیا تھا۔ ایسے مواقع پر ٹھیٹ ٹھیٹ کتابی اور لغوی معنی میں زرخشت روئی بھی ان کے مخاطب علیہ کی آنکھوں سے محو ہو جاتی، فطری درشت لہجہ میں دودھ شہد کی دھاریں چڑھ جاتیں، وہ کوئی اور ہی آدمی ہوتے۔ بات کرنے کا انداز بلا کا پُر تاثیر، وجود، آواز کی شیرینی لہجہ کی حلاوت، بشرہ کی گھلاوٹ، مخالف سامع او مخاطب علیہ کو مسحور کر دیتی اور ہر ایک دفعہ کو غریب کو ان کی منطق کے آگے سر جھکا ہی دیتا وہ اور اَن کہی کہلا کر ہی رہتے، اور دل میں اتر کر ہی ملنے رہنما کیا ہوا آبنوس کا لٹھا سا وجود، جو پہلی نگاہ میں ذرا دور سے چلتا پھرتا سنگ موسیٰ کا گھنٹہ گھر دکھائی پڑتا۔ پونے سات فیٹ قد جو دس گز سی اونچی بندش والی کے ساتھ آدمی سے زیادہ دیوزاد کی حدوں میں نظر آتا۔ پھر ستم یہ کہ یہ بلندی ان کے چوڑے چکلے ہاڑوں پر غیر متناسب نظر آتی۔ وہ "دو" بانہیاں تھے، ان کے ہاتھ کندھے سے لے کر پنجے تک لمبائی میں ان کے قد سے بھی غیر متناسب تھے اور انگلیاں گھٹنوں کے محاذ سے بھی نیچے لٹکتی تھیں، ہتھیلیاں لوہے کی تھالیاں اور انگلیاں کلائیاں کسی کھردرے درخت کی ٹہنیاں اور گدّے اور ہاتھوں کی یہی قدرتی غیر معمولی لمبائی انھیں شمشیر زنی، لاٹھی اور رکمہ بازی، ہاتھا پائی کے فن میں اپنے مدمقابلوں پر فوقیت اور سبقت کا باعث تھی۔ بھونرا سی سیاہ گھنی داڑھی، جیسے باریک فولادی تاروں کے گچھے رخساروں پر چپکے ہوئے اور بالوں کی نمو روش قدرتی طور پر بجائے نیچے کے اوپر کو چڑھتی ہوئی۔

جبڑوں، کنپٹیوں، رخساروں اور دہن کی گول گول سی اُٹھی ہوئی موٹی موٹی ہڈیوں کی تعمیر چہرہ، سنگِ سیاہ کی پہاڑیوں چوٹیوں کا تصور دیتا ہوا، اوپر سے جھکی ہوئی چٹان کی طرح لٹکتی پیشانی جس کے نیچے گنجان بالوں والی چوڑی چوڑی جھکی ہوئی تاروں کے گچھے سی بھویں جن کے اندر سے دو ہمہ وقت دہکتے شعلے سے متحرک نظر آتے، ویسے تو ان کی ہستی ہی بے پناہ تھی مگر منشی کمال شیر خاں کی آنکھیں ان کے تمام وجود میں سب سے زیادہ غضب کی تھیں۔ خاص طور پر وہ زاویے جن پر وہ حرکت کیا کرتیں ان کے اپنے مخصوص اور بڑے ہی نادر تھے اور بلا کے کارگر بھی۔ جس کا ان کے جبڑہ کلے اور بشرہ کی تربیت میں زبردست دخل تھا۔ گرما گرم رن کا میدان ہو یا تیز طرلاگ ڈانٹ والی کوئی بات پھر اس قسم کی چیزوں کے بالکل برخلاف ٹھنڈی اور حقیقی و قطعی انصاف کرنے والی دیہاتی پنچائت کا اجتماع ہو یا کچھ بھی: ہو محض حقّوں کے دھوئیں میں چوپالوں بیٹھکوں میں یاروں کی گپ شپ والی چکڑی ہی ہو۔ غرض رزم یا بزم کا کوئی بھی پہلو اور شعبہ ہو منشی جی کی موقع موقع کا نہایت مناسب ساتھ دینے والی آواز کے ساتھ یہ آنکھیں بڑا ہی مؤثر اور مرکزی کردار ادا کرتی جاتیں اور گرگٹ کے سے رنگ بدل بدل کر بغیر ہی گردن کو حرکت دینے محض پپوٹوں کی خفیف سی حرکت سے ماہر پٹے باز کی طرح پینترے سے کاٹ کاٹ کر کارگر زاویے تبدیل کر لیتیں جن کی بے پناہ تاثیر کا ان کے گرد و پیش و مخاطب علیہ کو بھی پتہ نہ چلتا۔ رزم ہو یا بزم اکثر و بیشتر اہم معاملے منشی جی کے مزاج کے مطابق طے ہوتے۔ اپنی بات منواتے ہوئے حتیٰ کہ اپنی من مانی کراتے ہوئے ان آنکھوں میں سے ایک جوڑی اور آنکھیں نکل آتیں جو بات کرتے وقت بار بار ٹھک ٹھک کر رخساروں پر آ پڑتیں، اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن پانی کا دودھ بنانا یا دودھ کو پانی کر دینا بھی ان کے جبڑے کلے کے لیے کچھ ایسا ہی تھا اور حق و ناحق جنون و خرد، پاک ناپاک، حرام حلال وغیرہ کا معیار ان کی اپنی کسوٹی پر پورا اترنا لازمی تھا۔ مجادلہ کے وقت مست ہاتھی کی چنگھاڑ اور ببھرے شیر کی دھاڑ سے مرکب جیسی گرج کڑک اپنی مخصوص بنائی ہوئی ایک

پُر ہول دہشت زا آواز پیدا کرنے اور اس وقت دیکھنے والوں کو صریحاً آنکھوں سے چنگاریاں چھٹتی دکھائی دیا کرتیں اور ایسے ویسے مدِ مقابل تو بغیر ہی مقابلہ کئے جان بچا کر سامنے سے بھاگ کھڑے ہوتے اور میدان پر ان کی پہلی ساکھ دھاک اور اس مخصوص خود ساختہ ہیبت زا آواز کے نعرے سے بے پناہ ہول طاری ہو جاتا اور اس میں شک نہیں کہ وہ بنوٹ کے فن میں مانے ہوئے استاد تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ انھیں مشہور آسمانی فن "ضربِ حیدری" پر بھی عبور حاصل ہے جس کے متعلق ان کے شاگرد بتایا کرتے تھے کہ اس فن کی سعادت انھیں برسوں ریاضت کے اور اپنے استاد کی بارہ برس جوتیاں سیدھی کرتے اور بنوٹ کے جملہ شعبوں پر قادر ہو جانے کے بعد حاصل ہوئی جب انھوں نے چالیس دن چلہ کشی کی اور حضرت مولا علی مشکل کشا شیرِ خدا سے رجوع کیا تو ایک شب مولا نے خواب میں تشریف فرما ہو کر بنفسِ نفیس "ضربِ حیدری" کے فن سے انھیں آراستہ فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی خلافت کی بشارت بھی دی، اور اس طرح انھیں ناقابلِ تسخیر اور شکست ناآشنا بنا دیا۔ اور بہت کچھ بات تھی بھی۔ ایسی ہی کچھ منشی جی کی بے پناہ صلاحیتوں کے زیرِ نظر اس میں زیادہ شک نہ ہوتا تھا پہلی چیز تو یہ کہ مانی ہوئی بات تھی کہ منشی جی کی ضرب آہنی کاسی پڑتی کہ مدِ مقابل کا مضروب عضو ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جایا کرتا اور دوسری بات یہ تھی کہ ہر معرکہ جس میں منشی جی اترے اس کا میدان آخر آخر ہمیشہ انھیں کے ہاتھ رہا، وہ اپنے جتھے کے استاد تھے اور ان کے جتھے میں اہلِ فن اور اہلِ کمال ہی رہ سکتا تھا اسی طرح ان کے مقابلہ پر دُو بدُو سامنے پڑنے کی کسی ایسے ویسے کی تو مجال ہی نہ تھی کوئی برابر ہی کا مانا ہوا استاد ان کی للکار پر للکار دیتا مگر اکثر و بیشتر دیکھا یہی گیا کہ اس بدنصیب کی یہ آواز اپنی شکست کو پکارنے والی صدا ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ لڑائی سے قبل اگر اپنے جتھے کو مدِ مقابل گروہ سے گھٹا ہوا محسوس کرتے یا عین لڑائی میں شکست کے آثار دیکھتے تو خوبصورتی کے ساتھ نامہ و پیام کے ذریعہ معرکہ ملتوی کرنے کے فن سے بھی خوب واقف تھے اور مونچھیں کھڑی رکھتے ہوئے وقتی صلح کر لینے کی عیاری کو بھی خوب برتتے تھے ویسے وہ بلا کے جری تھے اور اپنی ساکھ شہرت اور اہمیت کا بھرپور فائدہ اٹھانے کے فن سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ گفت و شنید میں مخالف گروہ کے اندر پھوٹ ڈلوا دینا، دوسرے جتھے کے اچھے بہادر یا مفید مطلب آدمی کو اپنی جانب ملا لینا خوب جانتے تھے، ان کا موٹو معاملت میں "دشمنوں کا توڑ، دوستوں کا جوڑ" تھا اور جب لڑائی آ ہی پڑتی تو میدان میں اتر کر جوہرِ مردانگی اور کمالِ فن دکھلانے اور ثابت کر دینے کہ رزم ہو یا بزم سرپنچی اور سالاری کی پگڑی انہیں کے سر سجتی ہے، گھمسان کے رن میں ان کے حواس میں سرِ مو فرق نہ آتا بلکہ حواسِ خمسہ کے ساتھ چھٹی ساتویں آٹھویں نہ معلوم کتنی اور حسیں اور بھی زیادہ تیزی سے بروئے کار آ جاتیں۔ فضا میں لہراتی، برستی، چٹختی لاٹھیوں کے رن میں بپھرے شیر کی طرح گرجتے ہوئے آ پڑتے اور بید رنگ اپنی پانچ سیر وزنی لاٹھی سے "چوکھی" چلاتے گھمسان کے رن میں گھس پڑتے، پھر ستم یہ کہ ایسی رستخیز کی گھڑی میں ماہر جرنیل کی طرح منصوبہ بندی، بہادر کی الحسن کمانڈر کی مانند ہدایت اور رہنمائی کے ساتھ ساتھ سرفروش اور صف شکن سپاہی کے تیوروں سے لڑائی میں بھی بھرپور حصہ لیتے اور اپنی ہاتھ، زبان، آنکھ ہر ہر حرکت پر اپنی ساکھ سے بھی استفادہ کرتے جاتے، پینترے کاٹ کاٹ کر اپنے سنگین ہاڑوں اور فولادی پٹھوں کے سوا تین منے لمبے تڑنگے تن و توش کو چیتے طرح لہرا لہرا کر وار کرتے، اپنے شکار پر عقاب کی طرح جھپٹ جھپٹ کر پڑتے اور ان کا مدِ مقابل یا تو ڈھیر ہو رہتا ورنہ اکثر دم دبا کر راہِ فرار اختیار کرتا، یا اگر بھاگ نہ سکتا تو دانت پہ تنکا رکھ کر رحم کی بھیک طلب کرتا جس کو منشی جی ٹھوکر مار مار کر اور گھسیٹ گھسیٹ کر منہ پر تھوک تھوک کر گالیوں اور تحقیری کلمات کی بوچھار میں حقارت کی آخری منزلوں پر پہنچانے کے ہی بعد امان دیتے اور

اس میں اکثر حیادار تو ہمیشہ کے لئے میدان میں اترنے اور بہادری اور لٹھیتی کرنے سے کان پکڑ لیتے اور بے حیا سے بے حیا بھی سوچ سمجھ کر کسی کٹے گڑے استاد کے سامنے پٹا کرتے۔ ویسے یہ بات نہیں منشی جی کا بھی تمام جسم جرگس تھا، وقت وقت پر سب ملا کر بائیس جگہ کی تو ہڈیاں ٹوٹی تھیں اور چہرے پر بھی کتنے ہی تمغے اور کلر دیکھے جا سکتے تھے مگر یہ سب بے سب منشی جی کے اعزاز تھے جن کی تاریخ کوئی خاص معرکہ فتح کر لینے کے بعد موج میں آ آ کر بالتفصیل سنایا کرتے۔ اہم امور کی انجام دہی اور مطلب براری میں بیک ڈور سے راستے اور ہمت کے بے پناہ اتصال کے مظاہرے کرتے جن کا توڑ حریف کے پاس نہ ہوتا۔ وراثت کے دخل اور قبضہ کے معاملہ میں فلسفۂ قانون ایک حد تک ہاتھ بڑھانے کے حق میں ہے اور یہی چیز منشی کمال شیر خاں کی افتادِ طبع کے عین مطابق اور خوش آئند تھی۔ وہ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی مطلب براری میں مال، دیوانی اور فوج داری کے قوانین کا پورا دفتر گڈ مڈ کر کے ہاتھ میں لے لیا کرتے اور کم از کم قانونِ وراثت کا عدالتِ مال کا فیصلہ تو ہمیشہ انھیں کے فریق کے حق میں رہا۔ اور ایسے ہی مقدموں کی ترتیب اور پیروکاری میں وہ ماہر خاص تھے۔ اس سلسلہ میں کبھی کبھی فوج داری کے سنگین جرائم کی مقدمہ سازی بھی کرنا پڑتی، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ خود کرایہ کے فوجی نہیں تھے کیونکہ ایسے معاملوں میں پڑتے وقت ان کے اندر کسبِ زر کا جذبہ دور دور کہیں نہ ہوتا بس اثر، طاقت اور ذہانت کے استعمال کا شوق اور نمائش مطمحِ نظر ہوتی اور چونکہ لالچ نہ تھا اس لئے ان کے کردار تاریخ میں غداری کا دھبہ نہ تھا جس نے ہاتھ بڑھا کر پہلے ان کی فری لانسر قسم کی خدمات حاصل کر لیں اسی کے ہو رہے نہ جتھہ بندی ان کی ہابی تھی اور جتھے سے سخت سے سخت کام لینے اور کامیاب ہونے میں انھیں لطفِ زندگی آتا، اگر لالچی ہوتے تو ہزاروں روپیہ نقد اور سیکڑوں ایکڑ اراضی اپنا لیتے عمر میں لاکھوں ایکڑ اراضی اپنی سرگرمیوں سے اِدھر سے اُدھر کرا دی لیکن ان کے حصہ میں وہی سات فیٹ لمبی اور ساڑھے تین فیٹ چوڑی زمین آئی وہ بھی جیتے جی زندگی نہیں۔ قبضہ اور دخل کے معرکے سر کرنے میں ہاتھی اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دہشت اور رعب جمانے کے لئے یلغار منشی جی نے دن دہاڑے مخالفوں کی بستیاں پھونک پھونک کر زیر کیا، دعوے دار فریق مخالف کے خاص آدمیوں کو پکڑوا پکڑوا کر ایسی ایسی جوتے کاریاں کرائیں کہ کانوں کے پردے تک پھٹ گئے اور پشت پناہی کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ جس نے ان کے سامنے قاعدہ قانون بگھارا اس کے منہ میں پیشاب کرا دیا اور مخالف فریق کی ساری چڑھائی ہوئی اتر گئی جو گردن اٹھا کر چلتے دکھیا اس کو اسی کی چوپال پر کھڑے نیم میں لٹکوا کر نیچے سے دھونی دی اور سب سے پہلے ایسے ہی چمکتے ہی چڑھے ہوؤں سے محاصل اور لگان وصول کر کے دکھلایا تاکہ ترکی کے ہاتھ پڑا تازی کے کان ہوئے اور چھٹ بھیوں کو عبرت ہو، مقدمہ کی پیشی کے دن بیٹر بکریوں کے گلہ کی طرح ہنکا کر عدالت میں ادائیگی کرنے کا حلفی بیان دلوایا اس میں غریبوں اور وفاداروں کو رعایتیں بھی دیں معافی اور التوی بھی کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مقامی پولیس سے بھی رابطہ رکھا، مال اور فوج داری کے وکلاء عدالت کے دلال اور جعل سازوں کے بھی کام لئے اور ان تمام کے ساتھ ساتھ سخت ضرورت کے تحت نہایت کامیاب اور مفید مطلب مقدمہ سازی کے فن میں بھی مانے ہوئے استاد تھے جس میں وہ ہمیشہ فوج داری کے قانون سے ال کی گتھیاں سلجھایا کرتے اور نہایت مؤثر امداد دیا کرتے اور یہ پولیس کے حق میں نہایت مبارک اور زرخیز نوعیت کی چیز ہوا کرتی بنا بنایا کیس گھر بیٹھے ہاتھ آتا اور ساتھ میں آمدنی ہی آمدنی لاتا۔

ہمیشہ کا تجربہ تھا اور مسلمہ امر کہ منشی کمال شیر خاں کے کاٹے کا منتر اگر کہیں ہے تو تھوڑا بہت پرائیوی کونسل کے ججوں کی فل بنچ میں ــــ حاجی میاں نہایت صلح کل لوگ تھے لیکن ان کے یہاں بھی منشی جی کی ضرورت مجبوری پڑ ہی گئی جو ایک بڑی ریاست اور بڑے رقبہ کی زمینداری

جو شان گمان وراثت میں آنے کے سبب اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑی مقدمہ بازی سر پڑ جانے کی وجہ سے ہوا۔ حاجی میاں کی ایک پھوپھی تھیں جو ایک بہت بڑے زمیں کی بیوہ تھیں اور ان کے نوجوان غیر شادی شدہ بیٹے کو باپ کا کل ترکہ ملا تھا۔ ایک شام نوجوان گھوڑے سے گر کر مر گیا اور بیٹے کے غم میں تھوڑی دیر بعد ماں بھی مر گئی۔ بیٹے کے پھچازاد بھائی بھی تھے۔ جو اگر ماں پہلے مری ہوتی تو چچازاد بھائی کی کل توریث کے مالک ہوتے۔ کوئی خاص قانونی نکتہ نہ تھا۔ محمڈن لا کے قانون وراثت کا سیدھا سادا معاملہ تھا۔ متوفیان کی اور موت کی تقدیم و تاخیر میں وراثت کے دھارے کا رخ پلٹا تھا۔ گھر ہی سے جنازے ساتھ ساتھ اٹھے تھے اور دونوں دفن بھی بیک وقت سانحہ ساتھ ہوئے تھے۔ عدالتوں میں ایسے مقدمے صرف زبانی شہادت پر طے ہوتے ہیں اور اس کی فریقین کے پاس کمی نہیں ہوا کرتی۔ لیکن پہلا رقت کا بند مرتع پر قبضہ اور لگان محاصل کی وصولیابی ہوتی ہے جس کی بنا پر محکمہ مال کے سرکاری کاغذات میں اندراج ہو جاتا ہے اور پھر عدالت دیوانی کا مقدمہ تو کہیں برسوں کی خبر لاتا ہے، دو دو تین تین نسلیں اور ان گنت اخراجات کھپ جاتے ہیں، ضلع کی ججی کی عدالتوں سے چل کر ہائی کورٹ اور پرائیوی کونسل کی اعلیٰ عدالتوں میں قطعی فیصلہ ہوا ہے اور اپنی توریث پہ پہلے خود ہاتھ بڑھا کر قبضہ کر کے کھاتا محکمہ مال کے اندراج کے لئے پہلی اور سب سے بڑی شرط ہوتی ہے، اس کے بعد تھوڑا بہت قانون دیکھا جاتا ہے اور ہاتھ بڑھانے اور قبضہ کرنے کے لئے طاقت اور موقع متنازعہ پر اثر رسوخ کی ضرورت ہوتی ہے، فریق مخالف اس کچھار کے شیر تھے ان کی آبائی ملکیت چلی آ رہی تھی صدیوں سے اس املاک میں ان کے جد امجد کا سکہ چل رہا تھا ویسے حاجی میاں کمشنری بھر کے مانے ہوئے ذی اثر آدمی تھے لیکن اس علاقہ میں اپنے پھوپھا کے برادر زادوں کے مقابلہ یہاں کا کوئی اثر نہ تھا، ویسے فطرتاً جھگڑوں سے بچنے والے آدمی تھے لیکن اتنی بڑی املاک کو چھوڑ کیسے بیٹھتے۔ انہوں نے مختار نامہ عام لکھ کر معاملہ کو منشی کمال شیر خاں کے سپرد کر دیا اور منشی کمال شیر خاں اپنی عمر کے سب سے کڑے مسئلہ اور سخت مہم سے دوچار ہوئے اس علاقہ میں فریق مخالف کے مقابلہ پہ دخل اور قبضہ حاصل کرنا ہاتھی سے گنا چھیننا تھا۔ ویسے قانون اور حق ان کے ساتھ تھا لیکن وہ بھی کوئی مضبوط قانونی بنیادوں پہ نہ تھا صرف معتبر و مقتدر زبانی شہادتوں پر موت کی دو گھنٹہ تقدیم و تاخیر ثابت ہو جاتی تھی اور سر دست تو قانونی مسئلہ ہی نہ تھا مال کی چھوٹی چھوٹی عدالتیں وقتی طور پر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق تھوڑا بہت حق بھی دیکھتی ہیں اور خاص طور پر موقع پر قرار واقعی جو فریق ہاتھ بڑھا کر قبضہ کر لیتا ہے اسی کا کاغذات مال میں نام اندراج کر دیتی ہیں جس میں تغیر تبدل کہیں برس ہا برس بعد صرف عدالت دیوانی کے قطعی فیصلہ اور حکم کے بموجب ہو کرتا ہے۔ ایسے معاملوں میں دخل اور قبضہ کے ثبوت کی واحد صرف کاشتکاروں سے محاصل لگان وصول کر کے کی جاتی ہے۔ اصل فریق کوٹھیوں اور دیوان خانوں میں شیر قالین اور گھونٹے پہ بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے گماشتے مختار عام وغیرہ کاشتکاروں کو شش کارک بنا کر رکھ دیتے ہیں لیکن گھونٹے کے بل رسی تنتی ہے اور منشی کمال شیر خاں کا گھونٹا کمزور تھا، اس علاقہ میں حاجی میاں کو کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ کس کھیت کی مولی ہیں جب منشی جی فولاد جیسی سختی اور ریشم جیسی نرمی اور چکناہٹ کے سب مظاہرے کر چکے تو مجبور ہو کر انھیں ضرورت پیش آئی کہ مد مقابل کاشتکاروں کے چند خاص خاص جتھہ بند افراد پر فوج داری کے قانون کی مدد سے حملہ کیا جائے اس قانون میں اور مقدمہ سازی بھی منشی جی کا خاص فن تھا ویسے وہ ایسی مدد کے قائل نہ تھے، ہر چہ بادا باد اپنی جانب کے ایک جوشیلے کاشتکار کو کلائی تڑوا کر دوسرے فریق کے چند مخصوص لوگوں پہ ضرب شدید کا استغاثہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا تاکہ دباؤ پڑ سکے اور مقابلہ سے ہٹ جائیں یا پھر گرفتار ہو کر حوالات میں ہی کچھ دنوں کے لئے بند ہو جائیں اور میدان خالی ہو جائے اور وہ محاصل وصول کر سکیں۔ ویسے یہ کام منشی جی اپنے مخصوص سونٹھے "مولابخش" نامی سے کیا کرتے

تھے تو مولا بخش علاوہ اس خدمت کے گرمیوں میں بھنگ اور بادام گھوٹنے کی خدمت بھی انجام دیتا تھا اور یہ خدمت تو عمر بھر میں چار چھ ہی مرتبہ مجبور ہو کر لی تھی اور ہر مرتبہ بڑی کامیابی کے ساتھ ایک ہی کاری حرکت میں انجام دی تھی لیکن وقت کی بات، ویسے منشی جی دریدہ و بریدہ شکست دہ بست میں منجھے ہوتے تھے لیکن آج وار اوچھا پڑا اور ہڈی نہ ٹوٹی، مضروب بلبلا کر بھاگ پڑا، منشی جی نے کھینی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے ارے رے ہے پکڑنا بھئی پکڑنا ۔ اور منشی جی اس سلسلہ میں نفسیات انسانی کے اچھے محرم نہ تھے، اوچھی چوٹ کھا کر ماہمی رضا فرماً کا نور اً پھر ہڈی تڑوانے کے لئے جوشیلے سے زیادہ جوشیلا آدمی تیار نہیں ہو سکتا تاہم حالیوں موالیوں نے پکڑ کر گھسیٹ لیا، اور منشی جی نے کلائی دوبارہ نہائی پر رکھنے کا حکم دیا اور وہ چوٹ کی تکلیف میں بہت بیتاب ہو رہا تھا کسی نہج حکم ماننے پر تیار نہ ہوا اور جب زیادہ کھینچا گھسیٹا اور ہاتھ پھر چوکی کے اوپر رکھوانا چاہا تو لگا گالیاں بکنے ۔ اور لگا منشی جی کو چیلنج کرنے ۔ ویسے منشی جی یوں تو ایسے موقعوں پر بہت صبر و تحمل کے ساتھ کام لیا کرتے تھے مگر بات شاید ہم خرما ہم ثواب قسم کی تھی، لہٰذا تاؤ آ گیا اب کی مرتبہ "مولا بخش" پوری طاقت کے چلایا اس بدنصیب کی کلائی تو زد میں نہ آئی نہ معلوم کس زاویہ سے ضرب چل کر سر پہ پڑی اور ایک ہی ہاتھ میں بھیجا منہ کے اندر آ گیا اور سانس نہ لی اور سب گھبرا گئے اور ایک دفعہ کو منشی جی کے حواس بھی کچھ خراب سے ہوئے لیکن فوراً ہی بغیر ہی پینترا بدلے سنبھل گئے ـــــ 'وہ تو ضرب شدید کا سنگین کیس بنانا چاہتے تھے، یہاں قتل کا سنگین ترین مقدمہ ہاتھ آ گیا' جن پہ ہڈی توڑنے کا دعویٰ کرانا چاہتے تھے ان پہ اور ان کے دوسرے اور تیسرے درجہ کے ساتھیوں پہ بلوہ، مداخلت خانہ اور قتل کا دعویٰ کرا دیا اور پولیس تو ایسے ہنگامہ آرا معاملوں میں بھیڑیئے کی طرح دبکی ہوئی تاک میں معزول اور مفلوج سی بنی بیٹھی رہتی ہے اور اک ذرا موقع ملتے ہی جھپٹ پڑتی ہے ۔ منشی جی نے ثبوت کے چشم دید گواہ فراہم کر دیے اور ان کی رہنمائی میں علاقہ کے اندر سکھا شاہی چل پڑی نشاندہی کر کے خاص خاص پچیس مخالف آدمیوں کی گرفتاریاں کرائیں اور حوالات میں نامعلوم مدت کے لئے ٹھنسوا دیئے ۔ اور دوسرے تیسرے درجہ کے مخالفین کو دبا کر پولیس کی جیبیں بھروا دیں اور اس طرح ان پر احسان کے چھپر رکھے اور انھیں عملی طور پر مال کے معاملہ میں سامنے پڑنے سے باز رکھا، بلکہ اکثروں سے محاصل وصول کر کے مال کے مقدمہ میں اپنی موافقت میں بیان بھی دلوائے ۔ تمام علاقہ میں بنجر اور باغوں میں سے ایستادہ درخت کٹوا کٹوا کر لکڑی اپنے موافق کاشتکاروں میں تقسیم کی ۔ کئی بڑے بڑے جتھے جمع کئے اور بڑی بڑی دعوتیں دیں ۔ فریق مخالف کی پارٹی درہم برہم ہو گئی رہے سہے ڈر سے لوگوں نے قتل کے مقدمہ میں الٹی سیدھی پیروی کی ۔ اگرچہ فریق مخالف نے پولیس اور عدالت میں کافی اثر و رسوخ دکھلایا لیکن موقع پر خوف کے مارے شیرازہ بکھرا ہوا تھا ۔ ثبوت میں منشی جی نے ایسے ایسے چشم دید گواہ طوطے کی طرح پڑھا پڑھا کر پیش کئے کہ پچیس آدمیوں میں سے ایک کو سزائے موت اور ایک کو کالا پانی ہوا اور بیس کو سات سات سال اور پانچ پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی ۔ فریق مخالف نے موقع پر شکست کھا کر عدالت دیوانی میں استقرار حق کی نالش دائر کر دی، اور تا انفصال مقدمہ دیوانی موقع پہ حاجی میاں کا قبضہ اور کاغذات مال میں حاجی میاں کا نام اندراج ہو گیا ۔ دیوانی کا مقدمہ ضلع عدالت جج سے لڑتا ہوا عدالت العالیہ، ہائی کورٹ اور پھر پرائیوی کونسل گیا اور حق بحق دار رسید، کہیں برسوں میں طے ہو کر پھر حاجی میاں کے حق میں ہی رہا اور اس تمام دوران کل املاک پر بحیثیت مختار عام منشی جی قابض رہے اور حاجی میاں متصرف رہے، کہتے ہیں کہ حاجی میاں تو آمدنی کا حبہ حبہ حساب کر کے مختار عام (منشی جی) سے لے جایا کرتے تھے ۔

اور منشی جی مختار نامہ عام کے رجسٹری شدہ تمسک میں سے دس روپیہ ماہوار کی تنخواہ اور ہر مہینہ کے اخراجات تل پل پل کر نہیں بلکہ جیسے دبانے والے ولایتی آہنی کولہو کے ذریعہ کھل پل پل کر نکالا کرتے تھے، مال اور دیوانی کی مقدمہ بازیوں بھر ہی رہا اور پھر پرائیوی کونسل سے دیوانی کا مقدمہ جیتنے کے بعد بھی مختار نامہ عام برقرار رہا اور وہی دس روپیہ ماہوار تنخواہ جو بالعموم مختار عام کی ہوا کرتی ہے۔ البتہ فصل کے فصل منشی جی سرکاری واجب ادا کر کے حاجی میاں کو جائداد کی آمدنی کا حصہ حصہ ادا کر دیتے اور باقاعدہ صفائی نامہ لکھا لیتے اور پھر پورے علاقہ سے حاجی میاں کو کوئی سروکار نہ ہوتا . . . . اور آج پھر حاجی میاں کو منشی جی کی کچھ ایسی ہی نوعیت کی خدمات درکار ہوتی تھیں، چنانچہ داماد کے حالات درست رکھنے کے لیے انھیں بندہ علی کے یہاں متعین کیا گیا تھا۔ یہاں صورتِ حال ان صورتوں سے ایک گونہ مختلف تھی جن میں منشی جی ساری عمر کامیابیوں اور کامرانیوں ہی سے دوچار رہے تھے۔ اور بظاہر مہم یک طرفہ سی تھی، اس لئے کہ مدِ مقابل فریق کی پشت پر ملکیت کی کوئی موثر طاقت کا دور دور پتہ نہ تھا۔ خالی مولازادہ غلاموں اور غلامانِ غلام چماروں سے مخالفت کی معاملت تھی، البتہ یہاں پر ذاتی طور پر ان کے حق کا سوال تھا، اور دخل اور قبضہ کے معاملوں میں اب تک یہ کاشتکار طبقہ بیڈمنٹن کی چڑیا ہوا کرتا تھا اور ہار جیت کھلاڑیوں کی ہوتی رہی تھی۔ تاہم منشی جی ان کی نفسیات اور ان کے ساتھ طریقہ کار اور طرزِ معاملت کے بھی بڑے اچھے محرم تھے۔ البتہ اس سلسلہ میں ان کے اس ردِعمل سے ناواقف تھے جو دوسرے کے لئے کرنے اور اپنے حق میں کرنے کے سلسلہ میں فطری ہے۔ ان میں سے مولازادے تو بہت کم شرح پر لگان دینے والے، موروثی دخیل کاشتکار تھے اور چمار صرف کھیت مزدور، گویا ایک فریق ذرا بھاری بھر کم تھا اور دوسرا بالکل خالی ہاتھ۔ تیرے میرے کھیتوں پہ کام کر کے پیٹ بھرنے والا ——— اور بات تھی بہت سادہ اور نسبتاً بہت آسان، اپنی ساری عمر کی مہمات میں منشی جی کا پالا تو ہمیشہ انھیں کاشتکاروں سے پڑتا رہا تھا، جو فریقِ مخالف کی بساط کے پیدل اور گھوڑے ہوا کرتے تھے۔ ان کی پشت پر وہاں ایک قلعہ کی فصیل ہوتی تھی اور یہاں سڑے گلے پھونس اور کچی مٹی کی نیچی نیچی جھونپڑیاں۔ البتہ ان کی آڑ سے وہاں بالواسطہ ضرب لگتی تھی اور یہاں براہ راست ضرب لگانا تھی اور زن، زر، زمین کے مسئلوں میں سبھی کا اور خاص طور پر آخر الذکر کا معاملہ صرف قبضہ اور دخل ہی کا آج نہیں بابا آدم نے زمانے سے چلا آ رہا ہے اس میدان میں منشی جی نے اس پہلو پہ تو ضرب لگانے کا مولازادوں کے فرنٹ پہ منصوبہ بنایا اور رہے چمار وہ تو انھیں مولازادوں کے رقبوں پر کھیت مزدوری کیا کرتے تھے اور قدیمی روایت کے دیہی آئین میں یہ لوگ مزدوری کی عام علاقہ کی شرح سے کم اجرت پانے کے حق دار تھے۔ یہ حقوق مولازادوں کو زمینداروں کے ہم خون ہونے کے سبب حاصل چلے آئے تھے، ساتھ ہی ساتھ جن دیہاتیوں کے پاس کاشت کی موروثی آراضیات نہیں ہوتی تھیں وہ یوں بھی تیرے میرے کھیتوں پہ مزدوری کے لئے مجبور تھے ساتھ ہی ساتھ پہلے اپنے گاؤں کے زمیندار کو (اگر خود کاشت کرتا ہو) اور نہ پھر موروثی دخیلکار کاشتکار کو ان سے اس رعایتی شرح کام کرانے کا حق تھا۔ اور چونکہ اس موضع میں زمیندار کی خود کاشت نہ ہوتی تھی لہٰذا یہ مراعات موروثی دخیلکار کاشتکاروں پہنچتی تھی جو تقریباً سب کے سب یہ مولازادے تھے۔ اور یہ تعلقات بے زمین ان چماروں اوران چماروں اوران موروثی دخیلکار کاشتکاروں کے درمیان چلے آتے تھے اور اب مدتوں سے وہ کم شرح والی بات بھی یوں ہی برائے گفتن رہ گئی تھی یہ چمار کام کر کے پیداوار کی کمی بیشی کے لحاظ سے جنس کی صورت اجرت پایا کرتے تھے، ویسے گاؤں کے روائتی آئین میں تو منوجی کا تشخیص کیا ہوا ریٹ درج تھا اور وقت صبح سے شام تک کام کرنے کے بعد آٹھ چھٹانک چینا۔ درمیانی کھانے والے مزدور کی ٹھیک ٹھیک نصف شکم خوراک تھی اور

ری خوراک کھانے والے کی پاؤ شکم پروری سے کچھ ہی زیادہ ہو سکتی تھی۔ تاہم اس میں وقت کے ساتھ ساتھ ترمیم و تنسیخ ہوئی تھی۔ اور
ب مدتوں سے اوسطاً ایک محنتی کھیت مزدور بقدر ایک چہارم پیداوار پاجاتا تھا اور اپنے اور اپنے اہل و عیال کی شکم پری کر لیتا تھا۔

اور جس علاقہ پر منشی کمال شیر خاں متعین ہونے ظاہر بات ہے کہ ان کا سوانگ اسی ردعمل کے ساتھ ہوتا جیسا طبقہ جنگل میں
دھری سے آدم خور شیر کے نازل ہونے کا ہوا کرتا ہے اور بہت کچھ دونوں ہی کے آپریشن اور طریقہ کار میں مماثلت تھی بھی، اور
اجی میاں کی سرکار سے بندہ علی کے یہاں خدمات منتقل ہونا ہی بجز ہراس کے اور کچھ نہ تھا۔ اور متعلقہ کاشتکار اور چمار اپنے اپنے
ل میں خود ہی چوہے لئے بیٹھے تھے وہ تو یوں بھی تو بیتر کھڑکنے پر ہی چونک چونک پڑتے تھے کہ بلا شان گمان یہ بمب شیل آ پڑا۔
، سب کے سب نے انہیں دیکھا بھی کچھ ایسی ہی نگاہ سے راڈر کی آنکھ بمبارڈمنٹ کے لئے پرواز کرتے ہوئے اپنی جانب بڑھتے
بادلوں کو دیکھتی ہے۔ وہ سب کے سب آقا کی موت اور بے راہ وراثت کی ہراس سے دو چار تھے پھر یک اندر یک حاجی میاں کے
ان کے بڑے آقا کی قرابت ہوئی جس نے بڑے کو بڑھا کر آسمان پہ دھر دیا۔ ممکن تھا کہ وقت کا مرہم اور گھڑیوں کی رفتار اس ہراسوں کے
دعوں کو صبر کے دامن میں لپیٹ دیتی لیکن منشی جی کا ورود اپنی جگہ پہ بھیڑوں کے گلہ میں بھیڑیئے کے آ پڑنے جیسی صورت تھی۔ ان کا پیشہ
ہ گیری رہا تھا۔ ادھر مدتوں سے ان کا رویہ بھی اس کا مستوجب تھا بھی اور دار و گیر کے ناعل ہمیشہ زبردست ہی رہے ہیں اور مفعول نالی کمزور
ہوتے چلے آئے ہیں اور ان کی منڈائی سے لے کر کٹائی اور تنائی تک بال سے لے کر ہڈی کے مغز تک روز ازل سے بھیڑوں پہ ہی گذری
۔۔۔۔۔۔ اور منشی جی نہ تو کردار تھے، نہ ٹائپ ہی، وہ تو علامت سی تھے۔ دوسروں کے لیے دنیا میں زیادہ عرصہ تنگ کر کے خود بھیں گھونٹ کر
دہ سے زیادہ فراخی کے ساتھ سانس لینے کے عمل کا سنبل (SYMBOL) بندہ علی کے یہاں ان کی خدمات کاشتکاروں کی بیار کرنے
لئے تو منتقل نہ ہوئی تھیں۔ ویسے منشی جی ٹھیک ٹھیک کتابی معنی میں گرگ باراں دیدہ واقع ہوئے تھے اور اس کا یہ خاص میں تو کچھ انتقامی
ی کیفیت کے حامل تھے اور جیسے حاجی میاں کی جانب سات خون معافی کا پروانہ لے کر مامور ہوئے تھے اور منشی جی کی تاریخ کی تو پیٹھ پر ایسے
معلوم کتنے دفتروں کے گٹھر تھے اور خاص طور پر جب مد مقابل ہر پہلو سے گھٹا ہوا ہو تو ضعف بڑی گرمجوشی کے ساتھ استبداد کو
ت دیتا ہے۔ اور کاشتکار کر بھی کیا سکتے تھے۔ بندہ علی مالک تھا، اور حکم حاکم مرگ مفاجات سے کوئی کیوں کر بچ سکتا ہے اگر
م کسی جنگل سے آدم خور شیر ہی ہنکوا کر ان کے کاشتہ کھیتوں میں چھڑوا دیتا تو انھیں دم مارنے کی گنجائش کب تھی، یہی موروثی حقوق
م شرح لگان والے بہر حال یہ کاشت کار ہی تو تھے۔ مالک اصل و نسل تو بندہ علی ہی تھا اور اسی نے مختار عام کا پروانہ منشی کمال شیر خاں
یا تھا۔ وہ خورد سال بھائی کی سرپرستی کے زمانہ میں ایک نوعیت کا مختار کل ہوتے ہوئے انھیں مراعات سے نواز چکا تھا لیکن یہ
حرام ذرا نہ پگھلے تھے اور مولا علی کا سن بلوغت انگلیوں پہ گن گن کر منتظر تھے اور مولا علی کی وفات کے بعد ان کے سنگین حملہ کے باوجود اس
طرح دی تھی اور اپنی اس شادی میں روائت اور دیہی آئین کے بالکل خلاف نذر معاف کی تھی اور سب کو کھانے پر مدعو بھی کیا تھا سو
نمک حراموں نے نذر تو چپکے ہضم کر لی تھی اور کھلانے پر باوجود اصرار کے آنا گوارا نہ کیا تھا۔ لیکن یہ کہہ بھی کیا سکتے تھے متقدمہ نے اس
لئے ایک سے ایک بڑھ کر ساماں فراہم کئے تھے۔ مولا علی کی موت کے بعد چاند بی بی سے شادی، دیکھنے میں تو گوبر کے چھینٹے کی
تی لیکن پیٹ میں ہیرے کی کان بھری تھی اور بریب شاددں انجبوں کی طرح وہ صفر نہ تھا، نابالغ بھائی کی سرپرستی اور کارکنی ہاتھ آ جانے

کے سبب ایک تو تھا ہی اس کی موت نے ایک اور شامل کر کے گیارہ بنا دیا اور حاجی میاں کی بیٹی نے دوش بدوش آکر ایک کو ایک سو گیارہ کر دیا تھا۔ حالانکہ بندہ علی کارکردہ آدمی تھا اور اپنے علاقہ کا چپہ چپہ کا محرم تاہم اس نے ان مخصوص گروہوں کے متعلق کل اختیارات منشی کمال شیر خاں کو سونپ دیئے اس عملی وعدہ کے ساتھ کہ کبھی اس میں دخل دے گا نہ تنسیخ کرے گا البتہ جن ترمیم سے منشی جی خواہش مند ہوں گے وہ بے چون چرا کرتا رہے گا۔

منشی جی کو اپنا کام بہت ہی آسان نظر آیا۔ موروثی سے حقوق والے کاشتکاروں پر ایسی کاری ضرب لگانا تھی کہ اگلی پچھلی سب سزائیں مل جائیں ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ کے راستہ کے کانٹے بھی صاف ہو جائیں اور مزہ تو جب ہے کہ ہم خرما ہم ثواب معقول رقم ہاتھ میں آنے کی راہیں بھی کھلیں۔ دشمنوں کا توڑ دوستوں کا جوڑ منشی جی کا تمام تر مہمات میں اصول رہا تھا اور اس معاملہ میں بھی اسی کو ہاتھ میں لے کر چلے۔ اور پہلا اقدام اس کی اول شق سے شروع کرنے کا منصوبہ بنایا کھونٹے کے بل پر تنی ہے یہ موروثی کاشتکار اپنے مقبوضہ کاشتہ رقبوں پر کم شرح لگان اور ناقابل بے دخلی قانونی حقوق کی صورت حال کے سبب سر اٹھا کر چل رہے تھے اور ان کی اکڑفوں اور سرکشی معاشی آسودگی اور مستقبل کی یقینی ضمانت کے سبب تھی، لہذا منصوبہ کی پہلی شق انہیں اس نوعیت کاشت سے بیدخل کرنا تھا اور منشی جی کے مولوی دوسری شق دوستوں کا جوڑ اسی بے دخل شدہ اراضی کو قبضہ میں لے کر اس کے ذریعہ نئی پارٹی تشکیل کرنا تھی۔ لیکن صدیوں پرانے موروثی مقبوضہ سے ذہنی طور پر بیدخلی تو شاید ناممکن تھی البتہ قانونی طور پر ممکن تھی اور وہ صرف وجوب لگان فصل کے فصل وقت پر ادا نہ ہونے کی بنا پر ہو سکتی تھی لیکن یہاں یہ قانون نہ چلتا تھا کیونکہ یہ کاشتکار وقت سے قبل ہی ادا کرتے چلے آتے تھے اور کبھی ایک حبہ بھی بقایا نہ ہونے پایا تھا۔ منشی جی ویسے قانون مال اور قانون قبضہ اراضی میں کسی وکیل سے کم مہارت اور معلومات نہ رکھتے تھے لیکن اس نوعیت کا ان کا یہ پہلا واسطہ تھا۔ چنانچہ موروثی دخیل کار کاشتکار کی بیدخلی کے لیے منشی جی کے ایک دوست وکیل نے قانون قبضہ اراضی میں سے ایک منجمد سی دفعہ نکال کر دی جس پر آج تک کسی زمیندار نے اس علاقہ میں تو عمل کیا نہیں تھا وہ یہ تھی کہ اگر زمیندار میکینیکل فارمنگ کے لئے چک بنانا چاہے تو موروثی کاشتکاروں کی بھی بے دخلی کرا سکتا ہے۔" اور منشی جی نے مولازادوں پر اپنی قانون کے تحت بیدخلی کاشت کا دعوی دائر کر دیا اور بندہ علی کے یہاں کام پر پہنچے کے سال اندر ایک سرے سے تمام موروثی کاشتکار اپنی آبائی اراضیات سے محروم ہو گئے اس رستخیز میں جدامجد سے لے کر بندہ علی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ ہوا کہ کاشتکار اپنی روزی بچانے کے لئے عذر داری کرنے زمیندار کے رو در رو عدالت میں پہنچے اور کاشتکار با زمیندار باقاعدہ مقدمہ بازی ہوئی لیکن بہرحال قانون اور صورت حال دونوں ہی بندہ علی کے ساتھ تھیں لہذا میدان انھیں کے ہاتھ رہا، تاہم زمین حاصل کر کے وہ چیز کھو دی جس کو "بھرم" کہتے ہیں اور جو کچھ اب تک پیٹھ پیچھے ہوتا رہا تھا وہ رو برو در عدالت پر ہو گیا۔

بیدخل شدہ رقبے کافی بڑے تھے لیکن انہوں نے اس پر میکینیکل فارمنگ وغیرہ کچھ نہیں کیا وہ تو سب جھول تھی، بھلا زمیندار کو پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ "خود کاشت" کا دردسر مول لیتا سالانہ لگان اور بٹائی وغیرہ کی سیکڑوں آمدنیاں ہی بہتیری تھیں۔ قانونی فائدہ اٹھانے اور مطلب براری کے لئے عدالت تک کی بات تھی۔ منشی جی نے اس تمام اراضی پر بستی کے بیاج خور ساہوکار کو قابض کر دیا اور اس سے معقول رقم لے کر ویسے ہی دوامی حقوق کا باضابطہ پٹہ لکھ دیا۔ جیسا مولازادوں کے پاس پشتہا پشت سے چلا آ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ

ایک شق یہ لگا دی کہ بیگار اور سائہ وغیرہ کے حقوق جو خود کاشت (میکینکل فارمنگ) کرنے کی صورت میں زمیندار کو دستور دیہی کے ذاتی آئین کی رُو سے پہنچتے تھے ان کو زبانی طور پر ساہوکار کے حق میں منتقل کر کے عام منادی کرا دی، کہ ان سے مثل ہمارے کوڑی ل مہاجن مستفیض ہونے کا مجاز ہے اور یہ زمیندار کے وہ وجوب تھے جن سے موروثی کاشتکار مستثنیٰ تھے یہ صرف کھیت مزدوروں تک واجب ہوتے تھے جو بالعموم چمار وغیرہ شدر اقوام تھیں، لیکن اب موروثی کاشت سے محروم ہونے کے بعد اس کا اطلاق مولازادوں پر بھی ہوتا تھا اور یہ بات بھی جا بیں کہ دنوں ہی دنوں میں تھی بلکہ قانون کی رو سے وہ اپنے ہاشی مکانوں سے بھی بے دخل کئے جا سکتے تھے اور کلیتاً زمیندار کے رحم و کرم اور مرضی پر تھے۔ اور اجرت کی شرح دستور دیہی کے آئین شدآمد قدیم میں شاید منو سمرتیوں سے اخذ کردہ تھی جس میں درج تھا کہ "شدر کو صبح سورج نکلنے کے وقت سے دن مندے تک کام کرا کر ایک وقت کی شکم پری کے بقدر خوراک دو، اس سے زیادہ کھانے سے اس کے دماغ کا توازن خراب ہو جائے گا اور یہ اگلے وقتوں کے ماہرین خوراک بزرگوں نے اچھی طرح خوب ٹھونک بجا کر اس خوراک کی تعداد چھ چھٹانک پسنے مکا کا چبنیا یا جو جوار کا آٹا تجویز کی تھی اور اس اجرت پر کام لینے کا حق صرف آقا (زمیندار) کو دیا تھا اور بندہ علی کے یہاں پشتوں سے کبھی زمینداری میں خود کاشت نہیں ہوئی تھی بستی اور مضافات کے بے زمین کھیت مزدور ان مولازادوں کے ان خاندانوں کے رقبوں پر اچھی اجرت میں کام کرنے آیا کرتے تھے جن کے گھر میں آدمی کم ہوتے تھے اور اراضی زیادہ، یہ موروثی کاشتکار ان کھیت مزدوروں کے ساتھ لگ لپٹ کر خود بھی کام کیا کرتے تھے۔ اور اوسطاً نقد و جنس کی مختلف صورتوں میں مزدو۔ وقت وقت پر اتنا پا جایا کرتا تھا کہ جو پیداوار کے ایک چہارم کے بقدر ہوتا تھا۔ پہلی چیز تو یہ ہوئی کہ مہاجن نے اچھی بھر مٹھی رقم دے کر بے دخل شدہ اراضی دوامی اور ناقابل تنسیخ پٹہ پر اور بہت کم شرح لگان پر لی، اور ساتھ ہی ساتھ بیگار، بھینٹ سائہ وغیرہ کی وہ تمام مراعات بھی حاصل کیں اور اس کے عیوض بھی معقول رقم نذر گذراتی، بہر حال اس آخرالذکر پر آج تک کبھی عمل تو ہوا نہ تھا لیکن یہ زمیندار کا ایسا حق تھا کہ عدالت دیوانی میں اس کی داد رسی ہو سکتی تھی اور ڈگری مل سکتی تھی۔

نو بڑے مہاجن دخیل کار نے زمین کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ بل کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا روپیہ کے زور سے اور زمین بھی حاصل کی اور روپیہ کے زور سے زمیندار اور مالک والے بیگار وغیرہ لینے کے حقوق بھی حاصل کئے۔ تاہم بنئے کی نگاہ تو تنظیم زر کی جانب رہتی ہے۔ ساونتی تسخیر ملک میں بھی محض سود و زیاں ہی مدِنظر رہتا ہے، ان مراعات کو بھی اسی سلسلہ میں خریدا تھا اور اس اراضی پر بجائے گیہوں چنے، گنے باجرے ماش کے پہلے سال ایک اچھے طاقت ور اور زرخیز رقبہ پر بڑے پتہ کی تمباکو کاشت کرائی جس میں مذکورہ اعلیٰ اجناس کہلانے والی فصلوں سے چوگنا پانچ گنا منافع ہوا تو دوسرے سال پورے کے پورے رقبہ پر تمباکو کی کاشت پھیلا دی اور اس قسم کی تمباکو جو سال میں دو فصلیں دیتی ہے اور اب صورت یہ ہو گئی کہ غلہ اور گنے وغیرہ اجناس کی کاشت میں کام کرنے والے مزدور ہاری وغیرہ جو بیاڑے کے وقت کٹائی اور کھلیاں میں تھوڑا بہت چرا چھپا کر یا کھلم کھلا کما پڑتے تھے اس سے بھی گئے تمباکو سبز ہی سبز کھیت میں سے کٹ کر تاریک گودام میں گٹھے بنا کر اوپتے ہتن دی جاتی ہے اور دو تین ہفتہ میں جب تیار ہو جاتی ہے تو انسپکٹر آبکاری معائنہ کر کے وزن کا تخمینہ کرتا ہے، جو مہاجن نے رشوت دے کر من کا پانچیہ کرایا اور تھوڑی سی تمباکو گورنمنٹ ریٹ پر محکمہ آبکاری کے ہاتھ فروخت کر دی بقیہ کل اسمگلنگ کے ذریعہ بھرپور قیمت پر خوردہ تمباکو فروشوں کے ہاتھ بیچ دی اور اس طرح انسپکٹر کو رشوت دے کر اور ٹیکس مار کر ایک جانب

نفع لیا بقیہ پیداوار بچا کر اور بڑے بھاؤ پر بازار کے تمباکو فروشوں سے دو منافع لیا اور کمتی پیداوار لاگت کا نفع تو اپنی جگہ علیحدہ اور مسلمہ تھا ہی۔ یہ تھوڑے
لاہد کا دھندا چل نکلا اور زیادہ سے زیادہ چسکا پڑا تمام اراضی پر بیاوری کھاد اور سخت گوڑائی جتائی آب پاشی کے زور سے سال اندر
دوسری فصل لینے کا منصوبہ بنایا اور چپکے ہی چپکے کمیت مزدوروں کی اُجرت بھی بڑھا دی تاکہ کمیت مزدوروں کی اشک شوئی ہوتی ہے
اور دھندا چلا سکے اور اس طرح مہاجن نے کھیتی کیاری کو اپنے سرمایہ کی گرفت میں لے لیا وہ چاہتا تھا کہ جیسی نفع کی کھیتی ہے اسی کے
مطابق اگرچہ گنتی مزدوری پر بھی کام کے لئے مزدور مل جائے تو بھی وارے نیارے ہیں ادھر سال بھر سے مولا زادے بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے
بیکار سے بیٹھے تھے، کاشت کی زمینوں سے بے دخل ہو چکے تھے بہرحال پچھلے تھے ہوئے تھوڑے بہت سرمایہ اور جنس سے ستم پشم
سال کاٹا، لیکن اس صورت میں تو نخاروں کا خزانہ بھی پورا نہیں پڑ سکتا۔ کوڑیا مہاجن بھی چاہتا تھا کہ بھرپیٹ اجرت پر انھیں کام پہ لوں
اور وہ بھی اب سوچ رہے تھے کہ چلو ٹھلوا سے بیگار بھلی اگر مہاجن کی تمباکو کی کاشت پہ دن بھر کام کرکے اتنا مل جایا کرے کہ شام کو بال
بچوں کا پیٹ بھر جائے تو یہی بہی وہ دخیل کاری موروثی کاشت نہ سہی پیٹ بھر مزدوری تو ملتی رہے۔ لیکن منشی کمال شیر خاں مانع تھے کہ
اگر کمیت مزدور کی یومیہ اجرت چھ چھٹانک چبینے سے بڑھتی ہے تو یہ اور روایت کے منافی بات ہوتی ہے اور زمیندار کے حق پر
ضرب پڑتی ہے' اور مہاجن نے خوشی خوشی یہ بیگار کے مالکانہ نوعیت کے حقوق اچھا بھر جیب نذرانہ منشی جی کو دے کر خود ہی تو
حاصل کئے تھے اور وہ اس ضمن میں زمیندار کا نمائندہ تھا۔ جب منشی جی مزدوری بڑھانے سے مہاجن کو سختی کے ساتھ روک دیا اور
مہاجن کو مزدور بھی مل نہ سکے تو مہاجن نے اس میں اپنا نقصان دیکھ کر منشی جی سے ان حقوق ہی کے حصول میں مدد اور داد رسی چاہی۔
اور منشی جی نے معاہدہ کے مطابق اس کام پر اپنے حصہ کے مخصوص موزوں آدمی تعینات کر دیئے جو صبح ہی صبح چماروں کو گھروں میں سے بروتی
گھسیٹ گھسیٹ کر مہاجن کے کھیتوں میں پہنچا دیتے تھے اور مہاجن ان لوگوں کو بڑی آؤ بھگت اور خوش اخلاقی کے ساتھ کام پر لگا۔
لیتا اور بنیا تو نفع نقصان کی ترازو میں ہر چیز کو تولتا ہے تمباکو کی کاشت میں جی کھول کر لاگت لگاتا اور بھر بھر جھولی نفع لیتا۔ ساتھ ہی ساتھ
آسانی کے ساتھ ہاتھ آجانے اور دل لگا کر محنت سے کام کرنے کی راہ پر ڈالنے کے لئے اس نے منشی کمال شیر خاں سے چھپا کر
اجرت چوگنی پچگنی تک کر دی اور دوسرے سال تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ مولا زادے اور چمار بغیر ہی بلائے مہاجن کے پہنچنے سے قبل
ہی کھیتوں پر پہنچ جایا کرتے اور منشی کمال شیر خاں اس کو اپنی اقبال مندی سمجھ کر پھولے نہ سماتے۔

لیکن آخر الامر یہ راز بھی منشی جی پہ فاش ہو گیا کہ مہاجن دستور دیہی کے خلاف عمل کر رہا ہے، ویسے وہ چاہتے تو تمباکو
کی کاشت کی آمدنی کے زیرِ نظر قانونی نہیں تو نجی طور پر دباؤ کر مہاجن سے لگان اراضی کی سالانہ رقم بڑھا لیتے لیکن یہ روایتی حصول کا معاملہ
تھا انہوں نے مہاجن کو بلایا اور کہا کہ کیوں ساہو جی اب تم ہماری دستور دیہی واجب الارض شدہ قدیم کے قانون کو توڑ رہے ہو' اور کمیت
مزدوروں میں رشوت کی لعنت پھیلا رہے ہو۔"

"وہ کیسے صاحب؟"

"یاد رکھو کہ سورج نکلنے سے دن مُندے تک کسی مزدور کو چھ چھٹانک موٹے چھوٹے اناج سے زیادہ نہیں جانا چاہئے۔ تم نے
زمیندار سے یہ حقوق حاصل کئے ہیں لہٰذا زمیندار والی شرح رائج دینا چاہیے۔ کل کلاں کو ہمیں ضرورت پڑی تو رعایا ہم سے بھی یہی مطالبہ کرے گی۔
یہاں روایت اور حکم چلتا ہے نفع نقصان نہیں۔

کوئی اور کاشتکار وغیرہ ہوتا تو شاید اتنی لب کشائی کر بھی نہ سکتا تھا اور اگر کرتا تو منشی جی بجائے اپنی زبان کے جوتے کی زبان سے جواب دے کر اچھی طرح سمجھاتے لیکن مہاجن تو ساہوکار تھا اس نے کھیت کی مٹی بھی ہاتھ سے چھوڑی بھی نہ تھی ذرا جھجکتے ہوئے گھگیا کر جواب دیا "کھیتی باڑی نہیں منشی جی یہ میرا کاروبار ہے، تمباکو پیدا کر کے میں خوب کماتا ہوں، اگر زیادہ مزدور مل جانے کے لیے مزدوری بڑھا دیتا ہوں تو کماتا بھی زیادہ ہوں" پھر یہ میرے اور مزدوروں کے درمیان معاملہ ہے۔"

منشی جی نے ایک لمبا ہنکارا نکالا "پھر وہی بات! تمہارے اور مزدوروں کے درمیان نہیں ہمارے اور مزدوروں کے درمیان کا پانچسو برس پرانا معاہدہ ہے جس کا زمین تحریری پٹہ کے ساتھ تم کو زبانی ٹھیکہ دے دیا ہے، کیا تم مزدوروں کی اجرت کے ساتھ ہمارے واجب لگان بڑھانے کو بھی تیار ہو ـــ بولو ـــ تمباکو کی کاشت میں تو سونا رول رہے ہو اور ہمیں تو وہی ڈھائی روپیہ ایکڑ سوکھا لگان دیتے ہو۔"

مہاجن نے ایک گھونٹ سا لیا، اُس نے تو کافی رقم نقد دے کر بہت کم سالانہ شرح لگان پر زمین کے دائمی اور موروثی حقوق حاصل کئے تھے۔ اور منشی جی کی یہ بات بھی برائے گفتن ہی سی تھی ورنہ وہ روایت کے قیام کے مقابلہ پر اس شرط کے من مانے طور پر پورا کر دینے کے باوجود بھی تیار نہ ہوتے۔ پھنسی ہوئی آواز میں مہاجن بولا "میاں یہ شرح لگان تو میری نسلوں کا حق ہے اور پھر زبان کو روکتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا" اور میاں میں نے یہ حق اچھی بھر مٹھی تعلقہ گذران کر میر صاحب سے رجسٹری کرا کر حاصل کیا ہے، اس کا کیا ذکر۔"

"تو پھر وہ ہماری پشتوں اور نسلوں کا حق ہے جو تم اپنی نفع والی کاشت بڑھانے کے لئے اجرت میں اضافہ کرنے جا رہے ہو، دیکھو ساہو جی تم کھیت مزدور پانے کے ہماری جانب سے حق دار بنے ہو، لہذا ہمارے ہی دائرہ میں چل سکتے ہو۔ اگر کل کو ہم اپنی خود کاشت میں نے جب تم نے چاہا ڈنڈے کے زور پر ان کھیت مزدوروں کو بیلوں کی طرح ہنکا کر تمہارے کام پر بھیجا آج تم کمر مایت بن بیٹھے۔ ہم نے تمہیں ذلیل ساہوکار مہاجن سے موروثی دخیل کار بنایا، ادھنی روپیہ کے بیاج پر گھر گھر بھیک ہی مانگ کر بیوپار کرتے پھرتے تھے۔ کبھی زمین پر قبضہ کا خواب بھی دیکھ سکتے تھے۔ یہ ہمی تو تھے کہ بھاگوں چھینکا ٹوٹا کہ یہ پانچسو سالہ دخیل کار ہوگا کہ اس زمین کے دائمی دخیل کاری تمہیں بخشی اور اب تم زمیندار بنا چاہتے ہو بلکہ زمیندار سے بھی بڑھ کر نئی نئی ریتیں ڈال رہے ہو۔ کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر ننانوے کے پھیر میں حساب کتاب کرتے ہو یہ کھیتی بھی تم ہماری جانب سے کر رہے ہو۔ اراضی ہم نے خود کاشت کے قانون کے تحت بیدخل کرائی تھی اور اس پر تمام قانونی اور روائتی حق جو ہمارے تھے تم کو منتقل کئے تھے۔ بس ہماری طرح کھیتی کرو یہ نفع نقصان کا چکر مت چلاؤ کھیت کی منڈ پر بیٹھ کر چھ مہینے میں ایک کے اٹھارہ کر لیتے ہو۔ دس روپیہ دے کے اکنی روپیہ کے حساب سے دروازہ دروازہ وصول کر کے کہیں دس کے بارہ کرتے تھے۔ بیوپار کرنے والوں کو، بس اب ہمارے ڈنڈے کے زور سے تمہاری تمباکو کھیتی ہوگی، تم اپنی تھیلیوں کا منہ بند کر کے رکھو۔

مہاجن منشی جی کی قوتوں کا پورا پورا اشنا سا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ان سے میل اور اختلاف کے نفع نقصان کا بھی دیہات بھر میں سب سے زیادہ

محرم اور بات وہ بادی النظر میں اس کی نفع والی بات کر رہے تھے۔ زیادہ بول بھی نہ سکتا تھا اور اس طرح مار باندھ کے سودے میں تمباکو جیسی محنت کی کھیتی کا کام بیگاریوں کے ذریعہ قرار واقعی چلنا بھی مشکل تھا۔ لیکن نفع نقصان سے سب سے بالاتر چیز زبردست کا ٹھینگا سر پر تھا۔ اور پھر اس کو دو تینک کے خطرے دکھائی پڑ رہے تھے۔ منشی جی کی ذات پر فیوض سے یہ بھی دور نہ تھا کہ انھیں مولازادوں کو اشارتاً شہ دے دیں اور وہ اپنی موروثی اراضی پر پھر سے قبضہ کر لیں اور پھر مہاجن کو عدالت میں استقرار حق اور حصول قبضہ کی مقدمہ بازی کرنا پڑے اور مارے پیچھے پکار ہوا کرے۔ مولازادوں کے لئے یہ مشکل کام بھی نہ تھا، بستی بھر ہی میں کا جتھہ تھا، زمیندار کے بعد بستی میں سب سے زیادہ ذی اثر لوگ تھے اور ابھی کل تک موضع کی بہترین اراضی پر اور سب سے کم شرح لگان پر قابض و متصرف تھے۔ سیم و زر کو سنبھالنے والے بھی سونے چاندی کی طرح کمیاب ہیں۔ بالعموم دیکھنے میں آتا ہے کہ مہاجن کا تو گاؤں پیچھے ایک ہی گھر ہوتا ہے اور دو ایک آدمی ہوتے ہیں بالعموم باپ بیٹا، بھائی بھائی اور کوڑی کوڑی کو سیج سج دو میاں بیوی اور ایک بستی، بستی اور اطراف میں مخصوص حلقہ کے اندر زبانی لین دین اور قرضہ سود کا بیوپار پھیلا ہوا تھا۔ پہیں کہیں قسطیں باندھ باندھ کر مہینہ بھر میں اتنی روز کے حساب سے وصول کیا کرتا تھا اور ایک روپیہ کے دوا کم دو روپیہ بنا لیتا تھا۔ اگر ذرا بھی ہوا اکھڑتی تو زبانی لین دین دیتے کے تودے اور پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہو جاتا منشی جی تو بڑی چیز تھے وہ منشی جی کے کتے کی بھی حکم عدولی نہ کر سکتا تھا۔ دوسرے روز شام کی اجرت تقسیم کرتے وقت اس نے منشی جی کے حوالہ سے آئندہ اسی شرح سے مزدوری دینے کا اعلان کر دیا جس کے وہ دستور دیہی کے مطابق اگر زمیندار خود کاشت کرے تو پانے کے حق دار تھے۔ بات کچھ عجیب سی تھی۔ زیادہ ریٹ کا لہو منہ کو لگا کر پھر کمی پر واپس لانا مشکل مسئلہ تھا۔ مگر دوسرے ہی روز منشی جی کے لٹھ بند جوانوں نے گھر گھر سے بیلوں کی طرح آدمیوں کو ہنکا کر مہاجن کے کھیتوں پر پہنچا دیا۔ اور کھیت مزدور شبہ میں رہے کہ یا قدام مہاجن کے اشارہ پر ہوا ہے یا درحقیقت منشی جی روایت اور ریت کا تحفظ کر رہے ہیں اور ہر امر کو نفع نقصان کی ترازو پر تولنے والا بنیا کم بخت بھی خوش نہ تھا، کھیت کی منڈ پر بیٹھ کر کم اجرت والے کام میں گھاٹے ہی گھاٹے کا اندیشہ دیکھتا رہا۔

(۴)

موروثی اراضی سے بیدخلی کے بعد پہلی عید آئی تو قدیم رواج کے مطابق حسب معمول علاقہ کے اور موروثی و خیلکاروں کے ساتھ مولازادے بھی نذر لے کر بندہ علی کے عید ملن جلسہ میں پہنچے لیکن منشی کمال شیر خاں کے اشارہ پر بندہ علی نے مولازادوں کی نذر لینے سے انکار کیا کیونکہ یہ اعزاز صرف موروثی و خیلکار کاشتکاروں کے لئے مخصوص تھا اور نہ ان سے معانقہ ہی کیا، کیونکہ اب ان کی پوزیشن وہ نہ رہی تھی جو پہلے تھی اور فوراً ہی یہی تمام نذرانے یکشت مولازادوں کے بجائے گویا ان کے جانشین کوڑی لال ساہوکار سے قبول کر لئے اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ معانقہ کیا اور قدرے مقتدر نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، ساتھ منشی جی کے اشارہ پر چھوٹے منشی نے ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے ساتھ عیدی دینے، انعام، فطرہ وغیرہ کے لئے ان مولازادوں کو طلب کیا لیکن انہوں نے انکار کیا تاہم اتنی ہمت نہ پڑی کہ جلسہ چھوڑ کر دیوان خانے سے باہر چلے جاتے محفل میں آخر تک موجود رہے۔ عید کے اس اجتماع میں ذرا پھیک سی رہی، اور مولازادے بہت آزردہ رہے اور جب محفل اٹھ گئی تو تقریباً تخلیہ میں مولازادوں نے اپنی شکایات بندہ علی کے روبرو پیش کیں، ان میں سے ایک مسن بزرگ نے جو

کسی زمانہ میں بندہ علی کے والد بڑے میر صاحب کا مقرب رہا تھا اور مزاج میں دخیل تھا کھل کر بات کی یہ بوڑھا مولازادہ ثقہ آدمی تھا قرآن پڑھا ہوا تھا اور جب مسجد کا پیش نماز بیمار ہوتا یا کہیں باہر ہوتا تو امامت بھی کر لیتا اور پانچوں وقت اذان دیتا، کچھ اس بات کا اور بہت کچھ باپ کے زمانہ سے مزاج میں دخیل ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا " میاں دولت اور زمین آنی جانی چیز ہے، آپ نے اپنے قانونی اختیارات کا فائدہ اٹھا کر ہم لوگوں سے زمین چھین لی اور مہاجن کو دے دی، لیکن اس گھڑی عید کی خوشی میں ہی ہماری نذر قبول کر لیتے علاقہ بلکہ ضلع بھر میں ہم ویسے ہی کیا کم ذلیل خوار ہیں اور یہ بھری محفل میں آپ نے اور بھی ذلیل کر دیا۔ بہر حال ہمیں اس کی شکایت نہیں نذر تو ڈھیلکاروں کی قبول کی جاتی ہے۔ اور آج مقدر نے ہمیں کرئی بھی نہ رکھا۔"

"مگر اس میں میرا کیا بس۔ کیا میں نے لٹھ مار کر زمین لوٹ لی ہے، وہ تو قانون نے تمہیں بےدخل کیا ہے۔ جس طرح میرے ادا کے زمانہ میں قانون نے تمہیں بہت کم شرح لگان پر کبھی ڈھیلکاری موروثی کا حق دیا ہوگا اسی طرح آج اسی قانون نے تمہارا یہ حق ختم کر دیا۔"

بڈھے نے ایک لمبی سانس لی اور کہا " ہاں میاں میں نے کہا تھا ہیں ابھی زمین خدا کی ہے جس کو چاہتا دیتا ہے جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے، آپ کے بزرگوں کی مہربانی سے کبھی ہمارے بزرگوں کو پہنچی اور آپ کے ساتھ ہمارے لڑکے بنا کر نہ چل سکے آپ نے واپس لے لی۔ آپ مالک ہی جو ٹھہرے۔ پھر ہاتھی بکرے کی لڑائی میں ہونا بھی یہی تھا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بندہ علی نے بیزاری کے ساتھ بات کاٹ دی۔ " ملاں کہنا کیا ہے، وہ بتاؤ، اب کوئی گنجائش کہیں پر باقی نہیں ہے، مدتیں ہوئیں، اٹھارہ مہینے پہلے قانون اپنا پورا عمل ختم کر چکا، ہونی کو ان ہونی کرنا کسی کے بس کی بات نہیں "۔

"بتاتا ہوں میاں۔" ملاں نے کہا، پھر ایک تلخ سا گھونٹ سے کر آواز درست کی۔ " عرض اتنی ہے کہ اب ہماری ذلت اور زوال کی انتہا ہو گئی ہے، چاروں نے اپنے طور پر کوڑیا مہاجن سے پہلی فصل زیادہ مزدوری طے کر لی تھی، چوری چھپے مولازادوں کے لڑکے بھی کام کر آیا کرتے تھے۔ پھر دوسری فصل سے اس نے تمباکو کی کھیتی اور بڑھائی اور تیسری فصل میں ولائتی کھاد ڈال کر پورے رقبوں پر تمباکو ہی تمباکو پھیلا دی، سونا رول رہا ہے، سرکار کا تو بس ایک دفعہ دائمی پٹہ لیتے وقت ذرا سی رقم تھما دی"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بندہ علی نے پھر بات کاٹ دی " ملاں مطلب کیا ہے، بات کرو۔"

" ہاں میاں، یہ اس کا مقدر اور اللہ کی دین۔ اگر سرکار کو خود کاشت نہیں کرنا تھی اور زمین پھر کسی کو موروثی پٹہ پر دینا تھی تو، ہمیں سے حکم کرتے اتنی رقم جتنی بنیے نے سرکار کو جیب سے نکال کر دائمی اور موروثی حقوق کے نذرانہ میں دی ہم سب جیب سے نہیں تو کہیں سے قرض دام کر کے سرکار کو دے دیتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " بندہ علی نے پھر بات کاٹ دی " بھئی ان بیکار باتوں سے فائدہ، سانپ نکل گیا گھسیٹا پیٹا کرو۔ تمہاری اس ایک بات کے میرے پاس ایک سو ایک جواب ہیں، لیکن نہ اس بات کے کرنے کی ضرورت ہے نہ میں جواب دیتا ہوں، وہ بات بتاؤ جو تم اب چاہتے ہو۔"

ملاں نے آواز درست کی اور کہا " بات اتنی سی ہے کہ جب سے بنئے نے تمباکو کی کھیتی سب رقبہ پر پھیلائی ہے مزدوروں کی بہت کمی پڑ گئی ہے، اس نے منشی اجرت پر کیا چار کیا مولازادے سب کے سب مزدوروں سے کام کرانا شروع کیا تھا کہ ایک دن غضب

کو ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ جو کے آٹے پر ٹرخا جاتا۔ جب مزدوروں نے سبب پوچھا تو کہا کہ منشی کمال شیر خاں کہتے ہیں کہ دستور دیہی واجب الارض کی جلد میں کھیت مزدوروں کی یہی مزدوری لکھی چلی آتی ہے، دوسرے دن جب کوئی مزدور کام پر نہیں گیا تو منشی جی نے صبح تڑکے ہی گھر گھر پر اپنے لٹھ بند تعینات کر دیئے جو نکلا اس کو پکڑ لیا۔ پھر جو گھر میں دبک گیا تھا اس کو اندر سے گھسیٹ گھسیٹ کر لے گئے اور کوڑیا مہاجن کی تمباکو کے کھیتوں میں ہانک ہانک کر مرد ناودوں اور بچاروں کا ایک ایک جوان پہنچا دیا۔

"تو میرا اس میں کیا بس، میں تے ابھی بتایا تھیں تھیں۔ وقت وقت کی بات ہے۔ قانون کے ہم تم سب بندے ہیں۔ اور یہ دستور دیہی واجب الارض شدہ آمد قدیم کا آئین ہے، اس پہ حکومت کی ساری کیلی گھومتی ہے، تم لوگ اب کھیت مزدور ہو، ابھی تم نے خود ہی کہا زمین خدا کی ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے، تم سے خدا نے چھین لی اور کوڑی مل مہاجن کو دے دی۔ اب وہ موروثی دخیلکار ہے تم کھیت مزدور اور کھیت مزدور کی اجرت چھ چھٹانک موٹا اناج ہے، انصاف یہی ہے چاہو تو ابھی سماسو برس پرانا قانون جلد بندوبست میں کھول کر دیکھ لو اور اس کو انگریز نے مغلوں سے لیا ہے، اکبر بادشاہ کے زمانہ کا جیسے کا تیسا اٹھا کر رکھ دیا ہے اور "شدہ آمد قدیم" نام رکھا ہے، اس میں تو ہائی کورٹ بھی کچھ نہیں کر سکتی۔" "جو میاں وہ تو سب کچھ صحیح کہہ رہے ہیں آپ، آپ کے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرے کے غلام کو یہ سب معلوم ہے"۔ اور بڈھے کی آواز رندھ گئی "کل تک انھیں کھیتوں پہ ہم گیہوں گنا اگایا کرتے تھے تو ہمارا کام کرنے مزدوروں کے غول کے غول آیا کرتے تھے اور آج ہمارے بیٹوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح منشی جی کیا پیٹ کی آگ شکار کرلے جاتی ہے۔ پھر اللہ تیرا شکر ہے جس حال میں رکھے تیری مرضی ...." اور بڈھے کا حلق بند ہو گیا بندہ علی نے ذرا نرم ہو کر کہا "ملاں جی اتنی دیر ہوئی میں تمہاری بات نہیں سمجھا، چاہتے کیا ہو؟ مگر سمجھ دار پڑھے لکھے آدمی ہو، تمہارے پیچھے میں بھی کبھی کبھی نماز پڑھ لیتا ہوں وہ بات بتاؤ جو میں کر سکوں۔"

"بڈھے نے بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بس سرکار اتنی عرض ہے کہ ہمارے بیٹوں کا مقدر اب تیرے میرے کھیتوں پر مزدوری رہ گیا ہے اس میں منشی جی دخل نہ دیں مہاجن ہر طرح مزدوری بڑھانے پر تیار ہے، بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کسی کے گھر فصل بھر کمانے کو ہے تو کام کئے جائے اور پیداوار کی بچت میں پتی سے لے، لیکن منشی جی دھاندلی کرتے ہیں۔ نہ اس کا کام بھرپور ہونے دیتے ہیں نہ ہماری مزدوری پوری ہاتھ آنے دیتے ہیں۔ اور مزہ یہ ہے کہ منشی جی کا یا سرکار دونوں میں کسی کا اس میں کوئی فائدہ نہیں۔ اور مہاجن بھی ایسے فائدہ سے خوش نہیں اس میں منشی جی کی شرارت ہے۔" بندہ علی کے علم میں یہ بات نہ آئی تھی پہلے تو اس کے منہ سے یہ نکلنے والا ہوا کہ "میں منشی جی سے پوچھوں گا۔" پھر زبان روک گیا اور تیور بدل گئے "بالکل ٹھیک ہے، ہم نے اراضی خود کاشت کرنے کے قانون سے چھڑائی ہے اور بیٹے کو دو حقوق بھی دے دیئے ہیں، آں، اور جو ہمیں حاصل ہیں مفت یوں ہی نہیں، بھاری رقم لے کر ـــــ ہوں۔ آں جو خود کاشت کرنے کی صورت میں کھیت مزدوروں اور رعایا پر ہمیں حاصل ہوتے تھے۔ بہرحال بنیا اراضی پر کھیتی کرنے کے بجائے روزگار سا پھیلا رہا ہے، جیسا کہ ابھی تم نے بتایا کہ تمباکو کی پیداوار سے سونا رول رہا ہے؟ زیادہ سے زیادہ سونا رولنے کے لئے ممکن ہے کھیت مزدوروں کی اجرت اپنے طور پر بڑھانا بھی چاہتا ہو، لیکن یہ تو نئی ریت پڑتی ہے، اگر کل کلاں کو ہم نے کسی رقبہ پر خود کاشت کی تو کھیت مزدور ہم سے بھی یہی بڑی اجرت اور پتی کا مطالبہ کریں گے۔ بنیا سالا ہماری پانچسو سالہ بنی ہوئی شرح

کو بگاڑنے والا کون ہوتا ہے؟"

بڑھا گھگھیا پڑا۔ "میر صاحب رحم کیجیے۔ ہمیں بستی میں پڑا رہنے دیجئے۔ خدا کے واسطے اور سرکار کیا دستور دیہی شد آمد قدیم کے حقوق تمدانہ سے کر کسی نئے دخیلکار کو دیئے بھی جا سکتے ہیں؟ یہ تو خدا حضور کی زمینداری برقرار رکھے زمیندار اور کاشتکار کے درمیان ہیں اور رہیں گے، کوڑی مل مہاجن زمیندار تو نہیں ہو گیا۔ بندہ علی کو تاؤ آ گیا، "ملاں تمہارے پیچھے میں نے نماز پڑھی ہے، ورنہ اس بیرسٹری کرنے کا مزہ چکھا دیتا، کھیت مزدوری کیوں کرتے ہو ہائی کورٹ میں جا کر وکالت کرو تم تو، سنو بستی میں رہنے دینے والی بات بھی میرا قانونی حق ہے، قانون قبضہ اراضی کی رو سے جب کوئی موروثی دخیلکار اراضی سے بے دخل ہو جاتا ہے تو بستی کے اندر گھر سے بھی آپ ہی آپ بے دخل ہو جاتا ہے اور یہ منشی جی کی مہربانی ہے، ورنہ چاہتے تو جس دن تمہاری اراضیوں پر دخل اور قبضہ کی قانونی کارروائی ہوئی پہلے سی دن قانونی طور پر تمہارے چھپروں کا پھونس نوچ کر تمہارے گھر کھدوا کر برابر کرا دیتے اور آج تک ہمیشہ کسی وقت بھی زمیندار قانونی طور پر اس کا مجاز ہے اور تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں ابھی تک موروثی دخیلکاریوں کے خناس کے انڈے رکھے ہوئے ہیں۔ ہونہ! ایں! ؟ بھلا دیکھو تو۔ کہاں سے بول رہے ہیں۔" اس خلاف امید سے دلفگار جواب پر مولازادوں کے وفد جیسے اراکین کے زخمی دل شق سے ہو گئے، چھاتیاں پھٹتی محسوس ہوئیں۔ بوڑھے ملاں نے لاچار سے شکایتی انداز میں جیسے رسمی نوعیت کا بیکار سا جواب دیا "میاں آپ سے ایسے جواب کی امید نہ تھی"..... اور بندہ علی نے جھٹ بات کاٹ دی "میرا جواب نہیں یہ قانون کے من و عن لفظ ہیں"۔ اور پھر ذرا پہلو سا بدلا، تیوروں میں بے چینی کی نشانیاں ابھریں، آواز لہجہ اور انداز سب بدل گیا اور سلسلہ کلام جاری رکھا "اور ہاں یہ تو بتاؤ، پھر کیوں نہیں تھی ایسی امید؟ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو — ایں؟ — بلکہ مجھ کو تو سنی سنائی جستہ جستہ پہنچی ہے اور تم تو سب جانتے ہو، اور تم میں سے کون سا تھا جو کسی نہ کسی طرح ملوث ہی نہ ہو، باقاعدہ حملہ، ورنہ سازش اور کچھ نہیں تو تماشائی اور بڑے سرکار کی وفات کے بعد چھوٹے سرکار مرحوم کی کارکنی اور پھر بحمد اللہ اپنی ملکیت کے شروع زمانہ تک دس سال کے عرصہ میں اپنے ہاتھ سے میں نے مولازادوں کو اپنا سمجھ کر جو جو مراعات دیں اور جیسی جیسی چھوٹیں، رعایتیں جن کا قانون میں بھی کہیں پتہ نہیں نہ روایت ہی میں تھیں نوازا، ڈھیل دی اور طرح دی ہر ہر پہلو سے ابھرا۔ ان کا کہیں کسی اور زمیندار کے یہاں بھی سراغ ملتا ہے، اور تم نے قتل کا الزام تھوپ کر مجھے ٹھکراتے ٹھکراتے پھانسی کے تختہ تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ اور پھانسی کا پھندا اللہ کے کرم سے گلے میں سے نکلنے کے بعد بھی خدا جانتا ہے تمہیں میں نے دل ہی دل میں معاف کیا، اور اپنی شادی پر دعوت دی، جو بلاشبہ تمہاری بہت بڑی عزت افزائی تھی، لیکن تم نے اس کو بھی ٹھکرا کر مجھ کو گویا ذلیل کر کے للکارا۔ تم ایسے بڑھ گئے کہ اپنی حیثیت اور اصل نسل کو بھول گئے۔ شادی کی بھری محفل میں برابر والوں کے سامنے میری تذلیل ہوئی میرا کھانا گھوروں میں دبایا گیا۔ کتوں نے کھایا — اوں، آں، ایں، اور تمہاری شہ پر پہلے چار نمک حرام پولیس کے آلہ کار بنے تھے اور اس مرتبہ بھی انہوں نے تمہاری ریس کی اور یہ بھوکے نمک حرام غلام بھی میری دعوت رد کر گئے — آج تم کس کے پاس معذرت کے لیے آئے ہو؟ ایں؟! بندہ علی کو تو ڈھائی سال پہلے پھانسی کے تختہ پر سے گھسیٹ کر جیل کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ کوئی دقیقہ تو تم لوگوں نے باقی رکھا؟ چلے جاؤ مردودو میرے سامنے سے محسن کش سؤر کے بچو۔ خون اترتا ہے میری آنکھوں میں، حرام زادو، تمہاری ہمت میرے سامنے آنے کی کیسے پڑی سانپ سے بدتر اور کہلانے والے۔ یہ تو سانپ بھی پھن نہیں مارتا۔ [illegible] مار کہیں کے۔

اگر کھیت مزدور بن کر نہیں رہنا چاہتے تو بستی چھوڑ کر کہیں اور جا بسو اور کوئی اور دھندا کر لو، اور یہاں رہو گے تو ڈیڑھ پاؤ جو جوار کے آٹے پر دن نکلنے سے دن چھپے تک کام کرو گے۔ ہوں، خاں، عزن، اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔ ٹھیک کہا ہے بزرگوں نے "کاگا نہ کرے ساکھا"۔ یہ قول مصطفےٰ کا۔

مجمع پر مراں پڑ گئی لیکن ایک صاحبزادے جو ساتویں آٹھویں درجہ تک پڑھے ہوئے تھے بولے "حضور! سید صاحب اب کرم کیجئے۔ یہ بزرگوں کی امانت ہے۔ آپ کی تحویل میں زمینداری کے نام سے اور ہمارے قبضہ میں دخیلکاری تھی۔ ہم بھی اسی جڑ کی شاخ ہیں جس میں آپ کی قلم لگی ہے۔ اتنا ذلیل نہ کیجیے کہ ہمیں چاروں کو ایک لاٹھی سے ہانکا جائے۔ قانوناً آپ کو اختیار تھا پانچ سو برس پرانے مقبوضے چھین لیے اور مہاجن کو مسلط کر دیا اور اللہ نے آپ کو تو نباہنے ہی رکھا ہم میں سے چند سرپھروں کی حرکتوں کے قصور میں ہم سب کو میٹ دیا آپ نے ـــ اس وقت ہم لوگ منشی کمال شیر خاں کی ہی خفیہ ہدایت کے بموجب عید کی خوشی کے موقع پر تلافیٔ مافات میں نذر گزارنے حاضر ہوئے تھے۔ اگر آپ قبول فرما لیتے تو آپ تو آپ ہی رہتے اور ہم کھیت مزدور سے پھر دخیلکار تو نہ ہو جاتے ہاں ذرا بھوبنی رہتی اور ہمارے آپ کے بزرگوں کی عزت۔ ہوں وہ سمجھ لیجئے کہ ہم آپ سے ہیں اور آپ ہم میں سے۔"

اور بندہ علی اس انگریزی داں لونڈے کے جواب پہلے تو "سید صاحب" کے خطاب پر اور پھر "ہمیں اور چماروں کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکیے" جملہ پر اور "بزرگوں کی امانت اور تحویل" پر اور جڑ شاخ اور قلم پر دل ہی دل میں بہت جز بز ہوا اور سب سے زیادہ یہ کہ اس انکشاف پر بہت متعجب ہوا کہ یہ لوگ نذرانے کر منشی کمال شیر خاں کی ہدایت کے بموجب آئے ہیں۔ لیکن سب پی گیا اور بھنا کر یہ کہتا ہوا اٹھ کر چل دیا۔ "بھئی آپ لوگ میرے پاس بیکار آئے ہیں، میں باضابطہ منشی کمال شیر خاں کو مختار عام بنا چکا ہوں یہ انھیں کے طے کرنے کی چیزیں ہیں مجھے ان سے سروکار نہیں۔ اور نہ اس میں کہنے سننے اپیل مرافعہ کی گنجائش ہے۔"

اور اس طرح منشی کمال شیر خاں کے فیصلے کا مرافعہ بندہ علی نے جوں کا توں انھیں کے اوپر دے مارا۔ اور فیصلہ جوں کا توں رہا۔ اور منشی کمال شیر خاں نے نہایت عیاری کے ساتھ خود ہی تحریک کرا کرا اپنے اس فیصلہ قطعی اور رائج کرا لیا۔ اور اپنی پوزیشن مزید مستحکم کر لی۔

**(۵)**

پوری بستی بیگاریوں کا قید خانہ بن کر رہ گئی۔ کوڑی مل مہاجن نے نہ صرف تمام اپنی دخیلکاری کے رقبہ پر تمباکو کی کاشت پھیلائی بلکہ بستی کے اور موروثی کاشتکاروں کی اراضیاں خوب اونچی منہ مانگی شرح پر پیشگی لگان ادا کر کے تین تین سال کو ذیلی کاشتکار کی حیثیت سے پٹہ پر لے کر ان پر بھی یوریا اور امونیا کھاد کے زور سے تمباکو کی کاشت پھیلا دی، حتیٰ کہ یہ دخیلکار اپنے کھانے کے لئے غلہ اور جنس بازار سے خرید کر لانے لگے۔ اور رئیس کی طرح دخیلکاروں میں بھی گھر گھر چین کی بنسی بجنے لگی۔ کھیتی کی محنت سے نجات ملی۔ بنئے نے حساب کر کے سمجھایا تو سال بھر میں پورے تین سو پینسٹھ دن مٹی میں لپٹے رہنے سے جتنا پیدا کر کے بچا پاتے تھے اس سے زیادہ گھر بیٹھے پیشگی بنیا ہاتھ پر دھر دیتا تھا۔ اور اب تک مزدور وہی چمار اور مولانادے پورے پڑ رہے تھے اور سال کے سال منشی کمال شیر خاں سے بیگار کے حقوق نذر کی معقول رقم ادا کر کے بنئے کو ملتے چلے آ رہے تھے کہ اسی لڑکے

نے یہ سوال اٹھایا کہ دخیلکار کاشتکاروں سے ذیلی پٹہ پر حاصل کی ہوئی اراضیوں پر ہم لوگ دستور دیہی واجب الارض کی شرح پر کام کرنے نہ جائیں گے مہاجن اپنے یہ حقوق جو اس نے بیگار وغیرہ کے سلسلہ میں حاصل کئے ہیں اپنی اس اراضی پر استعمال کر سکتا ہے جو اس نے زمیندار سے دوامی پٹہ پر موروثی دخیلکاری کے حقوق لے کر حاصل کی ہے شاید بنیا مان بھی لیتا لیکن منشی جی نے اس کو زبردستی کم اجرت کا ہو نگایا دیا تھا اور اب اس کو اس کا بھی چسکا پڑ گیا تھا کیونکہ کم اجرت والے مزدوروں سے اتنے دنوں میں گردن پر مسلط رہ کر اور کڑوی تمباکو پلا پلا کر اور میٹھی باتیں کر کر کے زیادہ کام لینے کا گر آ گیا تھا۔ کسی صورت شرح بڑھانے پر تیار نہ ہوا اور کہا کہ جس طرح وزن کشی اور ہاٹ پینٹھ وغیرہ کے ٹھیکے میرے پاس ہیں اسی طرح بیگار کا بھی ٹھیکہ ہے اس حق کو میں جس طرح چاہوں استعمال کرنے کا مجاز ہوں۔ حرکت پس پردہ تو مولازادوں کی تھی لیکن انہوں نے آگے رکھ لیا چماروں کو ۔۔۔ جیسے اور کچھ غیر شعوری طور پر سرمایہ و محنت کا مسئلہ چپقلش بن کر بستی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ تمام مزدوروں نے کھیتوں پر کام کے لئے جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن بنیا تو اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے آب پاشی کے بعد رقبوں کی نلائی گڑائی کا فوری کام سامنے تھا بجائے اس کے کہ منشی کمال شیر خاں سے فوراً مدد چاہتا اور اس میں دو چار دن ضائع ہوتے اور اسی میں ساری فصل سوکھ کر غارت ہو جاتی وہ بستی سے چار میل دور ستے سے چار مزدور دوگنی اجرت پہ لے آیا، لیکن خبر پاتے ہی بستی کے مزدور کھیتوں پر پہنچ گئے جن میں چار پیش پیش تھے اور چار پنچائتی قومیت میں لہذا دوسرے گاؤں کے آئے ہوئے چماروں کے ایک اشارہ پہ کام شروع کرنے سے پیشتر ہی اٹھ کر چلے گئے اور اب کوڑیا مہاجن کو دن میں تارے نظر آ گئے۔

آب پاشی کے ساتھ بھاری مقدار میں کیمیاوی کھاد ڈالی گئی تھی اگر فوراً گڑائی اور گڑائی کے بعد فوراً دوسری آبپاشی نہیں ہوتی تھی تو ساری فصل جل کر خاک ہو جاتی تھی۔ بنیا دور اندیش تھا اور اصل وہ منشی کمال شیر خاں کے یہاں فریاد گذار نے فصل کی گڑائی کے بعد اطمینان سے اگلی آبپاشی کے وقت فصل محفوظ کرنے کے بعد جانا تھا تاکہ آئندہ کے لئے اپنی بستی کے مزدوروں کے دماغ صحیح ہو جائیں۔ کیونکہ اس میں وقت درکار تھا لہذا پہلے باہر سے مزدور لا کر فصل کو محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن جب باہر کے مزدور ہٹ گئے تو مجبور ہو کر بجائے نے منشی جی کی زنجیر عدل ہلائی اور تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور خاص طور پر ایک چمار پرکھوتا نامی کی نشاندہی کی جو رنگ لیڈر تھا۔ نیز یہ بھی بتایا کہ ہر معاملہ میں جس طرح پس پردہ ہمیشہ مولازادوں کا ہاتھ رہا کرتا ہے اسی طرح اس میں بھی ہے اور خاص طور پر ان انگریزی داں صاحبزادہ بابو خاں کا نام بتایا جنہوں نے عید کے روز گستاخی کی تھی اور بندہ علی خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ منشی کمال شیر خاں کو تھوڑا سا تاؤ آیا لیکن بنئے نے ٹھنڈا کر دیا اور کہا کہ سر دست آسانی کے ساتھ نرمی سے میرا کام چلتا کرا دیں، یہ کھاد پانی نلائی گڑائی ہو جائے اور پندرہ واڑے کے لئے فصلیں سانٹھی ہو جائیں بعد کو دیکھا جائے گا۔ ضرورت اس وقت ہزاروں روپیہ کی فصل بچانے کی ہے اور منشی جی نے درحقیقت موقع کی نزاکت کے مطابق قرار واقعی نہایت نرمی ہی کے ساتھ شروع کر کے معاملہ کو ہاتھ میں لیا، وہ دل سے کوڑی مل کی فصل بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے خاص مقدم ملائم خاں کو چپکے سے پرکھوتا چمار کے گھر اس کو بلانے بھیجا ملائم خاں اپنی جگہ پر مصری کپاس کا ٹینٹ تھا۔ اگر سہولت کے ساتھ معاملت ہو تو مکھن کی طرح سفید براق، ریشم کی مانند نرم اور باریک ریشے ہی ریشے چمک ہی چمک، لیکن ذرا دباؤ تو بنولے سختی کے ساتھ چبھنے لگیں اور زیادہ دباؤ تو گولیوں کی طرح پھٹ پڑیں۔ ایک مدت سے منشی کمال شیر خاں کا رفیق کار تھا اور بڑے بڑے معرکے بغیر ایک بال بھی ٹوٹے ہوئے بڑی خوب صورتی و خوش اسلوبی

سے ساتھ سر کئے تھے۔ اور اس وقت بہت ہی نازک مسئلہ تھا اگر چار چھ روز گفت و شنید ہی میں گذر جاتے تو کوڑیا کی ہزاروں روپیہ کی تمباکو کی فصل کھیت میں جل کر تباہ ہو جاتی۔ ملائم خاں پرکھوتا کی چھوٹی سی چوپال پر پہنچے۔ اس نے پیوتزہ سے اتر کر پاؤں چھوئے اور ہاتھ اوپر کو ہے گیا۔ اتفاق سے یہاں کئی اور چمار جو اپنے اپنے گھر کے مکھیا تھے اور کئی کئی جوان بیٹیوں کے باپ تھے بیٹھے ہوئے تھے سب کے سب تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ملائم خاں بیٹھے نہیں۔ کھڑے ہی بظاہر روئے سخن پرکھوتا کی جانب رکھتے ہوئے نہایت شیریں آواز اور اپنائیت کے انداز میں کہا "پرکھوتا بھی منشی جی کا حکم ہے کہ کل چماروں میں کا بچہ بچہ کوڑی مل کے تمباکو کے کھیتوں پر پہنچ جائے" اور یہ کہتے ہوئے ایک چھپتی ہوئی نگاہ اور سب چماروں پر بھی ڈالی۔ اس وقت یہ سب چودھری قسم کے چمار اتفاق سے اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ منشی جی کا حکم سن کر اور سب چمار تو خاموش رہے اور چونکہ ملائم خاں براہ راست پرکھوتا سے مخاطب تھا لہٰذا اس نے جواب دیا " ای خان صاحب سب چماروں کے بیے مجھے حکم دیا ہے! کیا میں مبیٹ سرپنچ ہوں"

میٹے سرپنچ نہیں تو منشی جی تمہیں چماروں کا چودھری سمجھتے ہیں، اور پھر بات ٹھیک بھی ہے، سب چمار تمہاری بات مانتے بھی ہیں اور منشی جی تو منشی جی میر صاحب (بندہ علی) بھی یہی سمجھتے ہیں کہ چمار تو چمار بستی بھر، مولا زادے تک تمہاری عزت کرتے ہیں اور آن ——— اور منشی جی بھی۔ اور سرکار میر صاحب بھی ——— وہ اور آل جبھی تو دونوں نے کوڑی مل کی فریاد پر تمہارے پاس مجھے بھیجا ہے"

اور یہ کہتے کہتے ملائم خاں نے پھر اور سب چماروں کی جانب ایک چلتی ہوئی نظر پھینک کر گویا اپنی بات کی تصدیق چاہی اور اس طرح یہ حکم میر صاحب کا نام لگا کر اور بھی زیادہ اہم اور مضبوط بنایا اور پرکھوتا چمار کی سوکھی عزت افزائی کر کے باڑھ پر دھرنا چاہا مگر پرکھوتا چمار نے ملائم خاں کا گہرا جائزہ لیا، اور ذرا خاموش رہ کر بھاری بھرکم انداز میں بولا " تو اگر ایسی بات ہے کہ بڑے مجھے ایسا سمجھتے ہیں تو پھر میں ان نیائی نہیں کر سکتا" اور یہ کہہ کر پر معنی خاموشی اختیار کر لی۔

" ان نیائی کیسی ؟" ملائم خاں نے پرکھوتا کے بشرہ پر گہری سنجیدگی کی نشانیاں شبہ کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا اور اندازہ کیا کہ ان کی خالی خولی رائے بہادری بخشنے والی بات شاید خالی گئی۔

" دیکھو خاں صاحب، ان نیائی ایسی کہ کل صبح سے کام ہوگا مہاجن کی تمباکو پر فصل برباد نہیں ہونے دی جائے گی۔ پھر اجرت کی بات مہاجن اور مزدوروں کے بیچ رہے گی۔ مہاجن پوری اجرت دے بھرپور کام لے"

ملائم خاں نے ذرا بھولا انداز بنا کر کہا " تو کیا مہاجن اجرت نہیں دیتا ہے ؟"

" دیتا ہے مگر وہ اجرت دیتا ہے جو دستور دیہی کی جلد بندوبست میں زمیندار سے پا ٹھہری ہے۔ ڈھائی سو برس پرانی شرح۔ چھ چھٹانک ستو اور ایک کنکری نمک"

" تو ٹھیک تو ہے یہ، کوڑی مل اسی اراضی پر تو کھیتی کر رہا ہے جو زمیندار نے اپنی خود کاشت کے لئے موروثی کاشتکاروں سے قانوناً بیدخل کرائی تھی اور پھر یہ حق تو اس نے زمیندار سے بھرپور رقم دے کر علیحدہ حاصل کیا ہے۔ تو پہلے تو یہ بات ہوئی کہ وہ زمیندار کا جانشین ہے اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ خاص طور پر علیحدہ اور رقم اس مد میں دے کر اس نے منشی جی سے بیگار سائز وغیرہ کا ٹھیکہ بھی لے لیا ہے جس کی منادی منشی جی نے ڈھول پر بھی کرا دی تھی"

دیکھو خان صاحب قانونی بات تو یہ ہے کہ کوڑی مل مہاجن زمیندار کا جانشین نہیں ہے مولازادوں کا جانشین ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ بھینٹ بیگار سائر کا ٹھیکہ اسی سال کی بنی ہوئی چیز سے پہلے ہی سے ہاٹ کا ٹھیکہ ضرور ہوتا چلا آیا ہے اور میر صاحب کے علاقہ بھر کی وزن کشی تلائی کا ٹھیکہ بھی ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے، بھینٹ بیگار سائر بکا نہیں کرتی جتنی چاہے زمیندار لے سکتا ہے۔

ملائم خان اسم بامسمّی پٹھان تھا اور اس کا نام بھی کچھ اور تھا اور یہ لقب اس کو اسم صفت کے طور پر منشی کمال شیر خاں نے دیا تھا۔ اگر دوسرا مقدم ہوتا تو چار کی اس قانونی منطق کا جواب اپنے ادھوڑی کا سنر کے جوتے سے دیتا۔ گر سختی کا تو دکنار یہ بھی موقع نہ تھا گفت شنید میں ایک دو دن گزارا جانے اور کام کی اہمیت اور تنگیٔ وقت کے نازک مسئلہ کے تحت منشی کمال شیر خاں نے ملائم خان کو بھیجا تھا کہ کیسے ہی نہ کیسے مدبراہ کر کے آئیں اور مہاجن کی فصل کی جان بھی بچ جائے اور اپنی بات بھی بنی رہے۔ ملائم خان نے کہا۔ "یہ کوئی شرافت ہے کہ تم خواہ مخواہ کوڑی مل کو دبا رہے ہو اور ہماری حکم عدولی کر رہے ہو، بیگار لینے کا حق ہم نے دیا ہے نقد رقم وصول کر کے مہاجن کو اپنی جگہ مختار کیا ہے، اس طرح مہاجن کو کاہے کو تم ہمارے منہ آ رہے ہو۔"

پرکھوتا اور سب ہی رعایا کاشتکار ملائم خاں کا مخصوص لحاظ کرتے تھے اور ان کے متعلق کچھ ایسی رائے قائم کئے ہوئے تھے کہ جیسے وہ درمیان کے آدمی ہیں اسی لئے ان کے سامنے دل کھول کر بات کرتے تھے، پرکھوتا نے ذرا آزادی کے ساتھ جواب دیا۔

"خان صاحب، یہ بھینٹ بیگار سائر کے ٹھیکے والی بات ہمارے اور میر صاحب کے پرکھوں سے پانچ سو برس میں تو ہوئی نہیں، یہ منشی جی نئی ریت نکال رہے ہیں، زمیندار چاہے جتنی بھینٹ بیگار لے دیں گے اور دیتے ہی چلے آئے ہیں، راضی خوشی، ہمیں سہارا ہے اور زمیندار کو ہمارے پیٹ کی بھوک معلوم ہے۔ اب سال بھر میں دو مرتبہ اصطبل گئو خانہ کی مرمت لپائی پتائی ہے۔ باورچی خانہ بھر کے روزانہ خرچ کے آٹے کی پسائی ہے، من بھر روز پیستے ہیں، چاول دالیں علیحدہ ہیں، پھر گھوڑوں بیلوں گایوں بھینسوں کا راتب دانہ دلتے ہیں، بھلا کون سا کام ہے جو بیگار نہیں دیتے۔ روئی پھر پٹے پر سائیس کرتے ہیں۔ خریف ربیع اناج سے کھتیاں کٹھیاں بخاریاں بھرتے ہیں اور پھر ہمیں اپنے ہاتھوں سے انھیں تمام سال خالی کرتے رہتے ہیں۔ جتنی لکڑی باورچی خانہ میں درکار ہوتی ہے جنگل سے کاٹ کاٹ کر پہنچاتے ہیں۔ خان صاحب ہم کیا نہیں کرتے، مویشی خانہ کا گوبر تھاپتے ہیں کوڑا اٹھا کر گھورے پر ڈالتے ہیں، کون سا کام نہیں کرتے، اور تو اور سارے دیوان خانہ اور حویلی کی جھاڑ پونچھ چمار ہی کرتے ہیں۔ اور سب کاشتکار آ پڑے تو شادی غمی میں روپیہ پیسہ دو دو روپیہ نذر گذار کر چھوٹ جاتے ہیں اور چمار مہینہ میں تیسوں دن بیگار بھرتے ہیں۔ پھر یہ بیگار کا ٹھیکہ کیسا؟"

ملائم خان نے ایک گہری سانس لے کر مدابلہ کے انداز میں کہا۔ "یہ سب ذمہ داریاں بیگار میں بھی لکھی ہوئی ہیں دستور دیہی واجب الارض مشدآمد قدیم کے آئین میں درج ہیں اور یہ بھی لکھی ہوئی ہے کہ زمیندار کی خود کاشت پر کام کرنے کی اُجرت چہ چھٹانک سیر یا چھٹیادی جائے گی۔ اور یہ وہ قانون ہے کہ ہائی کورٹ بھی اس میں قلم نہیں مار سکتا۔"

"وہ آپ کیا بتا رہے ہیں سب جانتے ہیں۔" پرکھوتا نے رکتے ہوئے کہا۔ "خاں صاحب آپ تو پڑھے لکھے جانی کار آدمی ہیں یہ تو بتائیں کہ یہ زمیندار کی خود کاشت ہے یا مہاجن کی کھیتی؟ اور کھیتی بھی نہیں بنئے کا تمباکو کا روزگار" اور پرکھوتا کے خلاف امید منطقی جواب کے نیچے پر قانونی دہلا لگایا۔ "مگر زمیندار نے یہ اراضی مولازادوں سے خود کاشت کرنے کے قانون کے تحت بیدخل کرائی ہے اور مہاجن کو اپنے خود کاشت

کرنے کے حقوق اچھی رقم لے کر عمر بھر کے لئے بلکہ نسلوں پشتوں تک کو منتقل کر دیتے ہیں۔ کسی کو اس سے کیا مطلب زمیندار خود کاشت کر کے نفع اُٹھائے یا یکمشت رقم لے لے، وہی تین بیسی وہی ساٹھ خود کاشت کر کے زمیندار کو رعایا سے ساری رعائتیں اور بیگاریں لینے کا جو حق تھا وہ بھی کوڑی ل کا حق ہو گیا اور اس کا علیحدہ نذرانہ وصول کیا۔

"یہ منشی جی کی دھاندلی ہے" پرکھوتا نے جواب دیا۔ "انھیں کھیتوں پر چار کھیت مزدور پچھلے سالوں تک مولازادوں کا کام کرنے آتے رہے اور خان صاحب سچ بات یہ ہے کہ مزدوری اجرت کے نام سے، مانگ کر، چھڑا کر، کھسوٹ کر، راضی رضا کھا پی کر جیسے بھی ہوتا مولازادوں کی پیداوار میں سے سال تمام میں چہارم کے لگ بھگ پا جاتا تھا۔ اور یہاں تو خالی ہرے ہرے بڑے بڑے تمباکو کے پتے تو دکھائی پڑتے ہیں اور پھر کٹنے کے بعد کھیت میں پڑے ہی پڑے جو ذرا ایک دو دن دھوپ دکھا کر گودام میں جاتی ہے تو اس کے بعد دکھائی پڑنا تو درکنار دور سے سنگھائی بھی نہیں پڑتی کہ کہاں گئی کتنی سرکاری گودام میں پہنچی کتنی چرا چھپا کر رات کو بازار کے تمباکو والے لے گئے۔ آج بھی جا کر دیکھ لیجیے جہاں جہاں جس جس گاؤں میں زمیندار کی خود کاشت ہوتی ہے وہاں گیہوں چنا، ارہر باجرا، مکا، گنا پیدا ہوتا ہے، وہ چھ چھٹانک ستو تو نہ معلوم کہاں رہ جاتے ہیں، خان صاحب بونی کے دن سے کٹائی تک مزدور کا سارا گھر اسی خود کاشت سے پیٹ بھرتا ہے خان صاحب جس دن مزدوروں نے سنا تھا کہ زمیندار کی خود کاشت کے لئے مولازادوں کی زمینیں بے دخل ہو رہی ہیں تو مزدوروں نے بغلیں بجائی تھیں، خود کاشت میں سے تو ہم آدھ بٹائی کھا پڑتے۔ سو مہاجن کا روزگار مسلط کر دیا۔' اگر قانونی بات وہ ہے تو اصل بات یہ ہے۔

"مہاجن بنئے کا کاروبار مسلط ہو یا مالک زمیندار کا حکم یہ تو خدا کا دھرا سر پہ سمجھو، کرنا ہی پڑے گا اور ہو کر ہی رہے گا" ملائم خاں نے نرمی اور اپنائت کے انداز میں جیسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور چند سیکنڈ توقف کر کے چمار کے چہرہ کا ناظر جائزہ لیا اور ردعمل کا اندازہ لگایا اور پھر اسی انداز اور لہجہ میں کلام جاری رکھا۔ "اور بھیا پرکھوتا دیکھو مہاجن بنیا بیچارہ خود تو نہیں چلا آیا، سرکار میر صاحب کا بنایا ہوا باضابطہ نذرانہ کی رقم دے کر جس طرح اس نے اراضی میں موروثی دخیل کاری کے حقوق لئے ہیں اسی طرح سرکار میر صاحب سے اس نے بعینٹ بیگار ساٹر کا ٹھیکہ لیا ہے۔" اور پھر توقف کیا۔ اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "اب تم یوں سمجھو کہ اس گھڑی میں جو تمھیں حکم دے رہا ہوں تو کیا یہ اراضی میری ہوتی ہے، یا منشی کمال شیر خاں کے باپ کی جاگیر ہے، جو کچھ حکم ہے وہ سرکار میر صاحب کا ہے اور انہوں نے ہی بنئے کو اپنا حق دیا ہے۔" اور پھر ملائم خاں نے ایک لمبا توقف کر کے جواب کا انتظار کرنے کا انداز بنایا۔

پرکھوتا بڑے انہماک سے سن رہا تھا ملائم خاں کے لمبے توقف پر جواب دیا۔ "دیکھو خاں صاحب ملائم خاں تم سمجھ دار اور ڈھنگ کے آدمی ہو، تو اتنی کہہ سن بھی لیتے ہیں ہم لوگ، کوئی اور مقدم ہوتا تو ہماری اتنی مجال بھی نہ تھی کہ منہ سے آواز بھی نکالتے۔ سب رعایا تمھیں بیچ کا آدمی اور پنچ سمجھتی ہے۔ ہمارے گھروں میں کٹھیاں بجا بیاں تو بھری نہیں ہیں اور خاں صاحب ہمارے ہی کیا کسی موروثی دخیلکار کے گھر میں بھی فصل بھر کھانے کو نہیں ہوتا، ساری رعایا مزدور ہو یا موروثی دخیلکار روز کا کنواں کھودنا، روز کا پانی پینا۔ پھر تم یہ تو بتاؤ کہ چھ چھٹانک ستوؤں میں کیا مزدور خود کھائے گا کیا بچوں کو کھلائے گا۔ یہ چھ چھٹانک خوراک والی بات جو کتاب میں لکھی ہے آڑھے اور زمیندار کی خود کاشت میں چل سکتی ہے، جہاں بیج سے لے کر پیداوار ہونے تک اور کھیتوں سے لے کر کھلیان اور بنجاریوں تک مزدور اور اس کے

سب نپے کچی ہری، پکی تیار فصل سے بارہ مہینہ کیسے ہی نہ کیسے پیٹ بھرتے ہیں اور ڈیڑھ پاؤ ستو تو چادر کی گانٹھ ہی میں بندھے نہ معلوم کہاں رہ جاتے ہیں — اب بھی ضلع بھر میں جہاں جہاں چھوٹے بڑے زمیندار خود کاشت کرتے ہیں جا کر دیکھ لو مزدور آدھ بٹائی کھا رہے ہیں، گھر گھر چین کی بنسی بجتی ہے۔ زمیندار کے سنر میں پیچھے جاتا ہے، مزدور پہلے بھر پیٹ کھا لیتا ہے، قانون کی کتاب میں پرکھوں نے یہ بھی ان لوگوں کی پرورش کا ذریعہ رکھا تھا جن کے پاس موروثی زمینیں نہیں تھیں کہ اس طرح زمیندار کی خود کاشت سے ان کا پیٹ بھرا رہے اور مزدور گاؤں میں بنے رہیں۔ خاں صاحب اس تمباکو کے روزگار میں چھ چھٹانک ستو کی مٹھی کے سوا کچھ اور بھی سہارا ہے، آدمی اُن کا کیڑا ہے، مٹی کے ڈھیلے اور تمباکو کے ہرے پتوں سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا، اچھا مانا، مزدور بھیج دیئے آپ نے لاٹھی کی نوک پر ہنکا کر، پھر پہلے تو مٹھی بھر ستو کھا کر کام کیسے ہوگا، گھر میں بچے بھوکوں مریں گے: ایک دن کے بعد دوسرے دن کام پر کون آ سکے گا، آدمی کے پیٹ میں پاؤں ہوتے ہیں، ملائم خاں نے حلق سے کھنکھارنے کی آواز نکالی اور بولا " اب یہ ہم کیا جانیں، پھر بات یہ بھی ہے کہ کوڑی مل مہاجن نے جھولی بھر رقم آقا کو نذرانہ دے کر یہ حق خریدا ہے، وہ تو وصول کرے گا اور بیاج خور بنیا ایک کے تین بنائے گا، اور بھیڑ تو جہاں جائے گی منڈے گی، تم لوگ ٹھہرے رعیت، بھرو بھگتو جیسے بھی ہو۔ وہ جو کسی نے کہا ہے " رہو گے تو قاضی کا سہو گے"۔ پرکھوتا نے ذرا مضبوط ہو کر جواب دیا " یہ سرکار میر صاحب کا کام نہیں ہے، یہ منشی جی کمال شیر خاں کی اپنی اُپج ہے اور بات چلنے والی نہیں ہے دق کرنے والی ہے "

" اچھا تو پھر تم چلو اور منشی کمال شیر خاں سے ہی دو بدو بات کر لو"

" کاہے کے لئے ہم منشی کمال شیر خاں سے دو بدو بات کریں، ان کی خود کاشت ہے؟ نہ ان کی نہ سرکار میر صاحب کی۔ کھیتی ہے کوڑی مل مہاجن کی ہمیں اسی سے دو بدو بات کرنے دیں، منشی جی درمیان سے ہٹ جائیں۔ پھر یہ اوکھیتی بھی تو نہیں ہے، بنئے نے بھی کھیتوں میں تمباکو کا روزگار پھیلایا ہے، اس سے ویسی ہی بات ہوگی جیسی وہ رقم رولے گا گیہوں چنا جو جوار ہوتی تو ویسی بات ہوتی۔ بھٹیارے بازار شہر میں تمباکو کی تجارت کرتے ہیں کوڑی مل کھیتوں میں کاروبار کرتا ہے۔ ایک کے ایک سو ایک بناتا ہے۔ منشی جی ہمارے پیٹ پر لات مار کر اس کی توند کیوں بھرنا چاہتے ہیں"۔ پرکھوتا کی لیڈری پر ملائم خاں جیسے منڈے آدمی کو بھی جھرجھری سی آ گئی لیکن پی گیا ہونٹھوں پہ بار بار ہاتھ پھیرے اور بار بار تلخ گھونٹ لے ——— اور پھر سنبھل کر ذرا زہریلے تیوروں مگر قطعیت کا انداز لئے ہوئے لہجہ اور پست آوازیں بولا " دیکھو جی پرکھوتا، ہمیں سب کو سرکار میر صاحب تک کو پتہ ہے کہ ——— پورے گاؤں کی، سارے مزدوروں کی، میر صاحب بندہ علی کے سارے علاقہ کی چودھرائت کی پگڑی تم نے اپنے سر پہ سجالی ہے، بڑے قانون ہو! پورے بیرسٹر! ۔ لمبی بات کرنے والے، شرافت کے ساتھ پھر کہتا ہوں۔ مان جاؤ " زہریلی خوشامد کا طنزیہ انداز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

" وہ مہاجن بدنصیب پران چھوڑ جائے گا بھیّا، اس کم نصیب کی ہزاروں کی فصل اسی اٹھوارے میں جل کر راکھ ہو جائے گی، اتنا مت دباؤ کسی کو مجبور سمجھ کر، اندھیر ہے! تم لوگوں نے اس کی فصل پیسے باہر کے لاتے ہوئے مزدور بھی بھگا دیئے! ذرا خوفِ خدا کرو۔ یہ عمل داری قائم کر لی ہے! . . . . ایں! بھلا دیکھو تو —" پھر غصہ ضبط کر کے سلسلہ کلام جاری رکھا " پھر کہتا ہوں کہ تم چل کر منشی جی سے بات کر لو چلو میں تمہارے ہی سی کہوں . . . . . "

پرکھوتا نے ملائم خاں کی بات کاٹ دی " وہ خان صاحب ہم نے آپ سے تو بات کر لی، وہ یوں کہ آپ ہمارے اپنے آدمی

ہیں، پھر یہ کہ آپ آئے تھے اور بات چھیڑ دی تھی کہ منشی کمال شیر خاں ہوں یا سرکار میر صاحب، ہم کوڑیا مہاجن کا معاملہ ہیں ان سے جا کر کیوں طے کریں؟ آپ ہمارے پاس کوڑیا مہاجن کو بھیجے مال اس کا ہے، محنت ہماری ہے۔ کھل کر دو بدو بات طے کرے۔"

لیکن منشی جی بلائیں گے تو تم کیا چیز ہو، اس علاقہ میں کوئی بڑا سے بڑا جیت ہوگا اس کو بھی جانا پڑے گا، وہ سرکار میر صاحب کے مختار عام عام ہیں اور ان کا بلانا سرکار کا بلانا ہے۔"

حاتم خاں کے تیور بھانپ کر چمار ڈھیلا پڑا۔" کیوں نہیں، ہزار دفعہ جائیں گے۔ سرکار کی رعایا جو ہیں۔ اور سرکار ہمارے مائی باپ ہیں اور اولاد بچہ ماں باپ سے رو کر پیٹ کی فریاد کرتا ہے اور منشی جی یہ ہماری بھوکی انتڑیوں کی فریاد سرکار اور منشی جی تک آپ ہی پہنچا دیں۔ مجھے اگوا بنا کر نہ لے جائیں اور ہاں بس یہ پوچھ لیں کہ بھوکے کام کیسے کریں گے۔ وہ تو کھیت پیٹ بھرتا ہے اور جب کھیت میں تمباکو ہے تو مہاجن کو بھرنا ہی پڑے گا، نہیں تو کام نہیں ہوگا، ہم بھی مر جائیں گے اور پھر تمباکو بھی سوکھ جائے گی۔ اور آپ تو جانتے ہیں، میری تو کچھ نہیں، ایک چماری اور ایک بیٹی فقط دو دم لگے ہیں۔ تینوں کے تینوں ہاتھ پاؤں چلا کر پیٹ بھرنے والے، مفت کی چودھراہٹ میرے سر پڑ گئی ہے، پھر یہ تو بتائیں کہ ان مزدوروں کا کیا بنے گا جن کے ساتھ آٹھ آٹھ سات سات پیٹ لگے ہیں؟ انھیں تو روزانہ پانچ سیر آٹا درکار ہے۔ ایں؟ ڈیڑھ پاؤ چبینے میں کیا اس بدنصیب کا پیٹ بھرے گا اور کیا بچوں کا، اور پھر وہی بات بننے کا کام تو ایک دن صبح سے شام تک بھی نہ چل سکے گا۔"

چلو ٹھیک ہے منشی سے تم کو کمانے بھرے کے لئے بیاج پر نقد یا اناج جیسا بھی چاہو گے پیشگی دلوا دیں گے۔ تم اس وقت اس بدنصیب کا کام تو چلتا کر دو۔"

چمار نے زہر خند ہنسی ہنسی۔" ارے خان صاحب بیاج پر قرضہ! کس برتے پہ تتا پانی۔ کاہے سے ادا ہوگا؟ ایں، ننگے کھیت مزدور بیاج پر قرض اٹھائیں گے!"

تمہارا اُس کا لین دین چلتا رہے گا اور بھئی گاؤں میں تو کوئی ہو موروثی دخیلکار کھیت مزدور کسی کے پاس سوا ہاتھ پاؤں کے اور کوئی دھن دولت نہیں ہوتی۔"

" تو خانصاحب ساری عمر کو ہمارے ہاتھ پاؤں مہاجن کے پاس گروی پڑ جائیں گے اور مزدوری کاہے کو ہم اس کے غلام ہو جائیں گے ہماری پیڑھیاں بھی پچھلا کھایا ادا نہ کر سکیں گی۔ اور موروثی دخیلکاروں کی اور ہم کھیت مزدوروں کی کیا برابری، اب جب سے یہ تمباکو کا روزگار بستی میں پھیلا ہے موروثی دخیلکار بیٹھے منہ مانگا لگان پیشگی دے کر رئیس بنا کر گھر میں جھال دیتے ہیں کوئی ہاتھ بھی نہیں ہلاتا کھانے کے لئے ہاٹ بازار سے فصل کے فصل سال تمام کے خرچ کا غلہ خرید کر گھر میں بھر کے رکھ بیٹھتے ہیں اور پورے سال مزے سے چوپالوں میں بیٹھے ڈھول بجاتے گیت گاتے رہتے ہیں، ان کے کھیتوں پہ جو چنا ہوتا تھا اور باجرا جوار ہوتا تھا سو جو مزدوروں کو آدھے تہائی پیٹ مل جاتی تھی وہ بھی گئی۔"

یار بھاگ، مانو نہ ثنائی، میرے ساتھ منشی کمال شیر خاں کے سامنے چلو۔ اور یہ بھی میری شرافت ہے۔ یہ اتنی باتیں ملا رہے ہو، ان کے سامنے بھیڑ کی طرح "بھیں" بھی نہ نکال سکو گے۔

"ہم نے آپ سے کہہ دیا جو کہنا تھا وہاں جا کر اب اور کیا کہنا ہے۔" چمار نے کہا۔
"نہیں میں تو تم کو سے کر جاؤں گا منشی جی کے روبرو پہنچا کر دم لوں گا۔" ملازم خاں کا حلیہ ہی بدل گیا، جیسے اس کی آنکھوں میں سے ایک جوڑی اور سا تھیں منشی کمال شیر خاں والی مخصوص باہر کو آ کر رخساروں پر لٹک پڑیں۔ گرج کر کہا" میں تجھیں لینے آیا تھا، باتیں کرنے کرنے نہیں۔ اور لے کر جاؤں گا۔" چمار لرز کر سنبھلا اور یہ کہتا ہوا زنانہ مکان میں چلا کہ" ہم تو نہیں جائیں گے خان صاحب"۔ اور سب چمار بھی چوپال پر سے بھاگ پڑے اور ملازم خاں نے پرکھوتا کا گھر کے اندر کو غراتے ہوئے تعاقب کیا۔ "میں تو لے کر جاؤں گا ابھی۔"

ملازم خاں توی ہیکل پٹھان تو نہ تھا۔ مگر حکومت کی قوت سے بھرپور طاقت کی علامت، شدید کا ضعف یوں بھی راجپوت کی قوت کو بڑھاتا رہتا ہے۔ منشی کمال شیر خاں کا خاص فرستادہ، بندہ علی کا گماشتہ۔ طبعاً شریف النفس بھی تھا مگر کپاس کے اندر بنولے گرا پ کی کوبیوں کی طرح پھوٹ کر نکل پڑے۔ اندر پہنچ کر ایک مرتبہ پھر ضبط کرنے کی کوشش کی اور مخصوص تیوروں سے سوال کیا۔" تو پھر منشی جی سے میں یہی جا کر کہہ دوں؟"
چمار نے راجپوتی تیوروں سے جواب دیا۔" منشی جی کس ساتے پر مجھ کو بلاتے ہیں، بیگھہ بھر زمین جوتتا نہیں، قرضہ کا ڈھتا نہیں، وہاں گے تو یہ مٹھی بھر پھونس ہے چھوڑ کر کہیں اور جابسوں گا۔ ننگا ہوں، دھن دولت نہیں، مال مویشی نہیں، بس اپنے ہاتھ پاؤں میں جہاں چلاؤں گا پیٹ بھرے گا۔"
تو جا کر یہی کہہ دوں کہ ننگ پن پر اکڑتا ہے۔"
"ہاں جو چاہو سو کہہ دو۔ ننگا نہیں تو کیا دھن دولت، مال مویشی، دھرتی مرروثی ہے میرے پاس؟"
اور منشی کمال شیر خاں سے ملازم خاں نے من و عن یہی آخری جملے بیان کر دیئے انہوں نے کہا" یار ملازم خاں ایسی بھی کیا نرمی کہ میرے پاس اس دو کوڑی کے آدمی کا چیلنج لے کر آئے ہو، لاحول ولاقوۃ لاؤ پکڑ کر سالے کو کہتا ہے۔ ننگا ہے تو بس الف ننگا ہی کر کے لاؤ بیچ کی گلی سے اور میرے سامنے منہ میں سے زبان باہر کھینچ کر تھپیاں لگا دو زبان پر ساری قانون گوئی نکال دو۔" اور ملازم خاں نے چلتے ہوئے لاٹھی اٹھائی تو منشی کمال شیر خاں نے کہا" ارے رے رے یہ کس پر توپ باندھ کر جا رہے ہو، چٹیا پر! رکھو لاٹھی، رسی لے کر جاؤ اور کمر میں باندھ کر ننگا گھسیٹتے ہوئے لاؤ۔ وہیں گھر کے اندر سے۔" اور ملازم خاں نے لاٹھی رکھ کر رسی اٹھا لی اور چل پڑا۔
بے تال بے مردنگ بولے تو چلا گیا شامت کا مارا، اور وہ بھی کم بخت یوں زیادہ بول گیا کہ ملازم خاں جیسے تلنے ہوئے حلیم الطبع آدمی سے مخاطب تھا، مگر ملازم خاں کے سامنے سے ہٹتے ہی انفعال کا حملہ ہوا۔ چمار کے نتھنوں میں جیسے دور سے ہوا کے ساتھ کڑوے تیل میں مرچوں کے بگھار کی دھانس سے چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں وہ آہستہ سے کھانسا ایک لمبی سانس لی، تو خطرہ کی چراند سنگھائی پڑی۔ بارود کی مہک لئے ہوئے اور کان پر گولی کا زناٹا سنے آہوئے رم دیدہ کے انداز میں اس نے اپنے دائیں بائیں وحشت میں بھری نگاہیں ڈالیں، اس سنسناٹے میں چھٹی حس نے کان میں آواز دی، خیریت نہیں، بس ناک کان سلامت سامان بچا کر دو چار دن کو کدھر ہی مل جاؤ، بہت زیادہ بول گئے اب جلدی کرو، نو، دو گیارہ ہو ورنہ کیا کیا؟ ..... اور دماغ کے اندر سے عقل کا کمپوٹر بولا" خواہ مخواہ کی چودھراہٹ، تم کوئی پیکیج چودھری

تو نہیں، فرق اتنا ہے کہ اُن چماروں سے تمہارے اور پیٹ کی ذمہ داریاں کم ہیں، تھوڑی سے نوکری ہے، بڑھ بڑھ کے باتیں مارتے ہو۔ بات ویسے ہی بہت بڑھ گئی تھی، دوسرے گاؤں سے جو مزدور آتے انھیں بھی کام پر سے بھگا دیا۔ زمیندار اور مہاجن دونوں بہت خار یدہ ہیں، مقدم کو ابھی تم نے بلا وجہ خستہ کر دیا۔ بڑا بیگی مسل واری قائم کر رکھی ہے! اندھا دھند ہے! تم نے آپوں آپ یہ سرداری کی پگڑی سنبھال لی ہے! کہیں باپ کی پوٹ نہ بن جائے، سر پہ! اور منشی کمال شیر خاں جیسے تاریخ ساز اور پُر جبروت سے مقابلہ اور معاملت!— جس نے بڑے بڑے علاقے برباد کر دیئے، بھرے گھر ویران کر دیئے، تم بچارے کتنے بیچ میں ہو؟ کیا بدی، کیا بدی کا شہدہ!! اور اس کے اندر سے کسی پیش پا افتادہ خطرہ کی گھنٹی سی بجی ایک جھرجھری آئی بیوی کی آواز پہ چونکا تو چماری آٹا گوندھ کر روٹی پکانے کی تیاری کر چکی تھی، توا چولہے پر رکھ دیا تھا، کام کرتے ہوئے بول رہی تھی ٹن ٹن کر رہی تھی۔ "بھلا تم اگوا کیوں بن گئے۔ ساری بستی میں۔ بولیں تو وہ چمار بولیں جن کے پانچ سات جوان بیٹے کام پر جاتے ہیں اور ایک ایک کے دم سے پانچ یا پانچ سات سات پیٹ کھانے والے لگے ہیں۔ ہم ڈھائی پیٹ کھانے والے اور ڈھائی سے ڈھائی ہاتھ پاؤں چلا کر کمانے والے۔ کاہے کے لیے بہت سے کی ہوں کریں! ایں؟۔ ڈیڑھ ڈیڑھ جینے ستو میں بھی ہمارا پیٹ بھر ہی جائے گا، دھن دولت، کھیت مویشی جڑتے نہیں، محل ماڑی بنتے نہیں روز کا کنواں کھودنا روز کا پانی پینا۔ جنھیں بہت سا چاہیئے وہ آگے بڑھ بڑھ کر بولیں۔" بیوی کا لیکچر سنتے ہوئے پتہ نہیں کہ طنزیہ اختلاف کرتے ہوئے یا درحقیقت اس کی بات سے متفق ہو کر اسے بھرتا جاتا تھا اور جلدی جلدی فرار ہو جانے کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ ستوؤں کی پوٹلی نمک کمر سے باندھ چکا تھا سر پہ مونڈیسا باندھ کر گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ چماری نے لجاتی موٹی آواز میں کہا "دو نوالے بس دو نوالے کھاتے جاؤ، پتہ نہیں کہ کب پالے پڑے، دس کوس کی راہ ہے، رستہ میں پانی کا سہارا ہو جائے گا۔" اور لڑکی سے کہا کہ تو چٹنی پیس لے اور خود جلدی جلدی توے پر روٹی ڈالی، اور چمار نے چولہے آگے پہلی گرم روٹی کا پہلا نوالہ توڑ کر اور سل پر چٹنی سے چھوا کر منہ میں لیا ہی تھا کہ یکدم ملازم خاں صحن میں آ دھمکا، ہاتھ میں باگ ڈور لئے اور بغیر ایک لفظ بھی منہ سے نکالے خالی ایک غوں کے ساتھ تیندوئے کے انداز میں چمار پہ آ پڑا اور باندھنے کے لئے رسی سنبھالی، جہاں دیدہ چمار نے اسی سرعت کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا، اور حواس اور آواز دونوں ہی سنبھال کر نہایت ہی متفق اور ذرا بھاری طمطراق سے پُر تعاون انداز میں بات کو ہلکا سا کرتے ہوئے کہا: "چلتا ہوں! ٹھہرو! اس کی کیا ضرورت ہے!؟ میں آگے آگے چلتا ہوں، آپ سے پہلے پہنچوں گا سرکار میں اور خاں صاحب نے اس کی استدعا کا کوئی اثر نہ لیا اور پھندا بنایا۔" باندھتے کیوں ہو خاں صاحب میں تمہارے آگے آگے چلوں گا، رسی الگ کر دو چلونا۔" اور پھر بھی خاں صاحب کو رسی سنبھالتے دیکھ کر ذرا پنچایتی سمجھانے والے اپنائیت کے لہجہ میں کہتا رہا: "تو میں چل تو رہا ہوں! بھاگ تھوڑی جاؤں گا! ٹھہرو خاں صاحب! تم سے پہلے منشی جی کے پاس پہنچوں گا۔ باندھتے کیوں ہو؟" اور جب پھر بھی رستی بڑھائی تو پیچھے ہٹ گیا۔ "ارے رے رے!! کوئی چور ڈاکو تو نہیں خاں صاحب بھاگ کر کہاں جاؤں گا تمہاری رعایا— چہ چہ چہ!— کیا کرتے ہو، ٹھہرو جی! پھر میں چل تو رہا ہوں! چلو چلو چلونا!" لیکن خاں صاحب کے کان میں جیسے آواز ہی نہ گئی ہو۔ "او آں! تاہیں ناہیں" اور غوں غاں، غوں غوں۔ بس خاں صاحب گڈی چڑھا کر مشکیں کسنے کے لئے اس سے چمٹ ہی تو گئے۔ چمار پہلے تو منتر سے کاٹ کاٹ کر بچتا رہا، چمٹنے کی صورت میں پہلے تو اس نے ہاتھ بڑھا بڑھا کر علیحدہ کرنے کی کوشش کی اور آخر تا بکے۔

زور آزمائی ہوتی لیکن چمار جسمانی طاقت کے اعتبار سے خان صاحب سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اگر کشتی کا اکھاڑہ ہوتا تو پہلی پکڑ ہی میں زیر کر لیتا۔ مگر چٹان سے بھینسے کے فولادی اعصاب ہلکے پھلکے تیندوے کی عزم کے ساتھ شل ہو کر رہ جاتے ہیں، اور برچھا سے سینگ اور گرزِ گراں سر اور چٹان سی گردن، بیچارے کے سب ہتھیار گرد ہو کر رہ جاتے ہیں، اور یہ طاقت نہیں جبلت سے متعلق معاملہ ہے، مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بھینسا اپنی جبلت اور شیر کی طاقت دونوں سے ٹکرا جاتا ہے اور خال خال ایسی صورت میں شیر کو کچل کر پھینک دیتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ اپنے بھی چیتھڑے اڑ جائیں۔ اور مدافعت میں طاقت کے مظاہرہ کا احساس کر کے خان صاحب سے شیر کی سی دہاڑ نکالی اور چمار کو بھرپور دبا لیا، اور دارو گیر کی اس پیہم جدوجہد میں چمار کی طرح چماری بھی چیخ چیخ کر وہی بات کہتی رہی تھی کہ "باندھتے کاہے کو ہو؟" مگر خاں صاحب مانتے کیسے انھیں تو باندھنے کے بعد بے بس کر کے دھوتی تہبند میں آتارکر ننگا کرنا تھا اور تب بیچ والی گلی سے نمائش کر کے منشی جی روبرو پیش کرنا تھا۔ اور شوہر کو ظالم کی گرفت سے میں بے بس محسوس کر کے شدہ کی عورت کے گدلے پانی کی جوہڑ میں بھی باڑھ آگئی! جسمانی طور پر کسی تگڑے چمار سے کم تگڑی نہ تھی، شوہر کے ساتھ خود بھی گتھم گتھا ہو گئی۔ نوجوان بیٹی خوف کے مارے گھگھیا پڑی، بدحواسی میں ماں اور باپ دونوں کو خان صاحب سے علیحدہ کرنے کے لیے ماں باپ کے کپڑے کھینچنے لگی، اور اپنی بساط کے مطابق بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگی اور رو رو کر گھگھیا گھگھیا کر خان صاحب سے رحم کی بھیک طلب کرتی رہی، اس قسم جیسے رستخیز میں ظاہر بات ہے کہ گرج، چیخ، ہائے وائے بس بس کے علاوہ جسمانی طاقت کا بھرپور استعمال ہوتا۔ خان صاحب کو پہلے تو چمار کی دو دو باتش کی کوششوں میں دھکے لگے جس میں وہ ایک مرتبہ پیچھے پڑی ہوئی پیڑھی میں الجھ کر گر بھی پڑے اور یہاں سے "مزاحمت بیکار سرکار" کی عملی صورت پیدا ہوئی اور "دھینگا مشتی" خواہ حملہ کی ہو یا مدافعت کی اس میں پہل پان تو بٹا نہیں کرتے چارہ چماری دونوں سے جسمانی طاقت میں کہیں زیادہ گھٹے ہوتے کا اندازہ کر کے خان صاحب نے خان بہادری، اور للکار دھونس ڈپٹ سے زیادہ کام لینا چاہا، مگر جذبات سے مغلوب شدہ دل پر منوجی کا چڑھایا ہوا ازلی جادو بھی اس وقت چل نہ سکا اور خانصاحب اروگیر کی جدوجہد میں بیچ میدا شکست کھا گئے اور ظاہر ہے جو کچھ ہوا اس کو ٹکسالی زبان میں "ہاتھا پائی" اور مار پیٹ ہی کہا جائے گا لیکن دراصل خانصاحب کی خاصی پٹائی ہو گئی جبھی چمار کی گلو خلاصی ہو سکی، اور چمار چماری تو ہوتے ہی اس لیے ہیں ان کی کیا گنتی شمار مگر خاں صاحب بہادر کی رات گھونسوں اور دو دن چپتوں سے جو مرمت ہوئی وہ سنگینیت کے اعتبار سے علاقہ بھر میں پہلی اور بہت بڑی واردات تھی اور خان صاحب جان چھڑا کر اور رسی وہیں پڑی چھوڑ کر اپنی لاٹھی اور خاص کمک لانے کے لیے بھاگے، اور بھاگ کر جو پلٹے تو ایک پکھوتا اور اس کی جورو کیا دنیا بھر کے چماروں کو نیست و نابود کر دینے کے قابل کمک کے ساتھ لئے، بگولہ کی طرح سناتے اور سیلاب کی مانند لپکتے فتنۂ محشر جلو میں اور قیامتِ کبریٰ بنے جنگ آزما خان، شہباز خان، گولی مار خان وغیرہ وغیرہ اسم بامسمٰی القاب کے ڈیڑھ دو درجن ساتھیوں کی رہنمائی کرتے ہوئے، سب کے سب آدم خور شیر کے تیوروں میں ڈوبے ہوئے اور ہم کا عجیب ترین پہلو یہ تھا کہ اس جگہ پر چارج لینے اور کام سنبھالنے کے بعد منشی کمال شیر خاں آج پہلی مرتبہ بنفسِ نفیس میدان میں نظر آئے تھے اس سے بیشتر آج تک اقبال کام کرتا رہا تھا لیکن اپنی پارٹی سے پچاس گز پیچھے گلی کے موڑ پر کھڑے تھے ہاتھ میں صرف فتح پوری ساخت کا گھوڑے کا سخت کوڑا تھا۔ بشرہ پر بلا کا اطمینان اور شعلہ سال آنکھوں میں تجسس اور غیض کی ملی جلی نشانیاں تھیں۔

دارو گیر اور شکست و بست کسی نہ کسی شکل میں شخصی ہو یا فوجی حتیٰ کہ جمہوری مگر بالادست طبقہ کا ذریعۂ قیام اور طرزِ معاملت رہا ہے۔ پکڑ دھکڑ، جوتے کاری گوشمالی راعی اور رعایا، سرمایہ دار محنت کش طبقہ کے درمیان آئے ان کے امور ہیں اور منشی کمال شیر خاں کی تعیناتی سے قبل بندہ علی کے یہاں بھی حسب ضرورت چلنے ہی رہا کرتے تھے۔ لیکن منشی جی اپنے ساتھ ملک الموت والی ہیبت لے کر نازل ہوئے تھے، اور یہاں نزلہ بن کر نہیں فالج کی طرح کاشت کاروں کے سب سے زیادہ مضبوط گروہ موروثی دخیلکاروں پر گرے تھے اور وہ زمین پر بچا کھانڈا چلایا تھا کہ ایک ہی وار میں زندگی دنیا تک جینے والے موت کے گھاٹ اتار دیئے تھے۔ موروثی دخیلکاروں کی سند ریاست کی ملکیت سے بھی زیادہ قدیم تھی۔ شہنشاہ اکبر نے جب پہلا بندوبست اراضی کر دیا اس وقت ان کے مورث اس اراضی پر کھیتی کرتے پائے گئے تھے۔ ویسے میر صاحبان اپنا تعلق اس اراضی سے سید علاؤالدین کے دور سے ثابت کرتے تھے لیکن ان کے پاس اسناد اور فرمان صرف شاہجہانی دور کے تھے جن کی بنا پر ۱۸۵۷ء کے قبضہ کے بعد انگریز نے انہیں قابض اور مالک تسلیم کیا تھا۔ اور منشی کمال شیر خاں کے ذہن میں یہ تمام چیزیں تھیں، حالانکہ وہ ارض پر کہیں چپہ بھر اراضی پر ان کے حقوق پیدا نہ ہوئے تھے لیکن کاشتکار اور موروثی اراضی کے قبضہ کے رشتہ کو خوب پہچانتے تھے اور موروثی کاشتہ اراضی سے بیدخل ہونے کے بعد کاشتکار کی نفسیات اور ردعمل کے بڑے گہرے شناسا تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ان کے آدمی چار کو پکڑ کر لانے کے لئے لٹھ اور برچھے لے کر چلے تو ان کی چھٹی حس نے مبہم سے اندیشہ کی بو سونگھی۔ "کہیں بے دخل شدہ مولازادوں کا جتھہ چاروں کی پشت پناہی کے لئے تیار نہ ہو جائے" ـــ اور پھر اندر سے دوسری آواز آئی۔ "کل کی بات ہے زہر خورانی کے کیس میں دونوں ہی دوش بدوش تھے۔" اور جب تو آشنا خار بھی نہ تھا، اب تو یہ پشتینی اراضی سے بے دخل ہو کر دانہ دانہ کو محتاج ہیں۔" دخیلکار سے ادنیٰ کھیت مزدور ہو گئے ہیں۔ چٹیل سانپ ہیں، پیٹ کی لات پر بس پیٹ مسوسے بیٹھے ہیں اور جہاندیدہ منشی جی اپنے آدمیوں کے روانہ ہونے کے اک دو منٹ کے اندر ہی اندر تقریباً پیچھے ہی پیچھے گدی پر سے اٹھ کر چل پڑے، نہایت خراماں خراماں بڑے اطمینان کی چال چلتے ہوئے۔ کوڑا آہستہ آہستہ لہراتے، ویسے ان کے ذہن میں مدمقابل کیڑے مکوڑے تھے لیکن یہ سمجھ کر کہ کہیں کوئی خاص مزاحمت مقابلہ کی نوبت آ جائے تو پیشتر اس کے کہ اپنے آدمی لٹھ برچھے چلائیں وہ دور ہی سے ایک شیر کی سی دھاڑ نکال کر ہرنیوں کے گلہ کی طرح منتشر کر دیں اور ایسے بارہا تجربے تھے۔ اور جب وہ چمر گوٹے کی ملیی گلی کے اس کنارے پر تھے تو سو ڈیڑھ گز کے فاصلہ یا ان کے فاصلہ پر ان کے آدمی چار کے دروازہ پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے شیر کی غوں میں لپٹی ہوئی آواز نکالی "لاؤ باہر... کو ننگا کر کے باندھ کر" اور خلافِ امید پیچھے سے ایسے بہادر اور ہیبت و حکومت سردار کی آواز سن کر اس کمینی کا فورس پورے ایک ڈویژن کا ہو گیا اور گھر میں داخل ہوتے وقت سب نے شیر کے حملہ والی للکار دی اور اس کے ساتھ ہی منشی جی پھر شکار پر چلے ہوئے شیر کی طرح گرجے "لاؤ باہر... کو الف ننگا کر کے کمر اکمر میں رسی ڈال کر ذرا ہم بھی دیکھیں کتنا ننگا ہے......"

اور "میں تو ننگا ہوں، میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے!" والی بات، کمزور کا ظلم زبردست کے اوپر منشی جی اس کی نفسیات سے خوب واقف تھے اور اس سے بارہا دو چار ہو چکے تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ آدمی کو جسمانی طور پر زبردستی روز روشن ننگا میں کھڑا کر دینے کے مفلوج کن ردعمل اور اثرات کے بھی خوب شناسا تھے۔ چرب زبانوں کی زبان باہر کھینچ کر تمیاں بھی لگوائی تھیں۔ منہ میں

پیشاب کا نسخہ بھی نہایت مجرب اور تیر بہدف ثابت ہوا تھا اور بارہا اس طرح بھی منہ بند کئے تھے کہ پھر کبھی آواز سنائی ہی نہ دی لیکن جس نے اپنے آپ کو ننگا کہہ کر اپنی کمزوری کو طاقت بناکر دھونس دی تھی اس کو تو ہمیشہ روز روشن میں الف ننگا کرا کر ہی ذہنی اور جسمانی طور پہ زیر کیا تھا۔ اور پھر ایک بھی جسم پر چھوڑے دن دہاڑے صرف عریانی میں جلوس نکال کر جیسے جسم کا بند بند توڑ دیا تھا۔ مگر گھر کے اندر تو سناٹا تھا جیسے ہی ملائم خاں تو اُدھر بھاگا تھا، چمار چماری شدید طوفان کی چڑھائی کے اندیشے میں اِدھر تو دو گیارہ ہو گئے تھے۔ البتہ نوخیز معصوم بیٹی کو گھر میں چھوڑ گئے تھے کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ ایسے موقع پہ بالعموم زمیندار کے آدمی غصہ میں پہلا اقدام گھر کو آگ لگا دینے کا کیا کرتے ہیں اور اگر آگ لگانے کا موقع نہ ہو تو کچی دیواریں زمین بوس کرا دیتے ہیں اور پھر گھسیٹ کر بستی سے باہر گھورے پہ ڈلوا دیتے ہیں، اثاث البیت جو کچھ ہوتا ہے لٹوا دیتے ہیں، اور اس ضمن میں ایسا وقت آ پڑنے پر کمزور ترین مخلوق بیٹی کو بہترین محافظ تصور کرتے ہوئے گھر میں چھوڑ گئے تھے چونکہ یہ مضبوط اور راسخ دیہاتی روایت تھی کہ گاؤں کی بیٹی سب کی بیٹی ہوتی ہے اور سارے گاؤں کی کمزوری ہوتی ہے اور پاک امانت تصور کی جاتی ہے، لہٰذا کسی بھی قسم کے ظلم اور انتقام سے مستثنیٰ اور معصوم تصور کی جاتی ہے اور پھر اس با تھا پائی میں اس کا رول خاص طور پر غیر جانبدار اور بیچ بچاؤ والا رہا تھا جس کا ملائم خاں کو بھی دھینگا مشتی میں اندازہ ہو رہا تھا کہ ماں باپ کو کھینچ کھینچ کر باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے روتی گھگھیا رہی ہے، چنانچہ اس معصوم سے پرخاش انتقام کا کوئی امکان نہ تھا۔ لہٰذا اس کو ہدایت کر کے بھاگے تھے کہ اگر گھر کھدوائیں یا آگ لگائیں تو پاؤں پر گر کر گڑگڑا کر رو رو کر باز رکھے اور یہ کمزور کا آخری اور اکثر کارگر بھی ہتھیار ہوا کرتا ہے —— لہٰذا گھر اور سوسائٹی کے کمزور ترین اور شاید موزوں ترین عنصر کو اس مہم کے لئے چھوڑ گئے تھے۔

اور ملائم خاں تو پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ زدو کوب تو خیر یوں ہی سی تھی رات گھونسے دھکے، تھوڑی گالی گلوچ کا تبادلہ لیکن ارذل ہاتھوں توہین کے احساس میں اس کے رونگٹے رونگٹے سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ چمار چماری کے فرار ہو جانے کا اندازہ کر کے لڑکی کو دیکھتے ہی کلبی جنون کے کیڑوں نے خون میں ضرب اندر ضرب برپا کر دی —— اندھا دھند اسی غریب پہ آدم خور شیر کی مانند جھپٹ پڑا۔ اور اس کا اقدام درحقیقت آدم خور شیر سے بہت کچھ مماثل تھا بھی۔

آدم خور شیر جبلی طور پہ آدم خور نہیں ہوا کرتا اکثر انتقامی جذبہ کے تحت آدم خور بنتا ہے۔ اس کا شکار اکثر عورتیں ہوتی ہیں۔ ایک ہی ادنیٰ سے حملہ میں مار دینے کے بعد پہلا عمل جسم کے اوپر سے ملبوس تار تار کر کے ننگا کر دینا ہوتا ہے، پھر کھانا شروع کرتا ہے —— بغاوت کا قابل گردن زدنی جرم آقا کا لامحدود حکم، ہر پہلو سے اپنی بے پایاں طاقت اور مدمقابل کا ضعف ہی ضعف —— تا حدِ نگاہ میدان یک طرفہ اور خالی سبھی کا اور خاص طور پر ملائم خاں کا مریل سات خون معاف کی حد تک بلند ہو رہا تھا۔ "غاؤں غپ جھپٹ کر بیچاری کی دو تین چیخیں سی جیسے مرغی کے بچے کو چیل دبوچتی ہے چھپر میں سے سنائی دیں اور اس نے تو اسی جھپٹ میں آدم خور شیر والے انداز میں اسی سرعت کے ساتھ پٹ ہی گیا، دوپٹہ لہنگا، شلوکا تار تار کر کے اٹھتی جوانی بھرے بدن کو الف ننگا کر کے باگ ڈور میں کس لیا۔ پوشش وہ شدید ترین معاشرتی جبلت ہے جس کو آدمی مرنے کے بعد قبر کی تاریکی میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور مرنے کے بعد توشہ کی روٹی تو باہر رہ جاتی ہے لیکن بیس گز کپڑا قبر میں لے کر ہی جاتا ہے اور پھر اک ذرا زیادہ شدت ہو تو قبر کی مٹی کو بھی غلاف میں لپیٹ

سر اور چادر چڑھا چڑھا تقاضہ کی تسکین کرتا ہے اور قدرت نے درختوں اور پتھروں کو بھی ملبوس سے نوازا ہے اور آدمی اپنے متعلقہ جانوروں تک کو لباس پہنا کر انھیں آرام اور آرام سے زیادہ زیبائش مہیا کر کے اپنے شوق کی ملبوس کے ذریعہ تکمیل کرتا ہے، لیکن یہ آدمیوں کی معاملت جانوروں کے ساتھ ہے اور متوجہی نے شہد کو کیڑے مکوڑوں والا درجہ بھی نہیں دیا ہے اور آدمی سے ان کا کوئی رشتہ ہے تو جنگلی شہد کی مکھیوں کے چھتوں والا۔ اور کچھ اسی شان سے جیسے ڈنک جھڑے تتے کے دم میں دھاگا باندھ کر لڑکے اڑاتے گھسیٹتے کا کھیل کھیلتے ہیں — ملازم خاں کی پارٹی کے رسیوں کی بندشوں بلوں کچھ تناؤ ڈھیل کے ذریعہ، تھوڑا بہت جھٹکوں، لاتوں اور لاٹھیوں کے ٹھوکروں سے پیٹھ کمر اور گردن پہ الف ننگی لڑکی کو سیدھا کھڑا ہونے کی مسلسل کوشش کرتی ہوئی بے درنگ باہر لے آئی۔ اور سورج کی اوپل سال ایک رفتار چمکتی آنکھ بھی اس منظر کی تاب نہ لا کر جھپک گئی — لڑکی کو دنیا اندھیر نظر آئی — اور دیکھنے والوں کو بھی کچھ ایسا ہی اندازہ ہوا کہ شاید قیامت آج ہی آجائے —— خوردن گندم کی پاداش میں جنت بدر آدم حوا نے اللہ تعالیٰ سے رو رو کر پہلی فریاد عریانی کی تو کی تھی جب فردوسی لباس نے ان کے جسم کو چھوڑ دیا تھا — ستر پوشی کا تقاضا تو ذوقِ حفظِ زندگی سے کم شدید نہیں —— حوا کی اس ازلی بیٹی نے بھانت بھانت کی ستر پوشی چیخوں میں برہنگی کی اذیت سے پناہ مانگی۔ گڑگڑا کر رحم کی طرح طرح درخواستیں تو گھر کے اندر ہی ختم ہو چکی تھیں۔ اور چھپر سے صحن تک پہنچتے پہنچتے تو تناد غصہ اور پھر عاجزی تا کے سب مدارج طے کر چکی تھی، گھر سے باہر گلی میں اس شدید فطری تقاضہ کے تحت اور روح فرسا احساس سے نجات کے لئے آنکھ، زبان اور رسی میں بندھے ہوئے ننگے جسم کی ہر دسترس سے کام لینا چاہا مگر بے بس تھی، گلی میں چند قدم ڈالنے کے بعد فضا میں رحم کی عام بھیک طلب کی، اور فریادیں فلسفیوں اور دانشوروں کی فکر کو چھوا ایسی بستی کا اور کوئی آدمی نظر پڑا تو طبقہ اناث کا درجہ یاد دلایا۔ مشرقی اور دیہاتی روایات کا حوالہ دیا، پکڑنے والوں کو ان کی اپنی مائیں بہنیں بیٹیاں یاد دلا دلا کر دہائی دی، پھر کہنے اور گالیاں نکالیں، مگر جکڑی ہوئی رسی اتنے مضبوط اور شاطر ہاتھوں میں تھی کہ بجز زبان کے اور کوئی عضو حرکت نہ کر سکتا تھا، زمین پر گر پڑنا تو درکنار اک ذرا جھک بھی نہ سکی تھی، اور چند قدم ڈالنے کے بعد اس نے اک ذرا آنکھیں جھکائیں تو بھلا گئی، اور نہ معلوم کیسے سونی مچھلی کی طرح ایک ہاتھ رسی کے بل بس سے نکال کر زیر ناف چپک گیا جیسے مقناطیسی کشش کے ساتھ وہاں کا وہیں چپک کر رہ گیا ہو اور اس غیر متوقع اقدام اور کامیابی پر دار و گیر کرنے والوں نے اپنی شکست محسوس کی، لاٹھی کے ٹھوکوں سے چھڑانے کی کوشش کی، پھر برچھے کی نوک سے خراشیں مار مار کر ہٹانا چاہا، تاکہ منشی جی کے کام کی بھرپور تعمیل ہو جس میں یہ ہاتھ ان کی غفلت سے نہ معلوم کیسے حائل ہو گیا تھا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے تو کلائی پکڑ کر چھڑانا چاہا لیکن اس نازک سن نوخیز لڑکی کی کلائی اور جسم میں فولادی شکنجہ والی گرفت تھی کھینچے نہ کھینچ سکی جوں کا توں وہ ہاتھ جہاں کا تہاں چپکا ہو رہا۔ جیسے یہ اسی جگہ کا حصہ ہے —— اور گلی میں چند قدم بڑھنے کے بعد لڑکی کے حلق سے ذبح کرتے ہوئے ادھ کٹے گلے والی گائے کی آواز نکلی، اور ننگے بدن کے ریشہ ریشہ پر جیسے آپوں آپ پھٹ کر پرخچے اڑ جانے والی کیفیت محسوس ہونے لگی، جیسے اندر سے ڈائنامیٹ کا کارتوس مشتعل ہونے والا ہے اور راستہ تلاش کر رہا ہے، مگر اوپر سے قابو اتنا مضبوط تھا کہ ایٹم بم کے بس کا بھی روگ نہ تھا جیسے وقت کا ٹیٹوا مقدر کی گردن سب کچھ شدید گرفت میں تھی، نہ معلوم کیسے ایک دفعہ اک ذرا ڈھیل ملی تو اپنا ایک بازو دانتوں تک پہنچ گیا اور جب تک دار و گیر والے چھڑائیں چھڑائیں اس نے کھال اور گوشت پٹھوں کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ نہ اس کے دل کی گہرائیوں میں سے

خودکشی کی تمنا طوفان کی طرح امنڈ امنڈ کر رہ جاتی تھی ۔ آس پاس کی دیواریں بھی اس کی رسائی سے باہر تھیں، گلی میں جگہ جگہ نیم اور بیری کے درختوں کے کھردرے، سخت، موٹے تنے بھی سر کی دسترس میں نہ تھے اور کنوئیں کی سنگین جگت بھی، ہر چیز جو ٹکرا اس کے سر کو پاش پاش کر کے بھیجے کو بہا دے اور اُس کو اس بے پایاں اذیت سے نجات دلا دے اس کی رسائی سے باہر تھی اور بستی کے قدیم کنوئیں کا بانس بھر گہرا پانی بھی اس کی ایک چھلانگ سے بہت دور تھا جو بزدلی کی لعنت سے چھٹکارا کرا دیتا اور اپنی تاریک عمیق آغوش میں لے کر ستر پوشی کر دیتا ۔ جب ساونتھی ہو کر منشی جی کو دور سے گلی میں نظر آئی تو پہلی نگاہ پڑتے ہی اُن کے ہونٹوں سے بھی ایک دفعہ لاحول نکل گئی، اور ظالم نگاہ جھپک ہی گئی ۔ اور اک ذرا سے ذرا سا خیال آیا کہ انہوں نے تو باپ کے لئے حکم دیا تھا، ان لوگوں نے باپ نہ ملا تو بیٹی پہ تعمیل کر دی ۔ جو ان کا مطلب نہ تھا ۔ تاہم ملازم خاں کو اپنے ذاتی غصہ کا بھی کچھ حق ملتا تھا، لہٰذا اب جو ہو چکا وہی ٹھیک ہے ۔ ادھر ساونتی سخن پروری کا ذوق بھی اُٹھ آیا تھا البتہ اتنا منہ سے نکلا "اور وہ ... فرار ہو گیا کیا؟ ... جو ہمیں ننگ بن دھولس دیتا تھا ۔ مجمع میں سے کسی نے کہا "چمار چمریا دونوں بھاگ گئے" منشی جی نے ایک داخلی بل سا کھایا، پھر کی سے کر ہوا میں کوڑا پھٹکارا ۔ اور یہ کہتے ہوئے اینڈ سے بلوں پہ بل کھانے، کوڑا لہراتے آگے بڑھ گئے "اچھا لاؤ رسی ... کو بابِ عالی پہ ۔ اسی طرح ۔" اور چند قدم بڑھنے کے بعد پھر پلٹے، اور دوسرا حکم صادر کیا "بلاؤ بیل داروں کو، گھر کھدوا کے گدھوں کے ہل چلوا دو ... اور پھر دو قدم ڈال کر گرجے ۔ "سپاہیوں کو بھیجو، شام تک باندھ کر دونوں ... کو حاضر کریں ۔ جائیں گے کہاں فرار ہو کر" ۔ اور شیر کی طرح غراتے بڑھے چلے گئے ۔ بربریت کا یہ مظاہرہ قانونِ ظلم کی نئی راہ ایجاد کر کے چمار کے جھونپڑے سے بابِ عالی کی جانب اسی طرح گذرتا رہا ۔ گلی میں گذرتے ہوئے لوگ الٹ کر جا چھپے دروازوں پر کھڑی یا ادھر سے ادھر گلیوں میں آتی جاتی عورتیں ہسٹریائی انداز میں بدحواس ہو گئیں اور چیخ کر بیہوش ہو گئیں، ڈھائی ہزار نفوس کی آبادی کے موضع میں کھلبلی مچ گئی ۔ جیسے صبح ہی صبح مولا علی کی موت کی خبر حویلی سے باہر آتے ہی ہوا تھا ۔ سمجھ دار لوگ دم بخود رہ گئے ۔ بوڑھی عورتیں سینہ کوبی اور بین کرنے اٹھیں ۔ عورت مرد بچہ بستی کا ہر فرد خبر پا اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر کو بھاگ پڑا ۔ کسی نوکر لڑکے نے بڑی بیگم کو دوڑ کر حویلی میں خبر کی ۔ ۔ چمار زادی سیدانی بیگم چالیس سال قبل بڑے میر صاحب کی منکوحہ بنی تھیں اور چمار باپ کے جھونپڑے سے سید شوہر کے محل میں داخل ہوئیں تھیں اور داخل ہونے کے چھٹے ہی ماہ سید بیٹے کو جنم دیا تھا جو چماری کی کوکھ سے پیدا ہونے کے قصور میں باوجود فرزندِ اکبر ہونے کے بھی سادات سے محروم رہا تھا اور سید زادہ ہونے کے باوجود سید نہ بن سکا تھا جس کی پیدائش کی تاریخ پر تحقیقی روشنی ڈالتے ہوئے باپ نے خود تاریخی سا نام بندہ علی رکھا تھا تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت ان کی اولادِ صلبی کے کام آئے لیکن شرحِ محمدی کے قانون نے آج اس کو جائز وارث قرار دیا تھا اور آج وہ رئیس وارث کی ماں تھیں چالیس سال کے عرصہ میں شوہر کے خاندانی، معدد سے اعزاء، دوستوں، ہم چشموں میں کبھی نظر نہ آئی تھیں حتیٰ کہ اس اندیشہ میں کہ کوئی کھری سیدانی بیگم غلاظت کا چھینٹا نہ مار دے بیچاری شادیاں تو شادیاں اپنے طبقہ اور برابر والے رئیس گھرانوں میں کبھی غمیوں میں بھی نہ نکلی تھی، سچ پوچھئے تیسرے مہینہ تو بڑے میر صاحب کی لغزش کا بھانڈا پھوٹنے اور چرچہ گونٹے میں ہلکی ہلکی بدبو کی رتق پھیلتے ہی جو چمار نے حویلی میں لا کر چھوڑا تھا تو اس کے بعد آج چھتیس چھتیس سال ہونے کو آگئے تھے ڈیوڑھی سے باہر قدم ہی نہ آیا تھا حتیٰ کہ باپ ماں بھائی بھتیجے بھی کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے دونوں ہی نے ایک دوسرے کو ایک ہی بستی میں بستے ہوئے ایک دوسرے کو فراموش کرنے میں کمال دکھلایا تھا اور بیگم تو قطعاً قلب ماہیت ہو گئی

تھیں اس دوپہری کے بعد کبھی شوہر کا سایہ نہ دیکھا، نکاح کی کچھ باتیں سُنیں ضرور، اور اس وقت کچھ ہی کتنی تھی دس گیارہ برس کی عمر، حویلی کے ایک حصہ میں مدتوں چلی روایتی قسم کی معلانیوں نے پرورش اور تربیت کر کے داخلی طور پر انھیں ہر پہلو سے بیگم بنایا تھا اور جوں ہی ملازم لڑکے نے باہر سے آ کر حویلی میں بتایا کہ کسی چمار کی کونڈیا کو دن دہاڑے مادر زاد ننگا کر کے باندھ کر لائے ہیں۔ بیگم جیسے کئی بچھوؤں کے ڈنکوں کی خلش سے بلبلا کر جا پڑیں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ ان کے اندر والی چماری مگر درحقیقت سوئی ہوئی عورت تڑپ کر باہر آ گئی اور باہر آ کر بپھری شیرنی ہو گئی۔ اپنے گوشہ محل سے اٹھ کر سیدھی بہو (بندہ علی کی بیوی حاجی ماں کی بیٹی) کی حویلی میں جا دھمکیں اور دو لفظوں میں صورت حال بتا دی، اور بہو بھی غصہ میں بپھری ساس کے ساتھ ہو لی، اور ہزار ہا سالہ روایات کے تسمے توڑ تاڑ کر اپنے طبقہ اور حویلی و دیوان خانہ کی تاریخ میں پہلی ڈالتی منہ کھولے مردانے حصہ میں نکل آئیں، کئی نوکرنیاں ہیں ہیں، کیا کرتی ہیں!! کہتی پیچھے پیچھے ہو لیں۔ مردانے مکان میں بھگدڑ مچ گئی جو ملازم حالی موالی جہاں تھا اس نے وہیں کسی نہ کسی کپڑے سے منہ ڈھانک لیا، جسے فوراً کپڑا میسر نہ آیا اس نے آنکھیں میچ کر دیوار سے منہ بھڑا دیا، کرنے میں گھستا ہی چلا گیا، اس ملازم لڑکے کی رہنمائی میں بڑی چھوٹی دونوں ساس بہو بیگمیں دیوان خانہ کا وسیع صحن پار کر کے منشی کمال شیر خاں کی نشست گاہ اور دفتر کی جگہ پہنچ گئیں جہاں مجمع اکٹھا تھا اور چمار کے بجائے چمار کی بیٹی کی روبکاری ہو رہی تھی۔ ایسے طبقہ میں یہ روایت تھی کہ شاید کبھی سورج کی آنکھ نے بھی نہ دیکھی تھی بیگمات کے یوں کھلا بالطبع یکایک بے شان گمان کمرہ میں گھستے ہی پورے مجمع کے منہ سے بے ساختہ مہمل سی چیخ بلند ہوتی، منشی کمال شیر خاں پر بجلی سی گری اور تو سب شکرے کے جھپٹے ہوئے چڑیوں کے تنگ کی طرح جدھر کو جس کا منہ تھا اسی دروازہ سے بھاگ پڑا۔ منشی کمال شیر خاں کو بھاگنے کا بھی موقع نہ تھا، ہیبت اور حیرت میں لپٹی چیخ ان کے منہ سے بھی نکل گئی۔ چوکی پر سامنے ڈیسک تھا گاؤ تکیہ پیچھے تکیہ اور دیوار، اسی چھوٹی سی تنگ جگہ میں عافیت سمجھی جہاں کے تہاں سکڑ سمٹ کر ڈیسک کے نیچے اوندھے منہ ڈھیر ہو کر سمٹ گئے گدی اور تکیہ اوپر اوڑھ لیا۔ بیگمات نے برہنہ نسوانی جسم جو دیکھا تو ہسٹریائی انداز میں ان کے منہ سے بھی موت جیسی چیخ بلند ہو گئی۔ بہو تو بیہوش ہو کر گر گئی، ساس نے اپنا دوشالہ اتار کر ڈال دیا، لڑکی مخبوط الحواس ہو رہی تھی دوشالہ پڑتے ہی بیہوش ہو گئی۔

اور اب چند ساعت کے لئے موت جیسا سناٹا تھا، بیگم نے خود کو سنبھالا ایک نوکرنی کا دوپٹہ لے کر اوڑھا، اور بدحواس بہو کو اندر لے جانے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ دیوان خانہ کے کسی حصہ میں بندہ علی شطرنج کھیل رہا تھا خبر پاتے ہی ننگے پاؤں ادھر بھاگا۔ پہنچا تو ماں اور بیوی دونوں کو زنجیر عدل ہلانے بلکہ قانون ہاتھ میں لئے اس طرح دیکھا کہ ارسطو سے لے کر بندہ علی تک تاریخ خاموش تھی ہیں!
ہیں!! امی! آپ!! آپ کیوں؟ ۔ وہ، وُو وُو، جو کچھ بات تھی مجھ سے کہتیں، !! اور بات کیا تھی!" مگر وہاں کوئی صورت حال بتانے والا باقی ہی نہ رہا تھا۔ منشی کمال شیر خاں اس خرگوش کی طرح جس کی پناہ گاہ پر بھوکی شیرنی آ دھمکتی ہے اور لقمہ بنانے کے لئے راہ کی تلاش میں ہوتی ہے ڈیسک کی بے معنی سی آڑ لئے سانس روکے چوکی کے گدے اور گاؤ تکیہ دیوار میں ضم تھے اور بپھری ہوئی شیرنی جیسی ماں نے بیٹے کے دو تھپڑ مارے اور چند بیمہ ہیں پھر ایک مرتبہ دوشالہ میں سے لڑکی کا دبلا ہوا ننگا ڈھیر کھول کر سامنے کر کے پھر ڈھانک دیا۔ حالانکہ دو تھپڑ کے ساتھ محاسبہ اور جرم کی نوعیت پہ جسم میں ایک مرتبہ کو سنسناہٹ تو ضرور ہوئی مگر ساوتی دیار کا تحفظ آڑے آیا اور ضبط کر گیا "! تاہم گھبرا گیا۔

"امی! امی!! آپ اندر جائیں" اور بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا " یہ چیں اور انھیں!! ان بچاری کو بھی نکال لائیں، توبہ توبہ! ۔ امی آپ لوگ اندر جائیں۔"

اور بڑی بیگم پھٹ پڑیں: "نہیں جاؤں گی تیرے باپ کے محل میں، ابھی قبر پر جاکر پانچ جوتیاں مارتی ہوں تیرے باپ نگوڑے کی۔ تیرے یہ نمک حرام درندے! عورت کی یہ بے حرمتی! لڑکی پر! بستی کی بیٹی پر یہ ستم!!"

"امی آپ اندر جائیں" اور نوکرنیوں کو بیوی کو سنبھال کر لے جانے کے لئے اشارہ کیا: "امی میں سب نبٹ لوں گا۔ آپ اندر تو جائیں۔ یہ بزرگوں کی ناک کٹ رہی ہے کہ پردہ سے بیگمیں باہر نکل آئی ہیں کبھی ڈیوڑھی کی چوکھٹ پار نہیں کی اس حویلی کی۔ سادات کو بھی بتہ، چپہ چپہ، کبھی ایسی نہیں ہوئی تھی۔"

"دور ہو جا میرے سامنے سے موذی، خدا کی مار تجھ پر۔ چلا جا ابھی کون تیری ماں ہے اور کس کا تو بیٹا ہے، اگر زیادہ باتیں کیں تو ابھی عاق کر کے تیرے باپ کے گھر سے نکل جاؤں گی، یہ تو بڑا سید بنا پھرتا ہے! سادات کے یہ کرتوت ہیں! - ایں۔ وہ تو میں جانتی ہوں نہیں تو سمجھتی کہ تو کسی کمینہ کا وہ ہے۔"

امی، حد سے نہ بڑھیے دیکھیے تو، یہ ریاست کے معاملات ہیں۔ آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ نے پردہ سے باہر آکر سادات کی ناک تو کٹا دی اور کیا چاہتی ہیں، غضب خدا کا کبھی بیگمیں اس طرح باہر آئی ہوں گی، یہ دن بھی دیکھنا تھا میرے اللہ! بزرگوں کی قبریں پھٹ جائیں گی، امی آج! ہائے میرے خدا یہ کیا ہو رہا ہے آج!"......

"اگر زیادہ بولا تو ابھی کپڑے اتار کر تمہیں پر تیرے سامنے الف ننگی ہو جاؤں گی اور تیرے باپ کی ناک کٹا دوں گی۔" بندہ علی کانپ کر ہٹ گیا اور بیگم بولتی رہیں "چل دور ہو، خدا کی مار تجھ پر اور تیرے بزرگ نگوڑوں پر" —— اور پھر منشی کمال شبیر خاں کی اوندھے منہ پڑی ہوئی پوٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی: "اس موئے نمک حرام پر اللہ کی مار علیؑ کی تلوار، اس کو تو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں ابھی تو بھی جی ٹھنڈا ہو۔ گھگھو کا خواص، جہاں گیا نگوڑے نے تباہی مچائی۔" یہ کہتے ہوئے لڑکی کو نہایت اہتمام اور احترام کے ساتھ اپنے دوشالہ میں پیٹے ہی پیٹے دو نوکرنیوں کے سہارے اٹھایا جیسے ہسپتال میں ماہر نرسیں کسی حادثہ کے چور زخمی کو فرسٹ ایڈ کے وقت سنبھالتی ہیں اور حویلی میں لے کر چلی گئیں یوں تو یہ ساونتی تاریخ میں پہلا تجربہ نہ تھا، گلیوں اور کھلے میدانوں میں بھی خال خال ایسے رویہ کی نظیریں ملتی رہتی تھیں اور چار دیواریوں کے اندر تو یہ روز کے مشغلے اور بائیں ہاتھ کے کھیل تھے خود بیگم کا زریں تاج ایسے ہی ایک مشغلہ کی پیداوار تھا، بیگم تو تقدیر کی سکندر تھیں ورنہ ایسی بے تاج والیاں نہ معلوم کتنی کوڑوں کے ڈھیر اور گھوروں کے انبار پر دکھائی دیتی چلی آئی ہیں، ممکن ہے کہ منشی کمال شبیر خاں اور اس کے حالی موالیوں نے اپنی دونوں آقاؤں کی اس حرکتِ ناشائستہ کو چمار زادی اور حجام بچی ہونے پر محمول کیا ہو، لیکن در اصل ان دونوں ساس بہو کے اندر سے خالص عورت کھل کر سامنے آ گئی تھی اپنے اصلی روپ اور فطری حالت میں —— اور بڑی بیگم کی اندر والی عورت نے نکل کر ایک دفعہ سیدزادہ بیٹے اور اس کے بہادر و بیباک حالی موالی سب کو زیر کر لیا اور اندر سے باہر تک نظام بہشتی کی بادشاہت کا سماں باندھ دیا۔ بندہ علی چپ رہا، منشی کمال شبیر خاں اور حالی موالی روپوش ہو گئے۔ عورت کی بے پناہ طاقت کھل کر سامنے آ گئی اور سادات کورٹ پیٹی گوٹ گورنمنٹ کی گرفت میں تھا محل میں سے جا کر بیگم نے شکرے کی جھپٹی ہوئی گوریا کی تالیفِ قلب کی، اور داغ داغ روح والے جسم پر اپنے لباس میں سے ایک ساڑھی نکال کر پہنائی اور دونوں ساس بہو چند نوکرنیوں کو ساتھ لے کر دن دہاڑے ڈیوڑھی میں سے دیوان خانہ میں اور دیوان خانے کے

پھاٹک میں سے گلی میں نکل آئیں اور چمار کے گھر کی جانب چل پڑیں۔ بستی میں بھونچال سا بپا ہو گیا، سورج کی کرنیں بھی کانپنے سی لگیں، اِدھر سے اُدھر تک بھاگڑ پڑ گئی۔ جو مرد راستہ میں سامنے آیا اوندھے منہ لیٹ کر جا پڑا۔ بیگم روزِ روشن میں منہ کھولے باہر تھی یا فلسفہ تاریخ حیرت سے منہ کھولے رہ گیا۔ بستی کی جو عورت دروازہ یا گلی میں سامنے آئی حیرت کے ساتھ سجدہ میں گر گئی۔

لڑکی کو اس کے گھر میں بٹھا کر بیگم نے چمار کی چوپال پہنچ کر کھڑے ہی کھڑے اپنی فکر و استعداد کے مطابق ڈھنڈورہ پٹوانے کے احکامات صادر کئے۔

۱۔ بیکھو تا اور اس کی عورت گھر واپس آ جائے۔

۲۔ ہر کاشتکار اپنی زمین پہ اپنے ہاتھ سے کام کرے، کسی کھیت مزدور کو اس کی مرضی کے خلاف نہ لے جائے اور منہ مانگی اجرت دے۔

اور یہ کوئی غیر معمولی بات تو نہ تھی۔ بندہ علی اسی ازلی نظام کا ایک عام سا پرزہ تھا جس کا فاصلہ روزِ ازل سے ابدیت کی منزل کا رخ کئے بھانت بھانت کے روپ اور طرح طرح کی بانگِ درا میں سرگرمِ سفر ہے۔ اور مرغوں، بکروں، دنبوں کو زیادہ سے زیادہ فربہ رکھ کر اور آدمیوں کو ہر ہر پہلو سے لاغر سے لاغر تر بنا کر خود موٹے رہنے کے مواقع فراہم کرتا چلا آ رہا ہے۔ رنگ رنگ اور قد قد کے گربے ہاؤنڈوں کو تیز سے تیز اور ایک سے ایک بڑھ کر خونخوار اور ہونہار بنا کر پالتا رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ جانوں کو کم سے کم حق زندہ رہنے کا قائم رکھ کر معدودے چند زندگیاں آبِ حیات پیتی رہیں ......

روائت نے طولِ غلامی کو ٹھنڈا ناسور بنا دیا ہے۔ مگر کبھی کبھی ناسور میں بھی کیڑے بجا پڑتے ہیں۔ بشرطیکہ غیر معمولی انفیکشن پہنچے اور خلوصِ روائت میں خلل واقع ہو ــــ اور کچھ ایسی ہی صورت آج کے واقعہ کو حادثہ کی حد تک پہنچانے کی محرک ہوئی، ناسور میں کیڑے پڑے اور عفونت پھیلی۔ ورنہ آج کا عمل راعی اور رعایا کے مابین طاقت اور ناطاقتی کا توازن رکھنے میں فطری حق تھا لیکن طائم خاں کے عمل میں ذاتی غیض اور انتقام کے جذبہ کا غیر مخلص عمل اور بیگم کے بجائے اندر والی عورت کا باہر نکل کر اقدام، روائت اور خلوص دونوں ہی اپنے اپنے راستہ سے بھٹک گئے ــ اول الذکر نے تو بات کو آبائی مالک آقا کی حد سے بڑھا کر پنجاب پولیس کے کسی کانسٹیبل ہیڈ کانسٹیبل سے چڑھے ہوئے تھانہ دار کی حد تک پہنچا دیا۔ رہی آخر الذکر اس کے متعلق طرح طرح نفسیاتی تجزیے ہوئے۔ بہر حال دونوں اپنی اپنی جگہ پر عجیب تھے، لہذا قرب و جوار کے راعی اور رعایا دونوں ہی حلقوں میں حیرت کے ساتھ سنی گئیں اور خواص و عوام کی توجہ کا مرکز بن کر حاشیہ آرائیوں کے ساتھ پھیلتی پائی گئیں۔ راعی طبقہ کی اصطلاح میں زرعی دولت کو " دادِ الہیٰ " کہا جاتا ہے اور بنیادی طور پہ اپنے اسلاف کی طوار کا ہمالیہ اور بندھیاچل کے دل چیر دینے پہ قدرت کا عطیہ سمجھا جاتا ہے، اور رعایا والی معاملت کے باب میں تو کسی مسئلہ کا وجود کا تصور ہی نہیں، نرم قوام والا تماشہ جیسی کوئی چیز زبان و تالو کے درمیان شعور میں ہو سکتی ہے اور خوبصورت دو طرفہ ٹھنڈی ان کے ساتھ ان کا رشتہ " مائی باپ " والا بیان کیا جاتا ہے اور یہ امر بیل اور درخت والا تعلق " ظل الہی " وغیرہ کہلاتا چلا آ رہا ہے .....

بندہ علی جیسے " مولا علیوں " کو ان کے جدِ امجد اپنی اپنی فضا کا شہبازہ اور جنگل کا شینا کہہ کر چھوڑ گئے تھے اور جہاں کہیں انھیں دور دور تک بھی اک ذرا ناہمواری نظر آئی تھی وہاں پشتوں پہلے بل ڈوزر چلا کر اور رولر پھرا کر ان کے حق میں تا حدِ نگاہ میدان ہموار چکنا، بھر بھرا اور

زرخیز بنا گئے تھے، اور اس بزنگاہ میں ان کی شخصی مرضی بجلی سے حرکت کرنے والی خودکار مشینوں کی طرح چلتی چلی آرہی تھی...... بہرحال "انہونی" ہوئی تھی اور یہ تو شخصی حاکم کے وقار کا نازک سوال تھا۔ قابو یافتہ جمہوری زبان میں بھی "انہونی" کو عین ہونی کہا جاتا ہے۔ بات کو اک ذرا قابل توجہ پہلے تو گماشتہ کے بڑھتے ہوئے اقدام نے بنایا۔ خبر وہاں تک تو شاید سنبھل جاتی لیکن مالک آقا کی ماں نے خواہ مخواہ دخل در معقولات کر کے مٹھی بھر دھول جھونک کر مکدر کر دیا۔ پھر بدنصیبی یہ ہوئی کہ آج ہی بستی میں ہاٹ اور نخاسہ لگنے کا دن تھا، یعنی جنس و مویشی وغیرہ کے لین دین خرید و فروخت کے علاوہ خبروں اور افواہوں کے تبادلے کا مقررہ روز، اور اس اجتماع کے ذریعے یہ چھچھوندر کی سی بدبو اس بستی سے نکل کر سہ پہر سے سونا پڑتے تک قرب و جوار کے دیہات میں چل پڑی، گھر گھر چوپال چوپال۔ الاؤ الاؤ، اور پھر حویلی حویلی بیٹھک بیٹھک دیوان خانہ دیوان خانہ چاند پھوٹ گئی اور دو تین دن کے اندر اندر پورے ضلع بلکہ سرحدی اضلاع تک پھیل گئی، جس کاشتکار نے سنی ایک دفعہ کو تو سہم کر سن ہو گیا۔ پدرم سلطان بود نوعیت کے کچھ پٹے مہروں کے ڈھیر میں سے صرف نجابت کے سہارے سانس لیتے فرزیوں نے انگڑائی لی جو صرف خالص خون کو بندریا کی طرح مرے بچے کی لاش چھاتی سے چپکائے جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے، اور تقریباً سبھی برابر والوں کو دل خوش کن موضوع گفتگو کے لیے ہاتھ آیا۔ "بھری کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا بھی تو تھا اللہ میاں کے بھید میاں ہی جانیں، نہ معلوم ان کی کیا مصلحت تھی۔ اس سید انی زادہ کو اٹھا لیا۔ اور کمینہ راج کر دیا، معصوم سید مولا علی نہ مرتا تو آج ہم سب شرفا کو یہ روز بد کیوں دیکھنا نصیب ہوتا۔"

"اجی روز بد تو ہم سب نے مولا علی کے سوئم کے روز ہی دیکھ لیا تھا جب مونچھیں اٹھا کر کلغی سجا کر وہ چماری بچہ ہم سب کے بیچوں بیچ بیٹھا تھا۔"

"کسی کا کیا بگاڑا۔ چماری تھی، اصل پر پلٹی حرام زادی اور چلتے چلتے سید زادہ بیٹے کی قلعی بھی کھول گئی۔ اور چالیس برس بعد بتا دیا کہ میری اصل نسل ہنگا پھریا، گو برا پلے کوڑا کرکٹ ہے۔"

کوئی شاعر طبیعت بولے: "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔"

ایک فارسی داں نے فرمایا: "پرستار زادہ نہ آید بکار۔"

"اجی سب بیکار باتیں ہیں اور کیا ہوگا کون نہیں جانتا کہ بندہ علی نے نجیب الطرفین حقدار بھائی کو قتل کر کے یہ دولت ہتھیائی ہے۔" "پھر ایسی ہی چیزیں درپیش ہوں گی۔ قرب قیامت ہے نہ مانو تو مثنوی آثار محشر کھول کر پڑھ لو۔"

"ابھی تو بڑی بیگم اماں جان اور بہو بیگم گلیوں میں ناچی ہیں، ان سے کوئی بیٹی ہوگی تو چکلے میں بٹھلاتے شرم نہ آئے گی۔"

"شرفا کی عزت کا اللہ بیلی ہے۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ، ان بڑی بیگم کے نکاح کے شکر چھوہارے بھی کسی نے لوٹے ہیں پھر آج شکایت کیوں ہے۔"

"بہت اچھا ہوا ہماری آئندہ نسلوں کو حسب نسب اور خون ہڈی کے خواص بتا دیئے۔"

"اجی سادات کے نطفہ کی بھی مٹی پلید کر دی۔"

"سنا ہے کہ درحقیقت میر صاحب بندہ علی کی والدہ محترمہ اور زوجہ عالیہ دونوں نے غرارے قمیص اتار دیئے تھے اور چمار کی

لونڈیا کے ساتھ گلیوں میں الف ننگی نکل کھڑی ہوئی تھیں "

" اچی ناک کاٹ دی سارے طبقہ کی ۔ ۔ شور زمین ۴۰ برس بعد رنگ لائی "

المیہ کی شدت سے بستی میں دن کا چولہا تو کسی گھر میں گرم ہی نہ ہوا تھا ، شام کو فضا میں بھی "مرگِ نند" سی پھیلی ہوئی تھی - بچوں ہی نے کھانا کھایا - دونوں ہی حادثے ایک سے ایک بڑھ کر ہمالیہ شکن اور بندھیاچل الٹ تھا ، نوخیز دیہاتی لڑکی کا دن دہاڑے نقابپوش بیگمات کا روز روشن میں حویلی کے اندر سے گلی میں درشن دینا ویسے گاؤں کے اندر ابھی کئی بوڑھے زندہ تھے جنہوں نے انھیں بڑی بیگم کو انھیں گلیوں میں سے گوبر کا ٹوکرا اٹھا کرے جانے اور بٹورسے کے قریب اپنے تھاپتے دیکھا تھا تاہم چالیس برس سے تو کسی نے آنچل کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی - بہر حال دونوں ہی اقدام اپنی جگہ پر بڑی اہمیت کے حامل تھے ، لیکن بیگم کے اس روایت شکن اقدام اور مراعات سے نہ تو پرکھوتا چماری کی اور نہ بستی والوں کی اشک شوئی ہوئی - اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ آج ہی قصبہ کے اندر ہفتہ وار نخاسہ اور پینٹھ کا دن تھا - دل کھول کر باہر دور دور تمام علاقہ کے آئے ہوئے دیہاتیوں سے تبادلہ خیال ہوا بات ایک سے دوسرے اور تیسرے چوتھے تک پہنچی سادات نگر کے لوگوں میں تو جیسے دل کی بھڑاس نکل گئی - پھر بھی آج کی رات بستی پر وہ ہُو اور مہیب سناٹا طاری رہا - جو کبھی ہیضہ طاعون کی وبا میں پورے زور کے دوران راتوں راتوں کو طاری ہوا کرتا ہے - تاہم بستی کے اندر منشی کمال شیر خاں کی نظامت بن کھلم کھلا کوئی تحریک تو درکنار آنکھ بھی نہ اٹھ سکتی تھی ، البتہ بستی سے باہر نخاسہ اور ہاٹ کے ذریعہ جو خبریں اور افواہیں پہنچیں انہوں نے پینک کی دبی دبی ہلکی لہر پھیلائی اور اس علاقہ کے اندر پہلی مرتبہ اپنی نوعیت کا ردعمل ظہور پذیر ہوا - لیکن پیٹ مرا مرا سا . . . . چند سر ذرا اُٹھے ، وہ مخصوص لوگ جو کبھی کسی زمانہ میں موروثی دخیل کار تھے اور کسی معمولی سے سبب کی بنا پر ( جب منشی کمال شیر خاں بندہ علی کی ملازمت میں بھی نہ آئے تھے ) منشی جی کی معمول کی زد میں آ چکے تھے - اور جن کی نسلیں منشی نے اپنے تکیہ کلام نوعیت کے قول کے مطابق "دانہ دانہ کو محتاج کر دوں گا " اقتصادی طور پر درحقیقت برباد کر دی تھیں اور جنہیں موروثی دخیلکار سے ادنیٰ کھیت مزدور بنا دیا تھا - جیسی مرلازادوں پر آج پڑی تھی ان بدنصیبوں پر دس پندرہ سال پیشتر پڑ چکی تھی کچھ لوگ ایسے بھی انگڑائی سے رہے تھے جن کے گھر کھیت کھلیانوں کے اندر سیاسی انتظام میں کسی خاص غرض سے اپنی مخصوص اصطلاح کے مطابق منشی جی نے چپکے سے کسی اندھیری رات میں " سرخی " ( آتشزدگی ) کرائی تھی اور گوناگوں سیاسی مصلح کے تحت منشی جی کو ایسے اقدام علاقہ بھر میں کہیں نہ کہیں مہینہ دو مہینہ پیچھے کرانا ہی پڑتے تھے —— اور کچھ نہیں تو "نازی کے ہاتھ چڑا ترکی کے کان ہوتے" تماشبینوں کو درس عبرت دینے کے لئے ہی سزا کم اور انتظاماً زیادہ . . . . . اور مختلف چور گلیوں سے اندھیری راتوں کی کالی چادر کی آڑ آڑ یہ اپنی نوعیت کے بالکل ہی نادر جراثیم بیجوں کے بل چل چل کر سادات نگر کی دم بخود سناٹے میں ڈوبی فضا کے اندر داخل ہوئے اور اقتصادی زخم خوردہ لازادوں نے انھیں قبول کیا اور راتوں رات ان کے اندر گھر ہو کر چاروں میں حلول کر گئے - اس طرح جیسے چوہوں کے بلوں سے نکل کر آبادی کی فضا میں طاعون کے جراثیم پھیلتے ہیں یہ بغاوت کے کیڑے سادات نگر کے گھر گھر پر محیط ہو گئے آج چمار کی ننگی بیٹی پورے علاقے کی ناک ہو گئی - اس کی جامہ دری کو ہر دیہاتی اپنی بیٹی کی عصمت دری تصور کر کے بل کھانے لگا لیکن بقلباس سے بدھب بڑھے سے جلاس کی ساری عمر ل نکالتے ہی گذری تھی - مگر جب تک منشی جی کے شہر خبر سے

نوعیت کے اینٹیلیجینس گماشتے بھانپ کر اس سازش و بغاوت کے پروان چڑھنے کی اطلاع ان تک پہنچا میں چماروں کی پنچائت نے اگلے نخاسہ ہاٹ کا دن اکٹھ کے لئے تعین بھی کر دیا، اور عام منڈی میں کھلم کھلا اعلان بھی کر دیا اور چماروں کے اعلان پر سبھی اچھوت برادریوں نے دست تعاون بڑھایا ۔۔۔ اور یہ ہفت ہزار سالہ تاریخ اور دیومالائی روایت میں پہلا تجربہ تھا۔ سری لنکا سے لے کر شملہ تک آج بھی اچھوتوں کا نعرہ تھا۔ اور راون کی شکست کے بعد منو جی نے اس کی ذریات کو ملعون، مقہور اور رذیل قرار دے کر "شودر" کے ذلیل نام سے موسوم کیا تھا اور شودر کی تخلیق برہما کے پول و براز میل پسینے سے قرار دی تھی اور زنار پہنے اور قشقہ سجانے والے تو چند ہی تھے، آج بھی دال میں نمک سے زیادہ نہیں تھے، لیکن فاتح اور جابر قابض تھے، اور معدودے چند ہوتے ہوئے بھی ہر ایک پانچویں سواروں میں تھا اور آج تک ہر سال اپنے ہفت ہزار سالہ حملہ اور قبضہ کا تہوار (اکتوبر اکے دسہرے پر جمع ہو کر جشن منایا کرتے تھے، راون کا کاغذ او لکڑیوں کا پتلا جلا کر شودروں کی شکست کی تجدید کیا کرتے تھے - لیکن آج تو جیسے الٹی گنگا بہہ رہی تھی یہ شودروں کا اکٹھ برہمنوں چھتریوں کی ہفت ہزار سالہ تاریخ کا منہ چڑا رہا تھا۔ گویا راون کی شکست ہر دل کا زخم تھا۔ اور پرکھو ماچار کی ارزل مخلوق بھی سیتی سیتا کے مقام پر تھی ......

منشی مال شیر خاں یوں تو طاقت ہی طاقت اور منو مان جی کے نمائندے تھے، کھوٹا کھرا ان کا ہر سکہ چلتا تھا جس کی قانون پولس اور پنچائت ہر جگہ ساکھ تھی۔ علاقہ بھر میں آج بھی دن دہاڑے ایک آدھ گھر تو کیا چیز ہے پورے کا پورا ایک گاؤں جلوا کر خاک کرا سکتے تھے ان کی ساری عمر بے داغ اور بے لچک سچے فولادوں کو توڑنے اور سنگ خارا کی چٹانوں کو دھول بنا کر اڑا دینے میں گذری تھی جو کچھ جس وقت بولیں وہ ان کا معاہدہ اور وعدہ زبان تھی اور جو کچھ کریں وہی عین قانون و قطعی انصاف تھا تاہم ان کے اندر ایک اپنی مخصوص نوعیت کا مدبر بھی بیٹھا تھا۔ جس کو سنگ خارا کو چکنی مٹی کی طرح گوندھ کر اور بے لچک فولاد کو موم کی طرح نرم کر کے اپنی مطلب کی صورت تشکیل کرنا آتا تھا - اور جو بجائے زہر سے قتل کرنے کے گڑ کھلا کر مارنے کا گر بھی خوب جانتا تھا۔ اس "اکٹھ" کی خبر سن کر پہلی ساعت میں تو چکرا گئے پھر اندر والے کو آواز دے کر سائڈ بٹھا کر لیا۔ اور مونچھیں نیچی کر کے ہاتھ کے بجائے دماغ سے کام لینے کا تہیہ کر لیا ......

اور چھتنار درختوں کے سایہ میں دن ڈھلے جب ہاٹ اور نخاسہ جڑ کر جگمگا اٹھا - اور آج کے نخاسہ میں تو میلہ والی گہما گہمی تھی، پہلے تو اس علاقہ اس ضلع پورے برِ صغیر کے وارثوں کا اکٹھ تھا اور جو کبھی نہیں آتے تھے اس اعلان کو سن کر آج وہ بھی آئے تھے۔ اور کچھ نہیں تو یہ تاریخی نوعیت کا تماشہ ہی دیکھنے کے لئے پنچائت تو چماروں کی تھی مگر جمع ساتوں قومیں تھیں ——

بستی سے باہر نخاسہ والے باغ کے برابر ہی کھلیان کا لق و دق میدان پڑا تھا جس کے بیچوں بیچ پیپل کا پورے پھیلاؤ تک محیط قدیم درخت کھڑا تھا مقدس سنجیدہ، پرجبروت، ٹھنڈا اور پر امن سایہ فگن، اتنا قدیم کہ اس درخت کے نصب اور اس بستی کے آباد ہونے کی تاریخ ایک بتائی جاتی تھی اور بستی قدیم آریاؤں کے دور کی سمجھی جاتی تھی۔ اس کے تنے کے ساتھ ساتھ گماڈیوٹ (دیہاتی عبادت گاہ) کا وسیع قطر والا چبوترہ لپٹا ہوا سا لگا تھا۔ اور شودروں کا یہ عظیم تاریخی اجتماع آج اسی میدان پر ہوا۔ ایشیا کے اندر برصغیر خطہ ہی شودروں کا ہے، لہٰذا اس اجتماع میں بھی بھاری تعداد انھیں کی ہونی چاہئے تھی لیکن اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح اس عظیم اجتماع کی تمکنت بڑی حد تک نمایاں تخصیص اور عزّم

داخلی ہر پہلو سے سربرآوردہ شہر کا علاقہ کے چند پنڈت برہمن ہی تھے۔ گورے چٹے، چمکتی نجابت و شرافت کی آئینہ دار چند پیشانیوں کو سیندور چندن چاولوں کے قشقوں سے سجا کر اور بھی زیادہ مقدس اور شاندار بنائے گچھا سی کھچڑی مونچھوں پر تیل سے پیپد براق پھتوئیاں پہنے، اور دوہرے بیجوں والی مخصوص بندش کی دھوتیاں کسے، اور سروں پر دس دس گزی بڑی بڑی اونچی پگڑیاں دھرے اور بعض بعض وہاں چٹکوں میں پوتھیاں اُڑسے اپنی روایتی بلندی سے زیادہ بلند و بالا دکھائی پڑ رہے تھے اور توندوا لے تو اس ہزاروں کے بھرے مجمع میں یوں دبی دمکتے - یہ خاندانی عجیب الطرفین بزرگ "گماڈپوٹ" کے گول چبوترے پر قابض ہونے کے سبب نمایاں تر ہو گئے یہ پلیٹ فارم ازل ست ابد تک انھیں کی تو میراث تھا جس کی سند منو جی لکھ گئے تھا - لیکن آج یہ کچھ اندر ہی اندر متحیر اور بھرجز بز تھے -
مجمع کے تیوروں کا اندازہ کر کے ان بزرگوں نے چہروں کو اور بھی زیادہ لٹکا لیا، اور بعض بعض نے ماحول کی گندگی اور مجمع کے شیکش ہونے کا احساس کر کے کانوں پر جنیئو بھی چڑھا لئے۔ اور جب کچھ اور زیادہ رنگ محفل ساز گار نہ ہونے کا احساس ہوا تو کھڑے ہو کر پوری لمبائی تک تنے اور توندیں آپوں آپ جیسے ہاتھ ہاتھ بھر اور آگے کو نکل گئیں - اور جب اندازہ ہوا کہ نہیں ابھی تو ڈکار جیسی آواز میں "اوم، برہم" نکالی اور منو شاستروں کے اشلوک بڑبڑائے اور ہر ایک پریت ا برہمن اسے اپنے اپنے حلقۂ جہالت کو تھام لینا چاہا اور شودروں کو منو شاستروں اور ویدوں کے حوالوں سے ان کا مقام سمجھایا اور " راجہ پرجا" کے تعلقات بتائے اور اس کے خلاف عمل اور قول تو درکنار دل کے اندر خیال بھی لانے کی اس جنم اور آنے والے اور نہ معلوم کتنے جنموں کی پاداش بھگائی —— اور ایک دفعہ کو مجمع کے اندر متزلزل ہونے جیسے آثار رونما ہوئے ہی تھے اور ہر شودر جیسے کچھ سوچ میں پڑ کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا تھا کہ عین اسی وقت مولازادوں کا پورا گروہ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے سیدھا ادھر کو آ گیا، فرضوں سے قبل والی سنتوں کے بعد جماعت کھڑی ہونے سے قبل آج خلاف معمول پیش امام نے ملکہ وکٹوریہ کے دور والے علما کا پیٹنٹ وعظ کہا جس کا خلاصہ وہی تھا جو ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں مخصوص تو رمر خود علما نے گڑھا تھا اور خدا رسولؐ اور حاکم وقت کی اطاعت کرنے کے قرآنی حکم کی تفسیر بندہ علی منشی کمال شیر خاں اور کوڑیا مہاجن پر منطبق کی اور بستی کی تاریخ میں ملاں جی کی آواز پہلی مرتبہ محراب و منبر کے اندر گونج کر رہ گئی اور نماز سے فارغ ہو کر جماعت کی جماعت مسجد سے سیدھی اس مجمع میں پہنچ گئی - مولازادہ اس بستی کے ذرا اہم عنصر تھے اور اک سال بھر پہلے تک علاقہ کے سب سے بڑے رقبہ کے موروثی دخیل کار کاشت کار تھے - شودروں میں ان کی آمد سے نئی روح پھنک گئی اور اب اس بساط پر ہر سطح کا مہرہ جمع تھا - پنڈت پریتوں کو ان کی آمد ایسی محسوس ہوئی جیسے کسی راجپوت ٹھاکر کے یہاں تیرھویں کے دان کا بھوجن کرتے ہوئے کچوریوں میں شکر ملا دی جائے یا لڈوؤں میں پسی ہوئی سیاہ مرچیں ڈال دی جائیں مولازادہ آج اپنی عقل سے ملاں جی کے فتوے کا رد کر کے آئے تھے - زن، زر، زمین کا وہی ازلی تضیہ تھا - ہمارہ " زن " کے معاملہ میں فریادی تھے، کوڑیا مہاجن کے مزدور " زر " کے اور خود مولازادے زمین کے نالشی تھے اور سب کے انٹریسٹ اس وقت ایک مرکز پر جمع اور ایک ڈورے میں پرو دیئے ہوئے تھے —- پشتینی پریتوں اور پنج وقتہ کے پیش امام کی تلقین، منشی کمال شیر خاں کا حکم اور بندہ علی کی آبائی اور پشتینی قوت ہر طاقت بہت سے بے زبانوں اور کمزوروں کے مقابلہ پر بیکار اور کمزور اور ہر آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی - ادھر بڑی بیگم کی اعلان کردہ مراعات کا بھی بہانہ تھا سب کے سب دیکھتے ہی رہ گئے شودروں کی پنچایتوں اور بے زمین

کھیت مزدوروں کی برادریوں نے طے کر دیا کہ کوڑی مل مہاجن کی تمباکو کی فصل پر کوئی کام کرنے نہیں جائے گا چاہیں بھوکوں مر جائے اور جو کوئی جائے گا اس کو برادری سے خارج کر کے حقہ پانی ڈال دیا جائے گا گویا مینش شدہ کے درجے سے بھی خارج ہو جائے گا۔ اور حقہ پانی ڈال دینے کے بعد فرد انسان بلکہ یوں کہئے جاندار کے درجہ سے بھی گر کر بے جان مٹی اور سرد ٹھنڈی افتادہ زمین کا ٹکڑا رہ جاتا ہے۔ اور یہ پنچایتی برادری والی قومیتوں کا بے پناہ ہتھیار ہوتا ہے۔ مولازادوں کے پیٹ پر لات پڑی تھی اور چماروں کی عزت پر جوتا، وہ بھوکے بیٹھے رہے تھے اور یہ چیتل ناگ اور ناگ بھیڑیوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ دس ہزار سالہ ہزیمت خوردہ چمار پلٹ کر تعاقب کرتے ہوئے برہمنوں کے رُو در رُو آئے تھے، ڈھٹائی کے ساتھ پیپل کا پتا ہاتھ پر رکھ کر عہد کیا، مولازادوں نے کعبہ رخ ہاتھ اٹھا کر قسم کھائی اور گندے نالے کی لہریں بجائے دکھن کو چلنے کے اتر رخ چڑھنے لگیں، اور چڑھتے چڑھتے گنگوتری کی چوٹی تک جا پہنچیں ——

اضوارے اندر دنیا بھر میں آرے آرے ہو گئی کہ چماروں نے چودھریوں کا حقہ پانی ڈال دیا۔ اپنی کیلی کے بجائے زمین نے سورج کے گرد ایک الٹی پھیری کی لی۔ پرلو ہو گئی۔ جس نے سنا دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گیا یہ منشی کمال شیر خاں کے ممالک محروسہ میں وقوع پذیر ہوا تھا، جن کے متعلق مشہور بات تھی کہ پروائی پچھیاؤ بھی ان کی آنکھیں اور تیور دیکھ کر چلا کرتے ہیں پھر مہاجن کی تھیلی کی ناکامی کا بھی پہلا تجربہ تھا۔ آج بستی لوہے اور سونے کی ازلی آویزش میں ساوات نگر کے اندر بیچ اٹ سونے کے روز روشن میں آنے کے بعد آج پہلا دن تھا کہ لوہے کے مقابلہ میں کم وزن ثابت ہوا تھا، اور سر جھکانے موڑنے اور توڑنے میں ناکام رہا تھا۔ بہت سے بکے سروں پر تھوپنے کے لئے چند بادی النظر میں بڑے کمائی بڑھنے کھوپڑیوں کے گڑھے ہوئے تھے، جو دس پر وڈینس پر ٹھیک ٹھیک معنوی اور کتابی معنوں میں پورے اترتے ہوئے عین انصاف اصول، کبھی کبھی تاریخ کے کف دردہاں دھارے کی زد پر تنکے کی طرح یہ چلتے ہیں اور عین انصاف عین ناانصافی ہو جاتا ہے، آج ندن کی ازلی منڈی میں کچی چاندی اور پکا سونا مندا اور کھوٹا ثابت ہوا۔ کوڑی مل مہاجن کی اشرفیاں روپے، اٹھنیاں، چونیاں دونیاں، اکنیاں، پائیاں جیسی عجیب الطرفین مستورات تھیلیوں میں منہ چھپائے بند تجوریوں کے کونوں پڑی رہ گئیں اور لوہے کے نیچے، کھرپیاں، پھاوڑے ڈھٹائی کے ساتھ اس شکست کو کھڑے دیکھتے رہے جن کے جال کی کڑیوں کی مقناطیسیت اس حد تک زائل ہو گئی کہ اس کے قابو میں وہ پھنسی پھنسائی ازلی مچھلیاں بھی نہ آسکیں جو برسوں سے سود در سود کے چکر میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی کاشت کے مستقل ملازم جنہیں پیشگی تنخواہ کی ادائیگی نے ملازم سے بڑھ کر غلام بنا رکھا تھا وہ بھی کھا کر مکر گئے۔ اور سبز شاداب تمباکو کی فصل کرسانی نلائی کے انتظار میں کھڑی سوکھ گئی۔ اور کوڑیا مہاجن کی موٹی موٹی گداز روئی دھکی اپنی کلائیوں میں تو اتنی بھی جان نہ تھی کہ سینکڑوں ایکڑ میں سے ایک گٹھا بھر ہی تمباکو اتنی کو تجارت تو در کنار اپنے پینے کے ہی قابل آب پاشی گڑائی نلائی کر کے تیار کر لے۔ مہاجن کی دولت، بندہ علی کی حکومت، منشی کمال شیر خاں کی شجاعت اور پنڈت جی کی خطابت و سیاست سب کی سب خام تمباکو کی جلی فصل کے ساتھ درمیدان ڈھیر ہو کر رہ گئیں ........ سب کے سب چیتل ناگ کی طرح اپنی اپنی جگہ پر بل کھا کر رہ گئے اُدھر وہ سب نیولے ہو رہے تھے۔ اور چیتل ناگ اور کھسیائے ہوئے ہوئے نیولے آمنے سامنے تھے ..... اور سانپ و نیولے کے معرکے میں یا یہی باقی رہتا ہے یا وہی۔

(۶)

چت سے کے قانون کا ہر پانسہ بندہ علی اور کوڑی مل مہاجن کا ازلی مقدر رہا۔ شدہ دل مولازادوں کی یہ پنچائت ٹھوکتے ہوئے گمبد ٹھوں سے گول سے زیادہ رہتی فرق صرف اتنا تھا کہ وہ آدھی رات کے بولا کرتے ہیں اور یہ غول بیابانی دن ڈھلے چیخا تھا جس کا مطلب دیکھنے والے یہ سمجھے کہ یہ بھی مالک کے کان تک پہنچانے کے لئے کوئی فریاد کی کارگزرتم ہے۔ یا شاید گردوں رو معافی خواہی کے لئے پیش ہونے کے لیے تمہید ہے۔ اور ابھی ترپ کا ایک اور اکا بندہ علی کے ہاتھ میں تھا۔ وہی قانون پھر حرکت میں آیا جس کو آئین نیم دستور دیہی واجب الارض شد آمد قدیم کی لمبی ترکیبوں والا نام دیا گیا ہے اور جو روایت پر مبنی ہونے کے سبب عدلیہ و مقننہ دونوں کی ترمیم و تنسیخ کی دسترس سے باہر ہے۔ اور اس کا نفاذ بھی تازہ ہوا اور سورج کی روشنی کے انداز میں ہوتا چلا آتا ہے اور جس کا استعمال بھی کچھ اسی نہج پر گھر بیٹھے ہوتا چلا آیا ہے اور کسی حقدار کو اس کی دادرسی کے لئے آج تک عدالت کے دروازہ پر دستک دینے کی نوبت نہ آئی تھی لیکن آج یا انہونی بھی ہو کر رہی کوڑی مل مہاجن کے نام کی آڑ سے اس حق کے لئے عدالت میں نالش نہ کرنی پڑی اور اس کمزوری پر آس پاس کے زمینداروں کی چھاتیاں دہل کر رہ گئیں۔ راج گنواروں کو قرب قیامت کی نشانیاں نظر آئیں نالش اور فریاد تو کمزوروں کا عمل ہے۔ شدہ دل کی پنچائت بادی النظر میں معافی ملتوی اور ڈنڈ جرمانہ بھرنے اور براہ راست اس معاملت کو کوڑیا مہاجن پر چھوڑنے کا مطالبہ یا درخواست معلوم پڑتی تھی اس باغیانہ اقدام پر علاقہ کا ہر آدمی انگشت بدندان رہ گیا تھا جیسے کرنے والوں کو بھی خود اپنے اوپر یقین نہ آیا تھا اور اس نالش کی کارروائی پہ دوسری شق کسی کے وہم و گمان میں تھی۔ کہ اپنی حق طلبی کے لئے منشی کمال شیر خاں مختار عام در عدالت کھٹکھٹائیں گے انھیں تو ساری عمر تعزیرات ہند، ضابطہ دیوانی اور ٹیننسی ایکٹ تینوں جلدیں بغل میں دبائے ایک ہی ڈنڈے سے سب کو اپنے راستہ ہانکتے کٹی تھی بہرحال ہوا وہی جو وہ اپنے ہاتھ سے آن کی آن میں جادو کا ڈنڈا گھما کر کر لیا کرتے تاہم یہ کتابیں کھلیں اور ذرا تاخیر سے انصاف ہو سکا۔ عدالت میں مدعا علیہم جواب دہی کے لیے نہ گئے یک طرفہ ڈگری بیگار کے استقرار حق کی ہو گئی اور ساتھ ساتھ مخصوص رنگ لیڈر نوعیت کے لوگوں پر آئندہ کے لیے حکم امتناعی جاری ہوا کہ مزدوروں کو کام پر جانے سے نہ روکیں۔ اس عدالتی فیصلہ کے سہارے کوڑیا مہاجن نے اپنی تمباکو کی فصل پر کام کے لیے نہ جانے کے سبب اپنے حصے کی بھاری رقم کے مطالبہ کا دوسرا مقدمہ دائر کر دیا۔ اور قرقی قبل فیصلہ میں کوئی جائداد مال تو نہ تھا مگر مدعا علیہم کے گھر گھر گائے بھینس، بھیڑ بکری تھیں، جو ان بے زمین غیر کاشتکار دیہاتیوں کا اب واحد روزی کا سہارا تھیں اور مہاجن نے ان تمام مویشیوں کو قرق کر کے کانجی ہاؤس، داخل کرنے کا پروانہ حاصل کر لیا اور فوراً قرق امین عدالت کے ذریعہ گھر گھر چھاپہ مار کر بھینس سے لے کر میمنے تک ہر جانور قرق کر لیا اور سب کے سب کانجی ہاؤس ہنکوا دیئے۔ اس طرح کاشتکاری تمدن سے دھکا دے کر پہلے انھیں گلہ بانی میں پھینکا اور اب پتھر کے دور والے شکاری بن کر رہ گئے۔ بستی کا تھان تھان ویران ہو گیا، اور ایک مرتبہ پھر موت کا سناٹا طاری ہوا اور موت کے سناٹے میں سے اندھیری رات کی چادر کی آڑ میں پھر زندگی کیچوے کی طرح رینگ آئی۔ اور آن کی آن میں کیچوا کن کھجورا بنا اور کن کھجورا سانپ ہو گیا اور سانپ بھی چیتل افعی ——اور اس اندھیری رات کی حدیں روزگار کی صبح سے ملی ہوئی تھیں۔ پہیوں کے بل چل چل کر راتوں رات گرد و نواح ہو گئی اور گھر پیچھے ایک ایک جوان خاموشی ساتھ ہاتھ میں لاٹھی اور سر ہتھیلی پر رکھے نکل گیا۔ اور اسی دوران کوڑیا مہاجن کے دعوے کی تائید کے لئے عدالت میں حاضر ہو کر بندہ علی کا بیان دینا ناگزیر ہو گیا۔ بندہ علی کے اس نوعیت کے اور سب کام ان کے مختار عام منشی کمال شیر خاں کے ذریعہ ہوا کرتے تھے۔ اور خود بندہ علی کے عدالت میں جانے کی نوبت نہ آتی تھی لیکن اس کیس میں خاص طور پر عدالت دیوانی نے طلب کر لیا۔ اگرچہ یہ معمولی بات تو بالکل

نہ تھی کہ عدالت میں بیان دیئے جائیں تاہم بندہ علی کی حیثیت کے لوگ مختارِ عام کارندے اسی لئے رکھا کرتے ہیں کہ فکرِ معاش کے ترشح استغنا
میں زیادہ سے زیادہ وقت غمِ دوراں سے دور رہ کر خضوع و خشوع کے ساتھ ہمہ وقت غمِ جاناں میں ڈوبے اور ماسوائے مستثنیٰ رہ سکیں سیٹھ کوڑی
مل مہاجن نے اپنے ذاتی کام میں سرکار کو تکلیف دینے کا مقررہ نذرانہ بھی پیش کیا ورنہ اراضی میں مخصوص حقوق کاشت اور دستورِ دیہی کے مطابق
بیگار کا تحریری اختیار دینے کے بعد وہ مردے کو آخری منزل تک پہنچانے کے ذمہ دار تو نہ تھے، اگر یہ حقوق لینے والے کے ہاتھوں میں جان ہوگی
تب ہی ٹھونک بجا کر خریدے گا۔ پھر اصل بات تو یہ تھی کہ معاملہ یک فریقا تھا، دوسرا فریق بے جان بھی تھا ساتھ ہی ساتھ سرکش بھی، اگر اس وقت
وہ لوگ آکر اپنی داد رسی چاہتے تو کوئی بات نہ تھی، بندہ علی کے طبقہ میں عام دستور تھا بالکل یہی حقوق اسی طرح ان کے نام بھی تحریر کر دیتے جو انہوں
نے کوڑی مل کے نام لکھے تھے گویا ایک مُردا پہلے کوڑی مل کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد دوسرا پرچہ ان کے ہاتھ میں دے دیتے اور پھر کوڑی مل
جانے وہ جانیں۔ یا اگر دونوں میں سے جو کوئی بھی فریق نذرانہ کی رقم بھر مٹھی دیتا تو بیان میں اس کے حق میں کہہ دیتے کیونکہ اس طبقہ میں زبان دینے
لینے کے متعلق اصول یہ ہے کہ "جس وقت جو کچھ ہم کہیں وہ ہماری زبان ہے" اور ہمارا کوئی عمل غلط کی تعریف میں نہیں آسکتا" بہرحال عدالت میں
بندہ علی کا جانا ناگزیر تھا اور منشی کمال شیر خاں نے اس کو مزید وزن دیا اور خاص اہمیت کے ساتھ بھاؤ بڑھانے کے لئے پبلسٹی کی کیونکہ زمامِ ریاست
مضبوطی کے ساتھ ہاتھ میں آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سرکار کو تکلیف دی جا رہی تھی، کوڑی مل مہاجن نے ہاتھ کھول کر خرچ کیا، بندہ علی کو
گیارہ تولہ سونا پیش کرنے کے علاوہ منشی کمال شیر خاں سے لے کر دوسرے نمبر کے کارندوں اور بندہ علی کے ذاتی خدمت گار تک کو نذرانہ اور انعام اکرام
سے نوازا۔ ادھر عدالت کے سب چھوٹے اہلکاروں کو مقررہ چڑھائی، اٹھنی روپیہ کے بجائے ایک روپیہ سے شروع کر کے پانچ روپیہ تک "دستِ غیب"
کرایا، اور اس کے عوض پیشکار عدالت سے بندہ علی کی مرضی کی اپنی سہولت کے مطابق تاریخ اور خاص طور پر وقت مقرر کرایا تاکہ انتظار نہ کرنا پڑے
اور سرکار کے پہنچتے ہی مقدمہ پیش ہو جائے۔

چنانچہ قصبہ سے بعد دوپہر ہاتھی پر سوار ہو کر بندہ علی اور منشی کمال خیر خاں تقریباً ۲ بجے کچہری پہنچے اور سب کام پہلے سے تیار تھا، آسانی یہ
تھی کہ فریقِ ثانی میں سے عذر داری جواب دعوے کے لیے کوئی آیا ہی نہ تھا اور یہ بھی شاید آقا کی ہیبت کے طفیل تھا، بہرحال رو در رو مالک کا در عدالت
سامنا کرنا بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنا تھا خواہ معاملہ مفاد کوڑی مل مہاجن ہی کا کیوں نہ ہو اس نظام میں تو غیر جبلی غیر فطری امر تھا، جیسے غضبناک شیر کے
قابو پر پھیر آنکھ میں آنکھ ڈال کر آجائے پھر پہلا تجربہ تلخ ہی نہیں مکمل طور پر تباہ کن تھا جس کا خمیازہ ان کی پشتیں تا ابد بھگتتی رہیں گی۔ مہاجن کے دعوے کی
مدید میں بھی کسی مدعا علیہ نے کوئی عذر داری داخل نہیں کی تھی اور تائید میں معزز اور معتبر ترین متعلقہ شخصیت میر بندہ علی کا بیان ہو گیا، سول جج نے
ن ختم کرتے ہی اسی پر حصر کرتے ہوئے اسٹینوگرافر کو بلا کر مختصر سی تجویز بول دی اور سولہ آنہ ڈگری دے دی۔ کوڑی مل مہاجن اس طرح مقدمہ جیت
نے پر کہ ہڑ لگی نہ پھٹکری رنگ آیا چوکھا، بہت خوش ہوا۔ اور سرگوشی میں منشی کمال شیر خاں کے سامنے قصبہ پہنچ کر فوراً ہی بابِ عالی پر "نذرِ شکرانہ"
لیکر حاضر ہونے کی اجازت چاہی جس کو منشی کمال شیر خاں نے وہیں کچہری پر کھڑے ہی کھڑے چلنے سے پیشتر ہی سرکار کے کان میں ڈالا "گھی چپڑی
اور دو دو" سرکار کیوں نہ منظور کرتے کے ساتھ ہی مہاجن نے دوسری اجازت چاہی کہ اسی ہاتھی پر اس کو بھی سرکار کے ساتھ ساتھ قصبہ میں ساتھ
لے جایا جائے تاکہ فوراً پہنچتے ہی نذر گذار دے، اور یہ ذرا رقت کا بند تھا۔ اور بندہ علی نے بہت کچھ پس و پیش کیا۔ جنیو پہننے والوں میں
کمترین مہاجن تو ویسے ہے جس کو تقریباً شودر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ راجپوت خواہ اس کا مقروض ہی ہو لیکن مہاجن کو اپنے سامنے منہ نہ لگنے

چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور آج کوڑیا مہاجن ہاتھی پر سوار ہو کر ساتھ جانا چاہتا تھا۔ گنیش جی (ہاتھی کی شکل کے دیوتا) کی توہین جاتی پھٹ جائے گی اور بندہ علی کے بزرگوں کی قبریں شق ہو جائیں گی! لیکن بنیا نفع نقصان کی ترازو سوتے میں بھی ہاتھ میں رکھتا ہے، وہ اس طرح سرکار کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر یہاں سے وہاں تک جانے کی قیمت خوب سمجھتا تھا اور اس سفر میں جو سنہری روپہلی منزل ہاتھ آتی تھی وہ بھی سامنے تھی۔ اس درجہ پر فائز ہونے کے بعد متعلقہ لوگوں پر اس کی ہیبت طاری ہو جائے گی اور پھر تھوڑے سے روپیہ کے مزید اضافے میں کام چل پڑے گا چنانچہ بدستور دیسی واجب الارض آئینی مہم کے ذریعہ سرکار جملہ متعلقہ کاشتکاروں سے رقم نیلامہ کا جو نذرانہ وصول کرنے کے مجاز ہو جاتے تھے وہ بغیر ہی خریداری کے کوڑیا مہاجن نے پیش کی، گویا اس طرح تقریباً اس ہاتھی کو خرید کر پیش کر دیا جس کی پیٹھ پر اس وقت وہ سرکار کے ساتھ بیٹھ کر جانا چاہتا تھا اور یہ نذر سرکار نے قبول فرمالی۔ ساتھ ہی ساتھ منشی کمال شیر خاں اپنی مقررہ نذر سے اور ہاتھی کے دونوں نوکر مہابت اور چرکٹا، بندہ علی کا ذاتی خدمت گار سب کے سب انعام اکرام سے نوازے گئے۔ اور ہاتھی اس ترتیب کے ساتھ اور اس ترتیب کے ساتھ آدمی و ہاتھی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا لدا پھندا ہاتھی کچہری سے قصبہ روانہ ہوا کہ صدری نشست یک نشستی ہودے کی تھی جس میں سرکار براجمان تھے بقیہ گدے پر سرکار کے پیچھے خدمت گار داہنے ہاتھ پر منشی کمال شیر خاں، ان کے پیچھے چرکٹا اور سب سے پیچھے پٹھول کے ڈھلان اور دم کے جڑاؤ پر کوڑیا مہاجن لٹکنے، چپکنے اور بیٹھنے کے بین بین ممتاز نہ سہی لیکن نمایاں —— قصبہ پندرہ میل تھا۔ ہاتھی چل پڑا۔ کچی سڑک پر تقریباً گیارہ میل طے کرنے کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ راستہ کے کنارے قدیم جنگل کے دور کی باقیات چار پانچ ایکڑ رقبہ پر ایستادہ پرانے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک گھنا قطعہ ایستادہ تھا جس کے اندر کسی بزرگ کا مزار تھا، راستہ سے بالکل ملحق ایک چھوٹا سا کنواں اور بنجر اراضی کا چھوٹا قطعہ تھا اور یہیں سرکار نے نماز پڑھنے کے لئے ہاتھی بٹھلانے کا حکم دیا۔ مہابت نے ڈول رسی نکال کر جلدی جلدی پانی کھینچا۔ خدمت گار نے چادریں بچھائیں۔ پانچ کے پانچ سرکار کی امامت میں نماز ادا کرنے کھڑے ہو گئے، کوڑی مل دوسری جانب ہاتھی کے پھوٹے سے دھوک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یک دم جھاڑیوں کے اندر چاروں طرف سے ٹھ بندر جوان نکل پڑے، ایک ایک قزاق رہزن کو اچھی طرح پہچان کر کوڑیا مہاجن تو پانی بھرنے کی رسی کے سہارے بڑی چابک دستی کے ساتھ چپکے سے کنوئیں میں اتر گیا۔ اور یہ سب کا سب گروہ ان پانچ آدمیوں پر لاٹھیاں برساتا آن ٹپا۔

...... فضا میں ایک مرتبہ تو منشی کمال شیر کی مخصوص شیر کی سی غرّوں سنائی پڑی اور پھر تو آدھ گھنٹہ مسلسل بجز سڑک پر جھرمٹ پٹنے جیسی آواز کے اور کوئی آواز بھی نہ سنائی دے سکی۔ ڈھائی سو آدمی اور پانچ نفر ایک ایک پر پچاس پچاس کا اوسط۔ اور دوسرے روز علی الصبح جب تھانہ دار پانچ کھڑے لے کر موقعۂ واردات پر پہنچا تو لاٹھی کے کٹھل گوٹوں سے قیمہ کی ہوئی چھوٹی بڑی ڈھیریوں کے علاوہ کوئی سالم لاش بھی نہ پا سکا اور نہ پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر ہی رپورٹ میں کسی کھوپڑی کو کسی دھڑ پر فٹ کر سکا۔ البتہ گوشت کے متفرق ڈھیر میں ایک انگلی ہاتھ آئی جس میں نیلم کی اٹکی ہوئی ایک انگوٹھی سے اتنی شناخت ہو سکی کہ یہ بندہ علی کی تھی ۔۔

# ہنسی آ گئی

محمد احسن فاروقی

محمود کو وزیرن کے ساتھ کئی دفعہ سب سے الگ ہو کر ملتے ہوئے اور کئی دفعہ آرٹ ہاؤس سے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھنے کے بعد ایک دن میں نے پوچھا "ابے یہ کیا تو نے لگا رکھا ہے؟"

"اس نے کچھ خاموشی کے بعد مسکرا کر کہا "میاں پیسے آپ دیتے ہیں اور مزے میں کرتا ہوں۔"

میں چونک پڑا۔ اس نے میرے راز کی طرف یوں ذکاوت کے ساتھ اشارہ کر دیا۔ میں چائے کی میز پر تھا وہ ادھر ادھر آ جا رہا تھا۔ وہ گرم گرم پراٹھے لینے گیا۔ میں سوچنے لگا۔ وہ برابر دیکھتا رہا تھا کہ میری وزیرن پر نظر تھی۔ وہ کسی نہ کسی بہانے میرے پاس آ جایا کرتی تھی پیسے مانگا کرتی تھی۔ میں دے دیا کرتا تھا۔ ایک مانگتی تھی تو دو دیتا تھا۔ وہ جوان تھی۔ گوری تھی۔ اس کا جسم اور اس کی صورت نے میرے دل میں گھر کر لیا تھا۔ میں اس کے حالات بھی جانتا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے مار کر نکال دیا تھا اور وہ ماں باپ کے پاس آ گئی تھی۔ میرے دریافت کرنے پر وہ اپنا حال بتاتے ہوئے رونے بھی لگی تھی۔ آنچل سے آنسو پونچھنے کے انداز پر مجھے اس پر ترس بھی آ گیا تھا۔ وہ کئی کئی دفعہ میرے پاس آنے لگی تھی۔ میں اسے محبت کی نظر سے دیکھتا۔ وہ قریب آ کر پیسے مانگتی۔ یہی دو آنے چار آنے۔ میں دن میں اسے قریب ایک روپیہ تو ضرور دے دیتا۔ کسی کسی دن ایک سے زیادہ بھی ہو جاتے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے لئے کوئی مستقل انتظام کر دوں اور ہاں میرا اس سے مستقل تعلق بھی ہو جائے مگر میری اس کو چھونے کی اب تک ہمت نہیں ہوتی تھی۔ محمود یہ سب چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا اور ......

محمود میز کے پاس آیا اور پراٹھے میز پر رکھ کر سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میرا بچپن کا ساتھی تھا۔ میری والدہ کا پالا ہوا ہمیشہ میرے ساتھ رہتا تھا اور مجھ سے ہمیشہ کھل کر بات کر لیتا تھا۔ اسے سر سے پیر تک دیکھ کر میں ہنسا اور کہنے لگا "مجھے یہاں آئے ہوئے دس دن سے زیادہ تو ہو گئے ہوں گے۔ میں آنے کے ایک دن بعد سے دیکھ رہا ہوں کہ تو وزیرن سے مل رہا ہے آخر معاملہ کیا ہے؟"

"میاں آپ آنے والے دن ہی سے اسے پیسے دے رہے ہیں۔ میں نے کہا پیسے فضول پھک رہے ہیں۔ آپ سچا ہی کریں گے میں پیسے وصول کر لوں۔ تو دوسرے دن جب وہ آپ کے پاس سے نکل کر آئی تو میں نے ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا اور گھسیٹتا ہوا ادھر آرٹ ہاؤس میں لے گیا سو ! ارے دل سے چھوڑ دو چھوڑ دو۔ یہ کیا کرتی ہو ئی۔ گھسٹتی چلی گئی اور پھر میں نے ....

"ابے تو نے یہ جسارت کی اور یہ زبردستی، بڑا بدمعاش ہے۔"

"ایسوں کے ساتھ یہی کرنا چاہئے۔ آپ کا حسرت سے دیکھنا پیسے دینا۔ دل کی بات دل ہی میں رکھنا۔ سوچتے رہنا یہ کریں گے وہ

کریں گے شریف اور آپ کے درجہ کی عورتوں کے لئے ٹھیک ہے۔ مگر یہ بجنی۔ آپ کو ٹھگتے جائے گی اور بنتی رہے گی فضول میں آپ کا پیسہ جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ بچپن سے ہوں آپ کو سمجھتا ہوں۔ آپ ان کے ساتھ بھی ویسا سلوک کرتے ہیں جیسا اپنے درجہ کی عورتوں سے کرتے ہیں۔ میں نہ معلوم کتنے بار دیکھ چکا ہوں۔ ان کی روپیہ سے پیسوں سے مدد کی وہ راضی ہو گئیں۔ یہ عورت بڑی سیانی ہے۔ یہ آپ کو ٹھگتے جائے گی۔ میں سب پیسے وصول کرتا جاؤں گا۔ میں نے یہی طے کر لیا ہے۔"

اس وقت بات ختم ہو گئی مگر میری وزیرن کی طرف توجہ میں ایک خاص فرق آ گیا۔ مجھے قریب قریب سب ہی عورتیں اچھی لگا کرتی تھیں۔ ان کے خاص طور پر حسین ہونے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں حافظ کے اس نظریہ کا قائل تھا ؎

شاہد آن نیست کہ موئے و میانے دارد بندۂ طلعت آن باش کہ آنے دارد

اکثر ایسا ہوا کہ جسے لوگ بدشکل کہتے اس میں بھی مجھے آن نظر آئی اور میں اس پر سر دھننے لگا۔ وزیرن کو دیکھتے ہی وہ میرے دل میں سما گئی تھی۔ میں اسے محویت سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ مسکرائی تھی اور خاص ادا سے مجھ سے آنکھیں ملا کر جھکا لی تھیں اور سنجیدہ ہو گئی تھی، وہ بار بار میرے سامنے آتی رہی تھی اور میں اس کے جسم کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کی تندرستی بھرا بھرا جسم اور سخت سخت گوشت خاص طور سے دلکش ہو گیا تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا مگر اس میں میلاہٹ تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اُسے خوب صابن سے مل مل کر صاف کیا جائے۔ اس کے کپڑے بھی بہت میلے تھے اور ان کو بدلوا کر صاف ستھرے کپڑے پہنانے کو جی چاہتا تھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے مگر دو چار پھیروں کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ انھیں ٹھیک کر کے چٹیاں بنا کے میرے سامنے آئی۔ چھوٹی سی چوٹی پیچھے لٹکتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا چہرہ بھی زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ پورے جسم سے زیادہ دھلا ہوا ہونے کی وجہ سے صاف گورا نظر آیا۔ ماتھا چوڑا ہی تھا مگر اس پر ایک نشان تھا۔ آنکھیں بڑی تو نہیں تھیں۔ مگر چہرہ پر مناسب معلوم ہوتی تھیں۔ گال سُرخ تھے اور ان کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے ان کے اور ٹھوڑی کے درمیان بڑے دلکش گڑھے نظر آتے تھے۔ ٹھوڑی بھی نکلی ہوئی تھی اور اس کے اُوپر بڑا دھانا تھا۔ ہونٹوں کی ساخت ایسی تھی جیسی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ باتیں کرنے میں اور مسکرانے میں ان کی خاص حرکت نظر آتی جو دل کو تڑپا دیتی۔ میرا تجربہ کہتا تھا کہ ہر عورت کے ہونٹ بالکل منفرد ہوتے ہیں اور ان میں کچھ نہ کچھ خاص ادا بالکل مخصوص ادا ضرور نکلتی ہے جس کی وجہ سے مرد کا سب سے پہلے منہ چومنے کو دل چاہتا ہے۔

ایک دن میں اسے دیکھتا رہا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنے تئیں ہر ہر پہلو سے دکھانا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے بات کرنا چاہی مگر میری ہمت نہ پڑی۔ رات وہ حقیقت سے زیادہ دلفریب مجسمہ کی صورت میں میری نگاہوں کے سامنے رہی اور خواب میں بھی ایک غیبی پیکر بن کر آتی رہی۔ دوسرے دن صبح کو میں ٹہلنے نکلا تو دیکھا کہ وہ آ رہی ہے۔ جوانی کا مست مجسمہ بکری کی پٹھیا کی طرح حرکت میں تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے ٹھہر گئی۔ اس کے ہونٹ دلکش طور پر ہلے اور بڑی سریلی آواز آئی۔

" میاں مجھے کچھ پیسے دے دیجیے۔" اس کے چہرہ پر بے باکی تھی اور یہ کہنے کے بعد اس کے ہونٹ کھلے رہے۔

"پیسے؟ کتنے پیسے؟"
"یہی چار آنے۔"
"بس۔ اچھا چار کی جگہ آٹھ لے لو" اور میں نے پرس نکال کر پیسے ڈھونڈھے۔ نظر ایک روپیہ پر پڑی اور اسے نکال کر میں نے اُسے دیتے ہوئے کہا "لو یہ روپیہ لے لو۔ جب بھی ضرورت ہو۔ روپیہ دو روپیہ مجھ سے مانگ لے جایا کرو۔"
یہ کہہ کر میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اس کے چہرہ پر مجھے کشش بے بسی نظر آئی۔ میں نے رک کر کہا "تمہارا نام کیا ہے۔ کون ہو؟ کہاں رہتی ہو؟"
اس کے گالوں پر خون دوڑا اور وہ کہنے لگی "میرے ابا آپ کے اسامی ہیں۔ اماں آپ کی اماں کو یاد کرتی ہیں۔ آپ کی دولہن جب یہاں آئی تھی تو اماں ان کے پاس آیا کرتی تھیں۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ وہ بڑی حسین ہیں بڑی اچھی ہیں۔ میرا نام وزیرن ہے۔ میں ایک اور گاؤں میں بیاہ گئی تھی پانچ برس ہو گئے۔ میاں مجھے بہت مارتا تھا۔ ہڈی ہڈی توڑ ڈالتا تھا اور اب اس نے مجھے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا۔ کہتا ہے تو بانجھ ہے۔ میں دوسری شادی کر دوں گا جس کے بچے ہوں گے۔ تو بنجر زمین۔ ایسی محنت سے کیا فائدہ میری قسمت ہی خراب ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آئے اور ٹپ ٹپ ٹپکنے لگے۔ وہ میلے دوپٹے کے آنچل سے انہیں پونچھنے لگی۔
"رو نہیں۔ مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ خیر تم کو جب بھی ضرورت ہو۔ میرے بنگلے کے اندر بغیر ڈر کے چلی آیا کرو اور مجھ سے پیسے لے جایا کرو۔"
یہ کہہ کر میں آگے بڑھا اور وہ مخالف رُخ چلی گئی۔
میں شہر سے اکتا کر اور خاص طور سے اپنی بیوی کی زبردستیوں سے متنفر ہو کر گاؤں میں دل بہلانے کو آیا تھا۔ یہاں قدرتی مناظر اور سکون کی زندگی میں وقت کاٹ کر اطمینان حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر آتے ہی یہ عورت سامنے آ گئی اور وہ عاشق مزاجی جس کی وجہ سے میں نے اپنی بیوی کو پسند کیا تھا اور اسے التجاؤں کے بعد شادی کرنے پر راضی کر لیا تھا پھر عود کر آئی تھی۔ مجھے بیوی کے نخروں کی وجہ سے تمام عورتوں سے نفرت ہو چکی تھی اور میں طے کر چکا تھا کہ عورتوں کی طرف سے منہ پھیر کر زندگی گزار دوں گا۔ مگر میں جس سکون کا خواب دیکھ کر یہاں آیا تھا اس میں آتے ہی رخنہ پڑ گیا تھا؟ کیا یہ عورت زبردستی میری زندگی میں کود آئی تھی؟
باغوں اور کھیتوں کے درمیان ٹہلتے ہوئے اس کا تصور میری آنکھوں کے سامنے تھا اور وہ مجھے قدرتی فضا کا مثالی مجسمہ یا اشارہ معلوم ہونے لگی وہ مجبور تھی۔ مدد کے قابل تھی اور مجھے اس پر ترس بھی آ گیا تھا۔ میں گاؤں میں سے بھی گزرا اور وہاں بھی میری نگاہ لڑکیوں پر پڑی۔ ہر قسم کی لڑکیاں۔ وہ سب بن بیاہی کھیتی ان کے باپ میرے اسامی تھے۔ انہوں نے مجھے سلام کئے۔ میں نے لڑکیوں کو چادر سے منہ چھپا کر گھر میں گھس جاتے ہوئے دیکھا۔ ایک اسامی نے اپنی تین جوان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "میاں یہ تین پہاڑ سر پر ہیں کچھ مدد ہو جائے تو ان کو پار لگا دیں۔" میں نے مدد کا وعدہ کیا لڑکیوں کو غور سے دیکھا۔ مگر کوئی بھی وزیرن کی طرح اچھی نہ معلوم ہوئی۔ یہ سب کچے پھل تھے۔ ایسے پھل مجھے پسند نہیں تھے۔ وزیرن پورے طور پر پک چکی تھی اور پھر مرد چشیدہ بھی تھی۔

"تو یہی سب سے اچھی رہے گی۔" میرے دل نے کہا۔

بنگلے واپس ہوتے وقت مجھے خیال ہوا کہ وزیرن کو مستقل طور پر اس میں رکھ لیا جائے۔ خوب مانجھ کر صاف کر کے اچھے کپڑے پہنا کر اسے بیڈ روم میں بٹھا دیا جائے اور جب باہر سے آؤں تو وہ لپٹ جائے اور تمام وقت پٹی رہے۔ سکون اور اطمینان کے لئے شہر کو بالکل بھول جانے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوا اور عورت! وزیرن کا شمار عورتوں میں نہ ہونا چاہیئے۔ وہ ان عورتوں کے بالکل متضاد تھی جن پر میں جان چھڑکتا رہا تھا۔ وہ جنگلی جانور تھی جس کو میں پال لینے کا خیال کر رہا تھا۔ میں بلیاں اور کتے بھی پال چکا تھا جو بیوی نے آکر الگ کر دیئے تھے۔ اب مجھے ایک پالتو جانور مل رہا تھا جو اس کے علاوہ ایک حد تک بیوی بھی ہوگا۔ مجھے اس خیال سے ایک خاص قسم کی خوشی ہوئی میں تہذیب یافتہ مجھ پر حکم چلانے والی بیوی سے بھاگ کر قدرتی زندگی میں پناہ لینے آیا تھا۔ مجھے کھیتوں کا باغوں کا ٹھنڈی ہوا کا اور اطمینان کی زندگی ہی کا خیال تھا۔ مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس زندگی کے سب عناصر ایک عورت کے مجسمہ میں سمٹ کر آ گئے تھے۔ اس سے ہمکنار ہو کر قدرت کے سب اثرات مجھے ایک جگہ مل جائیں گے۔ قدرتی زندگی کے ساتھ ایک قدرتی عورت بھی ضروری تھی تاکہ زندگی مکمل بلکہ کامل ہو جائے۔

میں یوں سمجھنے لگا تھا اور وہ میرے یہاں آنے لگی تھی۔ بیڈ روم میں میں مسہری پر لیٹا ہوا سوچتا ہوتا یا کوئی رسالہ پڑھتا ہوتا۔ وہ دروازہ کھول کر اس کے پٹ سے لگ کر کھڑی ہو جاتی۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگتا۔ وہ مسکراتی۔ اس کے چہرہ پر بڑا دلکش رنگ دوڑ جاتا۔ اس کے منہ سے آواز آتی۔ "کچھ خرچہ دیجئے۔" اس کا منہ کھلا رہتا۔ میں پرس سے پیسے نکال کر جتنے بھی ہاتھ میں آتے دے دیتا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش کھڑی رہتی جیسے کہ انتظار میں ہو کہ میں کچھ کہوں۔ پھر میں اسے دیکھتے جاتا۔ وہ اور بھی اچھی معلوم ہوتی۔ میرے جسم میں کوئی حرکت ہی رہ جاتی اک دم سے وہ کہتی "اب میں جاؤں؟"

میرے منہ سے نہ معلوم کسی طرح نکل جاتا۔ "اچھا۔" اور وہ چلی جاتی۔

یہی کچھ روز ہی اور دن میں کئی دفعہ ہوتا رہا۔ ایک دفعہ جیسے وہ باہر نکلی میں اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی سے پھاٹک کی طرف جھانکنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ محمود اس کے پاس آیا اور چھیڑتا ہوا اس کے ساتھ پھاٹک کے باہر نکل گیا۔ مجھے اس بات سے کوئی رقابت محسوس نہیں ہوئی مگر میں ہر بار جب وہ میرے پاس سے نکل کر جاتی تو جھانکتا ضرور۔ مجھے محسوس ہوا کہ محمود تاک میں لگا رہتا ہے اور جیسے ہی وہ نکلتی ہے اس کے پیچھے لگ لیتا ہے۔ کئی دن کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ پھاٹک کی طرف نہیں گئی۔ میں پاس کے بیڈ روم میں آیا جو آرٹ ہاؤس کی طرف تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ محمود کے ساتھ آرٹ ہاؤس سے نکلی اور دونوں باورچی خانے میں چلے گئے

یہ دیکھ کر مجھے بھی جھرجھری آئی اور میں سوچنے لگا کہ اب کی آئے گی تو میں بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لوں گا۔ مگر جب وہ آئی اور میں اسے غور سے دیکھنے لگا تو اس کا میلا کچیلا پن میرے سامنے آ گیا۔ پراسرار طریقہ پر ایک بو سی میری ناک میں آئی اور دل نے کہا "ابھی چھونے کے قابل نہیں ہے۔ اسے خوب صابن مل مل کر بلکہ کوئی تیزابی چیز پانی میں ملا کر خوب نہلایا جائے اور پھر صاف صاف کپڑے پہنائے جائیں تب یہ اس قابل ہوگی کہ میں اسے چھپا لوں۔"

کئی دن میرے دل میں یہی کشمکش رہی۔ ایک طرف اس کا مخصوص حسن جو قدرتی چیز تھا مجھے زیادہ سے زیادہ لبھانے لگا اور

دوسری طرف اس کی گندگی میرے دل میں گھن پیدا کرتی رہی۔ وہ میرے پاس سے جا کر محمود کے پاس ضرور جاتی اور پھر ایک صبح کو میں محمود سے سوال کر بیٹھا۔ اس کا جواب "پیسے آپ دیتے ہیں مزے میں اُڑاتا ہوں۔" مجھے عجیب قسم کا طنز معلوم ہوا اور میں نے طے کر لیا کہ محض پیسے دیتے اور کچھ نہ کرنے کی حماقت سے نکل آؤں گا۔

چنانچہ اس روز جب وہ آئی تو میں نے کہا "کیسی میلی کچیلی رہتی ہے۔ خوب نہا دھو کر صاف صاف کپڑے پہن کر آیا کر۔"

"صاف کپڑے کہاں سے لاؤں۔ کھانے کو تو ہے نہیں آپ سے پیسے لے جاتی ہوں تب تو روٹی چلتی ہے۔ کپڑے کہاں سے آئیں۔"

"سب کپڑے کتنے روپیوں میں بن جائیں گے۔ ایک ایک کپڑا نیا ہو۔ نہانے کے لئے صابن۔ سر میں تیل۔ جسم میں خوشبو سب ہی کچھ کتنے میں آ جائے گا۔"

"بیس روپیہ تو لگ جائیں گے۔"

میں نے پرس سے دو دس کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ وہ میری مسہری سے آ کر لگ گئی اور ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے اس کی سخت سخت باہیں دیکھیں۔ ایسی سخت باہیں میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ مگر ان میں میل اٹا ہوا تھا اس لئے میرا دل انھیں پکڑنے کو نہ چاہا۔ "لے یہ لے جا۔ میں اور بھی دوں گا۔ بہت سے کپڑے بنا دوں گا۔ ہر وقت صاف صاف کپڑے پہنے ہوئے میرے سامنے آیا کر۔ مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے۔ صاف صاف ہو گی تو اور بھی اچھی لگے گی۔"

اس کی پنڈلیاں میری مسہری کی پٹی سے لگنے لگیں اور ان کی دھمک مجھے محسوس ہونے لگی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑوں کا بھپکا ناک میں لگا اور میں اک دم سے بولا "جاؤ۔ اب آنا تو خوب صاف ستھری ہو کر۔"

اس دن وہ پھر نہ آئی اور دوسرے صبح سے دوپہر تک غائب رہی۔ ۲ بجے کے قریب جب میری آنکھ کھلی مگر میں لیٹا ہوا اسی کا ہی تصور کر رہا تھا تو دروازے پر کھٹ سے آواز ہوئی۔ میں نے کہا "کون؟"

دروازہ کھلا اور وزیرن شرماتی ہوئی سامنے آ کر میری مسہری اور دروازے کے درمیان کی جگہ میں جسم کو بڑے دلکش انداز میں توڑا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بال گھسے دار بنے ہوئے تھے۔ کلپیں لگی ہوئی تھیں۔ منہ پر پاوڈر لگا ہوا تھا اور سرخی دوڑی ہوئی تھی۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور ان پر لپ اسٹک کا ڈھیر جمع ہوا تھا۔ چنا ہوا بادامی دوپٹہ سینے پر لہر بنا رہا تھا اور بڑے پھولوں والی سرخ قمیص کے نیچے ابھرے ہوئے سینے آدھے آدھے دکھائی دے رہے تھے۔ پیروں میں سفید شلوار تھی اور چپل میں۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنے کو اپنے بہترین طریقہ پر سجا کر لائی تھی۔

میں وارفتہ ہو گیا اور اکدم سے اُٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر کہا "یہ کیا کرتے ہیں مجھے اچھا نہیں لگتا" اور کمرے کے باہر بھاگ گئی۔

مجھے اس کی اس حرکت پر بڑا تعجب ہوا اور میں مسہری پہ آ کر گر گیا۔ تھوڑی دیر تک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے زور کا طمانچہ مارا اور میں تھورا گیا پھر دماغ میں خیالات کا ہجوم ابھرا اور میں سوچنے لگا۔ وہ اسی طرح سے میرے پاس آتی رہی تھی اور

اتنی بیباک ہو گئی تھی کہ میں سمجھنے لگا تھا کہ بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی اور وہ کچھ نہ کہے گی۔ محمود سے اس کا تعلق صاف تھا اور وہ کسی طرح سے پارسا نہیں کہی جا سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہر طرح تیار تھی۔ صرف مجھی کو کچھ گھن سی آ جاتی تھی۔ اسی لئے میں نے اسے صاف ستھرا ہو کر آنے کا سامان مہیا کیا۔ اگر اس کے ذرا بھی ضمیر ہوتا تو وہ سج بن کر اس طرح اکیلے میں ایسے وقت سامنے آ کر اس ادا سے نہ کھڑی ہوتی۔ سارا معاملہ بالکل راہ پر آ گیا تھا اور میں بغیر جھجکے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ بھی لیا تھا۔ مگر یہ کیا چیز تھی جو اکدم سے اس کے اندر ابھر آئی اور وہ یوں ہاتھ جھٹک کر بھاگی۔ اس کا ہاتھ جھٹک کر بھاگنا بار بار میرے سامنے آتا رہا۔ یہ کیا ہوا تھا۔ اب کیا ہو گا؟ کیا وہ بگڑ گئی؟ کیا اب نہ آئے گی؟ یا آئے گی تو دروازے سے لگی ہی کھڑی رہے گی۔ جی چاہتا تھا کہ اب پھر وہ ضرور آئے۔ اس سے بات کی جائے۔ پوچھا جائے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ محمود سے کیا کوئی اقرار ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مجھ سے بھاگی۔ کیا وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ مجھے محض دیکھنے ہی سے مطلب ہے۔ محض محمود کے مزوں کے لئے روپیہ دے دیتا ہے۔ ممکن ہے محمود نے اسے ایسا ہی کچھ سمجھایا ہو۔

غرض گتھیوں پر گتھیاں پڑتی گئیں اور میں طے کر تا گیا کہ اس معاملے میں محمود کا کوئی خاص ہاتھ ہے۔ میرا وزیرن سے عشق اگر اسے عشق کہئے زور پر آتا گیا اور یہ میری ناکامی اسے اور بھی الجھاتی گئی۔ معلوم نہیں کتنا وقت گزر گیا۔

اکدم سے دروازہ کھلا اور محمود سامنے آیا۔ "میاں چائے تیار لگی ہے۔ اُٹھ کر منہ دھوئیے۔"

میں نے اُٹھ کر محمود کے چہرہ کو دیکھا اس کے ہونٹوں پہ جیسے طنزیہ مسکراہٹ دبی دبی نظر آئی۔ وہ کمرے کے باہر چلا گیا۔

منہ ہاتھ دھو کر میں چائے کے کمرے میں آیا اور چائے پینے بیٹھ گیا۔ چائے پیا جاتا اور بار بار محمود کے چہرہ کو غور سے دیکھا جاتا جس پہ طنزیہ مسکراہٹ اب دبی ہوئی نہیں بلکہ صاف نظر آ رہی تھی۔

"کیوں اب یہ تیرا وزیرن سے معاملہ اب بہت گہرا ہوتا جا رہا ہے؛ تو کہاں تک جائے گا۔ آخر تیرے بیوی بچے ہیں جو شہر میں چھوڑ آیا ہے۔"

"میرا معاملہ گہرا؟" اور اس کی مسکراہٹ اور بھی زیادہ طنزیہ ہو گئی۔

"آخر چپ کیوں ہو گیا۔ کچھ کہنا نہیں۔" میں نے کچھ تندی سے کہا۔

"میاں۔ معاف کیجیے گا۔ معاملہ آپ کا گہرا ہو رہا ہے۔ آپ نے اسے کپڑوں کے لئے روپیہ دیئے۔ بن ٹھن کر آپ کے پاس آئی۔ اب کیا رہ گیا تھا۔ کہوں کیا ہوا؟"

"میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو میرا ہاتھ جھٹک کر بھاگ گئی۔"

محمود اکدم سے ہنس دیا اور پھر بولا۔ "اسی قسم کی عورتیں آپ لوگوں کے بس کی نہیں ہیں۔ اب مجھے یقین ہو گیا۔"

"اس نے ہاتھ کیوں جھٹک دیا؟"

"یہ کوئی بات نہیں تھی سب عورتوں کو کچھ نہ کچھ شرم ضرور آ جاتی ہے۔ چاہے کیسی ہی ہوں پہلی دفعہ جب مرد انھیں چھوتا ہے تو نخرہ ضرور کرتی ہیں۔ مگر یہی تو اشارہ ہوتا ہے تیار ہیں۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ ہاتھ کو اور زور سے پکڑتے بلکہ اینٹھ دیتے اور پلنگ پر گرا دیتے۔ وہ یہی چاہتی تھی اس کی عادی تھی۔ میں شروع ہی سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ اسے شریف عورتوں کی طرح سمجھ رہے ہیں اور مجھے معلوم تھا کہ اس

طرح وہ مچھلی کی طرح آپ کے ہاتھ سے پھسل کر نکل جائے گی اور وہی ہوا۔"

"تو اب کیا ہو گا؟"

"آپ کو اس کا کیا بھا گیا ہے میری طبیعت تو اس سے بھر گئی۔"

"اس کے جسم کی سختی۔ گوشت کی سختی نے مجھے ایک نئی لذت دکھائی ہے۔"

یہ سمجھئے کہ سخت چیز کو سخت بانہوں سے پکڑنے کی ضرورت ہے۔ آپ اس کے ساتھ اس نرمی سے پیش آ رہے ہیں جیسے اپنے طبقے کی عورتوں کے ساتھ آتے رہتے ہیں۔ پھسلے جاتے ہیں۔ ہاتھ بھی پکڑا تو ایسے جیسے آپ کے ہاتھ میں کوئی سکت ہی نہ تھی۔ اسی لیے میں نے کہا کہ وہ آپ کے بس کی چیز نہیں ہے آپ روپیہ دیتے رہئے اور مزے اور لوگ اٹھائیں گے۔

"تو وہ اب ہاتھ سے نکل گئی۔ اب نہ آئے گی۔"

"کیوں نہیں آئے گی۔ ہزار بار آئے گی۔ اگر آپ پھوکے سے ہاتھ پکڑیں گے تو پھر جھٹک کر بھاگ لے گی۔ یہ معاملہ آپ لوگوں میں دوستی اور رضامندی کا ہوتا ہے۔ ہمارے سگوں میں یہ جنگ اور فتح کا معاملہ ہے۔ دیکھئے کہ دشمن کتنا مضبوط ہے اور اتنی ہی زور سے حملہ کر کے فتح کر لیجئے۔ اگر جی چاہتا ہے تو یہ بھی کر کے دیکھ لیجئے۔"

اس کے یہ کہنے سے میرے سوچنے کا طریقہ ہی بدل گیا۔ چائے کے بعد میں کپڑے پہن کر چھڑی ہاتھ میں لے کر ٹہلنے نکلا کرتا تھا۔ گاؤں کی چھوٹی سی آبادی سے نکل کر کھیتوں میں ہوتا ہوا کسی باغ میں پہونچتا۔ وہاں کچھ دیر ٹھہر کر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتا۔ پیڑوں میں لگے ہوئے پھلوں کو دیکھتا۔ پھر آگے بڑھ کر دریا کی طرف جاتا۔ راستے میں ناہموار زمین تھی جس کو کاشت میں نہیں لایا جا سکا تھا اس پہ برسات کے موسم میں دریا بڑھ کر آ جایا کرتا تھا۔ جگہ جگہ جنگلی پودے اگ آئے تھے اور نہ معلوم کیسی کیسی جھاڑیاں تھیں۔ ان میں سے گزرتا ہوا دریا کے کنارے پہونچ جاتا۔ یہاں ایک ناؤ کھینے والا اپنی ناؤ لیے ہوئے نظر آتا۔ میں اسے پیسے دے کر ناؤ میں بیٹھ جاتا اور دریا کے اُس پار جا کر واپس ہوتا۔ اب سورج ڈوبنے لگتا اور میں ساری فضا پر پُر سکون اندھیرا چھاتا ہوا دیکھتا ہوا گھر واپس آتا۔ میں سمجھا کرتا کہ زندگی کا حاصل یہی سکون ہے اور اسی میں زندگی گزار دینا چاہتا تھا۔ شہر کے خرخشے مجھے بوکھلا دیتے اور ان سے فرار حاصل کرنے کے لئے ہی یہاں آ جایا کرتا۔ تین برس ہوئے تھے میں نے شادی بھی کر لی تھی۔ بیوی کو بھی کئی دفعہ ساتھ لے کر اس گاؤں میں آیا تھا۔ مگر وہ یہاں دو چار دن ہی میں اکتا جاتی اور اسے شہر کی تفریحات یاد آنے لگتیں اس لئے یہاں سے واپس ہو جاتا۔ اب کی دفعہ اس نے ساتھ آنے سے صاف انکار کر دیا تھا اس لئے اکیلا ہی آ گیا تھا۔ صرف محمود کو ساتھ لایا تھا کہ وہ سب کام کیا کرے گا۔

مگر اب کی یہاں وزیرن بھی نظر آ گئی تھی اور قدرت کے سکون میں بالکل کھو جانے کے بجائے وہ سر پہ سوار ہو گئی تھی۔ وہ بھی قدرت کا ایک حصہ سارے قدرتی عناصر کا ایک اشارہ تھی۔ مگر وہ درختوں پودوں کھیتوں اور دریا سے مختلف تھی عورت تھی۔ آدمی کی نوع سے تھی اور اس نے اس سکون میں ایک گڑبڑ مچا دی تھی۔ اس نے قدرت پُرسکون سے سوچنے کے بجائے مجھے انسان پر بھی سوچنے کی ترغیب دی تھی۔ پہلے تو وہ مجھے بالکل قدرتی چیزوں کی طرح معلوم ہوئی تھی اور میں اسے اس کی قدرتی جگہ دے کر کامل اطمینان حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔

میں جانتا تھا کہ محمود گاؤں سے گھبرایا کرتا تھا اور شہر واپس جانا چاہتا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ وزیرن کو اپنے پاس رکھ لوں گا اور محمود کو واپس جانے دوں گا۔ وزیرن ضروری کام کر دیا کرے گی اور اس طرف سے مجھے اطمینان رہے گا۔ قدرت میں داخل ہو جانے کے باوجود آخر مجھے ان خدمات کی ضرورت تو ضرور تھی جو محمود انجام دینے کے لئے تھا۔ وہ سب کام وزیرن کر لے گی۔ اور میں قدرت میں محو رہوں گا۔ مگر وزیرن کے آنے کے ساتھ ہی میری قدرت میں دلچسپی کا رخ موڑ دیا تھا۔ یہی بات کہ وہ قدرت کا اشارہ معلوم ہوتی اس تبدیلی کی ابتدا تھی اور پھر اس کا بار بار آ کر مجھ سے پیسے مانگنا اور بھی زیادہ مجھے اس کی طرف متوجہ کرتا گیا۔ پھر میں نے اس کا محمود سے ملنا جلنا دیکھا اور میری توجہ اور بھی زیادہ اس کی طرف ہو گئی۔ قدرت کی طرف توجہ اس میں صبح و شام گم ہو جانے کا کام ایک عادت کی طرح ہوتا رہا۔ مگر میں قدرت سے انسان کی طرف رجعت کرتا رہا۔ وہ قدرتی چیز تھی قدرتی طریقہ پر چل رہی تھی مگر میں اس کی طرف پورے طور سے رجوع نہ ہو سکا جب تک کہ اسے کچھ نہ کچھ انسان یعنی صاف ستھری اور خوش پوش نہ بنا لیا۔ اور جب وہ اس صورت میں آئی اور عورت کی فطرت کے موافق اس نے ایک ناز یا نخرہ دکھایا تو مجھے بڑا شاک تھا۔ مگر محمود کی باتوں نے یہ سمجھایا کہ اسے بھی حاصل کرنا ایک جنگ کے بعد فتح ہے۔

جنگ۔ فتح، زندگی یہی ہے۔ میری قدرت کے سکون میں محویت ایک وہم تھا۔ اور اب قدرت میری نظروں میں بالکل بدل گئی تھی۔ اب میں فضا میں پھیلے ہوئے کھیتوں کو قدرت پر انسان کی فتح کی مثال مان کر دیکھ رہا تھا۔ باغ بھی انسان کے لگائے ہوئے تھے۔ زمین کی کاشت اور پیڑوں کی داشت انسان کا کام تھا۔ قدرت میں بڑی قوت تھی مگر وہ خود بے ڈھنگی کثیف اور بے تکی تھی اس ایک نظام میں لانا۔ ایک ترتیب دے کر اس سے فائدہ اٹھانا انسان کا کام تھا۔ دریا بھی بے لگام چیز تھی۔ انسان نے اس پر ناؤ چلائی اس سے نہر نکالی اور وہ زیادہ مفید اور زیادہ تفریح کی چیز ہو گیا۔ اب تک میں قدرت کا بندہ تھا قدرت کا پجاری تھا اب میں قدرت کو اس نظر سے دیکھ رہا تھا کہ وہ فتح کر کے خوب صورت بنانے والی چیز ہے میرے اندر۔ قدرت کا پیدا کیا ہوا انسان اور قدرت پر فتح پانے والا انسان شاید ہمیشہ سے کشمکش کر رہے تھے۔ پیسے کی فراوانی۔ آرام کی زندگی اور اس پر قدرت کو پوجنے کا فلسفہ جس سے جمہوریت وغیرہ نکلی تھیں، ان سب نے مجھے آرام طلب، سکون کا جویا اور کاہل بنا دیا تھا۔ وزیرن کی طرف توجہ بھی اس کاہلی کا نتیجہ تھی۔ بیوی کو شادی پر راضی کر لینا اور شادی کر کے اس کے ساتھ رہنا ہی اپنی فتح سمجھتا تھا مگر اب وہ بھی ایک قسم کی پسپائی اور شکست معلوم ہو رہی تھی۔

اب تک میں واپسی میں بستی کو کترا کر نکل آتا تھا۔ مگر اب مجھے بستی کے کچے مکان انسان کی قدرت پر فتح کے نمونے معلوم ہوئے۔ شہروں کارخانوں۔ ذرائع آمد و رفت سب نگاہوں کے سامنے آئے پھر سے اور دل میں ایک امنگ پیدا ہوئی کہ انسان کی حیثیت سے مجھے بھی قدرت پر کسی نہ کسی طرح فتح حاصل کرنا ہے۔ میرے گاؤں کو فارم میں تبدیل کرنے۔ اس میں کارخانے بنانے کا منصوبہ بہت پہلے سے تیار تھا مگر اسی پر عمل کو میں ٹال رہا تھا۔ میں قدرت کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیسی حماقت تھی میری تمام زندگی انسان کی قدرت پر فتح حاصل کر لینے ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر قدرت کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ کھیت یہ باغ یہ گاؤں وغیرہ کچھ نہ ہوتے۔ نہیں مجھے وقت خراب کرنے کی بجائے اسی راہ پر آگے بڑھتا رہنا چاہیے۔ بہت وقت خراب کر چکا اب کچھ کرنا تھا۔

اب میں گاؤں کے چھوٹے سے بازار کے بیچ میں سے گزرا۔ لوگ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ مکھیا بڑھ کر میرے پاس آیا۔ میں نے

اس سے کہا۔ "میں اس گاؤں کو بالکل بدل دینا چاہتا ہوں۔ اس بازار میں پکی دوکانیں ہوں گی۔ یہ کمیت فارم بن جائیں گی۔ ٹنکری ل لگے گی سب ہی کچھ ہو جائے گا۔"

وہ ڈر کر کہنے لگا۔ "تو ہم لوگوں کا کیا ہو گا؟"

"تم سب کام کرو گے۔ زیادہ آمدنی ہو گی۔ پکے گھر بناؤ گے۔ زمین میں گھسے ہوئے نہیں بلکہ زمین سے اوپر رہو گے۔"

وہ خاموش رہا۔ مجھے وزیرن یاد آئی جو میرے ہاتھ پکڑ لینے پر گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کیوں وہ محمود سے کوئی الجھن سی محسوس کرتی تھی مگر مجھ سے بھاگ لی تھی۔ میں اس کے باپ کے ڈوٹے ہوئے گھر کے پاس سے بھی گزرا۔ باپ باہر نکل کر آیا اور مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا۔ "تمہارا یہ ٹوٹا گھر بن جائے گا اور تمہیں خوب کام ملے گا۔" وزیرن دروازے تک آئی مگر فوراً ہی گھر میں غائب ہو گئی۔ میں نے اس کی جھلک دیکھی۔ وہ نئے کپڑے پہنے ہوئے تھی دوپٹہ سر پر نہیں تھا۔

میں بنگلے کی طرف روانہ ہوا۔ بستی اور بنگلے کے درمیان میدان سے گزر رہا تھا تو وزیرن جس کی جھلک کا تصور میری نگاہ کے سامنے تھا میرے لئے مرکزی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ جو عزم میرے دل میں آ گیا تھا اور جس اسکیم پر چلنے کا بھی ارادہ کر چکا تھا وزیرن بھی اس کا ایک حصہ ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اس میں کہاں اور کیسے فٹ بیٹھے گی کہ پلٹ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ خاص چال میں مگر کافی تیزی کے ساتھ میری طرف بڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔

میں ٹھہر گیا۔ وہ پاس آئی۔ اس کی سانس پھول گئی تھی مگر بغیر دم لئے کہنے لگی۔ "آپ مجھے دیکھنے آئے تھے ویسے تو گاؤں کو چھوڑ کر ادھر سے نکل آیا کرتے تھے؟"

اس کے چہرہ پر بھولے پن کے ساتھ گھبراہٹ دیکھ کر ہی ہنس دیا۔ میرے اندر تبدیلی کی ایک حد تک وجہ وہی تھی۔ مگر میں جس عالم میں آ گیا تھا اسے وہ سمجھنے کی اہل نہیں تھی۔ میری ہنسی کو وہ اس بات پر خوش ہونا سمجھی کہ وہ میرے پیچھے دوڑی آئی تھی۔

"تم میرا ہاتھ جھٹک کر بھاگ گئی تھیں۔"

"آپ نے اتنے پیسے دیئے روپیہ دیئے۔ میں لیتی رہی۔ آپ مجھے دیکھتے رہے۔ محمود نے کہا تھا آپ کچھ نہیں چاہتے بس دیکھنے بھر کے ہیں۔ مگر اکدم سے آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں بوکھلا گئی۔ گھبراہٹ میں بھاگ جانے کے سوا کچھ نہ سوجھا پھر خیال آیا کہ آپ خفا ہو گئے۔ بس سوچ سوچ کر ڈرتی رہی۔ مگر آپ گھر پر آئے میرے باپ سے نیا گھر بنوانے کو زیادہ اچھا کام دلوانے کو کہا۔ میرا دل بانسوں بڑھ گیا۔ جس تیزی سے آپ سے بھاگی تھی اس سے زیادہ تیزی سے آپ کی طرف بھاگتی آئی۔ دیکھئے ابھی پورے طور سے سانس بھی نہیں سما رہی ہے۔"

"اچھا میرے ساتھ آؤ۔"

وہ مجھ سے دو قدم پیچھے آ رہی تھی۔ میں مڑ مڑ کر اسے دیکھتا جا رہا تھا اور سوچتا بھی۔ وہ بالکل قدرتی تھی۔ قدرت نے ہی اسے مرد پر ٹوٹ آنے پر مجبور کیا تھا۔ قدرت ہی نے اسے ہر شخص سے الگ جانے پر مجبور کیا تھا۔ اس کو برا کہنا قدرت کو برا کہنا تھا۔ میں اس کو انسانی لباس پہنایا تھا اور اب قدرت سے جنگ کرنے کی ایک انسانی تجویز میں بھی فٹ کر دوں گا۔ مجھے یہ بھی خیال ہوتا کہ وہ یہ سب سمجھنے کی بالکل

ابل نہیں تھی اور مجھے ہنسی آجاتی۔ وہ بھی اس ہنسی کو دیکھ کر کھل جاتی۔

بنگلے میں پہنچ کر میں آفس کے کمرے میں گیا۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے میز پر بیٹھ کر دو خط لکھے ایک منیجر کو کہ وہ ٹھیکیدار کو لے کر جلد سے جلد آجائے میں نے تجویز پر فوراً ہی عمل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ دوسرا اپنی بیوی کو کہ اب میں بیکار وقت نہیں خراب کیا کروں گا۔ جس کام میں لگ جانے کی تمہیں ضد تھی اس پر آج ہی سے لگ جاؤں گا۔ شہر نہیں آؤں گا جب تک کام اچھی طرح نہ چل نکلے۔ تمہارا جب جی چاہے یہاں آجانا۔

دونوں خط لئے ہوئے میں باورچی خانے میں آیا۔ محمود کھانا پکانے میں مصروف تھا۔ میں نے کہا "یہ سب چھوڑ۔ یہ دونوں خط لے کر ابھی شہر جا۔ ابھی رات نہیں ہوئی ہے۔ کار پر دس سے پندرہ منٹ میں پہنچ جائے گا۔ چل جلدی کر۔"

"اور کھانا کون دیکھے گا اور کون کھلائے گا؟"

وزیرن باہر ہی کھڑی تھی۔ میں نے اسے بلایا۔ وہ آکر محمود کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے کہا "کھانا اسی پہ چھوڑ۔ یہ سب کر لے گی۔"

"خط ابھی اپنے پاس ہی رکھیے۔ میں کپڑے بدل کر موٹر نکال کر آتا ہوں سے لوں گا۔" اور وہ باورچی خانے سے باہر چلا گیا۔

میں خط ہاتھ میں لئے ہوئے لان پر ٹہلتا رہا۔ محمود باقاعدہ کپڑے پہنے ہوئے موٹر ڈرائیو کرتا ہوا سڑک پر آیا۔

میں نے خط اسے دیئے۔ وہ بولا "میرے واپس آنے کی ضرورت ہے؟"

"تو کیوں آئے گا موٹر منیجر صاحب لیتے آئیں گے۔ ٹھیکیدار اپنے موٹر پہ آئے گا۔"

اس نے میرا منہ اس طرح دیکھا کہ مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا "اب پیسے بھی میرے اور مزے بھی میرے۔"

---

# ادب اور ادیب

ممتاز مفتی

(یہ مضمون حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کے سالانہ اجلاس کے لئے لکھا گیا)

دستور ہے کہ سالانہ اجلاس میں ادب پر دھواں دھار مقالہ پڑھا جاتا ہے لیکن میں مقالہ پیش نہیں کر سکوں گا کیونکہ نہ تو میں عالم ہوں نہ دانشور خالی خولی ادیب ہوں۔

اتفاق سے آج یہاں اتنے سارے ادیب مل بیٹھے ہیں۔ تو آئیے آج ہم علمی اور کتابی باتوں کی بجائے آپس کی باتیں کریں۔ رسمی باتوں کی بجائے مخلصانہ باتیں!

عورتیں مل بیٹھیں تو وہ اپنے دکھ روتی ہیں عاشق مل بیٹھیں تو وہ حسنِ یار کی باتیں کرتے ہیں۔ پڑوسی مل بیٹھیں تو وہ محلے والوں کی بدخویاں کرتے ہیں۔

آیئے آج ہم بھی ادب کے پردے میں حسنِ یار کی باتیں کریں۔ اپنے دکھ روئیں اور محلے والوں کی بدخوئیاں کریں۔

---

بات شروع کرنے سے پہلے یہ وضاحت کر دوں کہ یہ مضمون حلقے کی نمائندگی نہیں کرتا یہ خیالات میرے ذاتی ہیں اس کے باوجود میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ خدا را اس بات چیت سے کوئی اثر نہ لیجئے گا ویسے تو میں نے مخلصانہ کوشش کی ہے کہ اس تحریر میں تاثر پیدا ہونے نہ پائے پھر بھی اگر کوئی صاحب اپنی قلبی کیفیت کی وجہ سے اثر لے لیں۔ تو مصنف نتائج کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

ہاں تو ادب پر بات دو زاویوں سے ہو سکتی ہے۔ نام اور کام یعنی ادب اور ادیب۔ ادب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا نام ادب رکھ دیا گیا۔

اس نام میں ایک دھونس ملفوف ہے کہ خبردار بے ادبی نہ کرنا یہ ایوانِ ادب ہے نتیجہ یہ ہے کہ ادب پر اخلاق کا ہیڈ کانسٹیبل بٹھا دیا گیا۔

مجھے اخلاق کی اہمیت سے انکار نہیں۔ دقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں اخلاق کا کوئی منفرد وجود نہیں ہمارے ہاں اخلاق ایک اپاہج ہے جو دوسروں کے سہارے کے بغیر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لہذا ادب پر اخلاق کے اجارہ داروں کی اجارہ داری ہے۔

مذہب کہتا ہے میں اخلاق کا سربراہ ہوں میرے بغیر اخلاق ایک بے جان چیز ہے چلو یہ بھی مان لیتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ مذہب خود ایک حبشی غلام کی طرح ہے جسے صدیوں سے کوڑے مار مار کر اچھا خادم بننے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

عالموں اور ملاؤں نے صدیوں سے مذہب پر زین کس کر سواری کر رکھی ہے۔ ذاتی وقار اور اقتدار کے حصول کے لیے انہوں

نے مذہب کو ایک حربے کی حیثیت دے رکھی ہے۔ لہٰذا اخلاق خود مذہب کی نہیں بلکہ مذہب کے اجارہ داروں کے گھر کی لونڈی ہے اخلاق وہ ہے جو انہیں گوارا ہے اور جو ناگوار خاطر ہے وہ بد اخلاقی ہے۔

رسم و رواج کہتے ہیں اخلاق ہماری گود میں پلا ہے ہم نے اس کا منہ دھلایا ہے اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا ہے۔ اس کا "شوشو" دھو کر کلوٹ باندھا ہے لہٰذا اخلاق ہماری تخلیق ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ اس پر ہماری چھاپ لگی ہے۔ ہماری چھاپ نہ ہو تو سمجھ لو ال جعلی ہے

یوں اخلاق کے اجارہ داروں نے تخلیق کرنے والوں پر پابندیاں لگا رکھی ہیں اپنے کرداروں کو اجلے کپڑے پہناؤ ان کے پیتاؤ کو رسم کی سنہری زنجیروں سے سجاؤ۔ کریں جو جی چاہے مگر یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ وہ اخلاق کی حدبندیوں سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔

قلم کو ضبط سکھاؤ ادب نگاہوں کو!

جناب والا۔ اگر ادب کا نام تخلیق ہوتا تو تخلیق کار پر پہرے دار نہ بیٹھے ہوتے تخلیق کار نے منظر کشی کی۔ بولا،

ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے باپ حقہ پی رہا ہے۔

اخلاق کے اجارہ دار چونکے کیا کہا باپ حقہ پی رہا ہے بے شک باپ حقہ پیتے ہیں انہیں حقہ پینے کی عادت ہے لیکن باپ کو حقہ پیتے ہوئے دکھانا مستحسن نہیں۔ باپ کو اس حرکت کا مرتکب دکھانا اخلاق کے منافی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ متبرک باپ ہوتے ہوئے بھی بدبخت حقہ پیتا ہے بچے پر کیا اثر مرتب ہوگا اسے احساس ہو جائے گا کہ بڑا ہو کر مجھے باپ کی چلمیں بھرنی پڑیں گی۔

اسلام کے اجارہ دار بولے حقہ پینا اسلام کے نزدیک ایک مکروہ فعل ہے باپ حقہ پیتے ہیں تو پڑے پئیں لیکن باپ کو حقہ پیتے ہوئے دکھانا غلط مثال قائم کرنا ہوگا۔

جدید ادب کے علم بردار بولے حقہ پینا ایک غلیظ اور فرسودہ رسم ہے ایسی فرسودہ باتوں کو اچھالنا ادب کی شہراہ پر بیٹھ کر گندے پوتڑے دھونے کے مترادف ہے ہاں اگر باپ حقے کی جگہ سگرٹ پیئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حفظانِ صحت والے چونکے بولے نہ نہ نہ نہ باپ کو سگرٹ نہ پلانا۔ بچہ کیا کہے گا کہ میرا باپ حالات حاضرہ سے اس قدر بے خبر ہے اسے اتنا ہی پتہ نہیں کہ سگریٹ پینا کینسر پیدا کرتا ہے اس کے ہاتھ سے سگرٹ لے کر سگار تھما دو۔

تو جناب والا ادیبوں کی کیفیت ہمیشہ سے ایسپ کے افسانے کے اس باپ اور بیٹے کی سی رہی جو گدھا بیچنے کے لئے گاؤں سے شہر کی طرف عازم سفر ہوئے تھے۔

ایسا کیوں ہے صرف اس لئے کہ کسی مسخرے نے تخلیق کا نام ادب رکھ دیا۔

ٹھہریئے آپ کہیں گے یہ مفتی ادب کے پردے میں کیا طوطا مینا کہانیاں لے بیٹھا یقین کیجئے یہ طوطا مینا کہانیاں آپ بیتیوں سے اخذ کی گئی ہیں۔

جن دنوں مجھے مختصر افسانے لکھنے کا مرض لاحق ہوا ان دنوں میں ایک مدرسے میں معلم تھا۔

برسبیل تذکرہ ان دنوں مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں ادب لکھتا ہوں۔ (آپ سے کیا پردہ آج بھی احساس نہیں ہے) - چونکہ ان دنوں ادب کا لفظ پنجاب میں رائج نہیں تھا اور ہم اس غلط فہمی میں تھے کہ یہ لٹریچر ہے۔ ان دنوں میں اس لئے لکھنے پر مجبور تھا کہ اتفاقاً میری پہلی تحریر پر

نالی بھی تھی۔

میں نالی کا صبوکا تھا گھر میں کوئی درخور اعتنا نہ سمجھتا۔ چونکہ ڈرپوک اور شرمیلا تھا لہٰذا محلے کا کوئی ہم عمر مجھے ساتھی بنانے کے لئے تیار نہ تھا۔ سکول میں نالائق ہونے کی وجہ سے کسی گنتی شمار میں نہ تھا۔ ایسے حالات میں ایک بار نالی کی آواز سن کر اوسان کھو بیٹھا۔" ایک بار سنی ہے دوسری بار سننے کی ہوس ہے۔"

اس ہوس کے تحت۔ یہ جانے بغیر کہ یہ میدانِ ادب ہے مسلسل ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔

اگر اس وقت مجھے پتہ چل جاتا کہ ادب میں پاؤں دھر رہا ہوں۔ تو ڈر کر بھاگ اٹھتا چونکہ ان دنوں ادب میرے لیے ایک خوفناک چیز تھی۔

گھر سے دن رات ابا امی کی آوازیں سنائی دیتیں باادب باملاحظہ ہوشیار۔ محلے کے بزرگان سے بڑے بوڑھے گزرتے تو ان کے شکھا چلا چلا کر کہتے باادب ہوشیار۔ سکول میں اساتذہ کی خشمگیں نگاہیں خبردار کرتی رہتیں۔ ہٹ کے رہو پرے کے رہو۔ باادب اٹھو باادب بچو۔

ہاں تو جن دنوں مجھے افسانے لکھنے کا مرض لاحق ہوا ان دنوں میں ایک مدرسے میں معلم تھا خوش قسمتی سے مدرسے میں میرا نام ممتاز حسین تھا مگر اردو جریدوں میں ممتاز مفتی چھپا تھا چونکہ لوگوں سے ملنے کی عادت نہ تھی ادبی محفلوں میں نہیں جاتا تھا اس لئے عرصہ دراز تک بات پردہ پڑا رہا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ماسٹر ممتاز حسین افسانے لکھنے کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہے۔

پہلی مرتبہ جب یہ راز آشکار ہوا تو مدرسے کے اساتذہ ہکے بکے رہ گئے پھر وہ از راہِ ہمدردی وفد کی صورت میں میرے پاس آئے کہنے لگے میاں جو ہوا سو ہوا ہم اس کا تذکرہ نہیں کریں گے بشرطیکہ تم آئندہ سے توبہ کر لو ورنہ اگر ہیڈ ماسٹر صاحب کو پتہ چل گیا تو بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔

ایک بولا بھائی صاحب یہ میدانِ ادب ہے اس میں کچھو ندریں نہ چلاؤ۔

دوسرا بولا یہ آج کے افسانے جو ہیں یہ ادب نہیں خرافات ہیں بے ادبیاں ہیں۔

تیسرا بولا اگر ضروری ادب ہی لکھنا ہے تو اخلاقیات پر لکھو اسلامیات پر لکھو۔

چوتھا بولا اگر بچوں کو پتہ چل گیا کہ تم ان خرافات کے مصنف ہو تو ان کے دلوں میں تمہاری کیا عزت رہ جائے گی ذرا سوچو۔ اور اگر ان کے والدین کو پتہ چل گیا تو وہ اپنے بچوں کو اس مدرسے سے اٹھوا لیں گے۔

پھر ان میں سے دو ایک جنہوں نے ممتاز مفتی کی تحریروں کو پڑھا تھا میرے افسانوں کے" باپ حقہ پی رہا ہے "گنوانے لگے۔

اس کے بعد وہی ہوا جس کا ڈر تھا بات نکل گئی بچوں کے والدین تک جا پہنچی وہ داڑھیاں لگا سونٹے پکڑ ہیڈ ماسٹر تک آ پہنچے۔

ہیڈ ماسٹر نے کیس بنا کر ایس ایم شریف کو بھیج دیا جو ان دنوں ہمارے انسپکٹر تھے۔

ایس ایم شریف کے میرے والد سے مراسم تھے انہوں نے ابا کو خط لکھ دیا۔ گھر جو پہلے ہی اجنبیت سے بھرا ہوا تھا اب غم و غصہ سے بھر گیا۔

ادھر شریف صاحب نے سرکاری طور پر طلب کر لیا۔ پہلے تو ڈانٹتے رہے کہ اگر طلباء کے اخلاق کے رکھوالے خود بداخلاقی کا پرچار

کرنے لگیں تو تعلیم و تدریس کا کیا بنے گا؟

آخر میں مسکرا کر مدانہ وارانہ انداز میں کہنے لگے بھئی اگر لکھنا ہی ہے تو انگریزی میں لکھو۔ لٹریچر لکھو اُردو میں ادب کیوں لکھتے ہو؟

آج کا نوجوان ادیب سمجھتا ہے کہ پرانے ادیبوں نے حقائق سے منہ موڑ رکھا ہے اور وہ ادب میں اخلاق رسم اور مذہبی فروعات کے نرم اور خوشبودار جھاگ سے بلبلے بناتے رہے ملائم مخملی باتوں سے قاری کو بہلاتے رہے منافقت کے سنہرے جال پھیلاتے رہے لیکن کچھ پرواہ نہیں اب میں میدان میں آ گیا ہوں میں انقلاب کا نعرہ لے کر آیا ہوں میں پرانے دقیانوسی ادب کو رد کر کے انقلابی ادب کی داغ بیل ڈالوں گا۔ میں۔ میں۔

۱۹۳۶ء میں میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ مجھے خدا نے پرانے بت توڑنے کے لئے پیدا کیا ہے اور مجھ سے پہلے آنے والے ادیب منافقت کا شکار رہتے حقائق کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی ان میں جرأت نہ تھی میں بھی کہا کرتا تھا میں! میں اب میں آ گیا ہوں اب جگر تھام کے بیٹھو۔

مجھے یقین ہے کہ ۱۸۳۶ء کا ادیب بھی میں کہتا ہوا ایوانِ ادب میں داخل ہوا تھا۔

آج پرانے ادیب نئے ادیبوں پر ہنستے ہیں کیا پدی کیا پدی کا شوربا!

میرا بھی جی چاہتا ہے کہ مستند ادب کی مسند پر بیٹھ کر سامنے استادہ نئے ادیب پر ہنسوں لیکن جب ہنسنے لگتا ہوں تو مجھے ۱۹۳۶ء کا زمانہ یاد آ جاتا ہے جب مسند ادب پر بیٹھے ہوئے سکہ بند ادیب مجھ پر ہنسا کرتے تھے میری ہنسی کافور ہو جاتی ہے۔

یہ تو تھی نام کی بات اب کریں کام کی بات!

سوال یہ ہے کہ ادیب کون ہے کیا ہے سبھی اس بات سے متفق ہیں کہ ادیب وہ ہے جس کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہے اور وہ اس انداز سے کہنا جانتا ہے کہ بات پہنچ جائے۔ "کہنے کے لئے کچھ ہونا" کے لئے ضروری ہے کہ ایک زاویہ نظر ہو۔ ہٹ کر۔ منفرد۔

اب سوال یہ ہے کہ ادب لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ اس لئے ضرورت ہے کہ حقائق جو بہت قریب ہوتے ہیں مانوسیت کی اوٹ میں آ جاتے ہیں یقین جانیے مانوسیت ایک بہت بڑا پردہ ہے بہت بڑا بہت دبیز۔

ممکن ہے آپ اس بات کو نہ مانیں آپ سے کیا پردہ میں خود اسے نہیں مانتا میرا دل نہیں مانتا آپ کہیں گے نہیں مانتے تو کہتے کیوں ہو آپس کی بات ہے کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں میرا ذہن مانتا ہے پر دل نہیں مانتا۔ کچھ ایسی ہیں جنہیں دل مانتا ہے پر ذہن نہیں مانتا اور میں وقتی سہولت کے مطابق کبھی دل کا ساتھ دیتا ہوں کبھی ذہن کا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مانوسیت ایک پردہ ہے بہت بڑا بہت دبیز۔ جو بات یا حقیقت مانوسیت کی اوٹ میں آ جائے وہ نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے ادب یہ پردہ اٹھا دیتا ہے۔

سنیے مہاراج ایک تقریب پر باہر جانے لگے محل سے باہر نکلے تو دفعتاً انہیں یاد آیا کہ پگڑی پہننا تو وہ بھول ہی گئے انہوں نے اپنے ساتھی اہلکاروں سے فرمایا بھئی سر پہ پگڑی رکھنا تو ہم بھول ہی گئے ساتھی اہل کار جو ادب سے سر جھکائے کھڑے تھے بھاگے بھاگے محل میں گئے بسیار تلاش کے باوجود مہاراج کی پگڑی نہ ملی واپس آئے عرض کی مہاراج پگڑی اندر تو نہیں۔ اس وقت کسی نڈر چوب دار کی نظر مہاراج کے سر پہ پڑی اس نے چلا کر کہا مہاراج پگڑی تو آپ کے سر پہ ہے۔

مہاراج نے دونوں ہاتھوں سے پگڑی کو ٹٹولا اور پھر خوش ہو کر فرمایا اچھا کیا جو تم نے ہمیں یاد دلا دیا ورنہ ہم تقریب میں ننگے سر ہی جا پہنچتے۔

میری دانست میں وہ منڈر چوب دار جس میں اتنی جرأت تھی کہ ادب اور احترام کے باوجود گردن اٹھا کر مہاراج کے سر کی طرف دیکھ سکے۔ ادیب تھا۔

ادیب کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو یاد دلاتا رہے کہ جناب والا ٹوپی تو آپ کے سر پہ ہے اور یوں انہیں ننگے سر گھومنے پھرنے سے بچائے۔

عالم صرف سوچتا ہے اور اپنی فکر کو پیش کر دیتا ہے عالم کا پیغام ذہنوں تک محدود رہتا ہے ادیب میں ایک ٹرانسفارمر بھی لگی ہوتی ہے وہ سوچتا ہے اپنی سوچ کو جذبات کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے پھر وہ شدت کے الاؤ سے بھٹی گرماتا ہے اور گرماتا ہے حل چلا کر گرماتا ہے حتیٰ کہ فکر جذبات میں ٹرانسفارم ہو جاتے ہیں پھر وہ ان جذبات کو ٹرانسمٹ کرتا ہے اس لئے ادیب کا پیغام دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ادیب کے دو کام ہیں ایک تو یہ کہ وہ اپنی ازلی شدت کو ہوا دیتا رہے تنور کو تپائے رکھے آگ کو مدھم پڑنے نہ دے دوسرے یہ کہ وہ انگاروں کی ایسی پھلجھڑیاں جلاتا رہے جو دوسروں کے جذبات کو آگ دکھا سکیں۔

شدت انگارے پھلجھڑیاں دیکھ لیجئے۔ ادیب کا کام آگ سے کھیلنا ہے آگ میں جلنا آگ سے جلانا ہے۔

اگر قدرت ادیب میں مچھر کا وصف پیدا کر دیتی تو کتنا اچھا ہوتا مچھر خود ملیریا کا بیمار نہیں ہوتا لیکن دوسروں میں ملیریا پھیلاتا رہتا ہے اگر ادیب بھی دوسروں پر آگ کے شرارے پھینکتا رہتا لیکن خود شدت کے لاوے سے محفوظ رہتا۔ تو کتنی اچھی بات ہوتی۔

یہ نہیں تو اتنا ہی ہوتا کہ جتنی شدت وہ خود محسوس کرتا اتنی ہی ٹرانسٹ کرنے پر قادر ہوتا۔

قیامت یہ ہے کہ پتہ نہیں کس اصول کے تحت خود دو من دکھ سہو تو اس میں سے دو رتی دکھ ٹرانسفر ہو سکتا ہے نتیجہ کیا ہے کہ ادیب اس دنیا میں جیتے جی مسلسل اس جہنم میں رہتا ہے جس سے اللہ میاں اپنے مومن بندوں کو ڈراتے رہتے ہیں۔ یہ تو ہے اس دنیا کی بات، آخرت کی خبر بھی خوشں آئند معلوم نہیں دیتی۔

بے شک قدرت ایک عظیم تخلیق کار ہے عظیم صانع ہے لیکن ساتھ ہی وہ مزاج کی غنڈی بھی ہے اپنی دنیا کو آباد رکھنے کے لئے جنس کے بھونڈے درخت پر محبت اور لذت کی دو خوب صورت اور خوشبودار کلیاں لگا دی ہیں۔

اسی طرح تخلیق کے کرب سے بھرے ہوئے عمل میں کیف کی ایک شمع روشن کر دی ہے کیف کی یہ شمع انعام نہیں بلکہ ایک جال ہے کہ پھنسی ہوئی مچھلیاں نکلنے نہ پائیں۔

لیکن ٹھہریئے آپ کہیں گے یہ کیا تماشا ہے کہ میں یکدم شدت سے دکھ پر آ پہنچا۔

یہ بات قابلِ وضاحت ہے کہ شدت بذات خود دکھ ہے چاہے وہ خوشی کے جذبات کی شدت ہو یا غم کے۔

سوال یہ ہے کہ شدت کیا ہے شدت ایک بلیک ہول ہے جس میں بمشکل ۲۰ آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے لیکن جس میں ۱۲۰ آدمی ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ شدت اس موٹر کار کے مصداق ہے جسے فسٹ گیئر میں لگا کر ۸۰ میل کی رفتار سے چلایا جا رہا ہو

سرکس کے اس بوڑھے شیر کے مصداق ہے جسے کوڑے مار مار کر تخدی پر ابھارا جا رہا ہو۔
آپ تو جانتے ہیں کہ نفسیات کے مطابق خوشی ایک سطحی جذبہ ہے جو زندگی کے لق و دق صحرا میں یہاں وہاں دور دور بکھرے ہوئے نخلستانوں کی حیثیت رکھتا ہے اور باقی چاروں جانب پھیلی ہوئی ریت ہی ریت دکھ ہی دکھ۔

ادیب وہ احمق ہے جو شدت کی بھٹی تپائے بیٹھا ہے جو شدت کے بلیک ہول کی گھٹن میں زندگی گزار رہا ہے - جو اپنے جسم کی مشین کو پہلے گیئر میں لگا کر اسے ۸۰ میل کی رفتار سے دوڑا رہا ہے۔

یہ سب کس لئے کس خوشی میں کیا شہرت کی ایک تالی سننے کے لئے جو کبھی مسلسل نہیں بجتی کیا تخلیق کے کیف کے لیے، جو انعام نہیں بلکہ اک جال ہے۔

دوستو ہم کیوں فریب کھائے جانے پر مصر ہیں ذرا سوچئے تو ہماری کیفیت بالکل ایسے ہے :-

نہ پوچھ حال میں وہ چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

اس تمہید کے بعد میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ دوستو تخلیق کاری کے اس جہنم سے اپنے آپ کو بچا لو اس ادب بازی سے توبہ کر لو اب بھی وقت ہے ابھی توبہ کے دروازے بند نہیں ہوئے۔

میں خصوصاً نوجوان ادیبوں سے معروض ہوں کہ یہ تالی جس کی امید پر آپ "میں میں" کر کے بڑے طمطراق سے ایوانِ ادب میں داخل ہو رہے ہیں تاکہ اپنے آپ کو قربانی کا بکرا بنا لیں - یہ تالی بہت مہنگی پڑتی ہے بہت مہنگی - اول تو یہ تالی بجتی نہیں بج جائے تو جلد ہی رک جاتی ہے مسلسل نہیں بجتی اور پھر آپ میری طرح اس تالی کو سننے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں۔

لیکن ٹھہریئے ابھی تو میں نے صرف شدت کی وضاحت کی ہے ابھی میں نے شدت کے اثرات کا تذکرہ نہیں کیا۔

موٹی بات کہہ دوں اگر آپ شدت زدہ ہیں یعنی ادیب ہیں تو بیگم سے آپ کی کبھی نہیں بنے گی ہمیشہ اَن بن رہے گی۔
ہم میں سے بہت کم مختار مسعود یا اشفاق احمد ہیں جو حفظِ ماتقدم کے لئے پہلے ہی ایسی بیگم کا چناؤ کرتے ہیں جو خود ادب کی مریضہ ہو۔ خدا کے فضل سے میری بیوی ضرورت سے زیادہ صحت مند ہے وہ آج تک مجھے یہی کہتی رہی اے آپ کہانیاں کیوں لکھتے ہیں کیوں اپنی جان کھپاتے ہیں، ان جھوٹ کے پلندوں سے کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر آپ میں شدت ہے تو آپ کی بیگم سے نہیں بنے گی ماں باپ سے نہیں بنے گی، ہم کاروں سے نہیں بنے گی کسی سے نہیں بنے گی - ظاہر ہے اگر آپ شدت کے سکوٹر پر سوار ہیں تو پیدل چلنے والوں سے آپ کا کیا رابطہ۔

صرف افراد کی بات نہیں بذاتِ خود زندگی سے آپ کی ہم آہنگی نہیں ہوگی اور زندگی کے علاوہ خود اللہ میاں سے اَن بن رہے گی آپ کہیں گے اللہ میاں یہ کیسی دنیا بنائی ہے تو نے جو احساس سے بیگانہ ہے جو چلتی ہوئی رکتی ہے پر چلتی نہیں جس کا ہر پہیہ ڈھیلا ہے ہر پرزہ سست ہے ہر فرد MEDIOCRE ہے۔

اگر آپ میں شدت ہے تو آپ کی حیثیت ایسی ہے جیسے دال میں کوکڑو ہوتے ہیں وہ دانے جو کبھی نہیں گلتے جن میں گلنے کی

صلاحیت ہی نہیں ہوتی یعنی اگر آپ میں شدت ہے تو آپ MALADJUSTED ہیں۔

انگریز بڑا سیانا تھا اس نے اس MALADJUSTED برادری کا بھید پا لیا اس نے ایک خفیہ اصول مرتب کیا تھا کہ ادبی طبیعت کے لوگوں کو سول یا ملٹری کے بڑے عہدوں پر فائز نہ کیا جائے اس اصول کو عملی شکل دینے کے لئے اس نے پرسنیلیٹی ٹیسٹ PERSONALITY TEST ایجاد کر دیئے تھے اور شرط لگا دی تھی کہ امیدواروں کو یہ ٹیسٹ دیئے جائیں ان ٹیسٹوں میں دل کے سات پردوں میں دبی ہوئی شدت اپنا پتہ دے دیتی ہے۔

انگریز نے چناؤ کرنے والے بورڈوں کو تاکید کر دی تھی کہ کوئی نالائق اُمیدوار پاس ہو جائے تو مضائقہ نہیں لیکن خبردار کوئی ایسا امیدوار سروسز میں آنے نہ پائے جس کی سرشت میں ادبی شدت ہو ہلکے سے ہلکا ادبی رجحان ہو۔

انگریز کا یہ اصول آج بھی رائج ہے پہلے جان بوجھ کر رائج تھا اب شاید ان جانے میں رائج ہے لیکن ٹھہریئے ہو سکتا ہے حکومت کو اس اصول کا علم ہو اور حکومت نے اس لئے اسے منسوخ نہ کیا ہو کہ وہ ادیبوں کی خیر خواہ ہے بد خواہ نہیں۔

اس کے باوجود آج بھی کئی ایک ادیب طبیعت لوگ چوری چھپے اونچے عہدوں پر بیٹھے ہیں انہوں نے اپنی ادبی رجحانات کو کیمافلاژ CAMAFLOGUE کر رکھا ہے مثلاً مختار مسعود ہیں مختار مسعود نے اپنی ادبی شدت اُجلے پن میں چھپا رکھا ہے۔

نفسیات کے طالب علم کی حیثیت سے مختار مسعود میرے لئے ایک معمہ ہیں چونکہ وہ بیک وقت آگ بھی ہیں پانی بھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی آگ ان کے پانی کو بھاپ نہیں بناتی ان کا پانی ان کی آگ کو بجھاتا نہیں وہ بیک وقت مفکر بھی ہیں ادیب بھی ہیں دانش ور بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گڈ ایڈمنسٹریٹر GOOD ADMINISTRATER بھی ہیں ایڈمنسٹریشن اور ادیب طبیعت تو ازل سے دشمن چلے آئے یا وصاف ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ادیب اور اُجلے پن کا ہمیشہ بیر رہا حرکت اور قیام کبھی ساتھی نہیں بن سکے۔

یا تو مختار مسعود جھوٹے ہیں اگر انھیں سچا مان لیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ ادیب اور ایڈمنسٹریشن کی جمگاڈر ہیں اور اگر ایسا نہیں تو پھر آوازِ دوست "دراصل" آوازِ بگم ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مختار مسعود نے اپنی ادبی شدت کو اجلے پن میں کیما فلاج کر رکھا ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی ادبی شدت پر چپ کا ڈاٹ دے رکھا ہے شہاب نے بڑے التزام سے اپنے ہونٹوں کو سی رکھا ہے تاکہ بھید نہ کھل جائے حنیف رامے نے اس شدت پر دانشوری کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ مولینا کوثر نیازی نے بزرگی کی اوٹ لگا رکھی ہے۔

مصطفٰے زیدی واحد بڑے افسر تھے جنہوں نے اپنی تخلیقی شدت کو چھپایا نہیں بلکہ جھنڈا بنا کر اسے لہراتے رہے۔ اگر وہ اتنی دیر بچے رہے تو یہ ان کی جرأتِ غنڈانہ تھی۔

فیاض محمود کبھی بلند پایہ ادیب تھے مجھے ادب کی راہ کی طرف متوجہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری فیاض محمود کے سر ہے بدقسمتی سے فیاض محمود نے فوج میں عہدہ قبول کر لیا فوج کے سانچے کو توڑ نہ سکے خود ٹوٹ گئے تخلیق کو مدت ہوئی چھوڑ چکے اب نقد و نظر سے دل بہلاتے ہیں کہتے ہیں رنڈی کام کی نہیں رہتی تو پان کی دکان کھول لیتی ہے ادیب کام کا نہ رہے تو نقاد بن کر بیٹھ جاتا ہے۔

ادب کے چوگان میں بہت سی ایسی پان کی دکانیں کھلی ہیں وہ لوگ جو ابھر کر تخلیق تک نہ پہنچ سکے وہ لوگ جو پہنچنے کے بعد جان بوجھ کر

یا ویسے گر پڑے یادہ سیانے لوگ جو تخلیق کا کٹھن راستہ اپنے بغیر ادیبوں میں شمار ہونے کے خواہش مند ہیں۔ آپ سے کیا پردہ ہے میں خود ادب کے میدان میں کسی خالی کھوکھے کی تلاش میں ہوں میرے لئے دعا کیجئے۔

پھر وہ اپنے شفیق الرحمٰن تھے لیکن ان کے متعلق اختلاف رائے ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ طوطی خوش نوا اس لئے چپ ہو گئی کہ فوج نے منقار زیر پر کر دی دوسرے کہتے ہیں نہیں فوج نے نہیں کی ان کے گھر بیگم صاحب نازل ہو گئیں۔

مسعود مفتی کے کوائف کا مجھے علم نہیں ان سے ملنے والوں کا کہنا ہے کہ ان کے انداز میں APPOLOGETIC عنصر موجود ہے معذرت کو کیمافلاج کا پردہ بنا لینا یہ کام آرٹسٹ ہی کر سکتا ہے۔

ہم میں سب سے زیادہ سیانے فیض نکلے حیرت کی بات ہے کہاں شاعر اور کہاں سیانف، قدرت اللہ کہتے ہیں سیانے نہیں خوش بخت ہیں۔ قدرت اللہ کا بیان ہے کہ جب انہوں نے ایم اے پاس کیا تو ایم اے او کالج امرتسر کی طرف سے لیکچرز کی آسامی کے لئے ایک اشتہار جاری ہوا شہاب نے بھی عرضی گزار دی۔ چند دنوں کے بعد شہاب کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا انٹرویو میں صرف دو امیدوار تھے ایک شہاب خود دادا دوسرا ایک حسین و جمیل نوجوان جو بعد میں فیض بنا۔

ان دنوں ایم اے او کالج کے پرنسپل تاثیر تھے پہلے فیض صاحب انٹرویو کے لئے تاثیر کے کمرے میں داخل ہوئے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کمرے سے تاثیر اور فیض دونوں نیم بغل گیری کے عالم میں مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔

"تاثیر شہاب کو دیکھ کر رک گیا بولا تم کون ہو اور یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔

شہاب نے کہا جناب والا میں امیدوار ہوں جسے انٹرویو کے لئے بلایا گیا ہے۔

تاثیر نے ایک قہقہہ لگایا بولا ینگ مین YOUNG MAN آسامی کے لئے آدمی SELECT کر لیا گیا ہے آپ جا سکتے ہیں۔

شہاب کا کہنا ہے کہ اس واقعہ پر مجھے اتنی خار آئی کہ میں نے قلم ہاتھ میں پکڑا اور سیدھا آئی سی ایس I.C.S کے امتحان میں جا شامل ہوا۔

اگر تاثیر اس روز فیض کی جگہ مجھے سلکٹ SELECT کر لیتے تو یقیناً فیض کو خار آتی اور وہ آئی سی ایس ICS بن کر اس وقت فائلوں کے انبار تلے دبے ہوتے اور میں شہرت کے جھولے میں فیض بنا مونچھ مروڑ رہا ہوتا۔

شہاب کی اس دلیل کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ فیض ہم سب سے زیادہ سیانے نکلے پہلی بات تو یہ ہے انہوں نے بڑے عہدے پر فائز ہونے کی کبھی خواہش ہی نہیں کی غالباً اس لئے کہ انہیں اس بھید کا پتہ چل گیا کہ اثر رسوخ کی مسند بڑے افسر کی کرسی سے زیادہ دیرپا ہوتی ہے دوسری بات یہ کہ فیض نے ادب کے اندھیرے حجرے میں بین الاقوامی سیاست کی کھڑکی کھول لی تاکہ تازہ ہوا آتی رہے۔

محلے دار تو بہت ہیں لیکن چھوڑیے محلے داروں کی بدخویاں بہت ہو چکیں آئیے اب محلے کا جائزہ لیں۔

جائزہ لینا تبھی ممکن ہے اگر ہم ایوان ادب سے جو جو خوش کن خواب وابستہ کئے بیٹھے ہیں انھیں وقتی طور پر فراموش کر دیں۔

آج ادیب کی کیا کیفیت ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا کوئی قاری نہیں۔

قاری کی عدم موجودگی میں اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے ہم نے جگہ جگہ ارباب ذوق کے حلقے بنا رکھے ہیں ان محفلوں میں ہم متحارب جگہ جگہ ... سے اپنی انا کی تسکین کرتے رہتے ہیں۔

اگر ہمارا کوئی قاری ہو بھی تو وہ بدنصیب سراسر مجبور ہے چونکہ کاغذ کی قلت کی وجہ سے کتاب کی قیمت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کتاب خریدنا ایک اوسط آدمی کے لیے ممکن نہیں رہا چینی کو SUBSIDISE کیا جا سکتا ہے۔ بناسپتی پر کنٹرول ریٹ عاید کیا جا سکتا ہے لیکن کتاب جیسی غیر ضروری چیز مہنگی ہوتی ہے تو ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ادبی جریدے نزع کے عالم میں سسک رہے ہیں انھیں کاغذ نہیں ملتا کیوں نہیں ملتا تفصیلات کا تو مجھے علم نہیں البتہ سننے میں آیا ہے کہ وزارت اطلاعات صرف اسے کاغذ تسلیم کرتی ہے جو چلتی ہوا سے نہیں جو چلتی نہ ہو لہذا وہ چلتی میں کو ملتا تھا ہے آج کل کے دور میں ادب نہیں چلتا سیاست چلتی ہے لہذا کاغذ اخباروں کو ملتا ہے یا ایسے پرچوں کو جو باقاعدہ شائع ہوتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا ادبی جریدوں کو کاغذ نہیں ملتا۔ بلیک میں خریدنے کی استطاعت نہیں نتیجہ یہ ہے کہ پرچہ چھ چھ مہینے کے بعد نکلتا ہے مجھ سے پوچھئے تو میں اس صورت حالات پر بہت خوش ہوں نوجوانوں میں ادبی رجحانات کی بیخ کنی کے لئے اس سے زیادہ موثر طریق کار کیا ہو سکتا ہے؟

میرے نقطۂ نظر کے مطابق یہ صورت حال بہت امید افزا ہے۔

ہمیں وزارت اطلاعات کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ ادبی رسالوں کو کاغذ کا کوٹہ دینے میں بخل سے کام لے کر نوجوانوں کی زندگیاں اس میل ایڈجسٹڈ (MAL ADJUSTED) گروہ کے لئے جسے ادیب کہتے ہیں صحت مندانہ زندگی بسر کرنے کا راستہ ہموار کر رہی ہے۔

اس سلسلے میں حکومت نے بڑی اندیشش پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔

امداد دینے کے لئے وزارت تعلیم نے جو مد بنا رکھی ہے اس کا نام LEARNED BODIES ہے LITERARY BODIES کی مد کا وجود ہی نہیں آپ جانتے ہیں کہ ادب اور علم دو مختلف چیزیں ہیں ان میں کوئی ہم آہنگی نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے منافی ہیں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دل اور ذہن ہمیشہ برسرپیکار رہتے ہیں۔

حکومت ادیبوں کی ہمدرد ہے ان کی اعانت کرنے میں خوشی محسوس کرتی ہے لیکن اس اعانت کے لئے حکومت نے ایک شرط قائم کر رکھی ہے پوری امداد حاصل کرنے کے لئے ادیب پر لازم ہے کہ وہ مر جائے۔ اگر آپ مرنے کے لیے تیار نہیں۔ تو کم از کم خطرناک طور پر بیمار پڑ جانا ضروری ہے بیمار پڑ جاؤ تو وزارت اطلاعات کی سفارش پر ہسپتال اور دوا کے خرچ کے علاوہ دو وقت کی روٹی بھی ملتی ہے۔

یقین جانئے مر جانا بہت مشکل کام ہے میں کئی ایک برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہوا میں نے ہارٹ اٹیک بھی آزما دیکھا۔

سننے میں آیا ہے کہ ادبی جریدوں کے مدیر حکومت سے درخواست کرنے والے ہیں کہ انھیں بھی کاغذ کے کوٹے سے نوازا جائے یہ ایک خطرناک صورت حالات ہے مجھے ڈر ہے کہ متعلقہ اہل کار کہیں ترس کے جذبے سے سرشار ہو کر ادب نوازی کر کے بنے بنائے کھیل

کو بگاڑ نہ دیں۔

میرا ارادہ ہے کہ جناب خورشید حسن میر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا کیس پیش کروں اور درخواست کروں کہ اللہ کے واسطے ملک کے صحت مند نوجوانوں کو ادب کے عارضہ سے بچا لیجئے خیال رکھئے کہیں حکومت ادیبوں کی چرب زبانی سے متاثر نہ ہو جائے کہیں وہ ادیبوں کے متعلق اپنی پالیسی بدل نہ دے مجھے یقین ہے کہ جناب میر صاحب میری بات ضرور سنیں گے مجھے خورشید حسن میر پر بڑا مان ہے چونکہ اپنی ۶۷ سالہ زندگی میں میں نے اپنا پہلا VERGIN ووٹ میر کو دیا تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ ادیبوں کو پبلشر نہیں ملتا اگر مل جائے تو پبلشر کی دو شرطیں ہوتی ہیں پہلی یہ کہ آپ کی تصنیف ناول ہو اس میں نسیم حجازی جیسے صوفیانہ جذبات کو مل کر کے اور اس پس منظر پر ہیرو اور ہیروئن رومانی مکالموں کے فوارے چلا دیں۔ مجھے ان کی یہ شرط بھی منظور ہے لیکن دقت یہ ہے کہ ان کی دوسری شرط بڑی ٹیڑھی ہے دوسری شرط یہ ہے کہ میں اپنا نام بدل کر "فیروزہ خاتون" رکھ لوں۔

حفیظ ہوشیار پوری یہ تمنا لئے فوت ہو گیا کہ اس کا دیوان چھپ جائے اور بہت اچھا کیا اس نے کہ فوت ہو گیا ورنہ دیوان نہ چھپتا۔

اشفاق اور بانو کے گھر میں مسودوں کا ڈھیر لگا ہے بے چارہ اپنی کسمپرسی کے باعث ان کی وفات کی امید لگائے بیٹھا ہے۔

میں نے حال ہی میں اپنی ایک کتاب کے بارے میں ایک پبلشر سے بات کی اس نے بڑے ادب اور احترام سے معذرت کر دی کہنے لگا جناب والا ہم تو مصنفوں کی چیزیں چھاپتے ہیں آپ تو مصنفوں کے مصنف ہیں اس کا یہ ایک جملہ میرے دل میں خوشی کے اتنے انبار لگا گیا کہ اب کتاب چھپوانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

محمد طفیل نے مجھ سے کہا میری صرف ایک خواہش ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ نقوش کے نظر ثانی شدہ خاص نمبر چھاپ دے میں نے پوچھا اگر تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے۔ تو تمہیں کیا حاصل ہو گا بولا پھر میں سکون کی موت مر سکوں گا میں نے کہا بھائی اگر تم بے سکونی کی موت مر جانے کی زحمت کر لو تو ممکن ہے تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے صرف ایک شرط ہے کہ مرنے میں تاخیر نہ کرو اگر تم نے فیصلہ کرنے میں حفیظ جالندھری کی طرح دیر لگا دی تو لوگ نقوش کو بھول جائیں گے پھر موت بھی کام نہ آئے گی۔

ظاہر ہے کہ اپنی عزت کرانے کے لئے ادیب کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ وہ تخلیق کرے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مر جائے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ادیب کو پبلشر نہیں ملتا اور اسے FOORLY ATTEN DED محفلوں میں منہ زبانی پیشکشوں پر گذارہ کرنا پڑتا ہے جیسے کہ اس وقت میں کر رہا ہوں۔ مختار مسعود جن کی تحریریں کلاسیکی DICTION اور جدید تخیل کی آمیزش ہیں اور جو خود اونچے عہدے پر فائز ہیں انھیں بھی اپنی کتاب "آواز دوست" خود چھاپنا پڑی اگر وہ دیوالیہ ہونے سے بال بال بچ گئے تو اس کی وجہ مختار مسعود مصنف نہیں بلکہ مختار مسعود کے اندر چھپا ہوا بنیا ہے۔

نثار عزیز بٹ نے اپنی زندگی بھر کی بچت "نے چراغ نے گلے" کو شائع کرنے میں لگا دی ہے اور آج کل دونوں میاں بیوی آنے والے FINANCIAL DEPRESSION کے خوف سے نے چراغ نے گلے کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔

اس مشکل سے نکلنے کے لئے میں نے ایک تجویز سوچی ہے میرا ارادہ ہے کہ ایک اشتہار کے ذریعے اعلان کر دوں کہ جو پبلشر

میری کتاب چھاپے اور بیچے گا اس سے رائلٹی وصول کرنے کی بجائے میں خود اسے اپنی جیب سے نقد رائلٹی ادا کروں گا۔ صرف پبلشر کی بات ہی نہیں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آئیے اپنے آپ کو زندہ اور چالو رکھنے کے لیے ہم ریڈیو اور ٹی وی (T.V) کو بھی اپنے پروگرام کے عوض پیسہ ادا کرنے کی پیشکش کر دیں۔

ریڈیو پاکستان تو اولڈ فیشن دقیانوسی ادارہ ہے جو ابھی تک ادب نوازی کا مرتکب ہو رہا ہے جو ابھی تک اس نقطے کو نہیں سمجھا کہ ادیب کی حقیقی فلاح ادب نوازی میں نہیں اس کے برعکس ٹیلی وژن جدید اور ترقی پسند ادارہ ہے۔

ٹیلی وژن کی آمد پر کئی ایک ادیب امیدیں استوار کر کے بیٹھ گئے تھے لیکن ٹیلی وژن نے بہت تھوڑے عرصے میں بڑے SCIENTIFIC انداز سے کمپیوٹر کی مدد سے اس مسئلے کو حل کر لیا اور پھر اعلان کر دیا کہ ادیب اور ٹیلی وژن کے درمیان کوئی ناطہ نہیں چونکہ پرانے ادیب میں تازگی کا فقدان ہے اور نئے ادیب نا پختہ کار ہیں۔

جب سے حنیف رامے نے وزیر اعلیٰ پنجاب کا عہدہ سنبھالا ہے مجھے خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں وہ NEPOTISM یعنی ادب نوازی کر کے بنی بنائی بات بگاڑ نہ دیں۔

کئی ایک سال پہلے حکومت پنجاب نے ادیبوں کے لئے مکانات بنانے کا فیصلہ کیا تھا پھر بات حکومت کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے اپنا فیصلہ REVISE کر دیا کہ مکانات ادیبوں کو نہیں بلکہ فعال صحافیوں کو دیئے جائیں گے مجھے ڈر ہے کہ حنیف رامے کے دور میں کہیں پھر سے ادیبوں کو مکانات دینے کی بات نہ چل نکلے کہیں ادیب آباد نہ ہو جائیں کہیں ادیب آرام سے دو وقت کھانے نہ لگیں کہیں ادیب گنتی شمار میں نہ آ جائیں اگر ایسا ہو گیا تو نوجوانوں کے دلوں میں ادیب بننے کی خواہش بیدار ہو جائے گی اور ان کی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔

آخر میں میں آپ سے پھر اپیل کرتا ہوں کہ

دوستو تخلیق کاری کے اس جہنم سے اپنے آپ کو بچاؤ شدت کے اس تندور سے اپنے آپ کو نکالو میں ایڈجسٹمنٹ کے MAL ADJUSTMENT کے میکے پن کو تیاگ دو ادب کے اس لق و دق ویرانے میں کس امید پہ بیٹھے ہو جہاں قاری نہیں پبلشر نہیں۔ کتاب نہیں۔ جریدہ نہیں۔ ایک تالی کی امید پر۔ دوستو اب بجا دیجیئے نا تالی تاکہ میں مضمون ختم کر سکوں۔

---

# تبصرے

## فکرِ سخن

یہ شاعری کی کتاب نہیں۔ صدیق کلیم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ مضامین جو انہوں نے پچھلے پچیس برس کے دوران لکھے ہر کتاب اپنے زمانے کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور ان کے رجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔ جو کتابیں آج سے دو سو سال یا سو سال یا پچاس سال پہلے لکھی گئیں۔ وہ اپنے دور کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ماحول کے اعتبار سے، علمی مرتبہ کے اعتبار سے اور تنقید کے نقطہ نظر سے یوں مختلف اذہان کا سلسلہ در سلسلہ واسطہ ہوتا ہے۔ جو ایک نسل کے بعد دوسری نسل کو منتقل ہوتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے تھوڑا عرصہ پہلے ہی سے جتنی خوشگوار تبدیلیاں اردو تنقید میں ہوئیں۔ اتنی تبدیلیاں کسی اور صنفِ ادب میں نہیں ہوئیں۔ پہلے زیادہ تر انگریزی اور امریکی تنقید کے حوالوں سے بات کی جاتی تھی۔ اب ہماری تنقید میں فرانسیسی اور روسی رجحانات کا بھی خاصا عمل دخل ہے۔ پھر جس تنقید نگار نے اپنے ہاں کی تنقید سے آنکھیں نہ چرائی ہوں یعنی مولانا شبلی، مولانا حالی، عبدالسلام ندوی اور حسرت موہانی کے رجحانات سے۔ وہ اس میدان میں مار نہیں کھا سکتا۔ صدیق کلیم نے بھی نہ صرف اپنی تنقید سے استفادہ کیا بلکہ دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کے تنقیدی ادب سے بھی علاقہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں جو آج کی تحریر اتنی ہیں۔ وہ اسی عالمی تنقیدی شعور کی بدولت!

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں آپ کا واسطہ "مصنف اور تصانیف" سے پڑے گا۔ اس حصے میں غالب کی ہمہ گیریت، اقبال کی اردو نظمیں، حفیظ جالندھری کے گیت، فیض کی شاعری، گوئٹے کی غزلیاتی شاعری، ولیم فاکنر کی تکنیک ایسے مضامین سے دوسرے حصے میں "ادبی مسائل" زیرِ بحث ہیں۔ مثلاً ادبی اقدار، ادب اور فرار، ادب اور مقصدیت، علامتی اظہار، یہ مضامین زیادہ تر جدید مغربی تنقید کی بنیادی تحریروں کے تراجم ہیں۔

جو ناقد ادب پاروں کی روح تک پہنچ سکتا ہے۔ وہی ناقد تنقید کا حق بھی ادا کر سکتا ہے۔ وہی ناقد سچا ناقد ہے۔ ورنہ ناقد کی پریشاں خیالی قاری کو بھی پریشان کر دے گی۔ جیسا کہ آج کل تنقید میں ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ کھیل تو ایک عرصے سے کھیلا جا رہا ہے۔ ناقد کچھ نہ جانتے ہوئے بھی یہ کہتا ہے کہ "میرا یہ خیال ہے۔" "میرا فیصلہ یہ ہے۔" یعنی ناقد، بری طرح سے غریب قاری پہ اپنے خیالات کے چابک مار رہا ہے اور وہ اُف تک نہیں کرتا۔ پھر ہمارے نقادوں کا ایک وطیرہ یہ بھی ہے کہ وہ عیوب تو سو گنوا دیں گے لیکن فن کار کی رہنمائی نہ کر پائیں گے۔ یہ عجیب اندھیر ہے۔ جب تک ناقد کے ہاں ہمدردی کا رویہ جنم نہیں لیتا۔ یا ادب پارے کی روح تک پہنچنے کی جستجو نہ ہوگی، اُس وقت تک کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی والا چکر باقی رہے گا۔

غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل  وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال

صدیق کلیم کے ہاں "میرا یہ فیصلہ ہے" والا طنطنہ تو ہے مگر اس کے ساتھ علم کی تابندگی بھی ہے۔ اس لئے کبھی تو ذہن ان کے

خیالات کی چمک سے منور ہوجاتا ہے اور کبھی اندھیروں میں بھٹک جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہم وہاں نہیں پہنچ پاتے جہاں کہ یہ ہمیں لے جانا چاہتے ہیں اسے کوئی ہمارا قصور کہہ لے چاہے ان کا، یعنی نثر میں شاعری والے ابہام سے واسطہ پڑتا ہے۔ ویسے اُردو تنقید میں جو کوئی بھی اس کتاب کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرے گا وہ زیادتی کرے گا۔ جہاں تک زیادتی کا تعلق ہے وہ صدیق کلیم صاحب کے "تیسے" میں ہے تو عام!

ایک اور بات سن لیجئے کہ صدیق کلیم صاحب نے پچیس برسوں تک کی تخلیقات کو اس کتاب میں جگہ دی ہے۔ اس لئے کتاب کی قیمت بھی پچیس روپے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کو ارسلان پبلیکیشنز نے چھاپا ہے مگر کتاب ملتی ہے کواپرا ایک شاپ، ۷، شارع قائداعظم لاہور سے،

باقی باتیں اُس وقت ہوں گی جب آپ اس کتاب کو پڑھ لیں گے! کیونکہ سوال سے پہلے جواب کیسا؟ (م۔ ط)

## فاختہ (ناولٹ)

مصنف: مستنصر حسین تارڑ

قیمت: چھ روپے

ناشر: التحریر، کیپر اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

مستنصر حسین تارڑ کا ناولٹ "فاختہ" ایک نوعمر پاکستانی نوجوان کی ماسکو میں گزاری ہوئی جشن کی ایک رات کی مختصر روئیداد ہے جشن جسے عالمی میلے کا نام دیا گیا تھا اور جس میں شمولیت کے لئے ضروری تھا کہ شرکت کرنے والے کی عمر پچیس سال سے کم ہو اور وہ عالمی امن اور بھائی چارے کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد پر صدق دل سے یقین رکھتا ہو۔

جشن کی اس دھوم دھڑکے والی رات کو ماسکو کے سرخ چوک پر انسانوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ جو رنگ برنگی جھلمڑیوں اور ٹپا خوں کے جلو میں بڑے جوش و خروش اور بھرپور انداز میں خوشیاں منا رہا تھا۔ انوکھی اور نئی بات یہ تھی کہ وہاں تمام افراد نقاب پہنے ہوئے تھے۔ جانوروں کے چہروں، عفریتوں کی شکلوں جنوں اور بھوتوں کے چہروں کے نقاب جو کاغذ اور گتے کے بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایک مقدس مشن کی تشہیر کے لئے آئے تھے۔ لیکن اپنے اصل چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ چہرے ——— دل کے آئینے ——— ان لاتعداد نقابوں کے پیچھے نہ جانے کیسے کیسے چہرے ہوں گے ——— کون جانے، البتہ جشن کے بعد ان میں سے صرف ایک چہرے کی بڑے ڈرامائی انداز میں نقاب کشائی ہوتی ہے یہ ایک دبلی پتلی خاموش لڑکی کا چہرہ تھا، جس پر اس نے فاختہ کا نقاب لگایا ہوا تھا۔ اس چہرے پر آنکھیں نام کی کوئی شے نہ تھی۔ اس بدقسمت اور مظلوم لڑکی کا آنکھوں کے علاوہ بھی سب کچھ جنگ کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ اور وہ اس بھری دنیا میں تنہا اور بے سہارا ہو گئی تھی۔ اس المناک منظر پر ناولٹ کا اختتام ہوجاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے اس ناولٹ میں جنگی جنون کے خلاف نفرت کے جذبے کو بڑے فن کارانہ انداز میں ابھارا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔ زبان و بیان میں بھی دل کشی ہے۔ یہ وہ خوبی ہے کہ جس کے بغیر کسی تحریر کا دلچسپی کے ساتھ پڑھنا محال ہوتا ہے۔ کتابت اور طباعت معیاری اور سرورق دیدہ زیب ہے۔

قیوم راہی

# آندھی میں صدا

میرزا ریاض کے افسانے تاثر کے اعتبار سے زندہ جاوید ہیں کیونکہ قاری کے ذہن میں کھٹکتے رہتے ہیں موضوعات ایسے ہیں جو روزمرہ زندگی میں ہمارے سامنے واقعات کا روپ دھار کر آتے رہتے ہیں۔

اصل میں میرزا ریاض عورت کے بدن کا سیاح ہے — عورت، ماں، بہن، بیٹی، بیوی تمام صورتوں میں افسانہ نگار کی سیاحت کے شوق کو ہوا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اُن سارے رشتوں کی کھچڑی سی بنا کر دیکھتا اور فرائیڈ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔ MOTHER FIXATION اُس کا خاص موضوع ہے۔ بچپن کی طرف مراجعت۔ ماں کی آغوش کی تمنا سے بھی آگے، نئے سرے سے جنم لینے کی آرزو وا ایسا جنم جس کی وراثت میں کوئی ذہنی الجھن نہ ہو۔ یہ خواہش سوسائٹی کی صدیوں پرانی جامعت بندیوں سے آزادی حاصل کر کے از سرِ نو زندگی گزارنے کی خواہش ہے ——— دردآشنا"، تشنہ لب" ہاتھ" "عفریت" اسی آرزو کی وضاحت کرتے ہیں۔ دردآشنا میں اُسے ایک آواز کی تلاش ہے جو کردار کی ماں ہی کی آواز ہوسکتی ہے۔ ایک گداز سینے کی جستجو جس نے اُسے ذہنی مریض بنا دیا۔ ماں کے پیار کی حسرت لاشعور میں دبی ہوئی مگر نمایاں — "ہاتھ" کا آغاز بھی وہ اپنی ماں کے نرم ہاتھوں کے لمس کی یاد سے کرتا ہے۔ افسانہ نگار کے اپنے الفاظ میں اُس کے افسانے" ناتراشیدہ آرزوؤں کی داستان" سناتے ہیں۔ وہ خود ان آرزوؤں کی درجہ بندی نہیں کر سکا یہی وجہ ہے کہ اظہار کا اسلوب کہیں کہیں تجریدی افسانے کی حدود چھو لیتا ہے مثلاً" دردآشنا کا ہیرو عرفی تجریدی کہانی کا لبادہ سر پا کردار بڑی خوبی سے افسانہ نگار کے ذہن کی الجھن کی ترجمانی کرتا ہے۔ عفریت اور تشنہ لب میں بھی اُس کا یہی محبوب موضوع موجود ہے اس کے علاوہ افسانہ نگار کی ذہنی زندگی میں ایک اہم مقام ہے جس پر وہ قاری کو زبردستی روک لیتا ہے یہ مقام ہے شبِ عروسی، جو اکثر افسانوں کا مرکزی نکتہ ہے جس کی تصویر کشی اپنے اندر ایک کنوارا رویہ لیے ہوئے ہے باوجود اس کے کہ اکثر افسانوں کے کرداروں کی عمریں تیس برس سے اوپر ہیں۔ یادوں کا جلوس شادی کی نوبت بجاتا رومان کی شرعی شرح کرتا گزرتا ہے۔

میرزا ریاض سامنے کے واقعات کو افسانوں کے قالب میں ڈھال کر قاری کو اپنے گرد و نواح سے کچھ اس طرح آگاہ کرتا ہے کہ" دلدل" کا ڈاکٹر اور" ماتم" کی پگلی بالکل اپنے محلے میں بستے اور پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کے ضمیر کی بو اور ترشی ان افسانوں میں ہواس کس کر چھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

" سرطان" میرزا ریاض کا نمائندہ افسانہ ہے۔ افسانہ نگار کے لیے ایسے موضوع اور اس کے پلاٹ کی بنت پہ گرفت رکھنا کافی مشکل ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ کہانی فرد کی ذہنی شکست و ریخت کی مکمل صورت ہے اور اردو زبان کے ادبی سرمائے میں اضافہ ہے۔ اس کہانی نے کاتب اور پروف ریڈر دونوں کو اس حد تک اپنے ساتھ رکھا کہ زبان اور عبارت کی غلطیاں کہیں نظر نہیں آئیں۔" سرطان" ناہموار راستے پہ چلتے چلتے تھکے ہارے مسافر کی آپ بیتی ہے۔ یہ راستہ ہمارا معاشرہ ہے جس نے کردار کو شعور کی منزل میں قدم رکھتے ہی ایسے زخم کا احساس دلایا جس کا علاج کوئی نہ تھا ماسوائے اس کے کہ فرد ہر قدم پر ماں کی آغوش کی

طرف لوٹ جانے کی شدید آرزو کا مریض ہو جائے اور ماں بھی وہ جس نے اُسے بے شعوری میں جنم دینے کا زخم لگایا — یہ افسانہ میرزا ریاض کے تمام افسانوں کا KEY NOTE ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ وہ تنا ہے جس سے باقی شاخیں پھوٹیں اور آندھی میں صدا دینے لگیں۔

میرزا ریاض ذہنی کرب کا افسانہ نگار ہے۔ دو دہائی اُدھر نفسیاتی افسانے لکھنے کا رجحان اردو افسانے کی دنیا میں رواج کی طرح پھیلا تھا کیونکہ اس کا تعلق انسانی ذہن سے ہے اس لیے اس کا نیا پن کبھی ختم نہیں ہو سکتا دیکھنے کی چیز فنکار کا رویہ اور موضوع سے وابستگی ہوتی ہے۔ میرزا ریاض کا اپنے موضوعات اور کرداروں کے ساتھ غیر معمولی خلوص اُس کی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے یہاں تک کہ اندھیروں کے مسافر کی مبالغہ آمیز ٹریجیڈی قاری کو زندگی سے نفرت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ عاشق علی اچھا فنکار اور محبت کرنے والی بیوی کا شوہر ہے مگر اُس کے کردار میں اعتماد نہیں حالانکہ یہ دو نعمتیں ایک عام آدمی کے لئے اس معاشرے میں بہت کافی ہیں۔

منزل' آخری بس اور عفریت کی تینوں عورتیں اپنی اپنی ذات کے محور سے مکمل کر کے نئے آفاق کی سیاحت کرتی ہوئی زندگی کو نئے زاویے سے دیکھتی ہیں۔ ان کا تجربہ انھیں نئے راستوں پر لے جاتا ہے۔ "منزل" کی میرا کھیراج؟ "آخری بس" کی گرہستن کنیز" اور "عفریت" کی شادی شدہ کنواری سکینہ — تینوں بے چاریاں اندر اور باہر کی تپش کی ماریاں مغرور عورتیں — میرزا ریاض کی ان سے کہیں نہ کہیں مڈبھیڑ ضرور ہوئی ہوگی۔

افسانہ نگار اظہار کے معاملے میں اس قدر سنجیدہ ہو جاتا ہے کہ اکثر جملوں کی بناوٹ کی پروا نہیں۔ خوبصورت الفاظ کے آہنگ پر نظر رہی اُن کی ضرورت پر نہیں مثلاً "تریخ" میں۔

'کرخت چہرے پر پھیلی ہوئی خودرو مونچھیں'۔

پھر "جسے غوں" میں۔

" موجود سے بے خبر ماضی کی پُر نم خوابگاہوں میں وہ مست خواب گھومتے رہے۔"

" آفتاب نے بڑے زور سے اُس کی پنڈلی کو اپنی گرفت میں لینا چاہا مگر بھری بھری پنڈلی اُس کی گرفت میں نہ آ سکی —"

انتہائی سنجیدہ افسانوں میں کہیں کہیں ایسے فقرے آ کر قاری کو زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں — ورنہ مجموعی طور پر افسانوں کا ماحول اور روح متانت لئے ہوئے ہے۔

گرد پوش دلکش اور معنی خیز ہے۔ کتابت و طباعت گوارا۔ قیمت بارہ روپے۔ (فرخندہ لودھی)

حبیب بینک
میں حساب
کھولنا
بہت آسان ہے

۵ روپے درکار ہیں
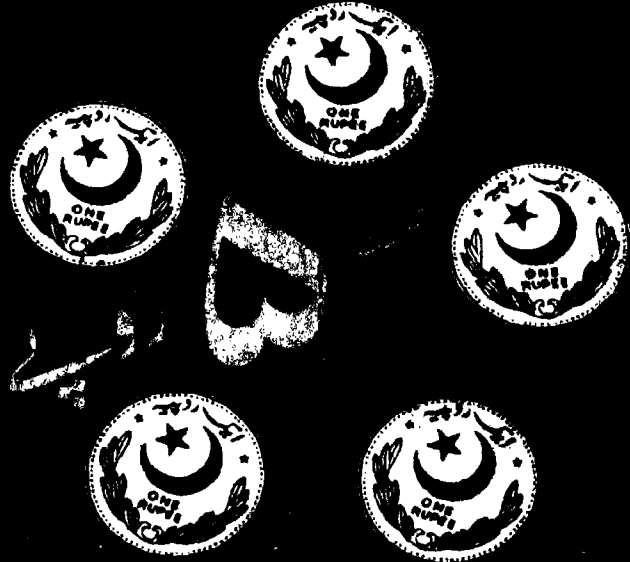
جی ہاں، صرف ۵ روپے سے آپ حبیب بینک کی کسی بھی
شاخ میں سیونگ اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں۔ آپ کی بچت کی رقم
خواہ کتنی ہی کم ہو، باقاعدگی کے ساتھ حبیب بینک میں جمع کراتے رہیئے۔
آپ دیکھیں گے کہ آپ کی جمع کی ہوئی رقم بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ
حبیب بینک جمع شدہ رقم پر منافع دیتا ہے۔
آپ حبیب بینک میں حساب کھول کر یقیناً خوش ہوں گے۔

**حبیب بینک لمیٹڈ**

پاکستان میں ۵۲۵ سے زائد شاخیں